اشاعتِ خاص بیادگار

امیر الہند محدث کبیر فقیہ جلیل حضرت مولانا ابو المآثر حبیب الرحمن الاعظمی

المآثر

بانی و سرپرست: حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی
ناظم مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو

مدیر تحریر: مسعود احمد الاعظمی

نائب مدیر: انور رشید الاعظمی

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مرقاۃ العلوم مئو

پوسٹ بکس ۱۱، مئو ۲۷۵۱۰۱، یو۔پی انڈیا
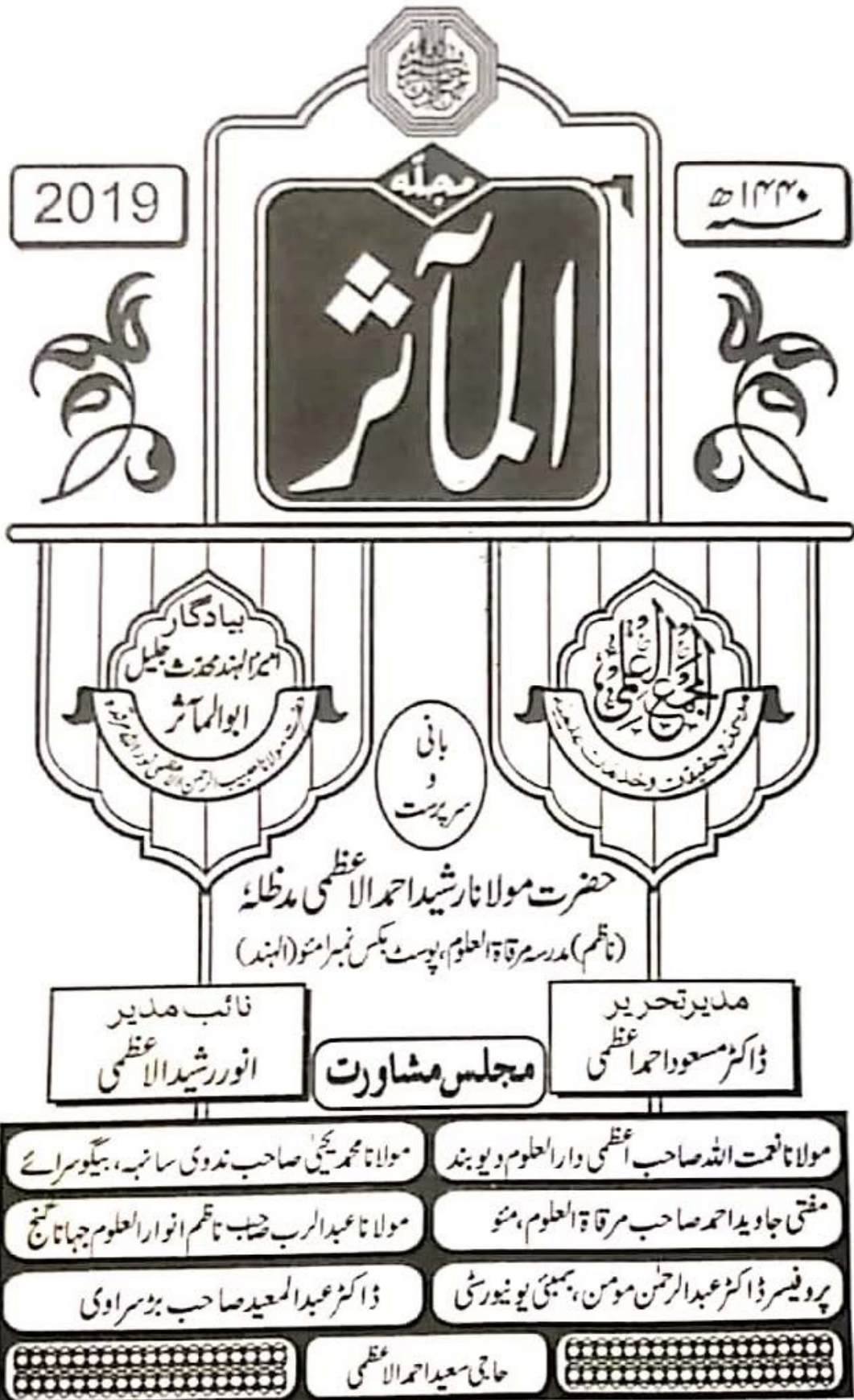
اشاعت خاص بیادگار

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

۱۴۴۰ھ = ۲۰۱۹ء

مسعود احمد الاعظمی

ناشر

مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مرقاۃ العلوم مئو

زر تعاون

اس شمارے کی قیمت =/۵۵۰ روپے

فی شمارہ ۲۵/۰۰ روپے

سالانہ ۱۰۰/۰۰ روپے

تین سال کے لیے ۲۵۰/ روپے

تعاون خصوصی ۱۵۰۰/۰۰ روپے

لائف ممبر ۷۰۰۰/ روپے

بیرون ملک ۲۵/ ڈالر

کمپیوٹر کتابت: محمد کوثر الاعظمی

فہرست عنوانات

ہدیۂ تشکر و امتنان

از: حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ خلف الرشید حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ ☆

الحمد لله وحده، والصلاة والسلام علی من لا نبي بعده!

رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ میں جس وقت حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی، اس وقت ہم پسماندگان کو جو سب سے زیادہ فکر لاحق تھی، وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علمی ذخیرے اور سرمائے کی حفاظت اور ان کے علوم و معارف کی اشاعت تھی، فوری طور پر ایک انتظام یہ کیا گیا کہ ان کی یادگار میں ایک سہ ماہی رسالے کا ''المآثر'' کے نام سے اجرا کیا گیا، جس کی ادارت کے لیے مولانا اعجاز احمد اعظمی علیہ الرحمہ کو منتخب کیا گیا، جو اس وقت اعظم گڈھ ضلع کے ایک گاؤں شیخوپور کے مدرسہ شیخ الاسلام کے صدر المدرسین کے منصب پر فائز تھے۔ انھوں نے اس رسالہ کو کامیاب بنانے کے لیے پوری جد و جہد صرف کی، اور اللہ کا شکر ہے کہ بہت جلد یہ رسالہ ملک کا ایک ممتاز علمی رسالہ سمجھا جانے لگا، اس کے ذریعے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بے شمار علمی و تحقیقی تحریریں اشاعت پذیر ہوئیں، اور اہل علم سے خراج تحسین وصول کیا۔ اسی دوران بنارس کے سہ ماہی رسالہ ''ترجمان الاسلام'' نے ایک خصوصی شمارہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر شائع کیا، اس کے چند مہینے بعد کچھ اور مضامین کا ایک ضمیمہ بھی رسالہ مذکورہ نے شائع کیا، اس کے بعد وقتاً فوقتاً والد صاحب کی زندگی اور علمی کارناموں سے متعلق تحریریں مختلف رسالوں اور خود ''المآثر'' میں چھپتی رہیں۔ تاہم ایک اہم ضرورت ابھی باقی تھی، جس کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی، وہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مستقل اور مکمل سوانح حیات تھی۔ میرے خواہر زادۂ عزیز ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ نے درس نظامی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڈھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ علی گڈھ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسی جامعہ سے منسلک ہونے کے

☆ ناظم مدرسہ مرقاۃ العلوم و سرپرست رسالہ ہذا۔

بجائے وہ مئولوٹ آئے، اور ''المآثر'' کی کچھ ذمہ داریوں کی انجام دہی کے ساتھ انھوں نے حضرت والد صاحب کی سوانح عمری دو ضخیم جلدوں میں مرتب کی، جس کے مجموعی صفحات کی تعداد تقریباً ۱۵۰۰ صفحات ہیں۔اس طور پر ایک نہایت اہم کام بحمد اللہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔

چند سال پیشتر باہمی مشورے سے یہ طے کیا گیا کہ ''المآثر'' کا ایک خصوصی شمارہ شائع کیا جائے، جس میں وہ تمام تحریریں یکجا کر دی جائیں، جو اب تک والد صاحب ؒ پر شائع ہوئی ہیں، ورنہ ڈر یہ ہے کہ کہیں دستبرد زمانہ کا شکار ہوکر ضائع نہ ہوجائیں۔اب الحمد للہ یہ کام بھی مکمل ہوگیا، اور عنقریب یہ خصوصی شمارہ طباعت کے لیے پریس میں جانے والا ہے، خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس نے ہم کمزوروں کو اس عظیم کام کی توفیق عنایت فرمائی، اب اسی کی بارگاہ میں یہ التجا کرتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں خلوص پیدا فرمائے، اور جس طرح اس نے ان عظیم کاموں کی توفیق عنایت فرمائی ہے، اسی طرح ان کو شرف قبول بھی عطا فرمائے، اور عزیز مرتب اور ان کے معاونین کو بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

<u>صفحہ ۱۱ کا بقیہ</u>

اس خصوصی شمارے کی اشاعت میں مولوی محمد کوثر اور مولوی اشتیاق احمد صاحبان کا تعاون احقر کو حاصل رہا ہے، اول الذکر نے مضامین کی کمپوزنگ اور مؤخر الذکر نے احقر کے ساتھ مل کر پروف ریڈنگ میں تعاون کیا، جس کے لیے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

خدا سے دعا ہے کہ ہم بے بضاعتوں کی اس کاوش کو شرف قبول عطا فرمائے، اور اس سے علمی دنیا اور قارئین کو نفع پہنچائے، اور جس شخصیت کے علوم و معارف کے تعارف کے لیے یہ خدمت انجام دی گئی ہے، اس کو اپنے شایان شان اجر جزیل و عظیم عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں مئو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، اُس وقت اِس قصبے کی کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں تھی، لیکن بالکل گمنام اور غیر معروف بھی نہیں تھا۔ اس وقت متعدد اہل علم، اصحاب زہد وتقویٰ اور اہل اللہ کے روحانی انفاس نے قصبے کی فضا کو پاکیزہ اور روح پرور بنا رکھا تھا۔ ان ملکوتی صفات اور پاکیزہ اوصاف کے حامل افراد میں ایک عجیب وغریب بزرگ مولانا محمد صابر بن عنایت اللہ تھے، جو اپنے ظاہری وباطنی خصائص وامتیازات کی وجہ سے اپنے وقت کے جنید وشبلی تھے۔ علم دین سے آراستہ وپیراستہ، شریعت پر بدرجۂ کمال عمل پیرا، تصوف وطریقت کے رمز آشنا، یاد الٰہی سے قلب مبارک معمور، ذکر باری میں رطب اللسان، اسلامی تعلیمات کا نمونہ، حسن اخلاق وکردار کا پیکر، اور رزق حلال کے اہتمام میں ابراہیم بن ادہم کی یاد تازہ کردینے والے۔ یہ مولانا محمد صابر صاحب وہ خوش قسمت انسان ہیں، جن کے گھر میں بیسویں صدی کے آفتاب عالم تاب کے ساتھ ایک ستارہ طلوع ہوتا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے علمی دنیا کے افق پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکنے لگتا ہے۔ یہ وہ عجیب وغریب اور حیرت انگیز انسان ہے کہ اس کے اوپر عمر کی پختگی سے قبل علم کی پختگی اور اس کے اندر رسوخ کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، مختصر سے عرصے میں علم ومعرفت کے اس مقام تک پہنچتا ہے کہ اس کی ضیا پاش کرنیں دنیائے علم وفضل کے بڑے بڑے باکمالوں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگتی ہیں۔

وہ یکتائے زمانہ اور یگانۂ روزگار شخصیت جسے دنیا محدث جلیل مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔ ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں ان کا تولد ہوا، والدین کے فیض تربیت اور اساتذہ کے فیضان نظر نے چند برسوں میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کسی بھی شخص کی اولین درس گاہ ماں کی آغوش اور اولین تربیت گاہ باپ کا ظل عاطفت ہوتا ہے۔ مولانا محمد صابر صاحب کی

تربیت اور کردار سازی نے ان کے نونہال کو ایک بہترین اور باکمال انسان بنادیا، اور سونے پر سہاگہ کا کام ان کے نور نظر کے ان اساتذہ ومشائخ نے کیا، جو علم وعمل کے لحاظ سے اپنے وقت کے منفرد اور بے مثال افراد اور منتخب روزگار تھے۔

محدث جلیل حضرت مولانا الاعظمی ؒ کی پوری عمر، طفولیت سے لے کر شباب، اور اس کے بعد سے آخری لمحات تک کا زمانہ طالبان علم اور اہل علم ومعرفت کے لیے نمونۂ عمل اور مشعل راہ ہے۔ آپ کی پوری حیات مبارکہ علم ودین کی خدمت سے عبارت رہی ہے، اور ہمہ جہت علمی ودینی خدمات نے آپ کو تاریخ کا ایک باکمال اور نابغۂ روزگار انسان بنادیا ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں تحصیل علم وکمال کے لیے محنت ومشقت، شب وروز جد وجہد، شب بیداری وسحر خیزی، آبلہ پائی وبادیہ پیمائی، درس ومطالعہ کی مواظبت ومداومت؛ اساتذہ کے ساتھ ملازمت، ان کا ادب واحترام اور خدمت گذاری، جیسے اوصاف اور محاسن اخلاق نے نہ صرف ان کو ان کے اساتذہ کا منظور نظر بنادیا تھا، بلکہ قدرت کی فیاضیوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ شعبان ۱۳۴۰ھ مطابق اپریل ۱۹۲۲ء میں آپ نے تعلیم سے فراغت پائی، اس وقت سے لے کر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق مارچ ۱۹۹۲ء تک کا طویل عرصہ آپ نے درس وتدریس، تعلیم وتربیت، تصنیف وتالیف، تعلیق وتحقیق، اصلاح وارشاد، وعظ وتذکیر اور تزکیۂ نفوس کے لیے وقف کردیا۔

تعلیم سے فراغت کے وقت سے لے کر دنیا سے رحلت تک کا زمانہ ستر (۷۰) برسوں سے زیادہ کی مدت پر محیط ہے، یہ کوئی معمولی مدت نہیں ہے، لیکن آپ نے جو عظیم الشان اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیے ہیں، وہ اس سے کہیں زیادہ غیر معمولی اور ناقابل یقین ہیں جو اس مدت میں انجام دیے جاسکتے ہیں، اور ان سب پر مستزاد یہ ہے کہ آپ کی شخصیت کو اللہ نے ایسا عجیب وغریب بنایا تھا، کہ جملہ اسلامی علوم اور فنون وآداب کے ہر شعبے میں مقام امامت پر فائز تھے۔ اگر وہ حدیث کی مہارت میں اِس زمانے کے ابن معین اور ابن المدینی تھے، تو فقہ میں کرخی اور سرخسی تھے، تفسیر میں جصاص ورازی، اور علم لغت میں مبرِّد واصمعی تھے، اگر عربی تحریر وانشا میں آمدی وجرجانی تھے، تو اردو نثر نگاری میں شبلی وحالی اور محمد حسین آزاد تھے، زہد وتقویٰ اور استغنا ایسا کہ جو ان کو دیکھتا تو حسن بصری اور ابن سیرین کا گمان ہونے لگتا تھا، ان تمام علمی وعملی کمالات کے باوجود انکسار وتواضع ایسا کہ اس کی مثال ملنی مشکل تھی۔

رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ کے عشرۂ رحمت ومغفرت کے درمیانی وقفے میں جس وقت اس عظیم اور یگانۂ روزگار انسان کی مبارک روح کو قفس عنصری سے رہائی نصیب ہوئی، اس وقت جدید وسائل ابلاغ نہ ہونے کے باوجود چند ساعتوں میں پوری دنیا میں ان کی رحلت کے روح فرسا سانحے کی خبر پھیل گئی، اور جہاں کہیں یہ خبر پہنچی صف ماتم بچھ گئی، عوام ہوں یا خواص ان کے رنج وغم کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، خواص اور اہل علم کو دوہرا غم اس بات کا تھا کہ نہ صرف ایک عظیم المرتبت اور بزرگ ترین شخصیت ان کے درمیان سے اٹھ گئی، بلکہ یہ سوچ کر ان کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا کہ ان کے علمی مسائل اور اشکالات کا اب کوئی حل کرنے والا نہیں رہا، علمی وتحقیقی مشکلات میں ان کا مرجع اور ملجأ وماویٰ ان کو داغ مفارقت دے گیا، قومی وملی رہنماؤں کو یہ احساس ستا رہا تھا کہ قوم وملت کے روز افزوں مسائل اور نازک اوقات میں ان کی رہنمائی کرنے والی ذات ان سے جدا ہوگئی، وہ ذات جس کی اصابت رائے دوراندیشی اور اخلاص ونیک نیتی پر دن کے اجالے کی طرح یقین واعتماد تھا۔

اخبارات اور رسائل وجرائد ایک مدت تک آپ کی رحلت سے واقع ہونے والے خلا پر اپنے احساسات وتاثرات کا اظہار کرتے رہے، اخبارات نے اداریے لکھے، رسائل ومجلات میں مضامین شائع ہوئے۔ پھر اس سانحے کے چند مہینوں بعد جامعہ اسلامیہ بنارس سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالے ''ترجمان الاسلام'' نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات پر ایک یادگار خصوصی شمارہ شائع کیا، جو اپنے مضامین اور مشمولات کے لحاظ سے انتہائی گراں قدر شمارہ تھا، پھر چند مہینوں کے بعد اس کا ایک دوسرا ضمیمہ بھی شائع کیا، جس میں مزید مضامین اور تحریریں اشاعت پذیر ہوئیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے چند مہینوں بعد ہی آپ کی یادگار میں اور آپ کے علوم وافادات کے اشاعت کے لیے مدرسہ مرقاۃ العلوم نے ایک سہ ماہی رسالے کے اجراء کا فیصلہ کیا، جس کا پہلا شمارہ محرم- ربیع الاول ۱۴۱۳ھ مطابق جولائی-ستمبر ۱۹۹۲ء میں طبع ہوکر سامنے آیا تو اہل علم نے غیر معمولی مسرّت وانبساط کے ساتھ اس کا استقبال کیا، قدر ومنزلت کی نگاہوں سے اس کو دیکھا، اور دل کے نہاں خانوں میں اس کو سجایا۔ اس رسالے کو شائع ہوتے ہوئے ستائیس سال کی مدت ہوچکی ہے، اور اب بھی اس کے واسطے سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم اور فیوض وبرکات کے نشر واشاعت کا سلسلہ جاری ہے، **والحمدللّٰہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات**. حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں شائع ہونے والے اس رسالے میں بھی ان کی شخصیت اور علمی

کارناموں سے متعلق بہت سی وقیع تحریریں اور قیمتی نگارشات شائع ہوئیں۔

پھر اس بے مایہ راقم السطور کی محنت سے آپ کے سوانح حیات اور علمی خدمات پر دو ضخیم جلدیں اشاعت پذیر ہوئیں، ان میں پہلی جلد جو ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی آپ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے، اور دوسری جلد جو ۲۰۱۱ء میں طبع ہوئی اس میں صرف آپ کے علمی کارناموں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ علاوہ بریں متعدد سکالروں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کو ریسرچ اور تحقیق کا موضوع بنا کر ایم-اے، ایم-فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے۔ جن میں کئی ایک طبع ہو چکے ہیں۔

چند سال پہلے ادارۂ ''المآثر'' نے یہ طے کیا کہ حضرت پر اب تک جو تحریریں مقالات ومضامین کی شکل میں منظر عام پر آچکی ہیں، چاہے وہ ''ترجمان الاسلام'' کے شماروں میں ہوں، یا ''المآثر'' کے صفحات کی زینت بنی ہوں، یا دوسرے رسائل میں شائع ہوئی ہوں، ان سب کو یکجا کر کے مجلۂ ''المآثر'' کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا جائے۔ اس کی تیاری کا کام کئی سال سے چل رہا تھا، اور ان تحریروں اور مضامین کی کمپوزنگ کرائی جارہی تھی۔ اب الحمدللہ یہ مضامین کتابت کے مراحل سے گزر چکے ہیں، اور انشاء اللہ بہت جلد یہ خصوصی شمارہ زیور طباعت سے آراستہ ہوکر ناظرین کے ہاتھوں میں ہوگا، مضامین کو حتی الامکان تلاش وجستجو کر کے نہ صرف ''ترجمان الاسلام'' اور ''المآثر'' بلکہ بعض دوسرے رسائل میں شائع شدہ مضامین مثلاً ''معارف'' اعظم گڈھ اور ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند وغیرہ سے بھی لے کر ان کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی طرح ''حیات ابوالمآثر'' کی دونوں جلدوں پر ملک کے بعض مؤقر رسالوں میں تبصرے شائع ہوئے تھے، جو ممتاز اور نامور قلم کاروں کے رشحات خامہ اور آثار قلم تھے۔ ان تبصروں کو بھی اس میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت کے انتقال کے بعد مختلف اخبارات جن میں سرفہرست اس وقت کے بنارس سے شائع ہونے والے روزنامے ''قومی آواز'' اور ''آواز ملک'' ہیں، ان میں خبریں اور تعزیتی تجاویز شائع ہوئی تھیں اور بہت دنوں تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ ان خبروں، ادارتی تحریروں اور تعزیتی قراردادوں کے بارے میں خیال ہوا کہ ان میں سے جو محفوظ ہیں، ان کو سکین (scan) کرا کر بعینہٖ پیش نظر شمارے میں شائع کر دیا جائے، تا کہ وہ اپنے اصلی انداز میں قارئین کے سامنے آسکیں، اور وہ ایک دستاویز کے طور پر محفوظ ہو جائیں۔

بقیہ صفحہ ۷ پر

کلمۂ افتتاح

حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی ☆

ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے، جب والد گرامی قدر محدثِ کبیر حضرت اقدس ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہٗ کا سایۂ عاطفت ہم لوگوں کے سروں پر قائم تھا، اس عظیم سائے میں علم کی ایک دنیا آباد تھی، ہمارا ماحول علم کی خوشبو سے معطر تھا، رات دن حدیث وقرآن کا چرچا تھا، اہلِ علم اپنے اشکالات لاتے اور تشفی حاصل کرکے جاتے، مخالفین کچی باتیں کہنے سے گھبراتے کہ حضرت محدث کبیر کی عقابی نگاہیں ان کے معائب کو چھان پھٹک کر الگ کردیں گی، تحقیق وتدقیق کا بازار گرم تھا، ان کے ہوتے ہوئے علم کی کوئی بات مشکل نہ تھی، کون سی حدیث کس کتاب میں ہے، اس کی سند کی کیا حیثیت ہے، اس کے متن کا کیا رتبہ ہے، ان کے حل کے لیے ایک توجہِ نظر کافی تھی، فن اسماء الرجال کی نازک اور دقیق گتھیاں جن کے سلجھانے میں عقلیں حیران ہوتیں، ایک معمولی التفات سے سلجھ جایا کرتیں، علم کا ایک خاموش سمندر تھا، جس کی ظاہری سطح پرسکون تھی، مگر اس کے اندر تفسیر وحدیث اور فقہ وادب کی پرشور لہریں موج مار رہی تھیں۔

علم کا یہ سمندر، جب زیرِ زمین چلا گیا، اور فضل وکمال کا یہ آفتاب جب غروب ہوگیا، تو ایسا احساس ہو رہا ہے، جیسے علمی دنیا میں ایک سناٹا چھا گیا ہے، ہم جو ابتدا سے اس گھنے سائے میں زندگی گزارنے کے خوگر تھے، ایسا محسوس ہو رہا ہے، کہ ہر طرف دھوپ کی سختی ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ آفتاب غروب ہوگیا اور ہم پسماندگان اندھیرے میں آگئے۔

لیکن حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس آفتاب نے اپنے علم وفضل کی شعاعیں دنیا میں پھیلا دی ہیں، تحریر وتصنیف اور تحقیق وتعلیق کی شکل میں اتنا بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے ہے کہ اس کی ترتیب وتہذیب اور طباعت واشاعت ایک اکاڈمی کے قیام اور ایک طویل منصوبہ کو چاہتی ہے، یہ کام آسان

☆ ناظم مدرسہ مرقاۃ العلوم، وسرپرست رسالۂ ہذا

تھا، اگر ہمارے پاس وسائل و ذرائع کی فراوانی ہوتی، اہل علم اور اہلِ ذوق کا اجتماع ہوتا، ایسے لوگ ہوتے جو تحقیقی کاوشوں میں خود کو کھپانے والے ہوتے، مگر حضرت اقدس جس زاہدانہ و بے نیازانہ ڈگر پر زندگی بھر چلتے رہے، اس میں علم و تحقیق کی فراوانی تو بحدِ کثیر تھی، مگر دنیاوی اسباب و وسائل کا کم سے کمتر گذر تھا، چنانچہ حضرت کے گذرنے کے بعد علمی تحقیقات کا وافر سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے، دل میں بار بار خیال آتا رہا کہ ان جواہر علمیہ کی اشاعت وقت کا ایک تقاضا اور ہماری گردنوں پر ایک فریضہ ہے، اس کے لیے کئی منصوبے زیرِ غور ہیں۔

فی الحال اس کی ابتدا ایک دینی و علمی مجلّہ سے کی جاتی ہے، خوش قسمتی سے ہمیں ایسے ایسے احباب و رفقاء فراہم ہو گئے، جنھوں نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ اس اہم کام کا بیڑہ اٹھالیا ہے، حق تعالیٰ کے کرم و احسان پر بھروسہ کر کے ہم نے حضرت اقدس کی علمی میراث کے سلسلے میں زیرغور منصوبوں کی پہلی قسط کا آغاز کر دیا ہے۔ اس مجلّہ میں حضرت اقدس کے غیر مطبوعہ مضامین و مقالات جن کی ایک خاصی تعداد مسودات میں محفوظ ہے، شائع کیے جائیں گے؛ نیز حضرت نے اپنی طویل علمی زندگی میں بہت سے گرانقدر مضامین ایسے تحریر فرمائے، جو کبھی ملک کے نامور رسالوں میں شائع ہوئے، لیکن اب وہ رسالے بھی ناپید ہیں، اور وہ مضامین بھی ان میں دفن ہیں، ان میں سے بیشتر ایسے ہیں، جن کی افادیت آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے جیسی اس وقت تھی جب وہ لکھے گئے تھے، ارادہ یہ ہے کہ اس مجلّہ کے ذریعے انھیں پھر عام کیا جائے، ان کے علاوہ اور بھی اہلِ علم کے بیش قیمت علمی نتائج فکر اس کے صفحات کی زینت ہوں گے، ناظرین کرام بالخصوص اہل علم حضرات اس کی جانب خصوصی توجہ فرمائیں تا کہ حضرت اقدس کی یہ علمی میراث ہم امت مسلمہ کے ہاتھوں میں بحسن وخوبی پہنچا سکیں۔

حرف آغاز

(المآثر: جلد۱، شمارہ۱، محرم-ربیع الاول ۱۴۱۳= جولائی-اگست ۱۹۹۲ء)

از مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ☆

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین.

اب سے تقریباً ایک صدی قبل غیر منقسم ہندوستان کے ایک چھوٹے سے صنعتی قصبہ مئو کے افق پر علم وفضل کا ایک ہلال نمودار ہوا جو باوجود بے سروسامانی، اور قصبہ کی علمی تنگ دامانی کے چرخِ کمال پر بڑھتا رہا، چڑھتا رہا، یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں وہ آسمانِ علم کا بدرِ کامل بن کر چمکنے لگا، کچھ لوگوں نے اسے پہچانا اور بہت سے لوگ اس کے رتبہ سے واقف نہ ہوسکے، لیکن اس کی عظمت سب کے قلوب پر چھائی رہی، سب کو اس کی دستگاہِ علم کی بلندی کا اعتراف رہا، اس نے اپنی زندگی کا تقریباً تمام تر حصہ مئو میں گذارا، مگر اس کی شہرت کا آوازہ عرب وعجم میں گونجا، وہ خود نہایت خاموش تھا، مگر اس کا چرچا شہر در شہر تھا، اس نے خود کو ہمیشہ چھپا اور دبا کر رکھا، مگر خدا نے اسے ظاہر کیا اور ابھارا، اسے متعدد علوم میں مہارت تامہ حاصل تھی، مگر خصوصیت کے ساتھ علم حدیث اور اس کی ذیلی شاخ فن اسماء الرجال میں اسے جو حذاقت ومہارت حاصل تھی، اس کی دورِ حاضر میں نظیر نہ تھی، وہ حدیث رسول کا سچا اور مخلص خادم تھا، اسے رسول کی ذات سے عشق تھا، والہانہ لگاؤ تھا، اس لیے حدیثِ رسول اس کے لیے سرمایۂ زندگی، اور آبِ حیات تھی، اس کے دن حدیثی ذخائر کی جستجو میں صرف ہوتے، اور اس کی راتیں ان کے مطالعہ وتحقیق میں بسر ہوتیں، اس کا حافظہ زبردست تھا، اس نے آبِ زمزم پیتے وقت فیضانِ الٰہی سے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ جیسے علم کی درخواست کی تھی، اس کی ذکاوت بے مثال تھی، اس کی دقتِ نظر عجیب تھی، اس کا مطالعہ وسیع تھا اور عمیق بھی، ان خصوصیات نے اسے علم وتحقیق، بالخصوص علومِ حدیث کی ایک زندہ علامت بنادیا تھا، وہ علماء وفضلاء کا

☆ سابق مدیر رسالۂ ہٰذا

مرجع تھا، تحقیق کی الجھی ہوئی گتھیاں اس کے یہاں سلجھتی تھیں، حدیث وقرآن کی مشکلات کا تشفی بخش حل اس کے پاس تھا، علم رجال کے مخفی خزانوں پر اس کی دسترس تھی، فقاہت اس کی طبیعت تھی، وہ سراپا علم تھا۔

یہ بدر تاباں! نہیں! آسمانِ فضل وکمال کا آفتاب درخشاں ۹۳ سال تک مئو کے افق پر چمکتا رہا، اور دنیائے علم کو روشنی اور حرارت بخشتا رہا، آخر میں اس کا جسم انتہائی نحیف ونزار ہو گیا تھا، قویٰ جواب دے گئے تھے، بینائی نے نظریں چرالی تھیں، مگر دل ودماغ بالکل تازہ دم اور نشیط تھے، حالت یہ ہے کہ بسترِ علالت پر جسم بیمار پڑا ہوا ہے، آنکھیں بند ہیں، اور حدیث کے ایک مشہور ذخیرہ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کی تحقیق جاری ہے، ایک ایک لفظ پر غور رہا ہے، غلطیوں کی نشاندہی کی جارہی ہے، حواشی املا ہورہے ہیں، اسی دوران خالقِ کائنات کی طرف سے بلاوا آگیا، کتابِ دنیا بند کردی گئی، آخرت کا دروازہ کھول دیا گیا، زندگی بھر کی کاوش وکوشش کا صلہ ملنے کا وقت آگیا، کچھ عرصہ تک یہ آفتاب موت وحیات کی کشمکش میں جھلملاتا رہا، بالآخر ۱۰ ر رمضان المبارک کی شام کو جب دنیا کو روشنی بخشنے والا آفتاب غروب ہورہا تھا، اور رمضان المبارک کا مقدس مہینہ عشرۂ مغفرت میں داخل ہورہا تھا، ٹھیک اسی وقت علم وفضل کا یہ آفتاب دنیا کے افق سے غروب ہوکر حق تعالیٰ کی آغوشِ رحمت میں جا پہنچا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ عظیم ہستی مئو اور اس کے اطراف میں ''بڑے مولانا'' کے نام سے معروف تھی اور علماء وفضلاء اسے ''محدثِ جلیل، فاضلِ اجل، ابوالمآثر حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی'' کے نام سے جانتے تھے۔

حضرت محدث اعظمی، دنیا سے تشریف لے گئے، وہ اپنی بے لوث خدمات کا صلہ بارگاہ خداوندی سے، اور اپنی محبت وعشق کی داد وتحسین بارگاہِ رسالت سے پارہے ہوں گے، محدثین کبار کی ارواحِ مقدسہ نے ان کا استقبال کیا ہوگا، جس طرح ان کے جنازے میں لاکھوں روزہ داروں کا ہجوم تھا، کیا عجب کہ عالمِ برزخ میں بھی لاکھوں ارواحِ طیبہ اور نفوس قدسیہ نے ان کو خوش آمدید کہا ہو۔

جانے والا، اس دنیا کو ـــــ رنج ومحن سے بھری دنیا کو ـــــ خیر باد کہہ کر چلا گیا، لیکن وہ اپنے بعد والوں کو علم کا بے بہا خزانہ دے گیا، حضرت محدث اعظمی کے علمی کارناموں کو بہت سے لوگ شاید تفصیلاً نہ جانتے ہوں گے، کیوں کہ وہ خاموش اور بے نیاز طبیعت کے مالک تھے، وہ علم وفضل کی نمائش کے فن سے واقف نہ تھے، وہ نام ونمود اور تمنائے ستائش سے ہمیشہ دور رہے، وہ ابتداء سے فقیرانہ زندگی کے عادی تھے، اور اخیر تک اسی حالت پر قائم رہے، ان کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا وہ علم کے کیسے

''جبل عظیم'' کے سامنے موجود ہے، لیکن ان کی تحریرات، ان کے مضامین، ان کی حدیثی تحقیقات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ ہماری صدی کے آدمی نہ ہوں، وہ حافظ شمس الدین ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کے دور کے آدمی تھے، ان کے حافظے کی گہرائی، اور مطالعہ کی وسعت کو دیکھ کر اگلے محدثین یاد آجاتے ہیں، وہ اس دور میں اسلام کی حجت بالغہ تھے، ۱۱؍رمضان ۱۴۱۲ھ کو روزہ دار مسلمانوں نے محض ایک شخصیت کو نہیں دفن کیا ہے، بلکہ پوری ایک امت کو دفن کیا، اور علم و تحقیق کے مکمل کتب خانہ کو تہِ خاک چھپایا ہے۔

مولانا کے وصال بعد دلوں میں یہ بات بہت شدت کے ساتھ آئی کہ انھوں نے جن علمی ذخائر کو اپنی میراث میں چھوڑا ہے، ان کی حفاظت کی جائے، ان کی اشاعت کی جائے، کیوں کہ ان کی اشاعت عین دین کی اشاعت ہے۔ ان کا تعارف کرایا جائے، گو کہ آج کی دنیا، دنیا داری کی دوڑ میں اتنا آگے بڑھتی جا رہی ہے، کہ خالص اخروی چیزوں کی قیمت اس کے آگے گرتی جا رہی ہے۔ دنیا کی چمک دمک نے نگاہوں کو خیرہ کر رکھا ہے، آخرت فراموش ہوتی جا رہی ہے، لیکن غفلت و خدا فروشی کے اس سناٹے میں، آج بھی اللہ کے فضل سے ایسے لوگ موجود ہیں، جن کے سینے فکرِ آخرت سے معمور اور جن کی نگاہیں علمی ذخائر کی جستجو میں مشغول ہیں۔ انھیں شوق ہے کہ قرآن وسنت کا علم انھیں حاصل ہو، ایسے لوگوں کے حق میں ناانصافی ہوگی، اگر ان علمی خزانوں کو عام نہ کیا جائے۔

اسی جذبے کے تحت قصد ہوا کہ حضرت محدثِ کبیر کی وہ علمی یادگاریں، جو اب دستیاب نہیں ہیں، انھیں جدید اسلوب کے مطابق تحقیقات و تعلیقات کے ساتھ مزین کر کے دوبارہ علم و تحقیق کے قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچایا جائے، چنانچہ یہ کام شروع ہو چکا ہے۔

اسی دوران یہ بھی خیال ہوا کہ ایک علمی و دینی مجلّہ حضرت اقدس کی یادگار میں جاری کیا جائے، جس میں مختلف دینی موضوعات پر تحقیقی مقالات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ، حضرت کی کتابوں کا تعارف بھی پیش کیا جائے، اور ان کے وہ قدیم مطبوعہ مقالات و مضامین جو اب کہیں نظر نہیں آتے، یا ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں، انھیں بھی منظر عام پر لایا جائے، نیز اکابر اور بزرگوں کے احوال و حکایات کی روشنی عام کی جائے، تا کہ دلوں سے آخرت فراموشی کی سیاہی دور کی جا سکے۔

غرض ایک ایسا دلآویز اور روح پرور علمی و روحانی مرقع تیار کیا جائے، جو اہلِ علم و تحقیق کے ذوق بلند کو مزید بلندی بخشے، اور اس کی ضمانت حضرت اعظمی کے علمی نوادرات و تحقیقات ہیں، اور محبت و معرفت کے شیدائیوں کی آسودگی و سیرابی کا سامان بھی مہیا کرے، نیز مسلمانوں میں صحیح علمی و دینی

ذوق بیدار کرے، اور اگر کسی طرف سے مسلک حق اور مذہب اہل حق پر آنچ آنے کا اندیشہ ہو، تو اسے دور کرنے اور قلوب کو مطمئن کرنے کا فریضہ بھی انجام دے۔

دلوں میں خیالات آئے، احباب سے مشورے ہوئے، اہلِ علم نے ہمت افزائی کی، گو علم کے اس کساد بازاری کے دور میں بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں اردو پڑھنے والوں ہی کی تعداد کتنی ہے؟ پھر ان میں سے دین اور علم دین سے دلچسپی رکھنے والے کتنی محدود اور مختصر گنتی میں ہیں؟ نیز یہاں وسائل وذرائع بھی ناپید ہونے کے درجے میں ہیں، آخر مجلّہ چھاپیں کیسے؟ اور جیسے تیسے چھاپ لیا تو پڑھے کون؟ یہ سوالات ایسے ہیں جو ہمت کو پست کردیں، پاؤں ڈگمگا دیں، حوصلوں کو توڑ کر رکھ دیں، تاہم بنامِ خدا امید وبیم کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا جاتا ہے۔

''مجلّہ المآثر'' کا پہلا شمارہ ہم ناظرین کے ہاتھوں میں پیش کر کے خدا کے حضور دستِ بدعا ہیں کہ الہٰ العالمین! دلوں کو سچا خلوص، نگاہوں کو صحیح نظر، دماغوں کو متوازن فکر، ہاتھوں کو محتاط قلم اور پاؤں کو جادۂ استقامت عطا فرمانے والے آپ ہیں، ہم کمزوروں اور ناتوانوں نے آپ کی قوت وتوانائی کے اعتماد پر قلم کا سفر شروع کردیا ہے، حقیقی منزل تک پہنچانے والے، اور جدوجہد کو قبول کرنے والے آپ ہیں، ہم بندے آپ سے امیدوار ہیں، اور آپ سے امید رکھنے والا ناکام نہیں ہوتا۔

ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت کے مطبوعہ علمی مضامین جو کبھی کسی رسالے میں شائع ہوئے تھے، اور اب نایاب ہیں، انہیں بھی آہستہ آہستہ منظر عام پر لائیں گے، اس سلسلے میں اس شمارے کے اندر حضرت اقدس کا ایک مضمون ''نصب الرایہ لتخریج احادیث الہدایہ للزیلعی'' کے متعلق پڑھیں گے، یہ مضمون نصف صدی پیشتر لکھا گیا، لیکن علم وتحقیق کی شادابی کبھی پژمردہ نہیں ہوتی، اس کو پڑھ کر آپ کی معلومات میں بہت بیش قیمت اضافہ ہوگا۔

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وتحقیقی کارناموں میں سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قدیم ترین متعدد حدیث کی کتابیں، جو اب تک شائع نہیں ہوئی تھیں، اہلِ علم نے کتابوں میں ان کے نام ضرور پڑھے تھے، مگر ان کی زیارت سے محروم تھے، ان کے اکادکا قلمی نسخے دنیا کے پھیلے ہوئے بے شمار کتب خانوں میں خال خال پائے جاتے تھے، حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان مخطوطات کا پتہ لگایا، باوجود بے سروسامانی کے انھیں حاصل کیا، یا ان کے فوٹو منگوائے، مخطوطات کا

پڑھنا بے حد مشکل اور صبر آزما کام ہے، مگر حضرت موصوف نے اپنی خداداد حذاقت ومہارت سے انھیں پڑھا، اغلاط کی تصحیح کی، ان پر تعلیقات لکھیں، اور انھیں منظر عام پر شائع کیا، علمی دنیا نے حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں کا اعتراف کیا، اور وہ ان کے احسان سے جھک گئی۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی ''مسند حمیدی'' کی تعلیقات وتحقیقات ہیں، امام حافظ ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی المتوفی ۲۱۹ھ حضرت امام بخاری علیہ الرحمہ کے استاذ ہیں، ان کی کتاب قدیم ترین تالیف ہے، حضرت محدث کبیر نے اس کی تحقیق میں محنت شاقہ برداشت کی ہے۔ آپ مجلّہ المآثر کے پہلے شمارہ میں حضرت محدث الاعظمی کی اس نوعیت کی پہلی کاوش کا تفصیلی تعارف پڑھیں گے۔

عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی قدس سرہٗ طریقت وسلوک اور روحانیت کے جس اعلیٰ مقام پر فائز تھے، وہ اہلِ علم کے حلقے میں مخفی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں نسبت مع اللہ کا زبردست حامل وداعی بنایا تھا، ایک تاثراتی مضمون حضرت کے متعلق بھی پڑھیے، حضرت پرتاب گڈھی اور حضرت محدث الاعظمی کے باہمی گہرے روابط تھے، اور دونوں ایک دوسرے کے فضل وکمال کے معترف ومداح تھے، اللہ تعالیٰ ہم کو بزرگوں کی پیروی واتباع کی توفیق عطا فرمائیں۔

جس وقت یہ مجلّہ ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچے گا، ماہ ربیع الاول کی آخری تاریخیں ہوں گی، یہ مبارک مہینہ اہلِ اسلام کے لیے خاص طور سے اس لیے اہمیت کا حامل ہے، کہ اس میں نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی ہے، اس کی یادگار کے طور پر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مجالس میلاد منعقد کرتا ہے، ان مجالس کی شرعی حیثیت سے قطع نظر، ان میں ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ غلط سلط روایات ولادت کے متعلق سنائی جاتی ہیں، حضرت محدث الاعظمی رمضان المبارک [1] کے مہینے میں بعد نمازِ جمعہ وعظ فرمایا کرتے تھے، حضرت نے ایک وعظ میں اس کی اصلاح فرمائی، اور یہ بتایا کہ میلاد حقیقی کیا ہے؟ اس میں کیا بیان کرنا اور بتانا چاہئے؟ اس تقریر میں آپ حضرت کے دل کا سوز وگداز بھی محسوس کریں گے، جلالی شان کے نمونے بھی دیکھیں گے، اور ان سب کی روح ذاتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ عشق ومحبت کا جوش تواَمنڈ اپڑتا ہے۔

(۱) رمضان المبارک میں اس کا خاص اہتمام تھا، رمضان کے علاوہ بھی اکثر جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ تقریر کیا کرتے تھے، جس تقریر کی طرف اشارہ ہے وہ رمضان کے علاوہ ہی کسی موقع کی ہے، اور بظاہر ماہ ربیع الاول کے کسی جمعہ کی ہے۔ (مسعود الاعظمی)

حضرت اقدس جس طرح ایک عظیم محدث تھے،اسی طرح نہایت دقیقہ رس اور نکتہ سنج فقیہ اور مفتی بھی تھے،حضرت کے قلمی مسودات میں بہت سے فتاویٰ موجود ہیں،فقہ وفتاویٰ کے یہ لعل وگہر ہم ان شاء اللہ ہر شمارہ میں قارئین المآثر کی نذر کرتے رہیں گے،ان کی صحت واستناد کے لیے خود حضرت محدث کبیر کی شخصیت ضمانت ہے،لیکن اگر اہل علم ان میں کہیں کچھ کمزوری محسوس کریں تو اس کی ذمہ داری حضرت محدث پر نہیں جاتی،ہم ناقلین کے نقل میں قصور وکوتاہی کے باعث ایسا ہوگا،اس سلسلہ میں توجہ دہانی کے ہم مشکور ہوں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۲۱ کا بقیہ

قدرت ان سے کام لے رہی تھی اور وہ اپنے وسعت مطالعہ کے نتیجہ میں انجام دے رہے تھے، وہ احادیث نبوی کے مزاج داں تھے۔ اب تو یونیورسٹیوں میں ہر طالب علم ایک کتاب کے مختلف مخطوطات کا تقابلی مطالعہ کررہا ہے اور تصحیح متون کا کام کررہا ہے، جب کہ علم حدیث کی گہرائی وگیرائی کی اس کو ہوا تک نہیں لگی ہے، اس کی نگاہ الفاظ وحروف تک محدود ہے اور کلام نبوت کا مزاج داں ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

مولانا اعظمی اپنے کارناموں کی وجہ سے علم حدیث کی تاریخ میں زندہ جاوید ہوچکے ہیں، ''ترجمان الاسلام'' کا یہ شمارہ آپ کے اوصاف وکمالات کا احاطہ کیا کرے گا،اس کی حیثیت بازار مصر میں یوسف کے خریداروں کی ہے، جو اپنی معمولی معمولی پونجی لے کر حاضر ہوگئے تھے،مگر ہم نے جس محبت وعقیدت سے یہ خصوصی نمبر آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے، اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے آپ اس کا مطالعہ کریں گے اور اسے اپنے پاس بطور یادگار محفوظ رکھیں گے کیونکہ

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا تاثر اور اظہار خیال

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی وفات (۱۱ر رمضان المبارک مطابق ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء) سے علوم دینیہ بالخصوص فن حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم علمی خسارہ ہوا ہے اور خلا پیدا ہوا ہے، اس کا احساس بہت سے لوگوں سے زیادہ اس عاجز کو ہے، جس کی برصغیر ہند و پاک ہی نہیں ممالک عربیہ اور مرکز اسلام پر بھی نظر ہے اور وہاں کے علماء، اساتذہ، مصنفین و محققین سے بہت سے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ واقف ہے، علم حدیث خاص طور پر عالمی و علمی پیمانہ پر جس انحطاط اور تنزل کا شکار ہے اور اس فن شریف کی واقفیت میں جو سطحیت .... پیدا ہوگئی ہے اور خاص طور پر حدیث وروایات صحیحہ اور فقہ حنفی کے درمیان تطبیق اور اس علمی حقیقت کے ثابت کرنے میں کہ مذہب حنفی حدیث کے خلاف نہیں، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ اور خلفائے کبار محض قیاس و ذہانت پر اعتماد نہیں کرتے تھے، ان کا مآخذ استنباط احکام میں آیات واحادیث ہی ہوتی تھیں، اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت مولانا کے ارتحال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اور بھی قابل افسوس و تشویشناک ہے۔

اس علمی تفرد وامتیاز کے علاوہ مولانا کے اخلاق، فہم وفراست، ملت کے مسائل ومفادات سے واقفیت وفکر مزید برآں ہے، اس لیے نہ صرف علمی حلقہ میں ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے، بلکہ ملت کی صف قیادت میں بھی ایک بڑی جگہ خالی ہوگئی ہے، جس کا پُر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے اور اہل علم و درس کو ان کی تصنیفات وتحقیقات سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے، اور فن حدیث سے اشتغال وانہماک کا سلسلہ جاری رہے۔

نذر حبیب (۱)

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب ☆

میرے سامنے محدث کبیر مولانا الاعظمی کے ذاتی حالات کے بجائے صرف ان کے علمی کارناموں کا تذکرہ کیا جاتا اور میں ذاتی طور پر مولانا سے واقف نہ ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ ان عظیم علمی کارناموں کی نسبت جس شخصیت کی طرف کی جارہی ہے وہ یقیناً چھ سات صدی پہلے کی ہوگی، وہی ہر بات میں حدیثوں کا تذکرہ، وہی ایک ایک لفظ کی تحقیق پر موشگافیاں، وہی رجالِ روایت کی چھان بین اور کرید جو کبھی ہمارے اسلاف بالخصوص محدثین کا طرۂ امتیاز تھا، حضرت مولانا بھی ٹھیک اسی نہج پر سوچ رہے تھے اور اپنے علمی کارنامے انجام دیتے رہے۔ قدیم محدثین جس طرح دنیا کی تمام دلچسپیوں سے صرف نظر کرکے صرف قلم کاغذ اور دوات کے ہوکر رہ گئے تھے، انقلابات آتے رہے، حکومتیں بدلتی رہیں، ایوان خلافت ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنتا رہا، کوئی پستی اور گمنامی کے غار سے نکال کر حکومت کے اعلیٰ منصب پر فائز کیا جارہا ہے اور کسی کو بام ثریا سے اتار کر تحت الثریٰ میں دفنایا جارہا ہے، اہل علم پر عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔ ہجرت اور روپوشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیے جارہے ہیں، لیکن سارے خلفشار کے باوجود علوم نبوت کے دیوانے اپنے خس پوش مکانوں میں چراغ جلائے احادیث لکھ رہے ہیں، اس کی صحت وضعف کا فیصلہ کررہے ہیں، اس کی سندوں کا تجزیہ کررہے ہیں، کون ثقہ ہے کون ضعیف؟ کون کذاب اور وضاع ہے؟ اور کون منکر روایتیں بیان کرتا ہے؟ ان کو اپنے جھونپڑے سے باہر اٹھنے والے طوفانوں کی خبر تک نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے مولانا اعظمی بھی شاید اسی دور کے ایک بزرگ تھے جو اس صدی میں پیدا ہوئے، تصحیح متون اور تعلیق وتحشیہ تو صرف اسی علمی بصیرت کے نتیجہ میں تھی جو علم حدیث کے سلسلہ میں آپ کو حاصل تھی، بقیہ صفحہ ۱۹ پر

---

(۱) ترجمان الاسلام میں یہ مضمون ''حرف آغاز'' کے عنوان سے تھا، رسالہ ہذا کا اداریہ بھی چونکہ ''حرف آغاز'' کے عنوان سے ہوتا ہے، اس لیے ترجمان الاسلام کے اس مضمون کا عنوان تبدیل کرکے یہ عنوان رکھا گیا ہے، اس مضمون کے آخر میں جو شعر مذکور ہے اسی کی مناسبت سے یہ عنوان اختیار کیا گیا ہے۔ (ادارہ)

☆ مہتمم دارالعلوم، دیوبند

سخنہائے گفتنی

مولانا نظام الدین اسیرؔ ادروی ☆

حالات اور ماحول تاریخ ساز شخصیتوں کی تخلیق میں اہم رول ادا کرتے ہیں، حوادث اور آلام ومصائب کا کالا غبار جب فضاؤں پر چھا جاتا ہے، مشکلات اور دشواریوں کی شب دیجور امنگوں اور حوصلوں پر سیاہ چادر بن کر چھا جاتی ہے؛ تو علم وعمل کے آسمان پر ان گنت ستارے جگمگانے لگتے ہیں، ان کی ہلکی ہلکی کرنیں بتدریج اس سیاہ چادر کر چھلنی بناتی رہتی ہیں اور پھر صبح بیداری علم وعمل کے دمکتے ہوئے سورج کے استقبال کے لیے تیار ہوجاتی ہے اور پھر ہر طرف جھما جھم روشنی برسنے لگتی ہے، ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء پر تمام ہوتی ہوئی صدی پر نظر ڈالئے، کون سی مصیبت ہے جو مسلمانوں پر نہیں ٹوٹی، اور کون سی قیامت ہے جو ان کے سروں پر نہیں گذری؛ لیکن اس نوے سالہ دور میں جتنی عظیم المرتبت شخصیتیں پیدا ہوئیں، پچھلی کئی صدیوں میں اس کی مثال نہیں ملتی، صف بہ صف قد آور شخصیتیں ملیں گی، علماء ومشائخ قطار در قطار نظر آئیں گے، خانقاہوں میں اوراد سحر گاہی کے لاہوتی نغمے گونج رہے تھے، مدارس کی چہار دیواریاں قال اللہ وقال الرسول کی زمزمہ سنجیوں سے معمور تھیں، ایسا محسوس ہونے لگا جیسے جسد ملت میں ایک نئی روح دوڑنے لگی، یہ وہ علماء ومشائخ تھے جنھوں نے ہندوستان کی مذہبی تاریخ پر زبردست اثر ڈالا، اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی محدث جلیل حضرت العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی ذاتِ گرامی تھی، جو ۱۶؍ مارچ ۱۹۹۲ء کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کرگئی، ان کے سفر آخرت کے بعد ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے **لَعَلَّ اللّٰہَ یُحدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْراً**.

....

محدث اعظمی کا علم وفضل، حدیث وعلوم میں ان کا درجۂ کمال، ان کی فقہی بصیرت ہر شک و

☆ سابق مدیر مجلّہ ترجمان الاسلام (سہ ماہی) بنارس۔

شبہہ سے بالاتر تھی، وہ احادیث نبوی کے مزاج داں، رمز شناس تھے؛ ان کی نگاہ دقیقہ رس، ان کا ذہن رمز شناس تھا؛ انھوں نے اپنے علمی سفر میں ایسے نقوش قدم چھوڑے ہیں جو مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوں گے، اہل علم ان کی روشنی میں اپنا علمی سفر پورے یقین واعتماد کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے، مولانا مرحوم نے بڑی حد تک گمنامی کی زندگی بسر کی، لیکن یہ گمنامی عوامی زندگی تک محدود تھی، اکابر علماء ومشائخ اور مشاہیر اہل علم کی مقدس محفلوں میں ان کا نام ہمیشہ عظمت واحترام سے لیا جاتا رہا، ان کے سامنے اعزاز واکرام کی اونچی سے اونچی کرسی پیش کی گئی، بلند ترین منصبوں کی پیش کش کی گئی، لیکن انھوں نے ان کی جانب ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور نہایت بے نیازی کے ساتھ اپنے گوشۂ خلوت کی طرف لوٹ آئے، ان تمام پیشکشوں کے باوجود وہ کبھی بھی کسی مشہور اور ہمہ گیر شہرت کے مالک ادارے سے وابستہ نہیں رہے، وہ حتی الامکان ایسے بلند منصبوں سے دامن کش رہے جو راتوں رات ان کی شہرت کو شہپر جبریل عطا کردے۔

ان کے غیور دل نے تواضع اور انکساری کی چادر اوڑھ کر گمنامی کی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی اور شہرت اور نام ونمود کی قباء زرنگار کو ان کے دل کے کسی گوشے میں ایک لمحہ کے لیے بھی وقعت واعتبار حاصل نہ ہوسکا، لیکن اس کے باوجود ان کی ہمالیائی شخصیت علمی وفنی مجلسوں میں ہمیشہ انتہائی مرعوب کن رہی، ان کے آستانۂ علم وتحقیق پر ہر سر خم، اور ہر گردن جھکی ہوئی نظر آئی۔

....

اگر کسی فقہ اکیڈمی میں کسی مسئلہ پر دھواں دھار بحثیں چل رہی ہوں، دلائل وبراہین کے قد آور مجسمے کھڑے کیے جارہے ہوں، فقہی بصیرت کے جوش میں بحث کرتے ہوئے کوئی زبان نہ رکتی ہو نہ تھکتی ہو، اسی ماحول میں ان کے کانوں میں چپکے سے کہہ دیا جائے کہ محدث اعظمی یہاں آگئے ہیں، تو یک بیک پُرشور مجلس پر شہر خموشاں کا سناٹا چھا جائے گا، دلائل وبراہین کے اچھلتے کودتے مجسمے لاشۂ بے جان اور جسد بے روح بن کر رہ جائیں گے، اور جوش وخروش کا پارہ یک بیک نازل ہوجائے گا؛ کیوں کہ محدث اعظمی کی فقہی بصیرت اور ان کی ہمالیائی شخصیت کے سامنے نہ کسی زبان میں یارائے تکلم رہ جائے گا اور نہ ہونٹوں کو مجال گفتگو۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تجربات ومشاہدات کی روشنی میں کہہ رہا ہوں، دو درجن علماء وفقہاء

نے لکھنؤ میں کچھ خاص مسائل پر تین دنوں کی بحث اور مذاکرہ کے بعد کچھ محقق ومدلل اور متفقہ فیصلے کیے، اور اس کے درست اور برحق ہونے پر ہر ایک کو ان کی فقہی بصیرت نے مطمئن کر دیا تھا؛ لیکن جب یہی متفقہ فیصلہ حضرت محدث اعظمی کی خدمت میں تصویب کے لیے پیش کیا گیا، تو چند جملوں میں یہ محققانہ فیصلہ تار عنکبوت ثابت ہوا، جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا، مولانا اعظمی کا فیصلہ حرف آخر ثابت ہوا، جن لوگوں کے سامنے اپنے نقطۂ نگاہ پر دلائل وبراہین کا انبار تھا وہ گرد غبار کی طرح ہواؤں میں اڑ گیا، اور پیاسے کے لیے سراب ثابت ہوا، اور خود فیصلہ کرنے والوں نے پوری بشاشت کے ساتھ اس فیصلہ کو قبول کیا۔

....

بات پر بات یاد آ رہی ہے، ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند سالانہ اجلاس سہارن پور میں ہوا، اس میں دوسرے مسائل کے ساتھ امارت شرعیہ کا نظام قائم کرنے کا مسئلہ پیش ہوا، ورکنگ کمیٹی ایک مسئلہ پر متفق ہوگئی، مگر علماء سہارنپور کو دلائل کی بنیاد پر اس سے اختلاف تھا اور یہ اختلاف تحریری طور پر ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش بھی کر دیا گیا، ارکانِ عاملہ میں برہمی پیدا ہوگئی، علماء سہارنپور اور مجلس عاملہ دونوں کو اپنے اپنے نقطۂ نگاہ پر اصرار تھا، اور محاذ آرائی کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا، جلسہ کی صدارت دنیائے اسلام کی ایک مقتدر شخصیت انجام دے رہی تھی، وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی، صدر نے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے اس فیصلہ کو کالعدم قرار دے کر آئندہ کے لیے ملتوی کرنے کا حکم دیا اور یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کرائی کہ جمعیۃ علماء کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے جب بھی کوئی فقہی مسئلہ پیش ہو تو محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی سے استصواب کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا، یہ تجویز پوری مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر منظور کی جب کہ مولانا اعظمی اجلاس میں موجود بھی نہیں تھے۔ یہ مولانا اعظمی کی فقہی بصیرت پر کلی اعتماد اور ان کے فضل وکمال کا اعتراف کئی درجن عظیم المرتبت علماء ومشائخ کی مجلس میں کیا جا رہا ہے اور کسی کو اس سے مجال اختلاف نہیں تھا۔

....

جب بات امارت کی چل پڑی ہے تو ایک بات اور بھی عرض کر دوں، پچھلے چار پانچ برسوں

میں نظام امارت قائم کرنے پر بڑی سرگرمی سے غور کیا جانے لگا تھا، ہندوستان کی ایک موقر تنظیم نے اس کی تفصیلات پر غور کرکے امیر الہند کے انتخاب کا فیصلہ کرلیا، جمعیۃ علماء ہند بھی ہندوستان میں امارتِ شرعیہ کے قیام کے امکانات کا جائزہ لے رہی تھی، دوسری تنظیم نے تین ماہ بعد کی ایک تاریخ مقرر کردی کہ اس تاریخ میں کل ہند اجتماع بلاکر اس میں ہندوستان کے لیے ایک امیر کا انتخاب کیا جائے گا، جمعیۃ علماء چونکہ عرصہ دراز سے اس مسئلہ پر غور کررہی تھی اور بار بار مجلس عاملہ کے سامنے یہ مسئلہ آتا رہا، اس نے بھی ایک امیر الہند منتخب کرنے کا فیصلہ کرلیا اور ایک ماہ کے اندر ایک نمائندہ اجلاس دہلی میں بلاکر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کو امیر الہند کے اس عظیم منصب پر جوش وخروش سے بھری ہوئی فضا میں بٹھادیا۔

دوسری تنظیم نے جب اپنا کل ہند اجتماع مقررہ تاریخ پر کیا اور اس میں امیر الہند کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا، تو اس شخصیت کی تلاش ہوئی جس کے فضل وکمال اور علم وتحقیق اور فقہی بصیرت پر مکمل اعتماد کیا جاسکے اور سارے ملک کو اس پر متفق کیا جاسکے، جب جستجو کی نگاہیں پورے ہندوستان کا جائزہ لینے کے بعد تھک گئیں اور ایسی قد آور شخصیت کوئی نظر نہیں آئی تو انتخاب امیر کے مسئلہ کو غیر معین مدت تک کے لیے ملتوی کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا، یہ التوا ضابطہ کا التوا تھا؛ کیونکہ بلا استثناء ہر دل کہہ رہا تھا کہ اب امیر الہند کا ہماری طرف سے انتخاب بے معنی ہے۔ جب سورج طلوع ہوگیا تو پھر چراغ جلانے سے کیا حاصل؟

....

مولانا اعظمی از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور شاید چار دہائیوں تک رہے، ارکان شوریٰ میں ہر ایک علم وفضل، علم وتحقیق اور زہد وتقویٰ اور علمی بصیرت میں اپنا اپنا ایک مقام رکھتا تھا، اس لیے جب ارکان شوریٰ دارالعلوم میں جمع ہوجاتے تھے تو پورے ملک میں آسمان فضل وکمال کے جتنے درخشندہ ستارے تھے وہاں جمع ہوجاتے، تو ایسا محسوس ہوتا کہ علم وفن کی ایک کہکشاں طلوع ہوگئی، مولانا اعظمی بھی اسی درخشاں کہکشاں کے ایک روشن وتابندہ ستارے تھے، ہر ستارہ کی اپنی چمک دمک اور آب وتاب تھی، یہ سب ستارے مل کر ایک جگمگاتی ہوئی کہکشاں کی شکل اختیار کرلیتے تھے؛ لیکن ایسا بہت ہوتا تھا کہ مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوتا تو مسندِ صدارت پر مولانا اعظمی ہی رونق افروز ہوتے تھے؛ کیونکہ سارے ستاروں میں سب سے تابندہ تر ستارہ کی حیثیت آپ کی شخصیت تسلیم کی جاچکی تھی۔

محدث اعظمی کی فقہی بصیرت اہل علم میں اُسی طرح ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی جس طرح حدیث اور علوم حدیث میں آپ کا فضل وکمال مسلّم تھا دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم کا منصب ہندو پاک اور بنگلہ دیش ہی نہیں، بلکہ سارے عالم اسلام میں اپنی ایک عظمت اور امتیاز رکھتا تھا، اس عظیم منصب پر کبھی مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی فائز تھے اور کبھی مفتی اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندی رونق افروز تھے؛ لیکن ایک وقت آیا کہ اس عظیم منصب کے لیے کسی عظیم شخصیت کی تلاش ہوئی جو اس بلند منصب کے شایان شان ہو، تو اہل علم، اکابر علماء اور مشائخ کی نگاہ انتخاب محدث اعظمی پر پڑی؛ لیکن اسی کے ساتھ ان اکابر کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ وہ شخصیت ہے جو اپنے خام اور سفالہ پوش مکان کی کچی زمین پر چٹائیوں کے فرش پر بیٹھ کر بھی شاہانہ مزاج رکھتی ہے، استغناء اور بے نیازی اس کا جوہر ذاتی ہے، اس کی طرف سے طلب اور درخواست کا تصور بھی ناممکن ہے، اس کے آستانے پر حاضر ہو کر اس کو راضی کرنا بھی کچھ آسان نہیں ہے، مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ جن کی دیدہ وری نے ان کو حکیم الامت کا خطاب دلایا تھا، وہ دقیقہ رس اور نکتہ بیں نگاہوں کے مالک تھے، انھوں نے اس جوہر قابل کو پہچانا اور ہر قیمت پر ان کو دارالعلوم میں لانے کی تدابیر اختیار کی، کیونکہ انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ہندوستان میں کوئی شخص اس عظیم ذمہ داری کو اٹھا سکتا ہے تو وہ مولانا اعظمی ہی ہو سکتے ہیں، اگر وہ اس منصب پر آجاتے ہیں تو اس منصب کی عظمت میں اور اضافہ ہو سکتا ہے، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں حضرت مولانا اعظمی کے یہاں تشریف لانے کا پروگرام طے ہو گیا، وہ شیخ الاسلام جن کی جوتیاں سیدھی کرنی ہزاروں علماء اپنے لیے ذریعہ عزت وافتخار سمجھتے تھے، ان گنت مدارس کے شیوخ حدیث اور دوسرے اہل علم جس شخصیت کی راہ میں دیدۂ ودل فرش راہ کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ تھے، وہ شخصیت شریک سفر تھی، ہزاروں ارادتمند حیرت زدہ کہ آخر وہ کون سی ایسی عظیم شخصیت ہے جس کے لیے خود حضرت شیخ الاسلام زحمتِ سفر برداشت کر رہے ہیں، آستانہ مدنی سے وابستہ علماء ومشائخ زبان حال سے کہہ رہے تھے ؎

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو   تو کجا بہر تماشا می روی؟

لیکن جوہر کو جوہری پہچانتا ہے، ان دونوں بزرگوں نے مولانا اعظمی کے سامنے اپنا مقصدِ سفر ظاہر کیا؛ لیکن عہدہ ومنصب کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر خدمتِ

حدیث نبوی کو آپ نے ترجیح دی، اور معذرت فرمادی، ہندوستان کی ان دو مایہ ناز شخصیتوں نے مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کے عظیم منصب کی پیشکش کر کے اس حقیقت کا اظہار فرمادیا کہ عہد حاضر میں مولانا اعظمی جیسا کوئی فقیہ اور صاحب بصیرت عالم ہندوستان کی سرزمین پر نہیں ہے، یہ اعتراف ہزاروں صفحات کی مدح سرائیوں سے کہیں زیادہ قیمتی اور جامع ہے۔

....

یادوں کا سلسلہ ابھی کچھ اور دراز ہے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث کا منصب اپنی خصوصیات وامتیازات کی وجہ سے سب سے اہم ہے اور سب سے عظیم منصب ہمیشہ سے شمار کیا جاتا رہا ہے، ہندوستان کی مایہ ناز شخصیتوں نے اس منصب کو سنبھالا اور اس کا حق ادا کردیا، اس عظیم منصب پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور آخر میں فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمہ اللہ نے زینت بخشی اور اس منصب کو مزید وقار وعظمت عطا کیا، اس سنہری زنجیر کی ہر کڑی طلاء ناب کی ہے اور زر خالص ہے، حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سفر آخرت اختیار فرمایا تو اربابِ شوریٰ نے پورے ہندوستان پر نظر ڈالی؛ لیکن ہر طرف سناٹا ہی سناٹا نظر آیا، حالانکہ علم وفضل کی مسندیں آباد تھیں، حدیث نبوی کی زمزمہ سنجیاں مدارس کی چہار دیواریوں میں سنی جارہی تھیں؛ لیکن یہ مدارس علاقائی تھے، اور شیخ الحدیث کی تلاش ہے ایک بین الاقوامی یونیورسٹی کے لیے ایک بار نگاہیں اس سلسلۃ الذہب کی طرف جارہی ہیں جس زنجیر کی پہلی کڑی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی ہے اور اس کی آخری کڑی فخر المحدثین کی ذاتِ اقدس، نگاہ جستجو حیراں اور متحیر، اور کہہ رہی ہے

ع ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

نگاہیں ہندوستان کی شمال وجنوب اور مغرب ومشرق کی سرحدوں تک کا جائزہ لے کر واپس لوٹیں، تو مجلس شوریٰ کے اس فرد جلیل پر آکر مرکوز ہوگئیں جس کو علمی دنیا محدث جلیل، محدثِ عصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے نام سے جانتی ہے، جس کا غلغلۂ شہرت ہندوپاک کی سرحدوں سے گذر کر حجاز کے ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے وادی نیل تک پہنچ چکا ہے، اس منصب کو قبول کرنے کی سفارش کی گئی کہ آپ اس منصب کو قبول فرما کر ہماری مشکل کو حل فرمائیں؛ لیکن وہی بے نیازی، وہی شانِ

استغناء بلند منصوبوں سے احتراز اور دوری، اپنے چٹائیوں کے فرش کو اطلس وکمخواب پر ترجیح دینے والے کی تواضع اور خاکساری نے نہایت نرم لفظوں میں معذرت کر دی، خدمت حدیث نبوی اور گوشۂ تنہائی یہی دونوں حاصل زندگی بن کر رہ گئے۔

....

اب تک طائرِ فکر ہندو پاک کی سرحدوں میں محصور رہا، اب شہباز فکر کو عرب دنیا کی فضاؤں میں پرواز کا موقعہ دیا جائے۔ حجاز اور شام کا نامور عالم، علماء احناف کا سرخیل، حدیث وعلوم حدیث کا ماہر کامل جس کو علمی دنیا شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے نام سے خوب جانتی اور پہچانتی ہے، جنھوں نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی الرفع والتکمیل جو نول کشور پریس سے صرف ۳۰ صفحوں میں شائع ہوئی تھی، اس کو پھیلایا تو ۳۹۴ صفحات میں علوم ومعارف کے لعل وجواہر بکھیر دیئے، مولانا ظفر احمد تھانوی نے اعلاء السنن پر جو مقدمہ لکھا تھا اس کو تعلیق وتحشیہ سے آراستہ کرکے ایک مستقل اور جامع کتاب بنا دیا، ان دونوں کتابوں کو ان کے کلکِ گہر بار نے ابن الصلاح کی ''علوم الحدیث'' اور ابوعبداللہ الحاکم کی ''معرفۃ علوم الحدیث'' کے ہم پلہ اور ہم سر بنا دیا، اور جب درس حدیث کے لیے مملکت سعودیہ کی یونیورسٹی میں بیٹھے تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ جوامع الکلم کی عملی تفسیر پیش کر دی اور اپنے علم وفضل سے مصر وحجاز کی علمی فضاؤں کو علوم ومعارف کی خوشبوؤں سے بھر دیا، اور جب انھوں نے سفر ہندوستان کا ارادہ کیا تو ان کے مقاصد سفر دو تھے ایک فخر ہندوستان مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی قبر پُر انوار واقع انوار باغ لکھنؤ پر حاضر ہوکر فاتحہ خوانی، اور دوسرے محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی سے شرف ملاقات اور سند حدیث واجازت لینے کا جذبہ۔ عبدالفتاح ابوغدہ ہندوستان تشریف لائے اور اپنے دونوں مقاصد میں کامیاب ہوئے، پہاڑیوں سے گھرے ہوئے علاقے میں رہنے والا ایک عظیم اور قدآور عالم جب ہندوستان آیا تو ہمالیہ کی بلندی کا صحیح اندازہ ہوا اور مولانا اعظمی کی ہمالیائی شخصیت کی آستاں بوسی کو اپنے لیے سرمایۂ فخر تصور کیا اور مولانا اعظمی کی زندگی کے اخیر لمحہ تک اس عقیدت وارادت اور تعلق کو نہ صرف اپنی ذات تک محدود کرکے باقی رکھا؛ بلکہ اپنے علمی دوستوں اور اپنے صاحبزادے کے لیے اجازت حدیث کی درخواست بھی کی، محدث اعظمی کے نام حضرت شیخ کے خطوط کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں محدث اعظمی کو کتنا بلند مقام حاصل تھا۔

سرزمین مصر ہمیشہ سے علم وفن کا گہوارہ رہی، یہاں ہر دور میں تاریخ ساز شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں، عصر حاضر میں ایک اور عظیم شخصیت پیدا ہوئی، جس نے مشہور مفسر ومؤرخ طبری کا جذبہ اور حوصلہ پایا تھا، طبری نے اپنے تلامذہ سے کہا کہ میں ایک تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، جو تیس ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی، شاگردوں نے عرض کیا کہ ہمتیں پست ہوگئی ہیں، جذبہ علمی سرد پڑتا جارہا ہے، اتنی ضخیم کتاب کون پڑھے گا؟ کچھ دنوں کے بعد جب تفسیر مکمل کر چکے تھے، اپنے تلامذہ کے سامنے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ میں ایک مفصل اسلامی تاریخ قلم بند کرنا چاہتا ہوں، اس کے تیس ہزار صفحات ہوں گے، طلبہ نے پھر وہی عذر کیا تو انھوں نے مجبوراً اپنی تفسیر مختصر کر کے چار جلدوں میں لکھی اور اپنی تاریخ مختصر کر کے ۱۳ جلدوں میں تمام کردی۔ جدید مصر کے ایک محقق عالم احمد شاکر طبری ہی کا حوصلہ لے کر اٹھتے ہیں اور مسند احمد بن حنبل کی شرح کا آغاز اسی جذبے اور حوصلے کے ساتھ کرتے ہیں، معلوم نہیں کتنی جلدوں تک پہنچانا چاہتے تھے، مگر پندرہ جلدوں تک پہنچتے پہنچتے سفر آخرت کا مرحلہ سامنے آ گیا اور کتاب نامکمل رہ گئی۔

یہی مصر کے محقق عالم ایک دن اپنے تصنیفی مشغلہ میں مصروف تھے کہ ان کو ایک گمنام عالم کا لفافہ ملا، کھولا تو اس میں ان کی شائع شدہ جلدوں میں ان کے تسامحات کا مفصل و مدلل تذکرہ تھا۔ یہ تبصرہ، یہ تنقید اتنی عالمانہ اور محققانہ تھی کہ احمد شاکر حیرت زدہ رہ گئے، انھوں نے اپنی کتاب پر نظر ثانی کی، ان استدراکات میں بڑا وزن محسوس ہوا، کوئی مصنف اپنی تصنیف پر نکتہ چینی اور اعتراض برداشت نہیں کرتا، مگر شیخ احمد شاکر کے خلوص اور جذبۂ تحقیق اور تلاشِ حق کی داد دیجئے کہ ان اعتراضات کو اسی گمنام عالم کے لفظوں میں اپنی کتاب میں نقل کیا اور داد تحسین سے نوازا، ان کا شکریہ ادا کیا اور اس گمنام عالم کو شکریہ کا خط لکھ کر درخواست ہی نہیں کی؛ بلکہ تقاضا کیا کہ مزید جلدوں کو پڑھ میری غلطیوں پر متنبہ کیا جائے، تو میں ممنون ہوں گا۔

وہ گمنام عالم کون تھا؟ وہ یہی محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ تھے، جو اس وقت مفتاح العلوم شاہی مسجد کٹرہ کی پوربی دیوار سے متصل ایک نہایت ہی بوسیدہ خام سفالہ پوش چھوٹے سے کمرے میں علوم ومعارف کے جواہر لٹا رہے تھے، اور حجاز ومصر کے اہل علم کے سامنے ابھی کوئی تحقیقی کارنامہ نہیں آیا تھا، یہ تو اس دور کے بہت بعد کا واقعہ ہے کہ قدیم مخطوطات کو آپ نے تعلیق

وتحشیہ سے آراستہ کر کے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا۔

....

حضرت محدث اعظمی کی ذات لعل بدخشاں تھی، جتنی ہی تاریکی میں رکھا جائے گا، اتنی ہی اس کی چمک دمک اور آب وتاب میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ خود اس ظلمت کدہ کو بقعۂ نور بنادے گا، محدث اعظمی کی ذات گرامی بھی کچھ ایسی ہی تھی، ساری زندگی گوشۂ خلوت میں بڑی حد تک گمنامی کی زندگی بسر کی؛ مگر وہیں سے وہ مملکت علم وتحقیق میں حکمرانی کر رہے تھے، ان کے نام کا سکہ چلتا تھا، ہر شخص ان کا نام عظمت واحترام سے لیتا تھا، اکابر علماء نے ان کے قد وقامت کو ناپا اور مرعوب ہوئے۔ ان کے علم، ان کے فضل وکمال کو جانچا پرکھا تو متاثر ہوئے، ان کے مقام ومرتبہ کی بلندیوں کی جانب نگاہیں اٹھائیں، تو سروں سے دستار فضیلت گرگئی۔

یہ علم، یہ فضل، یہ کمال، اور ان کے سینہ میں علوم ومعارف کا پوشیدہ خزانہ خداداد تھا، موہبت الٰہی تھا، ایسی شخصیتیں تاریخ میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں، تاریخ وہ خود بناتے ہیں، اس لیے تاریخ ان کو خود ہمیشہ یاد رکھنے پر مجبور ہوتی ہے۔

....

ہم اس شمارے میں جدید وقدیم تعلیمی اداروں کے ارباب علم وفضل کے کچھ خطوط اور تاثرات شائع کر رہے ہیں جو انھوں نے ''مولانا اعظمی نمبر'' کے مطالعہ کے بعد ہمیں ارسال فرمائے ہیں، ہم ان کے ممنون کرم ہیں، کہ انھوں نے ہماری حوصلہ افزائی کے لیے اپنے تاثرات قلم بند کر کے ہمیں ارسال کرنے کی زحمت فرمائی۔ کہاں آسمان علم وفضل کے وہ آفتاب وماہتاب! کہاں ہم ذرۂ بے مقدار! یہ صرف اعظمی نمبر کا فیض ہے:

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی!

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اوران کاعلمی مقام

تحریر: شیخ نورالدین عتر ترجمہ: مسعود احمد الاعظمی

[فضیلۃ الشیخ الدکتور نورالدین عتر مشہور شامی عالم ومحقق ہیں، جامع ازہر کے فضلاء میں سے ہیں اور دمشق یونیورسٹی میں تدریس کی خدمت انجام دیتے ہیں، علم حدیث ان کا خاص موضوع ہے، اوراس فن میں ان کی متعدد بیش قیمت اور تحقیقی کتابیں اہل علم وفن سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں۔

شیخ نورالدین عتر حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے گہری عقیدت رکھتے ہیں، علم حدیث میں حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے سند اجازت حاصل کی ہے، اور اس وقت اپنی زیرنگرانی حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی بے نظیر کتاب الحاوی لرجال الطحاوی کی تحقیق کرارہے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے عظیم استاذ اور مہتمم اور عربی ماہنامہ البعث الاسلامی کے فاضل مدیر مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی کی عربی تصنیف ''محدث الہندالکبیر'' کچھ عرصہ پیشتر شام سے شائع ہوئی ہے۔ شیخ نورالدین عتر نے اس کتاب پرایک جامع اور پرمغز مقدمہ لکھا ہے۔ سطور ذیل میں ان کے مقدمے کا ترجمہ شائع کیا جارہا ہے، تاکہ اردوداں حضرات بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔]

ہمارے شیخ (مولانا) حبیب الرحمٰن الاعظمی حدیث شریف اور علم دین کے حامل، شریفانہ مزاج رکھنے والے مثالی اہل علم میں تھے، جوانوں کا سا حوصلہ اور نشاط رکھتے تھے، بزرگوں کے وقار اور ان کی دوراندیشی سے بہرہ مند تھے، تحصیل علم میں محنت کی اور فائق رہے، پھر پوری قدرت ومہارت اور امتیازی شان کے ساتھ علم دین کی خدمت اوراس کے نشرواشاعت میں مصروف رہے۔

پروپیگنڈوں اور بلند وبانگ دعووں کے اس دور میں اہل علم احترام وعقیدت کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے، اہل علم کوآپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد کھوکھلے دعووں اور عُجب وخود پسندی سے دوچار نہیں ہونا پڑتا تھا، بلکہ وہ علم کے ایک ایسے بحر بے کراں کے سامنے ہوتے جس کی شخصیت بے پناہ تواضع اور حکیمانہ وقار سے آراستہ تھی۔

آپ کے علمی کارنامے میری ان باتوں کی بلکہ اس سے زیادہ کی گواہی دیں گے۔

ہم اپنے شیخ محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات میں سنجیدگی اور وقار کے دوش بدوش علمی منہجیت کو واضح طور پر دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، جس کی طرف اس بیش قیمت کتاب کے مؤلف شیخ سعید الاعظمی نے بجا طور پر توجہ مبذول کرائی ہے، چنانچہ لکھا ہے:

''علامہ اعظمی علیہ الرحمہ کی نشو ونما ایسے دور میں ہوئی جب علم وتحقیق اور تصنیف کے وسائل کو فروغ نہیں حاصل ہوا تھا، اس کے باوجود آپ نے توفیق الٰہی سے اپنی فکری اور علمی صلاحیتوں کو حدیث شریف کے خزانوں کو گوشۂ گمنامی سے نکالنے، علم وتحقیق کے آبدار موتیوں اور تابناک جواہر پاروں کو منظر عام پر لانے، اور بازار علم ومعرفت میں سجانے اور اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے میں صرف کردی، تاکہ علم کے شیدائی ان کی طرف توجہ کریں اور ان کو حاصل کر کے کسی خوشنما زیور کی طرح ان سے اپنے گریبان کو آراستہ کرلیں، اوران سے دنیا کے بڑے اور وسیع وعریض مکتبات مزین ہوجائیں''۔

شیخ نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں بھی آپ کو ان کی ایک نئی اور نمایاں راہ نظر آئے گی، اس کی سب سے روشن اور واضح مثال آپ کی عظیم الشان تصنیف (**الحاوی في رجال الطحاوی**) ہے، اس کتاب میں شیخ نے امام طحاوی کے ان رجال کو یکجا کر دیا ہے جو ان کی کتاب (**شرح معاني الآثار**) اور (**شرح مشکل الآثار**) کی سندوں میں آئے ہیں، یہ ایک عظیم کارنامہ ہے، جس کی تحقیقی خدمت کی اللہ تعالیٰ نے ہم کو توفیق عطا فرمائی، اس کتاب کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں ان دونوں عظیم الشان کتابوں کے رجال کو جمع کیا ہے، یہ وہ کارنامہ ہے جو ہمارے علم کے مطابق آپ سے پہلے نہیں انجام دیا گیا ہے، مگر اس کارنامے کے باوجود مصنف کو کہیں بھی شیخی بگھارتے ہوئے اور لمبے چوڑے دعوے کرتے ہوئے نہیں پاؤ گے، نہ اس کتاب میں، اور نہ آپ کی کسی دوسری کتاب میں، بلکہ آپ کے اوپر تواضع ایسا غالب تھا کہ آپ نے ایک مختصر سے مقدمے پر اکتفا کیا، اگرچہ ہماری حسرت یہ ہے کہ کاش شیخ حبیب الرحمٰن رحمہ اللہ نے اپنے اس کام کے متعلق تفصیل سے گفتگو فرمائی ہوتی، تو ہم کو اس کے تحقیق ومطالعے میں اس سے مدد ملتی، اوراس کی افادیت اور بڑھ گئی ہوتی۔

ان سب کے بعد اگر قارئین کرام غور فرمائیں علامہ کبیر حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے ان کے ہم عصروں کے ساتھ علمی مباحثوں کو، تو ان کے اندر پاکیزگی اور زبان کی پاکبازی کے ساتھ دقت

نظر اور وسعت معلومات نظر آئے گی، جب کہ آپ کے بعض معاصرین کے یہاں طعن وتشنیع اور گستاخانہ الفاظ کا انبار نظر آئے گا، جن سے پوری پوری کتاب بھری پڑی ہوگی، مگر اس وقت میرے پیش نظر موازنہ کرنا نہیں ہے، حاشا وکلا، پاکیزگی اور حملہ آوری، اور زبان درازی وزبان بندی کے درمیان بڑا فرق ہوتا ہے، مثل مشہور ہے (**وبضدها تتميز الأشياء**)۔

جہاں تک زبان واسلوب کا تعلق ہے تو شیخ جلیل حبیب الرحمٰن الاعظمی زبان کی فصاحت اور قوت وشوکت سے بھرپور علمی انداز کے لحاظ سے عرب زبان آوروں پر بھی فوقیت رکھتے تھے، اس کی آپ نے زمانۂ طالب علمی سے مشق بہم پہنچائی تھی، بلکہ زمانہ طالب علمی کے شروع ہی میں عربی زبان پر قدرت نے آپ کو آپ کے اساتذہ کا مرکز توجہ بنا دیا تھا، حالانکہ وہ ایک ہندوستانی ہیں اور ہندوستانیوں کے درمیان نشو ونما پائی ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اور آج کے مدعیان اجتہاد کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے، ان مدعیان اجتہاد کا تمام تر سرمایہ مبتدیوں کی چند چھوٹی چھوٹی کتابیں ہوتی ہیں، جب کہ حضرت علامہ اعظمی کو ان کی تمام تحقیقات وتالیفات میں زبان وادب کے معاملے میں پختہ کار اور راسخ القدم پاؤ گے، بلکہ ان کے فصیح وبلیغ اشعار وقصائد کی وجہ سے عربی ادب میں بھی ان کو فائق پاؤ گے۔

آخر میں ہم شکریہ ادا کرتے ہیں عظیم اسلامی رائٹر استاذ وعلامہ سعید الاعظمی کا کہ انھوں نے سرزمین ہند کے محدث پر تعارفی کتابچہ تیار کیا، درحقیقت یہ مختصر سی کتاب اس عظیم محدث کی حیات (لائف) کا محض عنوان ہے، اس سے ان کے سیرت نگاروں کے لیے آسان ہوجائے گا کہ ان کی کتاب زندگی کی مزید تبویب وتفصیل کرسکیں، پھر ان کی لائف کو مختلف انواع واقسام میں تقسیم کرسکیں، جیسا کہ آج کل سیرت نگاری کا طریقہ ہے کہ شخصیت کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ طلبگاران علم اس جیسی کتاب کے سخت محتاج ہیں، جس سے ان کے سامنے ماضی قریب کا ایک ایسا نمونہ آجائے، جو اس راستے پر چلنے اور اس کی پیروی کے لیے ان کے ہمت وحوصلے کو مہمیز کرسکے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی شخصیت اس قابل ہے کہ اس پر ایک ضخیم اور جامع کتاب لکھی جائے۔ امید ہے کہ تاریخ کا حق ادا کرنے کے لیے اور اس منفرد اور ممتاز شخصیت کے نمونے کو سامنے لانے کے لیے ان سے واقفیت رکھنے والے اس کام کو انجام دیں گے، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے، ان کے مقام کو بلند فرمائے، نبیوں، صدیقوں اور شہداء وصالحین کے ساتھ ان کو جگہ عطا فرمائے۔

محدث جلیل حضرت الاستاذ مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ
نقوش وتأثرات

مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ ☆

یہ درست ہے کہ اس دنیا میں جو آتا ہے، وہ ایک دن اپنے مولا حقیقی سے جا ملتا ہے لیکن ان میں بعض افراد وہ بھی ہوتے ہیں، جن کی جدائی کا غم عالمگیر ہوتا ہے، اس کے نہ ہونے سے دنیائے علم وعمل کی بہار جاتی رہتی ہے اور سارا عالم سوگوار ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک آفتاب تھا جس سے پوری کائنات انسانی پرنور تھی، اس کے جانے سے دنیا تیرہ وتاریک ہوگئی، ایک مرکز ومحور تھا باقی نہیں رہا۔

مولانا کا منصب ومقام:

انھی گنے چنے علماء کرام میں ہمارے استاذ مکرم، محدث کبیر، استاذ العلماء حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی امیر الہند قدس سرہ تھے، تنہا تھے مگر پوری اکیڈمی کا کام انجام دیا کرتے تھے، خاموش تھے مگر تلامذہ کی ایک مستقل جماعت آپ کی درسی تقریر سے اپنے دل ودماغ کو روشن رکھتی تھی، اور خواص وعوام آپ کے عالمانہ بیان سے اپنے عقائد واعمال کو درست رکھتے تھے اور ان کا تعلق رب کائنات سے بڑا مضبوط ہوا کرتا تھا، علم حدیث میں جن کو شغف تھا وہ آپ کو اپنا استاذ اور رہبر تسلیم کرتے تھے، خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، ہندوستان کے ہوں یا پاکستان کے، دوردراز سے علماء آتے اور قیام کرتے اور آپ سے سندِ حدیث حاصل کر کے واپس ہوتے تھے، کسی کو کوئی اشکال ہوتا وہ پیش کرتے اور حضرت والا کی تقریر سے ان کا اشکال منٹوں میں حل ہو جاتا تھا اور وہ خوش وخرم واپس ہوا کرتے تھے، آپ کو ہر فن میں کمال حاصل تھا، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، منطق وفلسفہ، ادب عربی، لیکن ان علوم میں سے آپ کو علم حدیث، اسماء الرجال، جرح وتعدیل اور فقہ فتاویٰ اور ادب عربی سے خاص شغف تھا، آپ کا نابغۂ روزگار علماء میں شمار تھا، قوت حافظہ، اور ذکاوت وذہانت میں آپ منفرد تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساری کتابیں آپ کے ذہن اور دماغ میں محفوظ ہیں جن کو آپ درس کی صورت میں کبھی پڑھا چکے تھے، یا مطالعہ کر چکے تھے۔

☆ مفتی دارالعلوم دیوبند

قلمی کتابوں کا ذوق:

قلمی کتابوں کے مطالعہ کا بڑا اہتمام تھا، جہاں جہاں معلوم ہوتا کہ علم حدیث کا کوئی قلمی نسخہ ہے آپ وہاں ضرور موقع نکال کر تشریف لے جاتے اور وہاں دو چار دنوں رہ کر مطالعہ کرتے، یہی وجہ تھی قلمی ذخیروں کا بڑا وسیع اور گہرا مطالعہ تھا اور وہ سب ذہن میں محفوظ رہتا کہ فلاں کتاب فلاں کتب خانہ میں ہے اور بوقت ضرورت اس سے استفادہ کرتے، اور ان کتابوں کا اپنی تصنیفات میں حوالہ دیتے، اور اخیر زندگی میں تو اپنے کو حدیثی ذخیروں کے ایڈٹ کرنے اور اپنی تعلیق وحواشی کے ساتھ چھپوانے کے لیے وقف کر دیا تھا۔

آپ کی مقبولیت وشہرت:

خاکسار نے پہلی دفعہ حضرت الاستاذ کا نام نامی مئو کے ایک طالب علم سے سنا، جب میں مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں شرح وقایہ وغیرہ کتابیں پڑھ رہا تھا، وارث العلوم چھپرہ ملحق مدرسہ تھا، میرا ارادہ اس سلسلہ کے ترک اور آزاد مدارس میں رہ کر تعلیم مکمل کرنے کا تھا، اس زمانہ میں معلوم کر رہا تھا کہاں جا کر تعلیم جاری رکھی جائے۔ اس ضمن میں مئو کے مدارس کا تذکرہ بھی آیا، مرحوم عبدالعزیز مئوی نے بتایا کہ مفتاح العلوم مئو میں تعلیم بہت عمدہ ہوتی ہے اور اس مدرسہ میں دو مدرس بڑی شہرت کے مالک ہیں ایک مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور دوسرے مولانا عبداللطیف نعمانی، یہ مناظر بھی ہیں اور علم فقہ اور حدیث کے ماہر اور بالغ النظر استاذ بھی، بلکہ معقولات میں بھی یہ حضرات اپنا ثانی نہیں رکھتے، یہ ۱۹۴۰ء جولائی اگست کی بات ہے، رمضان سے پہلے ہمارے اساتذہ نے طے کر دیا کہ بعد رمضان تم مفتاح العلوم چلے جاؤ۔

یہ دور ہندوستان کی جنگ آزادی کا کہنا چاہئے دورِ شباب تھا یہ بھی معلوم ہوا کہ مفتاح العلوم مئو جنگ آزادی میں پیش پیش رہتا ہے۔

انگریزی دور حکومت میں علمی ماحول:

انگریزی دور حکومت میں کہنا چاہئے علمی دلچسپی عام تھی، اور بڑے جید الاستعداد علماء ومشائخ پیدا ہوئے اور انھوں نے بڑی اہم علمی، دینی اور اصلاحی خدمات انجام دیں۔ شاید ایسے علماء اب پیدا نہیں ہوتے، جن کا علمی وقار بلند ہوا کرتا تھا، اور علمی مطالعہ بڑا ہی وسیع وعمیق تھا، جس ماحول میں

ہماری پرورش ہوئی تھی اس نے ہمارے اندر سیاسی سوجھ بوجھ پیدا کر دی تھی، اور انگریزی حکومت کے خلاف تقریر کرنا مشن بن گیا تھا۔

خاکسار کی مئو حاضری:

مختصر یہ کہ رمضان المبارک کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم مئو کی تیاری شروع کر دی گئی، چھپرہ سے مئو کی مسافت کچھ زیادہ نہ تھی، خاکسار کے ہم سفر برادر گرامی مولوی اظہار الحق مرحوم بھی تھے، ان کو بھی وہاں داخلہ لینا تھا، یاد آتا ہے کہ اسٹیشن سے اتر کر ہم دونوں حافظ خلیل صاحب کو پوچھتے ہوئے محلّہ چاند پورہ آئے جو اسٹیشن سے ملا ہوا محلّہ ہے، ان کے نام ہمارے استاذ حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خط دے دیا تھا۔ حافظ صاحب موصوف دار العلوم مئو کے ماننے والوں میں تھے، انھوں نے بہت طرح چاہا کہ مفتاح العلوم کے بجائے دار العلوم مئو میں داخلہ لیں، بلکہ وہ دار العلوم لے گئے اور قاری ریاست علی صاحب سے ملایا، جو وہاں کے مقبول ومشہور استاذ تھے، قاری صاحب کی گفتگو کی مٹھاس اب تک محسوس ہوتی ہے فرمایا کہ دو پیسے کی ہانڈی خریدنا ہوتی ہے تو پہلے اسے انگلیوں سے ٹھوک کر دیکھتے ہیں، پھر خریدتے ہیں یہ تو علمی زندگی کا سوال ہے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا، شہرت پر نہ جانا۔

مگر ذہن اور دماغ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا عبد اللطیف نعمانی کے علمی رسوخ کا غلغلہ گھر کر چکا تھا، لہٰذا داخلہ مفتاح العلوم میں ہی لیا گیا، مولانا اعظمی کا گھر مدرسہ سے قریب تھا اس لیے ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، اور ملاقات کی دولت سے مالا مال ہوئے۔

حضرت کا درس:

مگر عجب بات یہ ہوئی کہ نقشہ اسباق جب سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ ہمارا کوئی سبق بھی ان دونوں اساتذہ میں سے کسی کے یہاں نہیں گیا، بڑی مایوسی ہوئی، اور ذہن کو چوٹ لگی، مگر اب چارۂ کار ہی کیا تھا، یہ پورا سال آرزو اور تمنا میں گذارا گیا۔ دوسرے سال دو اسباق حضرت مولانا اعظمی کے پاس گئے اور ایک مولانا نعمانی کے پاس۔ مولانا اعظمی کے یہاں جلالین اور حماسہ کا سبق تھا اور مولانا نعمانی کے یہاں مختصر المعانی کا۔

پڑھانے کا انداز:

ایک سال میں اندازہ ہو چکا تھا کہ مولانا اعظمی جو ''بڑے مولانا'' کے نام سے مشہور تھے بڑے سخت ہیں، عبارت خوانی ان کے درس میں لوہے کے چنا چبانے سے کم نہیں، کیا مجال کہ کوئی

طالب علم ایک زبر زیر کی غلطی کر کے نکل جائے، اسی طرح ترجمہ میں بھی غلطی برداشت نہیں کرتے تھے، جہاں غلطی ہوئی مولانا کی طرف سے ہوں کی آواز آئی، اگر عبارت ٹھیک ہوگئی، تو کچھ نہیں فرماتے مگر ہوں کے بعد بھی غلطی ٹھیک نہیں ہوتی تو مولانا کی چھڑی اٹھ جاتی تھی اور ساتھ ہی نحوی وصرفی ترکیب وتعلیل کے سوالات شروع ہوجاتے، طالب علم پر کپکپی طاری ہوجاتی۔ اسی وجہ سے جس کو عبارت پڑھنا ہوتی وہ دو چار کتابوں کی مدد سے سارے مسائل حل کر کے جاتا تھا مجھے یاد ہے کہ میرے پچیس ساتھیوں میں شاید کوئی میرے سوا پٹائی سے بچا ہو، میری نحو وصرف غالبًا اچھی تھی، ترکیب بھی صحیح کر ڈالتا، اور صرفی سوالات کے جوابات بھی برجستہ دیتا، اور شاید یہی وجہ ہے مولانا کی توجہ مجھ پر بہت زیادہ تھی، حالانکہ میں بالکل نیا تھا، لیکن مطالعہ جم کر کیا کرتا تھا، ایک کتاب کے حل کے لیے کم از کم تین چار معاون کتابیں بالاستیعاب دیکھا کرتا تھا، سہ ماہی امتحان میں فرمایا کہ جلالین کے ان دو صفحوں کی ترکیب کر جاؤ، تمہارا آج یہی امتحان ہے الحمدللہ میں نے صحیح ترکیب کر کے سنادی۔ حضرت الاستاذ بہت خوش ہوئے، فرمایا تم نے جی خوش کر دیا۔

میں بڑی پابندی سے سبق میں حاضر ہوا کرتا تھا اور عبارت خوانی ساتھیوں نے میرے ہی ذمہ کر دی تھی ہفتہ میں ایک آدھ دن کوئی دوسرا پڑھ لیا کرتا تھا وہ بھی پہلے مجھے عبارت سنا دیا کرتا تھا، حضرت والا اس پابندی اور حاضری سے بھی بہت خوش رہا کرتے تھے۔ جب تک مولانا کی طبیعت اچھی رہتی سبق کبھی ناغہ نہیں فرماتے تھے، خود بھی پابندی فرماتے اور طلبہ سے بھی پابندی کراتے تھے۔

مولانا کا حافظہ:

دیوان حماسہ کے سبق پڑھاتے ہوئے ایک دن فرمایا کہ تم لوگوں میں ادبی شوق وذوق نہیں ہے، اپنا حال سناتے ہوئے فرمایا کہ مجھے خیال ہوا کہ دیکھوں مجھے کتنے عربی اشعار یاد ہیں، تو اپنی یاد داشت سے صرف ردیف الف کے پانچ سو اشعار لکھ گیا، پھر خیال آیا کہ کبر کہیں پیدا نہ ہوجائے یادداشت سے لکھنا بند کر دیا۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ اب پہلے جیسا حافظہ نہیں رہا، میری طالب العلمی میں میرے حافظہ کی شہرت ہوئی، تو ایک شاعر صاحب نے کہا جو مئو ہی کے تھے کہ میں کسی دن امتحان لوں گا پھر مانوں گا۔

مئو میں مشاعرہ ہوا ہی کرتا تھا، ایک مشاعرہ ہوا تو وہ شاعر صاحب اپنے نئے اشعار کہہ کر لے گئے، اور دوسرے شعرا کے ساتھ انھوں نے اپنے اشعار بھی سنائے، میرا نام لے کر جو اشعار ابھی

پڑھے ہیں یہاں آکر سنائے مولانا فرمانے لگے میں مجمع سے نکل کر گیا، فرمایا کہ تم نے میرے اشعار سنے ہیں سناؤ، میں نے کھڑے ہوکر ان کی پوری غزل حرف بحرف پڑھ کر سنا دی، فرمانے لگے اچھا بھائی آج سے میں تمھارے حافظہ کی گواہی دوں گا، اللہ تعالی نے بڑی دولت سے تم کو نوازا ہے۔

چہرہ مہرہ اور حافظہ:

خاکسار کا تجربہ ہے کہ حضرت الاستاذ کا حافظہ اخیر وقت تک ایسا ہی رہا، وفات سے دو ایک سال پہلے تک میں نے دیکھا کہ بیماری کی کمزوری کی وجہ سے تکیہ کے سہارے لیٹے ہوئے ہیں، طلبہ ہدایہ اخیرین کی عبارت پڑھ رہے ہیں، اگر کوئی جملہ غلط ہوتا اور چھوٹتا تو فوراً ٹوکتے حالانکہ آپ کے سامنے کتاب نہیں ہوتی تھی، اور پھر مضمون کو اسی ترتیب سے بیان کرتے تھے، یہی حال حدیث کے اسباق میں ہوتا تھا، حدیث کا بڑا ذخیرہ ذہن میں محفوظ رہتا تھا، اور درسی تقریر میں کوئی پہلو اوجھل نہیں رہنے پاتا تھا۔

خاکسار کا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یادداشت پر اور ظاہری صورت وشکل پر بڑھاپے کا کوئی ادنیٰ اثر نہیں دیکھا گیا، ۱۹۴۰ء میں جس صورت شکل پر پہلی بار میں نے دیکھا تھا، رجب ۱۹۹۲ء یعنی وفات سے دو ماہ پہلے تک میں نے حضرت کو اسی شکل وصورت پر پایا، تکلیف تھی، کمزوری بھی تھی، مگر چہرے بشرے پر اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا، یہی حال قوت حافظہ کا تھا، یہ اللہ کی دین تھی اور علم حدیث سے شغف کی برکت۔

مولانا پر بیماری کا حملہ:

چار سال خاکسار بحیثیت شاگرد حضرت الاستاذ کی خدمت میں رہا ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء بلکہ ۱۹۴۵ء کے نصف تک اخیر میں ایک سال مفتاح العلوم مئو کا ادنیٰ مدرس بنا دیا گیا تھا، مولانا سے میرا رابطہ بڑا گہرا اور مضبوط تھا، میں جب تک مئو میں رہا برابر ادنی شاگرد کی طرح خدمت میں حاضر ہوتا رہا، اور علمی استفادہ کرتا رہا، ان دنوں میں جب مولانا کبھی بیمار ہوا کرتے تھے تو پوری پوری رات جاگ کر خدمت کا شرف حاصل کیا کرتا تھا، عرصہ تک وقفہ وقفہ سے دردگردہ کی حضرت کو شکایت ہو جایا کرتی تھی اور ان دنوں بہت بے چین رہا کرتے تھے، میرے ساتھ دوسرے طلبہ بھی خدمت میں رہا کرتے تھے، اخیر میں آکر مولانا نے اس کا آپریشن غالباً بمبئی میں کرایا، اس کی وجہ سے اس بیماری سے

تو نجات مل گئی، مگر دوسری شکایت دورانِ سر کی شروع ہوگئی، رات میں تو باہر نکلنا بند کر دیا تھا۔ دن میں بھی تنہا کہیں آتے جاتے نہیں تھے، فرماتے تھے ہر آن خطرہ رہتا ہے کہ کہیں گر نہ جاؤں میرے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

> ''واقعی بڑا سخت ابتلا تھا اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ اس نے اس سخت مرحلہ سے سلامتی کے ساتھ گذار دیا، آپریشن میں الحمدللہ کوئی تکلیف وغیرہ نہیں ہے لیکن دورانِ سر کی شکایت اتنی شدید کہ ابھی تک مسجد تک جانے کے قابل نہیں ہوں جسم قابو میں نہیں رہتا''۔
> (مکتوب ۲۳ر ستمبر ۶۹ء)

حضرت کی تعلیم:

حضرت الاستاذ کی تعلیم اپنے وطن مئو میں شروع ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی، اور زیادہ کتابیں عربی کی حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے پڑھیں جو براہ راست حضرت گنگوہیؒ کے شاگرد تھے، دو سال دیوبند میں گذارا، مگر اپنی صحت کی ناموافقت کی وجہ سے کسی سال چھ سات ماہ سے زیادہ نہیں رہ پائے، علم حدیث کا ذوق محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے درس سے پیدا ہوا مولانا فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کا درس حدیث اپنی آپ مثال تھا، طالب العلم ایک سال میں حدیث کی سیکڑوں کتابوں، ان کی فنی حیثیت اور اسماء الرجال سے واقف ہو جاتا تھا، طالب العلم جتنا مطالعہ کرکے جاتا تھا، حضرت شاہ صاحب کے درس میں اس پر نیا اضافہ ہی ہوتا تھا، اور اس سے ذہن کھلتا تھا اور دماغ متاثر ہوا کرتا تھا، حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اپنے اساتذہ میں حضرت کشمیری سے بہت زیادہ متاثر تھے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔

حضرت کا ذاتی بیان:

مولانا اعظمی خود اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں: ''شوال ۱۳۳۷ھ غالباً جولائی ۱۹۱۹ء میں، میں نے دارالعلوم دیوبند پہلی بار داخلہ لیا'' (تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی)

اس سال مدرسہ میں فصلی بیماری پھیل گئی، جس سے طلبہ کافی بیمار ہوئے، سب سے پہلے مولانا عبداللطیف نعمانی اور مولانا عبدالحئی اور مولانا فاروق بیمار ہوکر روانہ ہوئے اور کسی طرح اپنے گھر پہنچے، مولانا لکھتے ہیں:

''اس سال بیماری کا بڑا زور تھا ان لوگوں کے جانے کے ایک ماہ بعد میں بھی بخار میں مبتلا ہوا، میری حالت تشویشناک دیکھ کر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مولوی یعقوب سکروری کے ساتھ مجھے بھی گھر بھیج دیا''

(تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۱)

مظہر العلوم بنارس کی مدرسی:

دسمبر ۱۹۱۹ء مطابق ربیع الاول ۱۳۳۸ھ سے دو تین ماہ بیمار رہے صحت ہوئی، تو حضرت مولانا نے مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں ملازمت کر لی اور دوسرے سال دیوبند دوبارہ نہیں گئے، خود لکھتے ہیں:

''بیماری کی وجہ سے اور اس لیے کہ میں نے فروری ۱۹۲۰ء میں مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں پڑھانے کے لیے پندرہ روپے ماہوار اور کھانے پر ملازمت کر لی تھی، اس وقت مدرس سوم عربی کی تنخواہ پندرہ روپے خشک ہوا کرتی تھی شوال ۱۳۳۸ھ میں دیوبند نہیں جا سکا، شوال ۱۳۳۹ھ میں دوبارہ میں نے دیوبند جا کر دورۂ حدیث میں شرکت کی تو اس سال بھی مولانا عبداللطیف دیوبند پہنچے''۔ (ایضاً)

دیوبند سے واپسی:

حضرت مولانا اعظمی اس سال بھی شوال سے ربیع الاول تک رہ سکے اس سال بھی مولانا کو بخار آ گیا، ادھر تحریک ترک موالات کی وجہ سے پورے ہندوستان کی طرح دیوبند میں بھی ہنگامے بپا تھے جس کی خبریں سن سن کر آپ کے والد بزرگوار پریشان تھے اور چاہتے تھے وطن واپس آ جائے خود لکھتے ہیں:

''ان حالات سے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مشوش اور پریشان تھے، چاہتے تھے کہ واپس ہو جاؤں، اسی اثناء میں مجھے اس سال بھی بخار آ گیا، والد صاحب نے اطلاع ملتے ہی لکھ بھیجا کہ تم مہتمم صاحب سے رخصت لے کر مکان چلے آؤ، چنانچہ صفر یا ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں، میں مئو چلا آیا'' (ایضاً)

دورۂ حدیث کی تکمیل:

صحت یابی کے بعد اپنے شہر مئو کے مدرسہ دارالعلوم میں آپ نے دورۂ حدیث میں داخلہ لے لیا، اس زمانہ میں اس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس حضرت شیخ الہند کے تلمیذ رشید مولانا

کریم بخش سنبھلی تھے ان کے درس میں بیٹھ کر آپ نے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، پھر مولانا سنبھلی ہی سے آپ نے دورہ کے بعد معقولات کی اونچی کتابیں پڑھیں، جن کتابوں کا پڑھنا اس زمانہ میں ضروری سمجھا جاتا تھا، اور جن کے پڑھے بغیر بڑا عالم نہیں بنتا تھا۔

دارالعلوم مئو میں تدریسی خدمات:

تکمیل درسیات کے بعد دارالعلوم مئو ہی آپ کو درجہ علیا کا مدرس بنادیا گیا، جہاں رہ کر آپ نے دوسال تک اونچی کتابوں کا درس دیا، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ نے یہیں آپ سے بہت ساری کتابیں پڑھیں، اور حضرت مولانا محمد حسین بہاری مرحوم نے بھی اور دوسرے مشہور علماء کرام نے، حضرت الاستاذ تحریر فرماتے ہیں:

> ''صحت یابی کے بعد (دیوبند سے واپسی پر) اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا دارالعلوم مئو میں دورے کی کتابیں تمام کرلوں، خوش قسمتی سے مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی دارالعلوم مئو میں تشریف لا چکے تھے، اور ان کے پاس ہمارے صرف ایک رفیق مولوی عبدالمجید صاحب دورہ پڑھ رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ شریک ہوگیا، شعبان ۱۳۴۰ھ میں دورۂ حدیث ختم ہوا، اور شوال ۱۳۴۰ھ میں بصیغۂ مدرسی وہیں میرا تقرر ہوگیا''۔
>
> (تذکرہ مولانا نعمانی ص۱۴)

مظہر العلوم میں صدر مدرس کی حیثیت سے:

دوسال مسلسل آپ نے دارالعلوم مئو میں درس وتدریس کی خدمات انجام دی اور کامیاب مدرس کی حیثیت ان سالوں کو گذارا، ناظم مدرسہ سے کسی بات پر اختلاف ہوگیا تو ۱۳۴۳ھ میں بحیثیت صدر مدرس آپ مدرسہ مظہر العلوم بنارس منتقل ہوگئے، اور چند سال وہاں تعلیمی اور تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

حضرت الاستاذ نے مولانا نعمانی پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں رقمطراز ہیں کہ جس سال آپ دارالعلوم مئو کے مدرس بنائے گئے اس سال مولانا نعمانی کا دورہ تھا جب وہ شعبان ۱۳۴۱ھ میں فارغ ہوئے تو آپ نے ناظم مدرسہ سے کہہ کر ان کو بھی مدرس بنالیا اس کے بعد فرماتے ہیں کہ شوال ۱۳۴۱ھ سے لے کر ۱۳۶۹ھ تک میرا ان کا ساتھ رہا، یہ بھی لکھا ہے:

''ہم دونوں ساتھ ساتھ درس وتدریس، وعظ وتذکیر اور بحث ومناظرہ کی خدمات انجام دیتے رہے درمیان میں صرف چند سال جب کہ میں مظہرالعلوم بنارس میں صدر مدرس ہوگیا تھا وہ مجھ سے اور میں ان سے جدا رہا دارالعلوم مئو سے مستعفی ہوکر میں بنارس چلا گیا، اور میری علیٰحدگی کے غالبا دوسال بعد مولانا عبداللطیف بھی دارالعلوم مئو سے سبکدوش ہوکر سنبھل چلے گئے'' (تذکرہ نعمانی)

مفتاح العلوم مئو میں:

بنارس میں ۱۳۴۲ھ سے لے کر ۱۳۴۷ھ تک آپ کا بحیثیت صدر مدرس قیام رہا اور تدریسی وتعلیمی خدمات انجام دیتے رہے، شوال ۱۳۴۷ھ میں طلبہ اور اساتذ کے اصرار سے آپ مدرسہ مفتاح العلوم مئو جامع شاہی کٹرہ میں بحیثیت شیخ الحدیث وصدر مدرس تشریف لائے۔ مولانا ممتاز صاحب نائب ناظم مدرسہ مفتاح العلوم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''۱۳۴۷ھ میں محدث العصر، عالم ربانی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی دامت برکاتہم کے دور میں حدیث سے اس (مدرسہ مفتاح العلوم مئو) کی نشأۃ ثانیہ ہوئی، مدرسہ کی بڑی خوش بختی تھی کہ اس کی نشأۃ ثانیہ دورۂ حدیث نبوی سے ہوئی''۔

(تذکرہ نعمانی ص۵۶)

خود حضرت الاستاذ نے لکھا ہے:

''جب میں بنارس چھوڑ کر مئو آیا تو مولانا ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور مجھے باصرار تمام مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں لا کر بٹھادیا، دو ماہ کے بعد مولانا عبداللطیف صاحب جب عیداضحیٰ کی تعطیل میں (سنبھل سے) مئو آئے تو میں نے ان کو بھی روک لیا، مفتاح العلوم جو چراغ سحری ہورہا تھا، اس کو حیاتِ نو دی، اور اس کی نشأۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا'' (ایضاً)

اس وقت سے لے کر ۱۳۶۹ھ تک برابر مفتاح العلوم مئو کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے اور بلا ناغہ ہر سال یہاں دوسری کتابوں کے ساتھ دورۂ حدیث کی کتابیں بھی پڑھاتے رہے، عام طور پر آپ کے یہاں بخاری شریف مکمل اور ترمذی شریف مکمل ہوا کرتی تھی۔ اور مولانا نعمانی کے

پاس ابوداؤد اور مسلم شریف، یہ دونوں ہی اساتذہ درس وتدریس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، تمام فنون پر پورا عبور حاصل تھا۔

۱۳۶۹ھ میں حضرت الاستاذ نے بعض اسباب کی بنا پر مفتاح العلوم سے علیٰحدگی اختیار کرلی، اور ہزار سعی اور جد جہد کے باوجود تدریسی خدمت پر بحیثیت ملازم واپس تشریف نہیں لائے، گوخود مولانا نعمانی اور مئو کے سارے علماء نے اس سلسلہ میں بہت ساری کوششیں کیں مگر مفتاح العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بلکہ سرپرست باقی رہے، صدارت تدریس حضرت الاستاذ مولانا نعمانی کی طرف منتقل ہوگئی۔

مفتاح العلوم کی نظامت اور تعمیرات پر توجہ:

۱۳۶۶ھ میں احباب اور اہل شہر کے اصرار پر آپ کو مفتاح العلوم کی نظامت کا عہدہ بھی قبول کرنا پڑا، اور ۱۳۷۱ھ تک اس عہدہ کے فرائض انجام دیتے رہے، تعمیرات پر اس زمانہ خصوصی توجہ دی، اور بہت سارے کمرے تعمیر کرادیئے اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا۔

> ''ناظم صاحب نے اپنے عہدہ سے سبکدوشی حاصل کرلی، عارضی طور پر یہ بار بھی مجھے ہی اٹھانا پڑا، تعمیر کا کام بہت تیزی سے جاری ہے اس کے ساتھ دورہ کے اسباق کی تعلیم بھی جاری ہے۔ (مکتوب مورخہ ۲۸/ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ)

مفتاح العلوم کی ذمہ داری برابر قبول کرتے رہے، مفتاح العلوم سے علیٰحدگی کے باوجود جب ضرورت ہوئی بلا معاوضہ اسباق بھی پڑھاتے رہے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''چند دنوں سے میں نے حماسہ اور ابن ماجہ پڑھانا شروع کردیا ہے''۔
> (مکتوب ۱۱/ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ)

والد محترم کا سایہ:

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم ۱۳۶۵ھ تک زندہ رہے اور جب تک وہ بقید حیات رہے مولانا کو گھر کی طرف سے قطعاً بےفکری رہی، پڑھنے پڑھانے اور مطالعہ کتب میں دن رات مشغول رہے، اور کہنا چاہئے والد کے سایہ کی وجہ سے مطالعہ کا بڑا عمدہ موقع ملتا رہا۔ اہل علم کو گھر کے انتظامی معاملات سے الجھن ہوتی ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے بہت دنوں فارغ رکھا، والد ماجد کی وفات کے بعد حضرت الاستاذ

کو گھر چلانے کی فکر دامنگیر ہوئی اور جھٹکا لگا، اپنے پدر بزرگوار کی وفات پر ایک خط میں لکھا:

''ایک ڈیڑھ ماہ سے رشید احمد بھی بیمار ہے اور اسی کے ساتھ سیدی ووسیلۃ ابی وجدی حضرت پدر بزرگوار بھی بیمار ہوئے، عید اضحیٰ کے ایک دن پہلے مسجد آنے جانے لگے اور عید میں بھی گئے، وہ دن عافیت سے گذرا، رات گذرنے نہیں پائی تھی کہ قے دست کے بعد جاڑا بخار شروع ہو گیا، تین چار دن کے بعد نمونیہ ہو گیا، بالآخر ۲۱/ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو پونے دو بجے دن میں ان کا وصال ہو گیا، اس وقت سے میرا جو حال ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے والد صاحب کی نسبت کچھ لکھنا پدرم سلطان بود کا مصداق ہوگا، ان کے لیے ایصال ثواب سعادتمندی اور تمھارے لیے موجب فیروزمندی ہوگا انشاءاللہ۔

(مکتوب ۲۸/ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ)

والد کی وفات کا اثر:

اس کے بعد والے خط میں لکھا:

''خصوصاً اس وقت کہ علمی کام میں نے تقریباً بالکل چھوڑ رکھے ہیں، صرف تین اسباق مدرسہ جا کر پڑھا آتا ہوں۔ میں کیا کہوں مجھے تو ایسا نظر آرہا ہے کہ علم کی روشنی ہندوستان میں برابر کم ہوتی جارہی ہے، مدرسہ کی تعداد بڑھ رہی ہے اور علم کم ہوتا جارہا ہے، علماء کو بھی احیاء علم کا خیال نہیں، ایسے افراد شاذ ونادر دیکھنے میں آتے ہیں جن کو علمی ترقی کا خیال ہو، بڑے سے بڑے مدرسہ میں بھی غوغا کے سوا کچھ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے''۔

(مکتوب ۲۱/فروری ۱۹۴۷ء)

ایک دوسرے مکتوب گرامی میں فرمایا:

''میں چاہتا ہوں کہ باہر نکلوں، مگر والد صاحب کی وفات اور بھائی کی علیٰحدگی کی وجہ سے گھر کی فکر میں ایسا مبتلا ہوں کہ دو دن کے لیے بھی کہیں جانا مشکل ہو رہا ہے''

(مکتوب ۲۲/رمضان ۱۳۶۷ھ)

تصنیف وتعلیق:

بہت دنوں کے بعد جب حضرت والا کی طبیعت میں سکون آیا، والد کی جدائی کا غم ہلکا ہوا تو

لکھنے پڑھنے کا کام شروع کیا، اور پھر بڑا علمی کارنامہ انجام دیا، حدیث کی متعدد کتابیں جو قلمی تھیں، جن کے نام کے سوا کوئی جانتا نہیں تھا، ان کی تصحیح کی، تعلیق لکھی، مقدمہ لکھا اور بڑی جانفشانی سے اسے چھپوا کر شائع کیا، چھپوانے کے لیے غیر مما لک کا سفر کیا اور سفر کی زحمتیں برداشت کیں، بیروت تشریف لے گئے، کئی کئی ماہ وہاں مقیم رہے، اور اپنی موجودگی میں کتاب طبع کرائی۔

مصنف عبدالرزاق:

مصنف عبدالرزاق گیارہ جلدوں میں ہے، اس کی تصحیح وتعلیق پر کافی دنوں مسلسل محنت کی اور خود بیروت میں رہ کر چھپوائی، ۱۳۹۰ھ میں جب طبع ہوکر آئی تو دنیا کے تمام اہل علم کے دلوں سے آپ کے لیے دعائیں نکلیں، اور علماء نے اس نعمت غیر مترقبہ سے استفادہ کیا، یہ حدیث کا بڑا ہی عظیم ذخیرہ ہے یہ امام عبدالرزاق بن ہمام بن نافع المتوفی ۲۱۱ھ کا جمع کردہ حدیثی ذخیرہ ہے، اس کی بہت ساری حدیثیں ثلاثی ہیں، اور بہت سی حدیثیں جو کہیں نہیں ملتی ہیں، اس میں موجود ہیں۔

افسوس ہے اس کتاب پر حضرت الاستاذ کا ایک جلد میں مقدمہ ہے وہ کسی وجہ سے نہیں چھپ سکا حالانکہ اس کا چھپنا بہت ضروری ہے۔ (۱)

مسند حمیدی:

اسی طرح آپ نے مسند الحمیدی پر کام کیا اور اس کی تصحیح وتعلیق پر محنت کی، یہ امام بخاری کے استاذ امام ابوبکر عبداللہ بن زبیر قریشی اسدی حمیدی المتوفی ۲۱۹ھ کی تصنیف ہے، یہ بھی غیر مطبوعہ تھی، حضرت الاستاذ کی سعی سے دو جلدوں میں حیدرآباد سے ۱۳۸۲ھ=۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔

کتاب الزہد والرقائق:

کتاب الزہد والرقائق امام عبداللہ بن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کی تالیف ہے، یہ بھی پہلے کبھی چھپی نہیں تھی نام سنا جاتا تھا مگر پڑھا ہوگا شاید ہی چند علماء نے۔

حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے وسیع المطالعہ نے تحریر فرمایا، ''قدماء میں صرف بزرگ امام عبداللہ بن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہمیں معلوم ہے جنھوں نے کتاب الزہد والرقائق کے نام سے تالیف فرمائی ہے، مگر یہ ہیچمنداں اس کتاب کی زیارت سے محروم ہے، اس لیے اس کی نسبت

---

(۱) یہ مقدمہ تحریر نہیں کیا جاسکا تھا (مسعود الاعظمی)

کچھ عرض نہیں کرسکتا۔''

استاذ محترم نے اس کو ڈھونڈ نکالا، اور مختلف مخطوطہ کے فوٹو سامنے رکھ کر اس کی تصحیح کی اور اپنی تعلیقات وحواشی کے ساتھ مالیگاؤں ضلع ناسک کے ادارہ علمی احیاء المعارف کے ذریعہ ۱۳۸۵ھ میں چھپوا کر شائع کیا، اور اس طرح یہ نادر روزگار مجموعہ علماء کرام کے ہاتھوں میں پہنچا۔

سنن سعید بن منصور:

سنن سعید بن منصور جو شیخ ابو عثمان سعید بن منصور المروزی المتوفی ۲۲۹ھ کی تالیف ہے یہ بھی مالیگاؤں سے ۱۳۸۸ھ میں اپنی تصحیح وتعلیق کے ساتھ دو جلدوں میں آپ نے شائع کرائی۔

المطالب العالیہ:

المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ للحافظ ابن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ مکمل چار جلدوں میں کویت کی وزارۃ الاوقاف نے ۱۳۹۰ھ میں شائع کیا۔

کشف الاستار:

کشف الاستار عن زوائد مسند بزار للہیثمی یہ بھی چار جلدوں میں دمشق کے ایک ادارہ نے شائع کیا۔

تکمیل الاذہان:

تکمیل الاذہان شاہ رفیع الدین المتوفی ۱۲۳۳ھ کا نسخہ ہے، ہاتھ آیا تو پہلے اس کا مقابلہ مختلف مخطوطہ سے کیا، ایک موقع سے حضرت الاستاذ دیوبند تشریف لائے تو مجھے رامپور کے مشہور کتب خانہ اپنے ساتھ لے گئے تاکہ مقابلہ کرنے میں سہولت رہے، وہاں کے نسخہ سے اس کا مقابلہ فرمایا یہ کتاب پاکستان سے شائع ہوئی۔

مصنف ابن ابی شیبہ کی تصحیح وتعلیق پر کافی محنت کی، اور یہ مکہ مکرمہ سے شائع ہو رہی ہے، حضرت کی زندگی میں اس کی چند ہی جلدیں چھپ کر آئیں۔

ابتدائی تصنیفات:

ان کتابوں کے علاوہ بھی بہت سارے مجموعہ حدیث پر آپ نے کام کیا اور اس کے چھپوانے کی

سعی فرمائی، آپ جس زمانہ میں مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں بحیثیت صدر مدرس اور شیخ الحدیث درس دے رہے تھے، اس زمانہ میں بھی تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری تھا اور مدرسہ کے شعبۂ تصنیفات سے آپ کی کتابیں شائع ہورہی تھیں چونکہ ایک زمانہ میں مئو اور اطراف مئو میں غیر مقلدین کا زور تھا، اس لیے برابر تقریروں کے ذریعہ بھی ان کا جواب دیا کرتے تھے، بستی ضلع میں رضا خانی کا جب حملہ ہوا تو وہاں پہنچ کر ان کا بھی سدباب کرنا پڑا، آپ اور مولانا نعمانی ؒ برابر اس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔

مولانا نعمانی پر آپ کا جو مقالہ شائع ہوا ہے اس میں لکھتے ہیں:

''میرا ان کا ساتھ صرف مسجد ومدرسہ اور نجی مجلسوں تک محدود نہ تھا، تبلیغ اور مناظرانہ جلسوں کی شرکت اکثر ایک ساتھ ہوتی تھی، کبھی کبھی دیوبند، دار المبلغین لکھنؤ اور جمعیۃ علماء ہند کے جلسوں یا مجلسوں میں شرکت کے لیے میں جاتا تھا تو وہ بھی ساتھ ہولیتے تھے۔

(تذکرہ نعمانی ص ۱۶)

دار المبلغین اور جمعیۃ سے وابستگی:

دار المبلغین لکھنؤ اور جمعیۃ علماء ہند سے بھی آپ کا برابر گہرا تعلق رہا، یہ درست ہے کہ آپ علمی طور پر ملکی سیاست میں کھل کر حصہ نہیں لیتے تھے، مگر سنجیدہ مجلسوں اور شوریٰ میں پابندی سے جایا کرتے تھے، خود آپ نے لکھا ہے:

علمی اور تعلیمی کاموں کے ساتھ ساتھ مقامی اور ملکی سیاست میں بھی ان (مولانا نعمانی) کا بڑا حصہ تھا، مگر میرا ان کا ساتھ سیاسی میدان میں نہیں تھا، باوجودیکہ چند باتوں کے استثناء کے بعد میرا اور ان کا سیاسی مسلک ایک تھا۔ (ایضاً)

اسمبلی کی ممبری:

اسی سیاسی مسلک کا نتیجہ ایک دفعہ یہ ہوا کہ کانگریس نے اپنی مصلحت کے پیش نظر حضرت مولانا کا نام اسمبلی الیکشن میں امیدواروں میں دے دیا اور آپ کے انکار پر پارٹی نے دھیان نہیں دیا اور کانگریس کو اس کی وجہ سے فائدہ بھی ہوا، اور اس طرح حضرت مولانا پانچ سال کے لیے اسمبلی کے ممبر منتخب ہوگئے، خاکسار کے نام ایک خط تحریر فرمایا مناسب یہ ہے کہ یہاں وہ پورا خط دے دیا جائے،

تا کہ آپ کو مولانا کی طبیعت کا صحیح اندازہ ہو سکے، وہ درج ذیل ہے۔

پٹھان ٹولہ، مئو

۲۱؍فروری ۵۲ء

عزیزم سلمہ اللہ

سلام مسنون، بحمدہ تعالیٰ بخیریت ہوں، اس دفعہ جواب میں تاخیر قصداً ہوئی، دو ماہ سے میں سخت الجھن میں تھا، حادثہ یہ پیش آیا کہ میرے طلب یا خواہش بلکہ وہم وگمان کے بغیر مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے مجھے کانگریس کی طرف سے اسمبلی کا امیدوار نامزد کر دیا اور میری ہر طرح کی بیزاری وکنارہ کشی کے باوجود امیدوار رہنا پڑا، اور ہر چند کہ میں اس کام کے لیے نہ ایک قدم چلا، نہ کسی سے اس کے لیے ایک لفظ کہا، پھر بھی زبردستی کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے نو دوسرے امیدواروں کے مقابلہ میں کھڑا رکھا گیا، پرسوں خدا خدا کر کے ۶۰۰۰ چھ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے میری کامیابی کی خبر مجھ کو سنائی گئی، اس بات کی خوشی تو ضرور ہے کہ ناکامی کی رسوائی سے اللہ تعالی نے بچالیا، لیکن ممبری کا سودا نہ پہلے تھا، نہ اس کامیابی کے بعد ہی اس سے کوئی انس ہے خدا ہی کو بہتر معلوم ہے کہ آگے کیا ہوگا، انتظار تھا کہ نتیجہ معلوم ہوجائے تو پورا قصہ ایک دفعہ سنا دیا جائے میں نے اس سلسلہ میں پہلی بار آج صرف تین جگہ دوستوں کو خط لکھا ہے سید صاحب کو باوجودیکہ ادھر میں نے دو خط لکھے، لیکن واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوئی، باوجودیکہ پوری داستان معلوم ہونے کے بعد میرا کوئی عمل دخل اس کاروبار میں ثابت نہیں ہوتا، پھر بھی میں اس چیز کے فکر سے شرمندگی محسوس کرتا ہوں والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

ممبری کے زمانہ میں تدریسی خدمات:

جب ممبر اسمبلی کی حیثیت سے انتخاب ہوگیا۔ تو لوگوں کے کہنے سننے سے استعفاء نہیں دیا، پانچ سال تک اسمبلی کے ممبر رہے، اور اس کے اجلاسوں میں شرکت بھی کی، مگر جب تک ممبر رہے اور لکھنؤ میں رہنا پڑا، تو قیام دار المبلغین لکھنؤ میں رہا یا پھر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں، اور ان دونوں جگہوں میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا، بلکہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کے اصرار سے ایک

سال ندوہ میں بلا معاوضہ بخاری شریف کا درس بھی دیا، اس زمانہ میں برائے ملاقات کبھی کبھی خاکسار حاضر خدمت بھی ہوتا رہا۔

اسمبلی کی ممبری ختم ہونے کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مولانا کے یہاں مالی تنگی محسوس کی گئی، اس زمانہ میں ندوہ نے طے کیا کہ سال بھر حضرت مولانا نے درس دیا ہے یہ موقع ایسا ہے کہ حضرت مولانا کی مدد کی جائے اور سال بھر کی تنخواہ جوان دنوں نہیں لیتے تھے بھیج دی جائے، چنانچہ دارالعلوم ندوہ کے ذمہ داروں نے ڈرافٹ حضرت مولانا کے نام بھیجا، مگر مولانا نے اسے وصول نہیں کیا بلکہ واپس فرمادیا۔ اور لکھا کہ میں نے یہ طے کر کے پڑھانا شروع کیا تھا کہ اس کا کوئی معاوضہ میں قبول نہیں کروں گا۔ اس لیے ڈرافٹ واپس کر دیا گیا ہے۔

مفتاح العلوم کی خدمت:

مفتاح العلوم مئو سے بھی ملازمت کے لیے معذرت کر چکے تھے، اس لیے جب کبھی یہاں بھی ضرورت محسوس کی بلا معاوضہ مدرسہ کی خدمت انجام دیتے رہے، خاکسار کے نام ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں روزانہ مدرسہ مفتاح العلوم جاتا ہوں، ایک گھنٹہ بخاری بڑھاتا ہوں اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ انتظامات کی کی دیکھ بھال کرتا ہوں، میں نے بلا معاوضہ یہ بوجھ اٹھا لیا ہے، صرف اس لیے کہ طلباء کا نقصان نہ ہو، اور مدرسہ کے ہمدرد لوگ بد دل اور مایوس نہ ہوں، لیکن ہر وقت یہ فکر دامنگیر ہے کہ ہر ضروری شعبہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے ایک ایک موزوں آدمی مل جائے، یا تیار ہو جائے۔'' (مکتوب گرامی ۲۸ر فروری ۳ے۷ء)

فقہ حنفی کی بغداد روانگی:

اسی خط میں یہ بھی لکھا کہ:

الاستاذ صبحی السامرائی مکتبہ المثنی بغداد کے نام ایک نسخہ ہدایہ اخیرین کا اور دو نسخے ہدایہ اولین کے کسی تاجر سے رعایتی قیمت پر بھجوادو اور کتاب کی قیمت مع مصارف ڈاک معجم المولفین کی قیمت سے وصول کرلو۔ (ایضاً)

چنانچہ خاکسار نے یہ کتابیں سامرائی کے نام دیوبند سے بھیجوادی تھی، اور وہ وہاں پہنچ گئی تھی، اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا کہ:

''بعض قلمی کتابوں کی جستجو میں دو دن کے لیے پٹنہ گیا، وہاں سے دربھنگہ اور دربھنگہ سے مئو، مولوی یحییٰ سے ملاقات ہوئی تھی، ابراہیم افریقی کا کوئی خط سملک سے بھی نہیں آیا، مصنف عبدالرزاق مجھ کو بھی بھیجی''

مصر کی دعوت:

ہندوستان میں شیخ الازہر الشیخ عبدالحلیم محمود تشریف لائے تو دوسرے علماء عرب کی طرح آپ نے بھی حضرت الاستاذ سے حدیث کی سند واجازت حاصل کی، اور حضرت نے ان کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی، شیخ الازہر نے حضرت سے درخواست کی کہ مصر تشریف لائیں، چنانچہ ایک خط میں خاکسار کو لکھا:

''شیخ الازہر نے اگر ٹکٹ بھیجوادیا، تو مصر جانے کا خیال ہے، ان کی بات رہ جائے گی اور ممکن ہے کوئی علمی مہم سر ہو جائے'' (مکتوب ۲۵/مارچ ۷۴ء)

اسی خط میں حضرت نے اس کا بھی تذکرہ فرمایا کہ:

''**المطالب العالية** بیروت میں فوٹو آفسیٹ سے دوبارہ چھپ گئی ہے مولانا یوسف نے مکہ میں ایک سو بیس روپے میں خریدی تھی، یہاں کچھ نسخے ہیں اگر کہو گے تو بھیجوادوں گا ایک نسخہ مولوی یحییٰ نے اور ایک ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے مانگا ہے'' (ایضاً)

مصنف ابن ابی شیبہ کی طلب:

جس زمانہ میں مصنف عبدالرزاق پر کام کر رہے تھے اس وقت تحریر فرمایا:

''میں جلد ہی مہتمم صاحب کو خط لکھنے والا ہوں، مجھے مصنف ابن ابی شیبہ کی ضرورت ہے ان کو لکھوں گا کہ کتب خانہ سے برآمد کرا کے تمھیں دیدیں تم اس کو بحفاظت مجھ تک پہنچا دو گے، آج کل مصنف عبدالرزاق پر کام کر رہا ہوں، اس سلسلہ میں ابن ابی شیبہ کی سخت ضرورت ہے، اس کی ایک جلد کتب خانہ دارالعلوم میں ہے'' (مکتوب ۱۴/فروری ۶۷ء)

حضرت مولانا اعظمی تمام کتب خانوں کے حالات سے باخبر تھے، چنانچہ متعدد کتب خانوں سے مختلف مخطوطوں کے فوٹو آفسیٹ منگوائے تھے۔

ایک مرتبہ یہ بھی لکھا کہ:

''ایک نسخہ فتح الملہم (۳ جلد) اور ایک نسخہ ماتمس الیہ الحاجہ مصنفہ مولانا عبدالرشید (کراچی والے) کا الاستاذ صبحی السامرائی مکتبۃ المثنیٰ بغداد کو بھیج دو'' (۴؍ستمبر ۷۳ء)

اس حکم کی بھی تعمیل کی گئی، اور کتابیں ان کے پتہ سے بھیج دی گئیں۔

مسند احمد پر آپ کے تعلیقات:

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرا تبادلہ دارالافتاء سے کتب خانہ میں کر دیا گیا، اور کتب خانہ کی نئی ترتیب و تنظیم فن وار و زبان وار کر دینے کی ذمہ داری ڈالی گئی، اس زمانہ میں مصر کے مشہور عالم حدیث احمد محمد شاکر کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ مسند احمد جو جدید ترتیب سے شائع ہو چکی تھی وہ سامنے آئی تو استاذ محترم کے تعلیقات اور استدراکات سامنے آئے، جو آپ نے لکھ کر انھیں بھیجا تھا اور انھوں نے شکریہ کے ساتھ مسند کی پندرہویں جلد میں شائع کیا تھا، میں نے بغور اسے پڑھا اور اس خدمت کا ذکر رسالہ دارالعلوم دیوبند کے اداریہ میں کیا، جس سے اس وقت عام طور پر ہم جیسے مولوی ناواقف تھے، حضرت کو میں نے اس کی اطلاع دی تو تحریر فرمایا:

''حق تعالیٰ تم کو صحت کے ساتھ فراغ بال و اطمینان نصیب فرمائے، رسالہ دارالعلوم میں ریویو میں نے بھی دیکھا''۔ (مکتوب ۱۵؍دسمبر ۵۴ء)

احمد محمد شاکر مصری کا خط اور شکریہ:

یہاں اس کا تذکرہ کر دینا بھی مناسب ہوگا، کہ اس دور کی بات ہے جب مولانا کی عام شہرت غیر ممالک میں نہیں ہوئی تھی، علماء آپ کو صرف مفتاح العلوم کا شیخ الحدیث کی حیثیت سے جانتے تھے، جب آپ کی تحریر احمد محمد شاکر مصری کو ملی تو انھوں نے جواب میں لکھا:

''حضرت الاخ العلامة الكبير المحقق الاستاذ حبيب الرحمن الاعظمى..... جاء نى كتابكم الاول النفيس........... اما استدراكاتكم فكلها نفيسة عالية والاقوال هذا مجاملة واشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة وأرجو ان تزيدون من اشاراتكم وارشاداتكم خدمة للسنة النبوية المطهرة وأنتم كما رأيت من عملكم من اعظم العلماء بها فى هذا العصر فالحمدلله على توفيقكم " كتبه المخلص احمد محمد شاكر

تعلیقات اعظمی مسند احمد پر:

اپنی کتاب میں جہاں حضرت الاستاذ کی تحقیق درج فرمائی ہے وہاں لکھتے ہیں:

''ثم جاء نی کتاب من أخ عالم کریم لم یکن لی شرف معرفة من قبل وقد عرفت من کتابه فضله وعلمه وتحقیقه بالبحث الدقیق، ووفاء بوعدی ومسرورا بما جاء نی ابحاثه الدقیقة سأثبت نص کلامه منسوبة إلیه بقولی قال الاعظمی بعد تمحیص کل منها وتحقیقه فما کان موافقا لما انتهی إلیه بحثی لم أعتب علیه اقراراً بصواب ما ذهب واعترافا بفضله وماکان لی فیه رأی یخالف وهو قلیل عقبت علیه بما رأه صواباً ''

بار بار علامہ مصری اعتراف کرتے ہیں:

''والصواب ما ذهب إلیه العلامة الاعظمی، تحقیقه نفیس جدا''

(دیکھئے مسند امام احمد بن حنبل بتحقیق احمد محمد شاکر ج۵ص۲۵۱وج۵ص۲۸۶)

محدث عبدالرحمٰن یمانی کا اعتراف:

محدث عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی الیمانی تعلیقات مسند حمیدی پر تحریر کرتے ہیں:

''تعلیقاته تنبئ عن وفرة علمه وجودة فهمه ودقة نظره وحسن اختیاره''.

مولانا افغانی کا بیان:

کتاب الزہد والرقائق پر مولانا ابوالوفا افغانی لکھتے ہیں:

''فقد اطلعت علی کتاب الزهد والرقائق للامام ابن المبارک رحمه اللّٰه الذی رتب اصوله وصححها وعلق علیه العلامة اللبیب الحبیب مولانا الشیخ حبیب الرحمن الاعظمی لا زال ناصراً للسنة...... فوجدته ماهراً للعلوم وحاویاً بها اميناً لروایة، حل فی تعلیقاته مشکلات الکتاب وأخرج أحادیثه وآثاره وقدمه بمقدمة ثمینة مفیدة تدل علی سعة اطلاعه وطول باعه قل له نظیر فی علماء زماننا'' (کتاب الزهد والرقائق ص ۶۴)

عبدالفتاح ابوغدہ کا بیان:

حلب کے مشہور حنفی عالم دین ابوغدہ عبدالفتاح نے اپنی تالیف میں حضرت الاستاذ کا نام اس طرح لیا ہے:

''العلامة المحدث البارع الفقيه الشيخ حبيب الرحمن الاعظمی صاحب التعليقات البديعه والتحقيقات النادره، العالم بالرجال والعلل، وتعليقاته السنية على سنن سعيد بن منصور، والزهد لابن المبارك ومسند الحميدی واستدركاته على الشيخ احمد شاكر فی تعليقه على مسند احمد ثم تعليقاته الحافلة على مصنف عبدالرزاق الذی يطبع الآن بعون اللّٰه كلها تنطق بسمو فضله وبسطة يديه فی هذالعلم الشريف'' (فقه اهل العراق وحديثهم ص ۸۲)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مسرت:

یہ چند علماء عرب کے ارشادات ہیں، جو نقل کیے گئے، اب چند علماء ہند کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیں حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی کتاب ''التنقید السدید علی التفسیر الجدید'' پڑھ کر لکھا:

احقر اشرف علی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو عنایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا، اس حدیث کا مصداق پایا۔ **قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفونه عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين.** ماشاءاللہ قوت استدلال حسن ادا، رفع شبہات، لین کلام، غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ پایا۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بارک اللہ فی افادات المصنف واضافاتہ ۲۴ رصفر ۱۳۴۹ھ تھانہ بھون۔

حضرت الاستاذ کی دوسری کتاب نصرۃ الحدیث پڑھ کر تحریر فرمایا:

''میں اپنے ضعف اور عذر سے خود شرمندہ ہوں، اور ہدیہ بسر وچشم قبول کرتا ہوں جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محققانہ نہیں لکھ سکتا۔

حضرت اعظمی علامہ سید سلیمان ندوی کی نظر میں:

شاہ معین الدین احمد ندوی نے ''حیاتِ سلیمان'' میں بر سبیل تذکرہ لکھا ہے:

''مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اگر چہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے لیکن حدیث اور فقہ پر گہری نظر تھی، اس لیے سید صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے''۔ (حیات سلیمان ص ۶۳۸)

حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی ؒ سے خاکسار کو حضرت الاستاذ ؒ نے فراغت کے بعد ملایا تھا اور خاکسار سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا تو وہ فرماتے تھے کہ ''اپنے استاذ سے لپٹے رہئے'' طلب علم کا زمانہ ابھی آیا ہے، پہلا زمانہ تہیہ اسباب واستعداد کا تھا، ایک خط میں لکھا:

''مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی خدمت میں سلام کہہ دیجئے اور یہ کہ جلد از جلد کسی دن تکلیف یہاں (اعظم گڈھ) آنے کی فرمائیں، تو بڑی خوشی ہوگی''۔

(۱۱؍ربیع الثانی ۱۳۶۴ھ)

اس وقت خاکسار مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں ابتدائی مدرس بنادیا گیا تھا، حضرت الاستاذ نے بعض باتوں کی وجہ سے مدرسہ آنا بند کردیا تھا، اس کی جب اطلاع سید صاحب کو ہوئی تو مجھے لکھا:

''حالات سن کر افسوس ہوا، مولانا سے کہہ دینا کہ وہ ہر فیصلہ سے پہلے مجھے ضرور مطلع فرماتے رہیں۔ (مکتوب یکم رجب ۱۳۸۴ھ)

سید صاحب ؒ اخیر میں بھوپال اور پھر وہاں سے آزادی کے بعد کراچی تشریف لے گئے، درمیان میں ایک دفعہ ہندوستان تشریف لائے اور اعظم گڈھ پہنچے تو اطلاع پاکر حضرت الاستاذ ؒ بھی ملنے تشریف لے گئے، میں اس زمانہ میں سانحہ ضلع مونگیر میں تھا، سید صاحب نے واپس ہوکر خط لکھا۔

''محبی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بھی اطلاع پاکر چند گھنٹوں کے لیے آگئے تھے، مل کر دل خوش ہوا، آپ کا ذکر خیر بھی درمیان میں آیا'' (مکتوب ۷؍مئی ۱۹۵۰ء)

ایک دفعہ خط میں جدائی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کراچی سے تحریر فرمایا:

''آپ نے گیلان جانے کا ذکر کیا، ہندوستان کے ان دوستوں میں سے جن کے جیتے جی چھوٹ جانے کا افسوس ہے، ایک مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں، اور دوسرے آپ کے استاذ مکرم مولانا حبیب الرحمٰن ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو مستفید فرمائے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا:

''میرا یہاں رہ جانا بھی اللہ تعالی کی مصلحت ہی ہے دعا کیجئے اس کو میرے لیے اور یہاں کے مسلمانوں کے کے لیے مفید فرمائیں''۔ (مکتوب گرامی ۲/اگست ۱۹۵۱ء)

یہاں پہنچ کر حضرت سید صاحب کے خط کے جملوں کو نقل کر کے آنکھیں اشک بار ہوگئیں، کہ اب ان میں سے کوئی اس دنیا میں باقی نہ رہا۔ خاکسار تنہا بے سہارا رہ گیا، رب العالمین میری دستگیری فرماتا رہے، ہمیں پوری توقع ہے ان اکابر کی دعائیں رہبری کا فریضہ ادا کریں گی اللہ تعالی ان بزرگوں کو اپنی بے انتہا رحمتوں سے نوازتا رہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی نظر میں:

مولانا عبدالماجد دریا آبادی جو علوم قدیمہ وجدیدہ دونوں سے تعلق رکھتے تھے اور ادب وانشاء میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، انھوں نے ایک دفعہ صدق جدید میں لکھا:

''ہندوستان کے خادمان حدیث اور ماہرین علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست تیار کی جائے تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا ہوگا''۔

(صدق جدید لکھنؤ ۱۲/اگست ۶۸ء)

پھر آپ کی خدماتِ جلیلہ پر رقمطراز ہیں:

''حیرت ہوتی ہے ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہوگئی''۔ (ایضا)

مولانا اکبر آبادی کا بیان:

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی فاضل دیوبند ایم۔اے۔ نے جب اپنی مشہور کتاب ''صدیق اکبر'' لکھی تو نظر ثانی کے لیے حضرت الاستاذ کی خدمت میں بھیجی اور دوسرے اڈیشن میں تحریر فرمایا:

''پھر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی جن سے بڑھ کر فن حدیث اور اسماء الرجال کا محقق اور مبصر میرے نزدیک آج انڈو پاک میں کوئی عالم نہیں ہے، دیرینہ نیاز مندی کی بنا پر خط لکھا کہ اگر آپ ''صدیق اکبر رضی اللہ عنہ'' کو ایک مرتبہ ملاحظہ فرمالیں تو مجھے اطمینان ہو جائے گا، مولانا نے از راہِ شفقت بزرگانہ میری درخواست کو قبول فرمایا، اور کتاب کا ایک ایک ورق پڑھ کر غلطیوں سے آگاہ فرمایا، میں نے نظر ثانی میں اصلاح فرمائی''

(مقدمہ صدیق اکبر طبع دوم)

چنانچہ حضرت الاستاذ نے ایک بار لکھا کہ بہت سارے علماء کے خطوط آتے رہتے ہیں کہ میں ان کی کتاب پر نظر ثانی کروں، جوابات میں الجھا رہتا ہوں، تحریر فرماتے ہیں:

''مصنف عبدالرزاق کے کام کے علاوہ روزانہ متعدد خطوط کے جوابات وغیرہ میں ایسا الجھا ہوا رہتا ہوں کہ کسی نئے کام کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں ہوتی، مولانا محمد میاں صاحب کا اصرار ہے کہ ان کے ''عہد زریں'' پر نظر ڈال کر تقریظ لکھوں اور مشورہ دوں، ایک صاحب مصر سے ابن عبدالبر کی الاستذ کار شائع کرنا چاہتے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اس کام میں، میں ان کی مدد کروں، اور برابر ان کے سوالات کے جوابات بھیجا کروں، اس طرح خطوط آتے رہتے ہیں''۔

(مکتوب گرامی ۲۱/اکتوبر ۱۹۶۴ء)

ایک خط میں تحریر فرمایا:

المطالب العالیہ کی پہلی جلد پوری ہوئی، کویت میں چھپ رہی ہے، اب دوسری کی طباعت شروع ہوئی ہوگی، تیسری کے مسودہ کے لیے سخت تقاضا ہے، اس کو تیار کرنے میں مصروف ہوں، اس لیے اب تک سفر بھی نہیں کرسکا''۔ (مکتوب یکم جون ۷۰ء)

ملازمت سے اجتناب:

بہت سارے علمی اور تعلیمی اداروں نے آپ کو بلایا کہ وہاں آ کر علمی خدمات انجام دیں سعودی عرب، کویت، مصر، ہر جگہ سے طلبی آئی، مگر کہیں تشریف نہیں لے گئے، بڑی بڑی تنخواہیں اور بھتے پیش کیے مگر ہر جگہ معذرت کرنا پڑی۔

دارالعلوم دیوبند کی پیشکش:

خود دارالعلوم دیوبند نے چاہا کہ یہاں تشریف لے آئیں، مگر حالات نے اجازت نہیں دی صدر مفتی کے لیے بلایا، بلکہ بذات خود شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الاسلام حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ مئو پہنچے۔

حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی کی وفات کے بعد صدارت تدریس پیش کی گئی مگر اس پر بھی معذرت کرنا پڑی، میں نے علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا جو خط لکھا تھا اس میں یہ بھی لکھا کہ دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس کے لیے اب لوگوں کی نظر حضرت والا پر ہے، اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''علامہ کی وفات کے بعد دیوبند سے جو خط لکھا تھا، وہ پہلے مل گیا تھا، آج وطن سے بھیجا

ہوا تمھارا خط ملا، تم نے جو باتیں لکھی ہیں، وہ بعید از قیاس نہیں ہیں، میرا خیال ہے کہ ہر دو فریق مجھے اس لیے گوارہ کرلیں گے کہ ہر ایک کے سامنے آئندہ جو اندیشے ہوں گے، وہ میرے باب میں یا تو نہ ہوں گے، یا بہت کم ہوں گے، مگر میں اپنے دل کو جہاں تک ٹٹولتا ہوں، میرے دل کے کسی گوشہ میں یہ تمنا نہیں ملتی میں وہاں کے ماحول سے بہت متوحش ہوں، میں انشاء اللہ وہاں کا رنگ قبول نہیں کرسکتا، اور امید نہیں کہ میرا رنگ وہاں مقبول ہو''

(مکتوب ۲۵؍شوال ۷۸ھ)

علمی خدمت سے آپ کا تعارف ہو:

حضرت کو دیو بند کی آب وہوا کبھی موافق نہیں آئی، جب کبھی شوریٰ میں تین دن کے لیے بھی آئے تو بیمار ضرور ہوئے اور مجھے دوا کی فکر کرنا پڑی، ایک بڑی وجہ دیو بند سے وحشت کی یہ بھی تھی، حضرت نے جس قدر بھی علمی اور تعلیمی کام کیا، سب گھر پر بیٹھ کر کیا، ظاہری طور پر شہرت کی وجہ آپ کے ساتھ کچھ بھی نہیں تھی، جو کچھ تھا وہ آپ کی علمی خدمت، علوم دینیہ میں مہارت بالخصوص علم حدیث سے شغف تھا، اللہ تعالیٰ نے دل ودماغ اور فکر وذہن متقدمین جیسا عطا کیا تھا، مئو جیسی چھوٹی اور صنعتی جگہ میں رہ کر پورے عالم اسلام میں روشناس ہوئے اور برصغیر سے لے کر سعودی عرب، کویت اور مصر تک علماء کرام نے آپ سے حدیث کی سند اور اجازت حاصل کی، طبیعت غیور اور بے نیاز پائی تھی، شہرت طلبی کے جذبہ سے سینہ پاک تھا، نام ونمود سے کوسوں دور تھے مگر مقبولیت خدا داد تھی، اور غالباً علوم نبوت سے دلچسپی کا فیضان تھا۔

مخالف مسلک کے سلسلہ میں آپ کا نظریہ:

مخالف مسلک والوں سے جنگ کا جذبہ قطعاً نہیں تھا لیکن جب کوئی مسلک حق پر حملہ آور ہوتا تو پھر اس وقت خاموش بھی نہیں رہ سکتے تھے، شیعوں اور رافضیوں کا منہ توڑ جواب لکھا، بدعتیوں کو دنداں شکن جواب دیا اور غیر مقلدوں کو ان کے گھر تک پہنچایا یہ سب دفاعی تھا، اقدامی نہ تھا۔

درس حدیث میں فرماتے تھے کہ مجھے کسی سے عناد نہیں ہے حدیث میں نماز کے سلسلہ میں متعدد روایتیں آئی ہیں ایک پر اگر غیر مقلد عمل کرتے ہیں تو ان سے کیوں لڑا جائے جب کہ وہ بھی حدیث سے ثابت ہے لیکن جب وہ حنفیوں کو طعنہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث پر عمل نہیں کرتے قیاس پر عمل پیرا ہیں، تو اس وقت سوچو کیسے خاموش رہا جائے، اور یہ کیوں نہ بتایا جائے کہ حدیث پر تم سے زیادہ عمل

کرنے والے ہیں۔اورتم سے زیادہ حدیث جاننے والے ہم ہیں۔

تصنیفات میں جامعیت کی شان:

تصنیفات وتالیفات کی فہرست سے اندازہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ نے کب قلم اٹھایا، اور جب قلم اٹھایا تو کس قدر مدلل ومکمل لکھا، کہ مخالف کو جواب دہی کی گنجائش باقی نہیں رہی، آپ کی تالیفات وتصنیفات میں تحقیق وتدقیق کے ساتھ جامعیت کی شان پائی جاتی ہے، پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ مؤلف اور مصنف کی نظر بہت وسیع وعمیق ہے اوراس نے اس کے لکھنے میں کافی محنت کی ہے اورکوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے، یہی حال درس تدریس کا تھا، جہاں تلامذہ کوعلم وفن کی دولت سے نوازتے تھے وہیں ان کی تربیت اورذہن سازی اورتعمیر سیرت پربھی نظر رکھتے تھے۔

تدریسی خدمت سے کچھ دنوں انقطاع اوراس کی وجہ:

درمیان میں بہت دنوں درس تدریس کا سلسلہ منقطع رہا، میں جب سفر ۱۳۷۶ھ میں دارالعلوم دیوبند بحیثیت ملازم آیا اتفاق سے اس زمانہ میں نصاب کمیٹی بلائی گئی تھی اس میں حضرت الاستاذ بھی تشریف لائے، اس وقت تک دارالعلوم کا یہ مہمان خانہ نہیں بنا تھا، ایک وسیع کمرہ تھا اسی میں سارے ممبران قیام کرتے تھے۔

ایک دن جب مولانا تنہا تھے میں خدمت میں حاضر ہوا اورعرض کیا کہ حضرت کی تدریسی خدمت سے علیحدگی سے طلبہ کا بڑا نقصان ہوا، اتنے سال میں نہ معلوم کتنے علماء تیار ہوجاتے اوراس کے علاوہ بھی میں بہت کچھ کہتا رہا، اپنی عادت کے مطابق خاموشی سے سنتے رہے، اخیر میں فرمایا ظفیر تمہارا تعلق افتاء سے ہے تم کو اندازہ نہیں ہے ورنہ صحیح بات یہ ہے طلبہ میں تحصیل علم کا وہ جذبہ صادق باقی نہیں رہا، جو کبھی پایا جاتا تھا، اب تو خود ہی عبارت پڑھو خود ہی ترجمہ کرو اور خود ہی مطلب بیان کرو، اورخود ہی سمجھو، بتاؤ اس پڑھانے کا کیا فائدہ ہے، طلبہ کی استعداد کچھ ہوتی نہیں، سب کچھ اساتذہ کو اپنے ذمہ لینا پڑتی ہے، انھیں نہ صرف سے لگاؤ ہوتا، نہ نحو کی خبر ہوتی اورنہ ادب سے واسطہ ہوتا۔

حضرت کا ذوقی معیار:

جس زمانہ میں حضرت سے ہم لوگ جلالین پڑھ رہے تھے اس سال تین چار مرتبہ ایسا موقع آیا کہ غلط عبارت خوانی پرسبق بند کردیا، اور جب تک ایک ایک طالب علم نے محنت اور مطالعہ کا وعدہ نہیں کیا، سبق شروع نہیں کیا، کبھی غصہ میں فرماتے اسے لے جاؤ ہدایۃ النحو کی جماعت میں بٹھا کرآؤ،

کبھی فرماتے مولانا ایوب ناظم مدرسہ سے کہو کہ چھوٹی چھوٹی کتابیں ہم اونچے مدرسین کے یہاں کردیں لوگوں نے طلبہ سے محنت لینا چھوڑ رکھا ہے، علم برباد ہورہا ہے۔

حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی کے بعد پھر مجبور ہو کر آپ کو مفتاح العلوم کی صدارت ونظامت سنبھالنا پڑی، اور دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھانے لگے تھے، اور کافی عرصہ تک ایسا ہی کرتے رہے، لیکن کچھ سیاسی لوگوں کی وجہ سے پھر مجبوراً مفتاح العلوم چھوڑنا پڑا، اور یکسو ہونا ضروری ہو گیا۔

المعہد العالی اور مدرسہ مرقاۃ العلوم:

اپنے محلّہ میں ایک بڑی مسجد کی کمی محسوس کر رہے تھے ایک زمین خرید کر جب اسے بنانے لگے تو پھر مدرسہ کا خیال آیا، اور مسجد کے اِدھر اُدھر جو تھوڑی بہت زمین بچی تھی، اس میں کمرے بنوانے شروع کیے جب وہ کمرے تیار ہو گئے، تو پہلے آپ نے اپنے ذوق کے مطابق ''المعہد العالی'' کے نام سے ایک تربیت گاہ کھولی تاکہ فارغ شدہ طلبہ کو رکھ کر مختلف فن میں تیار کیا جائے اور اسی کے ساتھ عربی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ بھی جاری فرمایا جس کا نام ''مدرسہ مرقاۃ العلوم'' تجویز ہوا۔

''المعہد العالی'' میں تین چار سال تک طلبہ کو داخل فرماتے رہے، مگر وہ معیار پر پورے نہیں اترے مجبوراً اس کو بھی بند کرنا پڑا، مدرسہ مرقاۃ العلوم باقی رہا، اس میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی رہی، بخاری، ترمذی اور ہدایہ اخیرین خود پڑھاتے تھے اور بقیہ کتابیں دوسرے مدرسین۔

مئو کے تقریباً سارے قدیم مدارس الٰہ آباد بورڈ سے ملحق ہو گئے اور مدرسین کی تنخواہیں حکومت یوپی سے ملنے لگیں، غالباً مرقاۃ العلوم تنہا عربی مدرسہ ہے جو گورنمنٹ کی امداد قبول نہیں کرتا ہے، صرف عام مسلمانوں کے چندے سے چلتا ہے، امید ہے یہ مدرسہ آپ کی یادگار میں چلتا رہے گا اور ترقی کی منزلیں طے کرے گا، اور خواص وعوام اس کی مالی ترقی میں حصہ لیتے رہیں گے۔

موجودہ ناظم حضرت مولانا رشید احمد کی خواہش ہے کہ المعہد العالی کو پھر چلایا جائے، اور ہونہار طلبہ کو داخل کیا جائے، اور اس کے لیے ایک ذی علم، مستعد اور محنتی استاذ کی خدمت حاصل کی جائے کہ اس کی ضرورت ہے، تاکہ اس قحط الرجال میں کام کے کچھ علماء تیار ہو سکیں، ہماری دلی دعا ہے کہ رب العالمین ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے راستے ہموار فرمادے، اور سامان فراہم کردے، ''ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم.''

امیر الہند محدث کبیر حبیب دارین
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

۱۹۹۲ء

بقلم عاجز محمد عثمان معروفی رحمۃ اللہ علیہ ☆

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن بن مولانا محمد صابر بن عنایت اللہ صاحب محلّہ پٹھان ٹولہ مئو ناتھ بھنجن میں ۱۳۱۹ھ = ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی نام اختر حسن ہے۔ آپ کے والد مولانا محمد صابر صاحب متوفی ۱۳۶۵ھ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید، انتہائی متشرع، متقی، زاہد وعابد، تہجد گذار، خوش اخلاق، مہمان نواز، بے نفس، قرآن کے بہت تلاوت کرنے والے اور سلام میں پہل کرنے والے، تقریباً ۳۶ سال مسجد محلّہ میں لوجہ اللہ ایک کثیر جماعت کو دینیات کی تعلیم دی۔ اس مذہبی گھرانے میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے تعلیم وتربیت پائی اور ۴۶ سال تک والد محترم کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے، ابتدائی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی، خاص کر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص مولانا عبدالغفار بن عبداللہ مئوی متوفی ۱۳۴۱ھ سے دیگر کتابوں کے ساتھ ادب کی ساری کتابیں پڑھیں، آخر میں ترمذی شریف بھی ان سے پڑھی، وہ جہاں جاتے آپ بھی وہاں پہنچ جاتے، جب وہ تدریس کے لیے گورکھپور اور پھر وہاں سے مظہر العلوم بنارس گئے تو آپ بھی ساتھ ساتھ رہے اور ان سے خوب علمی استفادہ کیا۔ مظہر العلوم ہی سے آپ نے ۱۹۱۸ء میں ملا کا اور مارچ ۱۹۱۹ء میں ملا فاضل کا امتحان دے کر اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ آپ نے پہلی بار شوال ۱۳۳۷ھ جولائی ۱۹۱۹ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، امتحان داخلہ میں اعلیٰ اور امتیازی نمبر ملا، مہتمم صاحب کو کچھ شک ہوا، دوبارہ شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی صاحب متوفی ۱۳۷۴ھ نے دیوان متنبّی وحماسہ میں سخت امتحان لیا، تو پہلے سے بھی زیادہ نمبر دے دیا۔ دیوبند میں مولانا نبیہ حسن صاحب سے علم ہیئت، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سے جلالین اور

☆ سابق استاذ مظاہر علوم، سہارن پور

مولانا رسول خاں صاحب سے بیضاوی پڑھی۔ تعلیمی مشغلہ میں ہمہ تن مشغول ہی تھے کہ مدرسہ میں فصلی بیماری پھوٹ پڑی، آپ بھی سخت بیمار ہوکر اواخر صفر میں گھر چلے آئے، تعلیمی سلسلہ موقوف ہوگیا، تو جمادی الاولی ۱۳۳۸ھ فروری ۱۹۲۰ء مظہر العلوم بنارس کے اندر بمشاہرہ پندرہ روپئے مدرسی شروع کردی، جس کا سلسلہ غالباً ڈھائی برس تک رہا، پھر دوبارہ شوال ۱۳۳۹ھ جون ۱۹۲۱ء میں دارالعلوم دیوبند جاکر دورۂ حدیث میں داخلہ لیا، علامہ انور کشمیری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۵۲ھ سے ترمذی شریف پڑھی اور ان سے زیادہ استفادہ کیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۶۹ھ سے مسلم شریف اور میاں اصغر حسین صاحب متوفی ۱۳۶۴ھ سے ابوداؤد شریف پڑھی۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کا زمانہ بہت ہنگامہ خیز تھا، ترک موالات کی تحریک شدت پکڑ چکی تھی، بدیسی کپڑے جگہ جگہ جلائے جارہے تھے۔ دیوبند سے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵ر محرم ۱۳۴۰ھ ۱۸ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو آپ کے سامنے گرفتار کرکے کراچی جیل بھیج دیئے گئے۔ ان حالات میں آپ کے والد محترم سخت پریشان تھے، ادھر آپ دیوبند میں بیمار بھی پڑ گئے، اس لیے والد صاحب کے حکم سے مہتمم صاحب سے رخصت لے کر ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں گھر چلے آئے اور صحت یابی کے بعد دارالعلوم مئو میں دورے کی کتابوں کی تکمیل کی۔ دارالعلوم مئو میں مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی سے بخاری وترمذی پڑھ کر شعبان ۱۳۴۰ھ اپریل ۱۹۲۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ معقولات میں صدرا، شمس بازغہ، حمد اللہ اور قاضی وغیرہ بھی مولانا سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین دارالعلوم مئو ہی سے پڑھیں۔ ترمذی شریف میں آپ کے تین استاذ ہیں، علامہ انور کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالغفار صاحب مئوی رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مئوی اور مولانا عبدالرحمٰن بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو اجازت ملی، فراغت کے بعد ہی شوال ۱۳۴۰ھ میں آپ دارالعلوم مئو میں درجۂ علیا کے مدرس منتخب ہوگئے، پھر ۱۳۴۳ھ میں مظہر العلوم بنارس کے اندر صدر المدرسین کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۹ء میں مولانا ابوالحسن مئوی متوفی ۱۳۶۱ھ ناظم مدرسہ نے مفتاح العلوم مئو میں باصرار خدمت تدریس پر آپ کو بٹھادیا، یہیں سے مفتاح العلوم کی نشأۃ ثانیہ ہوئی اور بہت جلد وہ ایک جامعہ بن کر اطرافِ عالم میں مشہور ہوا، آپ اس کے کبھی مہتمم کبھی صدر المدرسین اور شیخ الجامعہ رہے اور ۱۳۶۹ھ = ۱۹۵۰ء تک مسلسل قال اللہ وقال الرسول کی زمزمہ سنجی فرماتے رہے، خاص طور سے بخاری وترمذی آپ کے زیر درس رہیں، لیکن تصنیفی وتالیفی مصروفیات کی وجہ سے ۱۳۶۹ھ میں آپ جامعہ مفتاح

العلوم سے مستعفی ہوگئے۔ جواہر لال کے اصرار پر ۱۳۷۱ھ=۱۹۵۲ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، آپ اپنے حلقۂ انتخاب میں ایک منٹ کے لیے بھی کہیں نہیں گئے لیکن بہت بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے، ۱۹۵۷ء تک اسمبلی کے ممبر رہے، اس دوران مولانا علی میاں کے اصرار پر ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اعزازی طور پر بخاری شریف پڑھانے لگے، کچھ دنوں دار المبلغین لکھنؤ میں بھی درس دیا، اسمبلی کی ممبری ختم ہوتے ہی گھر پر تصنیفی کاموں میں مشغول ہوگئے۔

یکم ذوالحجہ ۱۳۹۲ھ ۷؍جنوری ۱۹۷۳ء کو جب آپ کے رفیق خاص مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مہتمم وصدرالمدرسین جامعہ مفتاح العلوم مئو رحلت فرماگئے، تو مدرسہ کے ارباب حل وعقد نے پھر آپ کو مفتاح العلوم کا مہتمم اور شیخ الجامعہ بنادیا، چندسال تک جامعہ کی تعلیمی وتنظیمی خدمت انجام دی، پھر بعض وجوہ کی بنا پر اس سے الگ ہوگئے۔ ۱۳۷۳ھ=۱۹۵۳ء یا ۱۳۷۵ھ سے جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن اور مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے بھی تاحیات رکن رکین رہے، بسا اوقات آپ ہی کی زیر صدارت مجلس شوریٰ منعقد ہوتی اور آپ کی رائے وقیع سمجھی جاتی۔

۱۳۶۴ھ = ۱۹۴۵ء میں جب آپ جامعہ مفتاح العلوم میں صدرالمدرسین تھے، حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ مولانا مدنی وقاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند آپ کے پاس مئو تشریف لائے اور دارالعلوم کے لیے صدارت افتاء کا منصب پیش کیا، مگر اہل مئو راضی نہیں ہوئے کہ آپ مفتاح العلوم چھوڑیں، پھر چندسال کے بعد دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس کا عہدہ پیش کیا گیا؛ مگر آپ نے عذر مقبول پیش کردیا۔

۲۸؍صفر ۱۴۰۷ھ ۲؍نومبر ۱۹۸۶ء کو نئی دہلی میں کل ہند اجتماع کے اندر ''امارت شرعیہ'' ہند کے لیے بالاتفاق آپ ہی امیر شریعت اور امیر الہند منتخب کیے گئے اور اس کی ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ آخر تک نبھایا، جمعیۃ علماء ہند کو بھی اپنے مشوروں سے نوازتے اور اس کی کانفرنسوں اور جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔

آپ ایک عظیم مناظر بھی تھے، رضاخانی وغیر مقلدین علماء سے بارہا مناظرہ کی نوبت آئی اور ہر بار آپ ہی فاتح وکامیاب ہوئے۔

ادری ضلع اعظم گڈھ میں ۲۴/۲۵/۲۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۲ھ = ۱۵/۱۶/۱۷/ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء

کومولوی حشمت علی ومولوی نعیم الدین سے مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا منظور نعمانی ومولانا عبداللطیف صاحبان کا مشہو مناظرہ ہوا، رضا خانی علماء شکست کھا کر چھپ کے بھاگ نکلے۔

آپ کا حافظہ بہت قوی اور کتابیں از بر تھیں، کتب بینی محبوب مشغلہ تھا، جس شہر میں جاتے وہاں کے کتب خانوں سے خوب خوب استفادہ کرتے، استحضار کا یہ عالم کہ عرصہ کی دیکھی ہوئی کتابوں کا حوالہ بقید صفحات وسطور پیش کر دیا کرتے۔

آپ ایک جلیل القدر مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، مناظر، مبلغ، واعظ، خطیب، ادیب، شاعر، مؤرخ، محقق، مدرس، مؤلف ومصنف اور اسماء الرجال کے زبردست عالم تھے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ اور کبھی اس کو موقوف کر کے تصنیف وتالیف میں برابر مشغول رہے۔ آپ کو تصنیفی خدمات پر حکومت ہند نے ایوارڈ اور اعزازی انعام بھی دیا۔ آپ کے بہت سے مسودات کہنگی وکرم خوردگی کی وجہ سے طبع نہ ہو سکے اور اب بھی بہت سے مسودات غیر مطبوعہ محفوظ ہیں۔ بہت سی کتابوں پر آپ کی لائق تحسین تحقیقات، تنقیحات، تعلیقات، اور تعقبات ہیں جو ملک وبیرون ملک میں طبع ہو کر عالم اسلام میں مقبول ہو چکی ہیں۔

آپ کے تعقبات محدثِ کبیر علامہ احمد محمد شاکر مصری کی شرح مسند امام احمد پر بھی ہیں، جن کو شارح نے اپنی پندرہویں جلد میں انتہائی تشکر کے ساتھ شائع کیا اور اپنی تحریر میں اعتراف کیا کہ آپ اس زمانہ کے اعظم علماء میں سے ہیں اور میں پُر امید ہوں کہ اپنی عمدہ تحقیقات سے آئندہ مجھے محروم نہ کریں گے۔ اسی طرح استدراک حافظ قاسم بن قطلو بغا علی الدرایہ فی تخریج احادیث الهدایہ پر جو آپ کی گرفت ہے اس کو علامہ محمد زاہد کوثری نے منیہ کے مقدمہ میں طبع کرایا اور آپ کا ذکر ''علامہ نحریر وجہبذ خبیر'' جیسے الفاظ سے کیا۔

حج وزیارت:

۱۳۶۹ھ = ۱۹۵۰ء میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے، پھر بارہا اس سعادت سے شرف یاب ہوئے۔ اپنی کتابوں کی طباعت ونگرانی کے لیے بیروت وحلب کا سفر کیا، تو ان سفروں میں بھی حج وزیارت کی دولت نصیب ہوئی اور دمشق، صیدا، بعلبک، لاذقیہ اور بعض بلاد شام کی بھی سیر کی، بحرین کا بھی سفر کیا، یہ سب اسفار علمی افادہ واستفادہ سے بھرپور ہیں۔

حدیث کی اجازت وسند لینے والے:

بلاد عرب وغیرہ کے بعض ان علماء کبار کے نام جنھوں نے آپ سے حدیث کی اجازت وسند حاصل کی (۱) شیخ عبدالفتاح ابوغدہ شامی (۲) شیخ عبدالحلیم محمود شیخ ازہر (۳) شیخ اسماعیل انصاری دارالافتاء ریاض (۴) شیخ حماد انصاری جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ (۵) شیخ سعدی ہاشمی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ (۶) شیخ عبدالعزیز ابوعیون السود حمص (۷) سید صبحی السامرائی، بغداد (۸) شیخ حمدی عبدالمجید، بغداد (۹) استاذ زہیر الشاویش، بیروت (۱۰) استاذ عبدالستار ابوغدہ، کویت (۱۱) شیخ محمد علوی مالکی، مکہ مکرمہ (۱۲) شیخ محمد عوامہ، مدینہ منورہ (۱۳) شیخ نوارلدین عتر، دمشق (۱۴) ڈاکٹر عبداللہ الجبوری، ریاض (۱۵) ڈاکٹر بشار عواد معروف، بغداد (۱۶) شیخ بہجۃ البیطار (۱۷) شیخ عبداللہ سراج حلبی (۱۸) شیخ عبدالعزیز بن باز (۱۹) شیخ الحرم محمد امین کتبی مکی (۲۰) شیخ محمد مغربی مکی (۲۱) شیخ عبدالرحمٰن یمانی مدیر مکتبہ حرم (۲۲) علامہ خیرالدین زرکلی (۲۳) استاذ سعید افغانی (۲۴) شیخ ناصرالدین البانی (۲۵) شیخ محمد حرکان قاضی جدہ (۲۶) شیخ ابویسر عابدین، دمشق (۲۷) شیخ امین حسینی مفتی فلسطین (۲۸) شیخ حسن خالد مفتی لبنان اور دیگر بہت سے حضرات ہیں۔ استاذی مولانا عبدالستار صاحب معروفی شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ نے فرمایا کہ جتنا زیادہ فائدۂ حدیث مجھے حضرت مولانا اعظمی کی کتابوں سے پہنچا اتنا کسی سے نہیں پہنچا۔

میرا تعلق ورشتہ:

۱۳۶۴ھ میں راقم الحروف نے ایک سال مفتاح العلوم مئو میں عربی سال دوم کی کتابیں پڑھیں، اس وقت حضرت مولانا وہاں صدرالمدرسین کے منصب پر تھے، یہیں سے حضرت کی صحبت وقرب میسر ہوا، نیز مولانا کی بڑی صاحبزادی کیاری ٹولہ میں میرے پھوپھی زاد بھائی حاجی محمد فاروق سے منسوب تھیں، انھیں کے گھر میرا زیادہ قیام رہتا تھا، اس نسبت سے بھی میں مولانا کے دولت خانہ پر آتا جاتا رہا اور کوشش یہ کرتا کہ زیادہ وقت حضرت کی صحبت میں گزاروں، اسی وقت سے حضرت کی نظر شفقت میرے اوپر ہوئی، جو تا آخر ۴۸ برس تک قائم رہی، مجھے اردو تحریر کا قدرے شعور جو ہوا وہ مولانا ہی کی توجہ کا اثر ہے۔ ۱۳۸۷ھ میں جب میں ''حیات طاہر'' مرتب کر رہا تھا، تو حضرت مولانا سے استفادہ کی ضرورت محسوس کی، مولانا نے فرمایا کہ اس کام کے لیے تم جب بھی آؤ، میں اپنا کام

چھوڑ کر تمہارا کام کر دیا کروں گا، چنانچہ جب جب میں حاضر خدمت ہوا، اپنا تالیفی کام روک کر میری رہنمائی کی، اس سے میرے حوصلہ کو بہت تقویت ملی۔ ''حیات طاہر'' کے اوپر ۲۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ کو نہایت پُر مغز پیش لفظ بھی تحریر فرمایا۔ اسی طرح میری دوسری کتاب ''ایک عالمی تاریخ'' پر ۲۴؍ شوال ۱۳۹۴ھ کو اپنا تاثر تحریر فرمایا۔ ۱۴۰۴ھ میں ''تذکرہ مشاہیر کوپا گنج'' پر بھی اپنے حوصلہ افزا کلمات تحریر فرمائے۔ جب میں نے ۱۴۰۷ھ میں تاریخ گوئی کے اصول وضوابط پر ''محاسن التواریخ'' نامی کتاب مرتب کی اور اس پر تقریظ لکھنے کی درخواست کی تو فرمایا کہ ''تم مصنف ہو چکے ہو اب تقریظ لکھوانے کی ضرورت نہیں''۔ آہ اب ہم حضرت مولانا کی ایسی حوصلہ افزائیوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ مولانا گاہے گاہے اپنے یہاں احقر کو طلب بھی فرما لیا کرتے تھے، ۱۳۸۹ھ میں بلا کر اپنی تالیف ''اعیان الحجاج'' کی کتابت میرے سپرد کر دی، جس کی کتابت میں نے بہت اہتمام سے کی۔ غالباً ۱۴۰۳ھ میں میری تالیف ''مشاہیر پورہ معروف'' منگوا کر کہیں باہر روانہ فرمایا۔ اب مولانا مرحوم ہم سب کو داغ مفارقت دے کر ۱۱؍ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ = ۱۷؍ مارچ ۱۹۹۲ء بروز سہ شنبہ اپنے قائم کردہ محبوب ادارہ مرقاۃ العلوم مئو کے صحن میں ہمیشہ کے لیے آسودۂ خواب ہو گئے، احقر نے آپ سے متعلق مختلف طریقوں سے پچاس عدد تاریخ رحلت برآمد کی ہے، جو دوسرے مقام پر طبع ہوگی۔ اختر حسن (۱۳۱۹) سے ولادت، مجاہد (۹۳) سے مدت عمر، ظفر پیکر (۱۴۱۲) سے تاریخ رحلت آپ بھی برآمد کر لیں۔ نماز جنازہ آپ کے شاگرد رشید استاذی مولانا عبدالجبار صاحب مئوی شیخ الحدیث مظہر العلوم بنارس نے ریلوے میدان میں دو لاکھ سے زائد روزہ داروں کے مجمع میں بعد ظہر پڑھائی۔

مولانا مرحوم کے دو صاحبزادے مولانا رشید احمد ومولوی سعید احمد اور چند صاحبزادیاں آپ کی صلبی یادگار ہیں۔ مریدین اور علمی استفادہ کرنے والی روحانی اولاد ملک و بیرون ملک میں بے شمار ہیں۔

مولانا اعظمی کے اوصاف وکمالات پر
ایک طائرانہ نظر

از: مولانا نظام الدین اسیر ادروی صاحب☆

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۲ء میں چھ ماہ دارالعلوم دیوبند اور تین ماہ کے قریب دارالعلوم مئو میں رہ کر دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور فوراً درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ یہ بیس بائیس سال کا زمانہ مذہبی ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے بڑا پُرشور تھا، مذہبی حلقوں میں مباحثہ ومناظرہ کی گرم بازاری اور باہمی کشمکش شباب پر تھی۔ اس معرکۂ کارزار کا نام حنفیت اور غیر مقلدیت تھا، اس کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوا اور بیسویں صدی جب شروع ہورہی تھی تو اس سمندر میں مدوجزر اور تموج وتلاطم انتہائی شورانگیز ہوچکا تھا، یہ ایک نئے مکتبہ فکر کا آغاز تھا، جس سے اب تک ہمارا ملک ناآشنا تھا، اس کی اجمالی تاریخ یہ ہے۔

علم حدیث کے دو سلسلے:

ہندوستان میں اشاعت حدیث کا سلسلہ خانوادۂ ولی اللہی سے چلا، جس نے آگے چل کر ہندوستان گیر شکل اختیار کرلی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ نے درس حدیث کا آغاز کیا اور ان کی وفات کے بعد ان کی مسند درس کو ان کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی متوفی ۱۲۳۹ھ نے رونق بخشی اور عرصہ دراز تک ان کا فیضان علم جاری رہا، انھوں نے حدیث کو ایک فن کی حیثیت سے اپنے تلامذہ کو پڑھایا، جس کی وجہ سے علم حدیث کا ذوق عام ہوا، پھر ان کی جگہ ان کے نواسے حضرت شاہ اسحاق محدث دہلوی متوفی ۱۲۶۲ھ مسند درس پر بیٹھے، تو ان کا علمی فیض ایک تیز دھارے کی طرح پورے ہندوستان میں پھیل گیا، دور دراز سے طلبہ آئے اور اس

☆ سابق مدیر ''ترجمان الاسلام'' بنارس۔

سرچشمۂ علم سے سیراب ہوکر گئے، شاہ اسحاق کے حلقۂ درس سے ان کے تلامذہ کے دوسلسلے چلے، ان کے نامور شاگردوں کے ایک سلسلہ میں شاہ عبدالغنی مجددی مہاجر مدنی، مولانا احمدعلی سہارنپوری محشی بخاری ہوئے اور شاہ عبدالغنی کے ممتاز اور نامور شاگردوں میں مشہور محدث حضرت مولانا رشیداحمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند ہوئے، شاہ اسحاق کے دوسرے سلسلہ کے ممتاز شاگردوں میں مولانا شاہ نذیر حسین بہاری ہوئے اور ان کے ممتاز شاگردوں میں ہمارے ضلع کے مولانا حافظ عبداللہ مئوی ثم غازی پوری، مولانا سلامت اللہ جیراجپوری اپنے استاد کے حلقہ درس سے جوش اور جذبات سے بھرے ہوئے عزم وارادہ لے کر نکلے اور اپنے نئے مسلک کے بڑے پُر جوش مبلغ ہوئے، کہا جاتا ہے کہ شاہ نذیر حسین صاحب بہاری ہی ہندوستان میں غیرمقلدیت کے بانی ہیں اور انھیں کے زمانہ سے اس مکتبۂ فکر نے اپنا نام اہلحدیث رکھا۔ ضلع اعظم گڈھ پر تیسری شخصیت جس کا اثر اس ضلع پر زیادہ پڑا وہ مولانا فیض اللہ مئوی ہیں، جو مولانا سخاوت علی جونپوری کے شاگرد اور علامہ شبلی نعمانی کے استاد تھے، انھیں حضرات کی شبانہ روز جدجہد اور ترغیب وتحریص کے نتیجہ میں ضلع اعظم گڈھ اور بنارس میں غیرمقلدیت کا آغاز ہوا، اور ''حنفیت'' کے خلاف محاذ آرائی شروع ہوئی، اور ہر طرف معرکۂ کارزار گرم ہوگیا، اور سب سے بڑی اور طوفان بدوش لڑائی خود مئو میں ہوئی۔

اہلحدیث احناف جنگ:

سیداحمد رائے بریلوی، مولانا اسماعیل شہید دہلوی مولانا عبدالحی بڈھانوی جو خانوادۂ ولی اللہی کے ساختہ پرداختہ تھے، انھوں نے بدعات وخرافات اور ہندوستان میں پھیلے ہوئے مشرکانہ رسم ورواج اور شیعی اثرات کے خلاف ہندوستان گیر جنگ چھیڑ رکھی تھی، ہرجگہ فتح وکامرانی ان کے قدم چوم رہی تھی، یہ ایک مخلصانہ تحریک اصلاح تھی جس کے بہترین اثرات مسلمانوں پر پڑ رہے تھے، یہ وقت کا سب سے اہم اور بڑا افریضہ تھا جو یہ حضرات انجام دے رہے تھے، یہ براہ راست خاندان ولی اللہی کا فیض تھا، لیکن اسی خاندان کے ایک فیض یافتہ مولانا شاہ نذیر حسین صاحب بہاری نے بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسم ورواج کے خلاف چلنے والے جہاد کا رخ حنفیت کی طرف موڑ دیا اور خاندان ولی اللہی کی تحریک اصلاح کو پس منظر میں ڈال دیا، اور چندفروعی مسائل کو لے کر ایک گھمسان کی جنگ چھیڑ دی کہ الامان والحفیظ! جب کہ پوری اسلامی دنیا میں یہ جنگ عوامی سطح پر کبھی اور کہیں نہیں لڑی گئی، جب کہ یہ جزوی

اختلاف دوسری صدی سے چلا آرہا ہے، ہر ملک میں کسی نہ کسی امام کی فقہ پر عمل ہوتا رہا اور آج بھی اس صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی، صرف ہندوستان میں ایک ایسی جماعت وجود میں آئی جس نے عملاً اکثر مسائل میں امام شافعی کی فقہ پر عمل کیا، لیکن تقریر وتحریر میں تقلید کو اپنے مطاعن ومثالب کا ہدف بنایا۔ اس طرح مولانا شاہ نذیر حسین صاحب بہاری شاہ اسحاق محدث دہلوی کے دوسرے سلسلۂ تلامذہ کے سرخیل اور امام ہوگئے، ان کا اور ان کے شاگردوں کا واحد مشغلہ ردحنفیت رہ گیا، بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسم ورواج کے خلاف تحریک جہاد کے محاذ پر شاہ اسحاق دہلوی کے دوسرے سلسلۂ تلامذہ کے افراد اپنے اسلاف کے مشن میں لگے رہے اور وہ خود احناف پر مشق ستم کرنے لگے۔

یہی وہ ماحول تھا جب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھا، احناف واہلحدیث کی جنگ کے شعلے ابھی سرد نہیں ہوئے تھے بلکہ کہیں کہیں تیز لودے رہے تھے، اس کی چنگاریاں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں اور کبھی کبھی پرسکون اور پرامن آبادی کے امن وسکون کو جلا کر خاکستر کردیتی تھیں، مولانا اعظمی کے گرد وپیش یہی حالات تھے اور یہی ماحول اور شب وروز یہی تذکرہ، مولانا اعظمی کے لیے اس سے صرف نظر کرنا ممکن نہ تھا، جب پورا ضلع اعظم گڈھ مناظروں، مباحثوں اور مجادلوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا تو اس سے کیسے بچا جاسکتا ہے، مولانا اعظمی بھی مجبور ہوکر اس محاذ پر آئے اور زبان وقلم دونوں سے اپنا فرض منصبی ادا کیا اور واقعات بتاتے ہیں کہ آپ نے مسلک احناف کی ترجمانی اور وکالت کا حق ادا کردیا، آپ نے قصبہ کے محلے محلے جلسوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع کردیا، اس مسئلۂ خاص میں مولانا اعظمی کے دست راست حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو صحیح معنی میں امام المناظرین کہے جاتے تھے، ان حضرات نے ضلع اعظم گڈھ کے محاذ پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد ضلع بستی ضلع گونڈہ اور دوسرے اضلاع میں- جہاں بھی یہ جنگ چھڑی ہوئی تھی- پہنچے اور اپنے مسلک کو پوری قوت سے پیش کرکے احناف کی وکالت کا حق ادا کردیا۔ اہلحدیث اور احناف دونوں فریق میں موضوع گفتگو تین چار ہی فروعی مسائل تھے، جن پر گفتگو ہوتی تھی، اس لیے ان مسائل پر مولانا اعظمی نے معرکۃ الآراء رسائل تحریر فرمائے، ''الاعلام المرفوعہ'' اور ''رکعات تراویح'' وغیرہ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، جو اپنے مشتملات اور دلائل وبراہین کے لحاظ سے اپنے اپنے موضوع پر مکمل اور تشفی بخش رسالے تھے۔

فتنۂ انکار حدیث اور مولانا اعظمی:

یہ عجیب حیرتناک بات ہے کہ غیر مقلدین حضرات نے اپنی جماعت کا نام نیک نیتی سے اہلحدیث رکھا ہوگا، جب کہ دلائل شرعیہ میں قرآن کو اولیت حاصل ہے اور اس کے بعد حدیث کا درجہ آتا ہے، نام میں بھی اگر اس کی رعایت ہوتی تو دوسروں کو غلط فہمی نہ ہوتی، اس نام نے کج فہم اور شر پسند عناصر کو ایک دوسرے پہلو کی طرف سوچنے کی راہ دکھائی، اس کی مثال میں ضلع اعظم گڈھ کے مشہور اہلحدیث مناظر مولانا سلامت اللہ صاحب جیراجپوری کا نام لیا جاسکتا ہے، وہ مسلک اہل حدیث میں انتہائی متشدد تھے اور اپنے کو اہل حدیث کہنے پر فخر کرتے تھے، قرآن کے بجائے صرف حدیث سے شیفتگی کے اظہار کا ردعمل ان کے گھر ہی میں ہوا، ان کے صاحبزادے مولانا اسلم جیراجپوری جو ایک بڑے عالم اور ''تاریخ الامۃ'' جیسی کتاب کے مصنف تھے اور جامعہ ملیہ دہلی میں استاذ تھے، ان کے والد نے اپنے کو اہلحدیث کہا تو ان کے بیٹے نے خود کو اہل قرآن کہنا شروع کردیا اور کجروی اتنی بڑھی کہ وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے قرآن کافی ہے، احادیث سب کی سب جعلی، جھوٹ کا پوٹ، نا قابل اعتبار اور جھوٹی ہیں، ان احادیث نے اسلام کی صورت کو مسخ کردیا ہے، اور اس کو ثابت کرنے کے لیے مولانا اسلم جیراجپوری کے ایک ہم مسلک اہل قرآن نے ''دو اسلام'' جیسی زہر آلود اور گمراہ کن کتاب لکھی اور پورے ملک میں اس کی خوب اشاعت ہوئی، اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا کہ اگر احادیث کو صحیح اور سچی تسلیم کرلیا جائے تو پورے اسلام کا حلیہ بگڑ جائے گا اور مثالیں دے کر سمجھایا تھا اور لوگ بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی، اس غلط جماعت نے اہلحدیث کے لفظ سے یہ سمجھا کہ ان کے دلوں میں قرآن کی صحیح عظمت نہیں اور اس کو اسلام کے بنیادی دستور کی کتاب نہیں سمجھتے ہیں اور اپنے لیے صرف حدیث کو کافی سمجھتے ہیں، اس لیے ردعمل کے طور پر انھوں نے اپنی جماعت کا نام اہل قرآن رکھ لیا، اور حد یہ ہے کہ اس زاویۂ فکر نے آگے چل کر فتنۂ انکار حدیث کی شکل اختیار کرلی، بخاری ومسلم کی حدیثوں کا بھی وہ استہزاء کرنے لگے۔ مولانا اعظمی نے جب اس فتنہ کی سمّیت اور زہریلے اثرات کو محسوس کیا تو اس کے جواب میں ایک مختصر رسالہ اردو زبان میں ''نصرۃ الحدیث'' کے نام سے لکھا، جس میں حدیث کی صحت وصداقت اور حجیت کو مدلل طریقہ سے ثابت کیا تھا، اور نا قابل تردید دلائل وشواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا تھا کہ یہ

کلام رسول ہے، اس کی صحت وصداقت میں کسی شخص کو شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ رسالہ مختصر ضرور تھا، لیکن اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب یورپ کے مستشرقین نے فتنہ انکار حدیث کو ہوا دینے کے لیے اپنی کتابیں شائع کیں اور عالمی پیمانے پر احادیث کے خلاف محاذ آرائی کی اور مصر، شام اور ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جو مستشرقین کی آواز میں آواز ملا کر کہنے لگا کہ حدیثیں سب جھوٹی ہیں اور دوسری تیسری صدی میں گڑھ کر رسول کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں، تو مولانا اعظمی کے اسی رسالہ "نصرۃ الحدیث" کے نہج اور دکھائی ہوئی شاہراہ پر چل کر مولانا اعظمی ہی کے ایک شاگرد ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے کیمبرج یونیورسٹی میں بیٹھ کر احادیث کے صحیح اور قابل اعتماد ہونے پر تاریخ کے حوالے سے ڈھائی سو سے زائد شواہد وثبوت کی روشنی میں اپنی تھیسس مرتب کی اور یوروپین محققین کو اس طریقہ استدلال کو ناقابل تردید تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا اور ان کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ان شواہد کی روشنی میں احادیث کو غیر صحیح اور ناقابل اعتبار کہنا درست نہیں اور ان کو ڈگری دینی پڑی، (۱) اس طرح اس مختصر سے رسالے نے عالمی پیمانے پر حدیث کے خلاف چلنے والی محاذ آرائی میں کلیدی رول ادا کیا اور فتح ونصرت کا پرچم مسلمانوں کے ہاتھوں میں دے دیا۔

رد بدعت اور مشرکانہ عقائد کے خلاف جہاد:

خاندان ولی اللہی کے ذریعہ بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد اور رسم ورواج کے خلاف جہاد چھیڑا گیا، سید احمد رائے بریلوی - جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے - ان کے ساتھ مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی (بڈھانوی) نے اس محاذ کو پورے ہندوستان میں وسیع کیا تھا، اس سلسلے کے لوگوں کا پہلا فریضہ تھا کہ اس پاکیزہ سلسلے کو جاری رکھتے تاکہ اسلام اس ملک میں اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ محفوظ رہے، لیکن مولانا شاہ نذیر حسین صاحب بہاری اور ان کے شاگردوں نے اس جنگ کا رخ حنفیوں کی طرف پھیر دیا اور اصل مشن سے انحراف کر گئے، یا کم از کم جتنی توانائیاں اس محاذ پر صرف کرنی چاہئے تھی اتنی نہ کر سکے، اس لئے شاہ اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کے

---

(۱) ڈاکٹر اعظمی کا یہ مقالہ انگریزی میں شائع ہو چکا ہے، بعد میں خود مقالہ نگار نے اس کو عربی زبان میں منتقل کیا اور دراسات فی الحدیث النبوی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کر دیا ہے جس پر مقالہ نگار کو فیصل ایوارڈ دیا گیا۔ (اسیر ادروی)۔

ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے تھیسس لکھتے وقت احقر سے حوالہ جات کی متعدد کتابیں منگوائی تھیں، جن میں ایک "نصرۃ الحدیث" بھی تھی، (رشید احمد الاعظمی)۔

دوسرے سلسلے کے بزرگوں نے جیسے مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا اشرف علی تھانوی نے تحریک اصلاح کو جاری رکھنے کے لیے پوری زندگی اس محاذ پر لگادی، جس کی آخری کڑی مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا اسماعیل سنبھلی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی، مولانا نور محمد ٹانڈوی، مولانا عبدالشکور لکھنوی تھے۔ اس سلسلہ میں ہر طرح کی مخالفتوں دشمنیوں اور مصیبتوں کا سامنا کیا، لیکن اپنے فرض کی ادائیگی میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔

مولانا اعظمی کی اس محاذ پر حیثیت ایک سرپرست کی تھی، آیات واحادیث کے حوالجات اور بروقت یاددہانی اور فریق مخالف کے جواب میں مسکت دلائل کی رہنمائی آپ کرتے تھے۔ ۱۳۵۲ھ میں قصبہ ادری ضلع اعظم گڈھ کا ہنگامہ خیز مناظرہ جس نے پورے ضلع کو متاثر کیا مجھے یاد ہے، یہ مناظرہ مولانا اعظمی کی بروقت مداخلت اور پیش قدمی کی وجہ سے ہوا، اس کا آغاز مولانا عبداللطیف نعمانی نے کیا اور خاتمہ مولانا محمد منظور نعمانی نے، مولانا اعظمی بحیثیت سرپرست ہر نشست میں اسٹیج پر بروقت رہنمائی کے لیے موجود رہتے اور دلائل اور جوابات کی نشاندہی اور ہدایت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

اہل بدعت سرکار دوعالم ﷺ کو مقام اُلوہیت پر پہنچائے اور سارے خدائی اختیارات کو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہونے کا عقیدہ عوام میں پھیلاتے تھے اور اپنی کتابوں کے باب العقائد میں کہتے تھے، مولانا اعظمی نے اس بدعقیدگی اور تثلیث پرستوں کی طرح کھلی گمراہی کے خلاف ''شارع حقیقی'' لکھی، جو پہلے الفرقان بریلی میں بالاقساط شائع ہوئی، بعد میں اس کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ اس طرح زبان وقلم دونوں سے رد بدعت میں اپنا کردار انجام دیا۔

مولانا اعظمی کی فقہی بصیرت:

مولانا اعظمی نے ایک لمبی مدت تک احادیث کا درس دیا تھا اور درس میں ائمہ فقہ کے موافق ومخالف دلائل پر مبصرانہ روشنی ڈالتے تھے، اس لیے آپ میں فقہی بصیرت بتدریج درجہ کمال تک پہنچ گئی، آپ مسائل پر بڑی باریک بینی کے ساتھ غور کرتے تھے اور جواب دیتے تھے، فقہی جزئیات پر وسیع نظر اور فقہ کا گہرا مطالعہ ہونے کی وجہ سے جب دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی کا عہدہ خالی ہوا تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند دونوں حضرات تشریف لائے اور مولانا اعظمی سے دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی کا عہدہ قبول کرنے کی

گذارش کی اور دیو بند چلنے کے یے آمادہ کرنا چاہا،لیکن مولانا اعظمی نے مدرسہ مفتاح العلوم کی ذمہ داری اوراپنے علمی وتحقیقی کاموں کی مصروفیات کی وجہ سے معذرت کردی۔

مولانا اعظمی کے تفقہ اورفقہی بصیرت پر ہندوستان کے مشاہیر علماء کا اتفاق تھا اور اس کا اعتراف کرتے تھے اور مسائل کے بارے میں مولانا اعظمی کی رائے کوقولِ فیصل سمجھتے تھے۔ مجھے مستند راویوں کے ذریعہ یہ واقعہ معلوم ہوا ہے کہ ایک بار لکھنؤ میں ایک موقر ادارہ کی طرف سے ہندوستان کے مشاہیر صاحبِ درس وافتاء علماء کا اجتماع کیا (گیا) اوراس اجتماع میں ان لوگوں کو خاص طور پر مدعو کیا گیا جن کو فقہ سے دلچسپی تھی اور افتاء کا کام کرتے تھے،اس اجتماع نے کئی نشستوں میں بیمہ،انشورنس وغیرہ کے جواز کے سلسلہ میں غور کیا اور دلائل وشواہد کی روشنی میں اس کی بعض صورتوں کے جواز کا فیصلہ کیا اور ان تمام دلائل کو جمع کر کے ایک تفصیلی فتوی مرتب کیا گیا اوراس فتوی پر اجتماع میں موجود تمام علماء کا اتفاق ہوگیا،مگراس کی عام اشاعت سے پہلے ضرورت محسوس کی گئی کہ اگر مولانا اعظمی کی تائید وتصویب حاصل ہوجائے تو اس کو رسالوں اوراخباروں میں اشاعت کے لیے دے دیا جائے،اجتماع نے ایک ذہین اور فقیہ عالم کے ذریعہ یہ تحریر مولانا اعظمی کی خدمت میں بھیجی،مولانا نے یہ تحریر دیکھی اس میں کئی باتیں آپ نے ایسی پائیں جن سے آپ اتفاق نہیں کر سکتے تھے،اس لیے آپ نے اس فتوی پر آٹھ صفحات میں اپنی رائے لکھی جو اس متفقہ فتوی کے خلاف تھی،علماء کے اس اجتماعی فتوی کے خلاف جو دلائل مولانا اعظمی نے تحریر فرمائے تھے اس کو پھر علماء کی مجلس میں پیش کیا گیا تا کہ ان پر غور کر کے اپنے سابقہ فتوی کو برقرار رکھا جائے یا اس کو رد کر دیا جائے،علماء کی اس مجلس نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ مولانا اعظمی نے جن دلائل کی روشنی میں اس کے عدم جواز کا فیصلہ فرمایا ہے وہی صحیح ہے اس کو رد نہیں کیا جا سکتا اور فیصلہ کیا گیا کہ یہ فتوی واپس لے لیا جائے،اس واقعہ سے مولانا اعظمی کی فقہی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا اعظمی کے علمی وتحقیقی کارنامے:

مولانا اعظمی کی عالم اسلام میں شہرت کا باعث یہی علمی وتحقیقی کارنامے تھے، وہ مخطوطے جو قدیم محدثین کے لائبریریوں میں ذاتی کتب خانوں میں پڑے ہوئے تھے،ان کی تصحیح اور تعلیق وتحشیہ سے آراستہ کر کے علمی دنیا کے سامنے آپ نے پیش کر دیا،جن سے پوری امت استفادہ کر سکی۔ اس موضوع سے آپ کی دلچسپی اس قدر بڑھی کہ آپ نے درس وتدریس کے مشغلہ کو ترک کر دیا اور شب

وروز اسی علمی وتحقیقی کاموں کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ آج یہ کام پہلے کی بہ نسبت آسان ہو چکا ہے، اگر فن حدیث پر کسی ریسرچ اسکالر کو عبور نہیں ہے پھر بھی وہ اختلاف نسخ کو چند نسخوں کو سامنے رکھ کر نشاندہی کر دیتا ہے اور **المعجم المفهرس لالفاظ الحديث** کے ذریعہ اس مخطوطہ کی احادیث کی تخریج پر قابو پالیتا ہے، لیکن اس سے پہلے یہ تحقیق وتصحیح وتعلیق وتحشیہ وہی شخص انجام دے سکتا تھا جس کو فن حدیث پر عبور اور اس کا مطالعہ حدیث کا بہت ہی وسیع ہو، مولانا نے اسی دور میں یہ کارنامے انجام دیئے جب یہ سہولتیں میسر نہیں تھیں، بعد کے دور میں بھی آپ نے زیادہ تر اپنی یادداشت اور اپنے مطالعہ پر بھروسہ کیا۔

مولانا اعظمی کو ابتدا ہی سے فن حدیث اور فن اسماء الرجال سے دلچسپی تھی، پھر بیسوں برس تک مسلسل صحاح ستہ کی کتابیں زیر درس رہیں، اس لیے آپ کا مطالعہ وسیع ہوتا چلا گیا، اس لیے احادیث کے حوالے، رجال پر کلام نوک زبان رہتا، انھیں خصوصیات اور فضل وکمال کی وجہ سے جب دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے شیخ الحدیث کا منصب خالی ہوا تو ارکان شوریٰ کی نگاہ میں اس عظیم منصب کے لیے مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ پورے ملک میں کوئی ایسی دوسری شخصیت نہیں تھی جو اس عظیم منصب کے شایان شان ہو، اس لیے مولانا اعظمی سے سفارش کی گئی کہ وہ اس عہدے کو قبول فرمالیں، لیکن مولانا اعظمی نے اپنی دوسری علمی مصروفیتوں کی وجہ سے اس عہدہ کو قبول نہیں کیا اور معذرت کر دی۔

درس وتدریس کے ابتدائی دور ہی میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کے مشہور ترین کتب خانے میں علمی استفادہ کی غرض سے جایا کرتے تھے اور کئی کئی دنوں تک مسلسل وہاں قیام کرتے تھے، ارباب دارالمصنفین کا بیان ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی ان دنوں سیرۃ النبی لکھ رہے تھے، سید صاحب کتاب میں آنے والی حدیثوں کے سلسلہ میں مولانا سے استصواب فرمایا کرتے تھے اور ان کی رائے کو بہت وزن دیتے تھے اور اس کو تسلیم کرتے تھے، اسی دور میں آپ نے رجال طحاوی کی تحقیق وتفتیش شروع کر دی تھی، آپ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب مرتب کرنا چاہتے تھے اور شاید اسی دور میں مرتب بھی کر چکے تھے، کیونکہ آپ نے جو بایوڈاٹا لکھوایا ہے اس میں اس کتاب کا ذکر ہے اور غیر مطبوعہ ہونے کی تصریح ہے، مگر میں اس کی زیارت سے محروم ہوں، البتہ مولانا اعظمی کی تحقیق وتعلیق اور تحشیہ

سے آراستہ ہوکر جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سے جو کتابیں ہماری لائبریری میں ہیں میں ان کا مختصر تعارف یہاں دے رہا ہوں۔

۱:-مسند حمیدی للامام الحافظ ابوبکر عبداللہ بن الزبیر الحمیدی المتوفی ۲۱۹ھ۔

حمیدی امام بخاری کے استاذ ہیں، ان کا اپنا ایک مجموعہ حدیث ہے، جو مسند حمیدی کے نام سے اہل علم میں معروف ہے، ''مسند حمیدی'' کے تین مخطوطے ہندوستان کے کتب خانوں میں تھے اور چوتھا مخطوطہ کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں تھا، ان کے علاوہ اور کہیں کسی نسخے کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے، مولانا اعظمی نے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے مخطوطے کو بنیاد بنا کر حیدرآباد کی سعیدیہ لائبریری اور عثمانیہ لائبریری کے نسخوں سے مقابلہ کیا اور دوران طباعت جب چوتھا نسخہ ہاتھ آیا تو طبع شدہ حصوں میں تو اس سے استفادہ نہ ہوسکا البتہ جو حصہ ابھی غیر مطبوعہ تھا اس میں اس مخطوطے سے مدد لی گئی، محقق نے مسند میں مذکور حدیث کو احادیث کے دوسرے مجموعوں میں تلاش کر کے اس کے حوالے دے دیے ہیں تا کہ مسند میں مذکور حدیث کی تصحیح کا حق پورا پورا ادا ہو جائے، اگر اس روایت کے متعدد طرق ہیں تو ان کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے اور کتاب کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ تصحیح متن کے ساتھ ساتھ آپ نے الفاظ غریبہ کا معنی و مفہوم بھی بتا دیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس کی گئی وہاں حدیث کی توضیح و تشریح کر کے اس کے حقیقی اور واقعی مفہوم و مراد کی بھی تعیین فرما دی ہے، تعلیق و تحشیہ اور توضیحات نے اصل کتاب کی ضخامت کو تقریباً دگنا کر دیا ہے، جہاں کوئی ایسی روایت ہے جو مسند حمیدی کے علاوہ دوسرے مجموعوں میں نہیں ہے تو اس پر محققانہ کلام کر دیا گیا ہے، جیسا کہ رفع یدین کے سلسلہ کی حدیث میں ہوا ہے۔

چونکہ یہ کتاب مسانید کے عام اصولوں پر مرتب کی گئی ہے، اس لیے اس میں باب اور فصلوں کے قائم کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا اور نہ کسی مسند میں ابواب فقہیہ کے طرز پر ترتیب ہوتی ہے، اس لیے مسانید میں روایتوں کی تلاش میں دشواری ہوتی ہے، یہی دشواری مسند حمیدی میں بھی تھی، اس لیے جو لوگ حدیث پر کام کرتے ہیں ان کے لیے کتاب میں حدیث کی تلاش ایک مشکل امر ہے، یہ دشواری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب راوی یا صحابی کا نام معلوم نہ ہو۔ مولانا اعظمی نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا ہے کہ ابواب فقہیہ کے انداز پر اس کی ایک فہرست مرتب فرما دی ہے جس کی وجہ سے

پوری کتاب میں تلاش کی زحمت سے قاری بچ جاتا ہے، اثناء حدیث میں جو نام آئے ہیں ان کی ایک علیحدہ فہرست مرتب کردی گئی ہے تاکہ ہر ایک کی مسند کا صفحۂ آغاز واختتام معلوم ہوجائے، محقق نے اپنے مقدمہ میں امام حمیدی کے حالات، تصانیف، محدثین میں ان کے مقام ومرتبہ، علم وفضل پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈال دی ہے، مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں پہلی بار شائع کیا۔

۲:- کتاب الزہد والرقائق: الامام شیخ الاسلام عبداللہ بن المبارک المروزی المتوفی ۱۸۱ھ۔

یوں تو زہد ورقائق کے عنوان سے متقدمین کی کئی کتابیں ہیں، لیکن عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقائق کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے، یہ دوسری صدی ہجری کے مشہور محدث ہیں، اب تک یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں دنیا کے بعض کتب خانوں میں تھی، شاہ قطر نے اس کتاب کی مائیکروفلم محقق موصوف کو ہدیہ میں ارسال فرمائی تھی، اس کے ملنے کے بعد آپ نے اپنے ذرائع سے اس کے دوسرے مخطوطات کا پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ مصر میں اس کے تین مخطوطے ہیں، ان تینوں کی مائیکروفلم منگوائی گئی، پھر ان چاروں نسخوں کو پیش نظر رکھ کر تقابلی مطالعہ کیا گیا۔

حاکم قطر کا نسخہ وہی تھا، جس کا مخطوطہ استانبول میں ولی الدین جاراللہ کا عطیہ ہے، یہ مخطوطہ ساتویں صدی سے پہلے کا ہے، کیوں کہ اس پر سماع کی تاریخ چھٹی صدی ہجری کی ہے، محقق نے اصل کتاب سے پہلے ۶۳ صفحات کا ایک محققانہ مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے، جس میں زہد ورقائق کی اسلام میں حقیقت کو پیش کیا ہے، پھر آپ نے اس موضوع پر مرتب کی جانے والی ۱۸ کتابوں کی نشاندہی فرمائی ہے اور پھر ان لوگوں کے مختصر ترجمے دیئے ہیں، جنھوں نے کتاب کا سماع کیا ہے، پھر عبداللہ بن مبارک کے تفصیلی حالات دیئے ہیں۔ مولانا موصوف نے حسن بن الحسین المروزی کے مخطوطے کو بنیاد بنایا ہے اور دوسرے مخطوطوں کو سامنے رکھ کر متن کی تصحیح فرمائی ہے، کتاب الزہد میں واقع تمام احادیث کی آپ نے تخریج فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ مفسرین اور محدثین نے کہاں کہاں اس کا ذکر کیا ہے، کتاب میں بہت زیادہ حوالے دینے کی کوشش نہیں کی گئی ہے جیسا کہ آج کل رائج ہے، بلکہ مستند حوالہ اگر ایک ہی ہے تو اسی پر اکتفا کرلیا گیا ہے اور دوسرے کمزور حوالوں کو ترک کردیا گیا ہے، دقیق الفاظ کی تشریح کردی ہے اور روایت کے مفہوم کی مختصر سے مختصر لفظوں میں توضیح فرمادی ہے، مخطوطے میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں یا سہو کتابت تھا اس کی نشاندہی کرکے اس کی تصحیح کی گئی ہے، ایک بڑا اور اہم

کام یہ کیا گیا ہے کہ حروف ہجا کے اعتبار سے صحابہ کرام کے ناموں کو مرتب کر کے بتا دیا گیا ہے کہ کس صفحہ پر ان کی روایت آئی ہے، مسانید کی فہرست میں اس کے جامعین کے ناموں کی ترتیب سے الگ فہرست ہے، مرسل اور معضل روایتیں جن راویوں کی ہیں ان کی فہرست علیحدہ ہے، مقطوع اور موقوف روایتوں کے راویوں کی فہرست بھی دی گئی ہے، کتاب احیاء المعارف مالیگاؤں نے پہلی بار ۱۳۸۵ھ میں شائع کیا ہے۔

۳:- سنن سعید بن منصور: الامام الحافظ سعید بن منصور بن شعبۃ الخراسانی المکی التوفی ۲۲۷ھ۔

امام سعید بن منصور المکی امام احمد بن حنبل، امام مسلم اور امام ابوداؤد سجستانی کے شیخ ہیں، خود انھوں نے امام مالک، حماد بن زید وغیرہ سے روایت کی ہے، اہل علم ان کی کتاب السنن کے نام سے واقف تھے، جو صحاح ستہ سے پہلے مرتب ہوئی تھی، لیکن متاخرین کو اس کے کسی نسخہ کا پتہ نہ چل سکا تھا اور یہ کتاب گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی، خدا جزاء خیر دے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مقیم فرانس کو انھوں نے اس مخطوطے کو ڈھونڈ نکالا اور اس حالت میں اس مخطوطہ کو پایا کہ آسانی سے یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سعید بن منصور کی کتاب السنن کا مخطوطہ ہے، اس کی بازیافت کی داستان یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے علمی کاموں کے سلسلہ میں استانبول (ترکی) گئے، محمد پاشا کوبریلی کے کتب خانے میں اپنے مطالعہ میں مصروف تھے کہ لائبریری کے بعض ذمہ داروں نے ان سے درخواست کی کہ ہمارے کتب خانہ میں کچھ مخطوطات خلط ملط ہوگئے ہیں، ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کس مصنف کے ہیں اور کس کتاب کا مخطوطہ ہے، اگر آپ ان مخطوطات کو دیکھ کر یہ بتائیں کہ یہ کس کتاب اور کس مصنف کے مخطوطے ہیں تو آپ کا علمی دنیا پر ایک بڑا احسان ہوگا، ڈاکٹر صاحب نے حامی بھر لی اور مخطوطات کے اس انبار کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔

کتب خانہ کی مطبوعہ فہرست چونکہ اہل علم کی مرتب کردہ تھی، اس لیے نوے فیصدی اس کے اندراجات درست اور صحیح تھے، لیکن اس فہرست میں ۴۳۸ سے لے کر ۴۴۴ تک کے نمبر جن مخطوطوں پر پڑے ہوئے تھے اس پر کیفیت کے خانے میں ''**نسخة أخرى من مشكوٰة المصابيح**'' لکھا ہوا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس اندراج کو شک کی نگاہ سے دیکھا، کسی پر مصنف ابن ابی شیبہ لکھا ہوا نظر آیا، غرضیکہ فہرست سازی کرنے والوں نے زیادہ عرق ریزی اور تحقیق سے کام نہیں لیا تھا اور ہر حصہ کو ایک

الگ نمبر دے کر لائبریری کے مخطوطات کے خانے میں ڈال دیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے مخطوطات کو پڑھ کر اور مصنف ابن [ابی] شیبہ کے دوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے فیصلہ کیا کہ سر ورق کا یہ اندراج صحیح نہیں ہے، پھر انھوں نے ایک ایک دستخط اور مختلف ورقوں کے مختلف اندراجات اور مہروں کو پڑھ کر قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ یہ یقیناً سعید بن منصور کی کتاب السنن کا مخطوطہ ہے اور سندوں نے اس فیصلہ کی مزید تائید کر دی، لیکن ان مخطوطات میں مکمل کتاب السنن نہیں تھی۔ چونکہ علمی دنیا میں اب تک اس کا کوئی دوسرا نسخہ دریافت نہیں ہوسکا ہے، اس لیے اسی جلد ثالث پر اکتفاء کیا گیا۔ یہی نسخہ محقق علام مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے پاس آیا اور آپ کی تحقیق وتصحیح کے بعد منظر عام پر آیا، جب کسی مخطوطہ کا ایک ہی نسخہ ہو تو اس کی تصحیح وتعلیق ایک دقت طلب امر بن جاتی ہے، نصوص کے ایک ایک لفظ کی تحقیق وتصحیح اسی وقت ممکن ہے جب دوسرے مجموعہائے حدیث پر پوری نظر ہو، مولانا اعظمی نے اپنی وسعت مطالعہ کی بنیاد پر سنن سعید بن منصور کی ایک ایک روایت کی تصحیح اور تحقیق کی ہے، جہاں کہیں سہو نظر آیا اس کی نشاندہی فرمادی ہے اور حوالہ دے دیا ہے، غریب الفاظ کے مفہوم ومعانی اور کہیں کہیں بوقت ضرورت توضیح بھی فرمادی ہے کتاب دو جلدوں میں ہے، جو مخطوطہ کی المجلد الثالث ہے، مجلس علمی ڈابھیل نے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔

۴:- المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ: الحافظ ابن حجر احمد بن علی العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ۔

مشہور شارح بخاری صاحبِ فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانی نے مسند ابوداؤد طیالسی، مسند حمیدی، مسند ابن عمر، مسند مسدد، مسند ابن منیع، مسند ابن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید اور مسند ابن ابی اُسامہ کی روایات کو ابواب فقہیہ کی ترتیب پر جمع کیا ہے، کچھ حصہ مسند ابی یعلی اور مسند اسحاق بن راہویہ کا بھی شامل کرلیا گیا ہے، ان مسانید میں سے کئی ایک نایاب ہیں اور کسی کتب خانے میں اس کا پتہ نہیں چلتا ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب کو مرتب کر کے اس قیمتی ورثہ کے بہت سے اہم حصے کو محفوظ کر دیا ہے، دوسرا اہم ترین فائدہ یہ ہوا کہ براہ راست روایات سے جزئی مسائل کا استنباط کر کے اہل علم کی راہوں میں ایک منارۂ نور کھڑا کر دیا ہے، لیکن المطالب العالیہ اب تک مخطوطے کی شکل میں تھی اور کچھ مخصوص لائبریریوں کی الماریوں کی زینت تھی، کتاب کا ایک مخطوطہ سعیدیہ لائبریری حیدرآباد میں تھا، لیکن یہ

مخطوطہ صرف نصف حصے کا تھا، نصف آخر موجود نہیں تھا، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ محمودیہ مدینہ منورہ میں تھا، لیکن کتب خانہ کی فہرست میں کتاب کا نام تو موجود ہے، لیکن کیفیت کے خانے میں مفقود لکھا گیا ہے، یعنی کتاب ضرور موجود تھی لیکن بعد میں گم ہوگئی، اب سعیدیہ لائبریری کا ناقص واحد نسخہ رہ جاتا ہے، اسی دوران مکتبہ علمیہ کے مدیر شیخ محمد سلطان النمنکانی کو علم ہوا کہ محدث شہیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کو المطالب العالیہ کی تلاش ہے، تو انھوں نے ترکی کے کتب خانوں سے معلومات حاصل کیں، تو معلوم ہوا کہ استانبول کے کسی کتب خانے میں اس کے دو مخطوطے ہیں، جن میں صرف روایتیں ذکر کی گئی ہیں اور سندیں چھوڑ دی گئی ہیں، صرف صحابی کا نام ہے جیسے مشکوٰۃ میں ہے، ان دونوں مخطوطوں کے فوٹو حاصل کر کے شیخ نمنکانی نے مولانا موصوف کو بھیج دیے، ان میں ایک مخطوطہ کا فوٹو اتنا باریک تھا کہ اس کا پڑھنا انتہائی دقت طلب امر تھا، البتہ دوسرے مخطوطے کا فوٹو قدرے صاف اور روشن تھا۔

اب مولانا موصوف کے سامنے تین مخطوطے تھے، آپ نے بلا سند والے مخطوطے کو بنیاد بنا کر تحقیق و تصحیح کا آغاز فرمایا، پہلے مخطوطے کے کاتب ملا محمد بن ملا محمد زید بن ملا محمد عثمان السلیمانی الافغانی ہیں، انھوں نے اس مخطوطے کو ۱۱۰۱ھ میں نقل کیا ہے۔ دوسرے مخطوطے کے کاتب احمد بن عبدالقادر الرفاعی المکی ہیں، انھوں نے اپنا مخطوطہ ۱۱۱۲ھ میں شام کے شہر ادلب میں بیٹھ کر لکھا ہے۔ یہ نسخہ سندوں سے خالی تھا لیکن دونوں نسخوں میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں ہے کہ پہلے مخطوطے میں سندیں بھی نقل کی گئی ہیں، جب کہ دوسرا نسخہ سندوں سے خالی ہے، غالبًا کاتب نے اپنی سہولت کے پیش نظر سندوں کو چھوڑ دیا ہے، چونکہ یہ نسخہ صاف تھا، اس لیے اس کو بنیاد بنایا گیا، لیکن اس میں کتابت کی غلطیاں بہت تھیں، کہیں الفاظ چھوٹ گئے یا بڑھ گئے ہیں، اس کی تصحیح کے لیے باریک خط والے مخطوطے کو پڑھنا ضروری تھا، اس لیے بدقتِ تمام اس کو پڑھنے کی کوشش کی گئی اور متن کی تصحیح کا کام انجام دیا گیا، بس یہی دونوں مخطوطے مولانا موصوف کے پیش نظر تھے اور سعیدیہ لائبریری کا مخطوطہ اگرچہ صاف، کتابت روشن اور قدیم العہد تھا، کیونکہ اس کی کتابت ۸۷۵ھ میں کی گئی ہے، یعنی حافظ ابن حجر عسقلانی کی وفات کے صرف ۲۳ سال بعد لکھا گیا ہے، اس کے باوجود اس سے کام نہ لیا جا سکا کیونکہ یہ نسخہ ناقص بھی تھا اور اس کے فوٹو کا بھی نظم نہیں ہوسکا۔

مولانا موصوف نے سب سے پہلے سندوں سے خالی والے مخطوطے کا تصحیح کے بعد ایک

مبیضہ تیار کیا اور کتابت کے موجودہ طرز کے مطابق علامتوں اور نشانوں کے ساتھ نقل کرایا اور اضافہ کی عبارت کو قوسین کے درمیان رکھا تاکہ امتیاز باقی رہے اور تمام روایتوں پر نمبر شمار ڈال دیے گئے۔ دونوں نسخوں میں جو فرق تھا اس کی وضاحت کر کے تصحیح کی گئی اور جہاں جہاں اجمال تھا اس کی توضیح کی گئی، لیکن ان الفاظ کو حافظ ابن حجر کی عبارت سے الگ اور ممتاز کر دیا گیا، تصحیح میں کمال احتیاط کے پیش نظر اسی موضوع پر مرتب کی جانے والی ایک اور کتاب کو پیش نظر رکھا تھا، حافظ شہاب بوصیری کی کتاب ''**مختصر إتحاف السادة المهرة فی زوائد المسانيد العشرة**'' کا موضوع بھی یہی ہے اور طریقہ کار بھی یکساں ہے، اس لیے محقق موصوف نے اس کو بھی پیش نظر رکھ کر دونوں کا تقابل کیا اور اس سے تصحیح متن میں مدد ملی اور روایتوں کے بارے میں مرتبین نے جو اپنی رائے ظاہر کی ہے اس کی بھی وضاحت فرمادی ہے اور اپنی رائے بھی دی ہے اور اگر کسی دوسرے مجموعہ حدیث میں ضعیف سند سے یہ روایت ہے یا یہاں سند ضعیف ہے اور دوسرے مجموعے میں اس سے قوی سند سے یہی روایت ہے تو اس کی بھی نشاندہی کر دی ہے، جہاں جہاں علامہ بوصیری نے اپنی رائے ظاہر نہیں کی ہے ''**سكت عليه البوصيري**'' سے وضاحت کر دی ہے اور ہر جگہ حوالے دے دیے ہیں اگر دونوں مصنفین کے یہاں حدیث پر کلام نہیں کیا گیا ہے تو مولانا موصوف حدیث کے مرفوع، موقوف، مرسل، یا موصول ہونے کو بتادیتے ہیں، اور اگر سند کے رجال پر کلام ہے تو اس کو فن اسماء الرجال کی روشنی میں اصل حقیقت پیش کر دیتے ہیں، جس حدیث کی سند قوی ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں تو حدیث کے نمبر سے پہلے ایک چھوٹا سا تارا بنا دیا گیا ہے تاکہ پہلی ہی نظر میں قاری حدیث کے وزن کو معلوم کر لے، اگر روایت جس مصنف کی کتاب سے نقل کی گئی ہے اگر کسی دوسرے مصنف کے یہاں بھی ہے تو وہاں اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ حواشی میں بالقصد اختصار کو مد نظر رکھا گیا، البتہ جہاں مفہوم میں پیچیدگی یا الجھاؤ ہے تو وہاں تفصیل سے بھی کام لیا گیا ہے اور جہاں جہاں رجال پر خود کلام کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے تو وہاں خاموشی اختیار نہیں کی گئی ہے، راوی کے بارے میں اپنی دوٹوک رائے دے دی ہے۔

کتاب کویت کے مطبع عصریہ میں چھپی ہے اور کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء مطابق ۱۳۹۰ھ میں شائع ہوا، کتاب چار جلدوں میں ہے، جس کے مجموعی صفحات ۱۷۷۶ ہیں، کتاب کی ابتداء میں

حافظ ابن حجر کے حالات ان کے علم وفضل اور مقام ومرتبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۵:-المصنف : الامام الحافظ ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی المتوفی ۲۱۱ھ۔

مصنف عبدالرزاق احادیث وآثار کا ایک نہایت ہی عظیم الشان ذخیرہ تھا، جس سے امام احمد ابن حنبل، اسحاق بن راہویہ، امام بخاری، امام مسلم جیسے اکابر امت ومحدثین عظام نے استفادہ کیا ہے، لیکن اب تک اس کا کوئی مکمل نسخہ دنیا کے سامنے نہیں آسکا تھا، اس کے اجزاء دنیا کے مختلف کتب خانوں میں بکھرے ہوئے تھے، ضرورت تھی کہ ان تمام اجزاء کو جمع کرکے تحقیق وتعلیق اور تحشیہ سے مزین کرکے علمی دنیا کے سامنے مکمل صورت میں پیش کیا جائے، لیکن ان کے منتشر اجزاء کا اکٹھا کرنا، ساڑھے چار ہزار صفحات اور ۲۱ ہزار احادیث پر مشتمل اس مجموعۂ حدیث کے مخطوطے کو حرفاً حرفاً پڑھنا، ہر حدیث کی تخریج کرنا، دوسرے مجموعہائے حدیث کو پیش نظر رکھ کر نصوص کی تصحیح کرنا پورے ایک ادارے کا کام تھا، کسی فرد واحد کے لیے یہ کام انتہائی دشوار تھا، لیکن اس امر عظیم کو محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے سرانجام دیا اور آج وہ علمی دنیا کے سامنے پوری تحقیق وتحشیہ کے ساتھ طباعت کے خوبصورت لباس سے آراستہ وپیراستہ ہوکر پیش کی جا چکی ہے، جس نے پوری علمی دنیا کو مولانا اعظمی کے فضل وکمال کو تسلیم کرنے پر مجبور کردیا۔ مولانا موصوف نے متن کی تصحیح پر پوری پوری توجہ فرمائی ہے، ایک ایک لفظ کو جانچا اور پرکھا ہے، حتی کہ سہو کتابت سے بھی کسی لفظ کی کمی بیشی ہوگئی ہے تو اس کو بھی حوالوں کے ساتھ درست کردیا ہے، مصنف کی روایتوں کو دوسرے مجموعہائے حدیث میں تلاش کرکے اس کے حوالے دے دیے ہیں، اگر حدیث کے دوسرے مجموعوں میں مصنف کے علاوہ دوسرا طریق ہے تو اس کی بھی نشاندہی فرمادی ہے، اگر کہیں راویوں کو متعین کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے تو اس کو بھی مستند حوالوں سے متعین کیا گیا ہے، نصوص کی تصحیح کے لیے تقریباً تیس پینتیس مجموعہائے حدیث کو پیش نظر رکھا گیا ہے، ہر ایک کے حوالے حاشیہ میں موجود ہیں۔

کتاب گیارہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، ہر جلد کے صفحات پانچ سو سے چھ سو صفحات کے درمیان ہیں۔ کتاب مجلس علمی ڈابھیل نے خوبصورت ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر شائع کیا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء مطابق ۱۳۹۰ھ میں شائع ہوا، بعد میں یہ کتاب بیروت سے شائع ہوئی۔

۶:-مختصر الترغیب والترہیب: حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ۔

مشہور محدث حافظ منذری کی کتاب ''الترغیب والترہیب'' نے اسلامی دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل کی، یہ ترغیب وترہیب اور آخرت کی جزا وسزا کے موضوع پر روایتوں کا انتخاب ہے، کتاب کافی ضخیم تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ روایتوں کے انتخاب میں صحیح اور مستند روایتوں کا التزام نہیں کیا گیا تھا، اس لیے کتاب میں بہت سی روایتیں متن کے لحاظ سے ضعیف تھیں اور بہت سی روایتیں سند کے اعتبار سے، ان وجوہ کی وجہ سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے حافظ منذری کی اس کتاب کی تلخیص کی اور ان روایتوں کو اپنی تلخیص میں بھی جو سند اور متن دونوں لحاظ سے قوی تھیں، کتاب مختصر ہوگئی اور غیر معتبر روایتوں سے بھی کتاب خالی ہوگئی، لیکن حافظ ابن حجر کی یہ تلخیص آج نایاب تھی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو اس کا ایک نسخہ بہرائچ کے ایک کتب خانے میں دوسرا دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں اور تیسرا مخطوطہ لکھنؤ میں دستیاب ہوگیا۔

مولانا موصوف نے ان تینوں مخطوطوں کو سامنے رکھ کر اس کی تحقیق وتصحیح فرمائی، حافظ منذری کی اصل کتاب بھی سامنے رکھی، جہاں جہاں لفظوں اور صیغوں کا فرق تھا اور موقع ومحل کے لحاظ سے جس لفظ کا تقاضا تھا اس کی تصحیح فرمادی اور اکثر مقامات پر منذری کی کتاب کا حوالہ دے دیا، راویوں کے ناموں میں بھی کہیں کہیں فرق کی وضاحت اور تصحیح کردی، کتاب مکتبۃ الغزالی دمشق سے شائع ہوئی ہے[1] اس نسخہ میں مزید یہ کام کیا گیا ہے کہ ساریہ عبدالکریم الرفاعی نے الفاظ غریبہ کی تشریح کردی ہے، کتاب کے آخر میں سولہ صفحات کی فہرست ہے، کتاب میں کل ۸۵۸ حدیثیں ہیں اور ۳۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسرے علمی شاہکار:

جن کتابوں تک میری رسائی ہوئی میں نے ان کا تعارف کرادیا، مولانا مرحوم کے دوسرے کئی ایک علمی شاہکار اور ہیں جو طبع ہوکر پورے عالم اسلام سے خراج تحسین حاصل کرچکے ہیں، لیکن وہ اس وقت میری دست رس سے باہر ہیں، اس لیے ان کا تعارف یہاں نہیں کرایا جارہا ہے، ان میں **''تلخیص خواتم جامع الاصول''** اور **''کشف الاستار عن زوائد مسند البزار**

(۱) یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے، جس پر مقالہ نگار نے یہ مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن مالیگاؤں کی مجلس احیاء المعارف نے ۱۳۸۰ھ میں شائع کیا تھا۔

للهيثمي'' شامل ہیں۔مولانا کا تیسرا تحقیقی شاہکار ''المصف لابن أبي شيبة'' ہے،مولانا اعظمی کے صاحبزادۂ محترم کے بیان کے مطابق مکمل کتاب کا مسودہ تیار ہے،کتاب کی پانچ جلدیں چھپ چکی ہیں، بقیہ جلدیں طباعت کے انتظار میں ہیں،مولانا اعظمی کی عربی زبان میں دو کتابیں ہیں: ایک **الحاوی لرجال الطحاوی** اور **الاتحافات السنية بذكر محدثي الحنفية**. ایک کا تعلق فن اسماءالرجال سے ہے اورایک تذکرہ کی کتاب ہے،صاحبزادے محترم کے بیان کے مطابق مسودے تیار ہیں،مگر مجھے اس کی زیارت نصیب نہیں۔ایک اور کتاب پر تحقیق وتصحیح کا کام پورا ہو چکا ہے،وہ ابن شاہین کی ایک مختصر کتاب ہے جس کا مخطوطہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں دریافت ہوا،میرے دوست مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے اس کتاب کو اپنی تحقیق وتصحیح کے بعد شائع کردیا ہے جو اس وقت میرے سامنے ہے، اس کتاب سے متعلق مسودہ بھی کہا جاتا ہے کہ مکمل تیار ہے۔ ان کے علاوہ اردو میں مولانا مرحوم کی اٹھارہ کتابیں مختلف موضوعات پر ہیں جن سے اہل علم اچھی طرح واقف ہیں۔

شعروشاعری:

مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک رخ شعروشاعری بھی ہے،جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں، شعروشاعری انسانی فضل وکمال کا ہی ایک حصہ ہے،اس سے ذوق سلیم اورموزونی طبع کا اندازہ ہوتا ہے؛لیکن مولانا اعظمی کے عظیم الشان علمی کارناموں کے ساتھ شعروشاعری کا تذکرہ کچھ غیرموزوں سا معلوم ہوتا ہے،اس لیے اس کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے،لیکن یہاں اس کا تذکرہ ناگزیر اس لیے ہے کہ مولانا کی شخصیت پر جب ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی تو زندگی کا اگر یہ رخ چھوڑ دیا جائے تو تصویر ناقص رہ جائے گی،اس لیے میں بہت ہی اختصار کے ساتھ گفتگو کروں گا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے جلیل القدر اسلاف اور علماء میں اکثر شعروشاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے،ان کا کلام دیکھنے اور پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قادرالکلام شاعر تھے،مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند،مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی،مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم،حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی،حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب،مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم،حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی،بقیۃ السلف مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی (خدا ان کی قبروں کو اپنی رحمت کے پھولوں

سے بھردے) ہرایک کا کلام پایا جاتا ہے۔سلاست وروانی، برجستگی، تخئیل ومعنی آفرینی ہرایک کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ یہی عروس شاعری کے زیورات ہیں،اس لیے اگر محدث جلیل مولانا اعظمی نے بھی کبھی اس کوچے میں قدم رکھا تھا تو اس میں کوئی حیرتناک بات نہیں ہے، ہر ذہین شخص موزوں طبع اور ذوق سلیم کا مالک ہوتا ہے، میں نے اردو، فارسی،عربی تینوں زبانوں میں آپ کی نظمیں دیکھی ہیں اور پڑھی ہیں اور پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا ہوں، کلام میں اتنی سلاست اور برجستگی اور محاروات کا اتنا برمحل استعمال ہے کہ جو کسی کہنہ مشق قادرالکلام شاعر کے کلام کی خصوصیت ہوتی ہے،اس کے دوایک نمونے میں آپ کے سامنے پیش کررہاہوں۔

''موج کوثر'' پرمبارکباد:

علامہ اقبال سہیل ہمارے ضلع کے بہت ہی مشہور وکیل اوراس سے کہیں زیادہ شاعر تھے، بلکہ ان کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا تھا لکھنؤ کی انجمن فردوس ادب کا جو سالانہ مشاعرہ مدح صحابہ کے نام سے امین آباد میں پورے تزک واحتشام کے ساتھ ہوتا تھا علامہ اقبال سہیل نے کئی سالوں تک مسلسل اس مشاعرہ کی صدارت فرمائی اوراہل لکھنؤ جب کہ دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتے ان کی صدارت پر فخر کیا کرتے تھے۔انھوں نے ۱۹۴۴ء میں ایک مرصع نعت لکھی،بحر خود مترنم تھی، پھراس سے خوبصورت الفاظ کا استعمال اس ترتیب وسلیقہ سے ہوا تھا جیسے کسی ماہر کاریگر نے ایک بہت ہی خوبصورت زیور میں نگینے جڑ دیئے ہیں۔

اس نعت کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رات کی رانی کی خوشبو نرم رَو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اپنے بے آواز پروں سے اڑتی ہوئی چلی آرہی ہے، مشام جاں معطر ہوجاتا ہے، روح سرشار ہوجاتی ہے، پورا وجود کیف وسرور میں ڈوب جاتا ہے۔۸۶ شعروں پر مشتمل یہ نعت ایک خالص نعت ہے جس میں ذکر رسول کے سوا اور کچھ نہیں۔الفاظ کے ذریعہ ایک نورانی وجود کی پیکرتراشی معلوم ہوتی ہے جیسے سرکار دوعالم ﷺ شاعر کے تصور کی آنکھوں کے سامنے جلوہ افروز ہیں، تجلیات کی رم جھم پھوار پڑرہی ہے اور شاعر کا پورا وجود اس میں نہایا ہوا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے وجود کو بھی فراموش کرچکا ہے، اتنی طویل نظم کے کینوس پر کہیں بھی اپنے وجود کا ایک دھبہ نہیں پڑنے دیا ہے، متصوفین کی اصطلاح میں اسی کو فنافی الرسول کہا جاتا ہے۔

نعت کا عنوان تھا ''موج کوثر''، کوثر وتسنیم میں ڈھلی ہوئی زبان، اسی طرح پاکیزہ، سلیس اور رواں نعت تھی۔ محسن کاکوروی، شہیدی، اور دوسرے شعراء کی نعتوں کا اپنا حسن و جمال، تاثیر اور پاکیزہ جذبات کا اظہار قابل قدر ہے، لیکن اس نعت کی آب وتاب کے سامنے ان کا حسن و جمال ماند پڑ گیا تھا، نعت کا آغاز ہوتا ہے:

احمد مرسل، فخر دوعالم، صلی اللہ علیہ وسلم — مظہر اول، مرسل خاتم، صلی اللہ علیہ وسلم
جسم مزّکی، روح مصوّر، قلب مجلّی، نور مقطر — حسن سراپا خیر مجسم، صلی اللہ علیہ وسلم

اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

راہ میں کانٹے جس نے بچھائے، گالی دی پتھر برسائے — اس پر چھڑکی پیار کی شبنم، صلی اللہ علیہ وسلم
اسوۂ اجمل، دین ممثّل، نطق مدلّل، وحی منزّل — شرع معدّل، سلم مسلم، صلی اللہ علیہ وسلم
علم لدنّی، شان کریمی، خلق خلیلی، نطق کلیمی — زہد مسیحا، عفت مریم، صلی اللہ علیہ وسلم

چھوٹے سائز کے ۱۵ صفحات میں جب یہ پاکیزہ نعت تمام ہوتی ہے تو شاعر کو اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے، آخری شعر ہے:

نظم سہیل ان کا ہی کرم ہے ورنہ یہاں کب تاب رقم ہے — ان اللہ تعالی اعلم، صلی اللہ علیہ وسلم

نظم پڑھ کر وجد آجاتا ہے، روح ذکر رسول کے اس خوبصورت نورانی پیکر کو دیکھ کر سرشار ہوجاتی ہے۔ مولانا اعظمی تو خود شاعر اور سخن شناس تھے، اس نعت کو پڑھ کر جو کیفیت طاری ہوئی اس کا ذکر آپ نے اپنے ایک خط میں کیا ہے، اسی کیفیت سرور کی فضا میں مولانا نے اسی نعت کی بحر اور قافیہ وردیف میں علامہ سہیل کو اس نعت پر مبارک باد دی، نعت میں ''صلی اللہ علیہ وسلم'' ردیف ہے، اس کی موجودگی میں کسی شخص کو مخاطب کر کے اس کی خدمت میں ہدیۂ تبریک نظم میں پیش کرنا کچھ آسان نہیں تھا، کیونکہ ردیف رہوارِ فکر کی لگام کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے، نعت میں خطاب سرکار دوعالم ''صلی اللہ علیہ وسلم'' سے ہے، اس لیے یہ ردیف اپنی پوری معنویت کے ساتھ ہر شعر میں جلوہ گر ہے، لیکن جب خطاب رسول کے بجائے ان کے ایک ادنیٰ غلام سے ہو، اس کے باجود نظم میں یہ ردیف اپنی پوری معنویت کے ساتھ آجائے تو یہ قادر الکلامی کی بہت بڑی سند ہوسکتی ہے۔ مولانا نے علامہ سہیل کو اپنی نظم میں مخاطب بنایا، اس کے باجود ردیف اپنی پوری معنویت کے ساتھ اتنی ہی بیساختگی کے ساتھ استعمال

ہوا جتنی معنویت و بیساختگی نعت میں تھی، مولانا نے مبارکباد کا آغاز اس طرح کیا ہے:

اے اقبال! اے شاعر ملت نازش قوم اور فخر جماعت — مدح نگارِ مرسلِ خاتم، صلی اللہ علیہ وسلم
لکھی تو نے کتنی سچی، کتنی بلند اور کتنی پیاری — نعتِ حضرتِ سرور عالم، صلی اللہ علیہ وسلم
اس نے روحوں کو گرمایا جوش عقیدت اس نے بڑھایا — سب کی زبانوں پر ہے پیہم، صلی اللہ علیہ وسلم
تجھ کو مبارک مدح نگاری، تجھ پر سایۂ رحمتِ باری — تجھ سے راضی ہادی عالم، صلی اللہ علیہ وسلم

آخری شعر میں مولانا نے جو قافیہ استعمال کیا ہے علامہ سہیل کا شاید ذہن بھی اس طرف نہیں گیا ہوگا، قافیہ اچھوتا بھی ہے اور خوب استعمال ہوا ہے اور اس آخری شعر میں جو بات کہی گئی ہے حق یہ ہے کہ سہیل کی اس پاکیزہ نعت کی اس سے زیادہ تحسین اور اس سے بڑی داد کوئی دے نہیں سکتا۔ مولانا کا آخری شعر عربی میں ہے اور لطف یہ ہے کہ اسی بحر اسی قافیہ وردیف کے ساتھ، آپ بھی دیکھیں:

إنّک إن تقرأه علیه، یوم المحشر حین تراه

أرجو منه أن یتبسم، صلی اللہ علیه وسلم

نعت لکھنے والے شاعر کی معراج کمال یہ ہے کہ دربار رسالت میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے، مولانا نے سہیل کے پاکیزہ جذبات عقیدت کی بھرپور داد دیتے ہوئے کہا کہ اگر آپ میدان حشر میں سرکار رسالتمآب ﷺ کو جذباتِ عقیدت سے مملو یہ پاکیزہ نعت سنائیں گے تو مجھے سرکار کی رحمۃ للعالمینی سے امید ہے کہ سرکار نعت سن کر مسکرا دیں گے اس طرح آپ کی نعت کو قبولیت حاصل ہوگی۔

اقبال سہیل کے لیے اس سے بڑی داد، اس سے زیادہ قیمتی خراج تحسین، اس سے بیش قیمت ہدیۂ تبریک اور کیا ہوسکتا ہے۔

فارسی شاعری:

اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی آپ نے طبع آزمائی فرمائی ہے اور وہی سلاست وروانی، برجستگی و معنی آفرینی فارسی نظموں میں بھی موجود ہے، فارسی شاعری کی بھی ایک ہی مثال کافی ہے جب آپ محرم ۱۴۰۰ھ میں اپنے آٹھویں سفر حج کے موقع پر مدینہ منورہ سے واپسی کی تیاری کر رہے تھے اور طلب اجازت کے لیے دربار رسالت میں حاضری دی، دل درد آشنا تھا، عشق کی چوٹ کھائے

ہوئے تھا، آج اس آستانے سے رخصتی کا وقت آ گیا تھا جس آستانے پر تڑپ تڑپ کر جان دے دینا بھی انسان کی سب سے بڑی تمنا سب سے بڑی سعادت ہے، روضۂ اقدس پر نگاہیں جمی ہوئی تھیں، جذبات میں ایک طوفان برپا تھا، دل وفورِ غم سے ڈوبا جارہا تھا، پہلے آنکھیں نم ہونی شروع ہوئیں، پھر بھر آئیں، سیلابِ اشک صبر وضبط کا بند توڑ کر ابل پڑنے کے لیے بضد تھا، جب مواجہہ شریف میں آخری سلام عرض کرنے کے لیے زبان کھولی تو آنکھیں برسنے لگیں، ہر منظر دھندلا ہونے لگا، شدت غم سے آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، اسی بے خودی وخود فراموشی کی کربناک کیفیت میں یہ اشعار موزوں ہوگئے، ان اشعار میں عشق ومحبت کی روح چیختی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اسی درد وکرب کی کیفیت کو تصور کی آنکھوں کے سامنے رکھئے اور یہ اشعار پڑھئے، یہ یاد رکھئے کہ دیار حبیب سے اپنے وطن واپسی کا وقت ہے، آپ نے کہا:

زآستانت باسر اشکِ غم بہ یادت می روم — بادلِ صد چاک وباصد یاس وحسرت می روم
گر توانستم نمی بودم زپائے تو جدا — می روم لیکن بقصد وعزم عودت می روم
می روم سوئے وطن وزدردِ دل بے اختیار — نالۂ دارم کہ می گوئی بہ غربت می روم

تیسرے شعر میں وطن اور غربت کا تقابل قابل دید ہے، آدمی جب گھر اور وطن چھوڑ کر پردیس جاتا ہے تو فطری طور پر غمزدہ ہوتا ہے، لیکن پردیس سے وطن واپسی کے وقت انسان انتہائی مسرور ہوتا ہے، لیکن یہاں وطن کی واپسی پر درد وکرب کا وہی احساس ہے جو وطن چھوڑنے کے وقت ہوتا ہے، دیار حبیب چھوڑ کر یہ وطن واپسی نہیں، بلکہ اپنے روحانی وطن چھوڑ کر دیار غربت کا سفر بن گیا ہے، کیونکہ نگاہیں سرکارِ دوعالم ﷺ کے روضۂ اقدس کی دید سے محروم ہوجائیں گی جو دل درد آشنا کے لیے سرمایۂ سکون ونشاط تھا، مدینہ منورہ سے واپسی گویا اسی سرمایۂ سکون ونشاط کا لٹ جانا تھا، یہ اشعار انھیں کیفیات کے ترجمان ہیں، زبان سلیس اور شگفتہ ہے اور فارسی شاعری کا لب ولہجہ اور اس کی فضا برقرار ہے، یہی کمال شاعری ہے۔

عربی شاعری:

مولانا اعظمی عربی زبان کے ادیب تھے، اس فن سے دلچسپی آپ کو طالب علمی کے دور سے تھی، یہاں تک کہ جب آپ دیوبند بغرض تعلیم تشریف لے گئے تو آپ نے مطلوبہ کتابوں میں ادب

کی کسی کتاب کا نام نہیں لکھا تھا تو شیخ الادب کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں، میں بقدر ضرورت پڑھ چکا ہوں۔ اس جواب پر شیخ الادب نے مختلف کتابوں کے پے در پے امتحان لیے اور رپورٹ لکھی کہ اس طالب علم کو ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ عربی میں آپ نے اکابر علماء، اور مشائخ کے بہت سے مرثیے لکھے ہیں جن میں اپنے استاذ علامہ شبیر احمد عثانی پر ایک طویل مرثیہ بھی شامل ہے، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اپنی بے مثال قومی خدمات کی وجہ سے عوام وخواص کے دلوں میں عظیم مقام رکھتے تھے، ان کی وفات ہوئی تو مولانا اعظمی کو بھی اس سانحۂ وفات پر سخت صدمہ ہوا، کیونکہ ان کی عظیم الشان قومی وملی خدمات سے بے حد متاثر تھے، چند اشعار بطور مثال پیش ہیں:

كـان الـفـقـيـد أخـونا حفظ رحمن	شهـمـاً، نبيلاً عـظيم القدر والشان
عـاش الفقيد نقيّ العرض عن دنس	فـمـالـه مـن عـائب فينـا ولاشـان
وليـس يـوم رزئـنـا فيـه صـاحبنـا	بيـوم حـزن ولـكـن يـوم أحـزان
فـمن لمجلس شورىٰ ديوبند ومن	لـمسلمي الهند من قاص ومن دان
يـحـمـي حـقـوقهم بالانتصار لهم	فـي البـر لـمـان بتصريح وإعلان

تینوں زبانوں میں آپ کی نظمیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ طبع موزوں کے مالک تھے، اس لیے جب بھی کسی مرحلے پر تاثرات نے دل ودماغ پر اثر ڈالا تو خوابیدہ شعری صلاحیت بیدار ہوجاتی ہے اور غیر اختیاری طور پر آپ سے اشعار کہلوادیتی ہے، چونکہ عصر حاضر میں شعر وشاعری فقاہت سے فروتر چیز شمار ہونے لگی ہے اور بعض حالات میں ناپسندیدہ بھی بن جاتی ہے، اس لیے آپ نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ مولانا اعظمی کی شاعری اُسی طرح کی ہے جس طرح ایک انسان کے دل ودماغ پر کوئی حادثہ گذرتا ہے اور اس سے متاثر ہوتا ہے، کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے، کوئی غم لاحق ہوتا ہے تو دوسروں سے بیان کر کے اپنے غم کو ہلکا کر لیتا ہے، مولانا کی شاعری بھی اسی قبیل سے ہے، مولانا نے اپنے تاثرات دوسروں سے بیان کرنے کے بجائے ان کو شعر کا قالب دے دیا اور اپنے تاثرات کی شدت کو ہلکا کر لیا، اسی لیے آپ نے اپنے اشعار کسی کو نہیں سنائے لکھ کر رکھ لیا، کبھی کسی نے نقل کر کے کسی اخبار یا رسالہ میں بھیج دیا تو چھپ گئے، آپ نے اپنے اشعار دوسروں تک پہنچانے کی بالقصد کبھی کوشش نہیں کی اور نہ یہ بات آپ کے مزاج کے مطابق تھی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ حدیث کا عہد زریں

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ

خطیب بغدادی نے ایک عالم کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کی بستی کے فلاں عالم شہرت و ناموری اور دینی و علمی خدمات میں آپ سے بہت آگے ہیں، حالانکہ آپ علم و فضل میں ان سے بہت آگے ہیں؟ اس کے جواب میں اس عالم نے کہا کہ بات یہ ہے کہ وہ اپنی بستی سے نکل کر شہر میں چلے گئے، جہاں ان کو خدمت کے مواقع ملے اور میں اپنی بستی ہی میں پڑا رہا، اور میرا حلقہ بہت محدود رہا۔ یہ بات صرف علم ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر بڑے کام کے لیے باہر سے تعلق پیدا کرنا ضروری ہے۔ اسلامی تاریخ ایسے ائمۂ علم و فضل سے بھری پڑی ہے، جو دور افتادہ کوردہ اور گمنام قریات و دیہات میں پیدا ہوئے اور مختلف ملکوں اور شہروں میں جا کر اپنے کاموں اور کارناموں کی وجہ سے امامت و شہرت کے مالک ہوئے، اور ان میں کچھ ایسے اہل علم بھی گزرے ہیں جو علمیت و قابلیت میں بہت آگے ہونے کے باوجود اپنے محدود ماحول میں رہ جانے کی وجہ سے نہ ان کا فیض عام ہو سکا اور نہ ان کو شہرت و ناموری حاصل ہو سکی۔

ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد نداردتنگنائے شہر تاب حسنِ صحرائی

ہم اپنے مخدوم و محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تیس سالہ زندگی کی علمی و دینی خدمات کو دیکھتے ہیں، تو ان کی پچھلی زندگی گمنامی کی زندگی معلوم ہوتی ہے، جو مئو اور اس کے اطراف میں گذری ہے، اس دور میں مقامی مدارس میں اونچی تعلیم اور مختلف فیہ موضوعات پر بلند پایہ تصانیف ضرور ہیں، مگر ان کی افادیت و اہمیت کو وہ عموم حاصل نہ ہو سکا جو مولانا کے بلند علمی مقام کے شایان شان ہو، البتہ خاص خاص علمی و دینی حلقے اور اہل علم مولانا کے مقام و مرتبہ کے معترف تھے، جن میں ملک اور بیرون ملک کے علماء کی اچھی خاصی تعداد ہے، ان میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی، مولانا ابوالوفا صاحب صدر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ

حیدرآباد، علامہ شیخ محمد زاہد کوثری قاہرہ، شیخ احمد محمد شاکر قاہرہ جیسے اساطین علم اور مشاہیر امت کے نام ملتے ہیں۔ اس دور کی تصانیف میں الاعلام المرفوعہ، نصرۃ الحدیث اور رکعات تراویح مولانا کے حدیث وفقہ میں تبحر کی دلیل ہیں، اس کے باوجود یہ دینی وعلمی خدمات دوسرے دور کی شاندار اور تابناک خدمات کی تمہید معلوم ہوتی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم کا یہ چشمہ آہستہ بہتے بہتے سیل بے کراں بن کر پھوٹ پڑا۔ اس طرح مولانا مرحوم کی علمی زندگی قریٰ کی اور بلاد کی ناموری کا مجموعہ تھی۔

مولانا نازک مزاج، ذکی الحس، لطیف الطبع اور دوراندیش انسان تھے، ۱۹۶۰ء میں جب کہ ان کی علمی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا، ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی، طرح طرح کے عوارض واسقام لاحق ہوگئے تھے، قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوگیا، اس دور کے اکثر خطوط میں بخار، ضعف بصارت، دوران سر اور دوسرے امراض کا ذکر کیا کرتے تھے، مگر اللہ کی شان کہ اس دور میں ان کو علم حدیث کی عظیم الشان خدمت کی توفیق ملی اور بڑھاپے میں امراض واسقام کے ہجوم کے باوجود وہ کام کیا جو جوانی میں کرنے کا تھا وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ع

بڑھاپے میں جوانی سے بھی زیادہ جوش ہوتا ہے

اور کسی پر صادق آئے یا نہ آئے مولانا پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حدیث کے خدمت گاروں کے حق میں دعا فرمائی ہے: **نضّر اللّٰہ امرأً سمع مقالتی فوعاھا ثم بلّغھا الخ** یعنی اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو تروتازہ اور سرسبز وشاداب اور ہرا بھرا رکھے جو میری بات سن کر دوسرے کو پہنچائے، اس نبوی دعا کا ظہور مولانا مرحوم کی آخری زندگی میں یوں ہوا کہ مادی اور جسمانی عوارض وامراض کے باوجود علم حدیث کی خدمت کے لئے بے پناہ قوت وہمت عطا ہوئی اور اس حال میں پورے نشاط وانبساط کے ساتھ مولانا نے وہ دینی وعلمی کارنامے انجام دیئے جو جوانی اور صحت کے زمانہ میں کیے جاتے ہیں، یہ بات بھی مولانا کی زندگی کے امتیازات میں سے ہے کہ بڑھاپے میں انھوں نے جوانی سے زیادہ کام کیا، اس علمی ودینی خدمات کے شاندار دور کی داستان ذرا تفصیل طلب ہے۔ میں ۱۹۵۰ء میں بمبئی گیا، اس کے بعد مولانا محمد اسحاق صاحب بنارسی مرحوم بھی بسلسلۂ تجارت بمبئی پہنچے، مولانا سے ہم دونوں کے علمی ودینی تعلقات بہت پہلے سے تھے، اور دونوں ہی مولانا کے بے تکلف معتقدین وخدام میں تھے، مولانا بنارسی تو مولانا کے تلمیذ عزیز ہی تھے، راقم زمانۂ طالب علمی سے مولانا

کے معتقدین میں تھا۔مولانا بنارسی صابوصدیق مسافر خانہ کے پاس الکریم منزل میں مقیم تھے اور عربوں کے ساتھ بنارسی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے،اور میں اسی کے قریب جنجیکر اسٹریٹ میں رہتا تھا،اورروز نامہ ''انقلاب'' اور ماہنامہ ''البلاغ'' سے متعلق رہ کر لکھنے پڑھنے میں مصروف تھا۔

ان ہی ایام میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد ایوب صاحب مدرسہ مفتاح العلوم مئو کے چندہ کے سلسلہ میں مالیگاؤں سے بمبئی آئے،ہم دونوں کی وجہ سے دونوں بڑے انشراح کے ساتھ کئی دن بمبئی میں مقیم رہے۔یہیں سے مولانا کے علمی خدمات کے دوسرے دور کی ابتدا ہوئی اس کے بعد مولانا سفر حج اور دوسرے مواقع سے بمبئی تشریف لاکر ہفتوں ہفتوں قیام فرماتے رہے، ویسے بمبئی میں مولانا کے قدیم معتقد وخادم شیخ انجینئر مرحوم تھے،جن کے یہاں مولانا قیام کیا کرتے تھے، مگر اب ان کا زیادہ وقت ہم لوگوں کے یہاں گذرنے لگا تھا،اسی دوران میرے چھوٹے بھائی قاضی حیات النبی مرحوم اور دوسرے چند لوگ بمبئی آگئے اور اچھا خاصا حلقہ بن گیا،جس میں بمبئی کے متعدد قدرداں بھی شامل تھے،ہم لوگ چونکہ مولانا کے بے تکلف مزاج شناس تھے،اور مولانا بھی ہم لوگوں سے مانوس اور افتادطبع سے واقف تھے اس لیے کسی قسم کا ذہنی وفکری انقباض محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ ہر وقت خوش وخرم اور پوربی زبان کے محاورہ میں ''بحال'' رہا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں خیال ہوا کہ بمبئی یا مئو میں ایک علمی ادارہ قائم کیا جائے،جس میں تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کا کام ہو اور اس کے امکانات پر غور کیا جانے لگا،اسی سلسلہ میں مولانا نے میرے نام ۲۲/اکتوبر ۱۹۶۰ء کو لکھا کہ ''مالیگاؤں میں ۱۹ دن لگ گئے،اس کے بعد بمبئی آنے کا موقع معلوم نہیں ہوا، نیز بڑا محرک آنے کا یہ خیال تھا کہ آپ سے یحیٰی زبیر سے بمبئی میں کسی ادارہ کے لیے بات ہوئی ہوگی، جب معلوم ہوگیا کہ یہ بات نہیں ہے تو کوئی خاص محرک نہیں رہا،اپنے (قرب) وجوار میں اب بھی میرا خیال ہے کہ جیسا ادارہ آپ چاہتے ہیں قائم ہونا مشکل ہے،اسی طرف (بمبئی) ایسے ادارے قائم ہوسکتے ہیں اور چل بھی سکتے ہیں،اس طرف (اپنے قرب وجوار میں) بخل،حسد،اور بے ذوقی نے راستے بند کر رکھے ہیں،لیکن اُدھر (بمبئی) جو خرابیاں ہیں ان کا انکار بھی ممکن نہیں،آپ دور رہتے ہیں اس لیے قرب مطلوب ہے،مگر مستقل قرب حاصل ہوجائے تو یقین ہے کہ یہاں کے حالات چند ہی دنوں میں......؟ کو مرغوب ومطلوب بنادیں گے، میں آج کل کھانسی سے بہت پریشان ہوں،آج خصوصیت سے زیادہ

مضمحل ہوں، بہت جبر کر کے یہ خط لکھ رہا ہوں۔''

میں ادارہ کے قیام کے سلسلہ میں متعدد بار مولانا کی خدمت میں مئو گیا اور وہیں ادارہ کے قیام کی کوشش کی، مولانا کے رفیق خاص مولانا عبداللطیف صاحب مرحوم جو اس وقت مئو میونسلپٹی کے چیرمین تھے، انھوں نے اس رائے سے بالکلیہ اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کے لیے زمین اور عمارت کا ذمہ لیتا ہوں، تصنیف وتالیف آپ لوگوں کا کام ہے، اس کے باوجود مولانا مرحوم کی شدت احتیاط اور اس وقت کی صورتحال کی وجہ سے ادارہ مئو میں قائم نہ ہوسکا، اور مالیگاؤں میں مجلس احیاء المعارف کے نام سے احادیث کے مخطوطات کی نشر واشاعت کے لیے ایک ادارہ عمل میں آیا۔

اس کی صورت یہ ہوئی کہ مالیگاؤں کے مولانا عبدالحمید نعمانی مرحوم جن کا آبائی وطن مبارکپور ہے، مولانا کی علمی شہرت سن چکے تھے، انھوں نے مالیگاؤں میں ''معہد ملت'' کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی، اس کے افتتاحی جلسہ میں میری کوشش سے بمبئی میں دولت کویت کے مدرسہ کویتیہ کے استاد مدحت اسماعیل میرے ساتھ شریک ہوئے، اور تدریسی خدمت کے لیے مولانا بشیر احمد مبارکپوری مرحوم، مولانا محمد عثمان صاحب مبارک پوری اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی بلائے گئے، اس کے بعد مولانا نعمانی اپنی بعض تالیفات وتراجم کی کتابت کے لیے بمبئی آتے جاتے رہے اور ہم لوگوں سے ملتے جلتے رہے، انھوں نے چاہا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کسی صورت سے سال میں چند ماہ ''معہد ملت'' میں قیام کریں اور ان سے علمی استفادہ کیا جائے، مولانا مرحوم اس کے لیے تیار نہ تھے، تو مولانا نعمانی نے یہ تجویز رکھی کہ مالیگاؤں میں ایک نشریاتی ادارہ قائم کیا جائے، جس میں حدیث کی نادر ونایاب کتابوں کی تصحیح وتعلیق مولانا کی نگرانی میں ہو اور وہیں سے ان کو شائع کیا جائے۔ یہ تجویز مولانا کے لیے بڑی پُرکشش تھی، گویا ان کی دیرینہ دلی مراد پوری ہورہی تھی، مگر جیسا کہ مولانا نے اپنے خط میں لکھا ہے بمبئی اور اطراف بمبئی کے ذہن ومزاج اور حالات سے مطمئن نہیں تھے، جب مولانا نعمانی کا تقاضا زیادہ ہوا تو مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ نعمانی بار بار تقاضا کرتے ہیں، مالیگاؤں چلو اور ادارہ کے قیام کے لیے فضا سازگار کی جائے، چنانچہ بمبئی سے مولانا، میں اور حاجی یحییٰ زبیر صاحب مالیگاؤں گئے اور وہاں کے اہل علم میں سے مولانا عبدالقادر صاحب، مولانا محمد عثمان صاحب اور دیگر علماء کے ساتھ معہد ملت کے مذکورہ بالا اساتذہ کی جدوجہد سے مجلس احیاء المعارف کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا اور ایک ہفتہ وہاں رہ کر اس کے لیے جملہ انتظامات کیے

گئے، جس سے اسی سال ۱۹۶۰ء میں پہلی کتاب ''انتقاء الترغیب والترہیب'' شائع ہوئی، امام ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی شامی مصری متوفی ۶۵۶ھ رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث کی مشہور کتاب الترغیب والترہیب کا انتقاء واختصار حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو اس کا پہلا قلمی نسخہ شاہ نعیم اللہ بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ میں ملا، اس کے بعد دوسرا قلمی مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں دستیاب ہوا، تیسرا نسخہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں تھا، مولانا فرماتے ہیں کہ بہرائچ والے نسخہ کی طباعت واشاعت کے لیے میں بے تاب تھا کہ احیاء المعارف مالیگاؤں کا قیام ہوا اور اس کی اشاعت ہوگئی، ادارہ کی پہلی یہ کتاب ۱۳۸۰ھ=۱۹۶۰ء میں ۲۲۵ صفحات میں چھپ کر شائع ہوئی، مولانا نے اس کتاب کے تینوں مخطوطات کا مقابلہ کر کے حاشیہ میں اختلاف نسخ کو بیان کیا ہے، اغلاط کی تصحیح کی ہے اور امام منذری کی اصل کتاب الترغیب والترہیب کو بھی سامنے رکھ کر تعلیق وتصحیح فرمائی ہے، اس کام میں مولانا کے شریک کار بعض اہل علم بھی رہے ہیں، مولانا نے ۲۲/اکتوبر ۱۹۶۰ء کے خط میں مجھ کو لکھا کہ:

''الترغیب والترہیب ۱۶ یا ۲۰ صفحات باقی تھے، اب وہ بھی چھپ گئے، تصحیح اغلاط وغیرہ کی طباعت ہو رہی ہے، آئندہ کیا ہوگا؟ کچھ معلوم نہیں، نہ میں نے کوئی بات کی''۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''پرسوں سے مولانا وصی اللہ صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، آپ کی کتابیں پیش کر دی گئیں، بڑی مسرت سے قبول کیا، الترغیب والترہیب کے صرف ۱۵۰ نسخے باقی ہیں، سب فروخت ہوگئے، دوسرے کام کا ابھی تک کوئی بندوبست نہیں ہے، آپ کو تو زبانی ہی حالات زیادہ معلوم ہوں گے۔ الحمدللہ آج کل میری صحت اچھی ہے''۔

اس خط میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جس کی وجہ سے ''احیاء المعارف'' پر بھی اثر پڑا اور مولانا کا اندیشہ صحیح ہونے لگا، مجلس احیاء المعارف سے دوسری کتاب ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۶ء) میں حضرت امام عبداللہ بن مبارک متوفی ۱۸۱ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الزہد والرقائق شائع ہوئی، جو اپنے موضوع پر ایک عظیم کتاب ہے اور علماء اسلام کے قدیم ترین دور تصنیف سے تعلق رکھتی ہے، اس نادر وعظیم کتاب کا قلمی نسخہ مکتبہ ولی الدین جاراللہ استنبول میں تھا، جس کا عکسی فوٹو حاکم قطر شیخ علی بن عبداللہ نے اپنے مکتبہ کے لیے نادر ومخطوط کتابوں کے فوٹو جمع کرتے تھے، اور چونکہ یہ کام حاکم قطر کی اجازت ومرضی سے ہوا

تھا، اس لیے مولانا نے مقدمہ میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے، نیز قاہرہ کے معہد مخطوطات سے اس کتاب کے تین فوٹو مجلس احیاء المعارف کے ذریعہ آئے، ان سب سے مولانا نے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے، کتاب الزہد کے دو نسخے تھے، ایک ابوعبداللہ حسین بن حسن بن حرب مروزی نزیل مکہ متوفی ۲۴۶ھ کا جو ۵۶۴صفحات میں ہے، دوسرا نسخہ ابوعبداللہ نعیم بن حماد مروزی مصری متوفی ۲۲۸ھ کا جو درحقیقت مروزی کے نسخہ پر زیادات ہے، یہ ۱۳۲صفحات میں ہے، مولانا نے اس کی تعلیق وتصحیح میں بڑے ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا ہے، اوراس میں ان کے روحانی اوراحسانی ذوق کی پوری جھلک موجود ہے، زہد کے موضوع پر نہایت وقیع معلومات جمع کی ہیں، امام عبداللہ بن مبارک کے حالات نہایت تفصیل سے درج کیے ہیں، کتاب الزہد کے راویوں کے تراجم کی تحقیق کی ہے، کتاب کے موضوعات، اس کی مسند ومرفوع احادیث، موقوفات صحابہ، موقوفات تابعین وتبع تابعین، حضرات انبیاء اوران کی احادیث کی علیحدہ علیحدہ مفصل فہرست مرتب کی ہے، جو بجائے خود نہایت دقت اور محنت طلب کام ہے، آخر میں استدراکات وتعقبات ۱۵صفحات میں دیئے ہیں جن میں نہایت نادرونایاب معلومات ہیں، اس کتاب کی تحقیق وتعلیق میں پچاس کتابوں کی فہرست بھی دیدی ہے، الغرض یہ کتاب مولانا کے علم وتحقیق اور حدیث وفقہ اور رجال میں تبحر کا مظہر بن گئی ہے، اوراس آئینہ میں ان کے علمی کمالات کی پوری عکاسی ہے، تعلیقات میں احادیث کی تخریج کرکے بتایا ہے کہ مشہور ومتداول احادیث کی کتابوں میں یہ حدیثیں کن کن کتابوں میں ہیں۔ مشکل الفاظ کی شرح کی ہے، سند کے رجال پر روشنی ڈالی ہے، نسخوں کے اختلافات درج کیے ہیں۔

۱۱رفروری ۱۹۶۶ء کے خط میں کہتے ہیں:

''کتاب الزہد پوری چھپ گئی، صرف فہرستیں باقی ہیں، پورا ایک مہینہ گذرگیا اوراب تک نہیں چھپیں، اب میں عنقریب مالیگاؤں آرہا ہوں، امید یہی ہے کہ ۲۰رفروری سے پہلے انشاء اللہ پہنچ جاؤں گا اوراپنے سامنے چھپوا کر آپ کو جتنے نسخے مطلوب ہوں گے آپ کو اور کچھ کچھ نسخے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ بھجوانے کی کوشش کروں گا۔ مولانا افغانی کے یہاں کتاب الزہد مطبوعہ فرمے بھجوادیئے تھے کہ مختصر سی تقریظ لکھ دیجئے تو لکھا کہ فرصت نکال کر لکھ دوں گا، مگر غالبًا اب تک لکھ کر بھیج نہیں سکے، خیال تھا کہ رمضان کے آخر میں کتاب پریس سے نکل آتی تو حجاج کے ہاتھ حرمین روانہ ہوسکتی تھی''۔

کتاب الزہد والرقائق کی اشاعت سے پہلے ہی مولانا کی علمی مشغولیت کا شہرہ ملک کے خاص خاص علمی واشاعتی اداروں تک پہنچ گیا اور وہ مولانا کی علمی خدمت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگے، چنانچہ مجلس علمی ڈابھیل (سورت) کے ارکان نے مصنف عبدالرزاق صنعانیؒ کی تعلیق وتصحیح کا کام بہت پہلے مولانا کے سپرد کردیا، جو آپ کی دلی خواہش کے عین مطابق تھا۔ کتاب الزہد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: **وما كنت لأ تمكّن من اختلاس الفرصة لذلك، لانصراف همتي بالكلية إلى تحقيق المصنف للإمام عبدالرزاق بن همام الصنعاني منذ أعوام الخ.**

اس زمانہ میں ہندوستان کے مشہور علمی ادارہ دائرۃ المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے مولانا سے مدد چاہی، بلکہ مستقل طور سے حیدرآباد میں قیام کی دعوت دی، مولانا نے ۱۴؍رمضان ۱۳۸۶ھ کے خط میں لکھا کہ، حیدرآباد کے متعلق آپ نے جو سنا ہے صحیح ہے۔ ان کے کئی خطوط آئے تو میں نے اتنا لکھ دیا کہ میں جو کام (مصنف عبدالرزاق کا) کر رہا ہوں اس کو مؤخر نہیں کرسکتا، بس اس میں ہی سے یہ وقت نکال کر یا اس سے فاضل وقت میں اکمال (الاکمال لابن ماکولا) وانساب (کتاب الانساب سمعانی) کا کام کروں گا، پھر دوسرے خط میں انھوں نے خواہش کی کہ حیدرآباد ہی آجایئے، میں نے لکھا، یہ کیونکر ممکن ہے، وہاں آکر میں مصنف کا کام نہیں کرسکتا، حق الخدمۃ کے باب میں وہ یہ نہیں بتاتے کہ معلّمی صاحب (شیخ عبدالرحمٰن معلّمی یمانی مصحح دائرۃ المعارف) کو کیا دیتے تھے، ان حالات میں کیا امید ہے کہ میں اکمال وانساب کا کام کرسکوں گا۔

اس کے بعد مولانا نے مجلس علمی ڈابھیل کے علمی کام میں تعاون کو مستقل طور سے پسند فرمایا اور احادیث کی متعدد قدیم ونادر کتابوں کی تصحیح وتعلیق کرکے عالم اسلام کو ممنون فرمایا، اور مصنف عبدالرزاق کے ساتھ مسند حمیدی کو ایڈٹ کیا، جو دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

امام ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی مکی متوفی ۲۱۹ھ رحمۃ اللہ علیہ امام سفیان ابن عیینہ کے شاگرد اور امام بخاری کے استاد ہیں، ان کی مسند ابتدائی مسانید میں شمار ہوتی ہے، اس کے چار قلمی نسخے مولانا کو ملے، ایک دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ سے، دوسرا کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد سے، تیسرا کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے اور چوتھا نسخہ اثنائے طباعت میں کتب خانہ ظاہریہ دمشق سے عکسی فوٹو کے ذریعہ، یہ تمام نسخے مولانا نے ذاتی طور سے حاصل کیے اور مجلس علمی ڈابھیل کے اراکین نے اس کو

شائع کیا۔

مسند حمیدی کے بارے میں ۳۰؍جنوری ۱۹۶۲ء کے خط میں مولانا کہتے ہیں کہ ''مصنف عبدالرزاق کی تحقیق کا کام میں نے شروع کردیا ہے،حمیدی کا جزءاول عنقریب شائع ہوگا''۔

مصنف عبدالرزاق جیسی عظیم وضخیم کتاب کی تحقیق کے ساتھ مولانا نے مسند حمیدی کے بعد سنن سعید بن منصور خراسانی مکی متوفی ۲۲۷ھ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق وتعلیق کی خدمت بھی انجام دی، جو ۱۳۸۷ھ (۱۹۶۷ء) میں مجلس علمی کی طرف سے شائع ہوئی، حدیث کی اس قدیم ونادر کتاب کو ڈاکٹر حمیداللہ صاحب حیدرآبادی مقیم پیرس نے دریافت کیا اور ترکی کے کتب خانہ محمد پاشا کوپریلی سے ان کو اس کا ناقص نسخہ ملا، جو القسم الاول من المجلد الثالث کے عنوان سے شائع ہوا، اس کا مقدمہ بھی ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اور تصحیح وتعلیق کا سارا کام مولانا مرحوم نے انجام دیا ہے، سنن سعید بن منصور کے اس حصہ میں فرائض ، وصایا، نکاح، طلاق اور جہاد کے ابواب پر احادیث ہیں ۔مولانا ۲۴؍مارچ ۱۹۶۴ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''سنن سعید بن منصور کا کام ختم ہوگیا، والحمدللہ''۔ پرمغز مقدمہ، فہرست مضامین اور اغلاط نامہ کے علاوہ یہ کتاب ۴۱۰ صفحات میں چھپی ہے، اس (کی) طباعت میں مشکلات درپیش تھیں، مولانا ۲۴؍رمضان ۱۳۸۷ھ کے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ''سنن سعید کی طباعت بالکل بند ہے، دونوں کمپوزیٹر گھر چلے گئے، وکیل صاحب زبردستی اپنے لڑکے سے کام لے رہے ہیں، جو مجھے پسند نہیں ہے، مالیگاؤں کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہ عید سے پہلے بالکل مکمل کردیں گے''۔

مسند حمیدی اور سنن سعید بن منصور پر میرے مفصل مضامین ''معارف'' اعظم گڈھ میں اسی زمانہ میں شائع ہوئے تھے اور میری کتاب ''مآثر ومعارف'' میں شامل ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہوا کتاب الزہد والرقائق کی تحقیق کے دور ہی میں مولانا نے مصنف عبدالرزاق صنعانی کی تحقیق شروع فرمادی تھی، اس وقت لکھا کہ اس کے لیے اہل علم کی ایک جماعت ہوتی تو کام بہت آسان ہوجاتا، مگر مولانا نے بڑھاپے اور امراض کے باوجود اپنے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب کو لے کر اتنا عظیم کام انجام دیا ہے جو ایک اکیڈمی کے کرنے کا ہے، یہ کتاب محتاج تعارف نہیں ہے، گیارہ جلدوں میں بیروت سے شاندار طباعت میں مجلس علمی کی طرف سے شائع ہوچکی ہے، اور اس ٹکّر کا دوسرا علمی کارنامہ مصنف ابن ابی شیبہ متوفی ۲۶۲ھ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جس کو مولانا نے اپنی حیات کے

آخری ایام میں انجام دیا ہے اوران کی زندگی میں تین یا چار جلدیں مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ سے شائع ہوسکیں، اللہ تعالیٰ بقیہ جلدوں کا جلد انتظام فرمائے۔

یہ کتابیں احادیث کے قدیم ترین ذخیرے ہیں، جواب تک دست برد زمانہ سے محفوظ رہ کر مختلف کتب خانوں میں پائی جاتی تھیں اوران کے نام کتابوں میں دیکھے جاتے تھے، یہ کتابیں درحقیقت بعد کے ائمۂ حدیث اورصحابہ وتابعین اور تبع تابعین کے درمیان ''واسطۃ العقد'' کی حیثیت رکھتی ہیں، اور یہود ونصاریٰ کے اس مزعومہ کا جواب ہیں کہ بعد کے علمائے اسلام نے احادیث اوران کی سندوں کو وضع کیا ہے، ان سے پہلے احادیث کتابی شکل میں نہیں تھیں، مذکورہ بالا کتابوں کی اشاعت کے بعد ان ہفوات کی کوئی حقیقت نہیں رہ گئی، نیز مولانا مرحوم نے ان احادیث کی تخریج کرکے بتادیا کہ بعد کی کتب احادیث میں یہ حدیثیں کن کن مقامات میں ہیں اوران کے دوسرے طرق واسناد بھی ہیں، اوران مذکورہ بالا کتابوں کے مصنفین نے بہت سے مقامات میں احادیث کے متن اور سند اوران کے مفاہیم ومعانی سے بحث کی ہے، جو بعد کی کتابوں میں نہیں ہیں، ان کے ذریعہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے بہت سے آثار واقوال محفوظ ہوگئے ہیں۔

ان قدیم ترین اور بنیادی کتب احادیث کے علاوہ اس دور میں مولانا نے کئی نادر ونایاب کتب احادیث کی تحقیق فرمائی، جومختلف اداروں سے شائع ہوئی ہیں، ان میں حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ کی ''المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ'' چار ضخیم جلدوں میں ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں دولت کویت کی وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ کی طرف سے نہایت شاندار طباعت کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس کتاب کا نصف حصہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں تھا، اور دو مکمل نسخے شیخ محمد سلطان نمنکانی، صاحب المکتبۃ العلمیۃ مدینہ منورہ سے ملے، ان میں ایک سند کے ساتھ تھا، اور دوسرا سند سے خالی تھا، دونوں نسخے ترکی سے حاصل کئے گئے تھے، مولانا نے نسخہ مجردہ عن السند کی تحقیق فرمائی ہے۔

نیز اسی دوران کشف الاستار عن زوائد مسند البزار، ہیثمی رحمۃ اللہ کی تحقیق وتعلیق کی اور ۱۳۹۹ھ میں چار جلدوں میں دمشق سے شائع ہوئی، اسی طرح محدث محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ کی تلخیص خواتم جامع الاصول آپ کی تحقیق سے ۱۳۹۵ھ میں شائع ہوئی۔ ان ہی ایام میں محمد بن طاہر گجراتی پٹنی رحمۃ اللہ کی مجمع بحار الانوار جو حدیث کی لغت کی مشہور وعظیم کتاب ہے، اس کی تحقیق مولانا عبدالحفیظ بلیاوی

مصنف مصباح اللغات [1] نے مولانا کی زیرنگرانی کی اور مولانا نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کام کو انجام دیا، کہنا چاہئے کہ اس عظیم لغت حدیث کی تحقیق بھی مولانا ہی نے کی ہے، اس دور میں مولانا کے علمی کارناموں میں امام ابن شاہین بغدادی متوفی ۳۸۵ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الثقات کی تحقیق وتعلیق بھی ہے، اس کتاب کا نادر مخطوطہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں تھا، مولانا کے حکم سے میں نے پوری کتاب نقل کی اور میں نے اور مولانا محمد عثمان صاحب [2] نے مل کر اس کا مقابلہ کیا، اسی زمانہ میں مولانا نے اس کی تحقیق مکمل کر لی تھی، جب شیخ عبدالفتاح ابوغدہ مولانا کے پاس مئو تشریف لائے تو میں نے اس کا تذکرہ کیا اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اصرار کیا کہ میں اس کو ساتھ لے جا رہا ہوں تاکہ جلد شائع ہوجائے، مگر مولانا نے کہا کہ کچھ کام باقی ہے، میں بعد میں بھیج دوں گا، افسوس کہ یہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوسکی، مولانا کی ابتدائی دور کی تصانیف میں ''الحاوی لرجال الطحاوی'' بہت مشہور کتاب ہے، جس کے بارے میں ہم لوگ زمانۂ طالب علمی میں سنا کرتے تھے، مگر افسوس کہ یہ کتاب بھی اب تک طبع نہیں ہوسکی ہے، حالانکہ اس کے مواقع فراہم تھے۔

اگر احادیث کی مذکورہ نادر ونایاب اور عظیم کتابوں کا تعارف اور ان کی اشاعت میں حضرت مولانا کی خدمات کا تذکرہ تفصیل سے کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہوجائے گا، اس لیے نہایت اختصار سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ احادیث رسول کے ان نادر ونایاب اور قدیم وعظیم ذخیروں کی اشاعت کے بعد ان میں سے کئی ایک فوٹو کے ذریعہ بیروت میں شائع ہوئے اور پورے عالم عرب اور عالم اسلام کے اہل علم کو ان سے استفادہ کا موقع ملا اور وہ حضرات مولانا کی علم حدیث میں عبقریت سے واقف ہوئے، جس کی وجہ سے مولانا کی شخصیت علم حدیث میں مرجع بن گئی، اور ہندوستان و پاکستان کے اہل علم سے زیادہ ان حضرات نے ان کتابوں اور مولانا کی ذات سے علمی ودینی فائدہ اٹھایا، ہم نے متعدد بار یہ منظر دیکھا کہ مولانا ایام حج میں حرم شریف کے سامنے مدرسہ فخریہ کے چھوٹے سے دفتر میں تشریف رکھتے تھے اور مصر وشام، حجاز اور افریقہ وغیرہ کے اہل علم مولانا کی خدمت میں نیاز مندانہ انداز میں حاضر ہوکر استفادہ کرتے تھے اور قدما کے طریقہ پر ان سے حدیث کی روایت کی سند لیتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ہندوستان میں علم حدیث کے آخری سالار قافلہ تھے۔

---

(۱) مولانا عبدالحفیظ بلیاوی علیہ الرحمہ نے اس کے نقل ومقابلہ کا کام کیا تھا، تعلیقات وحواشی اور تحقیق کی خدمت حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ہی انجام پذیر ہوئی ہے (مسعود الاعظمی)

(۲) مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارکپوری مراد ہیں۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ

شیخ نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ ☆

سابق ہندوستان کے صوبہ اودھ کے مشرقی اضلاع، یعنی بنارس، جونپور اور اعظم گڈھ جو عوامی اصطلاح میں پورب کہلاتے ہیں، صدیوں سے علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مرکز رہے ہیں، مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے بجا طور پر پورب کو شیراز ہند کا خطاب دیا تھا اور کہا تھا: ''پورب شیرازِ ما است''۔ بنارس میں آج بھی احناف اور اہل حدیث کے متعدد علمی مراکز ہیں۔ جونپور ملا محمود جونپوری مصنف شمس بازغہ کا مولد و مدفن ہے۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی مصنفِ تفسیر بحرِ مواج یہیں آسودۂ خواب ہیں، جونپور کی جامع مسجد میں سیکڑوں برس سے علوم دینیہ کی تدریس جاری ہے، جونپوری علماء کے طفیل بہار اور بنگال میں اسلام کی وسیع پیمانے پر تبلیغ و اشاعت ہوئی ہے۔ اعظم گڈھ میں علامہ شبلی کا قائم کردہ دار المصنفین ہے، جس نے علوم اسلامیہ کو نئی زندگی بخشی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی عبد السلام ندوی اور شاہ معین الدین ندوی اس ادارے کے روح رواں رہے ہیں۔

دورِ حاضر کے جلیل القدر محدث اور فقیہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، جنھوں نے ۱۷؍ مارچ ۱۹۹۲ء کو ۹۲ برس کی عمر میں وفات پائی، اعظم گڈھ کے ایک قصبہ مئو سے تعلق رکھتے تھے [۱]۔ وہ ۱۳۱۹ھ = ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مئو کے بعض مدارس میں پائی اور اعلیٰ تعلیم دار العلوم دیوبند اور دار العلوم مئو میں حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف مدارس میں علوم دینیہ کی خدمت کرتے رہے۔ اخیر عمر میں حدیث شریف کی اعلیٰ اور

☆ سابق مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

(۱) مئو اب مستقل ضلع بن گیا ہے۔

محققانہ تعلیم کے لیے خود المعہد العالی قائم کیا جس کا شمار شمالی ہند کے ممتاز مدارس میں ہے۔

مولانا اعظمی کا اصلی مشغلہ تعلیم و تدریس تھا۔ حدیث اور اسماء الرجال اُن کا خاص فن تھا۔ سیاسیات سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ بعض کرم فرماؤں کے اصرار پر انھوں نے جمعیۃ العلماء کی صدارت بھی قبول کر لی تھی۔ ایک زمانے میں وہ یو۔ پی۔ اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہو گئے تھے، لیکن بقول ایڈیٹر معارف ان کا زیادہ وقت ندوۃ العلماء کے کتب خانے میں گزرتا تھا۔ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں دو ایک سال تک درس حدیث کی خدمت بلا معاوضہ کرتے رہے۔

علم و فضل:

مولانا اعظمی دورِ حاضر کے ایک باکمال محدث تھے۔ کتب حدیث پڑھاتے پڑھاتے انھیں یہ کتابیں از بر ہو گئی تھیں، انھوں نے ساٹھ برس صحیح بخاری کا درس دیا اور کہا جاتا ہے کہ صحیح بخاری مع اس کی شرح فتح الباری انھیں حفظ تھی۔ علم فقہ پر بھی ان کی نظر گہری تھی، اس حیثیت سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب ممالک میں بھی ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ مولانا اعظمی کے معاصرین بھی ان کے علم و فضل کے مداح اور قدرداں تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم بعض علمی مشکلات میں ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی بھی ان کے بڑے عظمت شناس ہیں۔ مشہور شامی محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ (حال مقیم سعودی عرب جو ہمارے ہندوستانی علماء کے بڑے پایہ شناس ہیں) بھی ان سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔

تحقیقی کام:

مولانا اعظمی وسیع النظر عالم تھے، ان کا مطالعہ بھی بڑا وسیع تھا، عربی کی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کتاب شاید ہی کوئی ان کے مطالعہ سے بچی ہو، مولانا کو قلمی کتابوں سے بھی بڑا شغف تھا۔ ان کا عظیم الشان کارنامہ حدیث کی نادر کتابوں کی تصحیح و اشاعت ہے۔ اس طرح جو کتابیں مرتب کر کے شائع کی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، کتاب السنن (حافظ سعید بن منصور) کتاب الزہد والرقائق (امام عبداللہ بن مبارک) وغیرہ۔ ان کتابوں میں مصنف عبدالرزاق -جو صحیح بخاری سے بھی قدیم مجموعۂ احادیث ہے- کی تصحیح و تعلیق ان کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہے۔

حضرت مولانا انور شاہ مرحوم و مغفور کو اس کتاب کی اشاعت کی بڑی آرزو تھی، جس کی تکمیل

مولانا اعظمی نے کی ہے، مولانا نے مختلف قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے اس کا صحیح نسخہ مرتب کیا اور اس کو اپنے حواشی وتعلیقات سے مزین کر کے بیروت سے ۱۱ضخیم جلدوں میں عمدہ کاغذ اور خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ کاغذ اور طباعت کے تمام اخراجات جنوبی افریقہ کے ایک مال دار تاجر نے برداشت کیے ہیں، جو مولانا انور شاہ مرحوم کا شاگرد رہ چکا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اردو کے بھی اچھے انشاء پرداز تھے۔ اردو میں ان کی یہ کتابیں قابل ذکر ہیں:

(۱) اعیان الحجاج (دو جلدیں):

مشاہیر حجاج کے سفر حج اور زیارت مدینہ کے دلچسپ حالات اور واقعات پر مشتمل ہے۔

(۲) الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ:

تین طلاقوں کا مسئلہ ہمیشہ سے علماء احناف واہل حدیث میں وجہ نزاع رہا ہے، مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے الاعلام المرفوعہ کے نام سے ایک مختصر مگر ٹھوس اور مدلل رسالہ تحریر فرمایا تھا، جو طبع ہو چکا ہے۔

(۳) نصرة الحدیث:

حجیت حدیث کے بارے میں ایک بیش قیمت رسالہ ہے، جس میں حدیث کی ضرورت واہمیت ثابت کرنے کے علاوہ منکرین حدیث کا رد کیا ہے۔

(۴) رکعات تراویح:

ماہ رمضان میں بیس رکعت تراویح پڑھنے کی تصویب کی ہے۔

(۵) دست کار اہل شرف:

اس میں دست کار علماء وصالحین کے روح پرور حالات قلم بند کیے ہیں، اس کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں۔

اپنے علمی ودینی کارناموں کی وجہ سے مولانا نہ صرف اس برصغیر، بلکہ پوری اسلامی دنیا میں مشہور ومقبول تھے، اور اکناف عالم سے فتاوی وعلمی سوالات ان کی خدمت میں آتے رہتے تھے۔ اس علم وفضل کے باوجود مولانا بڑے متواضع ومنکسر المزاج تھے، غرور وپندار سے کوسوں دور تھے، وہ بادۂ عرفان کے بھی ذوق شناسا تھے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھے۔ ان کا رہن سہن سادہ اور معیشت وگزران درویشانہ تھی۔ فروری ۱۹۸۲ء میں راقم السطور کو دار المصنفین بقیہ صفحہ ۱۴۰ پر

بزم علم وفضل کی ایک شمع فروزاں گل ہوگئی

مولانا مجیب اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ ☆

یہ غم انگیز خبر ناظرین ''الرشاد'' کومل چکی ہوگی کہ نادرۂ روزگار عالم، منبع علم وفضل اور محدث وقت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے دس رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶/ مارچ ۱۹۹۲ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی ذات نہ صرف علوم دینیہ اور فن حدیث میں سند کی حیثیت رکھتی تھی، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی ذات گرامی سے ہندوستان میں بزم علم وفضل کی آبرو قائم تھی، کسی عربی شاعر نے اپنے قبیلہ کے سردار کی موت پر یہ شعر کہا تھا۔

وما كان قيس هلكه هلک واحد

ولـكـنـه بنيان قوم تهدما

یہ شعر ممکن ہے کہ اس کے قبیلہ کے لیے صحیح رہا ہو، مگر مولانا کی ذات واقعی ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے اس کا مصداق ہے۔

ہندوستان میں علوم دینیہ اور خاص طور پر فن حدیث کی علمی، تحقیقی اور تدریسی خدمات اس وقت سے انجام پا رہی تھیں، جب پورے عالم اسلام پر علم وتحقیق کے اعتبار سے بڑی حد تک سکوت طاری تھا، افسوس ہے کہ اس وقت ہندوستان میں اس سلسلۃ الذہب کی ایک ایک کڑی یکے بعد دیگرے ٹوٹتی جارہی ہے اور ان کی جگہ پُر نہیں ہو پارہی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی اس سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی تھی، جو ان کی وفات سے ٹوٹ گئی۔ مولانا مرحوم کی ذات سے اس وقت ہندوستان میں علم حدیث کا فنی اور تحقیقی جو ذوق قائم تھا، اب ہم اس سے محروم ہوگئے ہیں۔ خدا کرے مولانا عبیداللہ رحمانی مدظلہ تادیر سلامت رہیں، جو اس سلسلہ کی شاید آخری کڑی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وتحقیقی کاموں کا وزن ان کی کمیت کے اعتبار

☆ سابق مدیر رسالہ الرشاد اعظم گڈھ

سے نہیں، بلکہ ان کی کیفیت کے اعتبار سے ہے۔ مصنف عبدالرزاق جس سے استفادہ بلکہ اس کی دید کے لئے ایک مدت سے اہل علم کی آنکھیں ترس رہی تھیں، مولانا کی علمی و تحقیقی کاوش سے وہ منظر عام پر آ گئی اور اس سے عام اہل علم کے لیے استفادہ ممکن ہو سکا، افسوس ہے کہ مولانا نے اس پر جو قیمتی مقدمہ لکھا تھا، وہ کتاب کا جز نہ بن سکا، علم نہیں کہ وہ اب کس مرحلہ میں ہے[۱]۔

اس سے پہلے مسند حمیدی بھی مولانا کی تحقیق سے شائع ہو چکی ہے۔

اس کے علاوہ اردو زبان میں بھی مولانا کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں رکعات تراویح اور اعیان الحجاج کافی مشہور ہیں۔

مدرسہ مفتاح العلوم کی داغ بیل جن تین حضرات نے ڈالی ان میں ایک مولانا مرحوم بھی تھے، ایک مدت تک انھوں نے اس میں درس بھی دیا، مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مرحوم کے انتقال کے بعد وہ کئی سال اس کے ناظم بھی رہے، مگر ان کے مزاج کے خلاف کچھ ایسی باتیں پیش آئیں جس سے کنارہ کش ہو گئے اور ایک علٰحدہ مدرسہ مرقاۃ العلوم کے نام سے قائم کیا، جس کے احاطہ ہی میں مولانا کی تدفین عمل میں آئی۔

مولانا سے راقم الحروف کو اس وقت سے تعلق خاطر ہے جب وہ حضرت الاستاذ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لایا کرتے تھے، بسا اوقات وہ دارالمصنفین میں کئی کئی دن قیام کرتے تھے اور بیشتر وقت ان کا کتب خانہ میں گزرتا تھا، حضرت سید صاحب ان سے بڑی محبت فرماتے تھے اور ان کے لیے کتب خانہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھنے کا حکم فرماتے۔ بحمد اللہ ان کی مطلوبہ کتابوں کے نکالنے میں اکثر راقم الحروف معاون رہتا تھا اور اس سلسلہ میں کچھ استفادہ کا موقع بھی ملا، اس تعلق کی بنا پر جامعۃ الرشاد کی نئی عمارت کے سنگ بنیاد کے موقع پر ان کو دعوت نامہ بھیجا، تو کئی علماء کے ساتھ تشریف لائے اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور متعدد دیگر علماء کے ساتھ سنگ بنیاد میں شریک رہے۔ اس کے بعد بھی کئی بار ان کی تشریف آوری ہوئی اور انھوں نے اپنے تاثرات بھی لکھے اور زبانی بھی ہدایات دیتے رہے۔

مولانا نے علم حدیث میں حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا تھا اور انھیں کا تحقیقی رنگ ان پر غالب رہا، اس بنا پر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو دارالعلوم

---

(۱) افسوس ہے کہ مصنّف عبدالرزاق کا مقدمہ لکھا نہیں جا سکا تھا (مسعود الاعظمی)

میں بحیثیت استاذ حدیث کئی بار لانے کی کوشش کی، مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے، البتہ اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر زندگی بھر رہے۔

عموماً علم کا پندار اپنی باطنی اصلاح سے غافل کر دیتا ہے، مگر غیر معمولی علم وفضل کے باوجود مولانا نے ہمیشہ اپنے تزکیۂ باطن کی بھی فکر رکھی، یہ تو علم نہیں ہے کہ وہ کس سے بیعت [(۱)] تھے، مگر حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو خاص تعلق تھا اور ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ جب فتح پور سے الٰہ آباد منتقل ہو گئے، تو مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار ہی پر ہر پندرہویں دن مئو تشریف لایا کرتے تھے، یہ سلسلہ کئی مہینہ چلتا رہا۔ میں نے خط کے ذریعہ مولانا فتح پوری سے بیعت کی درخواست کی تو جواب میں فرمایا کہ جب میں مئو آؤں تو ملو، چنانچہ وہ مئو تشریف لائے مگر مجھے اس کا علم نہیں ہو سکا۔ ایک دن قیام کے بعد حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ کسی آدمی کے ذریعہ مجیب اللہ کو اعظم گڈھ سے بلوایئے، چنانچہ مولانا نے ایک خصوصی آدمی بھیج کر مجھے بلوایا اور مولانا فتح پوری نے مولانا اعظمی کی موجودگی میں تہجد کے بعد راقم الحروف کو بیعت فرمایا۔

مولانا فتح پوری کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آمد ورفت رکھی، وہ الٰہ آباد میں کئی کئی دن حضرت پرتاب گڑھی کی خدمت میں مدرسہ بیت المعارف میں قیام فرمایا کرتے تھے، حضرت مولانا پرتاب گڑھی بھی مولانا اعظمی کی حد درجہ قدر دانی اور ان کی مہمان نوازی کا اہتمام فرمایا کرتے تھے، ان دنوں راقم الحروف کا مولانا اعظمی کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مولانا اعظمی کی دوسری شخصیت تھی کہ اپنے غیر معمولی علم وفضل اور بین الاقوامی شہرت کے باوجود کسی وقت بھی اصلاح باطن سے اپنے کو بے نیاز نہیں سمجھا۔

واقعہ ہے کہ یہ رتبۂ بلند ہر صاحب علم کو نہیں ملتا۔ ان کی وفات سے ہندوستان میں جو علمی ودینی خلا پیدا ہوا ہے، شاید وہ ایک مدت تک پورا نہ ہو سکے، یوں اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے۔ **وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز**

---

(۱) مولانا مرحوم حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور مجاز بھی۔ یہ آپ کی طالب علمی کا آخری سال تھا حضرت فتح پوری رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق اسی نسبت کی وجہ سے تھا۔ (اسیر ادروی)

محدثِ عصر علامہ اعظمی
شخصیت اور اس کے عوامل

مولانا افضال الحق جوہر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ ☆

مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ علمی دنیا کی ان چند ہستیوں میں تھے کہ چودہویں صدی کے شروع میں آئے تو کسی نے دیکھا نہیں اور پندرہویں کے آغاز میں جانے لگے تو سارا عالم اسلام دیکھتا رہ گیا، انھوں نے اپنی زندگی میں افسانوی شہرت پائی مگر ان کی سادگی، بے لوثی اور خلوت گزینی کی وجہ سے انھیں دیکھ کر پہچاننا مشکل تھا کہ دنیا کا عظیم محدث، یہی شخصیت ہے، چنانچہ مکہ مکرمہ کا نوخیز عالم دہلی میں مجھ سے ملا اور حضرت مولانا کے بارے میں پوچھنے لگا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ تو اعظم گڈھ کے ہیں تم مکہ کے لوگ انھیں کیسے جانتے ہو؟ اس مکی عالم نے کہا کہ ہم ان کو اس طرح جانتے ہیں جیسے اپنے باپ دادا کو جانتے ہیں پھر اس نے کہا کہ میں مئو جا کر حضرت علامہ سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں، ضرور جاؤں گا۔

اسی طرح حضرت مولانا ایک مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے، مولانا اسعد صاحب بھی وہاں موجود تھے انھوں نے شیخ عرب علامہ ابن باز کی زیارت کا وقت مانگا اور وہ مقرر ہو گیا، جانے لگے تو حضرت مولانا کے پاس آئے اور علامہ کے پاس چلنے کے لیے کہا، حضرت مولانا تیار ہو گئے، وہاں پہنچے تو حسب معمول ہر شخص نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا کیونکہ ابن باز نابینا محدث ہیں۔ ان کے یہاں ہر شخص کو اپنا نام اور مختصر تعارف کرانا ہوتا ہے جب کئی آدمی اپنا اپنا تعارف کرا چکے تو آخری نمبر حضرت مولانا کا تھا، مولانا نے فرمایا اُنا حبیب الرحمٰن الاعظمی من الہند تو شیخ عرب اٹھ کر کھڑے ہو گئے حضرت مولانا سے معانقہ فرمایا اور معذرت کی کہ آپ نے یہاں آ کر مجھے شرمندہ کیا، مجھے معلوم ہوتا تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، پھر اپنی مسند پر مولانا کو بٹھا کر انھوں نے سکون پایا۔

☆ دار العلوم رسول پور۔ گورکھپور

خودسازی:

ایسی عظیم ہستی، عالمی شخصیت ہندوستان سے اٹھ گئی فانا للہ وانا الیہ راجعون فن حدیث اورفن اسماء الرجال میں آج کی دنیا حضرت مولانا کا لوہا مانتی ہے، اور انھوں نے امام عبدالرزاق، امام ابوبکر ابن ابی شیبہ امام عبداللہ بن مبارک امام حمیدی جیسی قدیم علمی شخصیتوں کی نایاب کتابوں کی تصحیح کر کے اور اتنی بڑی بڑی کتابوں کو تن تنہا آ ڈٹ کر کے ایسا شاہکار کام انجام دیا ہے کہ دنیا صدیوں حیرت کرے گی اور یہ حیرت اس وجہ سے اور بڑھتی جائے گی کہ یہ کارنامہ کسی جامعہ، کسی دارالعلوم یا کسی عالمی لائبریری میں بیٹھ کر نہیں انجام دیا ہے بلکہ ایک غیر معروف قصبے میں ایک ایسے کمرے میں بیٹھ کر انجام دیا ہے جس پر آج بھی کھپریل پڑا ہوا ہے، جہاں سے آج بھی موٹر نہیں گذر سکتا مگر وہاں ہوائی جہاز سے آنے والے پہنچے اور دیکھا کہ ایک معمولی جثہ کا انسان بیٹھا ہوا ہے جس کے اردگرد فن حدیث فن رجال، فن لغت اور ادب کی سیکڑوں کتابوں کا ہجوم ہے اور وہ اس میں اس قدر گُم ہے کہ بڑا سے بڑا شخص بھی آ جائے تو اسے سر اٹھانے کی مہلت نہیں ہے، اس کی دولت اس کا قلم ہے، اس کا آرام اس کا فن ہے اس کی شخصیت اس کے وہ مسودات ہیں جو بیروت، بغداد، دمشق، مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ پہنچ گئے تو لوگوں نے قلم چوم لئے یا دم بخود رہ گئے، اس طرح حضرت مولانا نے ایک عظیم مقصد کو اپنا موضوع زندگی بنایا اور پھر اس کے حاصل کرنے کے لیے موزوں مقام گوشۂ تنہائی کو قرار دے کر اس میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے اور دور نزدیک کسی لالچ، تمنا اور جاہ طلبی کو پھٹکنے نہیں دیا اور یہی ان کے اخلاص، حسن نیت، اور بلندی کردار کی سب سے بڑی دلیل ہے جس نے ان کی شخصیت کے چند پتھروں کو تراش کر تاج محل کھڑا کر دیا ہے۔

دنیا سے اعراض:

حضرت مولانا کا اپنے کچے مکان میں بیٹھ کر کام کرنا یقیناً ایک مجبوری تھی، کہ وہاں آبائی مکان تھا لیکن ایک دوسری مجبوری اور تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی محل میں جانے کے لیے قطعی طور سے تیار نہیں تھے، چنانچہ تقریباً ۳۵ برس پہلے جب مدینہ یونیورسٹی میں صدر کا عہدہ خالی ہوا تو جامعہ کی کمیٹی نے متفقہ طور پر طے کیا کہ مولانا اعظمی کو جامعہ کی صدارت کے لیے لایا جائے اور انھیں ۲۰ ہزار ریال مع لوازم رہائش پیش کیا جائے، عربوں نے تجویز بڑے شوق سے پاس کی اور حضرت مولانا کی منظوری کے لیے

بڑے اہتمام سے بھیجا، مگر ان کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ حضرت مولانا نے شکریہ کے ساتھ وہ تجویز واپس کردی، اور لکھ دیا کہ مجھے یہیں بیٹھ کر یہ خدمت انجام دینے دیجئے، غالباً اس کی اطلاع ان کے گھر والوں کو بھی نہیں ہوئی مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے انتہائی حیرت ومسرت اور سر بلند کرکے یہ بات مولانا محمد منظور نعمانی کو بتائی اور انھوں نے مجھے یہ کہہ کر اطلاع دی کہ ہندوستان میں ایسے ایسے علم کے خادم اور دنیا سے بے تعلق حضرات موجود ہیں اس لیے علم کا بھرم قائم ہے یہ تھی وہ مجبوری جس کی وجہ سے حضرت مولانا نے ساری عمر اپنے گوشۂ عافیت میں گذاردی اور بڑے سے بڑے آدمی کی آمد پر کبھی معذرت نہیں فرمائی کیونکہ اس مرد درویش نے ایسے اہم کام کے لیے سوچ سمجھ کر اسے اختیار کیا، تھا قدس اللہ سرہ العزیز۔

علمی غیرت وحمیت:

حضرت مولانا شکل وشباہت، تن وتوش، زبان وبیان اور وضع قطع میں اپنے ماحول سے ممتاز نہیں تھے لیکن ان میں جو دینی غیرت اور اسلامی حمیت تھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا، اس جذبے نے ہمیشہ بڑے بڑے کارنامے انجام دلائے ہیں، اور اسی جذبے نے مولانا کی شخصیت کو ان کے ماحول سے بلند کردیا تھا چنانچہ رمضان ۱۴۱۲ھ میں جب حضرت مولانا کے وصال کی خبر بمبئی پہنچی تو اہل علم میں صف ماتم بچھ گئی، دوسرے دن مولوی جنید بنارسی صاحب نے ایک تعزیتی میٹنگ بلائی اس میں راقم الحروف بھی تھا وہاں ہمارے دوست گلزار اعظمی نے ایک واقعہ بتایا کہ حضرت مولانا ایک مرتبہ بمبئی تشریف لائے ہوئے تھے ایک غیر مقلد صاحب ملنے آئے اور تراویح کی رکعت پر بحث شروع کردی، مولانا نے انھیں ٹالا مگر وہ بضد ہوگئے تو ان سے چند سوالات کیے اور وہی سوالات ان کا جواب بن گئے، مولانا نے دریافت فرمایا کہ تراویح سنت ہے یا مستحب یا بدعت؟ غیر مقلد صاحب نے کہا کہ سنت ہے پھر پوچھا کہ سنت کو قائم کرنے والا اہل سنت ہے یا اہل بدعت؟ انھوں نے کہا اہل سنت، حضرت مولانا نے فرمایا کہ آپ کے...... علامہ نے تراویح کو بدعت عمر رضی اللہ عنہ پھر کیسے قرار دیا ہے؟ وہ غیر مقلد صاحب سکتے میں رہ گئے اور چپ چاپ چلے گئے، مگر حضرت مولانا کو جلال آگیا کہ چند حدیثوں کو یاد کرکے یہ جاہل لوگ ائمہ ہدیٰ، خلفاء راشدین کو بُرا بھلا کہتے ہیں، کوئی حد ہے اس جہل اور نادانی کی اس کے بعد حضرت مولانا نے قلم اٹھایا اور لکھنے بیٹھ گئے، جب قلم رکھا تو ''رکعات تراویح'' مرتب ہوچکی تھی، اور

موذن حی علی الصلوٰۃ پکار رہا تھا، رات کی تاریکی صبح کے لیے جگہ خالی کر رہی تھی۔

اس واقعہ میں جہاں مولانا کے علم وفضل، برجستگی، واستحضار کی جھلک ہے وہیں اس جذبے کی نشاندہی ہے جس نے مولانا سے عجیب عجیب کارنامے انجام دلائے ہیں اسی دل ودماغ اسی جذبۂ غیرت اوراسی اولوالعزمی کا نام تھا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ۔

علمی حمیت:

ہندوستان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حدیث کو حجت ماننے سے انکار کرتی ہے، وہ کہتی ہے کہ حدیث ایک تاریخ ہے، غیر مسلسل ہے نامعتبر ہے، یہ آواز جامعہ ملیہ میں بھی سنائی دی اور تمام علماء نے سنی، کسی نے لاحول پڑھ دی کسی نے صلواتیں سنائیں، بعض نے ملحد اور بے دین کہہ کر دامن بچالیا مگر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے ایک رسالہ لکھ کر اس کو جواب دیا ''نصرۃ الحدیث'' اس کو پڑھیے تو آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے شیر کو کچھاڑ میں چھیڑ دیا ہے اور وہ ایمانی غیرت اور علمی ولولہ کے ساتھ میدان میں آ گیا ہے، اس میں حضرت مولانا نے خاص علمی انداز سے ان سوالوں کا جواب دیا ہے جن سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، مگر یہ تو ایک تمہید تھی، اصل جواب اس کا اس وقت دیا جب حضرت مولانا نے ساری دنیا کے کتب خانوں سے امام عبدالرزاق کی مصنف کے قلمی نسخے جمع کیے اور ہزاروں ہزار صفحات کی اس کتاب کی تمام جلدیں جمع اور مکمل شکل میں دنیا کے سامنے رکھ دیں، مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ۔

امام عبدالرزاق امام بخاری کے استاذ نہیں استاذ الاساتذہ ہیں، انھوں نے ۱۴ جلدوں میں حدیث مرفوع کا ایک عظیم ذخیرہ جمع کر دیا تھا جو اس کا پختہ ثبوت تھا کہ امام بخاری امام مسلم وغیرہ کی تیسری صدی تک حدیثوں کا سلسلہ منقطع نہیں تھا بلکہ ہزاروں ہزار صفحات میں تحریری شکل اختیار کئے ہوئے تھا اور مسلسل تھا اور کوئی دور ایسا نہیں گذرا جب حدیث کو یاد کرنے والے لکھنے اور روایت کرنے والے اور ان پر فقہی نقطۂ نظر سے غور کرنے والے نہ رہے ہوں، اس لیے حدیث قرآن کے بعد سب سے بڑی حجت ہے۔ پھر اسی طرح کا کام مولانا ابوالوفا حیدرآبادی نے امام ابو یوسف وغیرہ کی کتابیں چھاپ کر اور مصنف ابن ابی شیبہ کو شائع کر کے انجام دیا، اس طرح ان حضرات نے اسلم جیراجپوری جیسے منہ زور لوگوں کا منھ پھیر دیا اور امت کو حمایت حدیث کا راستہ دکھا دیا۔

جوش وجذبہ:

مہوابسم اللہ ضلع گونڈہ کا ایک دورافتادہ گاؤں تھا،شہری آبادی سے کوسوں دور،مگر مسلمانوں کا علاقہ وہاں ایک نوخیز عالم مولوی حفیظ اللہ صاحب نے ایک باغ میں جلسہ کرنا چاہا مگر وہاں کے زمیندار نے روک دیا کیونکہ جلسہ کرنے والے حنفی تھے اور باغ کا مالک غیر مقلد تھا،اس وقت مولوی حفیظ اللہ صاحب مظاہر علوم سہارنپور میں دورے کے طالب علم تھے،انھوں نے جگہ بدل کر دھرم پور کے باغ میں جلسہ کیا اور اس کے لیے مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی جیسی برگزیدہ ہستیوں کے یہاں سفر کر کے انھیں تیار کیا اور غیر مقلدین کی وجہ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور مولانا عبداللطیف صاحب کو بلا کر لے گئے۔

جلسہ شروع ہوا تو حنفیوں کا جوش اور غیر مقلدوں کا ہجوم قابل دید تھا اس جلسہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو فاتحہ خلف الامام کا موضوع دیا گیا اور آپ نے یہ کہہ کر تقریر شروع فرمائی کہ غیر مقلدین کے پاس کسی اور بات کے لیے کوئی دلیل ہے کہ نہیں اسے میں کچھ نہیں کہتا یہ بات اعلانیہ کہتا ہوں کہ فاتحہ خلف الامام کے بارے میں ان کے پاس مکڑی کے جالے کے برابر بھی کوئی دلیل نہیں ہے، یہ تھی اس تقریر کی اٹھان،اس کے بعد حضرت مولانا نے حدیث پڑھ کر اور اس کی سند اور متن پر بحث کر کے جب تقریر شروع کی ہے تو غیر مقلدین یہ دیکھ کر دم بخود تھے کہ ایک حنفی عالم زبانی حدیث پڑھتا ہے اور اس پر حوالے کے ساتھ بحث کرتا چلا جاتا ہے ہم تو صرف یہ جانتے تھے کہ حنفی عالم صرف ابوحنیفہ کی فقہ پڑھتے ہیں، حدیث پڑھتے ہی نہیں مگر آج دیکھا کہ ایک عالم ہے حنفی ہے جوان ہے اور اسے ایک موضوع پر سیکڑوں حدیثیں مستحضر ہیں جن کو بلا کسی کتاب اور کاپی کے زبانی پڑھتا چلا جاتا ہے آج ان کے علماء کو بھی اندازہ ہوا کہ اس موضوع پر ایک ہی دو روایتیں نہیں ہیں، بیسیوں حدیثیں ہیں جن کو سامنے رکھ کر کوئی مسلک طے کرنا پڑتا تاکہ کسی قول یا فعل رسول کی نافرمانی نہ ہونے پائے اور سارے مجمع نے دیکھ لیا کہ امام ابوحنیفہ کے ماننے والے حدیث وفقہ کے امام ہیں پھر بھی انھیں امام مان کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

حضرت مولانا نے پر جوش مجمع، پرسکون ماحول اور دم بخود عوام وخواص کو دیکھ کر اپنی پر جوش اور پر مغز تقریر اس وقت ختم کی جب موذن صبح کو اذان دے رہا تھا،اس عظیم الشان تقریر کا ایسا اثر ہوا

کہ غیر مقلدین نے حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ جیسے علامہ کو بلا لیا تھا مگر وہ کوئی جوابی تقریر کئے بغیر واپس چلے گئے۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس باغ میں حنفی کوئی جلسہ نہیں کر سکتے تھے وہاں آج انوارالاسلام جیسا حنفی مدرسہ چل رہا ہے اور اسی عالم مولانا حفیظ اللہ نے قائم کیا ہے جس کو جلسہ کرنے سے روک دیا گیا تھا حتی کہ آج مولانا کی قبر بھی اسی مدرسہ میں ہے۔اس طرح اب وہ ہمیشہ کے لیے وہاں فروکش ہو گئے ہیں۔

حضرت مولانا کی عظمت کا شامیانہ جن ستونوں پر کھڑا ہے ان میں قوت حافظہ غیور طبیعت، علمی مزاج، اسلامی حمیت، بے پناہ سنجیدگی اور ناقابل عبور استغناء کو خاص اہمیت حاصل ہے، ان متضاد قسم کے عناصر کو قدرت جب کبھی جمع کر کے کوئی مجسمہ تیار کرتی ہے تو ایسا ہی عجوبۂ روزگار شخص پیدا ہوتا ہے، مگر وہ کہاں بنائے گی؟ کب بنائے گی؟ قدرت کے سوا کسی کو معلوم نہیں **وهو اعلم بكم اذ انتم أجنة في بطون امهاتكم.**

مولانا کے استغناء کا ایک عجیب واقعہ دس برس پہلے کا ہے، مدینہ منورہ کی بلدیہ کے چیرمین حبیب صاحب جو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے ہیں انھوں نے مولانا سے پیشکش فرمائی کہ آپ مدینہ منورہ آجائیں اور جو کام مئو میں کرتے ہیں یہیں انجام دیں آپ کی آسائش وآرام کا ہر طرح خیال رکھا جائے گا، لیکن اس مرد دانا نے شکریہ کے ساتھ یہ پیشکش بھی ٹھکرادی اور مئو میں بیٹھ کر کام کرتا چلا گیا، اس کے استغنا کی بھی مثال ہے اور اس فیصلے کی پختگی کی بھی کہ حدیث کا کام سادگی، بے غرضی اور خاموشی سے کرنا ہے، آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

قوت حافظہ:

حضرت مولانا کو قدرت کے دست فیاض نے حافظہ غضب کا دیا تھا اور اس قوت سے انھوں نے اپنے اندر فقہ، ادب عربی اور حدیث کے خزانے جمع کر لیے تھے، چنانچہ طالب علمی کے زمانے میں جب دارالعلوم مئو سے دارالعلوم دیوبند داخلہ کے لیے گئے تو شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب کو امتحان داخلہ میں حیرت میں ڈال دیا تھا کیونکہ مقامات حریری کے مقامات انھیں از بر یاد تھے اور برجستہ پڑھتے تھے، اور جن لوگوں نے مفتاح العلوم مئو کی مدرسی کا دور دیکھا ہے مثلاً مولانا صفی اللہ صاحب دیوریاوی

جیسے حضرات، وہ کہتے تھے کہ کبھی کبھی حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کے بھائی مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقی مفتاح العلوم آجاتے تو مولانا اور وہ فاروقی صاحب اگر عشاء بعد بیت بازی شروع کردیتے تو عربی فارسی شعروں میں سخت مقابلہ ہوتا اور صبح کی اذان تک کوئی کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا کیونکہ قوت حافظہ دونوں حضرات کی عجیب وغریب تھی جو طلبہ حضرت مولانا سے قریب تھے ان کے لیے سنہرا موقعہ ہوتا تھا، اور اس کی گونج ہم لوگوں کو دارالعلوم مئو میں سنائی دیتی تھی، مولانا کی قوت حافظہ کی حکایتیں ایسی ایسی ہیں کہ آج سن کر حیرت ہوجاتی ہے اور وہی ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر ہے۔

علمی ذہن:

قدرت نے ان کو جو ذہن عطا فرمایا تھا وہ خالص علمی اور معروضی قسم کا تھا، نہ شاعرانہ تھا نہ خطیبانہ وہ اپنی بات کے اظہار پر مختصر سے مختصر لفظوں میں ایسی قدرت رکھتے تھے کہ علماء مقتدر سر دُھنتے تھے، فاضل بات ضرورت سے زیادہ گفتگو یا تقریر وتحریر کے قائل ہی نہیں تھے مثلاً شاہ بانو کا مقدمہ سپریم کورٹ نے خراب کرکے متاع کی بحث میں الجھا دیا تھا اس پر علماء مقتدر نے سخت احتجاج کیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے تحریک چلائی اور جمعیۃ علماء ہند نے ایک آل انڈیا اجتماع کرکے معاملہ کو مسلم پرسنل بورڈ کے حوالے کردیا، اس اجتماع میں ہر طبقے اور ہر سائز کے علماء مقتدر، اکابر واعیان نے حصہ لیا تھا، میں بھی میڈیکل علی گڈھ سے تین روز کی چھٹی لے کر شریک ہوا تھا اور اصل تجویز کی ترتیب وتسوید میں کافی حصہ لیا تھا، اتفاق سے اس کانفرنس میں حضرت مولانا بھی تشریف لائے تھے، ہم لوگوں نے تجویز مرتب کرکے حضرت مولانا کی تصویب کے لیے تبرکاً پیش کردیا تو آپ نے اسے پڑھا اور کچھ نہیں فرمایا، پھر قلم اٹھایا اور برجستہ صرف ۸ اور ۹ سطروں میں پوری بات لکھ کر ہمارے حوالے کردی جو مطبوعہ کارروائی میں آج بھی موجود ہے، اس تجویز کا لب ولہجہ میرے لیے عجیب وغریب تھا اس میں نہ کوئی بحث تھی نہ معذرت، نہ تسلی وطنز بلکہ ایک عالمانہ اظہار رائے تھا اور پوری خوداعتمادی اور خودداری کے ساتھ تھا چنانچہ پہلا ہی جملہ مخاطب کو جھنجھوڑ دیتا ہے آپ نے تحریر فرمایا کہ ''ہم پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتے ہیں......'' اس سے معلوم ہوا کہ اصل ذمہ دار کون ہے؟ اس اعلانیہ کے لیے حضرت مولانا کے علمی دماغ نے ان لائنوں سے الگ اپنی راہ نکالی جس کو ہندوستان کے دوسرے علماء مقتدر تجویز کررہے تھے، مولانا نے بحث کا بنیادی نقطہ ''متاع کا استعمال'' قرار دیا اور اس پر ایک مستحکم رائے کا اظہار فرماکر

بحث ختم کردی جو ایک عالمانہ مجمع کا کام تھا، اس طرح جو طویل مباحثہ چل رہا تھا اس پر تنقید بھی ہوگئی، اور ایک مثبت طریقہ کار نے بحث کو سپریم کورٹ یا پارلیمنٹ سے اٹھا کر علماء کی بارگاہ میں بھی پہنچا دیا جو اس مسئلہ کا آخری حل تھا، اس کا نام ہے ذہانت، علمیت اور برجستگی جو صرف خدا کا عطیہ ہے، کسبی نہیں ہے۔

معتبر تفقہ وتدبر:

۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کے بعد اور ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی سے پہلے ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء کا سہارنپور میں اجلاس ہوا، مئی جون کا سخت زمانہ تھا، اجلاس کا موضوع تھا ''امارت شرعیہ'' اور مقصد تھا جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے امیر الہند کا انتخاب واعلان اس اجلاس کے لیے جو ایجنڈا تھا اس کو ان داعیان اجلاس نے مظاہر علوم سہارنپور اور مولویان تھانہ بھون کو بھی بھیج دیا تھا مولانا محمد شفیع صاحب اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے اور حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم اور دونوں تھانہ بھون کے بہترین ترجمان تھے، جب ایجنڈا مظاہر علوم پہنچا تو حضرت شیخ الحدیث نے فرمایا کہ ہم مظاہر علوم کے ذمہ داروں نے اس پر بحث کی اور آخر ایک تحریر لکھ کر ہم نے ایک وفد کی شکل میں جا کر جمعیۃ علماء کے ذمہ داروں کو خود دی، مجلس عاملہ میں جو تجویز زیر بحث تھی اس کا مقصد تھا کہ ہندوستان کا امیر الہند منتخب کر کے اس کا اعلان کر دیا جائے اب اس کا وقت آ گیا ہے، اور مظاہر علوم کی تحریر کا خلاصہ یہ تھا کہ امیر الہند کا انتخاب موجودہ غلامی کے ماحول میں جائز نہیں جب کہ ہم کسی معنی میں با اقتدار نہیں ہیں، امارت کے لیے اقتدار شرط اول ہے، پھر اس پر قرآن وحدیث اور احکام السلطانیہ جیسی اہم کتابوں کے حوالے تھے، اس پر اکابر علماء ہند کے دستخط تھے جو تھانہ بھون اور مظاہر علوم سے متعلق تھے پوری تفصیل ''مضامین شیخ الحدیث'' میں چھپ چکی ہے۔

تحریر اجلاس میں پیش ہوئی، پڑھی گئی، اور ذمہ داروں کی موجودگی میں ان ذمہ داروں نے پڑھ کر سنائی، اس پر مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے برافروختہ ہو کر فرمایا کہ اب تک یہ حضرات کہاں تھے؟ جب ہم بحث کرتے کرتے آخری منزل پر ہیں تو ان حضرات نے الگ سے ایک رائے کا اظہار فرمایا، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی جیسا بزرگ مجاہد عالم اور فیصلہ کن شخص مجلس عاملہ کی صدارت کر رہا تھا، یہ مجلسِ اکابر کا نازک مرحلہ تھا، دونوں کے دلائل سن کر فیصلہ فرمایا کہ علماء مظاہر علوم نے ایک عالمانہ اختلاف رائے کیا ہے اور آپ اس وقت اس کا جواب نہیں دے سکتے، اس لیے

اجلاس ملتوی کیجئے اوراس بحث کوکسی نتیجہ تک پہنچانے کے لیے ایک کمیٹی بنادیجئے جس میں آپ کے منتخب افراد ہوں جوان حضرات سے بحث کرکے کوئی آخری شرعی حل تجویز کریں، اس مجاہدانہ فیصلے پر اجلاس عام کومجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن نے آخر ملتوی کردیا اور جن تین حضرات کی کمیٹی بنائی گئی اور متفقہ طور پر اعلان کیا گیا ان کے نام تھے مولانا عبدالحلیم صدیقی لکھنوی، حضرت مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی جب کہ حضرت مولانا الاعظمی اس اجلاس میں شریک بھی نہیں ہوسکے تھےمگر ایسے سنگین مسئلوں میں فقہی نقطۂ نظرکوعلمی انداز سے حل کرنے کے لیے حضرت مولانا کی تلاش لازم تھی اس لیے تلاش کرکے آپ کا نام شامل کیا گیا کیونکہ حضرت مولانا کی علمیت، ذہانت اورتفقہ پر پوری جماعت کواعتماد تھا، یہ تھا علماء ہند میں حضرت مولانا کا علمی مقام۔

مجتہدانہ نقطۂ نظر:

راقم الحروف ریاض العلوم گورینی ضلع جونپور میں درس حدیث دے رہا تھا اوراحباب کے اصرار پر وہاں کے چند احباب کے ساتھ ''الریاض'' رسالہ بھی نکالتا تھا، اس میں افتتاحیہ اور درس حدیث کا عنوان میرے ذمہ تھا نیز دوسرے موضوعات پر بھی حسب عادت لکھا کرتا تھا، یہ رسالہ حسب معمول حضرت مولانا کی خدمت میں لازمی طور سے جاتا تھا مگر اس کا وہم بھی نہیں تھا کہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں میں اس پرنظر ڈالتے ہوں گے الا اینکہ کبھی نظر سے گذر جائے۔

۱۹۸۶ء میں ایک صاحب نے آکر پیام دیا کہ حضرت مولانا نےتم کومئو بلایا ہےتو میں سر پر پاؤں رکھ کرحاضر ہوا، ویسے چار چھ مہینے میں ضرور حاضری دیتا تھا، اس مرتبہ طلبی پر حاضر ہوا تو فرمایا کہ تمہارا ''الریاض'' دیکھا کرتا ہوں، اس میں تم نے امارت اور قضا وغیرہ کی اچھی بحث کی ہے اس سلسلے میں میں نے ایک مضمون لکھا ہے، اسے دیکھ لوتو شام کو بات ہوگی حوالے کی دو کتابیں یہ ہیں، پھر گفتگو ہوئی تو قاضی کی شرعی حیثیت پر کلام فرمایا تھا اور علامہ ماوردی کی کتاب ''الاحکام السلطانیہ'' کے حوالے سے ثابت کیا تھا کہ قضا ایک شرعی عہدہ ہے جسے کوئی صاحب اقتدار کسی اہل کو سپرد کرتا ہے میں نے حوالہ دیکھ کر کتابیں واپس کردیں اور مضمون لاکر ''الریاض'' میں شائع کردیا (دیکھئے الریاض ۱۹۸۶ء) الریاض میں بحث اس کی چل رہی تھی کہ جمعیۃ علماء ہند نے امارت شرعیہ کا جو اعلان کیا ہے اوراس کی بیعت کا جو وجوب ثابت کرکے اس پر علماء دیوبند وغیرہ سے تصدیق کراکے ایک استفتاء بھیجا

ہے اس کا جواب کیا ہے تو ہندوستان کے تمام علماء نے وجوب اطاعت کی توثیق فرمادی، لیکن مفتی ریاض العلوم مولانا محمد حنیف مولانا عبدالحلیم اور ذمہ داران ریاض العلوم گورینی نے ''حیلہ ناجزہ'' کے موقف کے تجاوز کرنے کی ہمت نہیں کی تھی، اس لیے ان کو اس امارت کے وجوب اور وجوب بیعت دونوں سے اختلاف تھا اور وجہ وہی تھی کہ بلا اقتدار اعلیٰ کے امارت کا وجود نہیں ہوسکتا، الریاض نے اس پر کافی بحث کی تھی اس کے ساتھ شرعی پنچائت اور قاضی کے موضوع پر حیلہ ناجزہ کے موقف کی پوری وضاحت کی تھی کیونکہ امارت شرعیہ بہار نے حیلہ ناجزہ ہی سے شرعی پنچائت کو باطل قرار دیا تھا۔

قضا کی اس بحث کو مولانا نے پسند فرمایا تھا اس لیے ایک نیا استدلالی مضمون لکھ کر تاکید فرمائی تھی کہ اسے جمعیۃ علماء کی طرف سے شائع کرکے تقسیم کرادو تاکہ پورے ملک میں صحیح بات پہنچ جائے، حضرت مولانا نے اس مضمون کو کسی سے خوشخط نقل کرایا تھا اس پر ان کا نام نہیں تھا مگر اس کی اکثر عربی عبارتوں کا ترجمہ میں نے کیا تھا اس لیے بحیثیت مترجم اپنا نام شائع کردیا ہے۔

حرف آخر:

حضرت مولانا کی ایک عجیب بات یہ تھی کہ مئو سے چل کر الہ آباد جاتے تو وہاں کئی کئی دن قیام فرماتے اور قیام ایک ایسی ہستی کے پاس ہوتا تھا جو فقہ، حدیث یا ادب عربی میں سے کسی فن میں ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتی تھی مگر اس ہستی میں معلوم نہیں وہ کون سا جادو تھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن ایسا شیخ الحدیث والفقہ ان کی خدمت میں سعادت مند مریدوں کی طرح خاموش باادب اور سنجیدہ رہتا تھا وہ ہستی تھی حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ کی۔(۱)

مولانا پرتاب گڈھی میں جو کمال تھا وہ ان کی روحانیت تھی۔ اتنی بلند، ایسی طاقتور اور اس قدر عظیم درجات کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مولانا ابوالحسن علی ندوی قاری محمد صدیق صاحب اور مولانا ابرارالحق صاحب جیسے اکابر ان کے یہاں ضرور تشریف لاتے اور اپنی مشیخت کو بالائے طاق رکھ کر آتے، ہردوئی کے مولانا ابرارالحق صاحب کو دیکھا ہے کہ وہاں بھی معمول کے مطابق مجلس کو گرم رکھتے تھے مگر حضرت مولانا بالکل خاموش رہتے تھے، نہ کبھی حدیث بیان کرتے نہ فقہ پڑھاتے نہ

---

(۱) یہ بات صحیح نہیں ہے، حضرت مولانا پرتاب گڈھی سے حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے تعلقات معاصرانہ ودوستانہ تھے، اور اسی حیثیت سے ان کے پاس آپ کا جانا آنا ہوتا تھا، مریدوں کی طرح جانا ہرگز نہیں ہوتا تھا (مسعود الاعظمی)

مذاکرہ کرتے بلکہ مجلس میں رہتے اور کئی کئی دن خاموش رہتے، ایک صاحب نے مجھ سے نقل کیا کہ حضرت مولانا سے مولانا محمد احمد صاحب کی مجلس میں عرض کیا گیا کہ کچھ فرمائے تو عجیب وغریب جواب دیا، فرمایا کہ میں یہاں کان لے آتا ہوں زبان لے کرنہیں، مگر یہ تو مجلس کا جواب تھا دراصل مولانا وہاں دل لے کر جاتے تھے دماغ لے کرنہیں اس لیے ان کا دل مولانا محمد احمد صاحب کی روحانیت اوران کی عظمت سے خوب خوب سرشاراوران کے فیض سے سیراب ہوتا تھا۔

حضرت مولانا کی یہی روحانی پیاس تھی جوانھیں باری باری فتح پورتال نرجا لے جاتی تھی اور وہاں مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری کی خدمت میں رہ کرفیض اٹھاتے تھے، روحانی فیض،مگر یہ سارا کام اتنی خاموشی سے کرتے تھے کہ ہم جیسے لوگ اس کی بھنک بھی نہیں پاتے تھے، البتہ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ اکابراہل ذکر کے پاس پوری بشاشت اور سکون سے خاموش رہا کرتے تھے جو ذکراللہ کی لذت کا بلند مقام ہے۔

روحانیت کا مسئلہ انتہائی نازک ہے پھر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کی سعادت مندی تھی جوان کوابتداء سے حضرت تھانوی کی خدمت میں لے گئی تھی اوران سے فیض صحبت اٹھانے کے بعدان کے ارشد تلامذہ میں سے حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی خدمت میں برابرتشریف لاتے رہے پھران کے بعد مولانا محمد احمد صاحب کے پاس آکراپنی روحانی پیاس بجھاتے رہے ظاہر ہے کہ جوروحانیت تھانہ بھون سے الہ آباد تک انھیں ساتھ لیے پھرتی تھی وہ کوئی عظیم روحانیت ہوگی اور یہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ علم ظاہر چاہے کتنا ہی عظیم ہوجائے علم باطن اور روحانیت کے بغیر وہ نامکمل ہے اس لیے ایک محدث عصر کوایک روحانی پیشوا کی خدمت میں حاضر ہوکرفیض صحبت اٹھانا پڑا، ایسے میں ہم جیسے پڑھے لکھے جاہلوں کواپنی روحانیت بڑھانے کے لیے دوچار قدم ضرور چلنا چاہئے اور علم ظاہر کے حجاب سے باہرآنا چاہئے۔

حضرت مولانا کی یہی روحانیت تھی جس نے ان کوسادہ مزاج بنادیا تھا وہ تصنع وتکلف اور شان وشوکت سے کوسوں دور رہتے تھے، کپڑوں کی سجاوٹ مکان کی رونق یا رہن سہن کے ٹھاٹ باٹ کو ان کی روحانیت ایک بارمحسوس کرتی تھی اس لئے انتہائی نازک مزاجی، نفاست پسندی کے باوجود انتہائی سادہ اور البذاذة من الایمان کی تصویربن کرزندگی گذارتے تھے، قدس اللہ سرہ العزیز۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی علیہ الرحمہ

مولانا برہان الدین سنبھلی ☆

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ان نوابغ اور نادرۂ روزگار افراد میں سے تھے، جن کے وجود سے تنہا کوئی علاقہ یا ملک ہی نہیں، سارا عالم اسلام بلکہ پوری علمی دنیا مستفید ہونے کی وجہ سے ان کی بقاء کے لیے دعا گو اور خواہش مند رہی، مولانا مرحوم کے تعارف کا ہی نہیں علمی افادیت کا دائرہ بھی عرب وعجم کے حدود تک وسیع ہو گیا تھا، بنا بریں ان کا دنیا سے رخصت ہو جانا تنہا کسی ایک ملک یا محدود علاقہ کے لئے ہی باعثِ صدمہ ونقصان نہیں، بلکہ پوری علمی دنیا اور سارا عالمِ اسلام عظیم علمی خسارہ کے احساس کی بنا پر صدمہ سے دوچار ہو تو بعید نہیں، ان کے رحلت فرمانے سے یہ خیال کرنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان اس عظیم امتیاز سے محروم ہو گیا جو اِدھر کئی صدیوں کے اندر اسے حاصل رہا، جس نے سارے عالم اسلام پر اسے گویا برتری سے ہم کنار رکھا، میری مراد اس خصوصیت سے ہے جس کا اظہار واعتراف عالم اسلام کے نامور محقق وادیب علامہ رشید رضا مصری نے اپنے ان تاریخی اور سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق الفاظ میں کیا تھا: **لو لا عناية إخواننا علماء الهند بعلوم الحديث في هذا العصر لقضي عليها بالزوال .... فقد ضعف في مصر والشام والعراق والحجاز حتى بلغت منتهى الضعف''** (یعنی اگر ہمارے دینی بھائی ہندوستانی علماء، علوم حدیث کی خدمت واشاعت وغیرہ کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یہ علم شریف دنیا سے ختم ہو چکا ہوتا، کیونکہ اس علم کے جو اصل مراکز تھے، مثلاً مصر، شام، عراق اور حجاز وہاں یہ ضعف کے آخری درجہ تک پہنچ گیا تھا) ظاہر ہے کہ علامہ موصوف کا یہ اعتراف ہندی علماء کے ان علمی کارناموں ہی کی بنا پر تھا جو فن شریف کے سلسلہ میں انھوں نے اِدھر کوئی تین چار صدیوں کے اندر انجام دیے، کہا

☆ استاذ تفسیر وحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ

جا سکتا ہے کہ اس کی ابتدا دسویں صدی ہجری کے ممتاز محدث شیخ علی متقی رحمۃ اللہ (صاحبِ کنز العمال) سے ہوئی اور اس کا نقطۂ عروج حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کی صلبی و معنوی اولاد (جس میں علمائے دیوبند و مظاہر علوم بھی شامل ہیں) کی خدمت اور اس کا اختتام محدثِ جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی ذات گرامی پر ہوگیا، کیونکہ اب بظاہر ہندوستان میں ایسا کوئی نظر نہیں آتا جس میں مولانا کا اس فن میں سچا جانشین اور اس خلا کو پُر کرنے کی پوری اہلیت کا حامل کہا جاسکے: (وَمَا شَهِدْنَا اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِيْنَ) اس لیے یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ اگر بیرون ہند مولانا کا غم اس بنا پر ہے کہ ان کی وفات سے ایک بڑا علمی نقصان ہوگیا، تو ہندوستان اسی کے ساتھ اپنے امتیاز کے ختم ہوجانے کی وجہ سے دوہرے صدمہ سے دوچار ہے۔ اس پر مستزاد یہ حقیقت کہ اب اس روز افزوں علمی زوال کے زمانہ میں اس کی امید بھی بظاہر اسباب نظر نہیں آتی کہ آئندہ یہ خلا پُر ہوسکے گا اور ہندوستان کا یہ امتیاز لوٹ آئے گا! اگرچہ اللہ علیم وقدیر- جس کی صفت **يُخرج الحي من الميت، اور فعّال لما يريد**- ہے کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ سوکھی سرزمین کو پھر سرسبز و شاداب بنادے۔

اب حضرت مولانا مرحوم کے لیے علو درجات کی دعا اور ان کے چھوڑے ہوئے علمی خزانہ سے استفادہ کی سعی اور بقدر استطاعت و محنت ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے، اور مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں صدیقین و شہداء کے زمرہ میں شامل کرے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

مولانا ضیاءالدین اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ ☆

محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی عرصہ سے موت وحیات کی کشمکش میں گرفتار تھے، راقم ۲۳ر فروری کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کی دعوت پر کلیۃ فاطمۃ الزہرا کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے مئو گیا، تو مولانا الاعظمی کی عیادت کے لیے بھی حاضر ہوا، لیکن ڈاکٹروں نے ملنے جلنے پر سخت پابندی لگا رکھی تھی، میری خواہش پر صاحبزادہ محترم مولانا رشید احمد صاحب (نے) دیدوزیارت کا موقع مہیا کر دیا، لیکن اس وقت محدث کبیر نہ بات چیت کرتے تھے اور نہ آنکھیں کھولتے تھے، چندروز بعد مولانا رشید احمد صاحب نے خط سے اطلاع دی کہ اب بھی وہی کیفیت ہے، بلکہ صحت مزید خراب ہوتی جارہی ہے، میں پھر عیادت کے لیے جانا چاہتا تھا کہ ۱۱ر رمضان المبارک کو حادثہ جانکاہ کی اطلاع آگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

محدث العصر نے طویل عمر پائی اور مصروف علمی زندگی گزاری، وہ ۱۳۱۹ھ میں پیدا ہوئے، ''اختر حسن'' تاریخی نام تھا۔ گھریلو تعلیم کے بعد انھوں نے مئو سے ملحق قصبہ بہادر گنج کے مدرسہ میں داخلہ لیا، جہاں مولانا عبدالغفار عراقی کے بھائی مولانا ابوالحسن عراقی سے کسب فیض کرنے کے بعد مظہر العلوم بنارس میں داخلہ لیا، حصول تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند کا سفر دوبار کیا، مگر دونوں بار طبیعت خراب ہوجانے کی وجہ سے واپس چلے آئے اور دارالعلوم مئو ہی میں مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی کی خدمت میں رہ کر دورۂ حدیث مکمل کیا۔ فراغت کے بعد یہیں درس وتدریس کی خدمت پر مامور ہوگئے، پھر مئو کے دوسرے بڑے مدرسہ جامعہ مفتاح العلوم سے وابستہ ہوئے اور اس کے صدر مدرس بھی رہے، یہاں سے علیٰحدہ ہوئے تو خود المعہد العالی ومرقاۃ العلوم کی داغ بیل ڈالی، جواب مئو کے بڑے مدرسوں کی صف میں آگیا ہے۔

مولانا کا اصل مشغلہ درس وتدریس تھا، ان کے بے شمار تلامذہ اس برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں، جن میں مولانا محمد منظور نعمانی اڈیٹر الفرقان اور مفتی ظفیر الدین صاحب بھی ہیں۔ تاہم تحریر

☆ سابق مدیر رسالہ معارف وناظم دارالمصنفین اعظم گڈھ

وتصنیف کا کام بھی وہ برابر انجام دیتے رہے اور انھیں اس کا اچھا سلیقہ اور عمدہ ذوق تھا۔ حدیث واسماء الرجال ان کا خاص فن تھا اور اس پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، مخطوطات سے بھی انھیں بڑا شغف تھا، ان کا مہتم بالشان کارنامہ احادیث کی بہت سی ان نادر کتابوں کی اشاعت ہے جو مخطوطہ ہونے کی بنا پر اہل علم کی دسترس سے باہر تھیں۔ مولانا نے ان کو ان کے مختلف نسخوں کی مدد سے مقابلہ، تصحیح وتعلیق اور مفید حواشی کے ساتھ شائع کر کے اصحاب علم وتحقیق پر بڑا احسان کیا۔ انھوں نے جن کتابوں کو اڈٹ کیا ہے ان پر عالمانہ مقدمے بھی لکھے ہیں، جن میں مصنف کے حالات وکمالات کے علاوہ ان موضوعات پر پہلے اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ کر کے زیر اشاعت کتاب کی اہمیت وعظمت دکھائی ہے، حواشی وتعلیقات میں مختلف نسخوں کے فرق واختلاف اور متن میں درج آیتوں اور حدیثوں کی تخریج، رجال واسناد کی تحقیق، مشکل وغریب الفاظ اور مشکلات حدیث کی تشریح کی گئی ہے، دوسری مشہور ومتداول کتابوں کی حدیثوں سے زیر نظر کتابوں کی مطابقت یا اختلاف کو ظاہر کر کے ان کی صحت وخطا کا فیصلہ کیا ہے، شروع میں مخطوطہ کے بعض صفحوں کا عکسی فوٹو اور متعدد فہرستیں دے کر استفادہ ومراجعت کو آسان کر دیا ہے، اس طرح کی جو کتابیں مرتب کی ہیں ان کے نام یہ ہیں:

مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، کتاب السنن (حافظ سعید بن منصور) کتاب الزہد والرقائق (عبداللہ بن مبارک) مجمع بحار الانوار (ملا محمد بن طاہر پٹنی) الحاوی علی رجال الطحاوی وغیرہ۔

آخر الذکر رجال طحاوی پر خود مولانا کی بلند پایہ علمی وتحقیقی تصنیف ہے۔

اردو میں بھی مولانا کی متعدد تصانیف ہیں جو اکثر رد ومناظرہ میں ہیں، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

(۱) اعیان الحجاج (دو جلدیں) (۲) نصرۃ الحدیث (۳) الاعلام المرفوعہ (۴) رکعات تراویح۔

مولانا سلیس، شگفتہ، پُر مغز اور حشو زوائد سے پاک اردو لکھتے تھے، جو ماقلّ ومادلّ کا نمونہ ہوتی تھی۔

مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے معارف اور برہان میں متعدد محققانہ مضامین بھی لکھے

ہیں، ان میں سے اکثر میں کسی مصنف یا مقالہ نگار کی فروگذاشتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ بڑے بیش قیمت ہیں جن سے علمی وتحقیقی کام کرنے والے بے نیاز نہیں ہوسکتے، اس لیے معارف میں چھپنے والے ان کے مضامین کی ایک فہرست دی جاتی ہے:

جواد ساباط (جلد ۲۱ عدد ۴) دو متبرک اجازت نامے (جلد ۴۰ عدد ۶) تخریج زیلعی (جلد ۴۶ عدد ۱) الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ (جلد ۶۶ عدد ۲) مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے (جلد ۳۷ عدد ۱) پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (جلد ۴۷ عدد ۴ و ۵) قاضی رشید بن زبیر غسانی اسوانی مصری مصنف الذخائر والتحف [1] (جلد ۸۷ عدد ۶) دینور و مشائخ دینور (جلد ۹۶ عدد ۴) ابو عبید کی غریب الحدیث (جلد ۱۰۰ عدد ۴) غریب الحدیث (جلد ۱۰۱ عدد ۲) فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (جلد ۱۲۳ عدد ۴)۔

مولانا متبحر عالم اور بلند پایہ محدث تھے اور اس حیثیت سے ہندوستان ہی نہیں، بلکہ عرب ملکوں میں بھی وہ بے نظیر تھے، فقہ حنفی پر بھی ان کی وسیع نظر تھی جس کی تائید وحمایت میں پیش پیش رہتے تھے۔

لگن اور خاموشی سے علم و مذہب کی خدمت ہی مولانا کا مشن تھا اور اسی سے ان کو طبعاً مناسبت بھی تھی، لیکن ان کا رجحان آزادی واتحاد کی تحریک کی طرف رہا اور وہ کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند سے عملاً وابستہ بھی تھے، ۱۹۵۲ء میں مئو کے حلقہ سے کانگریس نے انھیں اسمبلی کے لیے اپنا امیدوار بنایا جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس زمانہ میں اسمبلی کی ممبری باوقار سمجھی جاتی تھی، تاہم مولانا جیسے علمی آدمی کو اس سے کوئی مناسبت نہیں تھی، اس لیے ان کا زیادہ وقت ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں گزرتا تھا، اس سے فائدہ اٹھا کر ندوہ کے ارکان نے انھیں درس حدیث کی خدمت تفویض کردی، جس کو وہ بلا معاوضہ انجام دیتے رہے؛ مگر دوبارہ انتخاب میں امیدوار ہونا پسند نہیں کیا۔ مولانا کی طویل علمی وتحقیقی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے ۱۹۸۴ء میں انھیں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ عطا کیا تھا۔

سیاست میں مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک سے قریب ہونے کی بنا پر مولانا اسعد مدنی سے بھی ان کو عزیزانہ تعلق تھا، چند برس قبل امارت شرعیہ ہند نے ان کو امیر الہند منتخب کیا تھا۔ بیعت واجازت کا تعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور دونوں بزرگ ایک دوسرے کے فضل وکمال کے معترف تھے۔

(۱) ماہنامہ معارف میں یہ مضمون ''کتاب الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟'' کے عنوان سے چھپا ہے (مسعود الاعظمی)۔

دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کے بڑے عظمت شناس تھے، دارالمصنفین آتے تو مولانا سے ملاقات کے لیے مئو بھی تشریف لے جاتے۔ شروع ہی سے مولانا اعظمی کا تعلق دارالمصنفین سے بھی تھا جو آخر تک قائم رہا، حضرت سید صاحب ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے اور اپنی بعض تحریروں کو اشاعت سے پہلے ان کے پاس بھیجتے اور ان کے مشورے کے مطابق ان میں ردوبدل بھی فرماتے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم بھی ان کا بڑا اکرام کرتے۔ چند برس قبل ان کو دارالمصنفین کی وقف کمیٹی کی رکنیت پیش کی گئی تو انھوں نے اس کو بخوشی منظور کرلیا۔

مولانا اس برصغیر ہی نہیں، پوری اسلامی دنیا میں اپنے علمی و دینی کارناموں کی وجہ سے مشہور ومقبول تھے، انھوں نے کئی مسلم ملکوں کا علمی سفر بھی کیا تھا۔ عرب ممالک کے ممتاز فضلاء سے ان کے روابط تھے، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ان کے بڑے مداح تھے۔ شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا لاہور بھی ان کے بڑے قدرداں تھے، ایک دفعہ وہ دارالمصنفین تشریف لائے تو مولانا سے ملنے مئو بھی گئے۔

اپنے وطن میں مولانا کو جو مقبولیت حاصل تھی، اس کا اندازہ ان کے جنازہ سے ہوا، جس میں شرکت کے لیے دارالمصنفین سے راقم اپنے رفیق کار مولوی محمد عارف عمری اور مولوی احتشام علی ندوی کے ساتھ گیا تھا۔ مئو کے ہر گلی کوچہ میں آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے، ہم لوگ بڑی زحمت سے مولانا کی قیام گاہ (پٹھان ٹولہ) پہنچے، لیکن دیدوزیارت کا شرف حاصل نہ کرسکے۔ ریلوے کے بڑے اور وسیع میدان میں جنازہ کی نماز کا اہتمام کیا گیا تھا، مولانا ہی کے ایک ہم نام اور اپنے اہل تعلق مولوی حبیب الرحمٰن ندوی کی معیت میں ریلوے میدان گئے، جہاں اتنے لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی جن کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا، البتہ بعض لوگوں کو جب یہ کہتے سنا کہ مئو میں ابھی تک کسی کے جنازہ میں نہ اتنا بڑا مجمع ہوا تھا اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے، تو ہم نے بھی اپنے دل میں کہا یہ اس عہد کے امام زیلعی اور ملا علی قاری کا جنازہ ہے، جن کی زبان وقلم ہمیشہ احادیث کی شرح وترجمانی اور ان کی مشکلات وغوامض کو حل کرنے میں مصروف رہے ہیں اور جن کا وجود گرامی علوم نبوی ﷺ کی خدمت وفروغ اور نادر ونایاب کتب احادیث کی طبع واشاعت کے لیے وقف رہا ہے۔

اللہ تعالی عالم آخرت میں علم ودین اور احادیث نبوی ﷺ کے اس خادم کے مراتب ودرجات کو بلند کرے۔

ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نور اللہ مرقدہ
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

پروفیسر عبدالرحمٰن مومن☆

علامہ عبدالرحمٰن بن خلدون مغربی اپنے مقدمہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ علوم دینیہ کی توسیع واشاعت کا سہرا زیادہ تر عجم کے سر بندھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس امر کا سب سے روشن ثبوت ہمارے ملک ہندوستان سے فراہم ہوتا ہے۔ علوم اسلامیہ کی نشر واشاعت میں ہندوستانی علماء کا جو حصہ ہے، کیفیت اور کمیت میں اس کی مثال شاید ہی دنیا کی کے کسی اور ملک میں ملے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ غرض کہ علوم اسلامیہ کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جس پر ہمارے اسلاف نے اپنے علم وفضل کے اَن مٹ نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ جس فن کے ساتھ ہمارے متقدمین ومتاخرین علماء نے بہت زیادہ اعتنا کیا اور جس کے معترف اہل عرب وعجم سبھی ہیں وہ علم حدیث ہے۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مسند احمد بن حنبل جو پہلی بار مصر سے چھپی اس کے جملہ مصارف حیدرآباد کے نواب میر محبوب علی خاں نے ادا کیے، مگر تاکید تھی کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

حیدرآباد کے دائرۃ المعارف العثمانیہ نے حدیث اور رجال کی نادر ونایاب اور بلند پایہ کتابوں کو آب وتاب کے ساتھ شائع کیا۔ چنانچہ سنن بیہقی دس جلدوں میں، کنز العمال ۲۲ جلدوں میں، مستدرک حاکم، مسند ابی داد طیالسی، مسند ابی عوانہ اور خوارزمی کی جامع مسانید الامام الاعظم اسی ادارہ سے شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ رجال میں ابن عبدالبر کی استیعاب، امام بخاری کی التاریخ الکبیر، حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب اور لسان المیزان، نیز ثقات ابن حبان جیسی بلند پایہ کتابوں کو شائع کروانے کا سہرا دائرۃ المعارف العثمانیہ کے سر ہے۔ علم مصطلح الحدیث میں حافظ ابوعمر الشہر زوری کی مشہور کتاب مقدمہ ابن الصلاح پہلی بار ہندوستان سے چھپی۔ ڈابھیل کی

☆ صدر شعبہ عمرانیات بمبئی یونیورسٹی

مجلس علمی نے زیلعی کی نصب الرایہ، مولانا کشمیری کی فیض الباری فی شرح البخاری، مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی اور سنن سعید بن منصور شائع کی۔

ہندوستان کے محدثین عظام کے اس قافلہ کے آخری اور بقیۃ السلف ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نور اللہ مرقدہ وطاب ثراہ تھے۔ ۱۰؍رمضان المبارک کو علم وفضل کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ مولانا کی ولادت ۱۳۱۹ھ میں اعظم گڈھ کے قصبہ مئو میں ہوئی۔ انھوں نے علامہ انور شاہ کشمیری، مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا عبدالغفار مئوی سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ نہ صرف ہند وپاکستان، بلکہ سارے عالم اسلام کے ممتاز ترین محدثین میں ان کا شمار تھا۔ آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے، مکہ مکرمہ کے ایک علمی ودینی اجتماع میں جس میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا منظور نعمانی بھی شریک تھے، شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آج تمام عالم میں علم حدیث میں آپ کا نام سب سے بڑی سند رکھتا ہے۔ چار پانچ سال پہلے آپ جامعہ ازہر کی دعوت پر مصر تشریف لے گئے تھے، اس موقع پر علماء وفاضلین عرب سے مولانا کا تعارف کراتے ہوئے مدیر الازہر نے کہا **ھذا کبیر المحدثین فی العالم وأکبرھم فی الھند** (یہ دنیا کے کبار محدثین میں سے ہیں اور ہندوستان کے سب سے بڑے عالم حدیث ہیں) عالم عرب کے علماء ومحدثین مولانا حبیب الرحمٰن سے حدیث کی سند لینے کو باعث سعادت وناز سمجھتے تھے۔ ان عرب علماء میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، دارالافتا ریاض کے شیخ اسماعیل الانصاری، شیخ حماد الانصاری، بغداد کے شیخ صحی سامرائی اور بشار عواد معروف اور کویت کے ڈاکٹر عبدالستار ابوغدہ وغیرہ شامل ہیں۔ مصر اور دیگر عرب ممالک کے سفر اور علمی ودینی مجلسوں میں متعدد اہل علم آپ کے پاس آتے اور کہتے ہیں کہ ہم آپ کو اپنا استاذ مانتے ہیں، کیونکہ ہم نے آپ کی کتابوں سے تحقیق وتعلیق کا فن سیکھا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن رحمہ اللہ حدیث کے نایاب مخطوطات کو حاصل کرنے اور ان کو تحقیق وتعلیق کے ساتھ مرتب کرنے کا خصوصی ذوق اور ملکہ رکھتے تھے۔ ان کا سب سے اہم علمی وتحقیقی کارنامہ عبدالرزاق بن ہمام صنعانی (متوفی ۲۱۱ ہجری) کی کتاب المصنف کی ترتیب ہے، جو مجلس علمی کی اعانت سے دنیا کی پہلی بار گیارہ جلدوں میں بیروت سے شائع ہوئی۔

عبدالرزاق صنعانی دوسری صدی ہجری کے جلیل القدر حفاظ حدیث میں سے ہیں، امام احمد

ابن حنبل اور یحییٰ بن معین ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔اس کتاب کی تحقیق وترتیب میں حضرت مولانا نے نہ صرف احادیث کی تخریج کی ہے اورغریب ونامانوس الفاظ کی وضاحت کی ہے، بلکہ اعلام وامکنہ کی فہرست بھی دی ہے۔آپ کا دوسرا اہم کارنامہ ابوبکر حمیدی (متوفی ۲۱۹ ہجری) کی مسند حمیدی کی تحقیق وتعلیق ہے۔امام حمیدی کے تلامذہ میں امام بخاری جیسے سرخیل محدثین شامل ہیں۔اس کتاب کی ترتیب میں بھی حضرت مولانا نے نہ صرف احادیث کی تخریج کی ہے، بلکہ فقہی ترتیب پر احادیث کی فہرست تیار کی ہے۔کتاب کے شروع میں مولانا کا مبسوط اور آخر میں اعلام وامکنہ کی فہرست بھی شامل ہے۔مولانا حبیب الرحمٰن رحمہ اللہ کی تیسری اہم کتاب سعید بن منصور خراسانی (متوفی ۲۲۷ ہجری) کی کتاب السنن کی تیسری جلد کی تحقیق وترتیب ہے۔امام سعید بن منصور کے حلقہ درس سے اٹھنے والوں میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، اور امام احمد بن حنبل، جیسے کبار محدثین بھی شامل ہیں۔اس کتاب کا نسخہ ڈاکٹر حمید اللہ رحمہ اللہ صاحب مدظلہٗ کی کوشش سے ترکی کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔اس کتاب کی ترتیب میں بھی حضرت مولانا نے تحقیق وتعلیق کا حق ادا کردیا ہے۔حضرت عبداللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ ہجری) کی کتاب الزہد والرقائق جو اب تک غیر مطبوعہ تھی اسے بھی تحقیق وتعلیق کے ساتھ حضرت مولانا نے مرتب کیا۔یہ کتاب مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ان کتب چہار گانہ کی ترتیب واشاعت پر تمام عالم اسلام سے حضرت مولانا کو داد تحسین ملی۔ان کتابوں کے علاوہ آپ نے حافظ ہیثمی کی کتاب کشف الاستار عن زوائد البزار کی بھی تحقیق کی ہے، اس کتاب کی دو جلدیں [۱] دمشق سے شائع ہوچکی ہیں۔حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب المطالب العالیہ فی زوائد المسانید الثمانیہ آپ کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ چار جلدوں میں کویت سے شائع ہوچکی ہے۔اگرچہ انتقال کے وقت آپ کی عمر نوے سال سے متجاوز تھی۔لیکن آپ اخیر تک علمی کاموں میں منہمک رہے، اخیر عمر میں آپ کا اہم کارنامہ مصنف ابن ابی شیبہ کی ترتیب وتحقیق ہے، جس کی پانچ جلدیں آپ کی حیات میں مکہ معظمہ سے شائع ہوئیں۔بقیہ آٹھ دس جلدوں کی تحقیق وتعلیق سے بھی آپ فارغ ہوچکے تھے۔یہ جلدیں ہنوز تشنۂ طباعت ہیں۔اگرچہ مصنف ابن ابی شیبہ بمبئی اور پاکستان سے شائع ہوچکی ہے، لیکن مطبوعہ نسخوں میں متعدد اغلاط موجود ہیں۔حضرت مولانا نے ان تمام اغلاط اور فروگذاشتوں کی نشاندہی اور اصلاح کی

(۱) یہ کتاب چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

ہے۔حضرت مولانا کی غیر مطبوعہ کتابوں میں الحاوی فی رجال الطحاوی اور ثقات ابن شاہین شامل ہیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمہ اللہ نے کئی کتابیں اردو میں بھی لکھیں۔نصرۃ الحدیث جو فتنہ انکار حدیث کی تردید میں لکھی گئی ہے، اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب ہے۔مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اس کی بڑی تعریف کی تھی۔مولانا کی دوسری اہم کتاب اعیان الحجاج جو دو جلدوں میں شائع ہوئی۔اعلام مرفوعہ نامی رسالہ طلاق ثلاثہ کے موضوع پر ہے۔رکعات تراویح میں تراویح کی بیس رکعتوں کے بارے میں مدلل ثبوت فراہم کئے گئے ہیں۔غالباً آپ کی آخری کتاب دستکار اہل شرف ہے جس میں آپ نے کفاءت کے مسئلہ کی وضاحت کی ہے اور پارچہ بافی سے وابستہ علماء وفضلاء کا تذکرہ کیا ہے۔مولانا منظور نعمانی کی کتاب معارف الحدیث پر آپ نے جامع مقدمہ لکھا تھا۔اس کا انگریزی ترجمہ سال بھر پہلے (**THE SUNNAH IN ISLAM**) کے نام سے لندن سے شائع ہوا۔

عاجز راقم السطور کا حضرت مولانا سے تعلق ان کی زندگی کے آخری حصہ میں ہوا۔آج سے دس بارہ سال پہلے مراسلت کے ذریعہ نیازمندانہ تعلقات کا آغاز ہوا، اور پھر کئی ملاقاتیں بھی ہوئی۔گذشتہ دس برسوں میں عاجز پر ان کی نظر عنایت رہی اور اس نے حضرت والا کے علم وفضل اور معرفت وبصیرت کے سرچشمہ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ان کی سادگی، انکسار اور نام ونمود سے بے نیازی نے ان کی شخصیت میں بڑی دل آویزی پیدا کردی تھی، وہ عُجب اور خود بینی سے کوسوں دور تھے، دوسرے علماء کے برخلاف وہ معاصرانہ چشمک سے بالاتر تھے، ان کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔مولانا بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اہل دل بھی تھے، ان کا چھوٹا سا اردو رسالہ ''اہل دل کی دل آویز باتیں'' ان کی سیرت وشخصیت کے دل آویز نہاں خانوں کی غمازی کرتا ہے۔شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی کتاب عجالۂ نافعہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ علم حدیث سے وابستگی اور مزاولت انسان میں صحابیت کی شان پیدا کردیتی ہے۔جن لوگوں نے مولانا حبیب الرحمٰن رحمہ اللہ کو قریب سے دیکھا ہے وہ محدث دہلوی کے اس بصیرت افروز مشاہدہ کی صداقت کی گواہی دیں گے۔

حضرت مولانا کے ساتھ میرے نیازمندانہ تعلقات کی تقریب ایک خط کے ذریعہ ہوئی، جس میں میں نے لکھا تھا کہ ''ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب صحیفہ ہمام بن منبہ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا کی تصنیف کردہ مصنف عبدالرزاق کی آخری جلد دراصل مسند معمر بن راشد

ہے جو مصنف کے ساتھ خلط ملط ہوگئی ہے''۔حضرت نے میرے خط کے جواب میں لکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال درست نہیں ہے۔اس کتاب کو اس کے مشہور راوی اسحاق بن ابراہیم الدبری کے علاوہ دوسرے ثقہ رواۃ نے بھی مستقل طور پر روایت کیا ہے۔اس کے کچھ عرصہ بعد مولانا نے اس موضوع کو اور وسعت دے کر لکھنؤ کے رسالہ البعث الاسلامی (رجب ۱۴۰۵) میں ایک مضمون لکھا اور بتلایا کہ انھوں نے مصنف کا ایک نسخہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے والد گرامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے،اس میں بھی آخری جلد مصنف عبدالرزاق کا حصہ ہے یہ نسخہ ۱۳۴۸ ہجری کا لکھا ہوا ہے۔

ملفوظات عزیزی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ارشاد نقل ہے کہ مشہور ہے اور تجربہ میں بھی آیا ہے کہ خادم حدیث کی عمر سو سال سے بھی تجاوز کر جائے تب بھی اس کے حواس بجا رہتے ہیں۔ ہم نے اس کی جیتی جاگتی مثال مولانا کی ذات میں دیکھی،ان کا علمی انہماک وجستجو اور استحضار آخری عمر تک قائم ودائم رہا،میں اکثر مراسلت کے ذریعہ یا ملاقات کے دوران ان سے علمی استفسارات کیا کرتا تھا۔۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ نے شاہ بانو مقدمہ میں جو فیصلہ صادر کیا،اس سے مسلمانان ہند میں کافی اضطراب پیدا ہوا،میں نے اس موقع پر انگریزی میں ایک رسالہ لکھا اور بتلایا کہ کس طرح سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے متاع مطلّقہ کے مسئلہ میں شریعت اسلامیہ کے احکام سے انحراف کیا اور قرآن کریم کی غلط اور من مانی تاویل کی۔اس سلسلہ میں میں نے حضرت مولانا سے مراجعت کی اور ان سے گذارش کی کہ متاع مطلّقہ سے متعلق حدیث وآثار صحابہ سے کچھ نظیریں اور شہادتیں فراہم فرمائیں۔ حضرت نے از راہِ کرم مصنف عبدالرزاق،مسند حمیدی اور سنن بن منصور،مصنف ابن ابی شیبہ اور تفسیر طبری سے صحابہ وتابعین کے اقوال وفتاویٰ کے حوالے ارسال فرمائے،اور لکھا کہ متاع مطلقہ ایک وقتی امداد کی حیثیت رکھتی ہے جس کا مقصد مطلقہ کی دل دہی اور تطییبِ خاطر ہے۔

آج سے چار پانچ سال پہلے بھیونڈی کے محلّہ اسلام پورہ کی مسجد کا از سرِ نو تعمیری کام شروع ہوا۔اس کا نقشہ بنوانے اور تعمیری کام کی نگرانی کے لیے ہم نے شہر کے ایک تجربہ کار اور ماہر فن ہندو انجینئر سے رجوع کیا،اس پر بعض لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔اس معاملہ میں میں نے حضرت مولانا سے رجوع کیا،میرے خط کے جواب میں حضرت نے لکھا کہ غیر مسلم سے مسجد کا نقشہ بنوانے نیز معماری وغیرہ کا کام لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔یہاں یہ ذکر کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ ہندو انجینئر

سے رجوع کرنے سے پہلے ہم بمبئی کے ایک مشہور مسلمان انجینئر کے پاس گئے تھے، جنھوں نے بیسیوں مسجدوں کے نقشے اور خاکے بنائے ہیں۔ ہماری بات سننے کے بعد انھوں نے اپنے معاوضہ کی بات کہی، جو کم وبیش بیس لاکھ روپئے ہوتی۔ ہم نے ان سے معذرت کی اور مجبوراً ہندو انجینئر کے پاس گئے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ مسجد کا تعمیری کام نہایت ایمان داری اور خوش اسلوبی سے انجام دیا، بلکہ معاوضہ کے طور پر ایک پیسہ لینا گوارا نہ کیا۔

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو صنم بھی کہے ہری ہری

غالباً ۸۷-۱۹۸۶ء کا ذکر ہے، میری درخواست پر حضرت ایک دن میرے غریب خانہ واقع بھیونڈی تشریف لائے، میں نے حضرت کو مصحف عثمانی کے نسخۂ تاشقند کی فوٹو کاپی دکھلائی جو امریکہ سے شائع ہوئی ہے، حضرت نے نہایت غور سے اس زمانہ کے طرز کتابت کو ملاحظہ فرمایا۔ میں نے انھیں ترکی کے توپ قپو میوزیم میں رکھے ہوئے بعض تبرکات نبوی کے فوٹو بھی دکھلائے جو میں نے ترکی سے منگوائے تھے۔ اس موقع پر میں نے حضرت کے سامنے صحیح بخاری کی پہلی حدیث **انـمـا الاعـمال بالنیات** کے متن کی قرأت کی۔ حضرت نے سماعت فرمائی اور اس حدیث کی مجھے اجازت عطا فرمائی۔ یہ لمحہ میری زندگی کے مبارک ترین لمحات میں سے ہے، اس نسبت سے حضرت مولانا میرے استاذ تھے اور یہ شرف تلمذ میرے لیے باعثِ صد افتخار ہے۔

گذشتہ دو برسوں میں حضرت کی صحت بہت زیادہ گر گئی تھی، داہنی آنکھ کا آپریشن ہوا جو بدقسمتی سے کامیاب نہ ہوسکا۔ غذا بھی بہت کم ہوگئی تھی۔ گذشتہ دسمبر میں میں نے اپنا ایک مضمون صحیح بخاری کی روایت زناقِردہ حضرت کے ملاحظہ کے لیے بھیجا، ضعف ونقاہت اور بینائی متاثر ہونے کے باعث مضمون تو نہ پڑھ سکے، لیکن اپنے صاحبزادہ مولوی رشید احمد سے پڑھوا کر سنا۔ اپنی رائے سے مطلع فرمایا اور لکھا کہ مضمون غیر ضروری طوالت لیے ہوئے ہے۔ صرف روایت کے الحاقی یا منکر ہونے پر اکتفا کیا جاسکتا ہے، یہ مضمون معارف کے حالیہ شمارہ میں شائع ہوا ہے۔

اگر چہ حضرت مولانا کے علمی کارناموں سے زیادہ تر اہل علم واقف ہیں، لیکن ان کی خدا ترسی، عظمت وشفقت کی بنا پر ہزار ہا لوگ ان کے گرویدہ تھے، ان کے جنازہ میں ہزاروں افراد کی

شرکت، جن میں غیر مسلم بھی شامل تھے، ان کی عنداللہ مقبولیت پر دلالت کرتی ہے۔ ان کی علمی خدمات کا تمام عالم اسلام میں شہرہ تھا، لیکن ہمارے اپنے ملک میں ان کی جیسی قدر دانی ہونی چاہئے تھی، وہ نہیں ہوئی۔ محسن شناسی کا تقاضہ ہے کہ ہم ان کے چھوڑے ہوئے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں اور ان کی عظمت اور علمی خدمات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں میں روشناس کرائیں۔ حضرت مولانا کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد ہندو پاکستان اور دیگر ممالک میں موجود ہے۔ وہ اس معاملہ میں باہم تعاون واشتراک کرکے اس فرض کو ادا کرسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں عاجز کی تجویز ہے کہ ایک انجمن بنام ''مولانا حبیب الرحمٰن اکیڈمی'' تشکیل دی جائے۔ جو درج ذیل امور کی انجام دہی کا ذمہ لے:

۱-: مصنف ابن شیبہ کی بقیہ جلدیں زیور طباعت سے آراستہ کی جائیں۔

۲-: الحاوی لرجال الطحاوی کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

۳-: ابن حجر کی المطالب العالیہ کا مجرد عن الاسانید نسخہ کویت سے شائع ہو چکا ہے، اس کا باسند نسخہ جسے حضرت مولانا مکمل فرما چکے تھے، شائع کیا جائے۔

اسی طرح کشف الاستار کی دو جلدیں دمشق سے شائع ہو چکی ہیں، دو باقی ہیں جن پر حضرت کی نظر ثانی ہو چکی ہے ان کی اشاعت کا بھی انتظام کیا جائے[(۱)]۔

۴-: مولانا منظور نعمانی کی کتاب معارف الحدیث پر مولانا کا جو مقدمہ ہے اور جس کا انگریزی ترجمہ لندن سے شائع ہوا ہے۔ اس کی ہندو پاک میں زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہئے۔

۵-: نذر حبیب یا اور کسی نام سے حضرت مولانا کی یاد میں ایک بین الاقوامی نوعیت کا سپاس نامہ (FESFSCHRIFT) تیار کیا جائے جو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں ہو۔

حضرت مولانا کے کتب خانہ میں نوادر علمیہ اور ان کے نام مشاہیر کے خطوط کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے۔ اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

۷-: اعیان الحجاج اور دست کار اہل شرف کے انگریزی تراجم شائع کیے جائیں۔

اخیر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمہ اللہ کے درجات بلند فرمائے اور ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

---

(۱) یہ کتاب پہلے بھی دمشق سے چار جلدوں میں شائع ہوئی تھی، اور اب اس کا نیا اڈیشن تصحیح کے مزید اہتمام کے ساتھ چار جلدوں میں اشاعت العلوم اکل کوا کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

ایک عہد آفریں شخصیت

مولانا محمد حنیف ملی☆

ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے دنیائے حدیث میں خصوصاً اور قابل وممتاز علماء ربانی کی بزم میں عموماً جو خلا ہوا ہے ایک زمانہ تک اسے محسوس کیا جاتا رہے گا، اہل کمال اور صاحب فضل تو پیدا ہوتے رہیں گے، لیکن مولانا نے حدیث کے میدان میں کوہ کنی کے ساتھ تحقیق وریسرچ اور تعلیق وتحشیہ کی جو انمول راہ قائم کی ہے اسے تشنۂ علم اب نہ پاسکیں گے، تقریباً ایک صدی پر مشتمل شکست نا آشنا زندگی نے جو روشنی اپنی کاوشوں سے اس امت کو عطا کی ہے، اس سے علماء اور ارباب فضل قیامت تک بے نیاز نہیں ہوسکیں گے، مولانا کی ذات کیا تھی ایک مشت خاک، ایک گرد راہ، ایک نقطۂ آغاز، لیکن خدا کے حکیم وحسین ہاتھوں نے موتی سمجھ کے انھیں اس طرح چن لیا کہ عرب وعجم سب ان کی تحقیق اور رجال وحدیث کی خدمات پر سرنگوں اور معترف ہیں۔

مولانا کی علمی، دینی اور تعلیمی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اگر میں یہ کہوں کہ ان کی ذات میں علم ومعرفت، ایثار وقربانی، تحقیق وریسرچ اور درس وتدریس کا ایک عالم اکبر آباد اور سنہری تاریخ آراستہ ہے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی وفات ان اولوالعزم، پیکر ایثار وتقویٰ بزرگوں کی طرح ہے، جن کی خدمات کا تابناک باب سارے عالم سے حسن قبول کی سند حاصل کرتا ہے، اور جن کی زندگیاں ہزار ظلمت کدہ دلوں کے لیے پیام جانفزا اور روح پرور پیغام ہوتی ہیں، بلاشبہ ان کے نیازمندوں، عزیزوں اور سوگواروں نے انھیں ہمیشہ کے لیے ٹنوں مٹی میں دبا دیا، لیکن حضرت کی ذات وہ کھرا سونا ہے جسے مٹی نہ کھا سکتی ہے، نہ دبا سکتی ہے۔ مولانا اب اس دار فانی میں واپس نہیں آئیں گے، لیکن

☆ معہد ملت مالیگاؤں

انھوں نے علم و معرفت کی جو شمع روشن کی ہے، اسے بے درد زمانہ بجھانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، انھوں نے سیسہ پلائی ہوئی جو روحانی شاہراہ تعمیر کی ہے، اس پر قیامت تک اللہ کے بندے چل کر منزل رسی کا سراغ پاتے رہیں گے۔ بلا شبہہ مولانا رحمہ اللہ اب وہ شمع سر راہ اور شبستان معرفت ہیں جس کی روشنی اور حرارت سے تاریک دل اور یخ بستہ فکر کو بالیدگی ملتی رہے گی۔ مولانا علم و معرفت کی وہ عظیم فانوس رہبانی ہیں جن کو نور علم کو موت بھی کم نہ کرسکی، انھوں نے گم گشتہ راہ مسلمانوں اور بھکے ہوئے انسانوں کے لیے فقہی اور مسلکی وادیوں میں نصف صدی سے زائد عرصہ تک اپنے نوک قلم اور تاب تحریر سے جو عالم گیر رہنمائی فرمائی ہے انسانیت اس احسانِ عظیم سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ مولانا نے وقت کی نزاکت اور زمانہ کی تہور آفرینی کی پرواہ کیے بغیر اٹھنے والے فتنوں پر جو بند باندھا ہے معاصرین میں اس انداز کی کوشش کم ملتی ہے، ایک مجلس میں تین طلاق کے مسئلہ پر جب مشرقی یوپی کے علماء حدیث نے غلط انداز سے نفس مسئلہ کی تشریح کرنا شروع کی، تو بیہقی وقت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل، حقیقت پسندی اور سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور غالباً ۱۹۳۲ء میں الازہار المربوعۃ فی الاحادیث المرفوعۃ لکھ کر علماء حدیث کا نہ صرف تعاقب کیا بلکہ نقل وعقل کی روشنی میں مسکت جواب بھی عنایت فرمایا، قادیانیت کے تار و پود بکھیرنے میں بھی حضرت موصوف نے جو اہم خدمت انجام دی ہے اس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی، غرض عالم اسلام اس ضیغم اسلام کو تا قیامت بھلا نہیں سکے گا۔

حدیث سے شغف اور رجال و رواۃ سے دلچسپی بلکہ اس راہ میں مولانا کی عظیم خدمات نے اسلاف کے اس تابناک دور کی یاد تازہ کردی ہے جس میں فتنۂ انکار حدیث اور وضاعین حدیث کی فتنہ سامانیاں شباب پر تھیں، دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں حضرت علامہ انو شاہ صاحب اور مونا ظہیر الدین شوق نیموی کے بعد مولانا نے اس بساط جرح و تعدیل اور تحقیق و جستجو کو اپنی فراست سے اس سلیقہ سے آراستہ کیا ہے کہ جس پر دارلعلوم دیوبند ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔ ہندوستان اگرچہ حدیث کی خدمت میں بغداد و عراق کے علمی سقوط کے بعد سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے، تاہم جن بزرگوں نے خونِ جگر دے کر اسے سینچا اور اس مقدس علم کو آسمان ہفتم تک پہنچایا ان میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا نام سر فہرست ہے، اس فکر و نظر اور تحقیق و جستجو کے کاوش طلب میدان میں مولانا نے بے سروسامانی کے باوجود ملت کو جو عظیم سرمایہ عطا کیا ہے اسے جانبداری کی حد بندیوں سے بالاتر ہوکر تسلیم

کر لینا اور مولانا کے حدیثی تبرکات کو عملاً اپنانا ہی ان کی عظیم خدمات کا سب سے زیادہ مؤثر اور انمول اعتراف ہوگا، ندوہ خوش نصیب ہے کہ اس نے وسعت فکر ونظر کا ثبوت دیتے ہوئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے افادات عالیہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے دائرہ کار میں اس پر عمل کیا، اور مرحوم مختلف اوقات میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بخاری شریف کا درس دیتے رہے، معہد ملت مالیگاؤں بھی اس خوش نصیب اداروں میں ہے جس کے حصہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کے مواقع آتے رہے، جیسا کہ ہم آئندہ ذکر کریں گے۔

مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے مخطوطات پر تحقیق وریسرچ اور تعلیق وتحشیہ کا کام اگرچہ بہت پہلے شروع کر دیا تھا، لیکن اس کام کے لیے باقاعدہ یہ سعادت مالیگاؤں کے حصے میں آئی، جس سے مولانا کا پہلے سے قرابتی اور روحانی رشتہ قائم ہے۔ مالیگاؤں میں مولانا کی آمد کا سلسلہ بستی کی مشہور دینی درسگاہ معہد ملت کے بانی وناظم حضرت مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی اور ان کے شریک کار مولانا محمد عثمان صاحب کی خصوصی توجہ سے ہوا، بانی معہد چونکہ علم دوست، علماء نواز اور ارباب کمال سے خالص علمی کام لینے میں ممتاز تھے، اس لیے ان کی یہ خلش تھی کہ حدیث کے مخطوطات کو نہ صرف زیور طباعت سے آراستہ کیا جائے، بلکہ ابوالمآثر حضرت مولانا اعظمی سے اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے مالیگاؤں میں قیام کی درخواست بھی کی جائے، یہ اس شہر کی خوش بختی کہئے کہ مولانا نے دعوت منظور فرمالی اور کوئی چھ ماہ کے لیے مالیگاؤں تشریف لائے، تو بانی معہد مولانا نعمانی صاحب کے یہاں مکان کا بالائی حصہ ان کی قیام گاہ بنا، پورے چھ ماہ کے مدت قیام میں حضرت مولانا اعظمی نے معہد ملت میں دورۂ حدیث کے طلبہ کو شرح معانی الآثار (طحاوی شریف) بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھایا اور اس سال کے طلبہ کو حدیث کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ علاوہ ازیں بعض اساتذہ کو خالص علمی کاموں میں مصروف بھی رکھا، بلکہ یہیں حضرت کی ذات سے تصنیف وترجمہ کے کام کا آغاز بھی عملاً فرمایا، جو معہد ملت کے بنیادی مقاصد میں روز اول سے شامل ہے۔

مخطوطات اور قلمی نسخوں سے متعلق حضرت مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی بانی معہد ملت مالیگاؤں کی خواہش پر حدیث کی کتابوں کی طباعت کا عملاً آغاز ہوا، ۱۹۶۰ء میں سب سے پہلے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مختصر الترغیب والترهیب" کی اشاعت کا کام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مرحوم کی خصوصی توجہ سے ہوا، مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقدمہ میں لکھتے

ہیں:

فكرنا في الامر والزملاء قبل عام ١٣٧٩هـ واجتمعنا وتبادلنا الأفكار مرة أخرى ففتح الله علينا ووفقنا أن نبدأ بالعمل بتوجيه الدعوة الى العالم النبيل علامة عصره في معارف الدين الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي ليقضي شطراً من الزمن في معهد ملت نستفيد بأفكاره فكان سعادتنا أن أجاب الشيخ دعوتنا ونزل فينا ضيفاً مكرماً محترماً وانتهى الأمر إلى أن أسسنا إدارة. إحياء المعارف وعلى رأسها الشيخ المحترم.

ہم نے اس سلسلہ میں غور کیا خدا نے مدد کی اور اس کی توفیق سے ہم نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی سے درخواست کی کہ موصوف معہد ملت مالیگاؤں میں کچھ دن قیام فرمائیں، ہماری نیک بختی کہ شیخ نے ہماری حقیر دعوت قبول فرمائی اور قابل صد احترام مہمان کی طرح تشریف لائے اور قیام بھی فرمایا اور حضرت مولانا ہی کی نگرانی میں ہم نے مالیگاؤں میں احیاء المعارف کی بنیاد رکھی۔

مخطوطات کی طباعت کے لیے کام کا آغاز ہوگیا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا شاہ نعیم اللہ صاحب بہرائچی کے کتب خانہ سے اس مخطوطہ کو حاصل فرمایا، اسی دوران دارالعلوم لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند سے بھی یہ مخطوطہ مل گیا، مولانا مرحوم نے طے فرمایا کہ تمام نسخوں کو سامنے رکھ کر تعلیق وتحشیہ کے ساتھ اسے شائع فرمادیا جائے، دارالعلوم دیوبند کے نسخے کو آپ نے مستعار حاصل کیا، جسے مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا، جس پر تمام نسخوں کو سامنے رکھ کر مولانا نے نظر ثانی فرمائی اور بڑے اہتمام کے ساتھ اسے احیاء المعارف مالیگاؤں نے شائع کیا، یہ حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے کام کا عملاً آغاز تھا، جسے سعادت سمجھ کر مالیگاؤں کے بزرگوں نے غیر معمولی دلچسپی لی، جب یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہوکر آئی تو سعودی حکومت نے اس کی اہمیت کے پیش نظر پانچ سو نسخہ خرید لیا، جو اس کار خیر اور خالص علمی کام کے مقبولیت کی دلیل ہے، اس عرق ریزی سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس اہم کام کو عملاً انجام تک پہنچانے کے لیے حضرت مولانا اعظمی کے سوا اور کوئی نہیں تھا جو اس کام کو انجام دیتا، بلا شبہہ حدیث کی دنیا میں یہ حضرت کا اتنا

زبردست کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کے شروع میں اپنے قلم فیض رقم سے جہاں مختصر و جامع پیش لفظ تحریر فرمایا، وہیں کتاب کے اصل مصنف علامہ عبدالعظیم منذری اور اس کے ملخص علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہما اللہ کی مختصر سوانح بھی تحریر فرمایا ہے جو قابل مطالعہ ہے، ادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں سے ۱۹۶۶ء میں حدیث کی دوسری کتاب جو مخطوطہ کی شکل میں تھی کتاب الزھد والرقائق شائع ہوئی، اس کی تحقیق و تعلیق بھی حضرت مولانا اعظمی نے ہی فرمائی، یہ کتاب پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، اس میں زہد و رقائق اور عبداللہ بن مبارک مصنف کتاب کے اوپر مبسوط پیش لفظ بھی ہے۔

ادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں کا قیام علمی حلقوں میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے وقیع اور قیمتی تصنیفات و تعلیقات کے تعارف کا ذریعہ اور ملک کے دوسرے مقامات اور علمی اداروں میں بھی مخطوطات کی تحقیق و اشاعت پر کام ہونے لگا، ان حدیث کی مخطوطات پر مولانا مرحوم نے جس تحقیقی کام کا آغاز فرمایا دوسرے تمام اداروں کے لیے اس علمی نہج پر کام کرنے کے لیے راہ ہموار ہوئی، اور اس کے بعد ہی بلاد عرب میں اس کام کی اہمیت نے حد سے زیادہ قبولیت حاصل کی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی خصوصی توجہ سے ادارہ احیاء المعارف نے اور بھی قیمتی اور قابل قدر کتابوں کو خط و قلم کی دنیا سے نکال کر طباعت و نشر کی پختہ اور حسین صورت میں پیش کیا، جن کے نام یہ ہیں، (۱) سنن سعید بن منصور دو جلدوں میں۔ (۲) تلخیص خواتم جامع الاصول علامہ طاہر پٹنی۔ (۳) مسند الحمیدی دو جلدوں میں۔ ابوعبید کی غریب الحدیث کی اشاعت بھی پروگرام میں شامل تھی، لیکن افسوس کہ اس کی اشاعت نہ ہوسکی، ابھی جانے ہمارے اسلاف علماء کے کتنے اہم اور نادر مخطوطے کتب خانوں اور لائبریریوں میں بند ہیں، جنھیں گرد اور دیمک چاٹ رہی ہوگی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے باکمال اور اہل تحقیق علماء کے لیے یہ راہ عمل چھوڑی ہے، جس پر چل کر زندہ جاوید بنانا ہماری اولین ذمہ داری ہے، مولانا کی زندگی کا یہ وہ قابل قدر گوشہ اور خاموش و قیع خدمت ہے، جو ہماری علمی اور تحقیقی زندگی کی ضمانت ہے۔

مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا کارنامہ ان کی وہ تصانیف ہیں، جو حقیقت کی نقاب کشائی کے لیے لکھی گئی ہیں، اہل حدیث اور رضا خانی علماء نے جب بعض مسلکی باتوں کو ہوا دی تو حضرت نے عقل

وانصاف کے ساتھ سنجیدہ مضامین قلم بند فرمایا، جو حقیقت پسند دل کی آواز اور کتاب وسنت کے ترجمان تھے۔ رکعات تراویح سے متعلق غیر مقلدین کی زہرافشانی اور دسیسہ کاری نے عقل ونقل اور ہوش وخرد کو جب چیلنج کیا اور امام اعظم ﷫ کی اہانت تک پر اتر آئے، تو موصوف نے دلوں کی طمانینت کے لیے رکعات تراویح کے نام سے انتہائی وافی اور شافی جواب تحریر فرمایا، جس سے نہ صرف یہ کہ عہد صحابہ کی صحیح تصویر سامنے آئی، بلکہ یہ بھی عیاں ہوگیا کہ غیر مقلدین صرف ہوائے نفس کے مقلد ہیں جنھیں حدیث نبی سے دور کی بھی کوئی نسبت نہیں رہی۔ ایک مجلس میں تین طلاق وغیرہ مختلف فیہ مسائل پر بھی حضرت مولانا اعظمی نے جس متانت سے کتاب وسنت کی روشنی میں قلم اٹھایا ہے، اس پر بھی مرحوم پوری ملت کی طرف سے تحسین وآفرین کے مستحق ہیں۔ مولانا مرحوم کی ان نادر ونایاب تحریروں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حق کے خلاف اقدام کرنے والوں کو نہ کبھی انھوں نے برداشت کیا اور نہ اس پر خاموشی کو پسند فرمایا، بلکہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ دفع مضرت کے اصول کی روشنی میں ان برائیوں کا خاتمہ نہایت ضروری ہے، جن کو نوک قلم اور نوک زبان سے ہوا دی جاتی ہے، اور فرماتے تھے کہ جلب منفعت تو بعد کی چیز ہے جس کا درجہ اباحت سے زیادہ نہیں ہے، عموماً ہوتا ہے کہ جواب آں غزل کے نام پر جو کچھ لکھا جاتا ہے اس میں بازی گری زیادہ اور احقاق حق کم ہوتا ہے، لیکن مولانا اعظمی ﷫ نے بطور جواب جو بھی گراں بہا تحریر اور قیمتی تحریری سرمایہ امت کے جان کار طبقہ کی خدمت میں پیش کیا، اس میں فرض سے ادا ہونے کا تو زبردست جذبہ کارفرما رہا، شہرت اور نمود کا دور دور تک نام ونشاں نہیں نظر آتا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اس عالم رنگ وبو میں ایسے علماء نظر نہیں آتے دین کی نشر واشاعت جن کا مقصد زندگی ہوا کرتا تھا۔ مولانا ساکن سمندر کی طرح خاموشی سے دین کی خدمت میں پوری زندگی گذار گئے، مگر ان کے افکار وحقیقت پسندی کا وہ طوفان تادم ہوش سرد نہیں پڑا اور مدہوشی کا عالم آنے سے پہلے اپنی جگہ پر اتنا بڑا ہشت پہل کارنامہ انجام دے گئے جس کی نظیر ماضی قریب میں نہیں ملتی۔

مولانا اعظمی ﷫ نے جس طرح فقہ وحدیث میں ارباب ذوق کے لیے راہ عمل اور نقش پا چھوڑا ہے، اسی طرح وہ اپنے اسلام کے بھی سچے نمونہ عمل اور مکمل تصویر تھے۔ زہد وتقویٰ، فقر وقناعت کے ذریعہ مرحوم نے جو نظیر قائم کی ہے، وہ دوسروں میں بہت کم ملتی ہے۔

سلوک واحسان میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ﷫ سے نسبت رکھنے کی وجہ سے شرعی

امور کا لحاظ، اوقات کی پابندی، دوسروں کی دلجوئی اور دوسروں کے ساتھ وضعداری بھی بے پناہ تھی۔
اخیر عمر میں جب سابق صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے مولانا کے تبحر علمی کے اعتراف میں ایوارڈ دیا، اس پر بھی نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ: ''ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم'' کی طرف علم وفقر کی قبائے روحانی پر نہ ذراشکن آنے دی اور نہ وقت کے اقتدار کے سامنے خوش آمدانہ انداز اختیار کیا، بلکہ اقتدار وقت ہاتھ جوڑے کھڑا کہہ رہا ہے کہ حضرت یہ ہماری نیک بختی اور سعادت ہے کہ آپ نے قدم رنجہ فرما کر ہمیں نوازا، یہ اعزاز نہیں مولانا کا امتحان تھا جس میں مرحوم کامیاب رہے۔

مولانا اعظمی ﷫ کی سیاسی زندگی بھی اس فیلڈ میں کام کرنے والوں کے لیے درس موعظت ہے، اس لیے کہ عہدہ اور منصب سے بلند ہوکر مولانا نے اس علاقے میں اس وقت کام کیا، جب مسلمان کی اشک شوئی اور ہمدردی کے لیے عہدوں کے زینے شمار کیے جاتے تھے، مولانا کی سیاسی زندگی تدبیر منزل اور مدنی سیاست کا اعلیٰ نمونہ ہے، ہنگاموں اور مسائل کے ہجوم میں آپ نے کام کرنے والوں کی ایک ورک ٹیم تیار کردی تھی جو آج بھی اصل سیاسی روح کو لے کر کام کرتی ہے، نہ چاہنے کے باوجود عوام وخواص کے شدید اصرار پر اسمبلی کے لیے جب مولانا امیدوار ہوئے تو بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ اپنے حلقہ انتخاب میں ایک مرتبہ بھی کنویسنگ نہیں کی، اس کے باوجود بھاری اکثریت سے چن کر آئے لیکن اوروں کی طرح نہ اس کامیابی پر لٹو ہوئے نہ اسے مقصد زندگی بنایا، بلکہ لکھنؤ میں اسمبلی میں شرکت کے ارادے سے آئے تو سارا وقت ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں مسائل واحادیث کی تحقیق میں بسر ہوتا، اسی زمانہ میں مولانا مرحوم نے بعض اہم تصنیفات ''اعیان الحجاج'' وغیرہ کا مسودہ بھی مرتب فرمالیا تھا، ہمارے سیاسی رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، رفیع احمد قدوائی نے جس طرح معاہداتی سیاست سے کنارہ کش ہوکر عملی سیاست کو دائرہ کار بنایا، یہی عملی مثال حضرت مولانا اعظمی نے بھی قائم فرمائی، دارالعلوم دیوبند کی جب تلاشی ہوئی اور یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ سیاسی طور پر پاکستانیوں کی پناہ گاہ ہے اور یہاں پاکستانی ٹرانسمیٹر نصب ہے، تو مولانا اعظمی ﷫ نے بذات خود اس کی تردید بھی کی اور حکومت کے ذمہ داروں کی توجہ اس کی طرف مبذول بھی فرمایا اور اسمبلی خدمت گذار ممبروں میں اپنا مقام بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم ناؤنوش، شہرت وریا سے بے نیاز ومرد قلندر تھے، سیاست جن کے در کی غلام ہوتی ہے، جو سیاست کو دیتے زیادہ ہیں، اسے اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال نہیں کرتے، وہ اسمبلی کے عہدۂ ممبری کے وقت بھی وہی ابوالمآثر تھے جو بوریہ اور چٹائی پر بیٹھ کر درس حدیث

اور مطالعہ کتب میں مصروف رہتے اور دل کی دنیا پر حکومت کرتے تھے، ان کی مقبولیت کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ مرحوم کے جلوس جنازہ میں لاکھوں نیازمندوں نے آبدیدہ ہوکر شرکت کی اور أنتم شهداء الله في الارض کا روح پرور نظارہ چرخ کہن نے بھی دیکھ لیا۔

وصال سے سال بھر پہلے جمعیۃ علماء کے ایماء پر ہزاروں علماء کی تائید وحمایت سے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ امیر الہند نامزد ہوئے، جو بلا شبہہ بڑا مبارک عہدہ ہے اور بلا شبہہ جس کے اہل صرف مولانا ہی تھے، لیکن حیرت اس پر ہے کہ امیر الہند کے انتخاب کا یہ عمل آخر اتنی تاخیر سے کیوں ہوا، اگر یہ اہم ذمہ داری حضرت مرحوم کو صحت وتندرستی کے زمانہ میں سپرد کی گئی ہوتی تو فقہ وافتاء اور امارت وقضا کی نزاکت اور باریکیوں سے واقف ہونے کی بنا پر مرحوم اسے نئی روح اور زندگی عطا فرماتے، مگر افسوس کہ جو لابی مولانا کے اردگرد نیازمندی کے انداز میں حلقہ بگوش تھی، اس کی خانہ زاد مصلحت کے خلاف تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ مرحوم یمن وتبرک کے طور پر امیر الہند رہے، لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا امیر الہند کے لیے دلی کی اس میٹنگ میں بھی تشریف نہیں رکھتے تھے اور منصب کا اباحتی ذہن رکھنے والوں نے یہ ذمہ داری نیابۃ حضرت مولانا اعظمی کو سونپ ہی دی، جب کہ مولانا تاحیات ایسی ظاہری سرگرمیوں سے پر حذر اور شہرت سے گریزاں رہے، حقیقت یہ ہے کہ جن بزرگوں نے پیشہ کو دیکھ کر مولانا کی صلاحیت سے کام لینے میں احتیاط کیا، اخیر تک وہی عنصر سرگرم رہا، ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ مولانا کی متحرک زندگی میں اس عنوان سے بھی ان کا فیض عام ہوتا، جب کہ بلاد عرب نے مولانا کے علوم ومعارف سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں رکھی، بلکہ اسے سعادت سمجھ کر حدیث کی اجازت حاصل کرنے کے لیے مئوتک کا سفر کیا، اور ہم پیاسوں کے حصہ میں سمندر سے ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہوا واللہ من وراء القصد۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ کی زندگی کے بے شمار فکر انگیز گوشے ہیں، جن پر پوری کتاب تیار ہوسکتی ہے، تاہم مولانا کے ساتھ نیازمندوں کا انصاف یہ ہے کہ انھوں نے فکر وعمل، سیرت وکردار، دعوت وعزیمت، سلوک وتصوف، تصنیف تالیف اور تحقیق وریسرچ کے جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں، ہم اجتماعی اور انفرادی طور پر اس پر چلنے کا فیصلہ کریں اور یہ یقین رکھیں کہ ؎

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
چشم سے اوجھل تو ہوتا ہے جدا ہوتا نہیں

بڑے مولانا

مولانا عزیز الحسن صدیقی ☆

غازی پور کے ضلع میں ایک قصبہ بہادر گنج ہے، جس کو عام طور پر چھوٹا مئو سمجھا جاتا ہے، اور مئو سے کاروباری ہی نہیں علمی وروحانی رشتہ بھی رکھتا ہے۔ اس قصبہ میں فیضان العلوم کے نام سے ایک دینی مدرسہ زمانہ دراز سے قائم چلا آرہا ہے، جو اپنے ابتدائی دور میں اس وقت کے عام رواج کے مطابق مدرسہ اسلامیہ کہلاتا تھا۔ اس زمانے میں چھوٹے مدرسے بھی بڑا کام کرتے تھے، جامع مسجد کے احاطہ میں ایک معمولی سی عمارت میں چلنے والا مدرسہ اس اعتبار سے بڑا اور اہم مدرسہ تھا کہ اس میں وقت کے مشہور وممتاز علماء درس دیتے رہے ہیں، ان میں سے ایک مولانا امام الدین پنجابی (وفات ۱۳۳۶ھ) بھی تھے، جنھوں نے مئو اور آس پاس کے علاقوں میں علم دین کی اشاعت اور عقائد واعمال کی اصلاح کے سلسلے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد غالباً ۱۳۲۹ھ میں مئو ہی کے ایک جید عالم مولانا ابوالحسن عراقی مئوی جب بہادر گنج آئے، تو ان کے ہمراہ مئو کے مولوی محمد صابر کا ایک کمسن بچہ بھی تھا، جس نے عربی کی ابتدائی کتابیں ان سے یہیں رہ کر پڑھیں۔

ایک قدیم رواج یہ بھی ہے کہ طلبہ واساتذہ ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ میں آتے جاتے رہتے ہیں، جس کو جہاں سے فیض پہنچنا ہوتا ہے یا جس سے اللہ کو جہاں کام لینا ہوتا ہے وہاں اس کو پہنچا دیتا ہے۔ مولانا ابوالحسن مئوی کچھ دنوں کے بعد بہادر گنج چھوڑ کر چلے گئے اور یہ بچہ بھی دوسرے اساتذہ سے علمی استفادہ کی غرض سے کسی اور جگہ چلا گیا، لیکن دستِ قدرت نے اس ہونہار طالب علم کے قلب ودماغ پر جونقوش ثبت کر دیئے تھے وہ ذرا دھندلے نہیں پڑے، بلکہ اور گہرے ہوتے چلے گئے، علم کی تلاش میں یہ بچہ مدتوں سرگرداں رہا، کبھی مئو، کبھی بنارس، کبھی دیوبند غرض کہ جہاں کہیں بساط علم بچھی نظر آئی وہاں خوشہ چینی کے لیے جا پہنچا، اس ہفت خواں کو طے کرنے میں جوانی کب آئی اور گذر

☆ مدرسہ دینیہ، غازی پور

گئی، بڑھاپے نے کب آ دبوچا، اس کو پتہ ہی نہیں چلا، علم کا متلاشی علم کی جستجو میں لگا رہا، دوری منزل اس کے ارادوں میں تزلزل پیدا کرسکی نہ پاؤں کے چھالے اس کورہ نوردی سے باز رکھ سکے۔

اس کی طالب علمانہ ہی نہیں تدریسی زندگی کے شباب کا زمانہ ملکی آزادی کی تحریکات کے شباب کا بھی زمانہ تھا۔ ہمارے کتنے ہی باصلاحیت علماء اور ہونہار طلبہ ان تحریکات میں انہماک کی وجہ سے تعلیم و تعلم سے دور ہوگئے، مگر اللہ کا یہ بندہ ان تحریکات سے وابستگی و دلچسپی کے باوجود مدرسہ و کتب خانہ سے جدا نہ ہوا۔ لکھنے پڑھنے والوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ فراغت و کتاب کے ساتھ انھیں گوشۂ چمن بھی نصیب ہو، مگر ہم جس انسان اور جس گروہ کی بات کررہے ہیں، اس کو کبھی فراغت ملی نہ گوشۂ چمن نصیب ہوا، اور نہ کبھی یہ لوگ اسکی طلب و جستجو میں رہے، لیکن کتابیں ان کی رفیق رہیں۔ ان میں سے بہتوں کی زندگیاں ریل اور جیل میں کٹ گئیں مگر علم اور کتاب سے ان کا تعلق قائم رہا۔

ہم جس انسان کی بات کررہے ہیں وہ بڑی آسانی سے کسی ریاست کا ملازم بن سکتا تھا، بڑے سے بڑے علمی و تحقیقی ادارے کا ڈائرکٹر بن کر اونچی تنخواہ حاصل کرسکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہی راستہ اختیار کیا جو اس کے بڑوں نے اختیار کر رکھا تھا، وہ بیک وقت مدرس بھی تھا اور مصنف بھی، محقق بھی تھا اور مقرر بھی۔ آزادی کا متوالا بھی، وہ غلامی پر قانع نہیں تھا۔ اس کا دل بھی ملک کی غلامی پر ویسا ہی کڑھتا تھا جیسا اس کے ہم عصر علماء کا کڑھتا تھا۔ آزادی وطن کی تحریکات سے اس کا اتنا ہی تعلق تھا جتنا کسی دوسرے عالم دین کا۔ لیکن جس طرح مولانا حسین احمد مدنیؒ نے تحریک استخلاص وطن میں حصہ لیا، دورے کیے، جیل گئے، مگر دل ان کا ہمیشہ کتابوں اور درسگاہوں میں لگا رہا، جیل سے چھوٹ کر آئے تو سیدھے دارالحدیث پہنچے، اسی طرح یہ نمونے کا انسان تحریکات سے وابستگی اور شرکت کے باوجود تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف سے کنارہ کش نہیں ہوا۔

ملک کی آزادی کے بعد جب غالباً دوسرا صوبائی الیکشن [1] چھڑا تو اکانگریس کمیٹی نے اس مجاہد حریت کی خدمات کے اعتراف میں مئو کے حلقہ سے اس کا نام امیدوار کی حیثیت سے چن لیا، مگر مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اللہ کا یہ بندہ ایک دن بھی حلقہ انتخاب میں نہیں گیا اور کامیاب ہوا۔ ممبر اسمبلی منتخب ہونے کے بعد بھی انداز وہی مولویانہ اور فقیرانہ رہا۔ لکھنؤ پہنچ کر علم کے اس شیدائی نے بساطِ سیاست کا

(۱) دوسرے نہیں، بلکہ پہلے صوبائی الیکشن میں آپ کو کانگریس کی طرف سے زبردستی امیدوار نامزد کیا گیا تھا (مسعود الاعظمی)

مہرہ بننے کی بجائے علم ہی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ ندوہ اور دارالمصنفین کی علمی مجالس کو رونق بخشی۔

قارئین کا تجسس بڑھ رہا ہوگا اور وہ سوچ رہے ہوں گے کہ مضمون نگار آخر کس انسان کی بات کرنا چاہتا ہے۔ تمہید ختم کیوں نہیں ہوتی اور استعاہ کہاں جا کر تمام ہوگا۔ لیجئے ہم اس کا نام بتائے دیتے ہیں: مولانا حبیب الرحمٰن بن مولوی محمد صابر بن محمد عنایت اللہ مئوی۔ یہی وہ بزرگ انسان ہے جس کی کلاہ سعادت اور دستار علم وفضل پر ایسے ایسے ہیرے جواہرات ٹنکے ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر نگاہیں خیرہ رہ جاتی ہیں، جس کو رأس المحدثین اور محدث کبیر اور ابوالمآثر کے القاب سے یاد کیا گیا، جس کو مصر وشام کے علماء نے عزت دی۔ عراق میں سر آنکھوں پر بٹھایا گیا، مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں توقیر ہوئی، شیخ الازہر نے جس سے حدیث کی سند لی، مکہ کے بزرگ عبداللہ زمزمی نے تاج العلماء کہہ کر پکارا، اسی بڑے آدمی کو مشرقی اتر پردیش میں جو مولانا کی تگ وتاز کا اصل میدان اور مرکز عمل تھا، جس کے ایک ایک گاؤں اور گھر گھر میں مولانا پر جان چھڑکنے والے تھے، بیک زبان سب نے اس برگزیدہ انسان کو ''بڑے مولانا'' کے نام سے یاد کیا، اس میں حقیقت کا اعتراف بھی تھا اور دل کی چاہت اور محبت بھی۔ واقعی وہ بڑا تھا، اتنا بڑا اور اتنا اونچا کہ دیکھنے والوں کی ٹوپیاں سر سے گر جاتی تھیں، اس کے آگے کسی کا چراغ نہیں جلا۔ اس کی رائے سب پر بھاری، اس کا فیصلہ اٹل، اس کا حکم واجب التعمیل۔ اس سے مل کر اور اس سے بات کر کے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم اس دور کے کسی آدمی سے نہیں مل رہے ہیں، بلکہ سیکڑوں سال پہلے کے کسی عالم اور شیخ سے مل رہے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی زندگی کے آخری ساٹھ سال بھرپور عملی زندگی کے سال تھے، اس عرصے میں انھوں نے تصنیفات کے ڈھیر لگا دیئے، صدیوں سے الجھے ہوئے مسائل پر محققانہ انداز میں کلام کیا، مخالفین کے دانت کھٹے کر دیئے، غرضیکہ جو کام کیا لا جواب کیا، جو کام صدیوں میں نہیں ہو سکا تھا گنتی کے چند سالوں میں کر ڈالا۔ ان کی خدمات کا اعتراف بھی ہوا، عہدے اور منصب بھی ملے، مگر مولانا جہاں تھے وہیں رہے، انھوں نے اپنا راستہ خود بنایا، لوگوں کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے چکنی چپڑی باتیں کبھی نہیں کیں۔ بھیڑ بھاڑ سے ان کو ویسی ہی نفرت اور چڑھ تھی جیسی مولانا آزاد کو تھی، کچھ لوگ انھیں تنک مزاج اور ضدی سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں سے ہم پوچھیں گے کہ مولانا تھانوی اور مولانا فتح پوری کو آپ کیا کہیں گے؟ ہم نے ہمیشہ اپنے بزرگوں پر ظلم کیا ہے، جب وہ زندہ رہے ہیں، تو ان پر اسی طرح کے

ریمارک پاس کیے ہیں، اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو ان پر آٹھ آٹھ آنسو روئے ہیں، حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے لوگ مؤدب ہوتے ہیں، مگر علماء کے سامنے بے ادب اور گستاخ بن کر جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا عالم ورہبران کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔

مولانا محمد علی جوہر نے اپنے ایک مضمون میں شکوہ کیا تھا کہ مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کا لیڈر ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلے، مشورہ ان ہی کا مانے اور جیل بھی جائے، چندہ خود فراہم کرے، مگر پالیسی بنانے کا اختیار اس کو نہیں مسلم عوام کو ہوگا۔

ہندوستانی مسلمانوں کا یہ المیہ رہا ہے کہ وہ اپنے قائد اور امام کو ہمیشہ پھٹے حال دیکھنا چاہتے ہیں، اس کے بدن پر چیتھڑے لپٹے ہوئے ہوں، بیوی بچے فاقے سے ہوں، یہ ہے مسلمانوں کی پسند (Choice) عیسائیوں کا عالم سیول لائن میں ''صاحب'' کی زندگی گذارتا ہے، عیسائی اس کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ہندو اپنے پیشوا کو دو دو ہوائی جہاز سفر کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں۔

مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ آج ہمارے بیچ نہیں ہیں، لیکن ان کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہے اور رہے گی، ان کی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی، ان کی روایات باقی رہیں گی اور ہمارے لیے قندیل بن کر جگمگاتی رہیں گی۔

مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے علم سے عمل سے اور خودداری سے علم اور علماء کا وقار بڑھایا، مدارس کا نام اونچا کیا، ہندوستان کا اور ہندوستانی علماء کا سر اونچا کیا۔

مولانا اعظمی علیہ الرحمہ کی جملہ علمی، دینی اور سیاسی خدمات کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں کہاں ممکن ہے۔

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لیے

میں صرف ایک واقعہ جو میرے سامنے کا ہے نقل کروں گا تاکہ قارئین یہ اندازہ کرسکیں کہ مولانا کی گرفت اور پہنچ مسلم سماج میں کہاں تک تھی اور ان کے فیصلے کتنے دوررس اور مضبوط ہوا کرتے تھے۔ علماء جن کا اختلاف مشہور ہے ان کے سامنے کس طرح سپر انداز ہوا کرتے تھے۔

غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے، بہادر گنج میں عیدین اور جمعہ کی امامت پر اختلاف ہوا۔ قصبہ کے مسلمان ایک ہی مسلک کے ماننے والے، مگر معاملے نے اتنا طول کھینچا کہ پورے قصبہ کے مسلمان آپس میں گتھم گتھا ہوگئے، قصبہ کے نیک دل اور مخیّر بزرگ حاجی عبدالشکور میرے والد مرحوم مولانا ابوالحسن

صدیقی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔صورت حال کی نزاکت سے واقف تھے۔دوڑے ہوئے میرے والد کے پاس آئے اور بتایا کہ عید کے دن نوبت خون خرابے کی آسکتی ہے۔اس زمانے میں غازی پور کے کلکٹر الطاف حسین تھے۔والد مرحوم حاجی صاحب کو لے کر کلکٹر کے پاس گئے۔کلکٹر نے سخت لہجہ میں باتیں کیں تو حاجی صاحب رونے لگے۔کلکٹر کی تجویز پر والد صاحب عید کی صبح بہادر گنج پہنچے۔کسی کے دروازے پر نہیں گئے سیدھے عید گاہ پہنچے۔نماز پڑھائی اور ایک بڑا فتنہ ٹل گیا،مگر ضرورت پائیدار حل کی باقی تھی، چنانچہ وہ پہلی فرصت میں اپنے ہمراہ مدرسہ دینیہ کے علماء اور شہری جمعیۃ کے صدر مولوی حکیم ولی الدین حاذق نیازی کو لے کر حضرت مولانا اعظمی کی خدمت میں حاضر ہوئے، بہادر گنج سے مولانا حکیم محمد سعید اور کچھ دوسرے اصحاب بحیثیت گواہ بلا لیے گئے، موجودہ امام مولانا عباداللہ اور مجوزہ امام مولانا عبدالحی بھی طلب کر لیے گئے، پھر باقاعدہ مقدمہ پیش ہوا اور بڑے مولانا نے جو فیصلہ دیا اس پر آج تک عمل ہو رہا ہے۔اس مقدمے کی مسل جب میں نے دیکھی، تو مجھے مولانا آزادؒ کا وہ تاریخی فیصلہ یاد آگیا، جو انھوں نے کلکتہ کی مسجد ناخدا کے مشہور مقدمے میں دیا تھا، جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۱۰۰ کا بقیہ

اعظم گڈھ میں ایک سیمینار سے فراغت کے بعد مولانا کی زیارت سے شادکام ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا، مولانا نے جس بزرگانہ محبت وشفقت سے اس گمنام طالب علم کی پذیرائی کی اس کی یاد تا عمر قائم رہے گی، وہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں میں بھی مقبول تھے جو ان سے تعویذ لینے آتے تھے۔ان کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ جب ۱۷/ مارچ ۱۹۹۲ء کو ان کا انتقال ہوا تو ان کے جنازے میں ڈھائی لاکھ کے قریب آدمی شریک تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علوم نبوت کے اس خادم کے مراتب ودرجات بلند کرے، (جس کی زبان وقلم ہمیشہ احادیث کی تشریح وترجمانی اور نادر کتب حدیث کی دریافت اور طباعت کے لیے وقف رہا ہے) اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

آہ! محدث عصر

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی رحمة اللّٰه علیه

مولانا حبیب الرحمٰن ندوی رحمۃ اللہ علیہ ☆

بچپن سے اپنے دیار کے جن علماء کا نام میں نے سن رکھا تھا، ان میں سب سے زیادہ اہم اور مرعوب کن شخصیت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، مولانا مرحوم کو میں نے اس وقت دیکھا جب آپ کی شہرت وعظمت کا آفتاب نصف النہار پر آ چکا تھا، متعدد بلند پایہ علمی کتابیں آپ کے قلم سے نکل کر ملک کے اہل علم طبقہ سے خراج تحسین وصول کر رہی تھیں، آپ کا وطن مالوف قصبہ مئوناتھ بھنجن تھا۔

مئوناتھ بھنجن ایک قدیم تاریخی وصنعتی اور علمی قصبہ ہے، یہ علم وادب کا ہمیشہ گہوارہ رہا، بڑے بڑے علماء، فضلاء، صوفیاء، ادیب وشاعر یہاں پیدا ہوئے، جن کے علمی ودینی کارناموں سے مئو کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا، ماضی قریب میں مولانا امام الدین پنجابی، حافظ عبداللہ مئوی غازی پوری، مولانا فیض اللہ مئوی، حکیم مولانا محمد عبداللہ مئوی، ابوالانوار مولانا عبدالغفار نقشبندی، مولانا ابوالحسن مئوی، مولانا عبداللطیف نعمانی، مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی رحمہم اللہ جیسی تاریخ ساز شخصیتیں پیدا ہوئیں اور اپنی علمی ودینی سرگرمیوں کی وجہ سے آج بھی ان کے نام ادب واحترام سے لیے جاتے ہیں، اسی فہرست میں ایک مرعوب کن اور پُرشکوہ نام محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہ کا بھی ہے۔

شاہی مسجد کٹرہ:

مولانا مرحوم کی علمی ودینی سرگرمیوں کا مرکز یہاں کی تاریخی عمارت کٹرہ کی شاہی مسجد بنی، جہاں مفتاح العلوم واقع ہے، مسجد سے متصل جانب مشرق ایک خام سفالہ پوش مکان جس کی خستگی، بے سروسامانی، بوسیدگی آج تک میری نگاہوں میں ہے۔ یہی مولانا مرحوم کی درسگاہ تھی، جو آگے چل

☆ محلہ ہٹھی مداری، مئو

کر علم و فضل کا دائرۃ المعارف بن گیا، اسی کمرہ میں آپ بخاری، ترمذی اور دیگر علوم وفنون کا درس دیا کرتے تھے، اسی میں اپنی تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں کے علاوہ دور دراز سے آنے والے اہل علم سے ملاقات کرتے، علمی و فقہی مسائل کا جواب تحریر فرماتے، کمرہ اگرچہ اپنی خستہ حالی کی وجہ سے مرقع عبرت تھا، لیکن طبقہ علماء پر اور ہر وارد و صادر کے لیے اتنا مرعوب کن تھا کہ اس میں قدم رکھنے سے پہلے دل کو بار بار آمادہ کرنا پڑتا تھا۔

مولانا اپنے آبائی مکان کے جس کمرہ میں رہتے تھے اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا، چھوٹا سا کمرہ، ہر طرف کتابوں کا انبار، بیچ میں چٹائیوں کا فرش اور اس میں صرف اتنی جگہ کہ مشکل سے دو چار آدمی بیٹھ سکیں، لیکن میں نے ہندوستان کے مشاہیر کو یہاں آتے ہوئے دیکھا ہے، اور بڑی سے بڑی علمی شخصیت کو ادب و احترام کے ساتھ بیٹھے ہوئے پایا ہے، چھوٹے سے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے سر ہی نہیں جھکا، بلکہ سینے میں دل بھی عقیدت و احترم کے ساتھ اس آستانۂ جاہ وجلال پر سر بہ سجود تھا۔

میں مدرسہ مفتاح العلوم میں ایک زمانہ تک زیر تعلیم رہا، اس دوران مجھے مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، دل وفور عقیدت سے معمور ہوتا چلا گیا، عقیدت و احترام کا ہر جذبہ لوح دل پر نقش کالحجر بن گیا اور آپ کی شفقت وعنایت سے ہمیشہ مستفید ہوتا رہا، یہ تعلق و ارتباط کسی نہ کسی شکل میں آخر وقت تک قائم رہا، یہ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ مولانا کی شفقت وعنایت بھی مجھے ہمیشہ حاصل رہی، جس کی وجہ سے بہت سے ایسے سوالات بھی کرنے کی جسارت کر جاتا تھا جو میرے لیے زیبا نہیں تھا، اسی جرأت سوال کی وجہ سے میں نے مولانا کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم کیے اور مولانا نے نہایت بشاشت سے میرے سوالات کے تفصیلی جوابات بھی دیئے۔

طالب علمی کا دور:

کوئی پندرہ بیس سال پہلے کی بات ہے کہ مدرسہ مفتاح العلوم سے ایک میگزین نکالنے کی اسکیم بنی، میگزین کے لیے مولانا مرحوم کی شخصیت پر لکھنے کی مجھ سے فرمائش کی گئی، اس مضمون کی تیاری کے لیے بار بار میں مولانا کی خدمت میں حاضری دیتا رہا، اسی سلسلہ میں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا کی تعلیم و تربیت از ابتدا تا انتہا مولانا عبدالغفار عراقی نقشبندی کے زیر سایہ ہوئی، جو محدث زمانہ حضرت

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، مولانا نے بتایا کہ میں نے اکثر کتابیں انھیں سے پڑھیں، انھیں کی خدمت میں رہ کر مضمون لکھنا شروع کیا۔

آپ نے بتایا کہ طالب علمی کے دوران سب سے پہلا مضمون میں نے سجدۂ تعظیمی پر خواجہ حسن نظامی کے جواب میں لکھا تھا، اور دوسرے کئی مضامین میں نے اسی دور میں لکھے، جنھیں میرے استاذ مولانا عبد الغفار صاحب مرحوم نے دیکھا اور پسند فرمایا، لیکن انھوں نے اس کی اشاعت کی اجازت اس لیے نہیں دی کہ دوران تعلیم اس کی اشاعت سے تعلیم پر اثر پڑے گا۔

درس وتدریس:

درس وتدریس سے آپ کو خصوصی مناسبت تھی، چنانچہ فراغت کے بعد ہی آپ نے اس مشغلہ کو اختیار کرلیا اور زندگی کے اخیر وقت تک اس میں لگے رہے، بیماری کے ایام میں جب کہ بغیر کسی سہارے کے اٹھ بھی نہیں سکتے تھے اور نہ آنکھ کی خرابی کی وجہ سے دیکھ سکتے تھے، فرش زمین یا چار پائی پر لیٹے لیٹے طلبہ کو پڑھاتے، طلبہ عبارت پڑھتے، جہاں غلطی ہوتی فوراً روک دیتے اور کتاب کی عبارت کا مطلب اس طرح واضح کرتے جیسے ساری کتابیں آپ کے سامنے کھلی ہوئی ہوں، سب سے پہلے دار العلوم مئو میں پڑھایا، اس کے بعد جامعہ مظہر العلوم بنارس میں، لیکن آپ کی تدریسی زندگی کا زیادہ زمانہ مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں گذرا، جہاں تقریباً ۲۵ سال تک اس شان سے آپ نے اس فریضہ کو انجام دیا کہ ایک اچھے اور معیاری درس گاہ کی حیثیت سے مفتاح العلوم کو پورے ملک میں شہرت حاصل ہوگئی اور دور دراز سے طلبہ صرف دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے یہاں آنے لگے، مفتاح العلوم سے الگ ہونے کے بعد آپ نے ایک مدرسہ مرقاۃ العلوم قائم کیا جس میں اخیر وقت تک آپ درس دیتے رہے۔

تصنیف وتالیف:

تصنیف وتالیف کا ذوق بہت عمدہ تھا، آپ جو کچھ لکھتے اس پر آپ کا عالمانہ ومحققانہ رنگ غالب رہتا، اردو میں آپ نے ایک درجن سے زائد کتابیں لکھیں، جو سب کی سب آپ کے خالص علمی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں، خصوصاً نصرۃ الحدیث، اعیان الحجاج، رکعات تراویح، الاعلام المرفوعہ، اور الازہار المربوعہ وغیرہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا مطالعہ کتنا وسیع تھا اور معمولی معمولی جزئیات

پر کتنی گہری نظر تھی، آپ کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے ''اہل دل کی دل آویز باتیں'' اس میں آپ نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بزرگوں کے حالات، واقعات اور ملفوظات کو اس خوبی سے جمع کیا ہے کہ بار بار پڑھنے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی، جی چاہتا ہے کہ یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہو جائے۔

تحقیقات وتعلیقات:

آپ کا محبوب ترین موضوع علم حدیث اور فن اسماء الرجال تھا، ان علوم پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا، اس سلسلے میں آپ کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ پورے ہندو پاک میں کوئی دوسری شخصیت آپ کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتی تھی، زندگی کے تقریباً پچاس سال یعنی آدھی صدی تک صرف علم حدیث کی آپ نے خدمت انجام دی، حدیث کے پرانے ذخیروں کی تلاش میں آپ نے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کویت، بیروت، دمشق، مصر اور بحرین کا سفر کیا اور اس طرح آپ نے ان قدیم محدثین کی یاد تازہ کر دی جنھوں نے حدیث نبوی کی تلاش میں دور دراز کے اسفار کیے، اور آج دنیا کے سامنے جو احادیث کا عظیم الشان ذخیرہ ہے وہ انھیں بزرگوں کی شبانہ روز جدوجہد کا ثمرہ ہے، انھیں کی طرح آپ نے حدیث کے ایک ایک لفظ کی تحقیق، غریب ومشکل الفاظ کی تشریح اور روایت کے ایک ایک راوی کے حالات کی جستجو میں پوری متاع حیات لٹا دی، حدیث کے قدیم ترین، ناصاف اور گنجلک مخطوطوں کا پڑھنا اور اس کی تصحیح کرنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا، جس میں آپ پورے نشاط اور دلجمعی کے ساتھ لگے رہے، جس کا نتیجہ ہوا کہ ایک درجن کے قریب کتابیں آپ کی تحقیق وتعلیق کے بعد منظر عام پر آئیں، مولانا نے جن کتابوں کی تصحیح وتعلیق کی ان پر نہایت عالمانہ مقدمے بھی لکھے، جس میں نہ صرف کتاب کی نوعیت، اہمیت اور اس کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی؛ بلکہ اس امر کی بھی وضاحت کی کتاب کے مصنف کون تھے؟ ان کے اس مخطوطے کی سند کیا ہے؟ اس مخطوطے کی نقل کہاں کہاں ہے اور کس حالت میں ہے؟

خداداد صلاحیت:

یہ بتانا تو بہت مشکل ہے کہ مولانا تصنیف وتالیف کی جانب کب اور کیسے مائل ہوئے، یہ خداداد صلاحیت واستعداد کا ثمرہ ہے، یا اکابر علماء کا فیض صحبت، البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تصنیف وتالیف کا یہ ذوق کہیں باہر کی پیداوار نہیں تھا، کیونکہ آپ تعلیم کے لیے باہر نہیں گئے، گئے بھی تو بہت تھوڑے دنوں کے لیے، آپ نے جو کچھ حاصل کیا، یہیں کے علماء سے حاصل کیا، ابتدائی تعلیم مولانا

ابوالحسن صاحب سے حاصل کی، درسیات کی اکثر وبیشتر کتابیں مولانا عبدالغفار صاحب نقشبندی مئوی سے پڑھیں، دونوں بزرگ مئو ہی کے رہنے والے تھے، دورۂ حدیث کے لیے مولانا اعظمی دیوبند ضرور گئے، ایک بار نہیں دو بار گئے، لیکن وہاں کی آب وہوا راس نہیں آئی اور دونوں بار کچھ عرصہ رہ کر واپس تشریف لائے اور یہیں کے دارالعلوم میں مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، اوراس طرح پڑھا کہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اس دیار میں کیسے کیسے اہل علم تھے، جنھوں نے اپنے تلامذہ کو زمین سے اٹھا کر بام ثریا پر پہنچا دیا۔

بیعت:

دارالعلوم دیوبند کے دوران قیام میں آپ بیعت کے لیے حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے۔مولانا نے پہلے تو فرمایا کہ میں طالب علموں کو بیعت نہیں کرتا ان کو محنت سے تعلیم حاصل کرنا چاہئے، لیکن جب آپ نے کہا کہ میں تعلیم کا نقصان نہیں کروں گا، مجھے آپ کے سلسلہ سے محبت ہے، اس لیے میں اس سلسلہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں، حضرت تھانوی اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور اپنے اصول کے خلاف آپ نے بیعت کرکے اپنے سلسلے میں داخل کرلیا۔

مکہ مکرمہ کے ایک سفر میں حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ قاری منیرالدین صاحب نے آپ کو اجازت وخلافت بھی دی، چنانچہ مولانا مرحوم وعظ ونصیحت کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بیعت بھی کرتے تھے، مالیگاؤں اور ناگ پور میں بہت سے لوگ آپ سے بیعت ہیں، قصبہ بہادر گنج ضلع غازی پور کے کئی افراد نے خود مجھ سے بتایا کہ ہم حضرت مولانا سے بیعت ہیں، آپ مسترشدین سے فرمایا کرتے تھے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ ہاتھ پکڑ کر جنت میں داخل کرادے گا، یہ تصور سراسر غلط ہے، صحیح بات یہ ہے کہ کسی شیخ کی نگرانی میں سلوک ومعرفت کی تعلیم حاصل کی جائے اوراس سے پوچھ کر احکام خداوندی پر عمل کیا جائے۔

وعظ وتذکیر:

درس وتدریس، تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ وعظ وتذکیر کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھتے تھے، وعظ ایسا ہوتا تھا کہ پرانے بزرگ کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، انداز بیان نہایت سادہ، موثر اور دل نشیں

ہوتا کہ ہر بات دل میں اترتی چلی جاتی۔ چھوٹے چھوٹے جملے مگر ہر بات مدلل، حشو وزوائد سے پاک، سبق آموز حکایتوں اور مثالوں سے اہم نکتے بیان کرتے، جو سامعین کے دلوں کو متاثر کئے بغیر نہ رہتے، قدرت نے بہترین صلاحیتوں سے آپ کو نوازا تھا جن سے آپ نے خود فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی پوری زندگی کوشش کی، لیکن یہ ہماری بدنصیبی تھی کہ ہم نے گھر کی دولت کی قدر و قیمت کو وقت پر نہیں پہچانا اور آج کھودینے کے بعد کفِ افسوس مل رہے ہیں۔

شفقت وعنایت:

اپنے اوپر مولانا کی شفقت وعنایت کو سوچتا ہوں تو دل بے چین ہوجاتا ہے، آنکھیں برسنے پر آمادہ ہوجاتی ہیں، آپ کی شفقت وعنایت کا یہ عالم تھا کہ سانحہ وفات سے کچھ دنوں پہلے جب کہ آپ چلنے پھرنے سے مجبور ہوچکے تھے، ان کو سہارا دے کر اٹھایا بٹھایا جاتا تھا، آنکھوں کی روشنی بھی جواب دے چکی تھی، میں اپنے احباب کے ساتھ مدرسۃ المساکین کی طرف سے آپ کی خدمت میں گیا اور آپ سے مسجد کے سنگ بنیاد رکھنے کی درخواست کی، مولانا نے اپنی معذوریوں کا اظہار فرمایا، لیکن غایت شفقت کی بنا پر میری درخواست کو رد نہ فرمایا اور کہا کہ ایک دن پہلے آکر دیکھ لینا، اگر طبیعت جانے کے لائق ہو ضرور چلوں گا، لیکن خود ہم لوگوں کی مجبوریوں نے سنگ بنیاد کے پروگرام کو ملتوی کرادیا اور ڈیڑھ ماہ تک آپ کی خدمت میں نہ جاسکا، جب دوبارہ اتنے عرصہ کے بعد پہنچا تو کسی ناگواری کا اظہار کیے بغیر میری درخواست منظور کر لی اور آپ بہادرگنج تشریف لے گئے، مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور دعا فرمائی مگر آہ، کیا معلوم تھا کہ آپ کا آخری سفر ہے، اس کے بعد اب آپ کہیں نہیں جاسکیں گے، آپ کی یہی سادگی اور سادہ مزاجی ہر شخص کے دل میں ادب واحترام کا بے پناہ جذبہ پیدا کردیتی تھی ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں جانے والے میں

اک چراغ اور بجھا، اور بڑھی تاریکی

مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی ☆

گذشتہ رمضان ۱۴۱۲ھ کے پہلے عشرہ میں رحمت کی گھٹائیں موسلا دھار برس چکی تھیں اور دوسرے عشرہ کے آغاز پر بارگاہ خداوندی سے عفو عام اور بخشش دوام کی منادی ہو رہی تھی کہ اسی پاکیزہ فضا میں علامہ اعظمی برکتوں اور رحمتوں کے جلو میں اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے، علامہ اعظمی جن کی ذات سے علم وفضل کے حلقوں، محدثین کرام اور فن اسماء الرجال کے نقادوں کی مجلسوں میں ستر سال سے جو چراغ روشن تھا، جس سے علم وتحقیق کی سیکڑوں قندیلیں روشن تھیں، یک لخت خاموش ہو گیا، بلکہ درحقیقت آسمان علم وفضل کا ایک درخشاں ستارہ ٹوٹ کر بکھر گیا اور اہل علم کی محفلوں میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیل گئی، ہند و بیرون ہند علم الحدیث اور علوم الحدیث کے آسمان پر جو آفتاب فضل وکمال پوری فیاضی کے ساتھ روشنی لٹا تا رہا، وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، علماء کرام اور محدثین عظام کی محفلوں میں دینی وعلمی مشکلات کے عقدۂ لاینحل کے لیے جو ناخن گرہ کشا کی حیثیت سے رہا، وہ ہمیشہ کے لیے ان کی آنکھوں سے بہت دور چلا گیا۔

مولانا کی ذات علم وتحقیق کی ایک مستند ومعتبر کتاب تھی جس سے علماء کرام اور محدثین عظام یکساں کسب فیض کرتے تھے، ان کی ذات اہل علم کے لیے چشمۂ آب حیات بن کر رہی، جس سے ہر ایک نے اپنی علمی پیاس بجھائی، جب ان کے سامنے کوئی علمی پیچیدگی آتی، یا کسی دقیق بحث سے سابقہ پڑتا جس سے وہ بذات خود عہدہ برآ نہیں ہو پاتے، تو فوراً علامہ اعظمی کی خدمت میں حاضر ہو جاتے، وہاں علم وتحقیق کے جواہر پاروں سے ان کا دامن بھر جاتا اور اپنی تہی دامنی کا احساس کافور ہو جاتا اور مطمئن ہو کر واپس ہوتے، علوم وفنون کی جامعیت نے ان کی ذات کو ایسی مرجعیت ومرکزیت عطا کر دی تھی کہ اہل علم کے علمی سفر کی راہوں میں ان کی ذات منارۂ نور بن گئی تھی، قدرت نے ان کی

☆ مدیر البعث الاسلامی ومہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ذات کو فیضانِ علم نبوت کے لیے ایک چلتے پھرتے مدرسہ کی شکل دیدی تھی۔

وہ مشرقی اتر پردیش کے ایک معزز علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد ماجد مولانا محمد صابر بن عنایت اللہ علیہ الرحمہ (جو ایک جلیل القدر عالم اور دینی معاملات میں شہر کے مسلمانوں کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے) اپنے فرزند ارجمند کی تعلیم وتربیت اور ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں لگے رہے۔

ابتدائی تعلیم، تجوید، خط کی مشق وتمرین کی تکمیل کے بعد مزید تعلیم کے لیے انھیں امام المحدثین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگرد مولانا عبدالغفار صاحب مئوی کی خدمت میں بھیجا، استاذ وشاگرد میں کچھ ایسی ذہنی مناسبت ہوئی کہ تعلیم کا بیشتر زمانہ مولانا ممدوح کی معیت میں گذرا، اور استفادہ کی کوئی صورت نہیں چھوڑی، وہ جہاں گئے مولانا اعظمی ان کے ہمراہ رہے۔

تعلیم کا پہلا مرحلہ تمام ہونے کے بعد دورۂ حدیث کے لیے نگاہیں ہندوستان کی مثالی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جانب لگی ہوئی تھیں۔

تقدیر نے یاوری کی اور دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگئے، وہاں انھیں علامہ محدث انور شاہ کشمیریؒ، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، علامہ شبیر احمد عثمانی، شاہ اصغر حسین دیوبندی جیسے چوٹی کے علماء سے استفادہ کا بھرپور موقع ملا۔

دارالعلوم دیوبند کی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد دارالعلوم مئو کے صدر مدرس مولانا کریم بخش سنبھلی سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، اور سند فضیلت حاصل کی۔ اسی طرح شیخ محمد سعید سنبل کا تالیف کردہ رسالہ الاوائل فی الحدیث مولانا عبدالغفار مئوی سے پڑھا اور انھوں نے روایتِ حدیث کی اجازت دی۔ ان کی سند حدیث عالی ہے، شیخ عبدالقیوم اور شیخ عبدالرحمٰن بھوپالی کے دو واسطوں سے شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتی ہے۔

فراغت کے بعد ہی دارالعلوم مئو میں علوم اسلامیہ خصوصاً حدیث شریف کی تدریس کے فرائض چار سال تک انجام دیتے رہے، ۱۳۴۳ھ=۱۹۲۴ء میں جامعہ مظہر العلوم بنارس بحیثیت صدر مدرس منتقل ہوگئے اور یہاں تقریباً چار سال تک تدریسی فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، اس قلیل ترین مدت میں فن حدیث وفقہ میں طلبہ کی ایک ایسی کھیپ تیار کردی کہ ان میں سے بیشتر افراد

مختلف علمی مراکز اور تحقیقی اداروں میں موقر مناصب پر فائز ہوئے؛ لیکن ان تمام ترقیوں کے باوجود ان کے دل میں ایک ایسے مدرسہ کی تاسیس وتعمیر کا خیال چٹکیاں لیتا رہا جو ان کی علمی توانائیوں کا مرکز، ان کے عظیم علمی منصوبوں کا امین اور علم حدیث کے فیضان کے لیے بحر مواج ثابت ہو، لہٰذا شاہزادی جہاں آرا بنت شاہ جہاں کی تعمیر کردہ شاہی مسجد مئو میں اپنے تخیل کو عملی جامہ پہناتے ہوئے مفتاح العلوم نام سے ایک مدرسہ قائم کرلیا اور اس طرح ان کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہوگئی، مدرسہ کی داغ بیل پڑتے ہی اسلامی علوم وفنون کے ماہرین کا یہاں اجتماع ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ مدرسہ آباد ہوگیا اور قلیل سی مدت میں مدرسہ نے حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔ اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ملک کے اطراف وجوانب سے تشنگان علوم نبوی اس چشمۂ حیواں پر سمٹ آئے اور اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

میرے والد ماجد مولانا محمد ایوب رحمۃ اللہ مفتاح العلوم سے وابستہ تھے، ۱۹۸۴ء[1] تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری بھی انھیں کے سپرد تھی۔ انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں اور تمام توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مدرسہ کو ہر پہلو سے ترقی دینے کی کوشش کی اور اس کے لیے انھوں نے پر مشقت طویل ترین اسفار بھی کیے، حتی کہ مدرسہ کے طائر شہرت کی پرواز بیرون ہند تک جا پہنچی اور اس کے تعلقات عظیم الشان علمی مراکز اور چوٹی کے علماء سے قائم ہوگئے۔

دوسری طرف والد ماجد رحمۃ اللہ اپنے تمام مشاغل کے ساتھ ساتھ مدرسہ کی نظامت سے لے کر دیگر تعلیمی وانتظامی امور میں علامہ اعظمی کے دست راست بنے رہے، والد مرحوم کا مکمل اور بھرپور تعاون ان کو حاصل تھا، اس ادارہ کی تیسری شخصیت مولانا عبد اللطیف صاحب نعمانی رحمۃ اللہ کی تھی، جو انتہائی جری، عزم وارادہ کے لحاظ سے مرد آہن سمجھے جاتے تھے، اپنی تدریسی مشغولیات حدیث وفقہ وتفسیر کی اونچی کتابوں کی تدریسی ذمہ داری انجام دینے کے ساتھ علامہ اعظمی کا پورا پورا تعاون کرتے تھے۔ ان کی شخصیت سے مدرسہ کو مختلف شعبوں میں محسوس طور پر فائدہ پہنچا اور مدرسہ کی ترقی پر ان کے دوررس اور گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

مدرسہ کو ان تینوں شخصیتوں کی فکری یکسانیت، مزاجی ہم آہنگی اور سعی پیہم نے بہت کم عرصہ میں معراج کمال پر پہنچا دیا؛ خصوصاً علامہ اعظمی کی فن حدیث میں بصیرت آمیز مہارت، جرح وتعدیل

---

(۱) یہاں بظاہر کچھ چھوٹا ہوا ہے، ۱۹۸۴ء میں حضرت مولانا محمد ایوب صاحب کی وفات ہوئی ہے (مسعود الاعظمی)

میں عمق و گہرائی اور اسماء الرجال کا استحضار (جو کم از کم ہندو پاک میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا) کے تشخص وتفوق سے مدرسہ کے اشہب عروج و اقبال کو مہمیز لگی اور تھوڑی مدت میں حیرت ناک ترقی کی اور اسی وجہ سے مدرسہ میں مولانا شمس الدین، مولانا عبدالباری، مولانا عبدالجبار مئوی (جنھوں نے اپنے آپ کو علامہ اعظمی کے سپرد کر دیا تھا اور ان کی وفات حسرت آیات تک ان کی اس خود سپردگی میں کوئی فرق نہیں آیا) مولانا محمد یحییٰ (جو علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے ہونہار فاضل شاگردوں میں تھے) جیسے لائق وفائق جلیل القدر اساتذہ کی ایک پاک طینت جماعت اکٹھا ہوگئی تھی۔

علامہ اعظمی کے دور نظامت کی اس قلیل سی مدت میں مدرسہ نے تعمیر وترقی کا طویل فاصلہ طے کرلیا، ہر عام وخاص کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اور اپنے قلیل وسائل اور سہولتوں کے فقدان کے باوجود ہندوستان اور پڑوسی ممالک سے آنے والے طلبہ جو علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کرنے کو اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھتے تھے، جب آئے تو ان کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور ان کے لیے ساری سہولتوں کا بندوبست کیا۔

یہ زمانہ میرے لڑکپن کا تھا اور میری معلومات بس اس قدر تھی کہ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ اس مدرسہ کے استاذ الاساتذہ وشیخ الشیوخ ہیں، اور ہر شخص دل وجان سے ان کی تعظیم تکریم کرتا ہے اور بلا ضرورت ان کے سامنے لب کشائی کی جسارت نہیں کر پاتا، مدرسہ کی چہار دیواری میں آپ کے قدم رکھتے ہی طلبہ اور اساتذہ پر ہیبت سی چھا جاتی، ایک مرعوب کن خاموشی کی فضا طاری ہوجاتی، یہ منظر بارہا میری نظروں سے ایسا گذرا کہ میرے دل ودماغ میں رچ بس گیا اور میرے تحت الشعور میں ان کی ہیبت سی بیٹھ گئی۔ میرا حال یہ تھا کہ جب تھوڑے دنوں کے بعد مجھے ان سے ادب عربی پڑھنے کا موقع ملا تو مارے ہیبت کے میری ہمت جواب دے گئی؛ لیکن والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ہمت افزائی کی اور بذات خود لے کر ان کے پاس گئے اور مجھے ان کے حوالہ کر دیا، اس کے بعد میں ان سے پڑھنے لگا، اور دھیرے دھیرے مجھے ان سے انسیت سی ہوگئی، اور ان کے سامنے پڑھنے سے ایک قسم کا سرور وانبساط محسوس ہونے لگا، اور دوران طالب علمی ان کے قیمتی مشورے اور ہدایات میری زندگی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے، اور ان سے میں نے ادب عربی میں جو کچھ پڑھا وہی آگے چل کر ندوۃ العلماء میں داخلہ کا سبب اور ابا حضور کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کا باعث بنا۔

میرا علمی سفر جاری رہا، اس دوران میں نے حدیث وادب کی بعض دیگر کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ فن حدیث میں درجہ کمال کے ساتھ عربی ادب میں بھی علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ یدطولیٰ رکھتے تھے، اسی وجہ سے میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ میں عربی زبان کے تمام اصناف میں کمال پیدا کروں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو زبان میں مہارت پیدا کرنا ہی منتہائے کمال سمجھا جاتا تھا اور عربی زبان درخور اعتناء نہ سمجھی جاتی تھی۔ والد صاحب کا عربی زبان کے تئیں اس حد سے بڑھی ہوئی فکرمندی اور ذوق وشوق کو دیکھ کر کسی نے والد محترم کو خط کے ذریعہ عربی ادب سے زیادہ دلچسپی لینے کو بے وقت کی شہنائی کہا اور لکھا کہ یہ دور اردو کا ہے نہ کہ عربی کا؛ لیکن والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اپنے موقف پر قائم رہے؛ کیونکہ ان کی دوررس نگاہیں مستقبل کے افق پر عربی زبان وادب کا تابناک ستارہ روشن ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا اندازہ صد فیصد درست نکلا اور ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اگر آج مشورہ دینے والے بزرگ بقید حیات ہوتے تو عربی زبان کی بالادستی اور اس کی ہمہ گیری کو بچشم خود دیکھ لیتے۔ غالباً والد رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں علامہ اعظمی سے تبادلۂ خیال بھی کیا اور ان سے یہ بھی درخواست کی کہ عربی زبان وادب کی تعلیم کے لیے مجھے اپنی تربیت میں لے لیں اور تھوڑا وقت عنایت کریں۔ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بخوشی اس کو قبول کرلیا، پھر انھوں نے عربی مشق وتمرین کے لیے ایک مصری فاضل کی کتاب عنایت کی اور حکم ہوا کہ اس کے تمام مضامین اردو میں منتقل کروں۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے، پھر ظہر وعصر کا درمیانی وقفہ تعلیمی وقت اور ان کے گھر میں ان کا خاص دارالمطالعہ درسگاہ قرار پایا، میں پوری تندہی کے ساتھ چھ ماہ تک عربی زبان وادب کی تحصیل میں لگا رہا، ان کے قیمتی افادات کے جواہر پارے اپنے دامن میں سمیٹتا رہا۔

اس کے بعد والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں خصوصاً استاذِ گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے خط وکتابت کی اور علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اس سلسلہ میں مشورہ کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دفتر سے منظوری آگئی اور میرا داخلہ ''تخصص فی الادب العربی'' میں ہوگیا اور اس طرح میں ہمیشہ کے لیے دارالعلوم سے وابستہ ہوگیا، یہاں سے میری زندگی کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔

اب میں گھریلو ماحول سے کٹ کر تعلیم وتعلم کی وسیع فضا میں آگیا تھا اور اس وقت میرا نصب العین والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی آرزوؤں کی تکمیل عربی زبان وادب کی تحصیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ مرور زمانہ کے

ساتھ میری، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یکساں آرزو بھی پوری ہوتی گئی۔ اور ہم دونوں کا جو واحد مقصود تھا اس میں خدا نے مجھے کامیابی دی۔

انھیں ایام میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا، جس کی وجہ سے لکھنؤ میں ان کا قیام لازمی سا ہوگیا۔ آپ امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب علیہ الرحمہ کے قائم کردہ مدرسہ دارالمبلغین میں فروکش ہوئے۔ مولانا کی ذات مدرسہ کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، اس مدرسہ کے طلبہ سے لے کر اساتذہ تک علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے وجود کو مغتنم سمجھتے رہے اور مشکل وپیچیدہ مسائل میں مولانا کی طرف مراجعت کیا کرتے۔ اس استفادہ میں خانوادۂ فاروقی کے افراد مولانا عبدالرحیم فاروقی، ان کے برادر اصغر اور مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی پیش پیش تھے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ عصر کے بعد علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس لگتی تھی، جس میں مستفیدین اور بڑے بڑے علماء کرام موجود ہوتے تھے، میں بھی مجلس میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا اور زریں موقع سے استفادہ کی بھرپور کوشش کرتا رہا۔

زندگی اسی طور سے گذرتی رہی، اس دوران دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تاریخ ادب عربی اور نصوص ادبیہ کی تحصیل، ادبی افکار ونظریات کے غائرانہ مطالعہ میں مشغول رہا، میں سمجھتا ہوں کہ میرے فکر ومطالعہ اور عربی ادب کی ذوق آفرینی وسیع النظری جہاں استاذ گرامی سید ابوالحسن علی ندوی کے قیمتی مشوروں اور ان کی رہنمائی، مربیانہ ومشفقانہ برتاؤ کی مرہون منت ہے، وہیں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے قیمتی آراء اور ان کے دوررس ہدایات وافادات کو بھی بڑا دخل ہے۔

میں زندگی اسی انداز سے گذار رہا تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے قیام کو بسا غنیمت سمجھ کر ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی، تاکہ مولانا شاہ محمد حلیم عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی موت سے مسند حدیث ایک مدت سے جو سونی پڑی تھی اس کو زینت بخشیں۔ یہ درخواست استاذ گرامی حضرت مولانا نے کچھ اس طرح پیش کی کہ وہ اسے مسترد نہ کرسکے۔ اور لکھنؤ میں قیام کی حد تک اس کے لیے تیار ہوگئے۔ یہ خبر مژدۂ جانفزا بن کر طلبہ واساتذہ کے درمیان پھیل گئی اور تمام لوگوں نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں مولانا عمران خاں ندوی دارالعلوم کے مہتمم تھے، انھوں نے علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے گھنٹوں کی ترتیب قائم کی اور ان کے قیام کا معقول نظم کیا۔ اور علامہ اعظمی

فضیلت کے سندی سال والوں کو بخاری شریف کا درس دینے لگے۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ڈیڑھ سال تک ابر کرم بن کر طلبہ اور ساتذہ پر یکساں برستے رہے۔ حتی کہ ۱۹۵۷ء میں جب نئے الیکشن کا زمانہ قریب آ گیا اور اسمبلی تحلیل کر دی گئی، تو اب پھر لکھنؤ میں قیام کا کوئی جواز باقی نہ رہا اور واپسی کے ارادہ کا اظہار فرمایا۔ ہر چند کہ طلبہ، اساتذہ اور ذمہ داران مدرسہ نے قیام پر اصرار کیا؛ لیکن آپ نے مزید اقامت سے معذرت کر دی۔ اور وطن مالوف مئو اعظم گڈھ واپس ہو گئے۔ اور اپنے مدرسہ کے انتظام وانصرام میں مصروف ہو گئے۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی مفتاح العلوم واپسی کے بعد ادارے کی رونق اور طلبہ واساتذہ کی تعلیمی وثقافتی سرگرمیاں پھر عود کر آئیں۔ اور ملک کے اطراف واکناف سے طالبان علوم نبوت کی آمد کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔ اور مدرسہ میں چہل پہل کی فضا پیدا ہو گئی، اور مدرسہ کی جامد ترقیاں پھر رواں دواں نظر آنے لگیں۔ اور کونے کونے سے اس کی نصرت وحمایت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ تدریسی اشتغال، انتظامی امور کی دیکھ ریکھ، دعوت وارشاد کے فریضہ کی انجام دہی جیسے مشاغل کی گونا گونی کے باوجود آپ کی تحقیقی کاوشیں ایک منٹ کے لیے موقوف نہیں ہوتی تھیں، مصروفیت ہی آپ کی روحانی غذا تھی، یہی مشغلہ تسکین قلب کا باعث اور زندگی کے لیے سرمایہ سکون تھا، جب بھی کوئی نو وارد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اس حال میں پاتا کہ ارد گرد کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے اور ان کے درمیان بیٹھ کر داد تصنیف وتحقیق دے رہے ہیں، کبھی املا ہو رہا ہے، کبھی کچھ نوٹ کیا جا رہا ہے، کہیں تعلیق کا کام ہو رہا ہے۔ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وہ نو وارد علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس طویل نشست نا مناسب سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ ان تصنیفی امور میں ان کے صاحبزادہ مرقاۃ العلوم کے مہتمم جناب مولانا رشید احمد اعظمی ہمیشہ معاون ہوتے۔ خصوصا ان کی موجودگی اس وقت ناگزیر ہوتی جب کسی مخطوطہ کا مقابلہ، یا کسی مسودہ کی تبییض ترتیب کا مسئلہ ہوتا۔ تصنیف وتالیف کے باب میں وہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ م ۱۴۰۲ھ کے مثنی تھے، اشتغال بالحدیث اور علمی افادات کی اشاعت، حدیث کی کتابوں کی تحقیقات وتالیفات کے سلسلے میں دونوں ایک ہی شجر طوبی کی دو شاخیں معلوم ہوتے تھے، غالبًا یہی وجہ ہے کہ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث کا انتہائی احترام کرتے تھے اور خاص خاص اوقات میں ان کے لیے دعاء خیر بھی کیا کرتے تھے۔

تحصیل علم اور خصوصاً ادب عربی کے سلسلہ میں میری کدو کاوش اور شوق فراواں کو دیکھتے

ہوئے استاذ گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے طے کیا کہ مجھے استاذ گرامی علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی (جوندوۃ العلماء میں چار سال تک ادیب اول کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دے چکے تھے اور فی الحال بغداد یونیورسٹی کے کلیۃ دارالمعلمین العلیا میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کررہے تھے) سے مزید استفادہ کرنا چاہیے، یہ ۱۹۸۵ء[1] کی بات ہے۔لیکن میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ذرہ نوازی کو فراموش نہیں کرسکتا کہ جس وقت ناچیز بغداد کے لیے روانہ ہورہا تھا تو دیکھتا کیا ہے وہ باوقار شخصیت لکھنؤ کے پلیٹ فارم پر جلوہ گر ہے، اس ناچیز پر ان کی الطاف وعنایات کی ہمیشہ بارش ہوتی رہی، اوراس ہمت افزائی کو بھی ناچیز ان کے ابر کرم کا ایک چھینٹا سمجھتا ہے، انھوں نے میری ہمت افزائی کرتے ہوئے اور درازیٔ عمر، سہولت و برکت کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا اور تاعمر میری تدریسی تعلیمی سرگرمیوں کی خبر گیری کرتے رہے، اللہ انھیں غریق رحمت کرے اوران کے درجات بلند فرمائے۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث ورجال میں عمیق بصیرت اور تنقیدی واقفیت اوران کے علوشان کی وجہ سے ہندوستان کے بڑے بڑے مدارس وجامعات ان کی خدمات حاصل کرنے کے متمنی اور کوشاں رہتے۔اور بہت سی جامعات ومدارس کی طرف سے پیش کش بھی ہوئی اور بڑے الحاح واصرار کے ساتھ اس کو قبول کرنے کی درخواست بھی کی گئی، مزید باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ اس سے افادہ کا دائرہ وسیع ہوگا اور آپ کی شخصیت محدود حلقوں سے نکل کر ملک گیر ہوجائے گی؛ لیکن انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے اس نوخیز پودہ مدرسہ مفتاح العلوم کی آبیاری اوران کی تعمیر وترقی کی خاطر ساری پیشکش کو مسترد کردیا اوراپنے مستقر کو خیر باد کہنا پسند نہ کیا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند اور قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند پانچویں دہائی میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لائے اور شعبۂ افتاء کی صدارت پیش کی اور افادۂ عام کے لیے دارالعلوم دیوبند میں فروکش ہونے کی خواہش ظاہر کی؛ لیکن انھوں نے مدرسہ مفتاح العلوم کی تعمیر وترقی کی اہمیت اوراپنے علمی وتحقیقی وتصنیفی مشاغل کی وجہ سے معذرت کردی؛ لیکن پھر تھوڑی مدت کے بعد دونوں بزرگوں نے منصب شیخ الحدیث کی قبولیت پر شدید اصرار کیا، لہٰذا مجبور ہوکر انھوں نے اس کو قبول کرلیا؛ مگر جب مفتاح العلوم کے مجلس شوریٰ کے ارکان اور مدرسہ کے ذمہ داروں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو سب نے اس منظوری کے خلاف بیک

---

(۱) ۱۹۸۵ء چھپا ہے، لیکن میرے خیال میں صحیح ۱۹۵۸ء ہے (مسعود الاعظمی)

زبان عقید تمندانہ احتجاج کیا اور کہا کہ ہم اپنے مربی اور علمی وروحانی قائد سے دستبردار نہیں ہوسکتے، یہ ہونہیں سکتا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہوجائیں۔اس شدید ردعمل کے بعد علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رائے بدل دی اور وہیں کے ہوکر رہ گئے۔اور یہ دن ایک یادگاری دن ہوکر رہ گیا۔

ان کی علمی وتحقیقی خدمات اہل نظر سے مخفی نہیں اور تاریخ کے صفحات پر ہیں، ان کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے المعھد العالی للدراسات العلیا فی الحدیث اور مدرسہ مرقاۃ العلوم اور اسی کے جوار میں دریائے ٹونس کے کنارے ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کی۔انھوں نے اپنے آخری دور میں مفتاح العلوم کو اپنے لائق وفائق شاگردوں کے حوالہ کرکے خود معہد اور مدرسہ مرقاۃ العلوم کے لیے فارغ ہوگئے تھے۔یہی دونوں ادارے ان کی امیدوں کا مرکز اور ان کی دینی وعلمی سرگرمیوں کا محور بنے رہے۔آپ اپنے خاص دار المطالعہ میں بحث وتحقیق میں منہمک رہتے اور مختلف دیار وامصار سے آئے ہوئے فارغ التحصیل طلبہ کے اندر حدیث وفقہ وتفسیر میں عمق پیدا کرنے کی فکر میں لگے رہتے۔اگر وہ ایک محدود تعداد اور باصلاحیت اہل لیاقت افراد کی شرط نہ لگاتے تو اس چشمۂ فیض پر تشنگان علم وفن کا جمگھٹا رہتا اور تشنگان علم وفن اپنے اپنے ظرف ذوق کے مطابق سیراب ہوتے۔

ہند وبیرون ہند کے بے شمار علمی حلقوں اور مختلف تحقیقی اداروں سے ان کے گہرے اور سرپرستانہ تعلقات تھے اور بے تعصبی کا یہ حال تھا کہ علماء اہل حدیث سے فقہی مسائل میں نقطۂ نظر کے شدید اختلافات کے باوجود ان کی تعریف وتوصیف سے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی اور جلیل القدر عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری، شیخ الحدیث علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی فی شرح سنن الترمذی اور ان کے معاصر شیخ عبیداللہ رحمانی صاحب کے علاوہ دیگر اہل حدیث علماء ومحدثین کے علمی ودینی خدمات کو سراہنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ جمعیۃ العلماء کے رکن اس وقت منتخب ہوئے جب کہ اس کی سرگرمیاں شباب پر تھیں اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس کے صدر تھے۔انھوں نے اس تحریک کی وسعت وترقی اور اس کے حامیوں کی تعداد میں کثرت کے سلسلہ میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ان کی محبوب ذات سے اس تحریک کو حددرجہ فائدہ پہنچا،شہر مئو اور قریبی شہروں کے مسلمانوں نے محض ان کی شرکت کی وجہ سے اس تحریک میں شمولیت اختیار کی اور اس کی رکنیت قبول کی، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ اس

تحریک کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے اور ہر آڑے وقت میں اس کی وکالت وحمایت اور تائید وتصدیق کرتے رہے، حتی کہ جب اس کے عہدۂ صدارت پر مولانا اسعد مدنی فائز ہوئے تو علامہ نے ان کے ساتھ بھی مکمل تعاون کیا۔

ان کی زندگی کے اخیر ایام میں انھیں امیر الہند مقرر کیا گیا۔ اس انتخاب کے بعد انھوں نے ملک گیر دورہ کیا۔ ہر مذہب ومسلک کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اور ان تمام لوگوں نے اس انتخاب پر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ علمی میدان میں ان کا جو وقار تھا وہ محتاج تعارف نہیں، لیکن دنیاوی اعتبار سے بھی انھوں نے جو شہرت عام حاصل کی وہ کم نہ تھی، اس انتخاب کے بعد ان کی حیثیت محض ایک جلیل القدر عالم ومحدث ہی کی نہیں تھی؛ بلکہ عوام الناس کے درمیان ان کی حیثیت ایک پیشوا کی بھی ہو گئی تھی۔

ہندوستان کے چوٹی کے علماء اور قائدین سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ جن میں سر فہرست مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات عالی صفات ہے۔ علامہ اعظمی کا ان سے مسترشدانہ تعلق تھا، وہ مختلف دینی شرعی معاملات میں خط وکتابت کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح بے شمار اکیڈمیوں کی رکنیت اور علمی مراکز کی سرپرستی بھی انھیں حاصل تھی۔ وہ مسلمانوں میں دینی بیداری کے سلسلہ میں حد درجہ فکرمند اور اس کے لیے تعلیم وتربیت کے ساتھ دعوتی وتبلیغی دوروں کو ضروری خیال کرتے تھے اور علماء کرام کو جب بھی کسی چیلنج کا سامنا ہوا علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ان کے دوش بدوش رہے اور مشقت وکلفت کو جھیلنے میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، انھوں نے اپنی زندگی کا مشن اعلاء کلمۃ اللہ اور اتباع سنت کو بنالیا تھا۔ ان کے علمی وتحقیقی کاوشوں اور عربی زبان وادب کے میدان میں ان کی بیش قیمت خدمات اور ان کی قدآور شخصیت کے اعتراف میں حکومت نے صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا تھا۔

ان تمام مساعیٔ جمیلہ کے ساتھ ساتھ وہ وعظ ونصیحت اور پر اثر تقریروں کے ذریعہ دعوت وارشاد کے کام میں لگے رہتے تھے۔ اس طرح ہر خاص وعام کو ان کی ذات سے فائدہ پہنچتا تھا، وہ علم وتحقیق، صلاح وتقویٰ، بالغ نظری، وسعت ظرف میں سلف صالحین کی زندہ یادگار تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال جلیلہ کو قبول فرمائے اور ان کو اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

حادثۂ جانکاہ

از: مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی ☆

أخلّائی وان شط الحبیب وداره　　　وعز تلاقیه وناءت منازله

وإن فاتکم ان تبصروه بعینکم　　　فما فاتکم منه فهذا شمائله

پچھلے مہینے رأس المحد ثین، مرجع العلماء حضرت امیر الہند مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن اعظمی کی خبر وفات تمام علمی ودینی حلقوں پر ایک صاعقہ بن کر گری، حضرت موصوف ایک عرصہ سے مختلف عوارض میں مبتلا تھے اور مورخہ ۱۱ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ م ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء سہ شنبہ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ إنا للّٰه وإنا إلیه راجعون.

حضرت محدث اعظمی نہ صرف علوم دینیہ، حدیث، تفسیر، فقہ، عقائد، احسان وسلوک کے بحر زخار تھے؛ بلکہ علوم آلیہ، صرف ونحو، ادب وبلاغت، سیر وتاریخ، منطق وفلسفہ اور علم الاسرار میں بھی نابغۂ روزگار تھے، اور زہد وورع، قناعت واستغناء، صبر واستقلال، اناۃ ووقار میں سلف صالحین کی یادگار تھے۔ فطری ذہانت وذکاوت، اخّاذ طبیعت، دقیقہ شناسی، نکتہ رسی، سرعت فہم، حیرت افزا استحضار اور غیر معمولی قوت حافظہ نے آپ کے وجود کو مجسمۂ علم اور ذہن کو ایک کتب خانہ بنا دیا تھا۔ کتابیں ہی آپ کی جلیس ورفیق اور زندگی کی ساتھی تھیں، دنیا کے سارے جھمیلوں سے دست کش ہو کر ہمہ وقت علمی تحقیقات واکتشافات میں مستغرق رہتے، کتابوں کا ایسا شیدائی اس زمانہ میں تلاش وجستجو کے باوجود بھی نہیں مل سکتا۔ ایسے جلیل القدر اور علوم کتاب وسنت کے عاشق کی وفات بلا ریب ایک ایسا علمی سانحہ وملی حادثہ ہے جس پر اظہار کرب والم کے لیے الفاظ بے معنی معلوم ہوتے ہیں، یہ صرف حضرت موصوف کے ابناء واعزہ کا نہیں، تنہا مئو اور اعظم گڈھ کا نہیں، جماعتِ دیوبند اور برصغیر کا نہیں؛ بلکہ پورے عالم اسلام کا حادثہ ہے، جس سے ''موت العالِم موت العالَم'' جیسے مقولہ کی صحت کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ استاذ دارالعلوم دیوبند، وسابق مدیر ماہنامہ ''دارالعلوم''

سوانحی نقوش

ولادت اور تعلیم وتربیت:

۱۳۱۹ھ م ۱۹۰۱ء میں ضلع اعظم گڈھ کے مشہور علمی و صنعتی قصبہ مئو ناتھ بھنجن میں آپ کی ولادت ہوئی، تاریخی نام ''اختر حسن'' ہے، والد ماجد کا اسم گرامی مولوی محمد صابر بن عنایت اللہ ہے، مولوی محمد صابر صاحب مرحوم حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے بیعت تھے اور نہایت عابد وزاہد اور خوش اخلاق وزندہ اوقات انسان تھے، کثرت تلاوت قرآن اور سلام میں پہل کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، تقریباً ۳۶ سال تک محض رضائے الٰہی کے لیے محلّہ کی مسجد میں بچوں کو قرآن پاک اور دینیات کی تعلیم دیتے رہے۔

علم دین کے اس سعادت خیز ماحول میں آپ کی نشو ونما اور ساخت و پرداخت ہوئی، قرآن عظیم اور فارسی کی ابتدائی کتابیں والد بزرگوار ہی سے پڑھیں، اس کے بعد اپنے خسر مولانا عبدالرحمٰن مئوی کے پاس فارسی کی دیگر بڑی کتابوں کی تعلیم حاصل کی، عربی تعلیم کی ابتداء مولوی عبدالعزیز مئوی سے کی اور اسی کے ساتھ تجوید کا ایک منظوم رسالہ مولانا عبدالحق پیلی بھیتی سے پڑھا اور زبانی یاد کر کے سنایا، صرف ونحو کی اکثر کتابیں ضلع کے مشہور عالم دین اور بافیض استاذ مولانا ابوالحسن مئوی کی خدمت میں رہ کر پڑھیں اور ادب کی دو ایک کتابوں کے بعض حصے مولانا محمد صابر صاحب ساکن محلّہ بلاقی پورہ مئو سے پڑھا۔ ادب، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، اور حدیث میں مشکوٰۃ شریف اور ترمذی نصف اول کی تحصیل استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالغفار تلمیذ رشید حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی سے کی اور انھیں کی زیر تربیت مظہر العلوم بنارس سے ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۸ء میں ''ملاّ'' الٰہ آباد بورڈ اور دوسرے سال ''فاضل'' کا امتحان اعلی کامیابی سے پاس کیا، اس زمانہ میں ان امتحانات کی بڑی اہمیت تھی اور ہر کس وناکس ان میں بیٹھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔

حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی نشو ونما اور علمی ساخت و پرداخت میں علی الترتیب ان کے ولی صفت والد مولوی محمد صابر صاحب اور یگانۂ عصر استاذ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ مرکزی حیثیت رکھتے تھے، اول الذکر پاک نفس بزرگ نے آپ کے مزاج میں دین کی عظمت

ومحبت اور حمیت وصلابت پیدا کی، بچپن کا یہ دینی انصباغ زندگی بھر آپ کی ذات میں نمایاں رہا، اور ثانی الذکر علمی مربی نے آپ کے اندر تحصیل علم کی ایسی چاہت ومحبت بھر دی کہ آپ کی شخصیت زندگی برائے علم کا نمونۂ کامل بن گئی۔

علم وفن کی تحصیل وتکمیل کے بعد شوال ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۷ء میں آپ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور داخلہ کا امتحان دیا تو اس میں امتیازی نمبرات حاصل ہوئے، حضرت مہتمم صاحب کو اس غیر معمولی کامیابی پر استعجاب ہوا اور اطمینان خاطر کے لیے دوبارہ حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی کے پاس امتحان بھیج دیا، مولانا موصوف امتحان میں بہت سخت گیر تھے، طلبہ عام طور پر ان کے پاس امتحان سے گھبراتے تھے، حضرت شیخ الادب نے دیوان متنبیؔ اور حماسہ کا دوبارہ امتحان لیا، جس میں آپ کو پہلی بار سے بھی زیادہ نمبرات ملے، امتحان داخلہ اور دیگر ضروری کارروائیوں سے گذر کر مولانا نبیہہ حسن صاحب سے ہیئت، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی سے جلالین اور حضرت مولانا رسول خاں سرحدی سے بیضاوی سورۂ بقرہ کے اسباق شروع کر دیے کہ اوائل ماہ صفر میں دارالعلوم کے اندر فصلی بخار پھیل گیا جس میں مولانا موصوف بھی مبتلا ہو گئے اور مرض نے اس درجہ شدت اختیار کر لی کہ وہاں قیام مشکل ہو گیا، ناچار آخر صفر میں گھر واپس لوٹ آئے، پھر دوسرے سال دوبارہ دیوبند کا قصد کیا اور دورۂ حدیث میں داخل ہو کر محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری سے ترمذی جلد اول، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی سے مسلم شریف حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی سے ابوداؤد اور دیگر اساتذۂ دارالعلوم سے بقیہ کتب صحاح ستہ کی تعلیم وتحصیل میں منہمک ہو گئے، مگر اس دفعہ بھی سال پورا ہونے سے پہلے ہی ماہ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں بیمار پڑ گئے اور رخصت لے کر وطن واپس آ گئے۔ صحت یابی کے بعد دارالعلوم مئو میں حضرت شیخ الہند کے مشہور تلمیذ اور نامور صاحب درس عالم حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی سے (جو اس وقت وہاں کے شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین تھے) صحاح ستہ کی تکمیل کر کے سند فراغت واجازت لی۔

حضرت مولانا سنبھلی اور حضرت علامہ کشمیری کے علاوہ آپ کو حضرت مولانا عبدالغفار مئوی اور مولانا عبدالرحمٰن بھوپالی سے بھی احادیث وغیر کی سند واجازت حاصل تھی۔

مولانا سنبھلی ہی سے معقولات کی باقی ماندہ کتابیں صدرا، شمس بازغہ، حمد اللہ، قاضی مبارک، توضیح تلویح اور اقلیدس کی کتابیں پڑھیں، دوران تعلیم ہی طلبہ کو درس دینا بھی شروع کر دیا تھا۔

درس وافادہ:

فراغت کے بعد دارالعلوم مئو ہی میں باقاعدہ درجہ علیا کے استاذ مقرر ہو گئے، تقریباً دو برس یہاں تدریسی خدمت انجام دے کر ۱۳۴۳ھ میں بحیثیت صدر المدرسین مظہر العلوم بنارس چلے گئے، مظہر العلوم ہء کے زمانۂ تدریس میں آپ کے استاذ مولانا ابوالحسن مئوی نے اپنے مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں خدمت تدریس کی پیش کش کی، استاذ محترم کی اس خواہش کو آپ رد نہیں کر سکے اور مظہر العلوم بنارس سے منتقل ہو کر ۱۳۴۷ھ میں مفتاح العلوم مئو آ گئے اور اپنی علمی سرگرمیوں کے ذریعہ اس کے اندر ایک نئی جان ڈال دی، بالفاظ دگر مدرسہ مفتاح العلوم کی از سر نو نشأۃ ثانیہ فرمائی اور اسے ایک قصباتی مدرسہ سے بلند کر کے بین الملکی جامعہ بنا دیا۔ ۱۳۶۹ھ تک مسلسل جامعہ مفتاح العلوم میں بحیثیت شیخ الجامعہ، صدر المدرسین یا مہتمم کے حدیث وتفسیر اور فقہ وادب کا درس دیتے رہے، اس مدت میں سیکڑوں تشنہ کام علم وفن آپ کے چشمۂ علم وعرفان سے سیراب ہوئے اور بخاری وترمذی وغیرہ پڑھ کر سند اجازت وفراغت حاصل کی۔

تعلیم وتدریس کا یہ زریں سلسلہ مزید آگے نہ بڑھ سکا، ۱۳۶۹ھ میں اپنے تصنیفی وتحقیقی کاموں بالخصوص مصنف عبدالرزاق کی تصحیح وتعلیق میں مصروفیت کی بناء پر مفتاح العلوم کی خدمت سے سبک دوشی حاصل کر لی۔

حرمین شریفین اور دیگر بلاد اسلامیہ کا علمی سفر:

۱۳۶۹ھ ہی میں پہلی بار حج وزیارت کی دولتِ بے پایاں سے مالا مال ہوئے، پھر دو سال بعد دوبارہ اس سعادت عظمٰی سے ہم کنار ہوئے، اس طرح تقریباً چھ سات بار حرمین شریفین کی حاضری سے بہرہ مند ہوئے۔ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ زادہما اللہ شرفاً وتعظیماً کے علاوہ آپ نے بیروت، حلب، دمشق، صیدا، بعلبک، لاذقیہ، جبلہ، بحرین، مصر وغیرہ بلاد اسلامیہ کے خالص علمی اسفار بھی کیے، جن میں آپ نے جی بھر کے استفادہ وافادہ کیا۔

ان رحلات میں بلاد عرب وشام کی بہت سی مشہور علمی شخصیتوں سے تعارف اور علمی روابط قائم ہوئے اور ایک کثیر جماعت نے آپ سے حدیث پاک کی سند واجازت حاصل کی، ان میں سے چند مشاہیر علماء کے اسماء یہ ہیں: (۱) الامام الشیخ عبدالحلیم محمود شیخ الازہر (۲) الشیخ بہجۃ البیطار (۳) الشیخ

عبداللہ سراج الحلبی (۴) الشیخ نورالدین عتر (۵) الشیخ المحقق عبدالفتاح ابوغدہ (۶) الشیخ عبدالعزیز ابن باز، (۷) الشیخ محمد امین الکتبی شیخ الحرم المکی (۸) الشیخ محمد المغربی المکی (۹) الشیخ علوی المالکی (۱۰) الشیخ حسن مشاط (۱۱) الشیخ حسنین مخلوف (۱۲) الشیخ عبدالرحمٰن الیمانی مدیر مکتبۃ الحرم (۱۳) العلامہ خیرالدین الزرکلی (۱۴) الاستاذ سعید الافغانی (۱۵) الشیخ ناصرالدین البانی (۱۶) الشیخ محمد علی الحرکان (۱۷) الشیخ سلیمان الصنیع (۱۸) الشیخ ابوالیسر عابدین (۱۹) الشیخ عبدالعزیز ابوعیون السود (۲۰) الشیخ مصطفیٰ الزرقاء (۲۱) المفتی الاکبر الشیخ محمد امین الحسینی (۲۲) مفتی الجمہوریۃ اللبنانیۃ الشیخ حسن خالد (۲۳) الشیخ اسماعیل الانصاری (۲۴) الدکتور صلاح الدین المنجد (۲۵) الشیخ حمد الجاسر (۲۶) الشیخ عبداللہ العقیل (۲۷) الشیخ عبدالبدیع صقر (۲۸) الاستاذ زہیر الشاویش (۲۹) الشیخ محمد عوامہ (۳۰) الدکتور بشار عواد وغیرہ۔

دارالعلوم دیوبند سے صدارت افتاء اور صدارت تدریس کی دعوت:

۱۳۶۴ھ م ۱۹۴۵ء میں جب کہ محدث عصر مفتاح العلوم مئو میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تدریسی و تعلیمی خدمت انجام دے رہے تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مئو آ کر بیک زبان صدارت افتاء کا اہم ترین منصب پیش کیا، مگر اہل مئو بالخصوص جامعہ مفتاح العلوم کے ارباب بست وکشاد کسی طرح سے مفارقت پر راضی نہیں ہوئے، پھر چند برسوں کے بعد اصحاب شوریٰ کی جانب سے صدارت تدریس کی عظیم پیش کش کی گئی، مگر اپنے تصنیفی مشاغل کی بنا پر آپ نے عذر معقول فرما دیا۔

یو پی اسمبلی کی رکنیت اور ندوہ میں درس بخاری:

۱۳۷۱ھ م ۱۹۵۲ء میں مئو کے حلقہ سے کانگریس نے آپ کو اسمبلی کے لیے اپنا امیدوار بنایا جسے اپنے مزاج و افتاد طبع کے خلاف احباب و اکابر کی خواہش کے احترام میں قبول کر لیا، مگر اپنے حلقۂ انتخاب میں ایک دن کے لیے بھی نہیں گئے، اس کے باوجود بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور پانچ سال تک اسمبلی کے رکن رہے، اس زمانہ میں اگرچہ اسمبلی کی ممبری باوقار سمجھی جاتی تھی اور ملک کا اعلیٰ و سنجیدہ طبقہ ہی اس تک رسائی کا حوصلہ کرتا تھا، بایں ہمہ حضرت محدث عصر کے علمی مزاج کو اس سے کوئی مناسبت اور ہم آہنگی نہیں تھی، اس لیے لکھنؤ میں آپ کا اکثر وقت سیاسی سرگرمیوں کے بجائے

ندوہ کے کتب خانہ میں مطالعۂ کتب میں گذرتا۔ اسی زمانہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی ناظم اعلیٰ ندوۃ العلماء کی شدید خواہش اور پیہم اصرار پر ندوہ میں بخاری شریف کا درس شروع کردیا، جس کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا، اسی کے ساتھ دارالمبلغین لکھنؤ میں بھی درس وافادہ کی مجلس قائم کر رکھی تھی، اسمبلی کی پانچ سالہ مدت پوری ہوتے ہی گھر پر اپنے اصلی مشغلۂ تصنیف وتحقیق میں مشغول ہوگئے اور دوبارہ انتخاب میں امیدوار ہونا پسند نہیں کیا۔

دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کی رکنیت:

۱۳۷۳ھ م ۱۹۵۳ء میں مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے رکن منتخب ہوئے اور زندگی کے آخری لمحے تک اس وقیع منصب پر فائز رہے، مجلس میں آپ کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور بسا اوقات آپ ہی کی زیر صدارت مجلس شوریٰ کا انعقاد ہوتا، حضرت مولانا عبدالحی چشتی خلیفہ حضرت شیخ الاسلام فرماتے تھے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی تجویز پر مجلس شوریٰ میں یہ طے ہوگیا تھا، ہر وہ تجویز جس کا تعلق انتظام وانصرام کے بجائے دین وشریعت اور فقہی احکام سے ہو، اس کی تصدیق وتصویب جب تک محدث اعظمی نہ فرمادیں نافذ العمل نہیں ہوگی، اسی سال مذکور ہی میں جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے بھی رکن بنائے گئے اور تاحیات اس پر قائم رہے اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاسوں اور کانفرنسوں میں برابر شریک ہوتے رہے اور اپنے مفید مشوروں سے ملک وملت کی خدمت انجام دیتے رہے۔

دوبارہ جامعہ مفتاح العلوم کی مسند اہتمام وصدارت تدریس پر:

ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ جنوری ۱۹۷۳ء میں جب آپ کے رفیق خاص اور دیرینہ ساتھی مولانا عبداللطیف نعمانی مہتمم وشیخ الجامعہ مفتاح العلوم مئو کا انتقال ہوگیا اور جامعہ مفتاح العلوم میں کوئی ایسی بھاری بھرکم شخصیت موجود نہیں تھی جو اس کی نیک نامی اور شہرت ومقبولیت کو برقرار رکھتے ہوئے کار اہتمام وصدارت تدریس کی خدمت انجام دے سکے، تو جامعہ کے اصحاب حل وعقد نے طے کیا کہ حضرت محدث اعظمی سے درخواست کی جائے کہ وہ اس کی علمی وانتظامی ذمہ داریوں کو قبول فرمالیں، چونکہ اس گلشن علم وآگہی کی آبیاری اور اسے پروان چڑھانے میں موصوف نے اپنی جوانی کے قیمتی شب وروز اور زریں اوقات نذر کیے تھے، بھلا اسے بے یار ومددگار کس طرح چھوڑ سکتے تھے، اس لیے پیرانہ سالی اور اپنی دیگر علمی ودینی مصروفیات کے باوجود جامعہ کے ارباب بست وکشاد کی اس درخواست کو رد

نہ کر سکے، اور دوبارہ مفتاح العلوم کے اہتمام اور صدارت تدریس کی خدمت قبول کر لی اور کئی سال تک جامعہ کی تعلیمی وانتظامی خدمت انجام دی، مگر بچند وجوہ یہ سلسلہ تادیر قائم نہ رہ سکا اور آپ جامعہ مفتاح العلوم کی خدمت سے سبک دوش ہو گئے۔

المعہد العالی اور مرقاۃ العلوم کی تاسیس:

حضرت محدث اعظمی کو عرصہ سے اس کا شدت سے احساس تھا کہ دن بہ دن طلبہ کی استعداد کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی ہے، مدارس اسلامیہ کے فضلاء میں بالعموم مطلوبہ صلاحیتیں ناپید ہوتی جارہی ہیں اور اگر بعض میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے تو علمی تربیت نہ ہونے کی بناء پر وہ صحیح طریقہ سے اس صلاحیت سے کام نہیں لے پاتے، جامعہ مفتاح العلوم کی دوبارہ خدمات نے حضرت موصوف کے اس احساس کو مزید پختہ بنا دیا، اس لیے آپ نے فیصلہ کیا کہ مدارس کے فضلاء کی تربیت کے لیے ایک ادارہ قائم کیا جائے، چنانچہ ۱۴۰۰ھ م ۱۹۸۰ء میں مئو میں المعہد العالی کے نام سے ایک تربیتی ادارہ کی بنیاد رکھی، پھر چند سالوں کے بعد ٹھوس ابتدائی تعلیم کے لیے مرقاۃ العلوم کے نام سے ایک اور مدرسہ قائم فرمایا، ان دونوں اداروں کی تعمیر وترقی سے آپ کو اس قدر دلچسپی تھی کہ ان کے سارے انتظامی اور تعلیمی کاموں کی خود نگرانی فرماتے تھے، اور پیرانہ سالی وکثرت عوارض کے باوجود منتہی طلبہ کو متعدد کتابوں کا درس بھی دیتے تھے، مدارس کے بارے میں آپ کا ہمیشہ سے یہ نظریہ رہا ہے کہ وہ محض رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کے لیے ہونے چاہئیں، ان میں دنیوی اغراض وخواہشات کی آمیزش تک نہ ہو، موصوف اس ادارہ کو اسی نہج پر چلا رہے تھے۔

صدارتی ایوارڈ:

حضرت محدث عصر کی طویل علمی وتحقیقی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے ۱۴۰۵ھ م ۱۹۸۴ء میں انھیں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ اور اعزازی انعام عطا کیا تھا جس کے واقعی طور پر وہ مستحق تھے۔

امارت شرعیہ ہند کا قیام اور امیر الہند کا انتخاب:

دین اسلام کیا ہے؟ یہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور مسلمانوں کی اجتماعی مرکزیت پر مشتمل ایک مکمل نظام حیات ہے، اس میں انتشار، فوضویت اور پراگندگی کی کوئی گنجائش نہیں، اسی بنا پر جمعیۃ علماء ہند ۱۳۳۹ھ م ۱۹۲۰ء سے مسلسل اسلامی شرعی امارت کی ضرورت پر زور دے کر اس کے لیے

راستہ ہموار کرتی رہی تاکہ اس ملک میں غیر مسلم اقتدار کے ماتحت رہتے ہوئے بھی منظم طور پر اسلامی احکام پر پورا پورا عمل کیا جاسکے، اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے جمعیۃ علماء کی یہ ۶۶ سالہ جد وجہد بار آور ہوئی اور اس کی دعوت پر ۲۸ رصفر ۱۴۰۷ھ م ۲ رنومبر ۱۹۸۶ء کو مدنی ہال بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی میں ملک کے چودہ صوبوں دلی، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش، کیرالہ، گجرات، اڑیسہ، مہاراشٹر، راجستھان، ہریانہ، کرناٹک، آسام، مغربی بنگال، آندھرا کے تین ہزار سے زائد نمائندے اور ارباب حل وعقد جمع ہوئے، جن میں علماء دین، مفتیان عظام، مصنفین، محققین، عصری اداروں کے لکچرار اور پروفیسر، اسمبلی و پارلیمنٹ کے ممبران، وکلا، تجار، ڈاکٹر غرضیکہ ہر طبقہ کے اصحاب رائے شامل تھے، ارباب حل وعقد کے اس عظیم اجتماع نے حضرت مولانا سید اسعد مدنی کی تجویز پر لبیک کہتے ہوئے امیر الہند کے منصب عظیم کے لیے باتفاق حضرت محدث کبیر صاحب کا انتخاب کیا، چونکہ اپنی علالت کی وجہ سے حضرت موصوف اجتماع میں شریک نہیں ہوسکے تھے، اس لیے ان کی جانب سے حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند نے شرکائے اجلاس سے سمع وطاعت کی بیعت لی، اس طرح شرعی معیار کے مطابق کل ہند سطح پر امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا اور اس کے اولین امیر شریعت حضرت موصوف قرار پائے **ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء**۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علمی کمالات اور خدمات

علمی مقام ومرتبہ:

حضرت محدث عصر اس برصغیر ہی میں نہیں پوری اسلامی دنیا میں اپنے علمی وتحقیقی کارناموں کی وجہ سے مشہور ومقبول تھے، وہ اعلیٰ درجہ کے مدرس، بلند پایہ مصنف، متبحر عالم اور نادرۂ روزگار محدث تھے، تفقہ فی الحدیث اور فقہ حنفی کی تائید ونصرت جو علمائے دیوبند کے درس کی امتیازی خصوصیت تھی، اسی کے ساتھ رجال طبقات رواۃ، علل حدیث اور طرق حدیث کی تحقیق میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا، وہ اپنے اس کمال میں ہندوستان ہی نہیں عرب ملکوں میں بھی بے نظیر تھے، عصر حاضر کے کبار علمائے حدیث آپ کی معلومات اور تحقیقات پر مکمل اعتماد کرتے تھے، چنانچہ مصر کے محقق عالم حدیث علامہ احمد محمد شاکر کی مسند امام احمد بن حنبل کی تحقیق وتعلیق پر آپ کے استدراکات وتعقیبات کو نہ صرف دوسرے

محققین نے بنظر استحسان دیکھا بلکہ خود علامہ احمد محمد شاکر نے پورے تشکر و امتنان کے ساتھ انھیں قبول کیا اور مسند کی پندرہویں جلد میں ان کو بعینہٖ نقل بھی کر دیا، اس سلسلے میں علامہ احمد محمد شاکر نے حضرت محدث اعظمی کو جو مکتوب لکھا تھا، اس کے اقتباسات یہاں نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا، وہ لکھتے ہیں:

حضرة الأخ العلامة الكبير المحقق الاستاذ حبيب الرحمن الأعظمي ..... جاء نى كتابكم الأول النفيس ..... أما استدراكاتكم فكلها نفيسة عالية ولا أقول هذا مجاملة ...... وأشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة وأرجو أن تزيدوا من إشاراتكم وإرشاداتكم خدمة للسنة النبوية المطهرة وأنتم كما رأيت من عملكم من أعظم العلماء بها في هذا العصر، فالحمد لله على توفيقكم۔

كتبه المخلص: أحمد محمد شاكر

اس مکتوب کے لفظ لفظ سے حضرت محدث اعظمی کی علم حدیث میں عظمت شان اور جلالت قدر کا اندازہ ہوتا ہے، اس سلسلے میں عصر حاضر کے جید عالم اور محقق فقیہ علامہ ابوالوفا افغانی کے تاثرات بھی ملاحظہ کرتے چلیے، جسے انھوں نے ''کتاب الزہد والرقائق'' کی تقریظ میں قلم بند کیا ہے، علامہ افغانی لکھتے ہیں:

فقد اطلعت على كتاب الزهد للإمام بن المبارك رحمه الله الذى رتب أصوله وصححها وعلق عليه العلامة اللبيب الحبيب مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي لا زال ناصراً للسنة .... فوجدته ماهراً للعلوم حاويا بها أميناً لرواياته حل فى تعليقه مشكلات الكتاب وأخرج أحاديثه وآثاره وقدمه بمقدمة ثمينة مفيدة تدل علىٰ سعة اطلاعه وطول باعه قل له نظير فى علماء زماننا۔

(كتاب الزهد والرقاق ص٦٤)

اس تحریر میں بھی اس بات کا اعتراف ملتا ہے کہ حضرت محدث اعظمی علوم حدیث میں ماہر اور وسعتِ معلومات میں اپنی نظیر آپ تھے۔

تعلیقات وتصنیفات:

حضرت محدث اعظمی کو خدائے علیم وخبیر نے تحریر وتصنیف کا نہایت عمدہ ذوق وسلیقہ عطا فرمایا تھا، جس سے وہ زندگی بھر کام بھی لیتے رہے اور اس صدی میں آپ نے علم حدیث کی ترویج واشاعت

میں جو مہتم بالشان اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں بلا ریب وہ آپ کا ایک تجدیدی کارنامہ ہے، جس میں ان کا کوئی سہیم ونظیر نہیں ہے، حضرت محدث اعظمی نے جن کتابوں کو ایڈٹ کیا ہے، ان پر عالمانہ مقدمے بھی تحریر کیے ہیں، جن میں مصنف کے حالات وکمالات، ان موضوعات پر پہلے اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ، زیر اشاعت کتاب کی افادیت واہمیت اور ان کے مخطوطات کی نشان دہی فرمائی ہے، حواشی اور تعلیقات میں مختلف نسخوں کے فرق واختلاف، متن میں درج آیات واحادیث کی تخریج، رجال واسناد کی تحقیق، مشکل وغریب الفاظ کی تشریح، دیگر مشہور ومتداول کتابوں کی حدیثوں سے زیر نظر کتابوں کی مطابقت یا اختلاف کو ظاہر کر کے ان کی خطا وصحت کا فیصلہ کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ امور ایسے ہیں جنھیں وہی انجام دے سکتا ہے جس کی متون وشروح حدیث پر پوری نظر ہو، علوم روایت کے تمام انواع اور علم درایت کے تمام مقاصد ومدارک سے کامل واقفیت رکھتا ہو اور طبقات رواۃ وطرق حدیث کی تحقیق میں اسے مہارت حاصل ہو۔

ذیل میں ان نادر کتابوں کی فہرست ملاحظہ کیجیے جنھیں موصوف نے تصحیح وتعلیق اور مفید حواشی سے آراستہ کر کے شائع کرایا، جس سے اس فن میں ان کی عبقریت اور مجتہدانہ مہارت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔

۱-انتقاء الترغیب والترهیب للحافظ ابن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ ناشر ادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں ۱۳۸۰ھ م ۱۹۶۰ء۔

۲-مسند الحمیدی (دو جلدوں میں) یہ امام بخاری کے استاذ امام ابو بکر عبداللہ بن الزبیر قریشی اسدی، حمیدی، المتوفی ۲۱۹ھ کی تالیف ہے، اب تک غیر مطبوعہ تھی، حیدر آباد سے ۱۳۸۲ھ م ۱۹۶۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

۳-کتاب الزهد والرقائق للامام عبداللہ بن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ: یہ کتاب بھی مخطوطہ ہونے کی وجہ سے علماء کی دسترس سے باہر تھی، حتی کہ علامہ سید سلیمان ندوی جیسے کثیر المطالعہ اور محقق عالم کو بھی اس کتاب تک اپنی نارسائی کا اعتراف ہے، وہ لکھتے ہیں:

''قدماء میں صرف ایک بزرگ امام عبداللہ بن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہم کو معلوم ہے جنھوں نے کتاب الزہد والرقائق کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے، مگر یہ ہیچمداں

اس کی زیارت سے محروم رہا ہے، اس لیے اس کی نسبت کچھ عرض نہیں کر سکتا''۔

(معارف ۱۹۴۴ء)

محدث اعظمی کے غواصی کی داد دیجیے کہ علوم حدیث کے بحر بیکراں سے اس موتی کو برآمد کر لیا اور اسے اپنے تعلیقات وحواشی سے مزید آبدار کر کے اہل علم وتحقیق تک پہنچا دیا جو آج ان کے کتب خانوں کے لیے باعث زینت ہے، یہ نادر مخطوطہ ادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں سے ۱۳۸۵ھ م ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ہے۔

۴-**سنن سعید بن منصور** (دو جلدوں میں) یہ شیخ ابوعثمان سعید بن منصور مروزی متوفیٰ ۲۲۹ھ کی تصنیف ہے، جس میں ثلاثیات بہت ہیں، یہ بھی مالیگاؤں سے ۱۳۸۸ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۵-**المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة** للحافظ ابن حجر العسقلانی المتوفیٰ ۸۵۲ھ (چار جلدوں میں) وزارۃ الاوقاف کویت نے ۱۳۹۰ھ میں شائع کی۔

۶-**المصنف لعبدالرزاق** امام عبدالرزاق بن ہمام بن نافع (استاذ امام احمد بن حنبل) المتوفیٰ ۲۱۱ھ کی تصنیف ہے، جس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں، یہ کتاب احادیث وآثار کا ایک دائرۃ المعارف ہے، ۱۱ر جلدوں میں دار القلم بیروت سے ۱۳۹۰ھ میں طبع ہوئی ہے۔

۷-**تلخیص خواتم جامع الاصول** للمحدث محمد بن طاہر پٹنی المتوفی ۹۸۶ھ: احیاء المعارف مالیگاؤں سے ۱۳۹۵ھ میں شائع ہوئی۔

۸-**کشف الأستار عن زوائد مسند البزار للھیثمی** کو چار جلدوں میں ۱۳۹۹ھ میں دمشق کے ایک ادارہ نے شائع کیا۔

۹-**المصنف لابن ابی شیبة** المتوفیٰ ۲۳۵ھ: اس کی تین جلدیں مکتبۂ امدادیہ مکہ مکرمہ سے شائع ہو چکی ہیں بقیہ زیر طبع ہیں۔

۱۰-**تحقیق حیاة الصحابة للشیخ محمد یوسف الکاندھلوی.**

۱۱-**تصحیح وتعلیق تکمیل الاذھان** للشیخ المحدث الشاہ رفیع الدین الدہلوی المتوفیٰ ۱۲۳۳ھ غیر مطبوعہ جس کا ایک نسخہ مجلس علمی کراچی میں ہے۔

۱۲-**کتاب الثقات لابن شاھین** غیر مطبوعہ۔

مؤلفات کی فہرست:

۱-**الحاوی لرجال الطحاوی**: عربی غیر مطبوعہ جس میں معانی الآثار اور مشکل الآثار دونوں کتابوں کے رجال پر بحث کی گئی ہے، یہ ایک عمل مبتکر اور نیا کام ہے، کیونکہ اب تک کسی محدث نے مشکل الآثار کے رجال پر کام نہیں کیا ہے، حضرت محدث کشمیری نے اس کتاب کے مسودہ کو دیکھ کر مولانا اعظمی کی کثرت معلومات کی تعریف فرمائی تھی۔

۲-**الإتحافات السنية بذكر محدثي الحنفية**،عربی غیر مطبوعہ۔

۳-**استدراكات على تحفة الأحوذي** شرح ترمذی للشیخ عبدالرحمٰن مبارک پوری۔

۴-**نصرة الحديث** اردو منکرین حدیث کی تردید میں بے نظیر کتاب ہے، حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس کتاب پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔

۵-**اعیان الحجاج** دو جلدیں، موضوع نام سے ظاہر ہے، مولانا ابوالحسن علی میاں نے اس تالیف کو علمی و دینی قرار دیا ہے۔

۶-**رکعات تراویح**

۷-**رکعات التراويح برد انوار المصابيح** یہ دونوں کتابیں ہندوستانی غیر مقلدین کے جواب میں تراویح کی رکعتوں سے متعلق ہیں اور اپنے باب میں بہت خوب ہیں۔

۸-**اعلام المرفوعة فی حكم الطلقات المجموعة**

۹-**ازهار المربوعة في رد الآثار المتبوعة**. دو جلدوں میں، یہ دونوں کتابیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک مجلس کی تین طلاقوں سے متعلق ہیں اور ہندوستانی غیر مقلدین کے رد میں ہیں جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کو اجماع امت کے برخلاف ایک مانتے ہیں۔

۱۰-**شارع حقيقي** یہ فرقۂ بریلوی کی تردید میں ہے اور اپنے موضوع پر نہایت گراں قدر ہے۔

۱۱-**تحقيق اهل حديث** یہ کتاب بھی غیر مقلدین کے رد میں ہے جو اپنے کو اہل حدیث کہلاتے ہیں۔

۱۲-**النذر لاولياء الله** اہل بدعت کی رد میں ہے۔

۱۳-ارشاد الثقلین فرقہ رافضیہ کی تردید میں ہے۔

۱۴-ابطال عزا داری یہ بھی فرقہ رافضیہ کی تردید میں ہے۔

۱۵-تعزیہ داری سنی نقطۂ نظر سے۔

۱۶-دفع المجادلة فی آیات المباهلة.

۱۷-التنقید السدید علی التفسیر الجدید خواجہ عبدالحی مرحوم کی تفسیر پر علمی پیرایہ میں گرفت کی گئی ہے۔

۱۸-اہل دل کی دل آویز باتیں۔

۱۹-رہبر حجاج۔

۲۰-رد تحقیق الکلام، غیر مطبوعہ۔

آپ کی علمی خدمات میں ایک خدمت یہ بھی ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایہ پر حافظ قاسم بن قطلو بغا نے جو استدراک تحریر کیا ہے اس کا نصف آخر جو آپ کو دستیاب ہو گیا تھا علامہ زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مصر بھیج کر منیۃ الالمعی کے ساتھ شائع کرایا جس کے لیے علامہ زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے منیۃ الالمعی کے مقدمہ میں بہت زیادہ اظہار تشکر وامتنان کیا ہے اور آپ کو ''العلامۃ النحریر والجہبذ الخبیر'' کے توصیفی کلمات سے یاد کیا ہے۔

علم فقہ میں مقام ومرتبہ:

بالعموم سبھی اہل علم جانتے ہیں حضرت مولانا الاعظمی ایک بلند پایہ محدث اور علوم حدیث کے زبردست ناقد ومحقق تھے، مگر یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ آپ ایک فقید المثال فقیہ بھی تھے، ان کی شان محدثیت، دیگر کمالات علمیہ پر اس طرح چھا گئی تھی کہ ان کی فقہی بصیرت ومہارت پس منظر سے اوجھل ہو گئی آپ کی فقاہت کی اس سے بڑی سند اور کیا ہو گی کہ برصغیر کے سب سے بڑے فقہ وافتاء کے مرکز دارالعلوم دیوبند کی صدارت افتاء کی مسند آپ کو پیش کی گئی اور وہ بھی حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی جیسے جلیل القدر اور صاحب بصیرت عالم ومحدث کی جانب سے۔

محدث اعظمی بحیثیت ایک مناظر کے:

دیگر علمی کمالات کے ساتھ آپ ایک زبردست اور حاضر جواب مناظر بھی تھے، بریلوی فرقہ

اور جماعت اہل حدیث (غیر مقلدین) کے علماء سے تحریری مناظرہ کے علاوہ آپ نے تقریری مناظرے بھی کیے اور انھیں لا جواب کر کے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، ۲۴/۲۵/۲۶/ر جمادی الاخری ۱۳۵۲ھ م ۱۵/۱۶/۱۷/۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو موضع ادری ضلع اعظم گڈھ میں بریلوی فرقہ کے صف اول کے عالم و مناظر مولانا نعیم الدین اور مولانا حشمت علی سے آپ کا مولانا عبداللطیف نعمانی اور مولانا منظور نعمانی کی رفاقت میں مناظرہ ہوا، نتیجہ میں بریلوی مناظرین شب کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غائب ہو گئے، اس مناظرہ کی مکمل روداد ماہنامہ الفرقان میں دیکھی جا سکتی ہے۔

احسان وسلوک:

احسان وسلوک میں بھی حضرت محدث اعظمی بلند مقام پر فائز تھے، علم کا غلبہ اور اخفائے حال کی بے پناہ کوشش کی بنا پر آپ کی احسانی کیفیت کا عام طور پر لوگوں کو ادراک نہیں ہو سکا، آپ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے بیعت تھے، اپنی بیعت کا ذکر خود انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''وہ میری زندگی کے نہایت مسعود و مبارک لمحات ہیں جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گذرے، مجھے حاضری کی سعادت پہلی بار اس وقت حاصل ہوئی جب دارالعلوم دیوبند میں طالب علمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ۱۳۳۷ھ غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی زیارت کے مقصد سے حاضری ہوئی تھی، مگر خوش قسمتی کی وجہ سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہو گیا، پہلے سے جانے پہچانے متوسلین میں اس وقت حضرت مولانا فتح پوری صاحب سوانح اور خواجہ صاحب (مجذوب تخلص) خانقاہ میں موجود تھے، مولانا فتح پوری صاحب سوانح حضرت اقدس کی نشست گاہ کے پیچھے ایک تنگ حجرہ کے سامنے ذرا داہنے ہٹ کر بیٹھنے پر مامور تھے اور وہیں حضرت کے ملفوظات قلم بند کرتے تھے۔

مولانا فتح پوری کو کئی دن تک دیکھنے اور وقتاً فوقتاً اپنی اپنی قیام گاہ پر آنے جانے ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا، عصر کے بعد خانقاہ کے دروازے پر ایک چائے خانہ میں چائے پینے اور گفتگو کی نوبت بھی آئی، جس شب میں بعد مغرب میں شرفِ بیعت سے مشرف ہوا تھا اس کے بعد والے دن میں غالباً بعد نماز عصر حضرت مولانا فتح پوری نے خواجہ صاحب سے فرمایا

تھا کہ خواجہ صاحب! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے مٹھائی وصول کرنی چاہیے ان کو حضرت نے زمانۂ طالب علمی میں بیعت کرلیا، حالانکہ حضرت ایسا نہیں کرتے، یہ ان کی خصوصیت ہے''۔

(مقدمہ تذکرہ مصلح الامت ص: و، ہ)

اجازت وخلافت آپ کو حضرت تھانوی قدس سرہ کے خلیفۂ اجل حضرت مصلح الامت مولانا وصی اللہ فتح پوری ؒ کے علاوہ حضرت مولانا منیر الدین صاحب مہاجر مکہ ؒ (خلیفہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) سے بواسطہ حاجی عبدالحمید صاحب اورنگ آبادی بھی حاصل تھی، لیکن اپنے علمی مشاغل کی وجہ سے ارادت مندوں کے اصرار کے باوجود بیعت نہیں کرتے تھے، البتہ کچھ مخصوص عقیدت مند آپ سے متوسل ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

اس موقع پر اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ آپ احسان وسلوک میں حضرت اقدس مولانا تھانوی ؒ سے منسلک ہونے کے باوجود ملکی سیاست میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی نور اللہ مرقدہ واعلی اللہ مراتبہ کے نظریہ کے حامی ومؤید تھے، اسی وجہ سے تاحیات جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ رہے، آپ کے اعتدال، توسط اور میانہ روی کا یہ کمال ہے کہ ان دونوں حضرات اکابر رحمہما اللہ کا اعتماد ہمیشہ آپ کو حاصل رہا، بلکہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے بعد ان کے صاحبزادۂ اجل حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند ونائب امیر الہند سے بھی آپ کا عزیزانہ تعلق تھا، چنانچہ بیماری کے آخر زمانہ میں جب کہ آپ پر ایک استغراقی کیفیت طاری تھی، گفتگو اور بات چیت بالکل موقوف ہوگئی تھی، آنکھیں ہمہ وقت بند رہتی تھیں، علالت کی اسی کیفیت میں حضرت مولانا اسعد مدنی مدظلہٗ عیادت کے لیے خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی آہٹ محسوس ہوتے ہی آنکھیں کھول دیں، گویا ان کے انتظار میں تھے اور اشارے سے اپنے قریب بلاکر کچھ دیر نہایت دھیمی آواز میں باتیں بھی کیں، اور صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد کو بلاکر فرمایا کہ مولانا کو گھر لے جاکر ناشتہ کرادیں، حضرت مولانا کی یہی آخری گفتگو تھی، اس کے بعد آپ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔

تلامذہ اوراولاد:

مولانا نے کم وبیش تیس چالیس سال تک مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس مدت میں کتنے لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا ان کی مکمل تعداد سے واقفیت نہیں، البتہ چند مشاہیر علماء، جن کو حضرت محدث عصر سے شرف تلمذ حاصل ہے ان کے اسماء یہ ہیں:

(۱) مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ (۲) مولانا محفوظ الرحمٰن نامی رحمۃ اللہ علیہ (۳) مولانا محمد حسین بہاری مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند (۴) مولانا عبدالستار معروفی سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۵) مولانا عبدالجبار اعظمی مدظلہٗ شیخ الحدیث مظہر العلوم بنارس (۶) مولانا ضیاء الحسن مئوی سابق شیخ الحدیث ندوہ (۷) مولانا سعید الرحمٰن اعظمی استاذ ادب ندوہ لکھنؤ (۸) مولانا ظفیر الدین مفتاحی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند (۹) صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد مفتاحی (۱۰) مولانا عبدالرشید مئوی مرحوم سابق صدر مدرس مفتاح العلوم۔

علمائے بلاد عربیہ جنھوں نے آپ سے سند حدیث اور اجازت روایت حاصل کی ان کی فہرست پہلے آچکی ہے۔

حضرت محدث اعظمی کے سوانح اور ان کے علوم ومعارف اور علمی کمالات وخدمات کا یہ ایک مختصر اور ہلکا سا تعارف ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس بحر بے کراں کے علمی ودینی جواہر پاروں کو سمیٹنے کے لیے ایک نہیں بہت سارے دفاتر درکار ہیں، لاریب کہ وہ برصغیر میں علم کا ایک بیش بہا خزانہ تھے، واحسرتاہ کہ ہم اس خزانہ خوبی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(ماہنامہ دارالعلوم اپریل ومئی ۱۹۹۲ء)

محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مرحوم

مولانا محمود الازہار ندوی ☆

ممتاز عالم دین اور محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کا ۱۱؍رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۷؍مارچ ۱۹۹۲ء کو انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی علم حدیث اور فن اسماء الرجال کے ممتاز عالم تھے، درس وتدریس اور فن حدیث سے آپ کا انہاک مستقل رہا ہے اور آپ کی تحریریں اور مراجعات بڑی اہمیت کے مالک تھے اور اہل علم بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مولانا کا شمار فن حدیث اور اسماء الرجال کے چوٹی کے علما میں ہوتا تھا، جس کی گواہی آپ کی علمی کاوشیں دیتی ہیں۔

مولانا کی ولادت ۱۳۱۹ھ میں ہوئی، آپ کے والد کا نام مولانا محمد صابر تھا اور آپ نے دارالعلوم دیوبند میں کچھ وقت گذارا۔

آپ کے اساتذہ میں مولانا انور شاہ کشمیری، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا کریم بخش سنبھلی اور مولانا عبدالغفار صاحب مئوی قابل ذکر ہیں۔

آپ نے ۱۳۲۹ھ میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اور اسی سال سے دارالعلوم مئو میں تعلیمی خدمات انجام دینا شروع کردیں، دو تین سال کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس چلے گئے اور وہاں علوم نقلیہ وعقلیہ کی تعلیم دی، اس کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم از سر نو قائم کیا اور اس سے پوری طرح وابستہ ہو گئے، آپ نے تدریسی خدمات ہی کے تحت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آکر بخاری شریف کا درس دیا۔

مولانا فن حدیث میں امام طحاوی کی تصنیفات سے سب سے زیادہ متاثر تھے اور حافظ ابن حجر عسقلانی کا بھی اثر تھا اور فقہ میں ابن ہمام اور شامی کی تدقیقات کے قائل تھے۔

آپ نے حج وزیارت کے ساتھ علمی تلاش وجستجو کے سلسلہ میں کویت، بیروت، دمشق اور بحرین کا بھی سفر کیا، ان اسفار میں ان کے ہمراہ مولانا ضیاء الحسن ندوی مرحوم تھے، جن کا اشتغال بھی حدیث سے بہت بڑھا ہوا تھا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔

☆ دارالعلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مولانا کا شماران محققین وعلماء میں تھا، جن کے علم وفضل کا سکہ دنیا پر بیٹھا ہوا تھا۔ان کی شہرت وعظمت کی بنیاد فن حدیث کی وہ اہم اور نادر کتابیں ہیں، جن کے مخطوطات کو آپ نے تحقیق وترتیب کے موجودہ علمی اصول کے مطابق ایڈٹ کر کے شائع کیا، ان میں مسند حمیدی (دو جلد) کتاب الزہد والرقائق جو گیارہ اجزاء ۱۶۲۷ حدیثوں پر مشتمل ہے، سنن سعدی بن منصور دو جلدیں، المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیۃ للحافظ ابن حجر عسقلانی۔

مصنف عبدالرزاق، مسند احمد کے علاوہ آپ نے زوائد مسند بزار للہیثمی، علامہ محمد طاہر گجراتی صاحب مجمع البحار کا فن رجال سے متعلق رسالہ التوسل، تعلیقات کتاب الثقات لابن شاہین، الاتحافات السنیہ بذکر محدثی الحنفیہ، اور الحاوی لرجال الطحاوی وغیرہ کی بھی تحقیق مراجعت کی۔ مولانا نے علمی وتحقیقی مقالات بھی تحریر فرمائے جو معارف اعظم گڈھ، برہان دہلی، دارالعلوم دیوبند، العدل گجرانوالہ، الفرقان بریلی اور لکھنؤ، البلاغ بمبئی، اور النجم لکھنؤ میں شائع ہوئے۔آپ عربی زبان وادب میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے، عربی مقالات منجملہ دیگر رسائل وکتب کے البعث الاسلامی میں بھی شائع ہوئے۔

مولانا نے منکرین حدیث کی رد میں نصرۃ الحدیث، شیعوں کے رد میں دفع المجادلۃ اور رد رضاخانیت میں شارع حقیقی اور النذر لاولیاء اللہ بھی لکھے۔اس کے علاوہ مولانا نے متعدد رسالے تحریر فرمائے جو ان کی علمی اشتغال پر دال ہیں۔

مولانا نے ایک طویل عمر پائی، مگر اس کو علمی اور تحقیقی کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ دارالعلوم مئو، مظہر العلوم بنارس میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اپنے رفیق کار مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی مرحوم اور مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مرحوم کے ساتھ مل کر مفتاح العلوم میں بڑا وقت گذارا اور عرصہ دراز تک تدریسی خدمات اعزازی طور پر انجام دیتے رہے۔ مولانا ۱۹۵۲ء میں اتر پردیش کونسل (ودھان پریشد) کے پانچ سال تک ممبر رہے اور آپ کی علمی اور تحقیقی خدمات کی وجہ سے حکومت ہند نے آپ کو صدارتی انعام سے نوزا۔

مولانا نے اپنی عمر کے آخری ایام میں مدارس دینیہ سے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے حدیث، فقہ میں اختصاص کے لیے المعہد العالی قائم کیا اور ثانوی ومتوسط درجہ کے طلبہ کے لیے مرقاۃ العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔

مولانا کے پس ماندگان میں دو لڑکے اور چار بیٹیاں ہیں، اس کے علاوہ آپ کے غم گساروں میں شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے اور آپ پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، آمین۔

امام العصر مولانا الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ
اور ان کے علمی شاہکار

ڈاکٹر عبدالمعید بڑسراوی ☆

مولانا الاعظمی کا علم وفضل اور اسلامی دنیا میں ان کا مقام ومرتبہ کیا تھا؟ آپ کے معاصرین اور اکابر علماء آپ کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے، درج ذیل اقتباسات سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

مشہور مصنف مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''الشیخ الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ان محققین علماء میں سے ہیں جو اگر چہ اپنے وطن میں ''غریب شہر'' ہیں لیکن عرب ممالک میں ان کے علم وفضل وشہرت وعظمت کا طوطی بولتا ہے، اور اس شہرت وعظمت کی بنیاد حدیث کی وہ نادر اور اہم کتابیں ہیں جن کے مخطوطات کو آپ نے تحقیق وترتیب کے موجودہ علمی اصول کے مطابق ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے''۔ (۱)

مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی علمی خدمات کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

''ہندوستان کے خادمانِ حدیث اور ماہرین علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست ہی تیار کی جائے تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن (مئو ضلع اعظم گڈھ) کا ہوگا''۔ (۲)

بقیۃ السلف مولانا محمد منظور نعمانی کا رسالہ الفرقان لکھتا ہے:

''حضرت محدث اعظمی نور اللہ مرقدہٗ عالم اسلام میں ''امام حدیث'' اور ''کبیر المحدثین'' جیسے الفاظ سے یاد کئے جاتے ہیں''۔ (۳)

آپ نے چٹائیوں پر تنہا وہ کام انجام دیا جس کو بڑے بڑے علمی ادارے اور اکیڈمیاں بھی

☆ دارالعلوم روڈ مئو

(۱) برہان، دہلی: اپریل ۱۹۷۴ء ص ۲۸۷

(۲) صدق جدید لکھنؤ: شمارہ ۲، اگست ۱۹۶۸ء ص ۴

(۳) الفرقان: ص ۴۶/ اپریل ۱۹۹۲ یادرفتگاں

نہیں کرسکیں اور وہ بھی حسبۃ للہ، نہ کتابوں کی کوئی رائلٹی لی اور نہ کوئی معاوضہ، مصنف عبدالرزاق جب بیروت میں طبع ہورہی تھی تو وہاں کے ایک دوسرے مکتبہ کے ذمہ دار نے فون پر حضرت نوراللہ مرقدہ سے پوچھا کہ آپ کو اس کی کتنی رائلٹی مل رہی ہے۔ حضرتؒ نے جواب دیا کہ کچھ بھی نہیں۔ جب کہ مصنف عبدالرزاق گیارہ جلدوں میں چھپی ہے اور اس کی ایک جلد کی رائلٹی کی رقم لاکھوں روپئے سے متجاوز تھی۔ اس پر وہ صاحب مبہوت اور حیرت زدہ رہ گئے۔ آپ کے اسی اخلاص کی وجہ سے آپ کی اس خدمت کی قدر دانی بارگاہ رسالت میں بھی فرمائی گئی اور اس سے بڑا کوئی شرف نہیں ہوسکتا۔ حضرت مولانا صوفی نصرت علی صاحب رحمۃ اللہ جو حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ کے اجل خلفاء میں تھے، انھوں نے انتقال سے کچھ دیر پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں یہ فرماتے ہوئے دیکھا کہ۔

''حبیب الرحمٰن سے میرا اسلام کہہ دیجئے اور کہہ دیجئے کہ وہ جس کام میں لگے ہیں لگے رہیں۔''

حضرت محدث اعظمی نوراللہ مرقدہ بھی اس وقت گورکھپور میں ہی تشریف فرما تھے، صوفی صاحبؒ کی نماز جنازہ ان کی وصیت کے مطابق آپ ہی نے پڑھائی۔

مندرجہ بالا خواب سے حضرت نوراللہ مرقدہ کے مقام ومرتبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

دینی وعلمی کارنامے:

آپ نے اب تک جتنی بھی علمی خدمات انجام دی ہیں، ان کو مختصراً تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱- علمی وتحقیقی مقالات جو معارف اعظم گڈھ، برہان دہلی، دارالعلوم دیوبند، العدل گوجرانوالہ، الفرقان بریلی ولکھنؤ، البلاغ بمبئی اور النجم لکھنؤ میں شائع ہوئے۔

ان مقالات اور معرکۃ الاراء مضامین کی فہرست بھی مرتب کرنی دشوار ہے۔

۲- علمی خدمات کی دوسری قسم ان تالیفات کی ہے جن میں آپ نے مخالفین کا رد کیا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ردفتنہ انکار حدیث:

۱- نصرۃ الحدیث (منکرین حدیث کے رد میں) نہایت ہی مدلل اور عالیشان کتاب ہے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں اپنے ضعف اور عذر سے خود شرمندہ ہدیہ بسر وچشم قبول کرتا ہوں اور دعائے نافعیت کرتا ہوں۔ جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا''۔(۱)

علامہ اعظمی کی نصرۃ الحدیث پہلی بار شعبۂ تصنیف وتالیف مفتاح العلوم مئو سے حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمام میں شائع ہوئی۔ آپ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کا تذکرہ فرمایا تھا:

''مدرسہ کے شعبہ تصنیف وتالیف کی طرف سے بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن نصرۃ الحدیث کو ایک خاص خصوصیت وامتیاز حاصل ہے، مضامین کی بلندی، استدلال کی چستی، عبارت کی شگفتگی، حسن ادا یہ چیزیں ہیں جس نے رسالہ کو بہت بلند پایہ بنادیا ہے''۔(۲)

یہ کتاب جب حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی نظر سے گذری تو انھوں نے مولانا ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس خط لکھا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

''اگر اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے والا ہو تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس پر ایک مقدمہ لکھوں، اس کتاب کی اہمیت کو میں سمجھتا ہوں، نہ معلوم کتنے ہزار صفحات کے مطالعہ کے بعد مصنف نے اس کتاب کو لکھا ہوگا۔ مقدمہ لکھنا میں اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہوں''۔

یہ اس لئے کہ اس کے کچھ ہی دن پہلے مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''تدوین حدیث'' شائع ہوئی تھی۔ لہٰذا مولانا گیلانی کے دل میں اس کی اہمیت کا ہونا ظاہر ہے۔(۳)

ردشیعیت:

۲- دفع المجادلہ:- آیت مباہلہ کی تفسیر اور بیان، شانِ نزول میں شیعوں کی ژاژ خائیوں کا

---

(۱) نصرۃ الحدیث تأثر وتبصرہ، طبع سوم (۲) اہل دل کی دل آویز باتیں ص ۳۲
(۳) بروایت مولوی محمد عاصم

دنداں شکن جواب دیا گیا ہے۔

۳- ارشاد الثقلین:- خلفائے ثلاثہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان اتحاد باہمی کا نا قابل انکار ثبوت اور شیعوں کے غلط پروپیگنڈے کی تردید خود شیعوں کی کتابوں سے کی گئی ہے۔

۴-تنبیہ الکاذبین:

مندرجہ بالا تمام کتابیں امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھنوی کی فرمائش پر لکھی گئی ہیں۔

۵-ابطال عزاداری:- یہ رسالہ تاریخ عزاداری علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔

۶-تعزیہ داری اور دیگر مراسم عزاداری پر سنی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ردرضا خانیت:

۷-شارع حقیقی:- اس مسئلہ کی مفصل اور نہایت محققانہ بحث ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنا خدا کے اختیار میں ہے۔

۸-احکام النذر للاولیاء اللہ:- آیت ما اُہل بہ لغیر اللہ کی صحیح تفسیر اور اولیاء اللہ کے لیے جو نذریں مانی جاتی ہیں ان کی قسمیں اور احکام سے بحث کی گئی ہے۔

ردغیر مقلدین:

۹-تحقیق اہل حدیث:- مولانا موصوف کی تصانیف کی فہرست میں یہ نام ہے، لیکن اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔ اس لیے اس کے تعارف سے مجبور ہوں۔

۱۰- رکعات تراویح:- یہ کتاب رکعت تراویح کے باب میں حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ خالص علمی اور تحقیقی انداز میں رکعات کی تعداد اور رجال و رواۃ پر محدثانہ بحث نے محدثین کے طرز کلام کی یاد تازہ کر دی ہے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عامر عثمانی رقمطراز ہیں:

''مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی دقیق اور نازک نکات فن کو بھی اس سلاست و بلاغت کے ساتھ سپرد قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی کے بغیر بات آئینہ ہو جاتی ہے، ان کی قوت

حافظہ کا تو ہمیں علم نہیں لیکن ان کے رشحات قلم میں فراست کا جونور، جو گیرائی، جو عبور اور جو کامل دست رس پائی جاتی ہے، اس سے خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، وہی روشن دراست، وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت اور وہی شان نقد ہے''(۱)

آگے تحریر فرماتے ہیں:

''امام عصر مولانا اعظمی کی تالیف ''رکعات تراویح'' ایک بیش بہا کتاب ہے، ٹھوس اور گہرا علم رکھنے والے-بشرطیکہ علم کو سہارنے والا مضبوط دماغ بھی ان کے پاس ہو-انشاء اللہ یہی کہیں گے کہ مولانا اعظمی نے مسلک حنفی کے احقاق کا حق ادا کر دیا ہے''۔(۲)

۱۱-رکعات تراویح مذیل بردانوار مصابیح:-اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ ماہر القادری رقمطراز ہیں:

''اس کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حنفی مسلک میں تفقہ فی الدین کی کتنی عمیق بصیرت، نزاکت اور باریکیاں پائی جاتی ہیں''۔(۳)

۱۲-اعلام مرفوعہ:- اس کتاب میں ایک مجلس میں تین طلاق کے باب میں موافق اور مخالف دلائل پر محققانہ تبصرہ ہے، نیز احادیث اور آثار کی روشنی میں وقوع طلاق ثلاثہ پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ثابت کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ قابل توجہ ہے، جو ایک معتبر راوی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ:

''حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین میں مسلم شریف کا درس دیتے وقت جب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث آتی جسے غیر مقلدین حضرات ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک طلاق ثابت کرنے کے لیے بطور دلیل پیش کرتے ہیں، تو علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''اس حدیث کی بہترین توضیح اور تشریح کے لیے مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی کی اعلام مرفوعہ دیکھو، اس سے بہتر توضیح کسی نے نہیں کی، یا یہ فرمایا کہ اس سے بہتر توضیح میں بھی نہیں کر سکتا''۔(۴)

---

(۱) تجلی دیو بند: ص ۵۵/ اکتوبر ۱۹۶۳ء (۲) تجلی دیو بند: ص ۵۶/ اکتوبر ۱۹۶۳ء
(۳) فاران: جنوری ۱۹۶۳ء (۴) بروایت مولوی عبدالغفور و مولوی محمد عاصم

اس کے علاوہ مستقل طور پر حضرت مولانا نے وقوع طلاق ثلاثہ کے موضوع پر صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین کے فتاوے آج سے ۵ سال قبل کلکتہ میں قیام کے دوران جمع فرمایا ہے جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ (۱)

۱۳-الازہار المربوعہ:- مندرجہ بالا موضوع پر نہایت جامع (مبسوط رسالہ ہے ضمناً اصول حدیث کے بہت سے مسائل کی تشریح بھی کی گئی ہے، جو قابل دید ہے۔

۱۴-التنقید السدید علی التفسیر الجدید:- خواجہ عبدالحی پروفیسر جامعہ ملیہ کی تفسیر پر ناقدانہ تبصرہ ہے اور اس کے ضمن میں آدم علیہ السلام کی جنت، حیلہ شرعی اور تقلید وغیرہ مسائل کی نہایت عمدہ بحث بھی کی گئی ہے۔

اس کتاب پر حضرت تھانوی قدس سرہ نے مندرجہ ذیل تقریظ رقم فرمائی ہے۔

احقر اشرف علی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایتِ شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا۔ **قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم يَحْمِلُ هذا العِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُه يَنْفُونَ عَنْه تَحْرِيفَ الغَالِينَ وَانتِحَالَ المُبْطِلِيْنَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِينَ (مشکوٰۃ عن البیھقی)**

ماشاء اللہ قوت استدلال، حسن ادا، دفع شبہات، لین کلام غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

بارک اللّٰہ تعالی فی افادات المصنف وافاضاتہ

۲۴ر صفر ۴۹ (۱۳) ھ، تھانہ بھون، **وقا اللّٰہ تعالیٰ عن الفتن.**

اس کے علاوہ اردو میں مندرجہ ذیل کتابیں بھی ہیں جو مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔

۱۵-اہل دل کی دلآویز باتیں:- تصوف کے موضوع پر بہترین کتاب ہے، دوحصوں میں طبع ہوئی ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود نہایت ہی جامع ہے۔ اس کے متعلق حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

(۱) یہ فتاویٰ ''اعلام مرفوعہ'' کے تیسرے ایڈیشن ۱۴۲۰ھ=۱۹۹۹ء میں اس کے آخر میں شائع کر دیے گئے ہیں (مسعود احمد الاعظمی)

رسالہ کی زیارت سے دل خوش ہوا۔ اللہ تعالی طالبین علم وعمل کے لیے نافع فرمائے وسیفعل انشاء اللّٰہ تعالی طالب علموں اور مبتدیان طریق کے لیے بہت مفید ہے۔ (۱)

۱۶-اعیان الحجاج (۲ جلدوں میں):- اکابرامت اور شاہانِ اسلام کے حج کے دلچسپ واقعات اوران کی زندگی کے پاکیزہ حالات اورزریں اقوال کا دلگداز مجموعہ ہے۔اردو میں اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اس کتاب کے متعلق رقمطراز ہیں:

''ضرورت تھی کہ کوئی صاحب نظر عالم اور مؤرخ ومحدث دوسرے موضوع پر قلم اٹھاتا اور تاریخ اسلام کے اکابر ومشاہیراورسلف صالحین کے واقعات حج جمع کردیتا۔

شکراورمسرت کا مقام ہے کہ فاضل گرامی محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اس سلسلہ کوشروع کیا اورایک نہایت مفید اور وقیع کتاب تیارفرمادی، ان واقعات کے ساتھ اپنے محدثانہ ومؤرخانہ ذوق کی بنا پر مفید معلومات اور تاریخی وعلمی واقعات کوبھی ضمناً ذکرفرمادیا...... یہ ضمنی معلومات اورتاریخی واقعات خودایک بڑاعلمی سرمایہ وذخیرہ ہیں اورجن لوگوں کواللہ تعالی نے علمی ذوق اورتاریخی نظرعطافرمائی ہے وہ ان کی افادیت اورعلمی قدر وقیمت کااندازہ کرسکتے ہیں۔'' (۲)

۱۷-رہبرحجاج:- اس کتاب پرتبصرہ کرتے ہوئے رسالہ معارف لکھتا ہے:

''حج کے موضوع پربکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں،ان میں یہ رسالہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے،اس میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے حج کے مسائل بہت اچھے اورآسان انداز میں بیان کیے ہیں۔ حج وزیارت کے سلسلہ میں بعض غیر شرعی اور مروجہ رسموں پر بھی مولانا نے حرف گیری کی ہے اوراختصار کے باوجود بعض مسائل پر عالمانہ بحث بھی کی ہے۔ خاص طور پرعصر وفجر کے بعد طواف کی دورکعتوں پر بڑی مدلل بحث کی ہے،مختصر ہونے کی وجہ سے اس سے فائدہ اٹھانا آسان ہے۔'' (۳)

---

(۱) اہل دل کی دلآویز باتیں: ص۲ (۲) اعیان الحجاج جلداول ص۸ پیش لفظ وتعارف

(۳) معارف اعظم گڈھ بابت ماہ اپریل ۱۹۶۳ء

۱۸-دست کار اہل شرف:- اس کتاب میں دست کاری کو ذریعہ معاش بنانے کے باب میں جو فضیلت اور تاکید احادیث میں بیان ہوئی ہے اس کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد امت کے جو اکابر اور نامور شخصیتیں بُنائی کے کام سے وابستہ تھیں اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں کتاب کے آخر میں (کفو) کے ایک اہم مسئلہ کی تحقیق بھی آ گئی ہے جو قابل دید ہے۔[1]

۱۹-عظمت صحابہ رضی اللہ عنہم (غیر مطبوعہ):- اس کتاب کا مسودہ مولانا عبدالباسط بنارسی کے پاس ہے جو حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ سے چھپوانے کی غرض سے مانگ کر لے گئے تھے، اب معلوم نہیں کہ وہ کس مرحلہ میں ہے۔[2]

اردو کتابوں کے تذکرہ میں دارالعلوم کے روداد سے چند باتیں نقل کرتا ہوں جس سے حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

مرتب روداد دارالعلوم مئو تحریر فرماتے ہیں:

''تصنیف و تالیف کے میدان میں دارالعلوم کا قدم اگر چہ پیچھے ہے، لیکن دارالعلوم نے اس خدمت کو بالکل نظر انداز نہیں کیا ہے، بلکہ اس میدان میں بھی زور آزمائی کی ہے اور اپنے جوہر دکھائے ہیں، چنانچہ جناب مولوی ابوالمآثر حبیب الرحمٰن صاحب مدرس مدرسہ دارالعلوم جو بحالت عدم موجودگی صدر مدرس صاحب صیغۂ تعلیم کے نگراں و ذمہ دار ہیں، جنھوں نے اسی مدرسہ میں تکمیل بھی کی ہے، حسب ذیل رسائل تالیف کر چکے ہیں:

الحجج القوية، السير الحثيث، التوصية باسرار التسمية (عربی) حدر اللثام عن وجه القراءة خلف الامام، معجزات و کرامات، اسلام اور صنف نازک، کشف المعضلات فی رد حل المغلقات، القول المختار فی التزيي بزي الكفار، الروض المجود فی تقديم الركبتين عند السجود، توطين الجائشة بشرح النباء بعائشة. تذكرة أدباء الهند (عربی) الاتحاف السنية بذكر محدثي الحنفية (عربی) وغیرہ جو بہت ضخیم اور عظیم المنفعت اور بعید

(۱) دیکھئے ص ۱۱۸-۱۱۷ (۲) اب یہ کتاب چھپ کر شائع ہوگئی ہے (مسعود احمد)

المرتبت ہے، اخیر کی دونوں کتابیں ہنوز زیر تالیف ہیں۔ (۱)

مندرجہ بالا کتابیں صرف ۲۳ سال کی عمر میں تالیف فرمائی جا چکی تھیں۔

....

۳-تیسری علمی خدمات کی تفصیل میں ان نایاب ونادر عربی قلمی کتابوں کی اشاعت ہے جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے فن حدیث کی امہات میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں، ان قلمی کتابوں کی نفس اشاعت ہی خود ایک علمی خدمت تھی، مگر محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف اسی پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ ان قلمی نسخوں کی نہایت دیدہ ریزی سے تصحیح اور ان کو ضروری اور بے حد مفید حواشی اور محققانہ تعلیقات سے آراستہ بھی کیا ہے، جس کا فن کے محققین نے نہایت کشادہ دلی سے اعتراف بھی کیا ہے۔ آپ اپنی اسی خدمت کی وجہ سے عالم اسلام میں امام حدیث اور کبیر المحدثین جیسے القاب سے یاد کیے گئے، مئو جیسی چھوٹی جگہ میں گوشۂ تنہائی میں اخلاص سے اپنے کام میں مشغول رہے، لیکن حق تعالی نے وہ مقبولیت عطا فرمائی کہ شیخ العرب والعجم ہو گئے ع

میں تو نام ونشاں مٹا بیٹھا شہرہ میرا اڑا دیا کس نے

ان کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱-مسند حمیدی:

صحیح بخاری کا مأخذ ہے، امام حمیدی امام بخاری کے استاذ ہیں۔

قاضی اطہر مبارک پوری اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''امام بخاری اپنے استاذ کی ثقاہت وعدالت پر اس درجہ اعتماد رکھتے تھے کہ جب امام حمیدی سے ان کو کوئی حدیث پہنچتی تو پھر کسی دوسرے سے اس کی روایت کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ حمیدی حدیث کے امام ہیں، ان کی جلالتِ شان کے لیے یہی کافی ہے کہ امام ابن عیینہ کی مجلس میں وہ اور امام شافعی ایک ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔'' (۲)

مسند حمیدی کو ان کے معتمد تلامذہ نے ان سے روایت کی ہے، جن میں بشر بن موسیٰ اسدی متوفی ۲۸۸ھ زیادہ مشہور ہیں، دوسرے راوی ابو اسماعیل سلمی متوفی ۲۸۰ھ ہیں، ان دونوں حضرات کے

---

(۱) روداد دار العلوم مئو ۱۳۳۶ھ سے ۱۳۴۲ھ ص ۱۸-۱۷

(۲) مآثر ومعارف ص ۲۰۴

علاوہ بقول ابن حجر ''غیر واحد'' نے حمیدی سے روایت کی ہے، مگر آج دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مسند حمیدی کا جو مخطوطہ وہ صرف بشر بن موسیٰ کی روایت کا ہے اور اسی نسخہ کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے مرتب اور مدون فرمایا، اور مجلس علمی ڈابھیل نے ۱۳۸۲ھ و ۱۳۸۳ھ (۱۹۶۳ء) میں پہلی بار شائع کیا۔ مولانا کو اس کے چار قلمی نسخے مل سکے تھے۔ ایک کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں جو ۱۳۲۴ھ کا مکتوبہ تھا۔ دوسرا کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں جو ۱۱۳۱ھ میں لکھا گیا تھا۔ تیسرا کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں جو ۱۱۵۹ھ سے پہلے کا مکتوبہ تھا، کیونکہ اس پر ۱۱۵۹ پھر ۱۲۹۵ میں کسی کی ملکیت میں آنے کی تاریخ تحریر ہے، اور چوتھا دارالکتب الظاہریہ دمشق میں جو مائکروفلم کے ذریعہ طباعت کے دوران ملا اور مولانا نے اس سے بھی استفادہ کیا، ویسے دیوبندی اور سعیدی نسخوں کو اصل قرار دے کر کتاب کی تصحیح وتعلیق کی ہے۔(۱)

مولانا نے اس کتاب کی تصحیح ہی نہیں کی ہے، بلکہ اس کی احادیث کی تخریج بھی کی ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ اس کی احادیث بعد کی کتب احادیث میں کن کن کتابوں میں کہاں موجود ہیں، کن طرق سے آئی ہیں اور ان میں کیا اختلاف ہے، اس طرح کی تخریج کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب کے دیکھنے سے ایک حدیث کے بارے میں بہت سی معلومات ہوجاتی ہیں، یہ کام بڑا دقت طلب ہے۔ ساتھ ہی جہاں ضرورت محسوس ہوئی حدیث کے غریب الفاظ کی شرح وتوضیح بھی کردی ہے۔ ابتداء میں ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی ترتیب وار فہرست ہے جس کی مسانید اس کتاب میں موجود ہیں۔ پھر فقہی ترتیب پر احادیث کی فہرست بڑی عرق ریزی سے مرتب کی گئی ہے، اور مختلف مسانید کی احادیث کو ایک باب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اعلام وامکنہ کی فہرست ہے پھر پُر مغز مقدمہ ہے، جس میں امام حمیدی اور مسند حمیدی کے رواۃ کے حالات وغیرہ درج ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اس نادر ونایاب کتاب کی تعلیق وتحقیق اور تصحیح میں موجودہ طرز اور اس کی آسانیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے(۲)۔

۲-مجمع بحارالانوار:

محدث طاہر پٹنی کی کتاب ہے۔ حضرت محدث اعظمی تحریر فرماتے ہیں۔

(۱) مآثر ومعارف ص ۲۰۵، ۲۰۶ (۲) مآثر ومعارف ص ۲۰۷، ۲۰۸

بظاہر لغت حدیث کی کتاب ہے، مگر درحقیقت اس کو پوری صحاح ستہ کی شرح وتوضیح کہنا چاہئے[۱]۔

اس حقیر نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے اور بڑی حد تک تصحیح بھی کی ہے[۲]۔

۳-التوسل:

(تلخیص خواتم جامع الاصول) علامہ محمد طاہر محدث پٹنی گجراتی کا فن رجال میں ایک رسالہ ہے۔ اس کے قلمی نسخہ کا فوٹو حاصل کرنے کے بعد اس کو نقل کرایا گیا ہے اور دوسرے قلمی نسخوں سے مقابلہ کے بعد اس کی تصحیح کی گئی ہے اور فن کی دوسری کتابوں بالخصوص اس رسالہ کے اصلی آخذ کی طرف مراجعت کر کے نقل شدہ نسخہ کو تعلیقات سے مزین کیا گیا ہے جو قابل دید ہے اور ہندوستان کے ایک نامور محدث کے علمی کارناموں کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی کتاب ''تلخیص خواتم جامع الاصول'' کے نام سے ایک جلد میں مالیگاؤں سے شائع ہوئی ہے۔[۳]

۴-رسالۃ الاوائل:

شیخ سعید سنبل مکی رحمۃ اللہ نے حدیث کی ۴۳ کتابوں کی ایک ایک حدیث (عموماً پہلی حدیث) اپنی سند کے حوالہ سے اس رسالہ میں نقل کر دی ہے۔ محدثین یہ رسالہ کسی محدث کو سنا کر ان کتابوں کی سند لیا کرتے ہیں۔ یہ رسالہ محدث الاعظمی کی نظر ثانی اور تصحیح کے بعد ان کے مختصر نوٹ کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

۵-حیاۃ الصحابہ رضی اللہ عنہم (عربی):

امیر تبلیغ حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ کی تصنیف ہے۔ اس کی تعلیق موجودہ امیر تبلیغ مولانا انعام الحسن صاحب اور مولانا الیاس صاحب بارہ بنکوی نے کی ہے۔ وہ لوگ مسودہ لکھ کر حضرت محدث اعظمی کے پاس نظر ثانی کے لیے بھیجے تھے۔ نظر ثانی میں حضرت رحمۃ اللہ نے مندرجہ ذیل کام انجام دیئے ہیں۔

۱-تعلیقات کی تصحیح کی ہے۔

۲-عربی متون کی تصحیح کی ہے۔

۳-معانی کی توضیح اور مزید نئے تعلیقات سے آراستہ کیا ہے۔

---

(۱) اعیان الحجاج جلد دوم ص ۲۱۸ (۲) ایضاً ص ۲۱۹

(۳) ہندوستان میں عربی علوم وفنون کے ممتاز علماء ص ۱۴۲، ۱۴۳

۶-الالبانی شذوذہ وأخطاءہ:

اس کتاب میں شیخ ناصرالدین البانی شامی کے نظریات کی محققانہ تردید کی گئی ہے۔تردید ہی نہیں بلکہ یہ ایک مستقل علمی خزانہ ہے۔چار حصوں میں کئی سال قبل مالیگاؤں سے ارشد سلفی کے نام سے شائع ہوئی تھی،لیکن اب سے چار سال قبل بحرین کے شیخ نظام یعقوبی نے نہایت اہتمام سے شائع کرایا ہے۔[1] اور بجائے بقلم ارشد سلفی کے بقلم محدث الدیار الہندیۃ والعالم الاسلامی اس پر لکھا ہوا ہے۔محدث اعظمی کے نام سے چھپ جانے کے بعد سے عربوں میں اس کی اہمیت اور بڑھ گئی،چنانچہ مولانا بدرالحسن صاحب دربھنگوی سابق ایڈیٹر الداعی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا کے پاس ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ یہاں کویت میں کتابوں کی نمائش لگی تھی جس میں آپ کی کتاب ''الألبانی شذوذہ و أخطاءہ'' بہت زیادہ تعداد میں فروخت ہوئی۔چنانچہ ابوظبی کے وزیر اوقات نے اپنے ایک اخباری بیان میں حضرت مولانا کی کتاب کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ شیخ البانی کے خیالات کی تردید میں شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی تصنیف الألبانی شذوذہ و أخطاءہ،کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

۷-کتاب الزہد والرقائق:

امام عبداللہ بن مبارک کی دوسری صدی ہجری کی تصنیف ہے۔اس کتاب کو حضرت محدث اعظمی نے ۱۳۸۶ھ میں تصحیح و تعلیق کے ساتھ طبع کرایا۔اس کتاب کی زیارت سے،بہت سے کبار اہل علم بھی محروم رہے۔علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''قدماء میں سے صرف ایک بزرگ امام عبداللہ بن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہم کو معلوم ہے،جنھوں نے کتاب الزہد والرقائق کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے مگر یہ ہیچ مداں اس کی زیارت سے محروم رہا ہے،اس لیے اس کی نسبت کچھ عرض نہیں کرسکتا''۔[2]

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہ معین الدین ندوی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

''زہد و رقاق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں دوسری صدی ہجری کے نامور محدث حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقاق سب سے قدیم اور اہم ہے۔یہ اب تک غیر مطبوعہ تھی۔اس

---

(۱) نظام یعقوبی نے نہیں،بلکہ شیخ یوسف ہاشم الرفاعی نے مکتبہ دارالعروبۃ (کویت) سے شائع کرایا ہے۔
(۲) آثر حکیم الامت:ص ۲۰۵ بحوالہ معارف ۱۹۴۴ء

کے قلمی نسخے دنیائے اسلام کے چند ہی کتب خانوں میں تھے۔ فاضل جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے - جو اس سے پہلے بھی حدیث کی بعض اہم کتابوں کو ایڈٹ کر چکے ہیں - اس کتاب کو مختلف نسخوں کی مدد سے مقابلہ وتصحیح وتحشیہ کے بعد شائع کیا ہے، شروع میں ایک جامع اور مبسوط مقدمہ ہے، اس میں زہد کی حقیقت، چھٹی صدی ہجری تک اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا تذکرہ، مصنف کتاب کے مفصل حالات، علمی ودینی کمالات کے علاوہ اس کتاب کی اہمیت، اس کے تین مختلف نسخوں اور ان کے رواۃ کے مختصر ترجمے اور دوسرے مفید معلومات تحریر کئے گئے ہیں، حواشی وتعلیقات، اختلاف نسخ، آیتوں کے حوالے، رجال واسناد کی تحقیق، مشکل وغریب الفاظ کی تشریح، دوسری مشہور ومتداول کتابوں کی حدیثوں کی تخریج، اس کے مرویات کی ان سے مطابقت واختلاف ظاہر کر کے ان کی صحت وخطا کا فیصلہ کیا گیا ہے، پوری کتاب گیارہ اجزاء اور بروایت مروزی ۱۶۲۷ حدیثوں پر مشتمل ہے۔ فاضل مرتب نے دوسرے نسخے کے زیادت کو جن کی تعداد ۴۳۶ ہے اور نعیم بن حماد سے مروی ہے، آخر میں شامل کر دیا ہے۔ شروع میں تینوں نسخوں کے عکسی فوٹو اور ۲۰ صفحات میں مختلف فہرستیں دے کر استفادہ ومراجعت کو آسان کر دیا گیا ہے۔ غرض یہ کتاب تہذیب وتدوین، تہذیب وتحشیہ اور تحقیق وتعلیق کے جملہ لوازم سے آراستہ اور اہل علم کے لیے ایک نادر تحفہ اور موضوع ومطالب کے اعتبار سے اہل دل کی طمانینت وسکون کا سامان ہے''[۱]۔

شذرات کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''مرتب کی محنت اور تلاش وتحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔ اس کی کتابت، ترتیب واشاعت سے ایک مفید اور اہم دینی خدمت انجام پائی ہے، جس کے لیے فاضل مرتب اور ناشر دونوں اہل قلم کے شکریہ کے مستحق ہیں[۲]''۔

۸- فتح المغیث:

حافظ شمس الدین سخاوی (المتوفی ۹۰۲ھ) کی اصول حدیث میں یہ کتاب ہے۔ محدث اعظمی نے اس کی تصحیح کی ہے۔ تعلیقات بہت کم ہیں۔

---

(۱) معارف اگست ۱۹۶۷ء ص ۱۵۵، ۱۵۶ (۲) معارف مئی ۱۹۶۷ء ص ۳۲۴

۹-استدراک وتعقیب شرح مسند امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ:

اس کی تفصیل خود شارح مسند شیخ احمد محمد شاکر مصری (محدث وادی نیل) کی زبانی سنئے:

''اس کتاب کی تیسری جلد ص ۳۹۵ میں درخواست کی گئی تھی کہ اہل علم مسند احمد کی شرح اور تعلیق میں جو خامی رہ گئی ہے اس کی نشاندہی فرمائیں۔مگر اس سلسلہ میں دس سال بعد سب سے پہلا استدراک وتعقیب، ایک ہندوستانی عالم دین علامہ استاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی خادم الحدیث جامعہ مفتاح العلوم مئو ضلع اعظم گڈھ کی طرف سے موصول ہوا ہے، جن سے میری کوئی جان پہچان نہیں، مگر ان کی اس تحریر سے ان کے عمیق علم وفضل، وسیع مطالعہ اور دقیق بحث وتحقیق کا اندازہ ہوا۔ چنانچہ میں اس تحریر کو یہاں اس اقرار کے ساتھ شائع کر رہا ہوں کہ جو گرفت کی گئی ہے وہ درست اور یقیناً مولانا کا فضل وکمال مسلم ہے''[1]۔

۱۰-کتاب السنن سعید ابن منصور:

قاضی اطہر مبارک پوری اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''حضرت امام ابوعثمان سعید بن منصور خراسانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۲۷ھ) محدثین کرام کے طبقہ اول سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی کتاب السنن احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی سرمایہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ہمیشہ سے علماء اسلام میں مقبول ومتداول رہی ہے۔مگر حدیث کی بعض دوسری قدیم کتابوں کی طرح یہ بھی اب تک طبع ہوکر سامنے نہ آسکی تھی۔ اب محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآبادی ثم فرنساوی کی کوشش سے اس کی تیسری جلد ۱۳۸۰ھ میں ترکی کے کتب خانہ محمد پاشا کوبریلی سے دستیاب ہوئی ہے، اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی تعلیق وتصحیح کے ساتھ اس کی طباعت مجلسِ علمی ڈابھیل اور کراچی سے ہورہی ہے۔(۲ جلدوں میں شائع ہوگئی)

امام سعید بن منصور کی جلالت شان کے لیے کافی ہے کہ ایک طرف ان کے اساتذہ وشیوخ میں امام مالک، امام لیث بن سعد، امام سفیان ابن عیینہ اور امام حماد بن زید جیسے ائمہ حدیث ہیں، تو دوسری طرف ان کے حلقہ درس سے امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد جیسے ائمہ پیدا ہوئے، ان کی کتاب السنن کی شہرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی نسبت سے صاحب

(۱) مسند احمد شرح وتعلیق احمد شاکر ص ۲۵۱ ج ۱۵

السنن مشہور ہوئے، سنن پر ایسی کتاب بہت کم محدثین نے لکھی ہے، ہر موضوع پر احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم، آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کا جو سرمایہ اس کتاب میں ملتا ہے، اس کی مثال دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔ اس کی ضخامت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کی تیسری جلد کا جو ناقص نسخہ دستیاب ہوا ہے، وہ تعلیق وتحشیہ کے بعد تقریباً نو سو صفحات میں آیا اور طباعت کے بعد اس کی ضخامت بارہ سو صفحات ہوگی''[۱]۔

سنن سعید بن منصور کا موجودہ نسخہ:

یہ مخطوطہ نہایت خوشخط ہے، اس کی پشت پر مصنف ابن ابی شیبہ درج تھا مگر اندرونی شہادتوں سے پتہ چلا کہ یہ سنن بن منصور کا ٹکڑا ہے، اس جلد میں حسب ذیل ابواب وکتب ہیں:

(۱) بـاب الـحـث على تعليم الفرائض من كتاب الفرائض (۲) كتاب ولاية العصبة (۳) كتاب الوصايا (٤) كتاب النكاح (٥) كتاب الطلاق (٦) كتاب الجهاد.

یہ نسخہ ربیع الاول ۷۲۵ھ میں دمشق کے قریب عبادیہ نامی قریہ میں محمد بن احمد بن علی خطیب کے قلم سے لکھا گیا ہے۔

اس جلد میں اسلام کے شخصی قوانین اور عائلی زندگی کے بارے میں بہت سے ایسے واقعات اور احادیث اور آثا موجود ہیں جو حدیث کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتے۔ کتاب الجہاد میں عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے بین الاقوامی امور ومعاملات سے متعلق عہد نامے پائے جاتے ہیں، جن سے رومیوں اور ایرانیوں اور خلافت اسلامیہ کے تعلقات ومعاملات کی نوعیت پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

اس کے مکمل نسخہ کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے، صرف تیسری جلد کا ناقص نسخہ دستیاب ہوسکا ہے، جو انشاءاللہ پوری کتاب کے لیے مقدمۃ الجیش ہوگا[۲]۔

اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے محدث اعظمی کی بابت تحریر فرمایا ہے:

''حیرت ہوتی ہے ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہوگئی ہے''[۳]۔

(۱) مآثر ومعارف ص ۲۰۹، ۲۱۰ (۲) ماثر ومعارف ص ۲۲۰، ۲۲۱
(۳) صدق جدید لکھنؤ: ص ۴، ۲ر اگست ۱۹۶۸ء

۱۱-مختصر الترغیب والترہیب:

اول بار یہ کتاب ادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں سے چھپی ہے، اس کے بعد مکتبہ الغزالی، دمشق نے شائع کیا۔

یہ کتاب اصلاً حافظ منذری کی تصنیف ہے، جس کا اختصار نابغہ عصر حافظ ابن حجر نے کیا ہے۔
اس کتاب کے مخطوطہ کو ڈھونڈ نکالنے کی سعادت علامہ عصر، محدثِ زماں، محقق دوراں، مدقق جہاں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے حصہ میں آئی۔

آپ کو اس کا مخطوطہ بہرائچ میں حضرت مولانا نعیم اللہ بہرائچی خلیفہ برحق حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے متروکات سے حاصل ہوا، اس کا دوسرا نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ملا اور تیسرا نسخہ دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا۔

آپ نے دار العلوم دیوبند کے نسخہ کو اصل قرار دیتے ہوئے اس کتاب کی تصحیح وتعلیق کی ہے۔

شروع کتاب میں ایک جامع مقدمہ ہے جس میں احادیث ترغیب وترہیب کے جمع کرنے کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

۱۲- المطالب العالیة بزوائد المسانید الثمانیة:

یہ کتاب ۴ ضخیم مجلدات میں ہے، اسے حکومت کویت کی وزارت اوقاف وشؤن اسلامیہ نے نہایت اہتمام سے ادارہ التراث الاسلامی کی طرف سے شائع کیا ہے۔

کتاب کا تعارف:

مولانا سعید احمد اکبرآبادی تحریر فرماتے ہیں:

''احادیث کی جمع وتدوین کا دور ختم ہوجانے کے بعد اکابر محدثین مختلف حیثیتوں سے احادیث کے مجموعے مرتب کرتے رہے، جن میں سے بعض آج متداول ہیں اور ارباب علم ونظر ان سے واقف ہیں۔ اسی زنجیر طلائی کی ایک کڑی یہ کتاب ہے، اس میں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ نے ان احادیث کو ابواب فقہیہ کے مطابق مرتب کیا ہے جو صحاح ستہ میں اور مسند احمد میں نہیں ہیں اور آٹھ مسانید میں سے کسی میں موجود ہیں۔ ان مسانید کے نام یہ ہیں:

(۱) مسند طیالسی (۲) مسند حمیدی (۳) مسند ابن عمر (۴) مسند مسدد (۵) مسند ابن منیع (۶)

مسند ابن ابی شیبہ (۷) مسند عبد بن حمید (۸) مسند ابن ابی اسامہ۔

بعد میں حافظ ابن حجر نے مسند ابی یعلی اور مسند اسحاق بن راہویہ کا ان پر اور اضافہ کر دیا۔ اس طرح یہ کتاب درحقیقت دس مسانید کا نچوڑ ہے۔

یہ مجموعہ تین وجوہ سے نہایت اہم اور قیمتی تھا:

۱-اس کو حافظ ابن حجر جیسے حافظ حدیث اور محقق ونقاد نے مرتب کیا تھا۔

۲-اس مجموعہ کی احادیث ان مسانید سے ماخوذ تھیں جو اگرچہ مرتب کے زمانہ میں موجود اور ان کے پیش نظر تھیں، لیکن اب ان میں سے اکثر وبیشتر ناپید ہیں اور ان سے استفادہ براہ راست ممکن نہیں ہے۔

۳-یہ احادیث صحاح ستہ اور مسند احمد کے احادیث وروایات کے علاوہ ہیں، اور اس بناء پر متداول احکام فقہیہ پر اُن سے نئی اور مزید روشنی پڑتی ہے۔

مخطوطہ کی تلاش وجستجو:

اسی اہمیت کی بنا پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کو جنھیں نوادر مجموعہائے احادیث کی کھوج رہتی ہے، اس مخطوطہ کی تلاش وجستجو تھی۔ سعیدہ لائبریری، حیدرآباد میں ایک مخطوطہ تھا مگر وہ ناقص تھا۔ مدینہ منورہ کی لائبریری میں اس کا سُراغ لگا اور وہاں سے وہ مفقود تھا، آخر کار مَنْ جَدَّ وَجَدَ کے مطابق ترکی سے مولانا کو دو مخطوطوں کی فوٹو کاپیاں ملیں، ان میں ایک مجردہ تھی اور ایک مسندہ، یعنی ایک بغیر اسناد کے تھا اور دوسرا اسانید کے ساتھ۔ مگر دوسرا اغلاط اور تصحیفات سے پُر تھا۔ اس کے علاوہ اول تو اس کا خط اس قدر باریک تھا اور پھر فوٹو بھی صاف نہیں آیا تھا۔ اس بناء پر اس سے کما حقہ استفادہ سخت دشوار کام تھا۔ البتہ نسخہ مجردہ نسبتًہ زیادہ صاف اور واضح تھا۔

تحقیق وتعلیق:

اس بناء پر مولانا نے مجردہ کو بنیاد بنایا اور اس کی تحقیق وترتیب اور تعلیق وتحشیہ میں مصروف ہو گئے، اس سلسلہ میں آپ نے جو اہم کام انجام دیئے ہیں حسب ذیل ہیں:

۱-متن کی تصحیح اس طرح کی ہے کہ

(الف) جو لفظ نسخہ مجردہ میں غلط تھا مگر نسخہ مسندہ میں صحیح تھا اس کو متن میں جگہ دی ہے اور حاشیہ

میں اصل نسخہ کی نشاندہی کر دی ہے۔

(ب) جہاں دونوں نسخوں میں کوئی لفظ غلط یا بے معنی تھا، متن میں اس کی جگہ جو لفظ صحیح اور بامعنی ہوسکتا تھا وہ رکھا ہے اور اصلین میں جو غلط لفظ تھا، اسے حاشیہ میں لکھ دیا ہے، اس صحیح لفظ کا انتخاب کبھی تو اپنے ذوق سے کیا ہے اور کبھی ان کتابوں کی مدد سے کیا ہے جو اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً الحافظ الشہاب البوصیری کی مختصر اتحاف السادہ...... یا الہیثمی کی کتاب مجمع الزوائد اور جن کے ساتھ آپ کتاب کی احادیث کا مقابلہ وموازنہ کرتے گئے ہیں۔

(ج) کبھی یہ بھی کیا ہے کہ اصل نسخہ میں جو لفظ تھا اس کو متن میں جوں کا توں رہنے دیا ہے لیکن حاشیہ میں لکھ دیا ہے کہ خود آپ کی رائے میں اس لفظ کی جگہ یہ لفظ زیادہ قرین صواب تھا۔

۲- احادیث کے درجات متعین کیے ہیں، یہ نہایت اہم کام ہے اس کی قدر اہل فن ہی جان سکتے ہیں۔

۳- راویوں پر کلام کیا ہے۔

۴- جو الفاظ مغلق وغیر مشہور تھے ان کی لغوی تحقیق کی ہے۔

۵- اختلاف نسخ کا بالالتزام ذکر کیا ہے۔

یہ تعلیقات اس قدر کثرت سے ہیں کہ کوئی صفحہ ان سے خالی نہیں اور اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے تاریخی، ادبی اور فن حدیث وعلم اسانید ورجال سے متعلق معلومات کا بیش بہا گنجینہ ہے، جس کے باعث کتاب کی افادیت دوچند ہوگئی ہے جو مولانا کے غزارت علم اور وسعت ودقت نظر کی شاہد عدل ہیں۔ تعلیقات کے علاوہ شروع کتاب میں ایک مقدمہ بھی ہے جس میں حافظ ابن حجر کا مختصر مگر جامع ترجمہ ہے، اس کے بعد کتاب کا تعارف اور اس کے مخطوطات کا تذکرہ ہے، پھر مخطوطوں کے دونوں نسخوں کے بعض صفحات کے عکس ہیں، ان میں نسخہ مسندہ کا جو عکس ہے وہ اس قدر باریک اور گنجلک ہے کہ اس کو پڑھ لینا بجائے خود ایک بہت بڑا کمال ہے۔ علاوہ ازیں ہر جلد کے آخر میں مضامین کتاب کی اجمالی اور مفصل اور تحقیق وتعلیق میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کی فہرستیں بھی شامل ہیں۔ غرض کہ اہل علم اور ارباب ذوق کے لیے یہ تحفہ مفید اور نعمت غیر مترقبہ ہے۔ کتاب کی افادیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں کثرت سے ایسی احادیث بھی نظر آئیں جن کی روشنی میں

بعض فقہی مسائل پر از سر نو گفتگو یا ان پر نظر ثانی کی جاسکتی ہے، لیکن اس پر مستقل مقالہ کی ضرورت ہے(۱)۔

۱۴-استدراک حافظ قاسم بن قطلو بغا علی الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ:

علامہ زاہد کوثری (۲) نے منیۃ الالمعی کے مقدمہ میں آپ کو (محدث الاعظمی کو) علامہ نحریر والجہبذ الخبیر اور استاذ جلیل جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں منیۃ الالمعی کی طباعت میں کوشش کرنے کے لئے متردد تھا کہ میرے بجھے ہوئے ارادہ کو ایک عظیم خط نے جگا دیا۔ جامع مفتاح العلوم کے چانسلر اور صدر مدرس (اعظم گڈھ ہند) اپنے علوم میں ماہر اور باریکیوں کی خبر رکھنے والے، زبردست نقاد مولانا العلامہ ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی نے خبر دیتے ہوئے مجھ کو لکھا کہ نصب الرایہ کی تلخیص یعنی ابن حجر کی الدرایہ ان کے ہاتھ لگی ہے اور اس پر حافظ علامہ قاسم ابن قطلو بغا کی اپنے قلم سے بعض ایسے مواضع پر تعلیقات ہیں جہاں ابن حجر نے کہہ دیا ہے کہ: میں نے نہیں پایا۔ علامہ قاسم اس کے مخرج کا ذکر کرتے ہیں۔

اس خوش کن خبر سے میں خوشی سے جھوم گیا اور میں نے ابوالمآثر الاعظمی کو فوراً خط اس امید میں لکھا کہ کتاب مذکور سے ان مواقع کو نقل کر دیں۔ چنانچہ اپنی عادت کے مطابق انھوں نے جواب میں جلدی کی اور ان تعلقات کو اپنے قلم سے لکھ کر اس عاجز تک بھیجا۔ جس سے میری خوشی اور نشاط میں اضافہ ہوا۔ میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے کہ اس زبردست استاد کو خیر و عافیت کے ساتھ زیادہ دن تک باقی رکھے اور مسلمانوں کو ان کے علم نافع سے فائدہ پہنچائے اور ان کے اس فضل عظیم کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔(۳)

---

(۱) برہان دہلی، اپریل ۱۹۷۴ء ص ۲۸۰-۲۸۱

(۲) شیخ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ استنبول (ترکی) کے رہنے والے، فقہ حنفی کے بلند پایہ عالم اور وہاں کے شیخ الاسلام تھے، ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا کے زمانہ میں علماء اور دین پر جو مظالم ڈھائے گئے، اس کے نتیجہ میں شیخ زاہد کوثری کو پہلے پھانسی کا حکم سنایا گیا جو بعد میں جلاوطنی میں تبدیل کردی گئی، چنانچہ شیخ نے مصر میں قیام فرمایا...... انھیں شیخ زاہد کوثری سے علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم شریف کی شرح ''فتح الملہم'' پر تقریظ لکھوائی ہے۔ ظاہر ہے علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے شخص کا ان سے تقریظ لکھوانا معنی رکھتا ہے۔ محدث اعظمی علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، شاگرد کے متعلق استاذ کی نگاہ میں جو بڑی شخصیت ہو، اس کا علامہ نحریر والجہبذ الخبیر اور استاذ جلیل جیسے الفاظ سے یاد کرنا محدث اعظمی کے علو مرتبت اور جلالت علمی کا پتہ دیتی ہے جو قابل غور ہے۔

(۳) منیۃ الالمعی ص ۵-۶

۱۴-المصنف لعبدالرزاق:

امام بخاری کے شیخ کے شیخ محدث عبدالرزاق متوفی ۲۱۱ھ کی عظیم تصنیف ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ کی طرح بہت ہی حاوی اور جامع حدیث کا ایک مجموعہ ہے۔ جس میں احادیث مرفوعہ کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے فتاوے بھی بڑی تعداد میں مذکور ہیں۔ فقہ حنفی کے لیے ایک مفید ذخیرہ ہے، کئی صدیوں سے نایاب تھا، علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس کی طباعت کی تمنا کرتے تھے، محدث اعظمی نے کئی برسوں کی عرق ریزی کے بعد اس کو طباعت کے قابل بنایا۔ مجلس علمی نے بیروت میں معیاری طباعت سے آراستہ کرکے گیارہ جلدوں میں شائع کیا۔ ۱۳۹۰ھ سے ۱۳۹۲ھ تک میں طباعت مکمل ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے اسلامی کتب خانہ میں ایک قیمتی اضافہ ہوا۔ مجلس علمی کا یہ کارنامہ اور محدث جلیل کی یہ علمی خدمت اہل علم کو ہمیشہ یاد رہے گی۔ (۱)

حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ برابر فرماتے تھے کہ کاش میرے شاگردوں میں کوئی ایسا ہوتا جو مصنف عبدالرزاق کو ایڈٹ کرکے شائع کرتا تو اس کو میری دلی دعائیں ملتیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تمنا پوری ہوئی اور یہ عظیم سعادت ان کے شاگرد رشید اور جانشین حضرت محدث الاعظمی کے حصہ میں آئی، بلکہ یہ کہنا بالکل بے جانہ ہوگا کہ حضرت محدث اعظمیؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کی جانشینی کا حق ادا کردیا اور عرب ممالک میں اپنے استاذ سے زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل کی اور اپنی علمی جلالت وعظمت کا لوہا منوالیا۔ اسی بناء پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی (شاگرد حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا ہے کہ:

''میں آپ کو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حقیقی علمی جانشین سمجھتا ہوں''

۲- ڈاکٹر عبداللہ الجبوری (ریاض) نے حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے مولوی انور صاحب سے فرمایا کہ اگر شیخ الاعظمی کی اور کوئی تصنیف نہ بھی ہوتی تب بھی ان کی علمی جلالت کے لیے مصنف عبدالرزاق کی ۱۱ جلدیں کافی تھیں اور فرماتے تھے کہ **وَاللّٰہِ ھو مسند الھند.**

۳- مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکہ شریف میں مقیم تھے۔ حرم شریف میں حضرت محدث الاعظمی سے ملاقات ہوئی۔

(۱) تاریخ ڈابھیل ص ۲۴۴

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ حضرت محدث الاعظمی سے لپٹ کر رونے لگے اور دیر تک لپٹے رہے اور فرماتے رہے کہ آپ نے بہت بڑا کام انجام دیا اور اسلاف کا قرض اتار دیا۔

(بروایت مولوی محمد عاصم و مولوی عبدالغفور)

ایک عظیم علمی خدمت:

محمد بن سعد المتوفی ۲۳۰ھ (واقدی کے شاگرد اور کاتب) کی کتاب ''طبقات ابن سعد'' صحابہ اور تابعین کے حالات اور سوانح پر نہایت جامع اور مستند کتاب ہے، جرمنی کے پروفیسر سخاؤ (SACHAW) نے ایڈٹ کر کے اس کو بارہ جلدوں میں شائع کیا ہے، اس کے متعلق مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری نے اپنی کتاب ''اصح السیر'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ طبقات ابن سعد کو ایک...... مسلم نے ایڈٹ کر کے چھاپا ہے، اس لیے یہ ایڈیشن معتبر و مستند نہیں، کیونکہ اس میں ایڈیٹر نے کمی بیشی کر دی ہوگی۔ اس کے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی جو اس زمانہ کے نامور محقق اور محدث ہیں، میں نے ایک خط کے ذریعہ ان سے اس بارے میں استصواب کیا، تو مولانا نے فرمایا:

پروفیسر سخاؤ پر شبہہ اور بدگمانی بالکل بے جا ہے۔ میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوطہ کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے عدم مطابقت نہیں پائی۔[(۱)]

اس تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا اعظمی کتنی نگاہ دور رس رکھتے تھے، مستشرقین پر آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ ان کی بدباطنی سے ہر لمحہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ع

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اور جب طبقات ابن سعد چھپ کر آئی تو آپ نے مصروف ترین اوقات میں سے وقت نکال کر اتنی ضخیم کتاب جو دار صادر بیروت سے نو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کے اصل مخطوطے سے مقابلہ کر کے اطمینان حاصل کیا کہ اس میں کوئی قطع و برید نہیں کی گئی ہے۔ اگر مولانا اعظمی نے اکبر آبادی کو یہ چند جملے نہ لکھ دیئے ہوتے تو علمی دنیا کو اس کا علم بھی نہ ہوتا کہ اس کی جانچ اور پرکھ میں کتنی جاں سوز محنت کی گئی ہے۔

---

(۱) عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ ص ۲۴

۱۵-جزعمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تصنیف (حجۃ الوداع وعمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، جب یہ چھپی تو انھوں نے محدث الاعظمی کے پاس اس کا نسخہ بھیجا، حضرت محدث الاعظمی نے فرمایا کہ اس میں ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے، حجۃ الوداع کا خطبہ نہیں ہے، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کام کو آپ بہتر انجام دے سکتے ہیں، چنانچہ حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ حجۃ الوداع کو جمع کر دیا اور حضرت شیخ کی کتاب کے آخر میں جزء عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے طبع ہو گیا ہے۔

۱۶-کشف الاستار عن زوائد البزار:

یہ ہیثمی کی تصنیف ہے، اس کے مخطوطہ کو تصحیح، تعلیق وتحقیق کے بعد چار جلدوں میں بیروت سے طبع کرایا گیا ہے۔

۱۷-مصنف ابن ابی شیبہ:

مولانا عبدالباری ندوی (دارالمصنفین اعظم گڈھ) تحریر فرماتے ہیں:

''اس کتاب کا پورا نام'' ''الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار'' ہے اور مصنف کا نام الامام الحافظ عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان ابوبکر بن ابی شیبہ الکوفی العبسی المتوفی ۲۳۵ھ ہے۔[(۱)]

مولانا عبدالباری ندوی کے ایک خط کے جواب میں حضرت محدث الاعظمی تحریر فرماتے ہیں:

''مصنف ابن ابی شیبہ کی پانچ جلدیں مولانا عبدالخالق افغانی مقیم حیدرآباد نے چھپوائی تھیں، مولوی مختار احمد نے کچھ جلدوں کو غالباً فوٹو اسٹیٹ کاپی لے کر شائع کیا ہے اور باقی جلدیں خود انھوں نے ایڈٹ کرا کے شائع کیا ہے۔

اب میں اس کو ایڈٹ کر رہا ہوں، مدینہ منورہ سے تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں، باقی کا مسودہ کچھ مدینہ منورہ میں اور کچھ میرے پاس ہے۔ ابھی کتاب کا کافی حصہ باقی ہے جو ایڈٹ نہیں ہوا ہے، اس کے ایڈٹ کرنے میں لگا ہوا ہوں''

---

(۱) ریاض الجنہ ص ۳۷ مارچ، اپریل ۱۹۸۹ء

ظاہر ہے کہ مولانا کا ایڈٹ کردہ نسخہ مختار احمد ندوی کے نسخہ سے یقیناً مختلف ہوگا۔ مولانا کو مستشرقین یورپ کی طرح اس فن مین بڑی مہارت حاصل ہوگئی ہے۔ جس کا مظہر ۱۱ جلدوں میں مصنف عبدالرزاق ہے۔ خدا کرے ان کی ایڈٹ کردہ مصنف ابن ابی شیبہ بھی مصنف عبدالرزاق کی طرح چھپ کر جلد سے جلد شائقین اور اہل علم ومحققین کے ہاتھوں پہنچ جائے۔ مولانا کا یہ دوسرا عظیم الشان علمی وتحقیقی کارنامہ ہوگا۔ (۱)

اب تک مصنف ابن ابی شیبہ کی ۵ جلدیں چھپ چکی ہیں، بقیہ کا بیشتر حصہ ایڈٹ ہو چکا ہے، جس کو طباعت کے مرحلہ سے گذرنا ابھی باقی ہے، صرف ایک یا دو جلدیں ایڈٹ کرنے کو باقی تھیں کہ حضرت مولانا قدس سرہ کی صحت نے جواب دے دیا اور پھر کچھ ہی دنوں کے بعد علم وتحقیق کا یہ نیر تاباں ۱۰ ررمضان المبارک بروز دوشنبہ ۱۴۱۲ھ کو عین افطار کے وقت غروب ہوگیا اور علم وتحقیق کی وہ محفل ہمیشہ کے لیے اجڑ گئی جس کے دم سے سارے عالم میں اک شور برپا تھا ع

متاع دین ودانش لُٹ گئی اللہ والوں کی

۱۸ – تعلیقات کتاب الثقات لابن شاهین (غیر مطبوعہ)

۱۹ – الاتحاف السنیه بذکر محدثی الحنفیة (عربی مخطوطہ ہے جو غیر مطبوعہ ہے)

۲۰ – الحاوی لرجال الطحاوی.

یہ کتاب امام ابوجعفر طحاوی متوفی ۳۲۱ھ کی مشہور ومعرکۃ الآرا تصنیف شرح معانی الآثار اور شرح مشکل الآثار کے رجال پر لکھی گئی ہے (مشکل الآثار کی ۴ جلدیں دائرۃ المعارف النعمانیہ حیدرآباد سے طبع ہوکر شائع ہوچکی ہیں، اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے، صرف مطبوعہ حصہ پر مولانا نے کام کیا ہے۔)

محدث اعظمی کے علاوہ علامہ بدرالدین عینی شارح بخاری متوفی ۸۵۵ھ نے صرف معانی الآثار کے رجال پر کتاب لکھی ہے، جس کا قلمی نسخہ دارالکتب المصریہ میں موجود ہے اور اس کا زیراکس مظاہر علوم سہارنپور کے کتب خانہ میں ہے۔ امیر سابق تبلیغ مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے امانی الاحبار لکھتے وقت حضرت محدث اعظمی کے ایماء پر مصر سے منگوایا تھا۔ مشکل الآثار کے رجال پر علامہ

(۱) ریاض الجنہ ص ۳۶، مارچ، اپریل ۱۹۸۹ء

اعظمی کے علاوہ پوری دنیا میں کسی نے کام نہیں کیا ہے، یہ ان کی خصوصیت ہے، یہ ایسا عظیم کارنامہ ہے جس سے علامہ مزی، ابن حجر عسقلانی علامہ ذہبی اور دیگر ماہرین رجال کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ خدا کرے یہ کتاب اور حضرت کی تمام کتابیں جلد منظر عام پر آجائیں تا کہ عوام وخواص سب مستفید ہوں۔

اس کی تالیف ۱۳۴۸ھ میں مکمل ہوگئی تھی، جیسا کہ اس کے تاریخی نام'' واللہ تصنیف شریف'' سے ظاہر ہے۔ (یعنی صرف ۲۹ سال کی عمر میں یہ کتاب لکھ کر فارغ ہو چکے تھے) اس کا کچھ حصہ حضرت مولانا نے اپنے مشفق استاذ بخاری زمانہ علامہ انور شاہ صاحب ؒ کے پاس نظر ثانی کے لیے بھیجا تھا۔ ابھی اس کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ حضرت شاہ صاحب ؒ بیمار پڑ گئے۔ بواسیر کا سخت حملہ تھا۔ ڈابھیل سے دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے۔ علامہ اعظمی عیادت کے لیے دیوبند تشریف لے گئے، بعد نماز عصر شاہ صاحب ؒ سے ملاقات ہوئی۔ چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے فرمایا کہ کہاں سے آنا ہوا ہے۔ مولانا ؒ نے بتلایا کہ اعظم گڈھ سے۔ شاہ صاحب ؒ نے فرمایا وہ مولوی حبیب الرحمٰن اعظم گڈھی کون ہیں جنھوں نے طحاوی کے رجال پر کام کیا ہے؟ مولانا ؒ نے فرمایا خادم حاضر ہے۔ یہ سننا تھا کہ حضرت شاہ صاحب ؒ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کن کن کتابوں سے آپ نے مدد لیا ہے؟ فلاں فلاں کتاب کہاں سے اور کیسے دستیاب ہوئی؟ غرض کہ بہت تعجب کے لہجہ میں اسی طرح کے مختلف سوالات کرتے رہے، اس کے بعد فرمایا کہ پورا مسودہ لے کر ڈابھیل تشریف لایئے، انشاء اللہ ضرور نظر ثانی کروں گا۔ لیکن افسوس اس کے چند دن کے بعد دیوبند ہی میں حضرت شاہ صاحب ؒ اللہ کو پیارے ہو گئے اور یہ آفتاب علم ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اناللہ انا الیہ راجعون۔

(بروایت مولوی محمد عاصم سابق خادم حضرت امام اعظمی ؒ)

اس سلسلہ میں ایک واقعہ درج کرنے کو جی چاہتا ہے تا کہ بعد کے مؤرخ کو حضرت محدث اعظمی کے علمی مقام کے تعین میں آسانی ہو۔

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب ندوی مدظلہٗ جو ہندوستان میں محدث اعظمی کی کتابوں کے سب سے زیادہ مطالعہ کرنے والے شخص ہیں اور عمومی طور پر بھی مطالعہ وسیع اور نظر عمیق رکھتے ہیں۔

انھوں نے محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے تمام علمی تحقیقات سے ''قلت''، کو جمع کیا ہے اور نہایت ہی اہم خدمت انجام دی ہے، علامہ اعظمی کا جب آخری سفر حجاز شیخ احمد سویدا یمن شامی کی دعوت پر ہوا تھا، وہ بھی ساتھ ساتھ تشریف لے گئے تھے، حجاز ہی میں کسی جگہ انھوں نے حضرت علامہ اعظمی سے پوچھا کہ حضرت امام ذہبی نے دعا کیا کہ مجھ کو دارقطنی کا علم حاصل ہوجائے اور حافظ ابن حجر نے آب زمزم پیتے وقت دعا کی ہے کہ مجھے امام ذہبی کا مرتبہ حاصل ہوجائے۔ (۱)

آپ نے کیا دعا کی ہے؟ حضرت محدث اعظمی نے فرمایا کہ میں نے آبِ زمزم پیتے وقت اور دیگر متبرک مقامات میں یہ دعا کی ہے کہ مجھ کو امام ذہبی اور حافظ ابن حجر دونوں کا علم حاصل ہوجائے۔ الحمدللہ حق تعالیٰ نے عطا کیا۔

اللہ اکبر! اتنا بڑا شخص ہم لوگوں کے بیچ زمانہ دراز تک زندہ رہا، نہ ہم لوگ ٹھیک سے ان کو پہچان ہی سکے اور نہ ہندوستان میں ان کے عالی مقام کے اعتبار سے قدر دانی ہی ہوسکی۔ اس کے بالمقابل راسخین فی العلم نے آپ کے عالی مقام کو پہچانا، جیسا کہ مضمون کے گذشتہ صفحات سے ظاہر ہے اور آپ کے شایان شان معاملہ فرمایا۔

حضرت مولانا یحییٰ صاحب مدظلہٗ یہ بھی فرماتے تھی کہ مولانا کے علم کا صرف دسواں حصہ ظاہر ہوا بقیہ اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ اور مزید فرمایا کہ ایسے لوگوں کو حق تعالیٰ کبھی کبھی بطور نعمت کے زمین میں پیدا کردیتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت مولانا ابوالوفا افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو خود بھی زبردست عالم و محقق تھے علامہ اعظمی کے متعلق فرمایا ہے کہ **قلَّ له نظيرٌ في علماء زماننا** آپ کی مثال ہمارے زمانہ کے علماء میں کمیاب ہے۔ (۲)

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ماضی قریب اور اس کے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے علم حدیث کی اہم خدمات انجام دی ہیں، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کے بعد محدث اعظمی نے اس علم شریف کی جو خدمت انجام دی ہے، ایسی ٹھوس خدمت پورے عالم میں صدیوں کے بعد انجام پائی ہے۔ وہ کتابیں جو کبار علماء و محققین کی دسترس سے باہر تھیں، ان کتابوں کو ایڈٹ کرکے، ان کی تصحیح، تعلیق اور تحقیق کے بعد شائع کرنا حضرت امام اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ تجدیدی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ

---

(۱) دیکھئے اعیان الحجاج جلد دوم ص۱۷۳،۱۷۴ (۲) کتاب الزہد والرقائق ص۶۴

بجا طور پر مجدد فی الحدیث کہے جانے کے مستحق ہیں۔

انھیں خدمات کے صلہ میں عراق کی مشہور علمی اکیڈمی نے آپ کو ''المجمع العلمی العراقی'' کا معزز رکن منتخب کیا، وہاں کے ڈائرکٹر کے خط کا عربی متن کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

''محدث جلیل امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو عراق کی مشہور علمی اکیڈمی کے ڈائرکٹر نے یہ اطلاع دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ المجمع العلمی العراقی، کی مجلس نے اپنے ایک جلسہ میں آپ کی اعلیٰ ترین علمی اور تحقیقی خدمات اور زبان وادب کے میدان میں آپ کے گرانقدر کارناموں کے اعتراف میں۔ المجمع العلمی العراقی، کا معزز رکن منتخب کیا ہے۔ انھوں نے اس انتخاب پر اپنی طرف سے دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے توقع ظاہر کی ہے کہ آپ کی رکنیت سے علمی اور ثقافتی روابط کو انشاء اللہ مزید ترقی ملے گی''۔

اخیر میں مولانا عامر عثمانی کے ان حقیقت پر مبنی جملوں کے ساتھ جو انھوں نے رکعات تراویح پر تبصرہ کے ضمن میں اخیر میں لکھے ہیں، جو کل تک مستقبل کی آواز تھے، اب حال بن چکے ہیں، اپنی تحریر ختم کرتا ہوں:

''آس پاس اونچی دکان والے تو بہت ہیں، لیکن علم وتفقہ کی ایسی دکانیں اب نایاب ہوتی جارہی ہیں جن کا پکوان پھیکا نہ ہو۔ ہمارا تو خیال ہے کہ اب زمانہ ہم جیسے نام کے علامہ تو ضرور پیدا کرے گا۔ شمس العماء، حکیم الاسلام، ارسطوئے دوراں اور مٹی کے بقراط بھی ضرور جنم لیتے ہی رہیں گے، لیکن انور شاہ کشمیری، شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور حبیب الرحمٰن الاعظمی جیسے لوگوں کی مسند نہ جانے کب تک خالی رہے گی ؎

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

ہے مکرر لب ساقی پہ صدا تیرے بعد''[1]

(۱) تجلی دیوبند اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۵۶

حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ اور خدمت حدیث

از: مسعود احمد الاعظمی - مئو

[جامعہ اسلامیہ مظفر پور ضلع اعظم گڈھ میں ۲۹-۳۰ صفر ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۱-۲۲ مارچ ۲۰۰۷ء کو ''ہندوستان اور علم حدیث'' کے عنوان سے ایک دو روزہ سیمینار منعقد ہوا تھا، پیش نظر مقالہ اسی سیمینار کے لیے لکھا گیا تھا، رسالہ ''المآثر'' کے بعض قارئین کی طرف سے اس کی اشاعت کے لیے اصرار تھا، لہٰذا یہ پورا مقالہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے (ادارہ)]

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۹ھ-۱۴۱۲ھ) جملہ اسلامی علوم وفنون میں یکتائے زمانہ اور یگانۂ روزگار تھے، ان کی شخصیت اتنی ہمہ جہت اور متنوع تھی کہ ان کو کسی ایک جہت اور فن کا ماہر اور شناور قرار دے کر دوسرے جوانب وجہات سے اعراض اور صرف نظر نہیں کیا جاسکتا: ادب ولغت، فقہ وتفسیر، حدیث وتاریخ اور تذکرہ وتراجم ہوں یا منطق وفلسفہ اور علم کلام، ہر ایک میں ان کا تفوق، فضل وکمال اور عبقریت مسلم تھی، اور وہ ان تمام علوم وفنون میں ممتاز اور بلند ترین مقام پر فائز اور متمکن تھے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے علمی وسعت وتبحر کو دیکھ کر دنیائے علم دم بخود اور حیرت زدہ تھی؛ خواہ وہ ہندوستان کے علمی حلقے ہوں، ان کے اساتذہ ومعاصرین ہوں، یا بیرونی اہل علم اور عرب محققین، ان کے فضل وکمال، علمی عظمت اور علو مرتبت کے نہ صرف معترف اور مداح تھے، بلکہ ایک بڑی تعداد ان کے علم وتحقیق کی شیفتہ وگرویدہ تھی، ان پر اعتماد کرتی اور ان سے رہنمائی اور روشنی حاصل کرتی تھی۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمہ جہت شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کے علم وعرفان کا اصل میدان، اور ان کی حذاقت ومہارت کا اصلی مرکز کیا تھا، البتہ ان کی تحریروں اور علمی کاوشوں کا اگر مطالعہ کیا جائے، تو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم وفن کے ہر شعبے میں یگانہ اور یکتا

تھے۔آپ کی کوئی بھی تحریر اٹھالی جائے، وہ فقہی نکات اور حدیث ورجال کے مباحث سے معمور، اور زبان وادب کی شوخی اور دلکشی سے آراستہ ہوتی ہے، چونکہ اس مجلس مذاکرہ کا موضوع حدیث کی خدمات ہیں، اس لیے اس مناسبت سے اسی کے متعلق کچھ عرض کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، حالانکہ راقم نہ اس کا اہل ہے اور نہ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ کی شخصیت اور بطور خاص علم حدیث کے سلسلے کی ان کی خدمات ایسی ہیں کہ مجھ جیسا بے بضاعت اور کوتاہ نظر ان کے تعارف کا حق ادا کرسکتا ہے، لیکن ان کی ان خدمات پر لکھنے کے لیے قرعۂ فال اس دیوانے کے نام نکلا ہے، اس لیے نااہلی کے باوجود سطور ذیل میں اپنی بساط کے مطابق کچھ معروضات پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ کو علم حدیث کے ساتھ تعلق اور شغف اوائل عمر ہی سے رہا ہے، اگر درس وتدریس کے لحاظ سے دیکھا جائے، تو فراغت کے بعد دوسرے ہی سال آپ نے ابوداؤد شریف کا درس دیا، اور پھر چند برسوں کے بعد بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس شروع کیا، تو بیسیوں سال مسلسل آپ ان دونوں کتابوں کا بیک وقت درس دیتے رہے؛ اور اگر تصنیف وتالیف کی حیثیت سے نگاہ ڈالی جائے، تو ابتدائی دور کی آپ کی کتابوں میں بھی فن حدیث کے اندر مہارت، دقت نظر، بداہت واستحضار اور قوت استدلال کے حیرت انگیز نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں، اس زمانے کے کتب ورسائل یا مضامین ومقالات میں -جن میں سے بیشتر دفاع حنفیت میں سپرد قلم کیے گئے ہیں- نہ صرف محدثانہ بلکہ ناقدانہ رنگ پوری طرح نمایاں نظر آتا ہے، اور ان تحریروں میں آپ کی شخصیت ایک محدث ہی نہیں بلکہ صاحبِ بصیرت اور نکتہ رس نقاد کی صورت میں ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

مثلاً: سب سے پہلے آپ کی کتاب ''حدر اللثام'' کو لیجیے، اس کو آپ نے فراغت کے ایک سال بعد تصنیف فرمایا تھا، آپ کا سالِ فراغ ۱۳۴۰ھ ہے، اور اس کا سن تالیف ۱۳۴۱ھ، یہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری رحمۃ اللہ کی مشہور کتاب ''تحقیق الکلام'' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ کی یہ کتاب اگرچہ نامکمل ہے، لیکن جتنا حصہ بھی موجود ہے، وہ قابل قدر اور مستحق داد وتحسین ہے، اس کے اندر حنفیہ کے دلائل اور ان کی روایات پر فریق مخالف کے اعتراضات کا جس حسن وخوبی کے ساتھ رد کیا گیا ہے، اور حنفیہ کے دلائل وشواہد کو جس وزن وقوت اور مضبوطی کے ساتھ پیش کرکے روایت ودرایت کے اصول پر جانچ پرکھ کر ان کو ثابت کیا گیا ہے، اس کو دیکھ کر یہ باور کرنا

مشکل ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسے عالم کی تحریر ہے، جس نے ابھی ابھی تحصیل علم سے فراغت حاصل کی ہے۔

اسی طرح آپ نے صرف انتیس برس کی عمر میں وہ کتاب تصنیف فرمائی، جس کی تحسین وستائش اپنے وقت کے دو عظیم امام ومحدث اور آپ کے استاذ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور جامع المعقول والمنقول شارح صحیح مسلم علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی، اور اس کتاب پر اپنی قلبی مسرت اور شادمانی کا اظہار کیا، یہ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''**الحاوي لرجال الطحاوي**'' ہے، جو امام طحاوی کی دو اہم کتابوں ''**شرح معاني الآثار**'' اور ''**شرح مشكل الآثار**'' کے رجال ورواۃ اوران کے حالات پر مشتمل ہے۔

اُسی دور میں آپ نے **الإتحافات السنية بذكر محدثي الحنفية** کے نام سے ایک کتاب لکھنا شروع کیا، یہ کتاب ان اہل علم کے تذکرے کے لیے خاص تھی، جن کو علم حدیث سے تعلق تھا، اور وہ حنفی مسلک پر عمل پیرا تھے، یہ کتاب پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی، لیکن جتنا حصہ ضبط تحریر میں آسکا ہے، وہ فن رجال پر آپ کی گرفت اور وسعت علم کا پتہ دیتا ہے۔

ابتدائی دور کے آپ کے اس سلسلے کے تصنیفی کارناموں میں ایک رسالہ ''**التوصية بأسرار التسمية**'' ہے، اس رسالے میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے تسمیہ (بسم اللہ) سے متعلق احادیث کو جمع کر کے ایک جزء بنادیا ہے، اوران روایات کو علم حدیث کے اصول وضوابط پر جانچا اور پرکھا بھی ہے۔

آپ کی اردو تصانیف میں ''رکعات تراویح''، ''رکعات تراویح مذیّل بردانوار مصابیح''، ''الاعلام المرفوعۃ'' اور ''الازہار المربوعۃ'' وغیرہ اگرچہ فقہی موضوعات پر تصنیف کی گئی ہیں، لیکن ان کتابوں کے تمام مباحث حدیث اور علم حدیث کے محور پر گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان مسائل سے متعلق روایات اوران کے رجال ورواۃ پر علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے جس انداز سے بحث وتمحیص اور ردوقدح کی ہے، اوران سے متعلق احادیث وآثار کا سند ومتن کے اعتبار سے جس حذاقت ومہارت کے ساتھ تحلیل وتجزیہ کیا ہے، اردو کے علمی وتحقیقی خزانے میں اس کی مثال شاذ ونادر ملے گی، ان کتابوں کے اندر علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت نہ صرف بلند پایہ مصنف، بلکہ ایک جلیل القدر وعظیم المرتبت محدث، ماہر نقادِفن، اور علم حدیث کے سچے جوہری کی شکل میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، ان

کتابوں میں ان کے موضوع سے متعلق ایک ایک روایت کو لے کر، اس کو روایت ودرایت کے معیار پر جانچ پرکھ کر تحقیق کا حق ادا کر دیا گیا ہے، یہ وہ کتابیں ہیں جن کو پڑھ کر قاری علم وفکر کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔

اردو زبان میں آپ کی ایک اہم تصنیف ''تعدیل رجال بخاری'' اگر چہ ردشیعیت میں لکھی گئی ہے، لیکن اس میں رجال ورواۃ پر جو بصیرت آمیز تبصرہ ہے، اور علم جرح وتعدیل کی اصطلاحات پر جس گہرائی اور دقیقہ رسی کے ساتھ بحث وگفتگو کی ہے، وہ فن حدیث اور علم رجال کے اندر آپ کی عظمت شان اور علو مرتبت کی واضح اور بیّن دلیل فراہم کرتی ہے۔

آپ کے کلک گہر بار سے اگر یہ کتابیں نہ وجود میں آئی ہوتیں، اور صرف ایک ''نصرۃ الحدیث'' ہی ہوتی، تو حدیث پاک کے ساتھ آپ کی وابستگی وشیفتگی، اور اس علم میں آپ کی قدرت ومہارت کے ثبوت کے لیے کافی ہوتی، جس کے اندر مستشرقین اور بہت سے روشن خیال اور نام نہاد مسلم مصنفین کی طرف سے حدیث کی حجیت اور اس کے درجۂ استناد پر کیے جانے والے اعتراضات کو تارِ عنکبوت کی طرح کم زور اور بالکل بے سروپا ثابت کر دکھایا ہے، اس کتاب کی مدح وستائش آپ کے شیوخ اور اکابر اہل علم نے کی ہے، اور اس علم میں آپ کے وسعت وتبحر پر داد تحسین پیش کی ہے۔

''نصرۃ الحدیث'' ہی کا اختصار اور خلاصہ ''مقدمہ معارف الحدیث'' کو سمجھنا چاہئے، اس مبسوط مقدمے میں آپ نے حدیث وسنت کی استنادی حیثیت، اس کی حفاظت وصیانت، اور اس کی حجیت پر وافی اور کافی وشافی دلائل پیش کیے ہیں، اور قرآن کریم کی آیات بینات سے حدیث شریف کا حجت اور اسلامی تشریع وقانون سازی کے لیے قرآن کریم کے بعد دوسرا ماخذ ہونا ثابت کیا ہے۔

مستقل کتب ورسائل کے علاوہ، حدیث وعلم حدیث سے متعلق تحریر فرمودہ متعدد مضامین بھی آپ کی یادگار ہیں، اس مختصر وقت میں چونکہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے صرف ایک مثال پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں، جو اس موقع پر بطور خاص قابل ذکر ہے، اور وہ آپ کا نہایت بیش بہا اور معلومات افزا مضمون ''ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات'' ہے، جو ماہنامہ ''برہان'' کے فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، یہ مضمون اسی عنوان سے ''برہان'' ہی کے اگست وستمبر ۱۹۵۳ء کے شماروں میں شائع ہونے والے مولانا ابوسلمہ شفیع احمد کے مضمون پر اضافہ ہے، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے

اس مضمون میں علم حدیث پر ہندوستان میں تالیف پانے والی کتابوں کی فہرست ہی نہیں پیش کی گئی ہے، بلکہ اس سے نہایت بیش قیمت معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں، اور حدیث کے بہت سے نادر ونایاب مخطوطات کا بھی سراغ ملتا ہے، یہ مضمون علامہ اعظمی ؒ کی وسعت معلومات، کثرت مطالعہ، قوت یادداشت اور حیرت انگیز حافظہ کا بہترین نمونہ ہے۔

مذکورہ بالا معروضات بطور تمہید کے حوالۂ قلم کیے گئے ہیں، مقصد تو دراصل حدیث شریف کے ان دواوین اور مجموعوں کا ذکر کرنا ہے، جو مخطوطات کے ذخیروں میں گم ہونے کی وجہ سے ناپید کے حکم میں تھے، اور علامہ اعظمی ؒ کی نگاہِ التفات اور آپ کی کوشش وکاوش سے اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچے، اور تحقیق وتعلیق سے مزین اور آراستہ ہوکر اشاعت پذیر ہوئے۔

لیکن ان تحقیقی کارناموں کے ذکر سے پہلے ان استدراکات کا ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے، جو آپ نے کتب حدیث ورجال پر تحریر فرمائے ہیں، اور ان کتابوں پر جا بجا بکھرے ہوئے ہیں، جو آپ کے زیر مطالعہ رہ چکی ہیں، ان استدراکات کو اگر جمع کیا جائے، تو ایک ضخیم جلد تیار ہوسکتی ہے، اس سلسلے میں یہ عرض کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے استدراکات باقاعدہ مراجعہ کرکے نہیں قلم بند کیے گئے ہیں، بلکہ بیشتر ایسے ہیں کہ دوران مطالعہ جہاں کہیں آپ کو زیر مطالعہ کتاب کے مصنف یا محقق کا تسامح نظر آیا، آپ نے قلم برداشتہ اور برجستہ ان کو حوالۂ قلم کردیا۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ شہرت کے حامل مسند امام احمد کی علامہ احمد محمد شاکر کی تحقیق پر آپ کے استدراکات ہیں، جن کو اگر ذکر نہ کیا جائے تو آپ کے علمی وتحقیقی کارناموں کی تفصیل ناقص اور ادھوری رہ جائے گی، آپ کے ان استدراکات کے منظر عام پر آنے کے بعد آپ کی شہرت ونا موری اور علم حدیث کے اندر آپ کی ژرف نگاہی کا چرچا عالم عرب اور دنیائے علم کے گوشے گوشے میں پہنچا، اور خود علامہ احمد محمد شاکر ان کو دیکھ کر اس قدر متاثر اور مشکور ومسرور ہوئے کہ ان کے قلم حقیقت رقم پر بے ساختہ **أنتم من أعظم العلماء بها في هذا العصر** کا جملہ آگیا، اور پوری وسیع الظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان استدراکات کو مسند احمد کی پندرہویں جلد میں شائع کیا۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ آپ نے اپنی توجہات کا مرکز حدیث کے نادر ونایاب مخطوطات کی تحقیق کو بنادیا، اور اپنی ساری توجہ ان کی نشر واشاعت پر مرکوز کردی، آپ نے اس دور میں حدیث پاک کے

بہت سے نایاب مجموعوں کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر ان کو سہل الحصول اور قابل استفادہ بنایا، اور جب ان کو اپنے تعلیقات وحواشی کے یاقوت ومرجان سے سجا سنوار اور آراستہ کرکے اہل علم کے سامنے پیش کیا، تو علم حدیث کے اس عظیم الشان اور بیش بہا سرمائے کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں، ان کے دل فرط مسرت وانبساط سے لبریز ہوگئے، اور ان کو اس کی قدر وقیمت کا احساس ہوا۔

اب آپ کے ان تحقیقی کارناموں کا تعارف سطور ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

انتقاء الترغیب والترهیب:

علامہ حافظ ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری (متوفی ۶۵۶ھ) کی کتاب "الترغیب والترهیب" اپنے موضوع پر بے نظیر تصنیف ہے، لیکن اس کی ضخامت اور طوالت کی وجہ سے اس سے استفادہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، خواص اور محقق اہل علم ہی اس سے استفادہ اور انتفاع کر سکتے تھے، اس کتاب کی نفع رسانی کو عام کرنے کے لیے امام ومحدث حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) نے اس کا مختصر تیار کیا، جس کے بعد اس سے ان لوگوں کے لیے بھی نفع اٹھانا آسان ہوگیا، جن کے لیے اصل کتاب تک پہنچنا دشوار اور مشکل کام تھا۔

حافظ ابن حجر کی مختصر کے مخطوطات ہندوستان کے مختلف کتاب خانوں میں پائے جاتے تھے، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا ایک مخطوطہ تقریباً ۱۹۳۰ء میں بہرائچ میں مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ مولانا شاہ نعیم اللہ بہرائچی کے باقیات میں دریافت ہوا تھا، اسی وقت سے اس کی طباعت کا خیال آپ کے ذہن ودماغ میں جاگزیں ہوگیا، لیکن برسوں اس کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی، پھر حسن اتفاق سے بیس برس کے بعد ۱۹۵۳ء میں اس کا ایک دوسرا نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری میں دستیاب ہوا، اور پھر چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک تیسرے نسخے کا بھی سراغ لگا، جو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں تھا، ان پے درپے دریافتوں نے علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی قوت ارادی کو مہمیز لگایا، اور آپ نے اس کتاب کو تصحیح وتحقیق کرکے شائع کرنے کا عزم مصمم کرلیا۔

اپنے ارادے کو روبہ عمل لانے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ دارالعلوم دیوبند کا نسخہ عاریۃً لے کر مالیگاؤں کے ایک صاحب علم وفضل مولانا عبدالحمید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کو نقل کرایا، اس نقل کے تیار ہونے کے بعد اپنے شاگرد اور محبّ صادق ومخلص مولانا عبدالجبار صاحب مئوی رحمۃ اللہ علیہ کی مدد سے اصل

سے اس کا مقابلہ کیا، پھر خود اس نسخے کے شروع اور آخر کے کچھ حصوں کا مقابلہ حافظ منذری کی ترغیب سے کیا، اور باقی حصے کا مقابلہ مولانا عبدالحمید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مالیگاؤں کے ایک دوسرے عالم مولانا محمد عثمان مرحوم سے کرایا۔ اس قدر اہتمام اور توجہ کے بعد اس کا پہلا اور تصحیح شدہ اڈیشن ۱۳۸۰ھ=۱۹۶۰ء میں علمی پریس مالیگاؤں سے طبع ہو کر منظر عام پر آیا، اور ادارہ احیاء المعارف مالیگاؤں کو اس کی نشر و اشاعت کا شرف حاصل ہوا۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب پر ایک مختصر اور جامع مقدمہ تحریر فرمایا، جس میں کتاب کے موضوع، اس موضوع پر دوسری تصانیف، ''الترغیب والترہیب'' اور اس کے مختصر کی اہمیت، اس کے نسخوں تک رسائی، ان کی حصولیابی اور اس سلسلے میں اپنی جدو جہد پر اجمال کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، پھر اصل کتاب سے پہلے چند سطروں میں حافظ منذری اور ابن حجر عسقلانی کے حالات ارقام فرمائے ہیں۔

اس کتاب میں آپ کی اصل توجہ تصحیح متن پر ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں اپنے تعلیقات وحواشی میں زیادہ تر نسخوں کے اختلاف کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، اور حواشی کی تطویل و تکثیر سے یکسر گریز کیا ہے، اصل مقصد یہ تھا کہ کتاب کا ایک عمدہ اور صحیح ترین اڈیشن اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔

رسالة الأوائل:

حدیث کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اہم خدمت رسالہ ''الأوائل'' کی طباعت و اشاعت ہے، اس کے جامع و مرتب علامہ و محدث شیخ سعید بن سنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اس رسالے کو پڑھ کر حدیث کا ذوق رکھنے والے لوگ سند اجازت حاصل کرتے ہیں، اس میں حدیث شریف کی ۴۰ سے زائد کتابوں کی ایک ایک حدیث نقل کی گئی، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح کر کے ۱۳۸۲ھ=۱۹۶۲ء میں مطبعۃ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے طبع کرا کر مکتبۃ الاعظمی مئو سے شائع کیا۔

مسند الحمیدی:

مختصر الترغیب والترہیب کے بعد جو دوسرا تحقیقی کارنامہ منظر عام پر آیا، وہ امام بخاری کے استاذ حافظ حدیث ابوبکر عبداللہ بن زبیر قریشی اسدی حمیدی مکی (متوفی ۲۱۹ھ) کی ''المسند'' تھی، مسند حمیدی کی اور جو بھی خصوصیات ہوں وہ اپنی جگہ، اس کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہ صحاح

ستہ سے پہلے کی تصنیف ہے، یہ اوراس جیسی کتابوں کے منظر عام پر آجانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ منکرین حدیث کا گروہ مصنفین صحاح ستہ پر جو بہتان تراشی کرتا تھا کہ اصحاب صحاح ستہ نے حدیثیں وضع کر کے ذات نبوی (علیه افضل التحیات والصلوات والتسلیمات) کی طرف منسوب کر دیا ہے، اور یہ پروپیگنڈا کرتا تھا کہ اس سے پہلے حدیثوں کا کہیں کوئی وجود نہیں تھا، تو مسند حمیدی جیسی کتاب کی دریافت اور تحقیق واشاعت کے بعد ان دعووں کی حیثیت پر کاہ سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کتاب کے مخطوطہ کا اولین سراغ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں ملا، اس کے بعد ہی سے آپ کو اس کے کسی دوسرے نسخے کی تلاش ہوئی، ۱۹۵۸ء کے اواخر میں حیدرآباد کا آپ کا ایک علمی سفر ہوا، وہاں سعیدیہ لائبریری میں اس کا ایک نسخہ آپ کے ہاتھ لگا، اس دوسرے نسخے کے دستیاب ہوتے ہی اس کتاب کی تحقیق کا ارادہ کرلیا، آپ نے دیوبند اور سعیدیہ کے نسخوں کی مدد سے اس کام کا آغاز کرنا چاہا، اور دیوبندی نسخے کا سعیدیہ کے نسخے سے مقابلے کے لیے حیدرآباد کا ایک اور سفر کیا، اس دفعہ قسمت نے پھر یاوری کی، اور وہاں اس کا ایک تیسرا نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں دریافت ہوا؛ ان تینوں نسخوں کو بنیاد بنا کر آپ نے تحقیق وتعلیق کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیا، پھر جب کتاب طبع ہونے لگی تو اس کا چوتھا نسخہ وصول ہوا، جو مکتبہ ظاہریہ دمشق کا تصویر شدہ نسخہ تھا، آپ نے کام مکمل ہوجانے کی وجہ سے اس کو نظرانداز نہیں کیا، بلکہ تحقیق کی آبرو کو باقی رکھنے اور دیانت کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اس نسخے سے بھی حتی الامکان فائدہ اٹھایا، اس سے آپ نے یہ استفادہ کیا کہ جتنا حصہ ابھی طبع نہیں ہوا تھا، اس میں اپنی تعلیقات میں اس کی مدد سے اضافہ کیا، اور جو حصہ طبع ہو چکا تھا، اس کے متعلق کارآمد اور ضروری باتوں کو کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ کے شامل کردیا، اس طرح یہ کتاب اپنی آخری شکل میں چار نسخوں کی مدد سے مکمل ہوئی۔

ان نسخوں کی مدد سے کتاب کی تصحیح ومقابلہ کے علاوہ حدیث شریف کی دیگر مطبوعات کی طرف بھی مراجعت کی، تاکہ مزید تصحیح ہوسکے، اور اگر ان نسخوں میں کوئی نقص یا کمی ہو تو اس کو دور کیا جاسکے، اس کی احادیث کی تخریج کی، اور تخریج میں صحاح ستہ کے حوالوں کا زیادہ اہتمام برتا؛ مزید برآں اگر کسی حدیث میں کوئی اجنبی یا نامانوس لفظ تھا تو اس کی تشریح کی، اور بوقت ضرورت حدیث کے

معنیٰ ومفہوم کی بھی توضیح کی۔

ان تصحیحات وتعلیقات کے علاوہ آپ نے اس کی فہرست سازی پر بھی خاص توجہ اور محنت صرف کی، یہ کتاب چونکہ مسانید صحابہ رضی اللہ عنہم پر مشتمل ہے، اس لیے اگر فقہی موضوع کے لحاظ سے اس سے استفادہ کی کوشش کی جائے، تو تلاش کرنے والے کو اس میں مشکلات کا سامنا ہوسکتا ہے، اس مشکل کے حل کے لیے آپ نے ایک فہرست ابواب کے اعتبار سے مرتب کی، اور مزید سہولت اور آسانی کے واسطے ایک فہرست اعلام کی بھی تیار کی، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تمام کاوشیں برداشت کر کے اس کتاب سے استفادہ کو بہت سہل اور آسان کر دیا۔

یہ کتاب دس اجزا اور تقریباً تیرہ سو حدیثوں پر مشتمل ہے، اور حیدرآباد و مالیگاؤں کے مطبعوں سے دو جلدوں میں ۱۳۸۲ھ=۱۹۶۳ء میں چھپ کر مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی ہے۔

کتاب الزہد والرقائق:

یہ کتاب اسلامی لٹریچر کے بیش قیمت قدیم سرمایوں میں سے ایک ہے، اور قدوۃ الانام شیخ الاسلام والمسلمین سرخیل مجاہدین امام عبداللہ بن مبارک مروزی - رحمہ اللہ تعالی - (متوفی ۱۸۱ھ) کی عظیم الشان اور بابرکت یادگار ہے، عبداللہ بن مبارک کی ذات ستودہ صفات، ان کی علوشان اور جلالت قدر ومنزلت تعریف وتعارف سے بلند وبالاتر ہے، ان کے بلندیٔ رتبہ کے لیے یہی کافی ہے کہ سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے بلند پایہ محدث نے ان کی نسبت فرمایا ہے کہ میں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور عبداللہ بن مبارک کے بارے میں غور کیا، تو ان کی فضیلت کے لیے اس کے سوا کوئی اور بات نہیں پائی کہ صحابہ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی اور یہ (ابن مبارک) اس سے محروم رہے، یعنی جہاد، طاعت وعبادت اور علم کی نشر واشاعت وغیرہ جو معمولات صحابہ کرام کے تھے، وہی ابن مبارک کے بھی تھے، البتہ اللہ تعالیٰ نے ان فضائل وکمالات کے ساتھ ان کے لیے شرفِ صحابیت بھی مقدر فرما دیا تھا۔

زہد کے موضوع پر متعدد محدثین نے کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، منجملہ ان کے عبداللہ بن مبارک کی پیش نظر کتاب بھی ہے، اس کتاب کے قلمی نسخے دنیا کے بعض بعض کتب خانوں میں پائے جاتے تھے، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت کدوکاوش سے اس کے نسخوں کو فراہم کیا، اس کا پہلا نسخہ قطر سے حاصل ہوا، اس کو سابق حاکم قطر کے والد شیخ علی بن عبداللہ نے ہدیہ کے طور پر عنایت فرمایا تھا، یہ نسخہ قلم

کے ذریعہ تیار کیا گیا تھا، اور یہ فلم استنبول کی ایک لائبریری مکتبہ ولی الدین جاراللہ کے نسخے سے تیار کی گئی تھی، یہ نسخہ ساتویں صدی ہجری سے پہلے قید کتاب میں آیا تھا، اور دس اجزاء پر مشتمل تھا، اس کے راوی حسین بن حسن مروزی (متوفی ۲۴۶ھ) ہیں۔

دوسرا نسخہ اسکندریہ کی میونسپل پبلک لائبریری سے حاصل کیا گیا، یہ معہد المخطوطات کی ایک فلم سے تیار کیا گیا تھا، یہ نسخہ نعیم بن حماد کی روایت سے تھا اور حسین مروزی کی روایت والے نسخہ سے بہت مختلف تھا، دونوں نسخوں میں ابواب کی تعداد، ان کے عناوین اور روایات کی تعداد میں بڑا فرق تھا، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اختلاف اور فرق کی وضاحت کا یہ حل نکالا کہ اس نسخے کی ان زائد روایات کو جو حسین بن مروزی کے نسخے کے ابواب کے تحت آتی تھیں، اپنی تعلیقات میں درج کردیا، اور جو روایات باقی رہ گئیں، یا جو زائد ابواب تھے، ان کو الگ سے کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ کے شامل کیا، چنانچہ وہ روایات جو نعیم بن حماد کی زیادات سے ہیں ۱۳۲ صفحات اور ۴۳۶ روایات پر مشتمل ہیں۔

یہ نسخہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے، اس کی ایک نمایاں اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایسے نسخے سے نقل کیا گیا ہے، جو حافظ ابن عبدالبر کے اصل نسخے سے نقل کیا گیا تھا جس کے بعد یہ نقل حافظ ابن عبدالبر کی اصل کے مطابق ہوگئی۔

تیسرا نسخہ دمشق کے مکتبہ ظاہریہ سے حاصل کیا گیا، یہ معہد المخطوطات کی ایک فلم سے تیار شدہ ۷۰/اوراق پر مشتمل تھا، اور ۶۰۱ء کا لکھا ہوا تھا، یہ پوری کتاب الزہد پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک نامکمل اور ناقص نسخہ ہے۔

اس کتاب کی تحقیق وتعلیق کے علاوہ اس سے استفادہ کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی متعدد فہرستیں تیار کیں، چنانچہ پہلے تو روایتِ مروزی اور زیادات نعیم کی الگ الگ فہرستِ ابواب بنائی، پھر مرفوع احادیث کی ایک فہرست بنائی، اور جس صحابی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، حروف تہجی کی ترتیب پر ان کے نام کے ساتھ جس صفحے پر وہ حدیث آئی ہے اس صفحے کو درج کیا، پھر اسی ترتیب سے ایک فہرست مرسل روایتوں کی بنائی، پھر موقوف اور مقطوع روایات کی ایک فہرست تیار کرکے اس کتاب سے استفادہ کو آسان سے آسان تر کردیا۔

ان سب باتوں کے علاوہ اس کتاب کا ایک نہایت اہم اور نمایاں پہلو اس کا مبسوط مقدمہ

ہے، اس میں تقریباً ۱۵ر صفحات میں زہد کی اہمیت اور اس کی اقسام اور اس موضوع کی تصانیف کا بیان ہے، پھر عبداللہ بن مبارک کی اس کتاب کی قدر و قیمت بیان کرنے کے بعد اس کے راویوں کا تذکرہ ہے، پھر تقریباً ۲۵ر صفحات میں امام ابن المبارک کے حالات نہایت جامعیت کے ساتھ اور بڑے ہی پُر مغز انداز میں قلم بند کیے گئے ہیں۔

درحقیقت یہ کتاب تحقیق و تعلیق کا ایک بہترین نمونہ ہے، جو ۱۳۸۵ھ = ۱۹۶۶ء میں علمی پریس مالیگاؤں سے طبع ہو کر مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں سے شائع ہوئی۔

السنن لسعید بن منصور:

امام و حافظ ابو عثمان سعید بن منصور بن شعبہ مروزی (متوفی ۲۲۷ھ) کا شمار علم حدیث کے کبار ائمہ و حفاظ میں ہوتا ہے، ان کی عظمت و جلالت کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ امام مسلم اور امام ابو داؤد جیسے اساطین علم حدیث کے شیوخ میں تھے، اور ان لوگوں نے ان سے حدیث سیکھی، پڑھی اور روایت کی، اور بڑے بڑے ناقدین و ماہرین فن نے ان کے حفظ و روایت پر اعتماد اور بھروسہ کیا ہے۔

امام سعید بن منصور صاحب تصنیف محدثین میں تھے، ان کی کتاب ''السنن'' اہل علم اور محدثین کے طبقے میں مشہور و معروف تھی، اور ان کے لیے ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھتی تھی، احادیث کی شرح و تخریج کے سلسلے میں جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، ان میں اس کتاب کے بہ کثرت حوالے آتے ہیں، لیکن اس کے نسخوں کی نایابی کی وجہ سے ایک مدت سے براہ راست اس کی طرف مراجعت کرنا اور اس سے استفادہ کرنا اہل علم کے لیے ممکن نہ تھا، یہاں تک کہ دنیا کے کسی کتب خانے میں اس کے کسی نسخے کی موجودگی کا بھی اب علم نہیں تھا۔

۱۳۸۰ھ میں ترکی کے ایک سفر کے دوران مشہور عالم و محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کو وہاں کے ایک کتب خانے میں اتفاقاً اس کا ایک مخطوطہ ہاتھ آ گیا، ان کو اس کی صرف ایک جلد یعنی جلد ثالث ملی تھی، جو قسم اول و ثانی پر مشتمل تھی، ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مخطوطے کو جوہانسبرگ مولانا محمد میاں سملکی کے پاس بھیجا، اس کتاب پر کام کرنے کے لیے اور اس کو قابل اشاعت بنانے کے لیے مولانا محمد میاں کی نگاہ ایک ہی جگہ پڑی اور وہ حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی، چنانچہ انھوں نے آپ کے سامنے اس کی تحقیق کی تجویز رکھ دی، آپ کا قلب چونکہ خدمت حدیث کے جذبے سے

معمور اور سرشار تھا، اس لیے سخت مشغولیت اور عدیم الفرصتی کے باوجود اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرلیا، اس کتاب کی خدمت اس فن میں کمال تبحر اور براعت وامامت کی دلیل ہے، ورنہ کسی ایک مخطوطے کو سامنے رکھ کر اس کی تحقیق اور حاشیہ نگاری کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

یہ کتاب تحقیق وتعلیق کے مراحل سے گزرنے کے بعد ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۷ء اور ۱۳۸۸ھ = ۱۹۶۸ء میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

المصنَّف لعبدالرزاق:

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارناموں میں سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ امام عبدالرزاق صنعانی کی کتاب ''المصنف'' کی تحقیق ہے، یہ کتاب اور اس کتاب کی تحقیق دونوں اسلامی تاریخ کا قابل افتخار سرمایہ اور کارنامہ ہیں، مصنف کے نام سے اس سے پہلے اور اس کے بعد متعدد کتابیں مرتب ہوئی ہیں، لیکن اس وقت پائی جانے والی مصنَّفات میں یہ سب سے قدیم ہے۔

امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی (متوفی ۲۱۱ھ) اصحاب تصنیف محدثین وحفاظ میں تھے، ان کی فضیلت اور جلالتِ قدر ومنزلت کے لیے یہی کافی ہے کہ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی ابن المدینی اور یحییٰ بن معین جیسے محدثین اور ائمہ علم وفن نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے حدیث روایت کی۔

امام عبدالرزاق نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور ومعروف ''المصنف'' ہے، اس کے اندر احادیث وآثار کا ایک بیش بہا ذخیرہ محفوظ ہے، بلکہ یہ کتاب اپنے مواد، محتویات اور جامعیت کے لحاظ سے اسلام کے عہد زریں کی عکاسی کرتی ہے، اور اس دور کے فطری اور سادہ ادب اور ثقافت وتمدن کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

مصنف عبدالرزاق کا لوگ محض نام سنتے تھے، یا کتابوں میں اس کا تذکرہ اور حوالہ پڑھتے تھے، یہ کتاب فقہ حنفی کے نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ کے ایسے اقوال وآثار کا بہت بڑا ذخیرہ سمایا ہوا ہے، جو مسلک امام حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید وتقویت کرتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دیرینہ خواہش اور تمنا تھی کہ کسی طرح یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہوکر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچ جاتی، بالآخر خداوند قدوس نے ان

کے زمرۂ تلامذہ ہی میں سے بعض اہل علم وفضل کو ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے منتخب فرمالیا، مولانا محمد میاں سملکی مقیم جوہانسبرگ نے اس کے نسخے فراہم کر کے علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی تحقیق وتصحیح کے لیے آمادہ کیا۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو مجلس علمی کے واسطے سے اس کا جو نسخہ ملا تھا وہ ترکی کے مکتبہ مراد ملا سے حاصل کیا گیا تھا، آپ اس کام کے آغاز سے پہلے اور اس کے بعد جب تک اس کا کام جاری رہا، اس کے نسخوں کے سلسلے میں عالم اسلام کے کتب خانوں سے سلسلہ جنبانی اور خط وکتابت کرتے رہے، یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی، اور اس کدوکاوش کے نتیجے میں کچھ مزید نسخے بھی آپ کو دستیاب ہو گئے، لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ اس کا کوئی بھی نسخہ کامل نہیں تھا، بعض محض چند جلدوں پر مشتمل تھے، اور بعض صرف چند ابواب اور اوراق پر، ایک مراد ملا کا نسخہ ہی نسبتاً کامل تھا، لیکن یہ بھی نقص سے سالم اور محفوظ نہیں تھا، اس نسخے میں دو مقام پر نقص تھا، ایک تو کتاب کے شروع میں، اور دوسرا مخطوطے کی پانچویں یعنی اصل کی آخری جلد کے شروع میں، جیسا کہ اس نوٹ سے معلوم ہوتا ہے، جو حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کے شروع میں درج کیا ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مخطوطہ ''**باب غسل الذراعين**'' سے شروع ہوتا ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کوئی کتاب جو سنن کے طرز پر تصنیف کی گئی ہو، اس کا آغاز اس قسم کے باب سے نہیں ہوتا ہے۔

دوسرا نقص جو اصل مخطوطے کی پانچویں جلد کے شروع میں ہے، وہ مطبوعہ کتاب کی جلد نمبر ۸ میں واقع ہے، اس کے صفحہ نمبر ۲۹۲ پر حاشیہ نمبر (۲) کے تحت علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے: ''**في هامش الأصل: الجزء الخامس من مصنف عبدالرزاق وبه يتم الكتاب، والنقص من أوله لم يعلم**''، لیکن اسی صفحے پر اس سے پہلے جو حاشیہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی جلد کے آخر کا بھی کچھ حصہ ساقط اور گم شدہ ہے، چنانچہ حاشیہ نمبر (۱) کے تحت لکھا ہے: ''**فُقد من الأصل الذي عندنا ورقة أو ورقات وكان تمام الحديث المرقم برقم ١٥٢٦٣ فيما فقد**''، یعنی ہمارے پاس جو اصل ہے، اس سے ایک ورق یا چند اوراق غائب ہیں، اور حدیث نمبر ۱۵۲۶۳ کا باقی حصہ اسی گم شدہ حصے میں تھا۔

اس کتاب کا مخطوطہ پانچ جلدوں میں تھا، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق وتعلیق کے بعد پھیل کر

گیارہ جلدوں تک پہنچ گیا، یہ کتاب ۲۱ ہزار سے زیادہ احادیث وآثار پر مشتمل ہے، جس کے قید طباعت میں آجانے سے احادیث نبویہ اور مصادر شریعت اسلامیہ کا ایک عظیم الشان ذخیرہ دستبرد زمانہ کا شکار ہونے سے محفوظ ہوگیا۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کتاب سے بے پناہ دلچسپی تھی، اور اس کی تحقیق وتعلیق میں آپ نے شب وروز ایک کردیے تھے، برسہا برس کی محنت وجانفشانی اور عرق ریزی کے بعد اس کتاب کو اس قابل بنادیا کہ اہل علم اس سے استفادہ کرسکیں، اور اسی پر بس نہیں، بلکہ اس کے بعد جب یہ کتاب بیروت میں طبع ہونے لگی، تو اس کے پروف پر نظر ثانی اور تصحیح کے لیے بیروت کا دومرتبہ سفر کیا، اور نہایت صعوبت اور مشقت برداشت کرکے پہلی مرتبہ ۶ رمہینے اور دوسری دفعہ ۲ رمہینے وہاں قیام پذیر رہے، لیکن آٹھ مہینے کی اس غربت کی زندگی کے باوجود طباعت کی رفتار کچھ ایسی رہی کہ آپ بنفس نفیس چند جلدوں سے زائد کے پروف پر نظر ثانی نہ کرسکے۔

اس طرح ۱۳۹۲ھ=۱۹۷۲ء میں اس کا پہلا اڈیشن بیروت سے نہایت عمدہ اور اعلی معیار کے کاغذ پر چھپ کر مجلس علمی سے شائع ہوا۔

اس کتاب کی طباعت کے دوران اور اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ اس کے لیے مقدمہ نہ لکھ سکے، باوجودیکہ مقدمے کا سارا مواد آپ کے ذہن میں موجود تھا، لیکن ان کو صفحہ قرطاس تک منتقل کرنے کی نوبت نہ آسکی، اس کا قید تحریر میں نہ آنا علمی دنیا کا ایک بہت بڑا خسارہ ہے، کیونکہ آپ کا خیال اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھنے کا تھا۔

المصنَّف لابن أبي شيبة:

اس کتاب کی تحقیق علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عمر کے آخری حصے میں کی ہے، لیکن ابھی مصنف عبدالرزاق کا تذکرہ ہوا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مناسبت سے اس کی نسبت بھی کچھ عرض کردیا جائے۔

ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان الواسطی الکوفی کا شمار بھی امام عبدالرزاق، حمیدی اور سعید بن منصور کی طرح بلند رتبہ محدثین وحفاظ اور جامعین حدیث میں ہوتا تھا۔ یہ امام بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ کے اساتذہ وشیوخ میں تھے، خصوصا مسلم اور ابن ماجہ نے ان

سے بہ کثرت حدیثیں روایت کی ہیں، ۲۳۵ھ ابن ابی شیبہ کا سن وفات ہے۔

اس سے اس قدر اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان کی تصنیف کردہ کتاب بھی صحاح ستہ سے قبل معرض وجود میں آنے والی تصانیف میں ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ ابن ابی شیبہ کی مصنف بھی عبدالرزاق کی مصنف کی طرح قدیم اور ضخیم ہے، بلکہ ضخامت میں مصنف عبدالرزاق سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہ کتاب اگرچہ مطبوع تھی، مگر اس کی تحقیق میں جو توجہ اور کوشش صرف ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں کی گئی تھی، اس ضرورت کے پیش نظر حجاز کے ایک سفر کے دوران مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے مصنف عبدالرزاق کے طرز پر اس کتاب کی تحقیق کی درخواست کی، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اپنی پیرانہ سالی، ضعف ومرض اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ کے لیے خود کو تیار کر لیا۔

اس کتاب کے قلمی نسخے بھی دنیا کے کئی ایک کتب خانوں میں پائے جاتے تھے، آپ نے تلاش وجستجو کر کے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے، ان کے دستیاب ہو جانے کے بعد اس کی تحقیق کا آغاز کیا، اور شبانہ روز محنت کے بعد اس کی تقریباً ۱۲-۱۳ جلدیں اپنی تحقیق سے تیار کر دیں، مگر آپ کی حیات میں اس کی چار ہی جلدیں شائع ہو سکیں، باقی جلدیں تشنۂ طبع رہ گئیں۔

المطالب العالية:

مذہب اسلام کی حقانیت اور اسلامی شریعت کے ابدی اور دائمی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ نہ صرف اس کی آسمانی کتاب بلکہ اس کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ وکلمات بھی آج چودہ سو برس سے زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اپنی تر وتازہ حالت میں محفوظ ہیں، باوجودیکہ اس طویل مدت میں اس امت پر بہت سارے انقلابات آئے، اسلام اور اس کے نام لیواؤں کو نیست ونابود کر دینے کی بارہا کوششیں کی گئیں، اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کے تہذیبی ورثے کو خاکستر کر دینے اور ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی، مگر ان تمام کوششوں اور پیہم سازشوں کے باوجود دین اسلام کا علمی وفکری اور تہذیبی وثقافتی سرمایہ پوری تازگی اور تابندگی کے ساتھ زندہ وپائندہ ہے۔

مسلمانوں نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دہن مبارک سے نکلنے والے الفاظ وکلمات، آپ کی

ذات مبارک سے ادا ہونے والے اعمال وافعال، آپ کے ساتھ اور آپ کی حیات مبارکہ میں پیش آنے والے حالات وواقعات کو جس طرح اور جس اہتمام سے محفوظ رکھا ہے، وہ قدرت کا بڑا کرشمہ ہے، اور دنیا کی کوئی بھی قوم اپنے دین وشریعت اور اس کے سرمائے کی حفاظت وصیانت میں اس کا سواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی پیش نہیں کرسکتی، مسلمانوں نے صرف اپنے پیغمبر ہی کے حالات وواقعات اور ان کے اقوال وافعال کی حفاظت نہیں کی، بلکہ پروانہ وار نثار ہونے والے آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اور ان صحابہ کے پیروکاروں اور ان کے بعد کے لوگوں کے اقوال وافعال کو بھی کتابوں کے اوراق وصفحات میں محفوظ کر رکھا ہے۔

علماء اسلام نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی احادیث طیبہ ومبارکہ کی حفاظت کا جس پیمانے پر انتظام وانصرام کیا ہے، دنیا کی دوسری قومیں اس کو دیکھ کر- خواہ وہ اس کا اظہار کریں یا نہ کریں- حیرت زدہ اور انگشت بدنداں ہیں، حدیث کے حفاظ وائمہ وعلماء نے اس سرمائے کی حفاظت کے لیے عجیب عجیب اور متنوع طریقے اختیار کیے ہیں، اور اس علم کی اتنی انواع واقسام وضع کی ہیں کہ ان کو حد شمار میں لانا مشکل ہے۔

حفاظت حدیث کے طریقوں میں ایک طریقہ اور منہج زوائد کی تصنیف کا ہے، زوائد سے مراد وہ کتابیں ہوتی ہیں، جن کے اندر ان کے مصنفین ان حدیثوں کو جمع کرتے ہیں، جو بعض دوسری کتابوں میں نہیں ہوتی ہیں، زوائد پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، یہاں میں ان کتابوں کو ذکر کرنا چاہتا ہوں جو علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سے معرض اشاعت میں آئی ہیں۔

ان میں ایک مشہور کتاب **المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية** ہے، یہ مجموعۂ حدیث حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، اس کے اندر حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے آٹھ مسندوں کی ان حدیثوں کو جمع کیا ہے، جو صحاح ستہ اور مسند امام احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، وہ آٹھ مسند جن کی زائد روایتیں لی گئی ہیں یہ ہیں: مسند ابوداؤد طیالسی، مسند حمیدی، مسند ابن ابی عمر، مسند مسدد بن مسرہد، مسند احمد بن منیع، مسند ابی بکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید اور مسند حارث ابن ابی اسامہ۔ یہ آٹھ کتابیں تو مکمل حافظ ابن حجر کے سامنے تھیں، اس کے علاوہ کچھ خاص روایتیں مسند ابویعلی کی بھی لیں، اور مسند اسحاق بن راہویہ کے بھی نصف حصے کو سامنے رکھ کر اس سے بھی استفادہ کیا، اور پھر ان تمام

احادیث کو فقہی ترتیب پر مرتب کیا۔

یہ کتاب حدیث پاک کا بہت بڑا اور قابل قدر ذخیرہ ہے، اس میں جن کتابوں کی روایتیں لی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر چند سال قبل تک دستیاب نہیں تھیں، اور کئی ایک تو اب بھی ناپید کے درجے میں ہیں، لہٰذا ان کی روایتوں کو انتخاب کر کے جمع کر دینا علم حدیث کی ایک بہت بڑی خدمت اور بہت عظیم الشان علمی و دینی کارنامہ ہے؛ اور اسی طرح اس کے نسخوں کو فراہم کر کے تصحیح و تعلیق کے بعد اس کو قابل اشاعت بنانا بھی غیر معمولی ہمت و حوصلہ اور فضل و کمال کی بات ہے۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو **المطالب العالیہ** کا سب سے پہلا قلمی نسخہ حیدر آباد کے مکتبہ سعیدیہ میں ۱۹۵۸ء کے سفر کے دوران دیکھنے کو ملا، یہ نسخہ کامل نہیں تھا، بلکہ اس کے صرف نصف اول پر مشتمل تھا، پھر کئی برس کے بعد علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو اتفاقاً اس کے دو نسخے میسر ہو گئے، ان نسخوں کو مدینہ منورہ میں مقیم شیخ سلطان نمنکانی نے ترکی سے تصویر کے ذریعے حاصل کیا تھا، ان میں ایک نسخہ باسند تھا، اور دوسرا نسخہ سند سے عاری تھا، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نسخے کو منتخب کیا جس سے سند کو حذف کر دیا گیا تھا، مگر اس کا باسند نسخے سے حرفاً حرفاً مقابلہ کیا، اسی طرح ٹھیک اسی نوعیت کی ایک دوسری کتاب امام بوصیری (متوفی ۸۴۰ھ) کی **إتحاف السادة المهرة بزوائد المسانيد العشـــرة** سے بھی اس کا مقابلہ کیا، اور اپنی تعلیقات میں ان دونوں کتابوں کی خاص خاص اور مفید باتوں کو ذکر کر کے المطالب العالیہ کو تین کتابوں کا مجموعہ بنا دیا۔

یہ کتاب کویت کی وزارت اوقاف کی طرف سے ۱۳۹۰ھ = ۱۹۷۰ء میں چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

کشف الأستار عن زوائد البزار:

یہ بھی زوائد ہی کے سلسلے کی ایک کتاب ہے، اس کے مصنف حافظ نور الدین علی بن ابی بکر ہیثمی (متوفی ۸۰۷ھ) ہیں، اس میں علامہ ہیثمی نے مسند بزار کی ان حدیثوں کو جمع کیا ہے، جو صحاح ستہ میں مروی نہیں ہیں۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کتاب کا ایک نہایت عمدہ و نفیس و تاریخی نسخہ کسی علمی سفر کے دوران کہیں دستیاب ہو گیا تھا، اس نسخے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ مصنف کی زندگی (۸۰۷ھ میں) لکھا

گیا ہے، اس کی نقل سے فارغ ہونے کے بعد مصنف کے سامنے اس کو پڑھا گیا ہے، اس کے بعد یہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے زیر مطالعہ رہا ہے، ان خصوصیات کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ ایک نادرۂ روزگار نسخہ ہے۔

علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نسخے کو نقل کرایا، پھر اس کی ایک ایک حدیث کو ہیثمی ہی کی ایک دوسری کتاب مجمع الزوائد میں تلاش کروا کر ہیثمی نے اس پر جو کلام کیا ہے، اس کو نقل کرایا۔

اس کی تحقیق وتعلیق سے ۱۳۹۹ھ میں فارغ ہوئے، اور اسی سال جو کہ ۱۹۷۹ء کے مطابق ہے یہ کتاب چار جلدوں میں موسسۃ الرسالۃ بیروت سے شائع ہوئی۔

مجمع بحار الانوار:

ہندوستان کے مشہور محدث اور اکبری دور کے زبردست عالم ملک العلماء محدث وعلامہ محمد طاہر پٹنی (متوفی ۹۸۶ھ) کی تصنیف **مجمع بحار الأنوار في غرائب التنزيل ولطائف الآثار** حدیث کے لغت پر ایک شاہکار اور بے نظیر کتاب ہے، یہ کتاب لکھنؤ کے مشہور پریس منشی نول کشور سے چار بار چھپ چکی تھی، حالانکہ ان طباعتوں میں غلطیاں بہت تھیں، اس کے باوجود مطبوع ہونے کی وجہ سے اہل علم کی دسترس میں تھی، پھر آہستہ آہستہ اس کے نسخے ناپید اور نایاب ہوتے گئے، بالآخر علامہ محمد طاہر رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ہم وطن اور علم دوست حضرات کو- جو حجاز میں مقیم ہیں- اس عظیم علمی سرمائے کے احیاء اور جدید تقاضوں کے مطابق طباعت واشاعت کا خیال ہوا، ان کی خواہش پر علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تعاون اور رہنمائی سے اس کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرا کے اس کی تصحیح کی، اور اس کو ایڈٹ کر کے از سر نو اشاعت کے قابل بنایا، اسی کے ساتھ اس کے لیے ایک مبسوط مقدمہ بھی سپرد قلم فرمایا، یہ کتاب پانچ جلدوں میں ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۷ء سے ۱۳۹۵ھ = ۱۹۷۶ء کے دوران مجلس دائرۃ المعارف النعمانیۃ حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

فتح المغیث:

ابوالفضل زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی (متوفی ۸۰۶ھ) حدیث کے ایک بڑے امام وحافظ گزرے ہیں، انھوں نے اصول حدیث پر الفیۃ کے نام سے ایک منظوم رسالہ تصنیف

فرمایا تھا، اس منظومہ کی شرح نثر میں مشہور محدث حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ لکھی ہے، جو علم حدیث پر بڑی ہی جامع، وقیع اور اہم کتاب خیال کی جاتی ہے، یہ کتاب مطبوعہ اور دستیاب تھی، لیکن کتابت وطباعت کی اغلاط سے پُر تھی، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اس کا صحیح اور پاکیزہ نسخہ شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور آپ نے اس کے کئی ایک نسخوں کا باہم مقابلہ کر کے ایک تصحیح شدہ نسخہ تیار کیا، اور مطبعۃ الاعظمی مئو سے طبع کیا، یہ کتاب تین جلدوں میں تھی، مگر افسوس کہ اس کی ایک ہی جلد آپ کی تصحیح سے زیور طباعت سے آراستہ ہوسکی۔

تلخيص خواتم جامع الأصول:

اس کے مصنف بھی علامہ محمد طاہر پٹنی ہیں، اس کتاب میں اختصار کے ساتھ رواۃ حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، جامع الاصول علامہ ابن الاثیر جزری کی ایک مشہور و معروف کتاب ہے، جس میں انھوں نے صحاح ستہ کی روایات کو جمع کیا ہے، اور اس کے آخر میں ان کتابوں کے راویوں کا تعارف کرایا ہے، علامہ پٹنی نے اس کے اسی حصے کا خلاصہ کیا ہے۔

علامہ اعظمی کو اس کے قلمی نسخے رام پور اور ندوہ کے کتب خانوں میں دریافت ہوئے تھے، پھر آپ نے اس کے ایک دوسرے نسخے کا فوٹو بانکی پور کی لائبریری سے حاصل کر کے اس کو ایڈٹ کیا، یہ کتاب ۱۳۹۵ھ میں شیخ عبدالغنی نورولی پٹنی مقیم حجاز کے نفقے پر مالے گاؤں سے شائع ہوئی۔

کتاب الثقات:

یہ کتاب -جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے- ثقہ راویوں کے تذکرہ وتعارف پر مشتمل ہے، اس کے مصنف ابوحفص عمر بن احمد بن شاہین ہیں، بمبئی کی جامع مسجد کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ حاصل ہوا تھا، آپ نے اس کتاب کو نقل کروایا اور اس کو ایڈٹ کر کے قابل اشاعت بنایا، لیکن افسوس کہ اس کی تحقیق پر تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی حلیۂ طباعت سے مزین نہ ہوسکی۔

ان کے علاوہ علم حدیث کے سلسلے میں آپ کی اور بھی بہت سی خدمات ہیں، لیکن اس مختصر وقت میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ان ہی کے تذکرہ وتعارف پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

اہل علم کے تاثرات واعترافات

اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت ان کے اکابر یا معاصر اہل علم کے وہ اقوال وتاثرات بھی پیش کردیے جائیں جو علم حدیث میں آپ کی عظمت وبلندی کے متعلق ان کے زبان وقلم سے نکلے ہیں، آپ کی محدثانہ عظمت اور علمی تفوق کے اعتراف میں اہل علم کے اقوال اس کثرت سے ہیں کہ اگر ان کو مرتب کیا جائے تو ایک رسالہ تیار ہوسکتا ہے، راقم الحروف کی مرتب کردہ کتاب ''حیات ابوالمآثر'' میں یہ باب ۶۰ صفحات سے زیادہ میں پھیلا ہوا ہے، یہاں صرف چند اقوال وتاثرات کے ذکر پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

علماء ہند کے اقوال وتاثرات:

☆ .... آپ کے پیر ومرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے آپ کی کتاب ''نصرۃ الحدیث'' دیکھ کر اس کے بارے میں تحریر فرمایا کہ:

''جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقّق نہ لکھ سکتا۔''

☆ .... آپ کے استاذ وشیخ علامہ محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ نے آپ کی کتاب ''الحاوی لرجال الطحاوی'' کو استحسان اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، اور حیرت واستعجاب کے ساتھ اس کے حوالوں اور مراجع کے سلسلے میں دریافت کرتے رہے۔

ایک دوسرے استاذ شارح صحیح مسلم اور محدث ومفسر وفقیہ علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ سے آپ کی برابر خط وکتابت رہا کرتی تھی، اور حضرت مولانا عثمانی آپ کو نہایت محبت والفت بھرے خطوط لکھا کرتے تھے، ایک خط میں لکھا تھا:

''کاش الحاوی چھپ جاتی تو ہم کو بھی اپنے کام میں مدد ملتی۔''

☆ .... شیخ الاسلام وبطل جلیل حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''رکعات تراویح'' پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات ایک خط میں تحریر فرمائے، اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

''میں نے رسالہ مذکورہ کا ابتدا سے اخیر تک مطالعہ کیا ہے، میں حضرت مؤلف ممدوح

کی تحقیقات انیقہ اور دلائل قویہ پر حضرت کو مبارک باد دیتا ہوں، جنھوں نے ان مدعیوں کے خرمنہائے تزویر پر صواعق محرقہ برسا کر نیست و نابود کر دیا ہے''۔

☆.........گزشتہ صدی کے عظیم مؤرخ و محقق علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ سے علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے نہایت گہرے اور مضبوط روابط و مراسم تھے، اور دونوں بزرگوں میں بڑی انس و محبت تھی، اور دونوں ایک دوسرے کی دل کی گہرائی سے قدر کرتے تھے، چنانچہ سید صاحب نے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز شاگرد مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی مفتی دارالعلوم دیو بند کو ایک خط میں لکھا:

''ہندوستان کے ان دوستوں میں سے جن کے جیتے جی چھوٹ جانے کا افسوس ہے، ایک مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں، اور دوسرے آپ کے استاد مکرم مولانا حبیب الرحمٰن (اعظمی) ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو مستفید فرمائے۔''

مولانا شاہ معین الدین ندوی رحمۃ اللہ علیہ حیات سلیمان (ص: ٦٣٧) میں سید صاحب کے تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علمی دائرے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوبکر شیث جونپوری، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا ابوالکلام سے زیادہ تعلقات تھے۔''

اس کے بعد اگلے صفحہ (ص: ٦٣٨) پر لکھتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اگر چہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، لیکن حدیث و فقہ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اسی لیے سید صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے، اور فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔''

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اہم کتاب ''الازہار المربوعۃ'' پر اپنے تبصرے میں لکھا تھا:

''اس بحث میں ہمارے ہندی دوست مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیب سابق شیخ ازہر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جنھوں نے اسی بحث پر ایک رسالہ ''الابحاث في التطليقات الثلاث'' لکھا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقلیات کے علاوہ نقلیات

میں بھی ہندوستان کا علم بحمد اللہ مصر سے زیادہ ہے۔''

☆ ....مولانا مناظر احسن گیلانی نے جو تصنیف وتالیف کی دنیا میں اپنی ایک انفرادی شان رکھتے تھے، ''نصرۃ الحدیث'' دیکھ کر آپ کو ایک خط میں لکھا:

''میں نے آپ کی کتاب نصرۃ الحدیث اول سے آخر تک پڑھی، ماشاء اللہ آپ نے کافی محنت اور مطالعہ فرمایا ہے، نئی چیزیں اس سلسلہ میں آپ نے پیش کی ہیں، خدا آپ کو جزائے خیر دے............، اگر حکم ہو تو آپ کی کتاب پر مفصل ریویو لکھنا اپنی سعادت خیال کروں گا، آپ جیسے دین کے مخلص خدام کا سرمایہ عز وشرف فی الدنیا والآخرہ ہے''۔

☆ ....مشہور عالم ومحدث مولانا محمد یوسف بنوری علیہ الرحمۃ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے نہایت سچے اور مخلص قدر دانوں میں تھے، ان کے قلب ونگاہ میں آپ کا کیا مقام ومرتبہ تھا، اس کا اندازہ مولانا محمد طاسین صاحب مرحوم کے ایک خط سے ہوتا ہے، جس میں انھوں نے لکھا تھا:

''غائبانہ آپ کا ذکر خیر جن تعریفی الفاظ کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، ہم لوگ سن کر حیران رہ جاتے، وہ (مولانا بنوری) آپ کو (علامہ اعظمی کو) اپنے وقت کا عظیم محدث فرمایا کرتے تھے''۔

☆ ....مولانا ابوالوفا افغانی علیہ الرحمہ کا شمار اس دور کے بلند پایہ اہل علم وتحقیق میں ہوتا تھا، انھوں نے کتاب الزہد والرقائق پر اپنی تقریظ میں لکھا ہے:

''فقد اطلعت على كتاب الزهد للإمام ابن المبارك رحمه الله، الذي رتب أصوله، وصححها، وعلق عليه العلامة اللبيب الحبيب مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي -لا زال ناصراً للسنة ومُدَّ فيوضه-، فوجدته ماهراً للعلوم، حاوياً بها، أميناً لرواياته، حلَّ في تعليقه مشكلات الكتاب، وخرَّج أحاديثه وآثاره، وقدّمه بمقدمة ثمينة مفيدة تدل على سعة اطلاعه، وطول باعه، قلَّ له نظير في علماء زماننا.''

میں نے امام ابن مبارک رحمہ اللہ کی کتاب ''الزہد والرقائق'' دیکھی، جس کے اول کی

ترتیب اور تصحیح وتعلیق علامہ لبیب وحبیب مولانا شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی - خدا ان سے ہمیشہ حدیث وسنت کی خدمت لیتا رہے، اور ان کے فیض میں اضافہ ہوتا رہے- نے کی ہے، پس میں نے ان کو علوم کا ماہر وجامع اور روایات کا امین پایا، انھوں نے اپنی تعلیقات میں کتاب کے مشکل مقامات کو حل کیا، اس کی احادیث وآثار کی تخریج کی، اور اس پر ایک قیمتی اور مفید مقدمہ لکھا، جس سے ان کی وسعت معلومات اور یدطولیٰ کا پتہ چلتا ہے، ہمارے زمانے کے علماء میں ان کی نظیر کم ملے گی۔

مولانا افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ ایک خط میں آپ کو لکھا تھا:

''کرم نامہ نے عرصہ کے بعد اپنے ورود سے مسرور کیا، کاش بیماری کے وقت مطلع کیا جاتا، تو بقیہ احباب کی دعاؤں کے ساتھ اس حقیر ناکارہ کی دعائیں بھی جاری رہتیں ......، اللہ جل شانہ آپ کو تندرستی وصحت کاملہ عطا فرمائے، آپ کی ہستی اس وقت اہل علم کے لیے رحمت ہے۔''

☆.........مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ۲۸؍اگست ۱۹۵۸ء کو ایک خط میں لکھا:

''آپ یقین مانیے ہندوپاک کے علمائے محققین میں آج کل میں صرف ایک تنہا آپ کی ذات کو مانتا ہوں جن سے علمی امور میں رجوع کرنا اپنا علمی فرض سمجھتا ہوں۔''

اور ۲۴؍دسمبر ۱۹۶۷ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''میں نے کتاب الزہد والرقائق پوری پڑھ لی ہے، اگرچہ چھوٹا منھ بڑی بات ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ کا علم وفضل، بصیرت ودقت نظر اور وسعت نظر کی داد نہیں دی جاسکتی ......، اس کا افسوس تھا کہ برصغیر ہندوپاک میں قاہرہ کے ساعاتی، احمد محمد شاکر اور کوثری جیسے محقق علماء نظر نہیں آتے، لیکن الحمدللہ آپ نے نہ صرف تلافی کردی ہے، بلکہ ان حضرات سے بھی بعض چیزوں میں سبقت لے گئے ہیں۔''

☆.........مولانا عبدالماجد دریابادی نے کتاب الزہد والرقائق پر تبصرہ کرتے ہوئے ''صدق جدید'' کے ۲؍جون ۱۹۶۷ء کے شمارے میں لکھا تھا:

''محدث وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات فن حدیث میں یوں بھی کچھ کم نہ تھیں، مستحق تہنیت وتبریک ہیں کہ اس نادر کتاب کی بھی تدوین کی سعادت انھیں کے حصہ میں آئی۔

کتاب اس قابل ہے کہ یورپ اور امریکہ جائے اور وہاں کے ماہرین اسلامیات دیکھیں کہ ہندوستان کے ایک قصبہ میں بیٹھ کر ایک گوشہ نشین نے وہ کام کر دیا، جو مستشرقین اپنے لامحدود ذرائع کے بعد ہی انجام دے پاتے ہیں۔''

اور سنن سعید بن منصور پر اپنے تبصرے میں صدق جدید ۲/اگست ۱۹۶۸ء میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے خادمان حدیث اور ماہرین علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست ہی تیار کی جائے، تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن (مئو، ضلع اعظم گڈھ) کا ہوگا۔''

☆.........مولانا عامر عثمانی مرحوم نے ''تجلی'' ۱۹۶۳ء میں لکھا کہ:

''مولانا اعظمی فن حدیث میں قابل رشک براعت ومہارت کے سرمایہ دار ہیں، اور صرف ہندو پاک ہی کے نہیں دنیائے عرب کے ارباب نظر بھی ان کے کمال تبحر کے معترف ہیں۔''

اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں:

''مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی دقیق ونازک نکات فن کو بھی اس سلاست وبلاغت کے ساتھ سپرد قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی کے بغیر بات آئینہ ہوجاتی ہے، ان کی قوت حافظہ کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن ان کے رشحات قلم میں فراست کا جو نور، جو گیرائی، جو عبور اور جو کامل دسترس پائی جاتی ہے، اس سے خاتم المحدثین علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، وہی روشن وراست، وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت، وہی تبحر اور وہی شان نقد۔''

☆.........رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۶/جنوری ۱۹۵۶ء کو ایک

خط میں لکھا:

''آپ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین ہیں، میرے دل میں آپ کے تقویٰ، علم وپرہیز گاری کی وجہ سے، بہت زیادہ عزت ہے۔''

اور ۱۵؍فروری ۱۹۵۶ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے آپ سے ایک تعلق ہے، کیونکہ آپ ان کے علم کے وارث ہیں، اس لیے مجبور ہوں کہ آپ سے اپنا تعلق رکھوں۔''

☆ .... مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ یکم محرم ۱۳۸۴ھ = ۱۴؍مئی ۱۹۶۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میری یہ عجب بدقسمتی اور عجیب سوءِ اتفاق، کہ میں ایک طرف تو آپ سے ایسا گہرا نیاز مندانہ تعلق رکھتا ہوں اور آپ سے ایسی علمی عقیدت ہے جو کسی دوسری معاصر شخصیت سے نہیں، نہ ہندوستان میں نہ ہندوستان سے باہر مصر وشام میں، اگرچہ یہ ایک تحسین ناشناس ہے اور میرا اعتراف کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن بہرحال واقعہ ہے۔''

ایک خط میں- جس میں ۳؍شوال کی تاریخ درج ہے، لیکن سنہ تحریر نہیں ہے- لکھا ہے:

''حدیث وسنت کی جیسی خدمت اللہ تعالیٰ آپ سے لے رہا ہے، وہ موجب صد شکر ومنت ہے، **ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء**۔''

اور اپنی کتاب ''اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین'' میں ایک عنوان ''چند باکمال حضرات جنھوں نے تنہا اکیڈمیوں کا کام کیا'' کے تحت صفحہ ۶۰ پر رقمطراز ہیں:

انھیں شخصیات میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا نام بھی بہت نمایاں ہے، جن کی علم حدیث واسماء الرجال میں فنی مہارت، اور علوم حدیث میں دقت نظر اور گہری بصیرت مصنف عبدالرزاق کی محدثانہ خدمت سے عیاں ہے، ایک مستقل جلد اس کتاب کے مقدمہ پر مشتمل ہوگی، اس سے پہلے مسند الحمیدی اور سنن سعید ابن منصور کی تحقیق وتصحیح کی خدمت انجام دے چکے ہیں، ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقائق حافظ نورالدین ہیثمی کی کشف الاستار عن زوائد البزار اور حافظ ابن حجر العسقلانی کی

المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية کی تحقیق کی ہے۔ (طبع اول: لکھنؤ ۱۴۰۲ھ= ۱۹۸۲ء)

☆ .... مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۳/ربیع الاول ۱۳۸۳ھ کو مولانا ابراہیم میاں (جوہانسبرگ) کو ایک خط میں لکھا:

''مولانا اعظمی کے علم وفضل کے کیا کہنے، سنن سعید بن منصور کو تیار کیا فرمارہے ہیں کہ اس میں چار چاند لگا رہے ہیں۔''

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ جب مصنف عبدالرزاق کی اشاعت کے سلسلے میں بیروت تشریف لے گئے، تو اس وقت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ایک خط میں لکھا تھا:

''شاہ ولی اللہ ثانی کی یہ خدمت حدیث عنداللہ ماجور عندالناس مشکور ہوگی۔''

علماءعرب کے اقوال وتاثرات:

☆ .... یہاں تک ہندوستانی اہل علم کے خیالات سپرد قلم کیے گئے ہیں، اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہوئے اب ہم بلاد عرب کے اہل علم کے کچھ تاثرات نقل کرتے ہیں، سب سے پہلے مشہور حنفی عالم ومحقق علامہ شیخ زاہد کوثری کے تاثرات پیش کرتے ہیں، علامہ کوثری کے متعدد خطوط علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے نام محفوظ ہیں، وہ اپنے خطوط میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو نہایت بلندوبالا الفاظ سے خطاب فرماتے ہیں، کبھی لکھتے ہیں:

''**العلامة الكبير**'' اور کبھی ''**الجهبذ الفريد**'' اور کبھی ''**العلامة النحرير الأستاذ الكبير**'' اور کبھی ''**حضرة مولانا العلامة الأوحد والنحرير المفرد**'' جیسے الفاظ تحریر فرماتے ہیں۔

شیخ زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے منية الألمعي کے مقدمے میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

''**مولانا العلامة النحرير والجهبذ الخبير أبو المآثر حبيب الرحمن الأعظمي**''

منية الألمعي نویں صدی ہجری کے مشہور حنفی عالم ومحدث حافظ قاسم بن قطلوبغا (متوفی ۸۷۹ھ) کی کتاب ہے، جس میں انھوں نے ان احادیث کو جمع کیا ہے، جو نصب الراية کے مصنف

علامہ جمال الدین زیلعی (متوفی ۷۶۲ھ) کو نہیں ملیں، حافظ قاسم بن قطلو بغا کی اس کتاب کو شیخ زاہد کوثری نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ کیا، تو حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ قاسم بن قطلو بغا کے ان استدراکات کو جوانھوں نے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۵۲ھ) کی درایہ پر لکھے تھے، اور حضرت محدث اعظمی کے پاس محفوظ درایہ کے ایک قلمی نسخے پر خود ابن قطلو بغا کے دست مبارک سے تحریر کیے ہوئے تھے، شیخ زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نقل کرکے بھیجا، شیخ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی اس علمی کاوش کا ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا:

''وإني أشكر مولانا العلامة النحرير والجهبذ الخبير أباالمآثر حبيب الرحمن الأعظمي السالف الذكر على تفضله بكتابة التعليقات بخط يده المباركة، ومبادرة بإرسالها إلى هذا العاجز مع ماله من الأشغال الكثيرة، فإنه هو السبب الأوحد لنشر الإثنين معاً.''

(میں شکرگزار ہوں علامہ نحریر جہبذ خبیر مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی کا، جن کا اوپر ذکر کیا گیا، ان کی اس کرمفرمائی کے لیے جوانھوں نے کثرت اشغال کے باوجود ان تعلیقات کو اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھ کر اور اس عاجز کے پاس ارسال فرما کر کیا ہے، در اصل دونوں کی ایک ساتھ اشاعت کا وہ تنہا ذریعہ بنے ہیں)

☆ ....مشہور مصری عالم و محقق علامہ احمد علامہ احمد محمد شاکر نے جب مسند امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی شرح و تحقیق کرکے اس کو شائع کیا، تو حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تحقیق میں پائی جانے والی بہت سی فروگزاشتوں کو قلم بند کرکے ان کے پاس روانہ کیا، شیخ احمد محمد شاکر اس کو دیکھ کر اس قدر مسرور ہوئے کہ حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شکریہ کا خط روانہ کیا، اور پھر ان کے ان استدراکات کو مسند کی پندرہویں جلد میں شائع کیا، شیخ احمد شاکر کا خط طویل ہے، اس کا ایک حصہ ذیل میں نقل کیا جارہا ہے:

''حضرتة الأخ العلامة الكبير المحقق الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمي!
جاء ني كتابكم الأول النفيس، أما استدراكاتكم فكلها نفيسة عالية، وأشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة، وأرجو أن تزيدوني من

إشاراتكم وإرشاداتكم خدمةً للسنة النبوية المطهرة، وأنتم -كما رأيت من عملكم- من أعظم العلماء بها في هذا العصر، فالحمد للّٰه على توفيقكم. ثم أكرر الرجاء ألا تحرموني من آرائكم النيرة، وتحقيقاتكم النفيسة، حفظكم اللّٰه وبارك فيكم۔''

(آپ کا نفیس گرامی نامہ ملا، آپ کے تمام استدراکات نہایت عمدہ اور بلند رتبہ ہیں، اس عظیم توجہ فرمائی پر خلوص قلب کے ساتھ آپ کا شکر گزار ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ سنت نبویہ مطہرہ کی خدمت کے جذبے سے مجھے مزید مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازیں گے، آپ کی اس کاوش کو دیکھنے کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ آپ اس زمانے میں حدیث پاک کے عظیم ترین علماء میں ہیں)۔

☆.........سابق شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے مکہ مکرمہ میں ایک مجلس کے اندر جس میں مولانا علی میاں ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی بھی موجود تھے، حضرت محدث اعظمی کے بارے میں فرمایا تھا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ اگر سارے عالم میں کوئی ''محدث اعظم'' کے خطاب کا مستحق ہے، تو یہ شخص ہیں۔

دارالعلوم ندوہ کے پچاسی سالہ اجلاس کے موقع پر شیخ الازہر ہندوستان تشریف لائے، تو اپنے اس سفر میں ڈابھیل بھی تشریف لے گئے، ان کے ہمراہ مصر کے وزیر اوقاف شیخ محمد حسین ذہبی بھی تھے، ڈابھیل کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے شیخ محمد حسین ذہبی نے حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کہا کہ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے محدث ہیں، تو شیخ الازہر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا: ''**بل إنه أكبر علماء العالم الإسلامي**'' (یعنی صرف ہندوستان کے نہیں بلکہ عالم اسلام کے سب سے بڑے عالم ہیں)۔

☆.........مشہور شامی عالم ومحدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے بے پناہ محبت اور شیفتگی تھی، اس کا اندازہ پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی سابق صدر شعبۂ عربی الہ آباد یونیورسٹی کی اس تحریر سے ہوتا ہے کہ:

''مجھے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ صاحب سے ۱۹۵۶ء میں حلب (شام) میں نیاز حاصل

ہوا، ریاض (سعودی عرب) میں کئی برس ایک ہی یونیورسٹی میں شرف رفاقت بھی حاصل ہوا، تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی اور مختلف مسائل وشخصیات کے بارے میں گفتگو ہوتی، علماء ہند کے تذکرہ کے وقت حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ضرور آتا، ان کا نام آتے ہی آنکھیں اشکبار ہوجاتیں، شیخ ابوغدہ مدظلہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے بے حد مداح، فریفتہ اور گرویدہ وقدرداں ہیں۔''(۱)

شیخ کی اس جذباتی کیفیت اور نمدیدگی کا حال اس وقت تھا، جب حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ابھی بقید حیات تھے، اس سے شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کے غایت تعلق ومحبت کا پتہ چلتا ہے۔

شیخ ابوغدہ کے حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے نام بہت سارے خطوط محفوظ ہیں، شیخ ان خطوط میں حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے اونچے القاب وخطابات سے یاد کیا کرتے تھے، کبھی لکھتے: ''**الأستاذ الجليل والمحدث النبيل شيخنا وبركتنا وبركة العصر العلامة الشيخ**''، اور کبھی لکھتے ہیں: ''**العلامة الأجل والمحدث الأنبل**''۔

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سے جب مسند حمیدی شائع ہوئی، تو اس پر شیخ ابوغدہ نے نہایت گرانقدر تبصرہ تحریر فرمایا، آپ کا یہ تبصرہ مجلۃ المجمع العلمی کے اکتوبر ۱۹۶۳ء = جمادی الاولیٰ ۱۳۸۳ھ کے شمارے میں شائع ہوا، شیخ کے تبصرے کے الفاظ یہ ہیں:

"**وقد صدر منه الجزء الأول محققاً عن أربع نسخ مخطوطة، في طباعة جيدة متقنة، وبتحقيق وتعليق العلامة الكبير المحقق المحدث مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، الذي عرفه علماء بلاد الشام ومصر والمغرب وغيرها من تحقيقاته واستدراكاته النادرة الغالية على العلامة الشيخ أحمد محمد شاكر رحمه الله تعالىٰ في تحقيقه لكتاب مسند أحمد**".

(مسند حمیدی کی پہلی جلد چار قلمی نسخوں کے مقابلہ کے بعد محقق طور پر نہایت عمدہ طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے، جس کی تحقیق وتعلیق علامہ کبیر ومحقق ومحدث مولانا شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی نے کی ہے، جن کو شام ومصر اور مراکش وغیرہ کے علماء مسند احمد پر علامہ شیخ احمد محمد شاکر رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پر ان کے بیش قیمت اور نادر تحقیقات اور استدراکات کی وجہ

سے جانتے ہیں)۔

اور فقہ أہل العراق وحدیثھم میں حضرت محدث اعظمی ﷫ کا تذکرہ حسب ذیل انداز میں کیا ہے:

"العلامة المحدث البارع الفقيه الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي صاحب التعليقات البديعة، والتحقيقات النادرة، العالم بالرجال والعلل، وتعليقاته وتحقيقاته السنية على سنن سعيد بن منصور، والزهد لابن المبارك، ومسند الحميدي واستدراكاته على الشيخ أحمد شاكر في تعليقه على مسند أحمد، ثم تعليقاته الحافلة، على مصنف عبدالرزاق الذي يطبع الآن بعون الله، كلها تنطق بسمو فضله وبسطة يديه في هذا العلم الشريف."

(محدث ماہر وفقیہ علامہ شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی، انوکھی تعلیقات اور عجیب وغریب تحقیقات کے مالک، علل اور علم اسماء الرجال کے عالم، سنن سعید بن منصور، مسند حمیدی اور عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد پر ان کی بیش قیمت تعلیقات اور مسند احمد پر شیخ احمد شاکر کی تعلیقات پر ان کے استدراکات، پھر زیر طباعت مصنف عبدالرزاق پر ان کے بھرپور حواشی، یہ سب چیزیں ان کی بلندی، ان کے علم وفضل اور اس پاکیزہ علم پر ان کی دستگاہ کی شہادت دیتے ہیں)۔

☆ ....شیخ محمود محمد شاکر علامہ احمد محمد شاکر کے بھائی تھے، اور ان کا شمار بھی بڑے اہل علم وتحقیق میں ہوتا تھا، ان کی نگاہ میں حضرت محدث اعظمی ﷫ کا کیا مقام تھا، اس کے متعلق ڈاکٹر محمد اسماعیل ندوی نے مصر سے ایک خط میں لکھا تھا، یہ خط یکم جولائی ۱۹۶۰ء کے صدق جدید میں شائع ہوا تھا، اس خط کا متن یہ ہے:

''یہاں (مصر) کے مشہور فاضل محمود شاکر صاحب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (مولانا اعظمی) بعض اعتبار سے ان کے بھائی مشہور محدث احمد محمد شاکر مرحوم سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔''

☆ ....شیخ عابد الفاسی الفہری فاس (مراکش) کی مشہور لائبریری خزانۃ جامعۃ

القرویین کے محافظ ونگراں اور ایک فاضل شخص ہیں، مصنف عبدالرزاق حضرت محدث اعظمی ﷫ کی تحقیق سے شائع ہونے کے بعد جب ان کے پاس پہنچی ہے، تو انھوں نے ۳۰ر جولائی ۱۹۷۳ء کو مکتب اسلامی بیروت کے پتے پر ایک خط لکھا، اس میں انھوں نے لکھا تھا:

''فقد تشرفنا بوصول كتاب المصنف للحافظ الكبير أبي بكر عبدالرزاق ابن همام الصنعاني الذي عني بتحقيق نصوصه وتخريج أحاديثه الشيخ الإمام العلامة المحدث السيد حبيب الرحمن الأعظمي.''

اسی خط میں چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

''إن الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي هذا أجدر الناس بتحقيق كتب السنة والتعليق عليها، فهو أحد أفراد هذا العصر، الذي هيأ نفسه وهيأه الله تعالىٰ لتجديد هذا الدين، تصديقاً لقول النبي عليه السلام: إن الله يبعث على رأس كل مائة سنة من يجدد لهذه الأمة أمر دينها ....''

(شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کتب حدیث کی تحقیق وتعلیق کے سب سے زیادہ حق دار ہیں، وہ ایسے یکتائے زمانہ ہیں، جنھوں نے خود کو تیار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس دین کی تجدید کے لیے مہیا فرمایا، رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کے مصداق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر سو سال پر ایک ایسے شخص کو پیدا فرمائے گا جو اس امت کے لیے دین کی تجدید کرے گا)۔

اختصار کے ساتھ یہ حضرت محدث الاعظمی ﷫ کے علم حدیث سے متعلق کارناموں کا تعارف اور اہل علم وفضل کے تاثرات تھے، جن سے احیاء سنت، علم حدیث کی اشاعت، کتب احادیث کی تحقیق وتعلیق وتحشیہ اور ان کی طباعت سے متعلق آپ کے مجددانہ کارناموں پر ایک ہلکی اور مدھم سی روشنی پڑتی ہے۔ حضرت محدث الاعظمی ﷫ کی حیات وخدمات پر خاکسار کی مرتب کردہ کتاب ''حیات ابوالمآثر'' میں، جو دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کی تفصیلات ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ
بحیثیت محدث کبیر

مولانا زین العابدین صاحب معروفی رحمۃ اللہ علیہ ☆

۱- ہمارے دیار میں جو علمی جگہیں ہیں مثلاً پورہ معروف، مبارکپور، اعظم گڈھ، مئو وغیرہ اور ان کے اطراف ضلع غازی پور، بلیا وغیرہ وہاں عرف عام یہ ہے کہ بڑے مولانا، بولنے یا سننے پر بلا تأمل محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی قدس سرہ کی ذات سمجھی جاتی تھی۔ اگر آپ کی بات (خواہ مسئلہ مسائل سے متعلق ہو یا حدیث وقرآن کے بارے میں ہو) کا جب کسی نے حوالہ دیا، تو تھوڑی دیر کے لیے علماء کرام تک خاموش ہو کر غور کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ آپ کے فقہی فتاویٰ اور حدیثی تحقیقات کا لوہا علمائے امت نے مان لیا تھا۔

ان کے صرف محدث ہونے کی حیثیت سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں، پہلے بطور تمہید ایک قاعدہ کلیہ عرض کرتا ہوں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۰۱۴ھ نے موضوعات کبیر ص ۸۷ پر تحریر کیا ہے:

ومن القواعد الكلية أن نقل الأحاديث النبوية والمسائل الفقهية والتفاسير القرآنية لا يجوز إلا من الكتب المتداولة لعدم الاعتماد على غيرها.

ایک قاعدہ کلیہ یہ بھی ہے کہ احادیث نبویہ اور فقہی مسائل اور قرآن پاک کی تفسیریں صرف متداول کتابوں سے ہی نقل کرنی جائز ہیں کیونکہ غیر متداول پر اعتماد نہیں۔

اور عدم اعتماد کی بنیاد دو چیزیں ہیں: پہلے یہ کہ غیر متداول کتابیں جن مصنفین کی طرف منسوب ہیں ان کی کوئی سند نہیں کہ واقعی وہ انھیں کی تصنیف ہوں، برخلاف متداول کتابوں کے کہ ہر زمانہ میں ان کے نقل کرنے والے اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ نہ تو اتفاق سے سب کی بات جھوٹی

☆ سابق شیخ الحدیث مظہر العلوم بنارس، وصدر شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم، سہارن پور۔

ہوسکتی ہے اور نہ وہ ناقلین جھوٹ بولنے پر اتفاق ہی کر لیتے ہیں۔

دوسری بنیاد یہ ہے کہ اگر واقعی انھیں مصنفین کرام کی تصنیف ہوں بھی تو غیر متداول ہونے اور اتفاقیہ کسی کے پاس ایک دو نسخہ پائے جانے سے اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ ملحدوں وغیرہ نے اس میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے نہ ملا دی ہوں، لیکن محفوظ ومتداول کتابوں میں یہ شبہہ نہیں رہتا کیونکہ اس کے متعدد صحیح نسخے موجود رہتے ہیں۔

یہ بات محققین کے نزدیک مسلمات میں سے ہے۔ چنانچہ خود کتب حدیث کی ترتیب باعتبار صحت وقوت سند کے جہاں بیان کرتے ہیں وہاں امت کے تداول اور تلقی بالقبول کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ نے شرح نخبۃ الفکر میں اس کو ذکر فرمایا ہے دیکھو ص ۲۹ و ص ۳۲۔

پس غیر متداول کتابوں میں جو باتیں مذکور ہوتی ہیں محض انھیں کے اعتماد پر ان کتابوں پر مسائل کی بنیاد رکھنا جائز نہیں جب تک کہ ان باتوں کی سند متداول کتابوں میں نہ مل جائیں۔

آج کل ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے محققین جو مقالے لکھتے ہیں ان میں یہ غلطی قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ اس قسم کی کتابوں پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرتے ہیں اور علم وفضل کے پندار میں برابر مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن آیئے اس ''عظیم محدث'' کے کارناموں کا اس اعتبار سے جائزہ لیں۔ صرف دو کتابوں کا خاص وجہ سے میں انتخاب کرتا ہوں۔

(۱) مسند حمیدی جس کا نام **المسند للإمام الحافظ الكبير أبي بكر عبدالله بن الزبير الحميدي** المتوفی ۲۱۹ھ ہے، جو امام بخاری رحمہ اللہ کے مشہور استاذ ہیں۔ میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں مدرس تھا، اس زمانہ میں مجھے اطلاع ملی کہ مسند حمیدی جو آج تک نہیں چھپی ہے اور اس کے قلمی نسخے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں اس کو بڑے مولانا طباعت کے قابل بنا رہے ہیں، تو مجھے اس خبر سے کوئی خاص خوشی محسوس نہیں ہوئی کیونکہ ایک عرصے تک جو کتاب ناپید یا کمیاب رہ چکی ہو اس کو شائع کرنا ایک علمی کارنامہ تو ضرور کہلائے گا، لیکن اس سے احتجاج اور استناد قاعدہ کلیہ کے موافق درست نہیں ہوگا، جیسا کہ مسند الامام الاعظم جس کو الخوارزمی وغیرہ نے امام اعظم کی وفات کے تقریباً تین سو سال کے بعد شائع کرایا، جو اس کی حیثیت صحاح ستہ کے درجہ کی نہ ہوسکی، اگرچہ اس کی اسناد کتب ستہ سے بہت عالی ہیں۔

یہی حال مسند حمیدی کا ہوگا۔ میں اسی خیال میں مبتلا تھا کہ وہیں ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں مسند حمیدی چھپ کر احیاء العلوم میں پہنچی۔ اس کے مقدمے کو جب میں نے پڑھا تو اس کے آخر میں میرے استاذ محترم حضرت مولانا عبدالستار معروفی مدظلہ العالی کا ذکر خیر ان الفاظ میں پایا: **وللمحب الفاضل عبدالستار المعروفی ان یبلغه أمنیته فهو الذی شارکنی فی المعارضة بین النسختین، وأسال الله لنفسی ولهما جمیعا ان یختم لنا بالحسنی.** اور میں فاضل محبّ مولانا عبدالستار معروفی کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان کی مرادوں کو پوری کرادیں کیونکہ اس کتاب کے معارضہ اور دونسخوں کے مقابلہ میں وہ میرے ساتھ شریک رہے اور برخوردار مولوی رشید احمد اور الفاضل عبدالستار اور اپنے لیے اللہ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہمارا انجام خیر فرمائے۔

یہ مولانا عبدالستار ولد حاجی عبدالرشید معروفی مدظلہ العالی ہمارے دیار کے مشہور شیخ الحدیث مولانا عبدالجبار معروفی کے بڑے بھائی ہیں اور راقم تحریر نے ابتدائی عربی سے لے کر شرح وقایہ تک تمام کتابیں انھیں سے پڑھی ہیں۔ اس وقت انتہائی ضعف اور پیرانہ سالی کی زندگی مالیگاؤں میں گذار رہے ہیں۔

استاذ محترم کے تعاون اور اس خدمت میں مشارکت کی وجہ سے میرے دل میں مسند حمیدی کے پڑھنے کا داعیہ شدید ہوگیا، پہلی ہی حدیث مسند ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں سے اس سند کے ساتھ جب پڑھی اور محدث کبیر کا اس پر حاشیہ دیکھا تو مارے خوشی کے میں اچھل پڑا۔ حدیث اور محدث کبیر کی تعلیق ذیل میں ملاحظہ ہو:

أخبرنا الحمیدی، أخبرنا سفیان بن عیینة أبومحمد، ثنا مسعر بن کدام عن عثمان بن مغیرة الثقفی عن علی بن ربیعة الوالبی عن أسماء بن الحکم الفزاری سمعت علی بن أبی طالب رضی اللّٰه عنه یقول: کنت إذا سمعت عن رسول اللّٰه ﷺ حدیثا نفعنی اللّٰه (عز وجل) بما شاء ان ینفعنی منه،

ہم کو حمیدی نے خبر دی کہا ہم کو سفیان بن عیینہ ابومحمد نے بتایا کہا ہم سے مسعر بن کدام نے بیان کیا عثمان بن مغیرہ ثقفی سے نقل کر کے انھوں نے علی بن ربیعہ والبی سے انھوں نے اسماء بن حکم فزاری سے نقل کیا انھوں نے کہا میں نے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ: میں جب کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنتا تو اللہ تعالی مجھ کو اتنا نفع پہنچاتے جو منظور الٰہی

واذا حدثني غيره استحلفته فاذا حلف لی صدقته فحدثني أبوبكر وصدق أوبكر قال سمعت رسول اللّٰه ﷺ يقول ليس من عبد يذنب ذنباً فيقوم فيتوضأ فيحسن الوضوء ثم يصلي ركعتين ثم يستغفر اللّٰه إلا غفر اللّٰه له. قال سفيان وحدثنا عاصم عن الحسن عن النبي ﷺ فزاد فيه، الا انه قال ويدبر ركعتين يصلي.

ہوتا اور جب کوئی شخص مجھ سے آنحضرت ﷺ کی حدیث نقل کرتا تو میں اس سے قسم لیتا اگر وہ قسم کھالیتا تو میں اس کو مان لیتا، تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے بیان کیا اور ابوبکر نے تو سچ ہی کہا کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ: کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ اس سے کوئی گناہ ہوجائے پس اٹھ کر وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعت نماز پڑھے پھر اللہ سے مغفرت مانگے مگر اللہ اس کی مغفرت فرمادیتے ہیں، سفیان نے کہا: ہم سے عاصم نے حسن سے نقل کیا اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے تو اس حدیث میں اضافہ کیا مگر ان کے الفاظ یہ ہیں جن کو وہ نقل کررہے ہیں کہ "ركعتين يصلي"

اس حدیث پر محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ جگہ حاشیہ لگایا ہے جن میں سے ہم دو کو صرف اس لیے ذکر کرتے ہیں تاکہ فنی مہارت اور دقت نظر اور علمی تبحر کا ناظرین کو کچھ اندازہ ہوجائے۔

(۱) عن عثمان بن مغيرة پر حاشیہ ہے:

فی الاصل "عمر" وكذا فی ع وأثبت كاتب الأصل على الهامش "عثمان" وهو الصواب فقد اخرجه أحمد من طريق مسعر والثوری عن عثمان بن المغيرة (جلد ۱ ص ۱۵۳) والترمذی من طريق أبی عوانة عن عثمان بن المغيـرة (ج ۱ ص ۳۱۳) كذا فی مسند الطيالسی وعمل اليوم

کہ اصل نسخہ میں عثمان کی جگہ عمر بن مغیرہ ہے اور جامعہ عثمانیہ کے نسخہ میں بھی عمر ہی ہے لیکن اصل نسخہ کے کاتب نے حاشیہ پر عثمان لکھا ہے وہی صحیح ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے مسند ج ۱ ص ۱۵۳ پر مسعر اور ثوری کے طریق سے اس حدیث کی سند میں عن عثمان بن المغیرہ کہا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو ابوعوانہ کے طریق سے (ج ۱ ص ۳۱۳) میں تخریج کیا ہے

و الليلة لابن السنى، عثمان بن المغيرة وظنى ان الكاتب رسمه هكذا ''عثمز'' ولم ينقط المثلثة فظنه أحد النساخ عمر.

تو انھوں نے بھی عن عثمان بن المغیرہ کہا ہے اسی طرح مسند طیالسی اور ابن السنی کی کتاب عمل الیوم واللیلہ میں بھی عثمان بن المغیرہ ہے، میرا خیال یہ ہے کہ اصل کاتب نے عثمان ہی لکھا تھا لیکن الف کی جگہ کھڑا زبر اور نون کا نصف دائرہ لکھا ہوگا۔ اور ثا کا نقطہ چھوٹ گیا ہوگا اس طرح (عثمز) بعد کے کاتب نے اس کو عمر پڑھ لیا۔ اھ

خوشی کی وجہ:

مجھ کو انتہائی خوشی اس وجہ سے ہوئی کہ محدث کبیر نے اس حدیث کو اس کے مظان سے نکال کر اس کی سند متداول کتاب ہی نہیں بلکہ کئی متداول کتابوں تک پہنچادی مسند احمد بن حنبل، جامع ترمذی، مسند ابوعوانہ کتاب الیوم واللیلہ لابن السنی۔ اسی طرح ہر ہر حدیث کی تخریج کر کے واقعی امام حمیدی کی کتاب ہی کی خدمت نہ کی بلکہ احسان کا قلادہ پوری امت کے گلے میں ڈالدیا اس لیے قاعدہ کلیہ (جو اوپر مذکور ہوا) سے مخالفت بھی نہ ہوئی اور اس کتاب کا حوالہ دینا بھی درست ہوگیا دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت نے رجال میں سے عمر اور عثمان کی کتابت کی جو تحقیق پیش کی اور آخر میں جو اپنا خیال ظاہر کیا وہ ایسا عبقری انسان ہی کرسکتا ہے جو فن رجال الحدیث میں عبقریت کا حامل ہوگا۔

تنبیہ: – حضرت قدس سرہ نے ترمذی کی حدیث کا جو حوالہ ج ا ص ۳۱۳ دیا ہے وہ تحفۃ الاحوذی کی شرح کے ساتھ والے نسخہ کا ہے، اگر کوئی طالب علم رشیدیہ وغیرہ کی مطبوعہ ترمذی میں ابوعوانہ کا طریق دیکھنا چاہے تو باب ماجاء فی الصلوٰۃ عند التوبة ج ا ص ۵۴ میں دیکھے حدثنا قتيبة نا أبوعوانة عن عثمان بن المغيرة الخ.

دوسرا حاشیہ اور محدثانہ انتقاد:

محدث کبیر نے دوسرا حاشیہ اس حدیث کے ختم ہونے اور حسن کی مرسل روایت میں لفظ یدبر پر یہ لکھا:

كذا فى الاصل وكذا فى ع على ما

لفظ ''یدبر'' اصل نسخہ میں اور بظاہر جامعہ

يظهر، وانظر هل الصواب "يذبر" أى يأثر وينقل كما ورد فى حديث عند أحمد (ج ٥ ص ٢٢٩) "أنا سمعت ذاك من معاذ يذبره عن رسول الله ﷺ" ومرسل الحسن هذا ذكره المنذرى معزواً إلى البيهقى ولفظه ما أذنب عبد ذنباً ثم توضأ فأحسن الوضوء ثم خرج إلى براز من الأرض فصلى فيه ركعتين واستغفر الله من ذلك الذنب إلا غفر الله له (المنذرى ص ١٢١) واعلم أن الترمذى روى الحديث من طريق أبى عوانة فلم يذكر قوله "ركعتين" بعد قوله "يصلى"، وكذا أخرجه أحمد والمصنف بعد هذا من طريق مسعر فلم يذكرا قوله ركعتين بل صرح أن مسعراً قال: يصلى وقال سفيان يصلى ركعتين، وكذا أخرجه ابن ماجه عن أبى بكر ابن أى شيبة ونصر بن على عن مسعر وسفيان فقال فى آخره ما نقلته عن مسند أحمد (ابن ماجة ص ١٠١) فالأظهر أن زيادة ركعتين فى رواية مسعر ههنا من سهو الكاتب

عثمانیہ کے نسخہ میں بھی بدال مہملہ ہے لیکن غور کرنا چاہئے کہ کہیں ''یذبر'' بذال معجمہ ہو جس کے معنی یاثر اور ینقل کے ہیں جیسا کہ مسند احمد ج۵ ص۲۲۹ میں ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں ''أنا سمعت ذاک من معاذ يذبره عن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم'' اور علامہ منذری نے بیہقی کے حوالہ سے حسن کی مرسل روایت کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ایسا نہیں کہ کوئی بندہ گناہ کر گذرے پھر اچھی طرح وضو کرے پھر زمین کے خالی میدان میں نکل جائے وہاں دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالی سے اس گناہ کی معافی مانگے مگر اللہ اس کی مغفرت کر دیتے ہیں (المنذری ص۱۲۱)

نقد یہ بات سمجھ لو کہ ترمذی نے اس حدیث کو ابوعوانہ کے طریق سے خود ذکر کیا ہے اور ایسے ہی امام احمد نے بھی اور خود اسی کتاب میں امام حمیدی نے حدیث نمبر ۵ کے اندر مسعر اور سفیان کے طریق سے جو نقل کیا اس میں تصریح ہے کہ مسعر نے صرف یصلی کہا اور سفیان ثوری نے یصلی رکعتیں کہا تو میرے نزدیک زیادہ ظاہر یہ ہے کہ لفظ رکعتین یہاں کتابت کی غلطی ہے جیسا کہ ابن ماجہ ص ۱۰۱ میں بھی مسعر کے الفاظ ''ثم یصلی'' بغیر رکعتین

کما أشرنا إلیه سابقاً ویدل علیه قول سفیان فی آخر هذه الروایة أیضاً.

کے وارد ہے (یہ ترجمہ کا خلاصہ ہے) اور خود اسی روایت کے آخر میں سفیان بن عیینہ نے جو مرسل حسن کو نقل کیا ہے اس میں ''فزاد فیه'' کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسعر کی روایت مذکور میں کچھ کمی ہے جس کا اضافہ دوسروں نے کیا ہے۔

سبحان اللہ کیا تحقیق اور وسعت نظر ہے اور کس قدر علمی امانت کا پاس ولحاظ ہے کہ حدیث کے جملہ طرق میں مجموعی طور سے لفظ رکعتین ہونے کی وجہ سے اگر ''بڑے مولانا'' یہ تنقید نہ بھی کرتے تو کوئی حرج نہیں تھا، لیکن چونکہ اسناد مسعر کی چل رہی ہے اس میں اس سہو کاتب کو برداشت نہ کر سکے تاکہ اس سند کے متن کے الفاظ گڈمڈ نہ ہو جائیں۔

یہاں پر ایک واقعہ ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے ایک مشہور حدیث ہے ''بنی الاسلام علی خمس'' اس کو امام مسلم نے سعد بن عبیدہ السلمی کی روایت سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ان الفاظ سے نقل کیا ہے: عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال بنی الاسلام علی خمسة علی أن یوحد اللّٰه وأقام الصلوٰة وإیتاء الزکوٰة وصیام رمضان والحج. تو ایک شخص نے اس کو دہرایا اور آخر میں یہ کہہ دیا الحج وصیام رمضان اس پر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یوں نہیں (بلکہ) صیام رمضان والحج کہو (کیونکہ) میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں ہی سنا ہے، جب کہ دوسرے طرق میں ''وحج البیت وصوم رمضان'' موجود ہے، لیکن جس سماع پر ابن عمر نے تحدیث کی بنیاد رکھی تھی اس میں ترتیب دوسری تھی تو ابن عمر اس معمولی تبدیلی کو بھی برداشت نہیں کر سکے۔

اسی طرح بخاری ومسلم نے رات کو سوتے وقت ایک دعا پڑھنے کی روایت کی ہے، اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں آمنت بکتابک الذی أنزلت ونبیک الذی أرسلت، راوی (براء بن عازب رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ اس کو یاد کرنے کے لیے میں دہرانے لگا، میں نے پڑھ دیا ''وبرسولک الذی أرسلت'' لفظ نبی کی جگہ رسول پڑھ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں کہو ''آمنت بنبیک الذی أرسلت'' (مسلم ص ۳۴۸ ج ۲ بخاری ج ۲ ص ۹۳۴)

محدثانہ بصیرت کی دوسری مثال:

مسند حمیدی ص ۹ پر ایک روایت ہے:

حدثنا الحميدى، ثنا سفيان ثنا عمرو بن دينـار قـال أخبـرنى طاؤس سمع ابن عباس يقول: بلغ عمر بن الخطاب ان سمرة با ع خمراً فقال قاتل اللّٰه سمرة ألم يعلم أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: لعن اللّٰه اليهود وحرمت عليهم الشحوم فجملوها فباعوها.

اس کا حاصل یہ ہے کہ سمرہ بن جندب ؓ نے شراب بیچ دیا حضرت عمر ؓ کو خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ اللہ سمرہ کا ناس کرے کیا انھوں نے یہ نہ جانا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے یہود پر لعنت اس وجہ سے کی کہ ان پر چربی حرام ہوئی تو انھوں نے گلا کر اس کو فروخت کیا (یعنی اس کے دام سے نفع اٹھایا)

لہذا شراب کے حرام ہونے کی وجہ سے بیچ کر اس کا دام کھانا بھی حرام ہوا۔ فقہاء وشراح حدیث نے حضرت سمرہ کے شراب بیچنے کی مختلف توجیہات کی ہیں، اس حدیث کی تخریج کرتے ہوئے ''بڑے مولانا'' نے تحریر فرمایا:

أخرج مسلم وابن ماجه هذا الحديث من طريق ابن أبى شيبة عن سفيان وفيه أيضاً ''أن سمرة'' ولكن أخرجه البخارى من طريق الحميدى فقال: ''أن فلاناً'' ولم يصرح باسم سمرة وهو عندى من صنيع البخارى وحسن تصرفه ولم ينبه عليه ابن حجر.

امام مسلم اور ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو ابوبکر بن ابی شیبہ کے واسطہ سے سفیان کے طریق سے ذکر کیا ہے اس میں بھی مسند حمیدی کے اس طریق کے مطابق ''ان سمرة'' کا لفظ ہے لیکن امام بخاری نے اس حدیث کو جو خاص حمیدی کے طریق سے نقل کیا ہے اس میں حضرت سمرہ کو مبہم کر کے ''ان فلانا'' فرمایا ہے اور سمرہ کے نام کی تصریح نہیں کی، میرے نزدیک یہ امام بخاری کا ہی حسن تصرف ہے۔

اصل روایت مسند حمیدی کے مطابق حضرت سمرة کے نام کی صراحت کے ساتھ ہے، لیکن ان کے اس عیب پر پردہ پوشی کے خیال سے ''فلانا'' کہہ دیا ہے اور

اس قسم کے مواقع میں حافظ ابن حجر اپنی عادت کے
موافق تنبیہ کر دیا کرتے ہیں، لیکن اس مقام پر تنبیہ
نہیں ہے۔ (حاشیہ کی پوری وضاحت ہوئی)

راقم الحروف کہتا ہے کہ صحیح مسلم میں یہ روایت جلد دوم ص ۲۳ پر اور ابن ماجہ مطبوعہ مصطفائی کے ص ۲۵۰ پر مذکور ہے اور امام بخاری نے حمیدی کے طریق سے اس حدیث کو **باب لا یذاب شحم المیتة** ص ۲۹۶ پر ذکر فرمایا ہے اور حافظ رحمۃ اللہ نے فتح الباری میں مسلم اور ابن ماجہ کا حوالہ بھی دیا ہے، لیکن "ان فلانا"، خود امام بخاری کا حسن تصرف ہے یہ ذکر نہیں فرمایا، محدث کبیر رحمۃ اللہ نے اس حاشیہ کے ذریعہ صحیح بخاری کی بھی خدمت کی اور اس کتاب کے پڑھانے والوں کو ایک الجھن سے نجات بھی دے دی۔

تصحیح و تعلیق میں محنت شاقہ:

اس مسند کی تحقیق و تعلیق میں جس قدر محنت کرنی پڑی ہے وہ تو محدث کبیر ہی جانتے ہیں کہ ہر حدیث کو امہات کتب اور متداول کتابوں سے تخریج کرنا اتنا بڑا کام ہے اور اس قدر محنت شاقہ کا طالب ہے کہ جامع ترمذی کے "فی الباب عن فلان و فلان" کی تخریج بہت سے اہل علم نے کرنی شروع کی لیکن کسی سے مکمل نہ ہوسکی، محدث مبارکپوری نے تحفہ میں فی الباب کے تحت جو کچھ فرمایا ہے وہ سب سراج احمد الہندی کی فارسی شرح سے ماخوذ ہے، جو خود مکمل نہیں ہے۔ محدث کبیر علیہ الرحمہ نے پوری مسند حمیدی کی ایک ہزار تین سو ایک حدیثوں کی تخریج کر ڈالی وہ بھی ایک نہیں کئی کئی متداول کتابوں سے حوالہ نقل فرما دیا فجزاہ اللہ خیر الجزاء، اور اس دشواری کی طرف مسند حمیدی کے مقدمہ میں اشارہ فرمایا۔

وبذلت غاية جهدي في مراجعةمظان كل حديث حرصاً على مزيد التصحيح واعتناءً بإتمام ما عسى أن يوجد فيه من نقص واهتماما بتخريج كل حديث وإحالته على كتاب آخر من كتب الحديث ص ۵

ہر حدیث کے ملنے کی جگہوں کا جہاں جہاں گمان ہوا۔ اس کے کھنگالنے میں میں نے اپنی پوری طاقت خرچ کردی اس لالچ میں کہ حدیث کی اور زیادہ تصحیح ہوجائے اور کسی حدیث میں اگر کچھ کمی ہوسکتی ہو تو دوسری کتابوں سے وہ کمی دور کر کے حدیث مکمل کر لی جائے اور اس اہمیت کے پیش نظر کہ ہر حدیث کی تخریج کردوں اور حدیث کے

ذخیروں میں سے کسی حدیث کی کسی دوسری کتاب کا

حوالہ دیدوں۔

لیکن چند باتیں تو ایسی ہیں جن سے ہم جیسے کم علم بھی اس شاقہ محنت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۱- یہ کتاب انواع کتب حدیث میں سے ''مسند'' ہے، یعنی ایک صحابی کی جتنی حدیثیں امام حمیدی کے نزدیک قابل ذکر ہیں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترتیب سے اکٹھی مذکور ہیں، مثلاً مسند ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ مکمل ذکر کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جملہ حدیثوں کو لائیں گے، خواہ وہ کتاب الایمان سے تعلق رکھتی ہو یا کتاب العلم سے یا کتاب الوضوء والغسل سے یا کتاب الزکوٰۃ اور کتاب الصیام وغیرہ سے، اس لیے ایک مضمون کی حدیثوں کو تلاش کرنا انتہائی دشوار ہے، اس دشواری کو دور کرنے کے لیے ''محدث کبیر'' قدس سرہ نے تیس صفحات پر پھیلی ہوئی ایک مبسوط فہرست مضامین تیار کردی ہے، جس میں ہر مضمون کی حدیثوں کے نمبرات لگا دیئے ہیں، جس کی وجہ سے یہ کتاب صحیحین اور سنن اربعہ وغیرہ کے نہج کے مطابق بھی سہل الماخذ ہوگئی۔ مسند احمد کے نہج پر تو پہلے ہی سے تھی اس میں کتنی محنت لگی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے دو مثال پیش کرتا ہوں:

(الف) طهارة جلد الميتة اذا دبغ. حدیث (۳۱۵) (۴۸۶) (۴۹۱) فہرست ص۵

حدیث ۳۱۵/احادیث ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے ذیل میں ج ا ص ۱۵۰ پر بہ ایں الفاظ ہے:

حدثنا الحميدى قال: ثنا سفيان قال: ثنا الزهرى قال: أخبرني عبيدالله بن عبدالله عن ابن عباس عن ميمونة: ان النبى صلى الله عليه وسلم مر بشاة لمولاة قد أعطيتها من الصدقة ميتة فقال: ما على اهل هذه لو أخذوا إها بها فدبغوه فانتفعوا به فقالوا: يا رسول الله انها ميتة فقال انما حرم اكلها. الخ

حدیث ۴۸۶/احادیث ابن عباس کی اس نوع کی حدیثوں کے ذیل میں ہے جس میں **سمعت رسول الله يا رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم** ابن عباس نے فرمایا ہے مسند حمیدی ص ۲۲۷ پر بہ الفاظ ذیل آئی ہوئی ہے۔

سمعت رسول الله ﷺ يقول: أيما إهاب دبغ فقد طهر اور تعلیق میں ہے

أخرجه مسلم من طريق غير واحد عن سفيان بلفظ ''إذا دبغ الإهاب فقد طهر''
(ج ۱ ص ۱۵۹)

حدیث نمبر ۴۹۱، ابن عباس کی ان احادیث کے ذیل میں جس میں سمعت رسول اللہ کی تصریح نہیں حدیث اول کے الفاظ کے ساتھ ص ۲۲۹ پر وارد ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے جلد میتہ کا دباغت کے بعد پاک اور قابل انتفاع ہونا مسند حمیدی کے ص ۱۵۰ او ص ۲۲۷ میں نمبرات بالا کی احادیث پر ہے فہرست میں ان سب کو اکٹھا ذکر کر دیا ہے۔

(ب) اس محنت کی دوسری مثال کتاب الصوم کے ماتحت ہے۔

القبلة والمباشرة للصائم حدیث ۱۹۶ و ۱۹۷ و ۱۹۸ و ۲۸۷ فہرست ص ۱۰

حدیث نمبر ۱۹۶ و ۱۹۷ و ۱۹۸۔ احادیث عائشہ ام المومنین میں ص ۱۰۰ تا ۱۰۱ تک ہے اور حدیث نمبر ۲۸۷ ام المومنین حفصۃ کی مرویات میں ص ۱۳۸ پر ہے۔

اور یہ عظیم الشان فہرست کتاب الایمان سے لے کر ابواب القیامۃ بلکہ المنوعات و کتاب بدأ الخلق تک جملہ اصناف حدیث کو حاوی و شامل ہے۔

۲- ایک دوسری فہرست اعلام کی ہے جس میں اسناد کے ماسوی متون میں جتنے صحابہ وصحابیات بلکہ انبیاء علیہم السلام تک کا ذکر آیا ہے ان کی تفصیل مع نمبرات مذکور ہیں اس کے بارے میں محدث جلیل فرماتے ہیں کہ یہ صرف انگریزوں کی نقالی میں نہیں لکھی گئی ہے، بلکہ اس کا نفع تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ مطلوب تک پہنچنے میں اس سے بڑی آسانی ہو جاتی ہے اور بہت سا وقت مطلوب کے ڈھونڈنے میں ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے، مقدمہ ص ۵۔ اس فہرست میں حروف تہجی کے لحاظ سے پہلے اسماء کا ذکر ہے، حرف یا کے ختم ہونے کے بعد علماء رجال کی عادت کے موافق الأباء پھر الابناء اس کے بعد قبائل اور بنات کا تذکرہ ہے۔

۳- ایک تیسری فہرست حروف تہجی ہی کے لحاظ سے **فهرس البلاد والامكنه والبقاع** کی مرتب فرمادی ہے۔

۴- محدث کبیر نے ۲۵ صفحات کا ایک مقدمہ شروع میں نہایت نفع بخش لکھ دیا ہے جس میں مسانید کی تاریخ، مسند حمیدی کا تعارف ذکر کرنے کے بعد ان تمام رواۃ کے معتبر حالات تحریر فرمائے

ہیں جن کے ذریعہ مسند حمیدی منقول ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ کس قدر دشواری کے ساتھ اس کے نسخے دستیاب ہوئے ہیں اور تصحیح وتعلیق میں کن باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

علمی حقوق واداء امانت:

ایک لمبی فہرست مسانید کی بقید صفحات مذکور ہے، مثلاً:

احادیث أبی بکر الصدیق ص ۲	احادیث عبدالرحمن بن عوف ص ۳۵
احادیث عمر بن الخطاب ص ٦	احادیث سعد بن أبی وقاص ص ۳٦
احادیث عثمان بن عفان ص ۲۰	احادیث سعید بن زید ص ٤۳
احادیث علی بن أبی طالب ص ۲۲	احادیث أبی عبیدة بن الجراح ص ٤٦
احادیث الزبیر بن العوام ص ۳۳	احادیث عبدالله بن مسعود ص ٤٦

میں نے محدث کبیر سے ایک بڑے مجمع میں فرماتے سنا کہ ''علم کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ جو علم جہاں سے حاصل کیا جائے منت شناسی کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جائے''۔

ویسے بھی دوسرے کی علمی تحقیقات کو اپنی طرف منسوب کرنا اخلاق کے بھی خلاف ہے، شرعاً بھی ''المتشبع بما لم یعط کلابس ثوبی زور'' کے مشابہ، بہت سے تصنیف کے دعویداروں نے ایسی حرکت کی ہے کہ دوسرے کی پوری پوری کتاب اور دوسروں کی کتابوں کے اجزاء اپنی تصنیفات میں بلا جھجک لے لیتے ہیں اور نام بھی لینا گوارا نہیں کرتے۔ امام نووی کی کتابیں ابن الجوزی کی تلقیح اور مولانا محمد حسن اسرائیلی کی تنسیق النظام میں ''یاروں'' نے یہ خیانت کر ڈالی ہے۔ لیکن محدث کبیر کے علمی شعور اور جذبہ منت شناسی نے اس کو گوارا نہیں کیا بلکہ اس فہرست کو اخذ کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وهناک فهرس ثالث یدلک علی ان مسند ابی هريرة مثلاً يبتدئ من صفحة كذا ومسند أنس من صفحة كذا، وليس هذا الفهرس مما عملته بل وجدته ملحقا بالنسخةالديوبندية	اور وہاں پر ایک تیسری فہرست ہے جو تم کو یہ بتائے گی کہ مثلاً ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مسند فلاں صفحہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ فہرست میری تیار کردہ نہیں ہے بلکہ مسند حمیدی کے دیوبند والے نسخہ کے آخر میں شامل ہے جس کو شیخ ادیب فاضل مولانا محی

بـخط الشيخ الأديب الفاضل محي الدين الالٰـه ابـادى نـاشـر التـاريـخ الصغيـر لـلبـخـارى، والـموتلف والمختلف لعبد الـغنى بن سعيد وغيرهما وكان رحمه الله مـن الـمشـغـوفين بعلوم الحديث. مقدمه ص ۵

الدین الالٰہ آبادی رحمہ اللہ نے تیار کیا ہے جو علوم حدیث کے نہایت دلدادہ تھے اور جنھوں نے امام بخاری کی ''تاریخ صغیر'' اور عبدالغنی بن سعید کی کتاب ''الموتلف والمختلف'' اور ان دونوں کے علاوہ دوسری کتابوں کو شائع کیا ہے۔

امانت علمی کی دوسری مثال:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث بروایت زہری عن سالم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کے برابر اٹھاتے تھے اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو دونوں ہاتھوں کو اسی طرح اٹھاتے۔ لیکن دونوں سجدوں کے درمیان نہیں اٹھاتے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے لیکن مسند حمیدی میں یہ حدیث اس کے خلاف ہے جلد ثانی ص ۲۷۷ حدیث نمبر ۶۱۴ میں بالفاظ ذیل وارد ہوئی ہے۔

حدثنا الحميدى قال ثنا سفيان قال ثنا الـزهرى قال أخبرنى سالم بن عبدالله عـن أبيـه قـال رأيـت رسول الله صلى الـلّٰه عليه وسلم اذا افتتح الصلوٰة رفع يـديـه حـذو منكبيه وإذاأراد أن يركع وبـعـد مـا يـرفع رأسه من الركوع فلا يرفع ولا بين السجدتين.

عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کے مقابل اٹھاتے اور جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے اور نہ دونوں سجدوں کے درمیان۔

یہ حدیث حنفیہ کے مذہب کے عین مطابق ہے اور محدث کبیر کا احناف کے لیے حصن حصین ہونا ایک مسلم امر ہے، اس کے باوجود اس عظیم محدث نے امانت علمی کا لحاظ کرتے ہوئے اس حدیث کی تحقیق میں تحریر فرمایا۔

أخرج البخارى أصل الحديث من

بخاری نے اصل حدیث کو یونس عن الزہری کے

طـريـق يـونــس عـن الزهري وأمـا روايـة سـفـيـان عـنـه فأخرجها أحمد في مسنده وأبو داؤد عن أحمد في سـنـنـه لكن رواية أحمد عن سفيان تـخـالف روايـة الـمـصنف عنه، ففي مسند أحمد رأيت رسول الله صلى اللّٰـه عـلـيـه وسلم اذا افتتح الصلوٰة رفـع يـديه حتى يحاذي منكبيه وإذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الـركـوع وقال سفيان مرة وإذا رفع رأسـه وأكـثـر مـا كان يقول وبعد ما يرفع رأسه من الركوع ولا يرفع بين السجدتين. (ج ۲ ص ۸)

فـفـيـه كـمـا تـرى إثبات الرفع عند الـركـوع والـرفـع مـنـه ونفيـه بين الـسـجـدتـيـن وفي رواية الحميدي نـفـيـه في الركوع والرفع منه وفيما بـيـن السجدتين جميعا ولم يتعرض أحـدي مـن الـمـحـدثـيـن لـروايـة الحميدي هذه.

طریق سے نقل کیا، رہی سفیان کی روایت زہری سے تو اس کو امام احمد نے اپنی مسند میں اور ابوداؤد نے بواسطہ احمد اپنی سنن میں نقل کیا ہے لیکن احمد کی روایت سفیان سے مصنف (حمیدی) کی اس روایت کے خلاف ہے جس کو انھوں نے سفیان سے نقل کیا ہے کیونکہ مسند احمد کی اس روایت میں ہے: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھوں کو یہاں تک اٹھاتے کہ مونڈھوں کے مقابل ہوجائے اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور اپنے سر کو رکوع سے اٹھانے کے بعد (سفیان اکثر انھیں الفاظ سے نقل کرتے تھے اور کبھی یہ لفظ بھی کہا کہ جب اپنا سر اٹھاتے) اور دونوں سجدوں کے درمیان ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

تو اس روایت میں رکوع کے وقت اور رکوع سے سر اٹھانے کے وقت رفع یدین کا اثبات ہے اور صرف بین السجدتین رفع یدین کی نفی ہے برخلاف حمیدی کی روایت عن سفیان کے کہ اس میں تینوں جگہوں میں رفع یدین کی نفی ہے، لیکن محدثین میں سے کسی نے حمیدی کی اس روایت کو نہیں چھیڑا۔

محدثین کی اصطلاح میں اس قسم کو ''شاذ'' اور ''محفوظ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، ممکن ہے دوسرے شراح کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو، اس لیے اس کی طرف ذہن نہ گیا ہو، بلکہ محفوظ روایت جو زہری سے ہے اسی کی بحث پر اکتفا کر دیا گیا ہو۔ لیکن ''محدث کبیر'' مسند حمیدی میں اس حدیث کو نقل فرماتے

ہیں تو اپنے مسلک کے موافق حدیث پا جانے پر ویسے ہی گذر نہیں جاتے، بلکہ پوری علمی دیانت سے اس کی حیثیت بھی متعین کر دیتے ہیں جو حق پرستی وحق پسندی کی دلیل ہے۔ فجزاه اللّٰہ خیراً عن سائر المخلصین.

غیر مقلدین کی بے وجہ الزام تراشی:

اس قدر احتیاط کے باوجود ہمارے زمانے کے ''لا مذہبی'' فرقہ والوں نے محدث الاعظمی قدس سرہٗ پر بے جا الزام لگا دیا کہ اس حدیث ہی میں ناشر نے تحریف کر دی کہ وہ حدیث رفع یدین کے اثبات کی تھی، الفاظ میں پھیر پھار کر کے اس کو ترک رفع یدین کی حدیث بنا دی گئی ہے، دیکھو ''ماہنامہ محدث'' بنارس مجریہ مارچ ۱۹۸۶ء، اور رسالہ ترک رفع الیدین میں عزیز گرامی قدر مولانا احمد اللہ اعظمی استاذ دار العلوم مئو نے ان کی ہفوات کا مکمل آپریشن کر دیا ہے اور انھوں نے مسند ابوعوانہ ص ۹۲ سے حمیدی کے طریق سے اس ترک رفع یدین کی روایت کو نقل فرما دیا ہے اللہ ان کو جزائے خیر دے، لکھتے ہیں:

کہ مسند ابوعوانہ ج ۲ ص ۹۰ میں بیان رفع یدین کے تحت امام ابوعوانہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہی کی حدیث کو چار سندوں سے ذکر فرمایا ہے جس میں ایک سند امام حمیدی ہی کی ہے۔

حدثنا عبداللّٰه بن أيوب المخرمي وسعدان بن نصر وشعيب بن عمرو في آخرين قالوا: ثنا سفيان بن عيينة عن الزهري عن سالم عن أبيه قال رأيت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إذا افتتح الصلوٰة رفع يديه حتى يحاذي بهما. وقال بعضهم حذو منكبيه وإذا أراد أن يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع لا يرفعهما.

ہم سے عبداللہ بن ایوب مخرمی اور سعدان ابن نصر اور شعیب بن عمرو نے دوسرے لوگوں کے ساتھ بیان کیا ان لوگوں نے کہا کہ ہم سے سفیان بن عیینہ نے زہری سے نقل کر کے بیان کیا انھوں نے سالم (بن عبداللہ) سے انھوں نے اپنے والد سے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کے مقابل اٹھاتے تھے اور جب رکوع کرتے تھے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد ہاتھوں کو نہیں اٹھاتے تھے۔

حدثنا الصائغ بمكة قال حدثنا الحميدی قال حدثنا سفيانعن أبيه قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم مثله. (ص ۱۱۲)

دوسری حدیث: ہم سے جعفر بن محمد الصائغ نے بیان کیا کہا کہ ہم سے حمیدی نے بیان کیا کہا ہمیں سفیان نے خبر دی زہری سے نقل کر کے کہا مجھے سالم نے اپنے والد سے نقل کر کے بتایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا اوپر کی حدیث کے مانند۔

اب ابوعوانہ کی اس سند کو لے لیجئے تو سفیان سے ترک رفع یدین کی روایت کرنے والے صرف امام حمیدی ہی نہیں رہے بلکہ ان کے ماسوی ۳ رجال بالتصریح اور بہت سے فی آخرین سے مجملاً ثابت ہوتے ہیں پس حمیدی کا تفرد ختم ہوگیا اور روایت شذوذ سے نکل کر محفوظ ہوگئی۔

پس عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے جس طرح عندالرکوع اور عندرفع الرأس منہ رفع یدین کی روایت منقول ہے، اسی طرح ترک رفع یدین کی روایت بھی بسند قوی مذکور ہے۔ اور اس کے مدمقابل حضرت ابن مسعود کی ترک رفع یدین والی روایت اس قسم کے اضطراب سے خالی ہے، اسی کو علماء حقانی کے سواد اعظم نے اختیار کیا۔ ''لا مذہبیوں'' کو تتبع اور تلاش کرنے کی محنت برداشت کرنے کے بجائے محدث کبیر پر الزام تراشی آسان معلوم ہوئی، اسی کا شور مچا دیا **فسيعلم الذين ظلموا أی منقلب ينقلبون.**

تنبیہ: مسند ابوعوانہ طبع حیدرآباد سے عزیز موصوف نے جس روایت کو نقل کیا ہے یہ وہ ابوعوانہ وضاح ابن عبداللہ الیشکری نہیں ہیں جو سفیان ثوری اور عبدالرحمٰن بن مہدی وشعبہ بن الحجاج کے اقران میں سے ہیں اور ان کی وفات ۱۷۶ھ میں ہوئی ہے، بلکہ یہ ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم الاسفرائنی النیشاپوری ہیں جن کی وفات ۳۱۶ میں ہوئی ہے۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے: **أبو عوانة الحافظ الثقة الكبير صاحب الصحيح المسند المخرج على صحيح مسلم وله فيه زيادات عدة.**

علم اسماء الرجال میں ملکہ تامہ:

صلوٰۃ الاستسقاء میں ایک حدیث حضرت عائشہ کی آئی ہے کہ جب بارش شروع ہوتی تو آنحضرت ﷺ یوں دعا فرماتے **اللّٰهم اجعله صيّباً نافعاً** اے اللہ اس کو بہنے والی نفع بخش بارش بنا۔ اس حدیث کو امام حمیدی نے بہ الفاظ متقارب اس سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حدثنا الحمیدی قال: ثنا سفیان قال: ثنا مسعرٌ عن أبیه عن عائشة الخ

کہ مسعر نے روایت کیا ان کے والد کدام سے انھوں نے حضرت عائشہ سے نقل کیا، اس پر یہ عظیم محدث یوں تحریر فرماتے ہیں:

لا اشک أنــه سقـط هنا من الاصل ''عن المقدام بن شریح'' وقد کتب فی ع بعد مسعر اسم راوٍ ثم کتب فوقه اسم راوٍ اٰخر فالتبس ولم أتحققه، وبعد کتابتی هذا بسنتین ظفرت بنسخة الظاهریة فوجدت فیه تصدیق ما کتبته، ''ففیه'' مسعر عن المقدام بن شریح عن أبیه.

والحدیث أخرجه البخاری فی الأدب المفرد عن خلاد بن یحیی عن سفیان عن المقدام بن شریح ابن هانی عن أبیه (ص ۹۹) وسفیان هذا عندی هو الثوری معاصر مسعر والذی روی عنه الحمیدی هو ابن عیینة وأخرجه ابن ماجه من طریق یزید بن مقدام بن شریح عن أبیه المقدام عن أبیه شریح ثم وجدت النسائی قد أخرجه عن محمد ابن منصور عن سفیان بن عیینة عن مسعر عن المقدام بن شریح عن أبیه عن عائشة فالحمدللّٰه، وعند النسائی

مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسناد میں مسعر کے بعد لفظ ''عن المقدام بن شریح'' چھوٹ گیا ہے اس کے بعد ''عن أبیہ'' ہے ''عثمانیہ نسخہ'' میں مسعر کے بعد کسی راوی کا نام ہے پھر اس کے اوپر کسی اور راوی کا نام ہے جس کی وجہ سے یہ نام مشتبہ ہوگیا ہے اور کتاب میں پڑھا نہیں گیا۔ یہ بات میں نے اپنے گمان سے لکھ دیا، دو سال کے بعد جب مجھ کو نسخہ ظاہریہ ملا تو اس سے میرے گمان کی تصدیق ہوگئی کیونکہ اس میں ''مسعر عن المقدام بن شریح عن أبیه'' ہے، امام بخاری نے ادب المفرد میں اس حدیث کو خلاد ابن یحییٰ کے طریق سے عن سفیان عن المقدام بن شریح بن هانی عن أبیه نقل کیا اور میرے نزدیک یہ سفیان، سفیان ابن سعید ثوری ہیں سفیان بن عیینہ نہیں ہیں جو حمیدی کے شیخ ہیں، اس حدیث کو ابن ماجہ نے یزید بن المقدام بن شریح عن أبیہ المقدام عن أبیہ شریح کی سند سے نقل کیا ہے، پھر مجھ کو سنن نسائی میں یہ روایت ملی جس کو محمد بن منصور کے طریق سے نقل کیا ہے انھوں نے سفیان بن عیینہ

صیّبا بالصاد فلیراجع نسخ النسائی. سے انھوں نے مسعر سے انھوں نے مقدام بن شریح سے الیٰ آخرہ، پس اللہ کا شکر ہے کہ سفیان بن عیینہ کے طریق سے بھی یہ روایت مل گئی۔

(مسند حمیدی ج ص ۱۳۱)

غور فرمائیں کہ سند کو پڑھتے ہی یہ یقین ہوگیا کہ ''مسعر عن أبیہ'' اسناد میں غلط ہوگیا ہے مسعر عن المقدام بن شریح عن أبیہ ہونا چاہئے مگر دونوں نسخون سے اس بات کی تعیین نہ ہوسکی اس لیے اصل میں تصرف نہ کرکے تعلیق میں اس کا ذکر کیا کس قدر اسماء الرجال پر نظر عمیق اور ملکہ تامہ حاصل ہونے کی بات ہے۔

کاتب الحروف کہتا ہے کہ نسائی میں یہ روایت استسقاء کی حدیثوں کے ذیل میں منقول ہے ''القول عند المطر'' کے باب میں ہے، مطبع احمدی کی نسائی جو انتہائی قدیم ہے اس میں ص ۱۳۷ پر ہے اور ابن ماجہ باب مایدعو به الرجل اذا رأی السحاب و المطر ص ۲۷۷ مطبوعہ اشرفی بک ڈپو۔ البتہ میری سنن نسائی میں اخبرنا محمد بن منصور قال حدثنا سفیان عن مسعر عن المقدام الخ ہے۔ اس میں ابن عیینہ یا ثوری کی تصریح نہیں دوسرے نسخوں سے ملانا چاہئے۔

ملکہ تامہ کی دوسری مثال:

آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر افراد، تمتع، قران میں سے کون سی نوع کا احرام باندھا تھا؟ اس میں روایتیں مختلف ہیں، مسند حمیدی حدیث نمبر ۲۰۴ میں ص ۱۰۳ پر آنحضرت ﷺ کے افراد کو بیان کیا گیا ہے اس کی اسناد یوں ہے:

حدثنا الحمیدی قال: ثنا عبدالعزیز بن محمد الدراوردی قال أخبرنی علقمة ''عن أمه'' عن عائشة أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم.

محدث کبیر فرماتے ہیں کہ یہ علقمہ بن ابی علقمہ ہیں جو مدینہ منورہ کے قاضی تھے اور ان کے والد کا نام بلال ہے، اصول میں یہ عن ابیه لکھ گیا تھا اور میرے نزدیک ٹھیک (عن امه ہے) اور ان کی والدہ کا نام مرجانہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت لیتی ہیں، اور ان سے ان کے لڑکے علقمہ روایت لیتے ہیں جیسا کہ تہذیب وغیرہ میں ہے، میں نے یہ حاشیہ اپنے ذوق کی گواہی پر لکھ دیا تھا، پھر

مجھ کو طحاوی میں یہ حدیث ملی جس کو انھوں نے ابوالزناد کے طریق سے ذکر کیا ہے اور اس میں صراحت ہے: کہ ''عن علقمة بن أبي علقمة عن أمه'' پس اللہ کا شکر ہے۔

غور کیجئے کہ کس قدر عظیم ملکہ کی بات ہے کہ آباء سے نقل کرنے والے تو بہت سے محدثین ہیں، لیکن امہات سے نقل کرنے والے معدودے چند ہیں جیسے منصور بن صفیہ وغیرہ لیکن اس عظیم محدث نے صرف ذوق کی بنیاد پر عن أبیہ کی غلطی کو حاشیہ پر درست کرکے عن أمہ بنا دیا پھر برابر تتبع میں رہے۔ یہاں تک کہ جب طحاوی کے طریق میں عن أمہ مل گیا تب اصل میں تصحیح کیا۔

اس قسم کی کئی مثالیں میرے عزیز گرامی مولانا خورشید احمد صاحب مئوی خریج مدینہ یونیورسٹی نے تلاش کرکے مجھے دیں جزاہ اللہ تعالی۔ لیکن تطویل کے خوف سے انھیں دو مثالوں پر اکتفاء کرتا ہوں۔

علماء حق کا مثالی کردار:

علمائے آخرت جس طرح اپنے علم پر پختہ کار اور بلا خوف دوسروں تک پہنچانے میں منہمک ہوا کرتے ہیں اور عوام و جہلاء کے شور و غوغا سے متاثر نہیں ہوا کرتے، اسی طرح ہمیشہ اپنے علم کا محاسبہ خود بھی کرتے رہتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا ان کے کمزور پہلوؤں کی طرف رہ نمائی کرے تو بلا تامل اس کو قبول کرتے ہیں، بلکہ غلطیوں کی نشاندہی کرنے والوں کے شکر گذار جذبہ منت شناسی میں سرشار ہو جاتے ہیں، اس کے برخلاف اپنے اغراض کے ساتھ علم کے دعویداروں میں یہ دونوں باتیں نہیں ہوا کرتیں، نہ تو ان کے علم پر انھیں یقین ہوتا ہے بلکہ شک و تذبذب کی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں، اور خود اپنے علم کا محاسبہ تو کیا کرتے دوسرے اگر ان کی خامیوں کی نشاندہی کر دیں تو اس پر چراغ پا بھی ہو جاتے ہیں، ان دونوں حیثیتوں سے جب ہم اس ''محدث کبیر'' کا جائزہ لیتے ہیں تو اس معیار پر بھی یہ کھرے ثابت ہوتے ہیں۔

علم پر پختگی کی مثال:

حضرت نے ''طلقات ثلاثہ'' کی تحقیق ''الاعلام المرفوعہ'' لکھی تو جہلائے زمانہ نے اس پر خوب شور و غوغا کیا اور ایک انجمن نے اپنے انداز سے اس کا جواب لکھ کر مجلس میں پیش کیا، بحث تمحیص کے بعد جس کا جواب راجح معلوم ہوا اس کو رسالہ میں درج کرتے گئے اور جب ان جواب میں کوئی

رجحان محسوس نہیں ہوا تو محدث مبارکپوری کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے رجوع کیا، اس طرح عرصہ میں یہ جوابات منظر عام پر بنام ''آثار متبوعہ'' ظاہر ہوئے، اور ''رکعات تراویح'' لکھی تو وہ انجمن درہم برہم ہوچکی تھی اس کے ایک دورکن بقید حیات تھے وہی اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے اور کچھ لکھ کر اپنے آپ کو جواب لکھنے کے دھوکہ میں مبتلا کیا، لیکن ''محدث کبیر'' نے اس غوغا کا کوئی اثر نہ لیا بلکہ اول کی تردید بقول ان کے چشم زدن میں حاضر کردیا اور دوسرے کی خبر ان کے فیض یافتہ مولانا عبدالباری قاسمی نے رکعات تراویح کے ذیل میں لے لی۔

محاسبہ اور قبول حق کی مثال:

مسند حمیدی کی ایک طرف تصحیح وتعلیق چل رہی ہے، دوسری طرف تعلیق پر نظر ثانی اور مسودہ کی کتابت کا بنظر غائر مطالعہ بھی ہورہا ہے کہ کہیں چھپنے میں کتابت کی غلطیاں نہ رہ جائیں، اس طرح جلد اول چھپتے چھپتے بائیس صفحات کی ''جدول الخطا والصواب'' تیار ہوگئی جس میں دوسوستانوے کتابت کی غلطیوں کا نقشہ مرتب فرمادیا۔

اور دوسری جدول الاستدراک والتعقیب کی ۲۱ صفحات میں ۳۲۸ استدراکات خود اپنی ہی تحریر میں وجود پذیر ہوگئیں۔

اور جس طرح ''محدث وادی نیل'' نے حضرت کے استدراکات کو شکر گذاری کے ساتھ قبول فرمایا اسی طرح محدث کبیر کا ایک واقعہ خود راقم الحروف کے ساتھ پیش آیا۔ جس کو دوسری مثال میں ملاحظہ کریں۔

پھر جلد ثانی مسند حمیدی چھپنے لگی تو دونوں جلدوں پر نظر غائر ڈالتے چلے جارہے ہیں یہاں تک کہ جلد اول کی تصحیحات سات عدد اور استدراکات ۳ صفحات میں تیرہ عدد مزید جلد ثانی میں ذکر فرمایا اور خود اس جلد کی تصحیح الاخطا ۳۲۲، اور استدراک ۲۲ عدد تک پہنچ جاتے ہیں افسوس کہ حضرت قدس سرہ نے جس محنت سے مسند حمیدی کی تصحیح کی، بعد کے ناشرین نے اس کی اتنی قدر نہیں کی، چنانچہ دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے وقت بھی بعینہ وہی جداول جو حضرت نے پہلے ایڈیشن میں تحریر فرمائے تھے اسی کو من وعن شائع کردیا اور یہ توفیق نہیں ہوئی ان جداول کی مدد سے اصل کتاب میں تصحیح کر لیتے۔ تلخیص خواتم جامع الاصول میں بھی کتاب کی اغلاط اسی طرح رہ گئیں، چنانچہ خود تلخیص کتاب کی

ــــہ وفات ٹائیٹل پر ۹۷۷ھ دے دیا ہے اور اندرونی ٹائیٹل پر ۸۸۹ھ لکھ گیا ہے حالانکہ یہ دونوں غلط ہیں، علامہ طاہر پٹنی کی وفات ۹۸۶ھ میں ہوئی ہے جیسا کہ محقق قدس سرہ نے مجمع بحارالانوار کی تعلیق وتحقیق کے وقت یہی ــــہ وفات دیا ہے۔

مجمع بحارالانوار کے ہر ٹائیٹل پر المتوفی ۹۸۶ھ/۱۵۷۸م مطبوع ہے اور مقدمہ میں نزہۃ الخواطر سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے۔

دوسری مثال:

جو اسی ناچیز راقم الحروف کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا ہے، ابن جوزی کی تلقیح سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مرویات کو ۱۴۰۰ھ میں جمع کر رہا تھا، اس وقت تلخیص خواتم جامع الاصول دارالعلوم چھاپی گجرات میں پہنچی، میں ان دنوں وہیں مدرس تھا تو میں نے اپنی علمی ضرورت کے لیے حضرت کے نام ایک خط روانہ کیا، ضمناً یہ بات بھی لکھ دی تلخیص ص ۳۲۵ میں عائشہ بنت طلحہ کے ترجمہ میں یہ عبارت آئی ہے:

تزوجها عبداللّٰه بن عبدالرحمن بن الصديق ومات عنها فتزوجها مصعب ابن الزبير فلما قتل تزوجها عمر بن عبداللّٰه بن عبدالرحمن ابن الصديق ص ۳۲۵	پہلے ان کا نکاح عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ہوا وہ وفات پاگئے تو مصعب بن الزبیر سے نکاح ہوا وہ مقتول ہوگئے تو عمر بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن صدیق اکبر ان کو اپنے نکاح میں لائے۔

شبہہ یہ ہے کہ عمر بن عبداللہ سے ان کا نکاح کیسے صحیح ہوسکتا ہے جب کہ پہلے وہ عمر کے والد عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے نکاح میں رہ چکی ہیں۔

میرے پاس جو کتابیں اس وقت رجال کی تھیں ان سے تحقیق نہ ہوسکی، تو میں نے کتاب الاغانی میں ان کے حالات دیکھے، تو اس میں آخری نکاح عمر بن عبیداللہ بن معمر تیمی سے ہونا لکھا ہے، صاحب اغانی چونکہ شیعی ادیب ہے اس لیے اس پر اعتماد نہیں ہے، امید کہ اپنی کسی کتاب کے حوالے سے اس شبہہ کو دفع فرمائیں گے۔

اس کے چند دن کے بعد جواب باصواب وارد ہوا کہ تم نے بہت خوب یاددہانی کی، میں نے

تصحیح کے لیے اس کلمہ پر نشان لگایا تھا، چنانچہ ان کے ترجمہ میں ابن اثیر سے اضافہ بھی کیا، مگر یہ غلطی کسی وجہ سے رہ گئی، اغانی کے علاوہ تعجیل المنفعۃ میں دیکھ لو۔ چھاپی دار العلوم میں تعجیل المنفعۃ نہیں تھی، تو میں چھاپی سے راندیر گیا، وہاں کتب خانہ میں جا کر دیکھا تو الاغانی کی بات کی تصدیق ہوئی، اور اصل کتاب تلخیص میں وہ غلطی موجود ہے، خدا کرے کہ دوسرے ایڈیشن میں کسی کو تصحیح کی توفیق ہو جائے اور حضرت محدث کبیر علیہ الرحمہ کی روح کو خوش کر سکے۔

تعجیل المنفعۃ ص ۳۰۱ میں عمر بن عبید اللہ بن معمر التیمی کے ترجمہ میں ہے:

کان عبداللّٰه بن الزبير ولي عمر بن عبيداللّٰه هذا البصرة ثم ولاه قتال الارازفة لما ولي مصعب بن الزبير على العراق وولي امرة فارس أيضاً وتزوج عائشة بنت طلحة بعد مصعب بن الزبير ص ۳۰۲

کہ عبداللہ بن الزبیر نے اپنی امارت کے زمانہ میں عمر بن عبید اللہ بن معمر تیمی کو پہلے بصرہ کا امیر بنایا پھر جب مصعب بن الزبیر کو عراق کی امارت سونپی تو ان کو قتال ارازفہ کا امیر بنایا اور مصعب ابن الزبیر کے بعد عمر بن عبید اللہ بن معمر نے عائشہ بنت طلحہ بن عبید اللہ سے نکاح کیا۔ اھ

افسوس کہ یہ گراں مایہ نامہ مبارک تلاش کرنے کے بعد بھی اس وقت نہ ملا، ورنہ اس کی فوٹو کاپی سے ناظرین کی تواضع کرتا، اب تو یہ بات صرف یادداشت سے لکھ رہا ہوں، اس خط کی اہمیت اس وقت محسوس ہوئی جب کہ میرے تنقیدی خط کو ایک مفکر نے قابل اعتنا نہ سمجھ کر پھاڑ دیا۔

ابھی تو تلخیص خواتم جامع الاصول کے بارے میں بہت کچھ لکھنے کا موقع ہے لیکن دوستوں کا اصرار ہے کہ جلد یہ مضمون ترجمان الاسلام کے مدیر صاحب کے پاس بھیج دوں تا کہ خصوصی نمبر میں یہ بھی شائع ہو جائے اس لیے سر دست اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

حدیث شوق بے پایاں وسعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی ودریا ہم چناں باقی

شرح مسند احمد اور محدث اعظمی کے علمی استدراکات

مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ☆

مسند امام احمد اہل علم کے حلقہ میں محتاج تعارف نہیں ہے، یہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا علم حدیث کے سلسلے میں ایک نادر اور عجیب کارنامہ ہے، صحیح احادیث کی جتنی بڑی تعداد اس میں یکجا کر دی گئی ہے اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، امام احمد نے اس عظیم القدر کتاب میں اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ بے اصل اور موضوع روایات نہ درج کی جائیں، اور نہ ایسے راویوں کی روایت لی جائیں، جو کذب اور وضع کے ساتھ مہتم ہوں، لیکن اس کے ساتھ اس بات کا بھی اہتمام رہا کہ معتبر احادیث کا بڑے سے بڑا ذخیرہ جمع ہو جائے۔ چنانچہ خود امام صاحب فرماتے ہیں:

إن هذا الكتاب جمعته وأتقنته من أكثر من سبعمائة وخمسين ألفاً، فما اختلف المسلمون من حديث رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم فارجعوا إليه فإن كان فيه وإلا فليس بحجة. (خصائص المسند) (۱)

اس کتاب کو میں نے ساڑھے سات لاکھ احادیث سے زیادہ سے انتخاب ومرتب کیا ہے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف ہو تو اس کی جانب رجوع کرو، اگر اس میں موجود ہے تو خیر، ورنہ وہ حجت نہیں۔

ساڑھے سات لاکھ یا اس سے زیادہ احادیث کا تذکرہ جو آپ کتب احادیث میں پڑھتے ہیں، اس پر چونکئے مت، یہ خیال نہ کیجئے کہ یہ ساری احادیث متن اور مضمون کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جو لوگ فن حدیث کی اصطلاحات سے ناواقف ہیں، انھیں یہ دھوکا اکثر ہوتا ہے۔ حدیث کے معاندین ومخالفین اسی کثرت تعداد کا نام لے لے کر عام مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں

☆ سابق صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور اعظم گڈھ

(۱) مسند احمد بشرح احمد محمد شاکر ص: ا ج: ا

کہ احادیث جب اس کثرت سے وضع ہوئی ہیں کہ لاکھوں لاکھ احادیث کے ذخیرہ سے بس یہ چند ہزار صحیح نکلی ہیں، تو ان کا بھی کیا اعتبار؟ لیکن خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ احادیث کی کثرتِ تعداد میں بہت کچھ دخل ان کی سندوں اور راویوں کے تعدد کا ہے، ایک ہی مضمون کی حدیث ایک ہی شخص اگر دس مختلف اساتذہ اور رواۃ سے لیتا ہے، تو ہمارے آپ کے نزدیک تو وہ ایک حدیث ہے، مگر محدثین کی اصطلاح میں، وہ دس حدیثیں ہیں؛ پھر محدثین جو کسی حدیث پر صحت، قوت، اور ضعف کا حکم لگاتے ہیں، وہ زیادہ تر سند کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک روایت کی ایک سند قوی ہو اور دوسری سند ضعیف یا موضوع ہو، پس باوجودیکہ حدیث کا مضمون صحیح ہے، لیکن اس خاص سند کے اعتبار سے محدثین فرمائیں گے کہ یہ روایت ضعیف یا موضوع ہے۔ اس لیے کسی روایت کے بارے میں ضعیف یا موضوع کا حکم دیکھ کر بغیر علم کے اس کے مضمون سے بدگمان نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح محدثین کی اصطلاح میں صحابہ وتابعین کے آثار بھی احادیث کے شمار میں آتے ہیں۔ ان سے احادیث کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ (۱)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے فرمایا کہ:

احتفظ بهذا المسند فإنه سيكون للناس إماماً. (۲)	اس مسند کو حفظ کرلو یہ لوگوں کے لیے رہنما اور پیشوا ثابت ہوگی۔

بلاشبہ یہ جلیل القدر کتاب اسی شان کی ہے، لیکن حضرت الامام نے اس کو ابواب وفصول کے اصول پر مرتب نہیں کیا ہے، بلکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو احادیث کے اصل اور بنیادی راوی ہیں ان کے لحاظ سے جمع کیا ہے، یعنی ایک صحابی کی جتنی روایات ہیں، خواہ وہ کسی موضوع سے متعلق ہوں، سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اس ترتیب کی وجہ سے اس سے استفادہ خاصا دشوار ہے، کسی کو پوری کتاب حفظ ہو، تو وہ استفادہ بسہولت کرسکتا ہے، لیکن اس عظیم الشان ذخیرہ کو حافظہ کی گرفت میں لانا اور اسے یاد رکھنا کتنوں کے بس کی بات ہے؟

اسی دشواری کے احساس سے مشہور حافظ حدیث امام ذہبی نے فرمایا ہے:

فلعل الله تبارک وتعالى أن يقبض	شاید اللہ تعالی اس عظیم القدر ذخیرۂ حدیث کے

(۱) حوالہ مذکور (۲) مقدمہ مسند احمد مذکور ج ا ص ۱۰ بحوالہ مناقب احمد لابن جوزی ص ۱۹۱

لهـذا الـديـوان السـامـي من يخدمـه ويبـوب عـليـه ويتـكـلـم على رجاله ويرتب هيئته ووضعه فانه محتوٍ على أكثـر الـحديث النبوى وقل أن يثبت حـديـث إلا وهـو فيـه (الـمـصـعـد الاحمد[۱])

لیے کوئی ایسا آدمی مقدر فرمائے جو اس کی خدمت کرے، اس پر ابواب قائم کرے، اس کے رواۃ پر گفتگو کرے، اس کی ہیئت وضع کواز سرِنو مرتب کرے، کیوں کہ یہ بیشتر احادیث پر مشتمل ہے، اور کم ایسا ہے کہ کوئی حدیث ثابت ہو اور اس میں نہ ہو۔

محدث اعظمی کے قلمی مسودات میں ایک مضمون ملا، اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس کتاب کو علامہ ابن زکنون[۲] نے بخاری شریف کے طرز پر مرتب کیا تھا۔ چنانچہ علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

إنـه رتـب المسند على أبواب البخارى وسماه الكواكب الدرارى فى تـرتيب مسند الإمام أحمد على أبواب البخارى وشرحه فى مائة وعشرين مـجـلـداً[۳] انھوں نے مسند احمد کو ابواب بخاری کی ترتیب پر مرتب کیا۔ اور اس کا نام الکواکب الدراری فی ترتیب مسند الامام احمد علی ابواب البخاری رکھا۔ اور اس کی شرح ایک سو بیس جلدوں میں کی۔

محدث اعظمی اپنی کتاب ''دستکار اہل شرف'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''الکواکب الدراری'' کی صرف ایک ضخیم جلد کتاب الزکوٰۃ سے کتاب الحج کے آخر تک رام پور کے کتب خانہ میں موجود ہے، جو ان کے داماد ابراہیم بن محمد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے[۴]۔

مسند امام احمد مکمل پہلی مرتبہ مصر میں ۱۳۱۳ھ میں معمولی کاغذ پر باریک حروف میں طبع ہوئی، اس کے بعد عرصۂ دراز تک دوبارہ طباعت کی نوبت نہیں آئی، ۱۳۶۵ھ میں مصر ہی کے ایک نامور عالم و محقق علامہ شیخ احمد محمد شاکر کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ انھوں نے برسہا برس کی عرق ریزی اور جانکاہی کے بعد اس کی نئی طباعت کا انتظام کیا، انھوں نے مطبوعہ نسخے کا دوسرے مخطوطہ صحیح نسخوں اور دوسرے

---

(۱) مسند احمد ج ۱ ص ۳۹
(۲) علاء الدین علی بن حسین بن عروہ ابوالحسن مشرقی ثم دمشقی المعروف بابن زکنون المتوفی ۸۳۷ھ
(۳) الضوء اللامع ج ۵ ص ۲۱۴ (۴) دست کار اہل شرف ص ۶۹

مراجع سے مقابلہ کیا، اغلاط کتاب کی تصحیح کی، حدیثوں پر نمبر لگائے، مشکل الفاظ کی شرح کی، رواۃ کے سلسلے میں تحقیقات کیں، جرح وتعدیل کے لحاظ سے ان کی حیثیتیں متعین کیں، پھر یہ (کہ ہر) جلد کے آخر میں اس کی کئی کئی فہرستیں مرتب کیں، تاکہ اس بحر ذخار سے استفادہ سہل ہو، ان فہرستوں میں سب سے اہم اور مفید فہرست وہ ہے، جو مسائل واحکام کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے، اس فہرست نے استفادہ کو بہت سہل کر دیا ہے۔

شیخ احمد محمد شاکر کا علامہ ابن زکنون کے بعد یہ ایک زبردست کارنامہ ہے اور اس سلسلے میں وہ اپنے بعد والوں کے پیش رو ہیں، بعد کے لوگوں نے اس پر مزید کام کیے ہیں، لیکن اولیت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔

شیخ کی مرتب کردہ جلدیں وقفہ وقفہ سے شائع ہوکر اہل علم کے پاس پہنچتی رہیں۔ پہلی ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ھ میں طبع ہوئی۔ شیخ کی مساعی جمیلہ جوں جوں آگے بڑھتی رہیں، اور معلومات ومطالعہ کا دائرہ پھیلتا رہا، انھیں ضرورت محسوس ہوتی گئی کہ پچھلی جلدوں میں جو کوتاہیاں اور غلطیاں رہ گئی ہیں، ان کی تلافی کی جائے، چنانچہ انھوں نے تیسری جلد میں ''الاستدراک والتعقیب'' کا ایک نیا عنوان قائم کیا، اس میں جہاں انھوں نے خود استدارکات لکھے وہیں دوسرے اہل علم ونظر کو اس کتاب کی تحقیقات پر دعوت نقد دی، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''مجھے تمام دنیا کے علماء حدیث سے امید ہے کہ جیسے جیسے ان کے پاس مسند کی جلدیں پہنچتی رہیں گی، اس کی احادیث کے سلسلے میں جہاں کہیں نقد ونظر، استدراک واضافہ کی ضرورت محسوس کریں گے، میرے پاس تحریر کر کے بھیجتے رہیں گے، ان کی یہ تحریرات میرے لیے قابل اہتمام اور باعث استفادہ ہوں گی، پھر میں خود اپنے طور پر ان کی تحقیق کروں گا، اس بحث وتحقیق کے بعد جیسی رائے قائم ہوگی اگلی جلد میں ان کے حوالے سے شائع کر دی جائے گی''(۱)

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہ کو- جیسا کہ ان کے مکتوب سے ظاہر ہے- اس کی پہلی جلد شروع ہی میں دستیاب ہوگئی تھی، اور اس کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ مگر

(۱) مسند احمد ج۳ ص ۳۶۵

بعد کی آٹھ جلدیں کئی سال کے بعد ملیں، مولانا نے ان سب کا نہایت غور وتدبر سے مطالعہ کیا، مولانا کا مطالعہ سرسری نہیں ہوتا تھا، ایک ایک لفظ پر نگاہ تعمق ڈالتے، حافظہ محدثین کرام کے حافظہ کی طرح نہایت قوی تھا۔ حدیث ورجال کی کتابوں پر بڑی گہری نظر تھی اور معلومات پر بڑا قابو تھا، پڑھا اور بہت اہتمام کے ساتھ پڑھا، جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی، نوٹ لکھتے گئے، اس سلسلے میں پہلا خط جو محدث کبیر نے علامہ احمد محمد شاکر کو تحریر کیا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

''آج سے دس سال قبل میں نے مسند احمد کی پہلی جلد جو آپ کی شرح کے ساتھ طبع ہوئی ہے، ایک صاحب کے نجی کتب خانہ میں دیکھی تھی اس کے بعد برابر سنتا رہا کہ اس کی جلدیں شائع ہو رہی ہیں، لیکن وہ مجھے دستیاب نہ ہوسکیں، پھر حسن اتفاق کہ اس کی ابتدائی نو جلدیں مجھے یکجا جامعہ مفتاح العلوم کے کتب خانہ میں مل گئیں، اس کے مہتمم انھیں بمبئی سے خرید کر لائے تھے، اس جامعہ میں میں نے ۱۳۴۹ھ سے ۱۳۶۹ھ تک پڑھایا ہے، میں نے وہاں سے بطور عاریت کے یہ جلدیں حاصل کیں۔''

پھر شیخ کے کارنامے کی توصیف وتعریف اور اعتراف وشکر کے بعد لکھتے ہیں:

''ان جلدوں کا مطالعہ کرتے وقت میں نے کچھ ملاحظات واستدراکات لکھے ہیں، انھیں آپ کے ملاحظے کے لیے بھیجتا ہوں، آپ انھیں دیکھ لیں، اگر آپ کو ان سے اتفاق ہو، اور ان پر شرح صدر ہو تو بہتر ہے، ورنہ میں نے علم کی امانت ادا کردی ہے۔''

شیخ محقق نے حضرت محدث اعظمی کے ملاحظات کو بہت اہتمام وتوجہ سے دیکھا، اور ان میں سے بیشتر کو بہت پسند کیا اور قبول کیا، کہیں کہیں کچھ اختلاف بھی کیا، یہ شیخ کے وسعت قلب کی دلیل ہے کہ انھوں نے ان ملاحظات کو پندرہویں جلد کے آخر میں بتمام وکمال شائع کردیا، اور اس سلسلے میں مزید تحقیقات کی درخواست کی، چنانچہ حضرت مولانا نے دوبارہ پانچویں جلد تک کچھ اور ملاحظات لکھے، اور انھیں ارسال کیا، لیکن اللہ کو منظور نہ تھا۔ ابھی سولہ جلدیں شائع ہوئی تھیں کہ شیخ احمد محمد شاکر کا بلاوا حضرت حق سے آگیا، اور وہ اپنی خدمات کا صلہ حاصل کرنے بارگاہِ قدس میں حاضر ہوگئے۔ شیخ احمد محمد شاکر نے حضرت محدث کبیر کے ملاحظات کو دیکھنے کے بعد جو خط لکھا ہے، اس کے بعض اقتباسات قابل ملاحظہ ہیں:

حضرة الأخ العلامة الكبير المحقق الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمی، جاء نی کتابکم النفیس...... أما استدرا کاتکم فکلها نفیسة عالیة ولا أقول هذا مجاملة ...... وأشکرکم خالص الشکر علی هذه العنایة الجیدة وأرجو أن تزیدونی من إشاراتکم وإرشاداتکم خدمة للسنة النبویة المطهرة وأنتم کما رأیت من عملکم من أعظم العلماء بها بهذا العصر، فالحمد لله علی توفیقکم''

کتبه المخلص أحمد محمد شاکر

آپ کا نفیس گرامی نامہ ملا آپ کے تمام استدراکات نہایت عمدہ اور بلند رتبہ ہیں، میں یہ بات محض آپ کو خوش کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس عظیم توجہ فرمائی پر خلوص دل کے ساتھ آپ کا شکر گزار ہوں، اور مجھے امید ہے کہ آپ سنت نبویہ مطہرہ کی خدمت کے جذبہ سے مجھے مزید مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازیں گے، اور جہاں تک میں نے آپ کے اس کام کو دیکھ کر سمجھا ہے، میرا خیال ہے کہ آپ اس زمانے میں سنت نبویہ کے عظیم تر علماء میں سے ایک ہیں۔ فالحمدللہ۔

اس خط کے علاوہ جب انھوں نے پندرہویں جلد کے اخیر میں ''الاستدراک والتعقیب'' کے تحت ان استدرکات کو شائع کیا تو تمہید میں تیسری جلد کی مذکورہ بالا تحریر کا حوالہ دے کر لکھا کہ:

''میں نے شوال ۱۳۶۶ھ میں یہ تحریر لکھی تھی۔ پھر کئی سال مسلسل گزر گئے۔ مگر کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ حالانکہ مجھے اس کی بڑی آرزو تھی، کیونکہ علم ایک امانت ہے، خصوصاً کتاب وسنت کا علم، پھر میرے پاس ایک بزرگ عالم کا خط آیا، مجھے ان سے شرف تعارف حاصل نہ تھا۔ لیکن ان کے مکتوب سے ان کے علم وفضل کا اور بحث ونظر میں ان کی تدقیق وتحقیق کا اندازہ ہوا۔ ان کا یہ مکتوب ۲۶/ذوقعدہ ۱۳۷۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اس میں جلد اول سے جلد ثامن تک نہایت قابل قدر اور دقیق استدراکات ہیں، یہ صاحب ہیں العلامۃ الاستاذ حبیب الرحمٰن الاعظمی سابق خادم حدیث جامعہ مفتاح العلوم مئو اور حال ممبر اسمبلی اتر پردیش، چونکہ پہلے میں نے وعدہ کیا تھا، نیز ان دقیق ابحاث سے چونکہ مجھے بڑی مسرت

ہوئی ہے، اس لیے ان کے استدراکات کو انھیں کی عبارت میں مختلف مقامات میں ''قال الاعظمی'' کے عنوان سے درج کروں گا، ان میں سے جو کچھ میری تحقیق کے مطابق ہوگا۔ اس پر کوئی نوٹ نہیں تحریر کروں گا، اور جہاں میری رائے ان کی رائے سے کچھ مختلف ہوگی، اور ایسے مقامات بہت کم ہیں۔ وہاں جو کچھ میرے نزدیک درست ہوگا تحریر کردوں گا''۔(۱)

اس تعارف کے بعد حضرت محدث کبیر کے استدراکات کے چند نمونے ملاحظہ ہوں، اس سے پہلے بطور خاص ذہن میں یہ بات رکھئے کہ وقت کا ایک بڑا منجھا ہوا تجربہ کار محقق و محدث پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ بیس پچیس سال کے عرصہ سے علم و تحقیق کے میدان میں اترا ہوا ہے، اس کی نظر بڑی وسیع ہے، اس کے وسائل و ذرائع زیادہ ہیں، مصر جیسی قدیم علمی جگہ ہے، جہاں علم و حکمت کے گرانقدر ذخائر دستیاب ہیں، کثرت مزاولت کی وجہ سے اسے فن حدیث میں کافی بصیرت حاصل ہو چکی ہے، اور وقفہ وقفہ سے مسند احمد کی ایک ایک جلد شائع کرتا ہے، اس کی ہر جلد تحقیق و تدقیق کے موتیوں سے مالا مال ہے، ان موتیوں کی چمک دمک سے اہل علم کی نگاہیں خیرہ ہیں، اس نے نو سال پہلے اہل علم کو، ساری دنیا کے اہل علم کو دعوت نقد و نظر دی، کام بھی اہم تھا، دعوت بھی قابل لحاظ تھی، محققین موجود تھے، مستشرقین بھی علم و تحقیق کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے، مگر نو سال کی مدت میں کوئی آواز نہیں آئی، اور نو سال کے بعد جو آواز آئی، اور امید کی روشنی پھوٹی تو ہندوستان جیسے ظلمت کدے کے ایک گوشے سے، اور یہ نو سال بھی اس لیے لگے کہ جس نے یہ آواز لگائی اور جس نے یہ روشنی دکھائی، اس کو یہ جلدیں دستیاب ہی نہ تھیں، پھر جب دستیاب ہوئیں تو تاخیر نہیں ہوئی، یہ آواز ایک ایسے شخص کی تھی، جو عالم عرب ہی میں نہیں، اس وقت اپنے دیار میں بھی کچھ زیادہ نامور نہ تھا، اس کے پاس وسائل بھی کم تھے، اس کے پاس علمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ بھی نہ تھا، اس کی جگہ بھی کوئی اہم علمی جگہ نہ تھی، لیکن اس کو علم کی جستجو تھی، مطالعہ و تحقیق کا بے پناہ شوق تھا، وہ اس کے لیے جگہ جگہ سفر کیا کرتا تھا، اس کا حافظہ غضب کا تھا، اسے علم حدیث سے عشق تھا، اس عشق اور اس حافظہ نے اسے علم کا پیکر بنا دیا تھا، اس نے گویا چیونٹیوں کے منھ سے دانہ دانہ اکٹھا کیا تھا۔ دنیا بھر میں کسی نے شیخ محقق کی امید پوری نہ کی، یہ امید پوری ہوئی تو ایسے شخص سے جس سے اس کا کوئی تعارف نہ تھا، پھر اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا کہ استدراک لکھنے والا وقت کا عظیم تر عالم ہے۔

---

(۱) مسند احمد ج ۱۵ ص ۲۵۱

محدث اعظمی کے استدراکات کو بغور دیکھنے کے بعد اس کو کئی حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ایسے استدراکات جن کا تعلق متن حدیث یا سند کی تصحیح سے ہے۔

(۲) ایسے ملاحظات جن کا تعلق سندوں کے رجال ورواۃ سے ہے۔

(۳) وہ تنقیدات وتصحیحات جو احادیث کی شرح اور ان کے الفاظ کی تفسیر سے متعلق ہیں۔

(۴) ایسی تحقیقات جو کسی ایسی حدیث کے متعلق ہیں، جو شارح محقق کو باوجود تلاش وجستجو کے نہیں مل سکیں۔

(۵) کوئی کوئی استدراک شارح کے استنباط سے متعلق ہے۔

(۶) بعض جگہ طباعت کی غلطی کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۷) کہیں شیخ محقق کی کسی بات کو مدلل کیا گیا ہے۔

ہم ان میں سے ہر ایک کی چند مثالیں دیں گے۔ ان میں سے بعض تو وہ ہوں گی جو شائع ہو چکی ہیں، ان کا حوالہ دے دیا جائے گا۔ اور بعض حضرت مولانا کے قلمی مسودات کی شکل میں ہیں، ان کا کوئی حوالہ نہ ہوگا۔ علی الترتیب مثالیں ملاحظہ ہوں، سہولت کے لیے جلد، صفحہ اور حدیث کے نمبرات لکھ دئے گئے ہیں۔

متن حدیث اور سند کی تصحیح:

(۱) ج۲ص۷۷حدیث۸۴۹: **وتجعلون رزقكم أنكم تكذبون،** اس میں **رزقكم** کی تفسیر **شرككم** سے کی گئی ہے (**قال شرككم**)

محدث اعظمی نے لکھا کہ یہ صحیح نہیں ہے، صحیح **وشكركم** ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسی کتاب کی ج۲ص۱۵۴ پر یہ لفظ آیا ہے اور یہی لفظ ترمذی شریف میں بھی موجود ہے دیکھئے ترمذی مع تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج۴ص۱۹۲۔

(۲) **والله إن رجاء هذه الأمة بعد مائة عام.** یہ عبارت ج۲ص۹۲ پر حدیث ۱۷ میں بھی ہے اور ص۹۵ حدیث ۱۸ میں بھی ہے، دونوں جگہ شارح محقق نے لفظ **رجاء** کو باقی رکھا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے، یہاں پر درست لفظ **رخاء، بالخاء المعجمة** ہے، چنانچہ اسی جلد کے ص

۲۸۰ پر یہ لفظ آیا ہے۔ حدیث ۱۱۸۷ [1] نیز مشکل الآثار ج ۱ ص ۱۶۱ کنز العمال، مجمع الزوائد، اور مستدرک حاکم میں بھی رخاء کا ہی لفظ آیا ہے۔

(۳) ج ۴ ص ۸۷ حدیث ۲۳۱۳، **لا تستقبلوا ولا تحفلوا، ولا ينعق بعضكم لبعض**، اس میں شارح محقق نے **ولا ينعق** کو **نعيق** سے مشتق سمجھا ہے، مگر ایسا نہیں ہے، ترمذی شریف میں بھی یہ حدیث موجود ہے، درحقیقت یہ لفظ **ولا ينفق بعضكم لبعض** ہے، اور یہی لفظ اپنے ماقبل کے دونوں لفظ کے معنوی حیثیت سے مناسب بھی ہے۔

(۴) ج ۴ ص ۲۰۵- (حدیث) ۲۵۹۷، **لو أن أحدكم أولو أن أحدهم إذا أتى إمرأته قال اللّٰهم جنبنى الشيطان وجنب الشيطان ما رزقتنى ثم كان بينهما ولد الا لم يسلط عليه الشيطان أولم يضره الشيطان**. اس حدیث میں کلمہ الا زائد ہے، شارح کو چاہئے تھا کہ اسے ذکر کردیتے، ورنہ اس کی کوئی اور توجیہ کیے ہوتے۔

اس کے زائد ہونے اور ناسخین کی طرف سے اضافہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ امام احمد نے محمد ابن جعفر عن شعبہ عن منصور کے طریق سے اس کو روایت کیا ہے اور امام بخاری نے آدم عن شعبہ کے طریق سے اس کی تخریج کی ہے، بخاری کے الفاظ یہ ہیں: **لو أن أحدكم إذا أتى أهله قال اللّٰهم جنبنى الشيطان وجنب الشيطان ما رزقتنى فان كان بينهما ولد لم يضره الشيطان أولم يسلط عليه**. اس میں **لم يسلط** سے پہلے کلمہ "**الا**" نہیں ہے۔

اسی روایت کو امام مسلم نے جریر عن منصور کے طریق سے نقل کیا ہے، اور اس کا متن بھی ذکر کیا ہے، پھر مذکورہ بالا روایت کی سند یعنی محمد بن جعفر عن شعبہ کے طریق سے بھی اس کی تخریج کی ہے، مگر حدیث کے الفاظ نہیں نقل کیے ہیں، صرف یہ کہا ہے کہ بمعنی حدیث جریر **غير أن شعبة ليس فى حديثه ذكر بسم اللّٰه**. میں کہتا ہوں کہ حدیث جریر میں لفظ الا نہیں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: **لو ان أحدهم إذا أراد أن يأتى أهله قال بسم اللّٰه اللّٰهم جنبنا الشيطان وجنب الشيطان ما رزقتنا، فإنه إن يقدر بينهما ولا فى ذلك لم يضره الشيطان أبداً**.

---

(۱) اس روایت میں **إنما رخاء هذه وفرجها بعد المائة** کا لفظ ہے، اس میں **فرجها** کے اضافہ نے رخاء کو متعین کردیا ہے۔ اعجاز

حافظ ابن حجر نے فتح الباری ج ۹ ص ۱۸۱ میں تحریر فرمایا ہے کہ امام مسلم اور امام احمد کے یہاں شعبہ کی روایت میں **لم يسلط عليه الشيطان أو لم يضره الشيطان** ہے، دیکھئے حافظ ابن حجر مسند احمد سے **لم يسلط** نقل کرتے ہیں الا **لم يسلط** نہیں نقل کرتے۔

امام طیالسی نے بھی اپنی مسند میں اس حدیث کو **حدثنا شعبة عن منصور والأعمش** کہہ کر نقل کیا ہے، اس میں بھی کلمہ الا نہیں ہے۔

(۵) ج ۲ ص ۲۷۳ حدیث ۱۱۶۷ سند میں مسعر بن الحکم آئے ہیں، یہی لفظ قدیم طباعت میں بھی ہے، لیکن صحیح مسعود بن الحکم ہے، چنانچہ اسی جلد میں ص ۲۴۷ حدیث ۱۰۹۴ میں مسعود بن الحکم ہی ہے۔

لیجئے چند منٹ میں آپ نے بغیر کسی خاص محنت کے کئی مثالیں پڑھ لیں، مگر خیال کیجئے، ان تحقیقات و معلومات کے لیے کیسی کچھ جگر کاوی اور دماغ سوزی کرنی پڑی ہوگی، ہر ہر بات کے لیے مختلف ذخائر سے دلائل فراہم کر لینا کیا ہر کسی کے بس کی بات ہے؟

رجال و رواۃ پر استدراک

(۱) ج ۴ ص ۶۸ حدیث ۲۲۶۵ **حدثنا إسماعيل بن عمر حدثنا ابن أبی ذئب عن شعبة عن ابن عباس**، اس سند کو شارح محقق نے منقطع قرار دیا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ شعبہ بن الحجاج اگرچہ امام جرح و تعدیل ہیں، ثقہ و مامون ہیں، ثبت اور حجۃ ہیں، لیکن انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس کو نہیں پایا ہے۔

اس پر محدث اعظمی نے نقد کیا کہ یہ شعبہ جو حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت بیان کر رہے ہیں، وہ شعبہ نہیں ہیں، جو ابن حجاج ہیں، امام اہل فن ہیں، بلکہ یہ شعبہ مولیٰ ابن عباس ہیں، جن کا تذکرہ تاریخ بخاری ۲/۲/۲۴۴ میں ہے، اس میں ہے کہ بشر بن عمر نے شعبہ کے متعلق جن سے ابن ابی ذئب روایت کرتے ہیں، امام مالک سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ثقہ نہیں ہیں، اسی روایت ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل ۲/۱/۳۶۷-۳۶۸ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور امام احمد سے نقل کیا ہے کہ **ما أرى به بأسا**، اور ابن معین سے نقل کیا ہے **لا يكتب حديثه**، ابوحاتم سے یہ کہ **ليس بقوی**، اور ابوزرعہ سے یہ کہ مدینی ضعیف الحدیث ہیں، یہ تہذیب کے رجال میں سے ہیں۔

شیخ محقق اس پر لکھتے ہیں۔ **هذا استدراک جید نفیس جزاه اللّٰه خیراً.**

پھر لکھتے ہیں کہ شعبہ مولی بن عباس کو اس سے پہلے ہم حدیث ۲۰۷۳ میں بیان کر چکے ہیں، اور اس کے بعد حدیث ۲۸۰۱ میں بھی کہ وہ حسن الحدیث ہیں، یہاں ہم سے غلطی ہوگئی کہ ہم نے انھیں شعبہ بن الحجاج سمجھ لیا(۱)

(۲) ج۴ص۱۵۹ حدیث ۲۴۷۸، حدثنا عبدالله بن الولید العدنی قال حدثنا سفیان عن دوید عن إسماعیل بن ثوبان عن جابر بن زید عن ابن عباس.

اس پر حاشیہ میں شیخ محقق نے فرمایا کہ یہ دوید بصری ہیں، اور یہ ثقہ ہیں......ان کا تذکرہ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے لسان المیز ان میں ان کی پیروی کی ہے، لیکن تعجیل المنفعۃ میں اسماعیل بن ثوبان کے تذکرہ میں ان سے چوک ہوگئی۔ انھوں نے اس میں لکھ دیا ہے کہ اسماعیل بن ثوبان وہی ہیں، جن سے دوید بن نافع نے روایت کی ہے، اور اس کو قطعیت کے ساتھ لکھ دیا ہے، اسی لیے انھوں نے تہذیب میں دوید بصری کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ وہ دوید بن نافع کا تذکرہ لکھ چکے ہیں۔

اس پر محدث اعظمی نے استدراک لکھا کہ حافظ ابن حجر کی چوک اس سلسلے میں نہیں ہے کہ انھوں نے دوید بصری اور دوید بن نافع کو ایک شخصیت سمجھ لیا ہے، چوک ان سے امام بخاری کی مراد سمجھنے میں ہوئی ہے، امام بخاری نے جہاں دوید کا جو اسماعیل بن ثوبان کے راوی ہیں تذکرہ کیا ہے، اس پر حافظ ابن حجر نے لکھا کہ یہ دوید، دوید بن نافع ہیں، حالانکہ امام بخاری نے خود دوید بن نافع اور اسماعیل کے راوی دوید کے درمیان فرق کیا ہے، اور بلاشبہہ یہ حافظ ابن حجر کا سہو ہے، لیکن اس کے باوجود نہیں کہا جاسکتا کہ حافظ ابن حجر یقینی طور پر دوید بن نافع ہی کو اسماعیل کا راوی سمجھتے ہیں، اور اس سلسلے میں آپ نے جو دلیل پیش کی ہے کہ اسی غلط فہمی کی وجہ سے حافظ نے دوید بصری کا تذکرہ تہذیب میں چھوڑ دیا ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ حافظ نے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن دال مہملہ کی فصل میں نہیں کیا ہے، بلکہ دال معجمہ کی فصل میں کیا ہے، اور وہاں تصریح کی ہے کہ اسماعیل بن ثوبان کے راوی یہی ہیں ان کی عبارت ملاحظہ ہو:

''ذوید البصری عن إسماعیل بن ثوبان وعنه الثوری ذکر ابن أبی حاتم عن

---

(۱) مسند احمد ج۱۵ص۲۶۴

أبيـه ليـس هـو ذويـد بن نافع هذا شيخ لين وقال ابن حبان في الثقات ذويد بن نافع يروي عن أبي منصور عن ابن عباس''.

شیخ اعظمی فرماتے ہیں کہ ابوحاتم کا یہ قول کہ **هذا شيخ لين** تعجیل میں بھی موجود ہے، اورلسان اور میزان اور مجمع الزوائد میں بھی اسی جیسی بات ہے اور تاریخ بخاری کے مصحح کی تعلیقات میں ابوحاتم سے منقول ہے کہ وہ ذوید بن نافع نہیں ہیں **وهو شيخ لين** البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ انھوں نے ذال معجمہ میں ان کا تذکرہ لکھا کیوں، جب کہ امام بخاری اور ابن ابی حاتم نے ان کا تذکرہ دال مہملہ کی فصل میں کیا ہے، شاید ابن حبان نے ذال معجمہ میں ان کا تذکرہ لکھا ہو، ہاں حافظ ابن حجر نے تہذیب میں ذال معجمہ کے تحت ذوید بن نافع کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور کہا ہے کہ انھیں ذوید کہا گیا ہے، اور دال میں ان کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

اس پر شیخ محقق نے لکھا ہے کہ **وهو تحقيق جيد** اس دقت نظر کا کیا کہنا کہ لفظوں کے فرق کو بھی پرکھ لیتی ہے، تحقیق اسے کہتے ہیں [1]

(۳) علم اسماء الرجال میں محدث اعظمی کی وسعت نظر کا ایک اور نمونہ دیکھتے چلئے:

مسند احمد ج ۴ ص ۲۷۲ حدیث ۲۷۷۱، **حدثنا حسن، حدثنا دويد عن سلمة بن بشير عن عكرمة عن ابن عباس.**

اس پر شیخ محقق لکھتے ہیں کہ میں نے ان سلمہ بن بشیر کا تذکرہ کہیں نہیں پایا، اور تاریخ کبیر کے جس حصے میں ان کا ذکر ہونے کا احتمال ہے، وہ ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے، مزید انھوں نے یہ بھی لکھا سلمہ بن بشیر کا ترجمہ حافظ حسینی نے سالم بن بشیر کے نام سے تحریر کیا ہے، اس پر حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفعۃ میں نقد کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> **''سالـم بـن بشيـر عـن عكرمة وعنه دويد الخراساني، مجهول. قلت هـذا غلـط نشأ عـن تـحـريف وإنـمـا هـو سلمة بسكون اللام بعدها ميم وسأذكره علـى الصـواب ان شاء الله تعالى، ثم جاء في ص ۱۵۸ وقال سلمة بن بشير تقدم في سالم، ثم لم يقل شيئاً ولم يف بما وعد.''**

---

(۱) مسند احمد ج ۱۵ ص ۲۶۶

حافظ ابن حجر کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ سالم بن بشیر غلط ہے، یہ سَلْمہ ہے، اور میں بعد میں اسے صحیح طور پر ذکر کروں گا۔ مگر ہوا یہ کہ جب سلمہ بن بشیر کا تذکرہ لکھنے کا موقع آیا تو حافظ نے حوالہ دے دیا کہ سالم بن بشیر کے تذکرہ میں بات گذر چکی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا اور انھوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔

شیخ محقق کے نزدیک یہ گتھی ایسی الجھی ہوئی ہے کہ وہ حیران ہیں، اولاً تو انھیں سلمہ بن بشیر کا تذکرہ کہیں نہیں مل رہا ہے، ثانیاً انھیں یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ حافظ ابن حجر نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اب محدث کبیر کے ناخن گرہ کشا کا کمال ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ سلمہ بن بشیر کا ترجمہ تاریخ بخاری ۱۵۸/۲/۲ میں اور کتاب الجرح والتعدیل ۲۲۶/۱/۲ میں ہے، اور اس میں یہ بھی ہے کہ ابن معین نے ان کے بارے میں **لیس به بأس** کہا ہے۔

رہی یہ بات کہ حافظ ابن حجر نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا، تو میں کہتا ہوں کہ انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا، لیکن یہ وعدہ بجائے سلمہ کے اسمہ ''سلیم'' کے تحت پورا ہوا، چنانچہ انھوں نے ان کے تذکرہ میں وہی بات ذکر کی ہے جو ابن ابی حاتم نے سلمہ کے تذکرہ میں لکھی ہے، پھر کہا کہ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان لوگوں کے تحت ان کا ذکر کیا ہے جن کا نام سلمہ ہے۔

محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ ابن حبان اس میں تنہا نہیں ہیں، امام بخاری نے بھی اور ابن ابی حاتم نے بھی ''سلمہ'' ہی کے تحت لکھا ہے، لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ حافظ نے کس کے اتباع میں سلیم لکھا ہے، البتہ حافظ کو یہ ضرور چاہئے تھا کہ سلمہ بن بشیر کے ذکر میں بجائے اس کے کہ **تقدم فی سالم** کہتے، **یاتی فی سلیم بن بشیر** فرمادیتے۔

شیخ محقق فرماتے ہیں ''وھو تحقیق نفیس''۔(۱)

ایک فرد سلمہ پر دیکھئے کہ تحقیقات کے کیسے کیسے موتی کہاں کہاں سے لائے گئے، یہ جہاں ایک طرف محدث کبیر کی وسعت نظر، قوت حافظہ اور تعمق مطالعہ کی دلیل ہے، وہیں اس سے علم حدیث کی معجزہ کاری کا بھی ثبوت ملتا ہے، کیسی ذہانتوں اور کیسی کیسی عبقری شخصیات کو اس نے اپنی خدمت پر لگا رکھا ہے، اور یہ بھی منجملہ حقانیتِ اسلام کے دلائل کے ہے۔

---

(۱) مسند احمد ج ۱۵ ص ۲۶۸

(۴) میں نے ارادہ کیا تھا کہ چند نمونے پیش کر کے بات ختم کردی جائے گی، مگر حضرت محدث کبیر کا جو استدراک پڑھتا ہوں، دامن دل کھینچتا ہے کہ جا اینجاست، مضمون طویل ہوتا جارہا ہے، مگر دل گوارا نہیں کرتا کہ سامنے آئی ہوئی بیش قیمت بات بغیر ذکر کئے چھوڑ دوں، درحقیقت یہ پوری ایک کتاب کا موضوع ہے، خیر کتاب کا مسئلہ بعد میں حل ہوگا۔ فی الحال ایک اور نمونہ دیکھئے:

مسند احمد ج ۵ ص ۹ حدیث ۳۰۱۷ سند میں نوح بن جعونہ السلمی خراسانی آئے ہوئے ہیں، اس پر شیخ محقق لکھتے ہیں:

ان کا ترجمہ تعجیل میں ہے ص ۴۲۵-۴۲٦، لیکن وہاں انھیں حجازی کہا ہے اور یہ کہ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور میزان جلد ۳ ص ۲۴۳ میں ہے **أجوز أن يكون نوح بن أبي مريم، أتى بخبر منكر.**

امام ذہبی کے اس قول پر شارح محقق اعتراض کرتے ہیں کہ ان کا یہ قول بہت بعید ہے، کیوں کہ نوح بن جعونہ خراسانی ہیں جیسا کہ مسند احمد کی سند میں اس کی صراحت ہے حجازی نہیں ہیں، جیسا کہ تعجیل میں مذکور ہے، اور نوح بن ابی مریم مروزی ہیں۔

یہاں محدث اعظمی نے تحریر فرمایا کہ نوح بن جعونہ کو حجازی قرار دینے میں حافظ ابن حجر نے حافظ حسینی کی تقلید کی ہے، چنانچہ انھوں نے بھی اکمال میں انھیں حجازی قرار دیا ہے، نوح کا تذکرہ کتاب الجرح والتعدیل میں بھی ہے، وہاں انھیں حجازی نہیں کہا گیا ہے، اور تاریخ بخاری میں سرے سے ان کا تذکرہ ہی نہیں ہے۔

اور جہاں تک امام ذہبی کے اس احتمال وتجویز کا تعلق ہے کہ وہ نوح بن ابی مریم ہوں تو اس بات کی تردید کتاب الجرح والتعدیل کے مصحح نے بھی کی ہے، اور کہا ہے:

''نوح بن جعونه سلمي ونوح بن ابي مريم قرشي ولاءً''

شارح محقق نے فرمایا کہ **وهو كما قال**[1]

یہ استدراک تو مطبوعہ ہے، اس کے بعد حاشیے پر محدث اعظمی نے اپنے قلم سے مزید اضافہ کیا ہے، فرماتے ہیں کہ حافظ ابن احجر نے جزماً نوح بن جعونہ اور نوح بن ابی مریم کو ایک شخصیت قرار دیا

(۱) مسند احمد ج ۱۵ ص ۲۷۰

ہے، اور کہا ہے کہ ابو مریم کا نام یزید بن جعونہ ہے، ابن حبان نے اس کو جزماً لکھا ہے۔ پھر انھوں نے حسینی کے اس قول کی تردید کی ہے کہ یہ دو شخصیتیں ہیں، حسینی کی دلیل یہ ہے کہ ابن حبان نے نوح بن جعونہ کی وفات ۱۵۳ھ میں بتائی ہے جب کہ ابن ابی مریم کی وفات ۱۷۳ھ میں لکھی ہے، حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی کہ راویوں کے سنین وفات میں اختلاف تو ہوتا ہی رہتا ہے، لہذا یہ اختلاف سن کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔

نیز حافظ حسینی نے امام ذہبی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے قطعیت کے ساتھ نوح کو ابن ابی مریم ہی کہا ہے۔ (جزم بکونه ابن ابی مریم) اس کی بھی تردید حافظ ابن حجر نے کی ہے، اور کہا کہ امام ذہبی میزان الاعتدال میں اس باب میں متردد ہیں، شاید انھوں نے کسی دوسری جگہ جزماً لکھا ہو۔

محدث اعظمی نے حسینی کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ حسینی نے ''جوز'' لکھا ہوگا کتابت کی غلطی سے- جسے محدثین تصحیف کہتے ہیں- وہ ''جزم'' ہوگیا ہے۔

(۵) علم اسماء الرجال میں وسعت معلومات کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو:

مسند احمد ج ۵ ص ۸۴، حدیث ۳۲۴۳، **حدثنا یحیی عن عبدالمطلب عن ابن عباس.**

اس کے متعلق شارح محقق لکھتے ہیں کہ عبدالمطلب مطبوعہ نسخے میں ہے، اور ایک قلمی نسخہ میں - جو شارح کے نزدیک معتبر ہے- یہ سند اس طرح ہے یحیی عن المطلب طاؤس عن ابن عباس، شارح کو دونوں سندوں پر اعتراض ہے، وہ کہتے ہیں کہ جن رواۃ کا ترجمہ لکھا گیا ہے، ان میں کوئی راوی عبدالمطلب نامی نہیں ہے، بجز عبدالمطلب بن ربیعہ بن الحارث کے، لیکن یہ صحابی ہیں اور عبداللہ بن عباس سے بڑے ہیں، اور کتب رجال میں مطلب نام کے جو راوی ملتے ہیں، ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں احتمال ہو کہ وہ طاؤس سے روایت کرسکتا ہے، اور اس سے یحییٰ بن قطان نے روایت لی ہو۔

اس پر محدث اعظمی کا استدراک ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں مطلب نام کے دو راوی ایسے ہیں جو طاؤس سے اگر روایت کریں تو گنجائش ہے، ایک مطلب بن عبداللہ بن مطلب بن حنطب، جن کا تذکرہ تہذیب میں ہے، یہ خارجہ بن زید کے شاگرد ہیں اور خارجہ بن زید طاؤس کے ہم عصر ہیں، ایک قول کے مطابق دونوں بزرگوں کا ایک ہی سال انتقال ہوا ہے۔

دوسرے مطلب بن عبداللہ بن قیس، ان کا تذکرہ بھی تہذیب میں ہے، یہ سعید بن ہند سے

روایت کرتے ہیں، اور سعید کی وفات طاؤس کے بعد ہوئی ہے، نیز یہ اپنے والد گرامی سے بھی روایت کرتے ہیں، جن کا وصال جہاں تک میرا خیال ہے کہ طاؤس سے پہلے ہوا ہے۔ یہ مدینہ میں ۷۳ھ سے ۷۶ھ تک قاضی رہے ہیں۔

شیخ محقق لکھتے ہیں کہ ھذا کلام جید ینبئ عن اطلاع واسع (یہ عمدہ کلام ہے، جس سے وسیع علم کی خبر ملتی ہے)

واقعی اسماء الرجال کے لق ودق صحرا سے ایسے گمشدہ افراد کو تلاش کرلانا کسی زبردست صاحب بصیرت ہی کا کام ہے۔

(۲) مسند احمد ج ۵ ص حدیث ۳۸۸۵ حدیث کی سند میں ایک صاحب ابوالرضراض آئے ہیں، شیخ محقق فرماتے ہیں کہ ''یہ تابعی ہیں ابن سعد نے جلد ۶ ص ۱۴۱ پر ان کا ترجمہ تحریر کیا ہے لیکن حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفعۃ ص ۱۳۰ میں انھیں اضراض لکھا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ یہی صاحب ابورضراض ہیں، کنیتوں کے باب میں ان کا ذکر آئے گا'' لیکن وہاں نہیں ذکر کرسکے، شاید بھول گئے ہوں، دارقطنی نے بھی انھیں رضراض ہی کہا ہے دیکھئے لسان المیزان ج ۴ ص ۴۷۷''

اب یہ بات معرض بحث میں آگئی کہ یہ صاحب رضراض ہیں یا ابوالرضراض، علامہ شیخ عبدالرحمٰن یمانی مصحح تاریخ کبیر فرماتے ہیں دونوں روایات میں اس طرح تطبیق ہوسکتی ہے کہ رضراض ہی ابوالرضراض ہوں، نام پر کنیت رکھنے کا ثبوت موجود ہے۔

اس پر محدث کبیر نے تحریر فرمایا کہ اس حدیث کی تخریج امام طحاوی نے معانی الآثار میں ۲۶۳/۱-۲۶۴ پر فرمائی ہے ان کی سند یہ ہے **حدثنا فهد حدثنا الحمانی قال حدثنا محمد بن فضیل عن مطرف عن ابی الجهم عن ابی الرضراض عن عبدالله۔**

حافظ حسینی نے اکمال میں ابوالرضراض کا ذکر کیا ہے فرمایا کہ ابوالرضراض، وقیل رضراض بن اسعد، انھوں نے حضرت علی اور حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے، اور ان سے ابوالجہم سلیمان بن ابی الجہم نے، ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور حسینی نے ''الاسماء'' میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے، وہاں کہا ہے، ''الرضراض'' (مطبوعہ نسخہ میں کاتب کی غلطی سے الرضاض ہوگیا ہے) بن اسعد اور کہا جاتا ہے ابوالرضاض (مطبوعہ نسخہ میں یہی ہے، لیکن یہ غلط ہے، صحیح

ابوالرضراض ہے)**عن علی و ابن مسعود عن النبی ﷺ فی الصلوٰۃ**، اورامام عینی نے بھی معانی الاخبار میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اورابن حبان سے ان کی توثیق اورازدی سے ان کی تضعیف نقل کی ہے، اورکہا ہے کہ ان کو رضراض بن اسعد کہا جاتا ہے، **حکاہ السندی فی کشف الاستار**.

پھر محدث اعظمی نے مزید لکھا ہے کہ شیخ عبدالرحمٰن الیمانی نے یہ جو فرمایا ہے کہ وہ رضراض عن علی کی کوئی حدیث نہیں جانتے، اورانھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس حدیث کی سند میں رضراض بن اسعد واقع ہوا ہوگا۔ تو میں کہتا ہوں کہ شیخ کا خیال صحیح ہے، مجھے رضراض عن علی کی روایت معانی الآثار ج۲ص۸۰ میں قتادہ عن الرضراض بن اسعد مل گئی، فرماتے ہیں کہ **شھدت علیا رضی اللہ عنہ جلد شراحۃ ثم رجمھا**، شیخ محقق فرماتے ہیں کہ **ھذا تحقیق بدیع ممتاز**[۱]

محدث اعظمی کی قوت علمیہ ملاحظہ ہو کہ جس بات کو حافظ ابن حجر نے مجملا کہہ کر آگے ذکر کرنے کا حوالہ دے دیا، اور پھر ذکر نہ کرسکے امام بخاری کی تاریخ کبیر میں محض رضراض ہے، دارقطنی کا اشارہ بھی یہی ہے، شارح محقق اور علامہ عبدالرحمٰن یمانی کے نزدیک راجح ابوالرضراض ہے، پھر یہ بھی احتمال ظاہر کیا ہے کہ دونوں ایک ہی شخصیت ہو، محدث اعظمی نے اسی کو دلائل کے ذریعہ مکمل کردیا پھر اتنا ہی نہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابوالرضراض دوصحابی سے روایت کرتے ہیں، حضرت ابن مسعود سے، اورحضرت علی سے، مگر علامہ عبدالرحمٰن کو حضرت علی سے ان کی کوئی روایت نہیں ملی، اسے محدث کبیر کی وسیع نظر نے کھوج نکالا۔

(۷) مسند احمد ج۶ ص۱۸ حدیث ۳۹۳۸ **حدثنا سلیمان بن داؤد الھاشمی حدثنا سعید یعنی بن عبدالرحمن الجمحی عن موسی عقبۃ عن الاودی عن ابن مسعود ان رسول اللہ ﷺ قال: حرم علی النار کل ھین لین سھل قریب من الناس.** حدیث میں ایک تابعی محض الاودی کے نام سے آئے ہیں، شارح محقق ان کے متعلق لکھتے ہیں میں بالیقین نہیں بتا سکتا یہ کون ہیں؟ تاہم میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ دو شخصوں میں سے کوئی ایک ہوں گے، یا تو عمرو بن میمون الاودی ہوں یا ہزیل بن شرحبیل الاودی ہوں، یہ دونوں عبداللہ بن مسعود کے شاگرد ہیں۔

محدث اعظمی اس پر نقد کرتے ہیں کہ یہ خیال صحیح نہیں، یہ عبداللہ بن عمرو الاودی ہیں، چنانچہ

---

(۱) مسند احمد ج:۱۵ص:۲۷۸

تہذیب میں ہے کہ انھوں نے عبداللہ بن مسعود سے **هل تدرون على من تحرم النار غداً** والی حدیث روایت کی ہے، اوران سے موسی بن عقبہ نے یہ روایت لی ہے ابن حبان نے کتاب الثقات میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

لیجئے! الاودی کی شخصیت دلیل کے ساتھ متعین ہوگئی، شارح محقق نے جن کے بارے میں خیال ظاہر کیا تھا۔ ان میں سے کوئی نہ نکلا، ایک تیسرے صاحب ثابت ہوئے۔

آگے پھر شارح محقق لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مجھے اس سند کے ساتھ صرف جامع صغیر[1] میں ملی ہے، اور وہاں صرف مسند احمد کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن اس کے شارح علامہ مناوی نے حافظ عراقی کا قول نقل کیا ہے کہ اسے ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور ''حسن غریب'' کہا ہے، اور ترغیب وترہیب ج ۳ ص ۲۶۳ میں بھی ایک روایت اسی مفہوم کی ہے اور صاحب ترغیب نے بھی کہا ہے **رواه امام الترمذی وقال ''حديث حسن''**، شارح فرماتے ہیں کہ میں نے ترمذی میں یہ روایت بہت تلاش کی مگر نہ ملی، اور مجھے تقریباً یقین ہے کہ ترمذی کی روایت کسی اور طریق سے ہوگی۔

بہرحال شارح محقق کو یہ روایت سرے سے ترمذی میں ملی ہی نہیں، پھر بعض قرائن کی بناء پر جن کا تذکرہ انھوں نے شرح میں کیا ہے، یہ فرمایا کہ اگر اس میں اس قسم کی کوئی روایت ہوگی، تو دوسرے طریق سے ہوگی۔

اب محدث الہند کا استدراک ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ روایت ترمذی میں اسی سند سے ہے یعنی موسیٰ بن عقبہ عن الاودی جیسا کہ تہذیب میں ہے، اور یہ حدیث بحمداللہ مجھے مل گئی، ترمذی شریف **باب ما جاء في صفة اواني الجنة** کے بعد والے باب میں یہ حدیث موجود ہے، دیکھئے ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ج ۳ ص ۳۱۴۔

کیسا عمدہ فیصلہ ہوا، شارح محقق فرماتے ہیں **وهذا كله صحيح وصواب**[2]

(۸) محدث کبیر کے ان استدراکات میں ایک مقام ایسا آتا ہے، جہاں شیخ محقق نے ان سے شدید اختلاف کیا ہے، اوران کے استدراکات پر اچھا خاصا تبصرہ ہی نہیں بلکہ دو الزام بھی عائد کردیئے ہیں، انھیں ملاحظہ کرنے کے بعد محدث الہند کے علم وتحقیق کا دریا امنڈ آیا، واقعی تحقیق اسی کا

(۱) حدیث ۳۷۰۳ (۲) مسند احمد ج: ۱۵ ص: ۲۷۹

نام ہے، اور علم کی رسائی اسے کہتے ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو۔

مسند احمد ج ۷ ص ۱۷، حدیث ۴۹۵۷، اس حدیث کی سند میں **عبدالعزیز بن عمر بن عبدالعزیز عن إسماعیل بن جریر عن قزعة قال: قال عبدالله بن عمر** آتے ہیں شارح محقق نے لکھا ہے کہ اس مسند میں دو اختلاف ہے، بعض روایات میں عبدالعزیز بن عمر اور قزعۃ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے، اور دوسری روایات میں واسطہ ہے، پھر واسطہ میں بھی اختلاف ہے کہ وہ اسماعیل بن جریر ہیں یا ان کے بیٹے یحییٰ بن اسماعیل بن جریر؟ حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں یحییٰ بن اسماعیل کو ترجیح دی ہے، بلکہ انھیں کو جزماً متعین کیا ہے، چنانچہ انھوں نے اسماعیل کے تذکرے میں بس اتنا کہا کہ صحیح یحییٰ بن اسماعیل بن جریر ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے ج ۱ ص ۲۸۷ اور اس پر ابوداؤد کا رمز تحریر کیا ہے، پھر یحییٰ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ **یحیی بن اسماعیل بن جریر بن عبدالله البجلی الکوفی عن الشعبی ونافع مولیٰ ابن عمرو قزعة بن یحیی وعنه عبدالعزیز وهشیم والحسن بن قتیبة المدائنی، ذکره ابن حبان في الثقات قلت (القائل ابن حجر) قال الدارقطني: لا یحتج به** اس کے بعد اور کچھ نہیں لکھا۔ صرف نسائی کا رمز تحریر کیا ہے، گویا نسائی میں یہ روایت اسی سند سے موجود ہے، شارح کہتے ہیں کہ میں نے نسائی شریف میں یہ روایت تلاش کی، مگر مجھے نہیں ملی، شاید وہ سنن کبری میں ہو، اور وہ جو ہم نے ابن حجر کا فیصلہ نقل کیا ہے کہ واسطہ یحییٰ بن اسماعیل ہیں، میرا گمان یہ ہے بلکہ یہی میرے نزدیک راجح ہے کہ یہ بات حافظ ابن حجر نے اپنی طرف سے کہی ہے، تہذیب الکمال میں حافظ مزی نے اس کو نہیں ذکر کیا ہے، کیوں کہ خزرجی نے خلاصہ میں جو تہذیب الکمال کا اختصار ہے، اس میں سرے سے یحییٰ بن اسماعیل کا تذکرہ ہی نہیں کیا ہے، اگر تہذیب الکمال میں ان کا ذکر ہوتا تو خزرجی بھی ضرور تذکرہ کرتے، ان شاء اللہ، کیونکہ انھوں نے اختصار کے ساتھ تہذیب الکمال کے تمام رجال کو لے لیا ہے۔

محدث اعظمی نے شارح محقق کی اس بات پر کہ خزرجی نے خلاصہ میں یحییٰ کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اگر تہذیب الکمال میں ان کا تذکرہ ہوتا تو خزرجی بھی ضرور ذکر کرتے، تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یحییٰ بن اسماعیل کا تذکرہ تہذیب الکمال میں ضرور ہوا ہوگا، خواہ قزعہ کے راوی ابوداؤد کی روایت میں اسماعیل ہوں، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں، یا ان کے بیٹے یحییٰ ہوں، کیونکہ یحییٰ مذکور کی روایت

ابوداؤد کی روایت کے علاوہ بھی موجود ہے، اور اس میں ان کے نام کی تصریح ہے، یہ روایت نسائی نے ذکر کی ہے جیسا کہ آپ نے حافظ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے نسائی کا رمز تحریر کیا ہے، اس لیے ان کا ذکر تہذیب الکمال للمزی میں ہونا ضروری ہے، رہا یہ کہ خزرجی نے ان کا تذکرہ خلاصہ میں نہیں کیا تو یہ ان کا یا تو سہو ہو یا کاتبوں کی غلطی کی وجہ سے حذف ہو گیا ہو۔

پھر محدث اعظمی نے یہ بھی لکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے سنن نسائی میں یہ روایت تلاش کی مگر مجھے نہیں ملی، شاید وہ سنن کبری میں ہو تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ حافظ نے جو رمز تحریر کیا ہے وہ ''س''نہیں ہے کہ سنن نسائی مراد لی جائے، بلکہ انھوں نے رمز''سی'' بالیاء والسین لکھا ہے، جس سے ان کی مراد ان کی دوسری کتاب عمل الیوم واللیلۃ ہے۔

شیخ محقق نے اس جگہ اعتراف کیا کہ محدث اعظمی کی گرفت بالکل صحیح ہے، بلا شبہ حافظ نے ''سی'' کا رمز لکھا ہے،''س'' کا نہیں لیکن محدث کبیر کی، اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ تہذیب الکمال میں یحییٰ کا تذکرہ ضرور ہوگا۔ اور یہ کہ خزرجی نے خلاصہ میں ان کا ذکر جو نہیں کیا تو یہ ان کا سہو ہے، فرماتے ہیں کہ یہ محل ظن پر یقینی فیصلہ صادر کرنا اور بے وجہ خزرجی کے سر تہمت لگانا ہے، (**فانہ جزم فی موضع الظن واتہام للخزرجی فی غیر موضع التہمۃ**) کیونکہ حافظ ابن حجر نے خود بھی تقریب التہذیب میں یحییٰ کا ترجمہ نہیں لکھا ہے، انھوں نے ان کا ذکر صرف تہذیب التہذیب میں کیا ہے، اس سے ہمارے گمان کی تائید ہوتی ہے کہ یہ ترجمہ تہذیب الکمال کے تراجم پر اضافہ ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ یقینی اور واقعی بات یہ ہے کہ حافظ مزی نے یحییٰ بن اسماعیل بن جریر کا تذکرہ تہذیب الکمال میں سرے سے کیا ہی نہیں اور اس کا ہم کو یقین اس لیے ہے کہ ہم نے اس کے ایک نفیس قلمی نسخہ کا فوٹو حاصل کیا ہے، اس میں یحییٰ بن اسماعیل کی جانب محض ایک ہلکا سا اشارہ ہے، حالانکہ حافظ مزی کے لیے ان کے دستور کے مطابق یحییٰ بن اسماعیل کا علیحدہ تذکرہ کرنا ضروری تھا، کیونکہ ان کی ایک روایت عمل الیوم واللیلۃ لنسائی میں موجود ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ بخاری نے ان کے والد کا ترجمہ نہیں لکھا ہے، بلکہ صرف یحییٰ ہی کا لکھا ہے، اور انھیں کا اتباع ابن ابی حاتم نے کیا، غرض شارح محقق کو یقین ہے کہ حافظ مزی نے تہذیب الکمال میں یحییٰ کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ (۱)

(۱) مسند احمد ج: ۱۵ص: ۲۸۲

اب محدث کبیر کے ارشادات سنئے پہلے تو انھوں نے شیخ محقق کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ حافظ ابن حجر نے تقریب میں یحییٰ کا تذکرہ نہیں کیا ہے، یہ نقد بصورت مکتوب ہے، مطبوعہ نہیں ہے، یہ مکتوب شیخ کے یہاں بھیجا گیا تھا۔ مگر چونکہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی، اس لیے شائع نہ ہوسکا، میرے سامنے محدث کبیر کے مکتوب کا اصل مسودہ ہے، فرماتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے تقریب میں یحییٰ بن اسماعیل کا تذکرہ کیا ہے، دیکھئے تقریب ص ۳۸۹ مطبوعہ مطبع احمدی شاہدرہ ۱۲۷۰ھ اور مطبوعہ مطبع فاروقی ۱۲۹۰ھ ۱۳۰۸ھ اور مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۳۲۱ھ اور یہ آخری نسخہ علامہ امیر علی ہندی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوا ہے، اور انھوں نے کتاب کے آخر میں تنبیہات کے تحت لکھا ہے کہ انھوں نے کتاب کی تصحیح کا مدت دراز تک اہتمام کیا ہے، جہاں بھی کوئی نسخہ تقریب کا ملا ہے، اس سے تصحیح کی ہے۔

پھر دوسرے مکتوب میں لکھا کہ مزید ملاحظہ ہو، حافظ سبط بن العجمی نے یحییٰ بن اسماعیل کا تذکرہ نهاية السول فی رواة الستة الاصول میں لکھا ہے، اس کی عبارت یہ ہے۔

يحيىٰ بن إسماعيل بن جرير بن عبدالله البجلى عن الشعبى وقزعة وعنه عبدالعزيز بن عمر بن عبدالعزيز وهشيم والحسن بن قتيبة ذكره ابن حبان فى ثقاته قال فى الميزان يحيىٰ بن اسماعيل الكوفى الجريرى قال الدار قطنى: لا يحتج به، یہ عبارت میں نے رام پور کے نسخہ سے نقل کی ہے، جس کا نمبر ۱۰۱۹ ہے، اور یہ خود مؤلف کا تحریر کردہ ہے، اور آپ کو معلوم ہے کہ نہایۃ السول، تہذیب الکمال ہی کا اختصار ہے، جیسا کہ مؤلف نے شروع کتاب میں اس کی تصریح کی ہے۔

اور خود تہذیب التہذیب میں حافظ نے یحییٰ کا ترجمہ جس انداز سے لکھا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ تہذیب الکمال سے ماخوذ ہے، حافظ کا اضافہ نہیں ہے، کیوں حافظ نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ جو تراجم تہذیب الکمال میں ہیں ان کے اثنا میں اگر مجھے کوئی اضافہ کرنا ہوگا تو اپنے اضافہ سے پہلے ''قلت'' کہوں گا، پس قلت کے بعد والی عبارت میری ہوگی، تہذیب الکمال کی نہ ہوگی ج ۱ ص ۵، اب آپ یہاں تہذیب التہذیب میں یحییٰ بن اسماعیل کا ترجمہ دیکھیں کہ بالکل آخر میں حافظ نے ''قلت'' کہا ہے اور اس کے بعد کی عبارت ہے **وقال الدار قطنى لا يحتج به.** اس

کا مطلب یہ ہے کہ قلت سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ تہذیب الکمال کی بات ہے۔

اوران سب سے بڑھ کر دلیل یہ ہے کہ مکتبہ آصفیہ حیدر آباد میں تہذیب الکمال کا جو نسخہ ہے، اس میں یحییٰ مذکور کا ترجمہ ہے، اس کی اطلاع مجھے شیخ ابوالوفا افغانی نے دی ہے، میں نے شیخ کو لکھا ہے کہ اس کو نقل کرا کے میرے پاس بھیج دیں، جیسے ہی یہ ترجمہ میرے پاس پہنچے گا میں آپ کے پاس فوراً بھیجوں گا ان شاء اللہ، اتنی تصریحات کے بعد تو میں اس الزام سے بری ہوں گا، جس کے متعلق آپ نے فرمایا ہے کہ یہ محل ظن پر یقین کرنا اور بے موقع خزرجی کے سر تہمت لگانا ہے۔

پھر محدث کبیر نے اپنا وعدہ پورا کیا، چنانچہ تہذیب الکمال سے یحییٰ بن اسماعیل کا ترجمہ نقل کرا کے بھیجا۔ ہم اسے من وعن نقل کیے دیتے ہیں:

يحيىٰ بن إسماعيل بن جرير بن عبدالله البجلي الكوفي روى عن عامر الشعبي وقزعة بن يحيىٰ على خلاف فيه ونافع مولى ابن عمر وروى عنه الحسن ابن القتيبة المدائني وعبدالعزيز بن عمر بن عبدالعزيز وهشيم بن بشير ذكره ابن حبان في كتاب الثقات روى له النسائي في اليوم والليلة حديثاً واحداً وقد وقع لنا بعلو عنه أخبرنا حنبل بن عبدالله قال أخبرنا ابوالقاسم بن الحصين قال أخبرنا ابوعلي بن المذيب قال اخبرناابوبكر القطيعي قال حدثنا عبدالعزيز بن عمر بن عبدالعزيز عن يحيىٰ بن إسماعيل بن جرير عن قزعة، قال أرسلني ابن عمر في حاجة، فقال أستودع الله دينك وأمانتك وخواتيم عملك رواه عن احمد بن سليمان الرهادي عن ابي نعيم فوقع لنا بدلا.

وأخرجه من وجهين آخرين عن عبدالعزيز عن إسماعيل بن جرير والصواب رواية النسائي والله اعلم وقد اختلف فيه على عبدالعزيز .

اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان دونوں مکتوب کو پا کر شیخ محقق کس درجہ متاثر ہوئے ہوں گے، واقعہ یہ ہے کہ علم ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اور محدث اعظمی نے اس بحر کی خوب غواصی کی ہے، جبھی تو ایسے نفائس حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

احادیث کی شرح پر استدراک

(۱) مسند احمد ج ۵ ص ۲۹۴ حدیث ۳۷۸۰ میں ابواسحاق شیبانی سے روایت ہے کہ اتیت زر بن حبیش وعلی دربان فالقیت علی محبة منه، اس میں لفظ دربان کی تفسیر میں شارح نے لکھا ہے کہ بظاہر کپڑے کی یہ کوئی قسم ہے۔

محدث کبیر نے اس پر نقد کیا کہ دربان فارسی کلمہ ہے، جس کو عربی میں حاجب اور بواب کہتے ہیں، شیبانی کی مراد یہ ہے کہ ان کے دروازے پر ایک دربان تھا، اللہ تعالی نے اس کے دل میں میری محبت ڈال دی، اور اس نے مجھے ملاقات کی اجازت دیدی یہ مطلب بالکل ظاہر ہے، شارح سے یہاں چوک ہوئی۔

(۲) مسند احمد ج ۸ ص ۳۲ حدیث ۵۶۳۸ ایک شاعر نے حضرت ابن عمر کے سامنے یہ مصرعہ پڑھا۔

وبلال عبداللّٰہ خیر بلال

اس پر عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ تم غلط کہہ رہے ہو، ذاک بلال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، اس کی شرح میں شیخ محقق نے بتایا کہ لغت میں بلال کے معنی تری اور نمی کے ہیں، لیکن یہاں یہ لفظ بطور کنایہ کے استعمال ہوا ہے، مراد سخاوت اور فیاضی ہے یعنی شاعر نے یہ کہنا چاہا ہے کہ عبداللہ کی فیاضی سب سے بڑھ کر ہے، اس پر انھوں نے ٹوکا کہ رسول اللہ ﷺ کی فیاضی سب سے بڑھ کر ہے۔

محدث اعظمی اس کی تصحیح کرتے ہیں کہ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے، بلکہ پہلے بلال سے مراد حضرت عبداللہ بن عمر کے فرزند ہیں۔ ان کا نام بھی بلال تھا، اور دوسرے بلال سے مراد بلال بن رباح مشہور صحابی اور خادم رسول اللہ ﷺ ہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حافظ ابوالقاسم التیمی نے سیر السلف میں لکھا ہے کہ سالم سے مروی ہے کہ ایک شاعر نے بلال بن عبداللہ بن عمر کی مدح میں یہ مصرعہ پڑھا۔

بلال عبداللّٰہ خیر بلال

اس پر عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو بلکہ

بلال رسول اللّٰہ خیر بلال

دیکھئے ذرا سی چوک نے بات کہاں سے کہاں تک پہنچا دی تھی، محدث کبیر اس کو اس کی جگہ واپس لائے، اور دلیل کے ساتھ۔

احادیث کی تخریج

(۱) مسند احمد ج ۲ ص ۳۰۳ حدیث ۱۲۴۸ **عن علی قال قال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لا تبرز فخذک ولا تنظر إلی فخذ ولا میت**، اس کے بارے میں شارح لکھتے ہیں کہ کئی حفاظ حدیث جن میں امام منذری اور حافظ ابن حجر جیسے لوگ شامل ہیں، اس روایت کو ابن ماجہ کی طرف منسوب کیا ہے، بلکہ صاحب ذخائر المواریث نے ابن ماجہ کی کتاب الجنائز کو متعین بھی کر دیا ہے، مگر باوجود تلاش بسیار کے مجھے یہ روایت نہیں ملی۔

محدث اعظمی لکھتے ہیں کہ یہ روایت ابن ماجہ میں ہے، دیکھئے کتاب الجنائز **باب ماجاء فی غسل المیت** کی تیسری حدیث۔

(۲) مسند احمد ج ۵ ص ۲۳۷ حدیث ۳۶۵۲ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چوکور خط کھینچا (**خطاً مربعاً الخ**) اس کے بارے میں شارح لکھتے ہیں کہ ذخائر المواریث میں اس حدیث کے سلسلے میں ترمذی کا حوالہ دیا گیا ہے مگر میں نے باوجود تلاش کے نہیں پایا۔

محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ترمذی میں **باب ماجاء فی صفة اوانی الجنة** کے بعد والے باب میں ہے۔ ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۳۰۴

(۳) مسند احمد ج ۴ ص ۱۹۳ حدیث ۲۵۶۱ **حدثنا عبدالرزاق أخبرنا سفیان عن الأجلح عن یزید بن الأصم عن ابن عباس أن رجلاً قال: ما شاء اللّٰہ وشئت فقال جعلتنی للّٰہ عدلا بل ما شاء اللّٰہ وحدہ.**

اس حدیث کے بارے میں شارح محقق لکھتے ہیں، کہ باوجود کوشش بلیغ کے یہ حدیث مسند کے علاوہ کسی اور کتاب میں مجھے نہ ملی، حتی کہ مجمع الزوائد میں بھی نہیں، البتہ ابن ماجہ میں اس کے متقارب ایک حدیث **بطریق عیسی بن یونس عن الأجلح عن یزید بن الأصم عن ابن عباس مرفوعاً اذا حلف أحدکم فلا یقل ما شاء اللّٰہ وشئت ولیقل ما شاء اللّٰہ ثم شئت**، شاید

صاحب زوائد نے ان دونوں حدیثوں کو ایک سمجھ لیا، اس لیے اس کی تخریج نہیں کی، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے، دونوں حدیثیں الگ الگ ہیں اگر چہ معنی کے لحاظ سے قریب قریب ہیں۔

محدث کبیر نے اس پر استدراک فرمایا کہ اس حدیث کو امام بخاری نے الادب المفرد ص ۱۱۵ میں بطریق ابونعیم عن سفیان عن الاجلح ذکر کیا ہے، اور امام نسائی نے بھی مسند کے الفاظ ہی میں نقل کیا ہے، جیسا کہ اس کا حوالہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں دیا ہے ج ۱۱ ص ۴۳۵، شاید یہ روایت سنن کبری میں ہو، اور میرا خیال ہے کہ امام نسائی کے نقل کرنے کی وجہ سے صاحب زوائد نے اسے اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا، اور امام طحاوی نے بطریق شیبان نحوی عن الاجلح مشکل الآثار میں ذکر کیا ہے ج ۱ ص ۹۰۔

لیجئے حوالوں کی قطار لگ گئی، کیا ٹھکانا ہے وسعت نظر کا، اور کتنا حیرت انگیز حافظہ ہے۔

(۴) مسند احمد ج ۵ ص ۲۰۳ حدیث ۳۵۸۲ حدثنا سفيان عن يزيد عن أبي الكنود أصبت خاتماً يوماً فذكره فرآه ابن مسعود في يده فقال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن حلقة الذهب.

اس حدیث کے متعلق شارح محقق نے لکھا ہے کہ اس کو میں نے مسند احمد کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہیں پایا، اور ہیثمی نے مجمع الزوائد میں بھی اس کو نہیں لکھا، شاید انھوں نے اس حدیث پر جس میں سونے کی انگوٹھی پہننے کی کراہت کا بیان ہے جو مسند میں ۳۶۰۵ پر آرہی ہے، اکتفا کیا ہے، لیکن وہ دوسری حدیث ہے۔

محدث کبیر اس پر تحریر فرماتے ہیں کہ امام طیالسی نے اپنی مسند میں اسے ایسی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے جس میں انقطاع نہیں ہے، اور یہ بعینہ وہی سند ہے جو مسند میں حدیث ۳۸۰۴ پر آرہی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ امام احمد نے عن محمد بن جعفر عن شعبہ روایت بیان کی ہے، اور امام طیالسی نے خود شعبہ سے براہ راست روایت لی ہے۔

شیخ محقق کے استنباط پر نقد

مسند احمد ج ۱ ص ۱۵۶ حدیث ۵ حدثنا محمد بن جعفر قال حدثنا شعبة عن يزيد ابن خمير عن سليم بن عامر عن أوسط قال خطبنا أبو بكر الخ اس سند پر شارح نے لکھا

ہے کہ یہ اوسط بن اسماعیل بجلی ہیں، حافظ ابن حجر نے اصابہ اور تہذیب میں انھیں تابعی لکھا ہے، اور دلیل یہ دی ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ پہنچے ہیں، لیکن حدیث ۱۷ پر آ رہا ہے کہ **أنه حديث عن أبي بكر أنه سمعه حين توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم**، یہ روایت اس بات پر دلیل ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی ہے، اوسط مدینے میں تھے، اس لیے قوی احتمال ہے کہ انھوں نے وفات سے پہلے آپ کی زیارت کی ہے۔

محدث کبیر نے اس پر نقد کیا کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ حدیث آگے ۴۴ پر بھی آ رہی ہے، اس میں اوسط خود فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ پہنچا تو میں نے ابوبکر کو خطبہ دیتے سنا، اور حدیث ۱۷ میں ہے کہ انھوں نے یہ خطبہ اس وقت سنا جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی تھی (**حين توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم**) لیکن حدیث ۴۴ میں **توفي** کا مطلب صاف ہو جاتا ہے کہ جس وقت انھوں نے حضرت ابوبکر کا خطبہ سنا تھا، اس وقت حضور ﷺ کی وفات ہو چکی تھی یہ نہیں کہ جس وقت وفات ہوئی تھی، اسی وقت سنا تھا۔

اس پر شارح محقق لکھتے ہیں کہ **هذا استدراك جيد محقق**

اس استدراک میں ایک خاص لطیفہ بھی ہے، اس سے محدث اعظمی کی دقت نظر اور استحضار تام کا اندازہ ہوتا ہے، ورنہ سرسری طور پر اس کا ادراک نہیں ہو سکتا، لطیفہ یہ ہے کہ حدیث نمبر ۵ کی سند میں محض ''اوسط'' ہے بغیر کسی نسبت کے، اور حدیث نمبر ۱۷ میں اوسط بن اسماعیل بن اوسط بجلی ہے اور حدیث نمبر ۴۴ میں اوسط بن عمرو ہے، سرسری نظر سے دیکھنے والا ہرگز نہیں ادراک کر سکتا کہ تینوں جگہ ایک ہی بزرگ ہیں، جب کہ ولدیت میں فرق ہے، غالبًا اسی فرق کی وجہ سے شیخ محقق کی نظر بھی چوک گئی، چنانچہ ولدیت کے اختلاف کی طرف حضرت محدث کبیر نے توجہ دلائی اور لکھا کہ:

بہتر یہ تھا کہ اوسط بن اسماعیل کے تذکرہ میں ان کے باپ کے نام میں جو اختلاف ہے، اسے بھی ذکر کر دیا جاتا، کہ وہ اسماعیل ہیں یا عامر یا عمرو، تاکہ حدیث نمبر ۴۴ کو دیکھنے والا یہ سمجھ لے کہ اس میں جو اوسط بن عمرو ہیں یہ دوسرے ہیں، اور دوسری حدیثوں میں دوسرے[1]۔

---

(۱) مسند احمد ج ۱۵ ص ۲۵۳

طباعت کی غلطی کی نشاندہی

(۱) مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۸ حدیث ۱۲۰۶ امتن حدیث میں ثم إنی رأیت أبی آیا ہے، صحیح ''ثم انی رأیت انی'' ہے[1]۔

(۲) مسند احمد ج ۴ ص ۳۸ حدیث ۲۱۹۳، متن حدیث میں ''باقة'' آیا ہے، صحیح ناقة ہے، بظاہر یہ طباعت کی غلطی ہے[2]۔

(۳) مسند احمد ج ۵ ص ۲۶۷ حدیث ۳۷۱۲ شارح محقق کا جملہ ہے و کلام الذهبی فی انه لا یدری من هو، اس پر محدث اعظمی نے فرمایا کہ شاید جملہ اس طرح ہو و کلام الذهبی فی المیزان انه لایدری من هو الخ شیخ محقق نے اس کی تائید کی اور فرمایا کہ هذا صحیح سقطت کلمة المیزان[3]۔

شیخ محقق کے کلام کی دلیل بیان کرنا

مسند احمد ج ۵ ص ۳۳۵ حدیث ۳۸۷۶، اس حدیث کی سند میں ایک صاحب عیزار بن جرول حضرمی آئے ہیں، ان کے متعلق شیخ محقق نے لکھا ہے کہ یہ تنعی ہیں، اور بنو تنع (بکسر التاء وسکون النون) کی جانب منسوب ہیں، یہ ہمدان کا ایک خاندان ہے، حافظ ابن حجر کی تعجیل المنفعۃ میں انھیں ''ثقفی'' لکھا گیا ہے، شارح فرماتے ہیں کہ یہ کاتب کی غلطی (تصحیف) ہے۔

حضرت محدث اعظمی فرماتے ہیں کہ آپ نے درست فرمایا، کیونکہ حافظ حسینی نے تصریح کی ہے کہ عیزار سلمہ بن کہیل کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، اور سلمہ بن کہیل یقیناً تنعی ہیں، جیسا کہ تہذیب وغیرہ میں ہے[4]۔

ایک بات جو اندازہ اور بصیرت سے کہی گئی تھی، محدث کبیر کی وسعت نگاہ نے اس کی دلیل پیش کر دی۔

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہ کی وسعت نظر، وفور علم، عمق مطالعہ، قوتِ گرفت، اور دقیقہ رسی کی یہ چند مثالیں ذکر کی گئیں، بالخصوص علم اسماء الرجال میں، جو

---

(۱) ج:۱۵، ص:۲۵۸ (۲) ج:۱۵، ص:۲۶۳
(۳) ج:۱۵، ص:۲۷۵ (۴) ج:۱۵، ص:۲۷۸

فنون حدیث میں غالباً سب سے مشکل فن ہے، اعلیٰ درجہ کی حذاقت ومہارت کے نمونے آپ نے دیکھ لیے، ویسے تو علم وفن کا یہ شاداب چمن اپنے ہر گوشے میں بہار بےخزاں لیے ہوئے تھا۔مگر اسماء الرجال میں جو اسے خصوصیت حاصل تھی۔اس کی نظیر نہیں ملتی، اسی طرح دقت نظر کی جو شان آپ میں تھی کم علماء میں پائی جاتی ہے۔

ایک بار حضرت محدث کبیر کی خدمت میں ملک کے ایک نامور عالم جو خود بھی علم وتحقیق کے مرد میدان تھے،تشریف لائے ان دونوں ''علل ابن مدینی'' طبع ہوکر آئی تھی، اور حضرت مولانا کے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب سے سوال کیا کہ یوں تو مولانا بہت عظیم القدر ہیں اور جلالتِ شان کے مالک ہیں، مگر حضرت مولانا کی خاص خصوصیت کیا ہے؟ صاحبزادۂ محترم نے تھوڑی دیر تأمل کیا اور پھر وہی کتاب ان کے سامنے رکھ دی اور فرمایا کہ حضرت مولانا کے استدراک کو دیکھے بغیر اصل کتاب میں غور کیجیے اور دیکھئے کہیں کوئی غلطی نظر آتی ہے، کیوں کہ اس کو ایک بڑے محقق نے تحقیق کرکے شائع کیا ہے۔انھوں نے دیکھنا شروع کیا، انھیں کہیں کوئی کمی کوتاہی محسوس نہیں ہوئی، پھر مولانا کے استدراکات پڑھے تو معلوم ہوا کہ کھلی غلطیاں تھیں۔

بس یہی مولانا کی خاص بات تھی۔علم حدیث میں علل کا علم ایک مشکل ترین علم ہے، علی بن مدینی اس کے ماہرین میں سے ہیں، ایسی کتاب کی تحقیقات کی غلطیوں کا ادراک بہت وسیع مطالعہ، اعلیٰ درجہ کی قوت حفظ، اور کامل استحضار چاہتا ہے، حضرت مولانا میں یہ صفات بدرجہ اتم تھیں، مولانا کے استدراکات، تعلیقات وتحقیقات پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اگلے زمانے کے محدثین میں سے کوئی صاحب ہمارے دور میں تشریف لائے تھے۔آہ کہ ہم نے رمضان المبارک کی گیارہ تاریخ کو ایک شخصیت نہیں علم وفن کے ایک بڑے کتب خانے کو دفن کردیا، اسلاف کی یادگار ہم سے کھوگئی، اسلاف کی ایک حجۃ بالغہ جاتی رہی، جب تک وہ رہے، کسی بڑے صاحب علم کی وفات سے جو خلا پیدا ہوتا تھا، ان کی ذات اسے پُر کردیتی تھی، اطمینان رہتا تھا کہ ابھی علم کا جبل عظیم موجود ہے۔اب وہ نہیں ہیں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام علماء کا وصال ہوگیا۔انھوں نے اتنے لوگوں کی جگہ پُر کی تھی، وہ اپنی ذات سے ایک امت بن گئے تھے، اب یہ امت اٹھ گئی، ہر طرف خلا ہی محسوس ہوتا ہے۔خیر اللہ ہر جانے والے کا خلیفہ ہے، سب کے لیے فنا ہے، وہی ایک ذات باقی ہے، اسی پر بھروسہ اور اعتماد ہے۔
رہے نام اللہ کا۔

محدث اعظمی اپنی تحقیقات وتنقیدات کے آئینہ میں

مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی رحمہ اللہ☆

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ''نوراللہ مرقدہ'' کواللہ تعالی نے اپنے فضل سے جملہ فنون بالخصوص حدیث، فن رجال اور فقہ کے اندر ایسی بالغ نظری، محققانہ ہوش مندی، ناقدانہ بصیرت اور نگاہ کی جامعیت عطافرمائی تھی، جس کی وجہ سے ان کی ذات گرامی عالمگیر شہرت کی حامل ہوگئی تھی، اور وہ اپنے دور کے کبار محدثین کے مرجع اور امام ہوگئے تھے، جیسا کہ ان کے بارے میں علمائے عرب وعجم کے بلند کلمات اور اعلی تاثرات کاعلم رکھنے والے اہل علم سے مخفی نہیں۔ میرے نزدیک وہ بہت بڑے محقق اور نقاد تھے، ان کی جملہ شئون میں شان نقد وتحقیق ہی میرے نزدیک ان کی امتیازی شان معلوم ہوتی ہے، میں طالب علمانہ انداز میں اسی بات کو مشتے نمونہ ازخروارے چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے اصول حدیث کے ایک مشہور مسئلہ سے متعلق ان کے نقد وتبصرہ اور محققانہ رائے کونقل کروں گا، جس کو میں نے **قواعد فی علوم الحدیث** مولفہ مولانا ظفر احمد عثمانی ﷫ پر المحدث النبیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ الشامی کی تعلیقات سے لیا ہے، اس کے بعد محدث وادی نیل احمد شاکر پر ان کے استدراکات سے چند مثالیں پیش کروں گا، جن کو میں نے احمد شاکر کی شرح وتحقیق سے شائع ہونے والی مسند احمد کی پندرہویں جلد سے لیا ہے اور اخیر میں فقہ کے ایک مشہور مسئلہ ''کفاءت'' سے متعلق ان کی تحقیق کو پیش کرکے مضمون کا اختتام کروں گا۔ **واللّٰہ ولی التوفیق.**

مصطلح الحدیث کے ایک مسئلہ پر ان کی تحقیق:

امام بخاری کسی روای کے بارے میں جب **فیہ نظر** اور **سکتوا عنہ** ۔فرماتے ہیں، تو اس قول سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے؟ فن مصطلح کا ایک اہم سوال ہے، علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں اور ان سے پہلے حافظ عراقی نے شرح الالفیہ کے اندر لکھا ہے کہ بخاری ان دونوں باتوں کا اطلاق

☆ سابق استاذ حدیث جامعہ مظہر العلوم بنارس

ضعیف اور متروک الحدیث راوی پر کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی نے بھی اسی بات کو اپنی کتاب الرفع و التکمیل کے اندر حافظ عراقی اور علامہ ذہبی کے حوالے سے لکھا ہے، اور بخاری کی مراد کے سلسلہ میں یہی بات معروف ومشہور بھی ہے۔ جیسا کہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ اب دیکھئے اس مسئلہ میں علامۂ محقق، بحاثۂ مدقق، محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی محققانہ رائے کیا ہے؟ اور وہ کتنی وزنی ہے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ قواعد فی علوم الحدیث پر اپنی گرانقدر تعلیقات میں لکھتے ہیں کہ میرے شیخ حضرت العلامہ المحدث النبیل حبیب الرحمٰن الاعظمی حافظ عراقی اور ذہبی کے قول پر جس کو علامہ لکھنوی نے الرفع و التکمیل کے اندر نقل کیا ہے، نقد وتبصرہ کرتے ہوئے میرے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا ہے کہ:

لا ینقضی عجبی حین أقرأ كلام العراقي والذهبي هذا، ثم أرى أئمة هذا الشأن لا يعبأون بهذا فيوثقون من قال فيه البخاري (فيه نظر) أو يدخلونه في الصحيح وإليك أمثلته.

جس وقت میں عراقی اور ذہبی کا یہ کلام پڑھتا ہوں پھر ائمۂ فن کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس کو کوئی وزن اور حیثیت نہیں دیتے، بلکہ اس کے برخلاف جس راوی کے بارے میں بخاری کا ''فیہ نظر'' ہوتا اس کی توثیق کرتے ہیں یا اپنی صحیح میں اس کو جگہ دیتے ہیں، تو میرے استعجاب اور حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، آپ کے سامنے مثالیں پیش ہیں

۱: **تمام بن نجیح**:- بخاری نے ان کے بارے میں (فيه نظر) کہا ہے اور ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے، بزار نے ان کو ایک جگہ صالح الحدیث لکھا ہے، اور خود بخاری نے ان سے رکوع کے متعلق عمر بن عبدالعزیز کے رفع یدین کے سلسلہ میں ایک معلق وموقوف اثر نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بخاری کے نزدیک بھی متروک نہیں، ابوداؤد اور ترمذی نے بھی ان کو ترک نہیں کیا ہے۔

۲: **راشد بن داؤد الصنعانی**:- بخاری نے ان کے بارے میں (فيه نظر) کہا ہے، لیکن اس شان کے امام یحییٰ بن معین نے ان کی توثیق کی ہے اور ان کے بارے میں ''لیس به بأس ثقة'' فرمایا ہے۔ دحیم فرماتے ہیں کہ هو ثقة عندی، ابن حبان نے ان کا ذکر ''الثقات'' میں کیا

ہے، ان سے نسائی نے روایت نقل کی ہے، حافظ ابن حجر نے ان کے بارے میں (صدوق له أوهام) فرمایا ہے۔

۳: ثعلبہ بن یزید حمانی: - بخاری نے ان کے بارے میں (فی حدیثه نظر لا یتابع فی حدیثه) فرمایا ہے، اور نسائی نے کہا ہے ثقہ ہیں، اور ابن عدی نے کہا ہے کہ (لم أر له حدیثاً منکراً فی مقدار ما یرویه)، حافظ ابن حجر نے صدوق شیعی کہا ہے۔

۴: جعد المخزومی: - بخاری ان کے بارے میں (لا أعرف له الا هذا الحدیث وفیه نظر) فرمایا ہے، اور ترمذی نے ان سے روایت نقل کی ہے، حافظ ابن حجر ان کو مقبول کہتے ہیں، اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ حافظ اسی کو مقبول کہتے ہیں جس کے بارے میں متروک الحدیث ہونے کی کوئی بنیاد نہ ہو۔

۵: جمیع بن عُمیر التیمی: - بخاری نے کہا ہے کہ (فی احادیثه نظر)، ابوحاتم نے ان کو صالح الحدیث ومحلّہ الصدق لکھا ہے، ابن حجر نے صدوق یخطئ ویتشیع لکھا ہے، اصحاب سنن اَربعہ نے ان سے روایتیں لی ہیں، ترمذی نے اپنی سنن میں مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں ان کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

۶: حبیب بن سالم: - بخاری نے (فیه نظر) کہا ہے، ابن عدی نے کہا ہے کہ (لیس فی متون أحادیثه حدیث منکر بل قد اضطرب فی أسانید ما یروی عنه)، آجُرّی نے ابوداؤد سے نقل کیا ہے کہ وہ ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کا ذکر ''الثقات'' میں کیا ہے۔

۷: حریش بن خرّیت: -قال البخاری: فیه نظر، وفی تهذیب التهذیب قال البخاری فی تاریخه: أرجو أن یکون صالحاً، وقال أبو حاتم: لا بأس به.

۸: سلیمان بن داؤد الخولانی: -قال البخاری: فیه نظر اور امام ابوزرعہ، ابوحاتم، عثمان بن سعید اور حفاظ کی ایک جماعت نے ان کی ثنا خوانی کی ہے، ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان کے صدوق ہونے میں کوئی شک نہیں۔

۹: طالب بن حبیب المدنی الانصاری: -قال البخاری: فیه نظر، اور ابوداؤد نے ان سے روایت نقل کی ہے، ابن عدی نے کہا ہے کہ أرجو أنه لا بأس به، ابن حبان نے ان کا

ذکر ''الثقات''، میں کیا ہے۔ ہیثمی نے مجمع الزوائد۵/ ۱۰۶ میں ان کی توثیق کی ہے۔

۱۰: صعصعہ بن ناجیہ: -قال البخاری: فیہ نظر، وھو صحابی ذکرہ ابن حجر فی ''تھذیب التھذیب'' ''والاصابة''.

۱۱: عبدالرحمٰن بن سلمان الرعینی: -قال البخاری: فیه نظر، ابن یونس نے ان کی توثیق کی ہے، ابوحاتم کہتے ہیں کہ میں نے ان کی حدیث میں کوئی منکر نہیں پایا، وہ صالح الحدیث ہیں **(وله عند مسلم فی مبیت ابن عباس عند میمونة) وقال النسائی: لیس به بأس، وقال ابن حجر: لا بأس به وأدخله البخاری فی الضعفاء.** ابوحاتم کہتے ہیں کہ ضعفاء کی فہرست سے ان کا نام جدا کر دینا چاہئے۔

ان مثالوں کے بعد مولانا اعظمی نہایت اعتماد کے ساتھ اپنا محققانہ فیصلہ سناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

والصواب عندی أن ما قاله العراقی لیس بمطرد ولا صحیح علی إطلاقه بل کثیراً ما یقول البخاری ولا یوافقة علیه الجھابذة، وکثیراً ما یقوله ویرید به إسناداً خاصاً، وکثیراً ما یقول ولا یعنی الراوی، بل حدیث الراوی؛ فعلیک بالتثبت والتأنی. (قواعد فی علوم الحدیث ص ۱۵۵)

میرے نزدیک صواب اور درست بات یہ ہے کہ عراقی کا قول نہ تو مطرد ہے اور نہ علی الاطلاق صحیح، اس لیے کہ ایسا بہت ہوا ہے کہ بخاری نے ''فیہ نظر'' کہا ہے اور ماہرین وجہابذۂ فن نے ان سے اتفاق نہیں کیا ہے، اسی طرح امام بخاری بکثرت فیہ نظر کہتے ہیں اور اس سے مراد کوئی خاص اسناد لیتے ہیں اور بسا اوقات فیہ نظر کہتے ہیں اور راوی کو مراد نہیں لیتے بلکہ ان کی مراد راوی کی حدیث ہوتی ہے۔ جب ایسا ہے تو خوب غور وفکر اور تثبت وتحقیق کے بعد ان کے کلام کا مطلب متعین کرنا چاہئے، جلدی نہیں کرنی چاہئے۔

....

اب احمد شاکر محدث مصر پر ان کے استدراکات کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیے: مسند احمد ج ۱

حدیث نمبر ۱۷-**حدثنا عبداللّٰہ قال: حدثنی أبی قال: ثنا ھاشم قال: ثنا شعبة قال: أخبرنی**

يـزيـد بـن خـميـر قـال: سـمـعـت سليم بن عامر رجلاً من حمير يحدث عن أوسط بن إسـمـاعيل بن أوسط البجلى يحدث عن أبى بكر أنه سمعه حين توفى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: قام رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عام الاول مقامى هذا الخ.

اس حدیث میں احمد شاکر (**أنـه سـمـعـه حيـن تـوفـى رسـول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسـلـم**) کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکے تھے، اور غلط فہمی کی بنیاد پر یہ استدلال کر بیٹھے تھے کہ اوسط بن اسماعیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت مدینہ میں موجود تھے، مولانا اعظمی نے اس پر استدراک فرمایا ہے:

قـال الأعـظـمى: الاستدلال بحديث رقم ۱۷ عـلى أن أوسط بن إسماعيل كـان فـى الـمـدينة وقت وفاة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، لا يستقيم، لأن أوسـط يـقـول فـى عيـن ذلك الـحديث رقم ٤٤ "قـدمـت المدينة بـعـد وفـاة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسـلـم بسنة، فألفيت أبابكر يخطب الـنـاس" الـخ فيـذكـر سماعه ذلك الـحـديـث بـعينه بعد وفاة رسول اللّٰه صـلـى اللّٰه عليه وسلم بعام، وقد ذكر فى ۱۷ أنـه سـمعه حين توفى رسول الـلّٰـه صـلـى الـلّٰـه عـليه وسلم. فهذا يوضح ان المراد بقوله حين توفى فى ۱۷، حيـن ثبـوت التوفى لـه وصـدقه عليه لا حين حدوثه.

سترہ نمبر کی حدیث سے اس بات پر استدلال کرنا درست نہیں ہے کہ اوسط بن اسماعیل رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت مدینہ میں موجود تھے، اس لیے کہ بعینہ یہی حدیث چوالیس کے تحت مذکور ہے، اس میں اوسط کا بالکل واضح بیان موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ایک سال بعد جب میں مدینہ پہنچا تو میں نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خطبہ دیتے ہوئے پایا، دیکھئے اوسط یہاں بعینہ اسی حدیث کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سننے کا ذکر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ایک سال بعد کر رہے ہیں۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ حدیث نمبر ۱۷ میں (**أنـه سـمـعـه حيـن توفى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عـليه وسلم**) سے ان کی مراد یہ تھی کہ انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حدیث اس وقت سنی جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوچکی تھی حدوثِ وفات کا وقت مراد نہیں۔

احمد شاکر اس استدراک پر پھڑک اٹھے اور فرمایا کہ **أقول: وهذا استدراک جید محقق.** میں اعتراف کرتا ہوں کہ محدث اعظمی کی گرفت بہت خوب اور محققانہ ہے۔

مسند احمد جلد۴ حدیث نمبر ۲۲۶۵ کے تحت احمد شاکر نے لکھا کہ **إسناده ضعيف لانقطاعه. شعبة بن الحجاج إمام أهل الجرح والتعديل ثقة، مأمون، ثبت حجة لكنه لم يدرک ابن عباس.**

مولانا اعظمی نے ان کو لکھا کہ میں کہتا ہوں کہ اسناد حدیث منقطع نہیں ہے:

قال الأعظمي: أقول إسناد الحديث ليس بمنقطع، لأن شعبة الذى يرويه عن ابن عباس ليس هو بابن الحجاج إمام أهل الصنعة كما زعمتم، بل هو شعبة مولى ابن عباس.

اس لیے کہ ابن عباس سے روایت کرنے والے شعبہ، شعبہ ابن الحجاج امام فن نہیں ہیں، جیسا کہ آپ نے سمجھ رکھا ہے بلکہ یہ شعبہ مولیٰ ابن عباس ہیں۔

اس کے بعد مولانا نے تاریخ البخاری ۲/۲/۲۲۴ اور کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ۲/۱/۳۶۷-۳۶۸ کا شعبہ مولی ابن عباس کے ترجمہ کے لیے حوالہ دیا ہے اور ان کے بارے میں ائمہ فن کے اقوال نقل فرمائے ہیں۔

احمد شاکر نے مولانا کو اس استدراک پر بہت دعائیں دی ہیں، فرماتے ہیں: **وهذا استدراک جيد نفيس جزاه الله خيراً.** میں اعتراف کرتا ہوں کہ مولانا اعظمی کی یہ گرفت نہایت عمدہ اور نفیس ہے، اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

اس مثال سے علم الرجال پر مولانا کی گہری نظر اور استحضار تام کا پتہ چلتا ہے۔ رواۃ حدیث میں ایک نام کے متعدد اشخاص ہوئے ہیں، اب حدیث میں کون مراد ہے، اس کی تعیین بہت مشکل ہوتی ہے، اسی میدان میں پتہ چلتا ہے کہ اس فن کا شہسوار کون ہے، واقعی اس بحر بیکراں کو کامیابی کے ساتھ صحیح وسالم وہی عبور کرسکتا ہے جو فن میں گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ موفق من اللہ بھی ہو۔

مسند احمد جلد۵ حدیث نمبر ۳۲۴۵ کے تحت احمد شاکر نے اپنی شرح وتعلیق میں لکھا تھا کہ کتب رجال میں مطلب نام کے جتنے بھی رُواۃ ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا طاؤس سے روایت کرنا ممکن ہو۔

وجميع من يسمى المطلب في الرواة المترجمين لا يصلح واحد منهم أن يروي عن طاؤس الخ

مولانا اعظمی نے ان کی گرفت فرمائی اور لکھا کہ کیوں نہیں؟ مطلب نام کے رُواۃ میں دو مطلب ایسے ہیں، جن کا طاؤس سے روایت کرنا ممکن ہے اور وہ دونوں مندرجہ ذیل ہیں:

۱- مطلب بن عبداللہ بن المطلب بن حنطب۔

ان کا ترجمہ تہذیب میں ہے، یہ خارجہ بن زید سے روایت کرتے ہیں، اور خارجہ طاؤس کے اقران میں سے ہیں، اور ایک قول کے مطابق دونوں کا انتقال ایک ہی سال میں ہوا ہے۔

۲- مطلب بن عبداللہ بن قیس ہیں۔ ان کا ترجمہ تہذیب میں ہے یہ سعید بن ابی ہند سے روایت کرتے ہیں اور سعید کی وفات طاؤس سے متأخر ہے۔

محدث اعظمی کے اس استدراک پر احمد شاکر کے تأثرات یہ ہیں کہ:

أقول: وهذا كلام جيد، ينبئ عن اطلاع واسع ما شاء الله. یہ کلام بہت ہی عمدہ ہے اور مولانا کے واسع الاطلاع ہونے کا پتہ دیتا ہے۔

مولانا اعظمی نے احمد شاکر کی شرح وتعلیق والی مسند احمد بن حنبل کی ۱ تا ۸ جلدوں پر استدراک تحریر فرمایا تھا ان سب کو احمد شاکر نے مسند کی پندرہویں جلد میں اس اعتراف کے ساتھ شائع کیا ہے کہ جو گرفت کی گئی ہے وہ درست، اور یقیناً مولانا کا فضل وکمال مسلم ہے۔

(مسند احمد شرح وتعلیق احمد شاکر ج ۱۵ ص ۲۵۱)

اس کے علاوہ احمد شاکر نے مولانا اعظمی کو خط میں لکھا تھا کہ: **(وأنتم كما رأيت من عملكم من اعظم العلماء بها في هذ العصر) رحمها الله رحمة واسعة.**

ایک فقہی مسئلہ میں مولانا کی تحقیق

قتیلہ بنت قیس کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ بننے والے کی بیٹی ایک عربی، بلکہ قریشی وہاشمی بلکہ سب سے اشرف واکرم ہاشمی کی کفو ہوسکتی ہے، اسی طرح اس کی بھی کفو ہوسکتی ہے جو یہ پیشہ نہیں کرتا، اس بحث میں فقہی کتابوں سے جو نقل کیا جاتا ہے وہ سب غلط فہمی پر مبنی ہے۔

اب پوری بحث ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں:

قتیلہ بنت قیس:- یہ باعزت خاتون، اشعث بن قیس کندی صحابی کی بہن تھیں، پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اشعث کے والد قیس کپڑا بننے میں بڑے ماہر اور اسے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اس کی شہادت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دی ہے، وہ اشعث کو حائک بن حائک کہا کرتے تھے، قتیلہ انھیں قیس کی بیٹی اور اشعث کی بہن تھیں، اللہ نے اس کپڑا بننے والے کو وہ عزت بخشی جس سے بڑی کوئی عزت نہیں ہوسکتی، یہ کپڑا بننے والا اس بات پر جتنا فخر کرے کم ہے کہ سردار دو جہاں اشرف انبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی لڑکی قتیلہ کو قبول فرمالیا تھا، قتیلہ یمن میں تھیں اور ان کے بھائی اشعث نے ولی بن کران کا نکاح آنحضرت سے مدینہ میں کر دیا تھا، یہ نکاح ۱۰ھ ہجری کے آخر میں ہوا تھا، قتیلہ یمن سے ابھی رخصت ہو کر نہیں آئی تھیں کہ نصف صفر ۱۱ھ میں آنحضرت کی بیماری شروع ہوئی اور ابن عبدالبر کے بیان کے مطابق ۲/ربیع الاول ۱۱ھ کو آپ کی وفات سے دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔

دوسرا بیان یہ ہے کہ وفات سے دو ماہ پیشتر نکاح ہوا، اور تیسرا بیان ہے کہ آپ کی آخری بیماری ہی میں نکاح ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں وصیت کی تھی کہ ان کو اختیار ہے کہ دوسری ازواج مطہرات کی طرح ان پر بھی قانون حجاب نافذ اور حجاب قائم ہو، اس صورت میں میرے بعد کسی سے نکاح کرنا جائز نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ طلاق قبول کرلیں اور جس سے چاہیں نکاح کرلیں، انھوں نے دوسری صورت اختیار کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انھوں نے حضرت عکرمہ صحابی سے نکاح کرلیا۔

بنکر گھرانے میں سب سے اعلیٰ واشرف نبی کا یہ رشتہ ان دستکاروں کے لیے سب سے بڑا سرمایۂ افتخار ہے اور یہی اس بات کی نہایت مستحکم دلیل ہے کہ بننے والے کی بیٹی ایک عربی، بلکہ قریشی وہاشمی، بلکہ سب سے اشرف واکرم ہاشمی کی کفو ہوسکتی ہے اسی طرح وہ اس کی بھی کفو ہوسکتی ہے جو یہ پیشہ نہیں کرتا۔ اس بحث میں فقہی کتابوں سے جو نقل کیا جاتا ہے وہ سب غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس مسئلہ کے لیے اس دلیل کے بعد کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں، پھر بھی مزید استحکام وتائید اور ایضاح کے لیے ہم اسوۂ نبوی کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت واسوہ بھی پیش کرتے ہیں، اس سے مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی سامنے آجائے گا اور وہ یہ کہ کپڑا بننے والے کا لڑکا

ایک قریشی عورت کا کفو ہو سکتا ہے۔

معجم طبرانی میں روایت ہے کہ اشعث بن قیس (وفات نبوی کے بعد دین سے منحرف ہو گئے تھے) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے (اور تائب ہو کر دین کی طرف انھوں نے دوبارہ رجوع کیا) تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھ پیر کھلوائے، پھر اپنی ہمشیرہ ام فروہ سے ان کا نکاح کر دیا۔ دیکھئے یہ وہی اشعث ہیں جن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ حائک بن حائک کہا کرتے تھے، کپڑا بننے والے کا وہی لڑکا کسی معمولی عورت کا نہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ کا کفو قرار دیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کے لیے معجم کبیر طبرانی جلد اول ص ۲۰۸ بسند صحیح اور مجمع الزوائد ج ۹ ص ۴۱۵ اور اصابہ ج ۱ ص ۵۱ دیکھئے۔ اس نکاح کا ذکر دار قطنی اور ابن السکن نے بھی کیا ہے، آخر الذکر نے یہ لکھا ہے کہ اشعث کے دو لڑکے محمد اور اسحق ام فروہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اصابہ ج ۴ ص ۴۸۳ اور استیعاب ج ۴ ص ۴۸۴ میں ہے کہ دو لڑکیاں بھی پیدا ہوئی تھیں، ان میں سے ایک کا نام حبابہ، دوسری کا قریبہ تھا۔

حضرت ام فروہ کا یہی شرف کیا کم ہے کہ وہ صدیق اکبر کی بہن اور قریشیہ تھیں، مگر وہ اس سے بھی کہیں زیادہ شرف اور برتری کی مالک تھیں، ان کا سب سے بڑا شرف یہ تھا کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی، اس کے باوجود ایک بننے والے کے لڑکے کو ان کا کفو قرار دیا گیا اور قرار دینے والا وہ ہے جو اسلام میں آنحضرت کے بعد سب سے اونچا مقام رکھتا ہے اور جس کی نسبت آپ نے سارے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ دونوں جو میرے بعد ہیں یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ ان کے قدم بقدم چلو۔

(تذکرہ نساجین مصنفہ مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ)

محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے محدثانہ کارنامے

مولانا فضل حق صاحب عارفؔ خیرآبادی ☆

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات والا صفات اسلامی علوم وفنون کی جامع تھی، قرآن، حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، بلاغت و معانی، صرف ونحو، منطق وفلسفہ مختصر یہ کہ قرآن وحدیث کے تمام متعلقہ علوم وفنون اور اصول ومبادی پر آپ کو گہری اور عمیق بصیرت حاصل تھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ خصوصی عشق وشیفتگی کی بنا پر ع

حدیث مصطفٰے سے ربط تھا قلب مصفا کو

محدث اعظمی کا حدیث سے شغف:

اسی عشق رسول کی شوریدگی اور مستی نے محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کو وہ جلا اور روحانی بالیدگی عطا کی کہ آپ کی زندگی کی ایک ایک ساعت اور ایک ایک لمحہ احادیث رسول کی تحقیق وتفتیش سے اس طرح مربوط نظر آتا ہے کہ۔ ع

سانسوں کی آمد وشد وقف حدیث پاک تھی

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے محدثانہ کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث پاک کی حجیت، اہمیت، ضرورت اور افادیت کو اختصاراً واضح کردیا جائے، پھر محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب زندگی کے بعض خطوط کی نشاندہی کی جائے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تبیین قرآن کے لئے ہوئی:

اللہ جل شانہ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واضح اور کھلے لفظوں میں بیان فرمادیا ہے کہ قرآن کی تبیین اور توضیح وتشریح کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔ گویا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے

☆ استاد مدرسہ منبع العلوم، خیرآباد، مئو

اعمال واقوال کا صدور آیات قرآنی کی توضیح وتشریح کے لئے ہوتا تھا۔

چنانچہ واقعات وحوادث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر فقط قرآن مجید ہی ہوتا اور اس کی تشریح کے لئے محمد رسول اللہ ﷺ کے اعمال واقوال امت کے سامنے نہ ہوتے تو انسان بڑے بڑے مغالطوں کا شکار ہو جاتا۔

حدیث قرآن کی ترجمانی ہے:

ذخیرہ احادیث میں ایک روایت ہے کہ ایک خاتون عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی خدمت عالیہ میں پہنچیں اور عرض کیا کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بیان فرماتے ہیں کہ گودنا گودنے والی اور گدانے والی پر لعنت کی گئی ہے، حالانکہ میں نے از اول تا آخر قرآن پڑھا ہے، اس میں یہ بات کہیں نہیں ہے۔ اس سوال پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا **وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا**، تم نے نہیں پڑھا؟ یعنی رسول جن احکام کا تمہیں حکم کریں تم انھیں اختیار کرو اور جن سے روک دیں رک جاؤ

(بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص۳۸۱)

اس سے ثابت ہوا کہ قول رسول اپنائے بغیر چارۂ کار نہیں۔

منکرین حدیث کا رد:

علم حدیث سے شغف ہی نے آپ کو مجبور کیا کہ اس علم شریف کے خلاف چلنے والی مہم کے سامنے آپ سینہ سپر ہو جائیں، جب انکار حدیث کے فتنہ نے سر ابھارا تو اس کی سرکوبی کے لئے محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب ''نصرۃ الحدیث'' کے نام سے تالیف فرمائی، جو ۱۳۴۵ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی، جس کے محققانہ و فاضلانہ استدلال کے سامنے منکرین حدیث کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

نصرۃ الحدیث پر ایک جامع تبصرہ:

صاحب بصیرت، یگانۂ روزگار، انشاء پرداز علامہ ماہر القادری نصرۃ الحدیث کے دوسرے ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''نصرۃ الحدیث کے مطالعہ سے احادیث رسول اللہ ﷺ کی اہمیت، افادیت، ضرورت بلکہ

اس کے منصوص ہونے پر دل مطمئن ہو جاتا ہے، اس کتاب کا ایک ایک ورق ایمان فروز ہے۔ نصرۃ الحدیث کے فاضلانہ اور محققانہ مقدمے نے علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ مرحوم کے خطبات مدراس کی یاد تازہ کردی ہے۔ (فاران جنوری ۱۹۶۳ء کراچی)

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی جرات، حق گوئی، ہمیشہ تازہ دم رہی یہاں مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ قلم بند کیا جاتا ہے:

ہندوستان کی جمہوری حکومت نے اسلام کے عائلی نظام وقوانین میں تبدیلی کی ٹھانی تو جن با حمیت وغیور حضرات کی رگ حمیت جاگی اور جن لوگوں نے مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کے خلاف آواز اٹھائی، ان میں اسلام کے بطل جلیل محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں، انھوں نے پوری شرح وبسط کے ساتھ آیات قرآنی کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ اللہ کے اس نظام میں کسی کو شمہ برابر بھی تبدیلی کا قطعاً کوئی حق نہیں پہنچتا۔

چنانچہ ۵/مارچ ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کے خلاف انصاری لائبریری خیرآباد کی طرف سے ایک جلسۂ عام کا انعقاد کیا گیا، تو اس میں خاص طور سے پاسبان علوم قرآنی حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تشریف ارزانی سے ارباب خیرآباد کو سرفراز فرمایا اور قرآن مجید کی پندرہ آیتوں سے ثابت اور مبرہن کیا کہ،،اسلامی شریعت خدا کی نازل کردہ ہے، اسلامی قانون اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور مسلم پرسنل لاء حق تعالیٰ کا وضع کیا ہوا ہے۔''

مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کے خلاف محدث اعظمی کی تقریر:

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید یہ بھی فرمایا کہ دنیا کے عام انسان تو کجا!! خود خدا کے مقرب ترین اور برگزیدہ بندے انبیاء علیہم السلام کو بھی قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ خدا کے نازل کردہ کسی بھی قانون میں کوئی تبدیلی کریں، اس سلسلے میں بطور استشہاد کے قرآن مجید کی چھ آیتیں پیش فرمائیں۔

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ مسلکاً حنفی تھے اور آپ کی پوری زندگی بھی حنفیت ہی کی پاسبانی میں گذری۔

کہا جاسکتا ہے کہ اپنے آباء واجداد کے حنفی ہونے کی وجہ سے آپ بھی حنفی تھے، ممکن ہے

یہ بات بے شعوری کی زندگی تک کے لئے تو صحیح ہو، مگر حقیقت واقعہ یہ نہیں، بلکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مسلکِ حنفی سے وابستگی آپ کی فہم وفراست اور فطانت وذہانت کی بناء پر تھی، اس لئے کہ جب اپنی فراست ایمانی اور بصیرت عرفانی سے توجہ فرمائی تو مسلکِ حنفی کو قرآن اور احادیث صحیحہ و قویہ سے قریب تر پایا، چنانچہ مسلک کے احقاق واثبات میں اولاً آیات قرآنی کو پھر مزید تائید کے لئے مستند، حدیث صحیحہ وقویہ کو پیش فرماتے، مثال کے طور پر راقم السطور اپنی آپ بیتی ہی پیش کرتا ہے۔

راقم السطور کو تعلیمی مراحل کی تکمیل کے لئے جب مشرقی یوپی کی سب سے عظیم درسگاہ دارالعلوم مئو جانا ہوا، تو حصول فیض وبرکت کے لئے گاہے ماہے خدمت عالیہ میں حاضری ہوتی رہی، شدہ شدہ راقم کا دورۂ حدیث کا سال شروع ہوگیا، یہ ۱۹۷۰ء کا زمانہ تھا، اچانک ایک دن بعد مغرب پورے دارالعلوم میں شیفتگانِ علوم نبویہ کی زبانوں سے یہ پرمسرت شور اٹھا کہ آج سے بڑے مولانا نے اپنے محلّہ کی مسجد میں طحاوی شریف کی تدریس کا آغاز فرما دیا ہے۔ بس کیا تھا؟ روزانہ عصر بعد تشنگان علوم نبویہ دجلۂ حدیث پر سیرابی کے لئے رواں دواں، کشاں کشاں پہنچنے لگے، یوں کہئے کہ ایک مقناطیسی کشش تھی، جس نے محاذات میں واقع سارے آہنوں کو ایک مرکز پر جمع کرلیا تھا۔

راقم السطور بھی بلاناغہ حاضری دیتا رہا۔

محدث اعظمی کی تدریسی شان:

حضرت محدث اعظمی ؒ اپنی پوری شان جلالتِ علمی کے ساتھ ہر مسئلے پر نہایت مختصر مگر محققانہ اور پُرمغز تقریر فرماتے، جس سے متعلقہ مبحث کا کوئی بھی گوشہ تشنہ نہیں رہ پاتا اور حنفی مسلک کی تائید میں اولاً آیت قرآنی پیش فرماتے۔

چنانچہ حدیثِ مسح علی الناصیہ پر آیتِ سورۂ اقراء لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ اور آیتِ سورۂ رحمٰن فيؤخذ بالنواصي والأقدام سے استشہاد فرماتے ہوئے ایسی جامع تقریر فرمائی کہ مبرہن ہوکر بات واضح ہوگئی کہ مسح رأس میں فرضیت یقیناً ربع رأس ہی ہے، مزید جو کچھ ہے وہ سنت ہے۔

آٹھ رکعات تراویح پر رد وتنقید:

ہندوستان کے فرقۂ اہلحدیث نے کم وبیش سو سال سے رکعات تراویح کی بابت جو شور وغوغا مچا رکھا ہے اس کے رد میں حضرت محدث اعظمی ﷫ نے کتاب ''رکعات تراویح'' تصنیف فرما کر صحیح اور مستند حوالوں سے ثابت فرمایا کہ گذشتہ ساڑھے بارہ سو برس کی تاریخ میں اس کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مسلمانوں نے آٹھ رکعت تراویح پڑھی ہو۔

مزید یہ بھی ثابت فرمایا کہ بیس رکعات والی مرفوع روایت کو یکسر نا قابل اعتبار کہنا اصول حدیث اور مسلمات مخالفین کی روشنی میں قطعاً صحیح نہیں۔

ہندوستان کے مایۂ ناز نقاد دیدہ ور اور بالغ نظر، تبصرہ نگار مولانا عامر عثمانی مرحوم ''رکعاتِ تراویح'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں: ''امام عصر مولانا اعظمی ﷫ کی تالیف ''رکعات تراویح،، ایک بیش بہا کتاب ہے''۔

پھر چند سطروں کے بعد رقمطراز ہیں۔

''ٹھوس اور گہرا علم رکھنے والے بشرطیکہ علم کو سہارنے والا مظبوط دماغ بھی ان کے پاس ہو تو انشاء اللہ یہی کہیں گے کہ مولانا اعظمی ﷫ نے مسلک حنفی کے احقاق کا حق ادا کر دیا ہے''۔

(ماہنامہ تجلی دیوبند ص ۵۶، اکتوبر ۱۹۶۳ء)

حضرت محدث اعظمی ﷫ کی زندگی میں ان کا اجمالی تعارف عربی زبان میں مرتب ہو چکا تھا، جس کی تصدیق وتصویب خود محدث اعظمی ﷫ نے فرمادی ہے، وہ اجمالی تعارف فل اسکیپ سائز کے چھ صفحات پر مشتمل ہے۔

محدث اعظمی ﷫ کی تعلیقات وتحقیقات:

حضرت کے خلف الرشید مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ العالی کی عنایت خاصہ سے ناچیز راقم کو وہ اجمالی تعارف میسر ہوا، درج ذیل تعلیقات اسی سے نقل کی جارہی ہیں، ملاحظہ ہو:

۱:-مسند حمیدی (دوجلدوں میں) ۱۳۸۲ھ میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

۲:-سنن سعید بن منصور (دوجلدوں میں) ۱۳۸۸ھ میں مالیگاؤں سے شائع ہوئی۔

۳:-کتاب الزہد والرقائق للامام عبداللہ بن مبارک ۱۳۸۵ھ میں مالیگاؤں سے شائع

ہوئی۔

۴:-انتقاء الترغیب والترہیب لابن حجر ۱۳۸۰ھ میں مالیگاؤں سے شائع ہوئی۔

۵:-المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ لابن حجر (چار جلدیں) ۱۳۹۰ھ میں وزارت اوقاف کویت سے شائع ہوئی۔

۶:-تلخیص خواتم جامع الاصول للمحدث محمد طاہر پٹنی مالیگاؤں سے شائع ہوئی۔

۷:-المصنف لعبدالرزاق ۱۳۹۰ھ میں گیارہ جلدوں میں دارالقلم بیروت سے شائع ہوئی۔ الحمدللہ ہمارے مدرسہ منبع العلوم کے کتب خانے میں گیارہوں جلدیں موجود ہیں۔

۸:-کشف الاستار عن زوائد مسند البزار للہیثمی ۱۳۹۹ھ میں مؤسسۃ الرسالہ دمشق سے چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

۹:-المصنف لابن ابی شیبہ ۱۴۰۳ھ میں (تین جلدیں) المکتبۃ الامدادیہ مکہ مکرمہ سے شائع ہوئی[1]۔

۱۰:-کتاب الثقات لابن شاہین یہ غیر مطبوعہ ہے۔

۱۱:-تحقیق حیاۃ الصحابہ اس کی جلد اول شائع ہوچکی ہے، اخیر کی دو جلدیں بھی انشاء اللہ العزیز زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آرہی ہے[2]۔

۱۲:-مجمع بحار الأنوار للشیخ محمد طاہر پٹنی ۱۳۹۵ھ میں اس کی تعلیق مکمل ہوئی۔

مذکورہ بالا وہ بارہ کتابیں ہیں جن پر ہمارے محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیقات وتحقیقات اور حاشیے ہیں۔

محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی عربی تصنیفات:

آپ کی مستقل عربی تالیف الحاوی لرجال الطحاوی ہے۔

۱۳:-الحاوی لرجال الطحاوی میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب طحاوی شریف کے رجال کی تحقیق

(۱) حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سے مصنف ابن ابی شیبہ کی ۴ر جلدیں مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ سے شائع ہوچکی تھیں (مسعود الاعظمی)

(۲) حیاۃ الصحابہ کی تحقیق مولانا محمد الیاس بارہ بنکی نے کی ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے نظر ثانی کی ہے، لیکن نظر ثانی میں بھی بہت سے حواشی قلم بند فرمائے ہیں (مسعود الاعظمی)

کی گئی ہے۔طحاوی کے رجال کی تحقیق سب سے پہلے ہمارے حضرت محدث اعظمی ؒ ہی نے فرمائی، آپ سے قبل طحاوی کے رجال پر کوئی تحقیق دنیا میں موجود نہیں تھی۔

فطوبیٰ له ثم طوبیٰ له

محدث اعظمی کی دوسری عربی مستقل تالیف

۱۴:-الاتحافات السنیۃ بذکرمحدثی الحنفیۃ ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

ان چودہ کتابوں کے علاوہ سید رضوی مرتب، ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' نے شرح مسند امام احمد بن حنبل پر استدراک وتعلیق کا تذکرہ بھی تاریخ دارالعلوم دیوبند ص۱۲۵ جلد ثانی میں کیا ہے جو ۱۳۹۸ھ میں شائع ہوئی۔ان عربی تعلیقات وتصنیفات کے علاوہ اٹھارہ کتابیں حضرت محدث اعظمی ؒ نے اردو زبان میں تصنیف فرمائیں جن کے نام یہ ہیں۔

محدث اعظمی ؒ کی اردو تصنیفات:

۱:-نصرۃ الحدیث،۲-اعیان الحجاج (۲ جلدیں)،۳-رکعات تراویح،۴-رکعات تراویح مذیل،۵-الشارع الحقیقی،۶-احکام النذر للاولیاءاللہ وتفسیر مااہل بہ لغیر اللہ،۷-الاعلام المرفوعہ (اکٹھا دی گئیں تین طلاقوں کے احکام)،۸-الازہار المربوعہ فی ردّ الآثار المتبوعہ (دو جلدیں)،۹-تحقیق اہلحدیث،۱۰-دفع المجادلہ عن آیات المباہلہ،۱۱-ارشاد الثقلین فی جواب اتحاد الفریقین،۱۲-التنقید السدید علی التفسیر الجدید،۱۳-ابطال عزاداری (ردشیعیت)،۱۴-تعزیہ داری سنی نقطۂ نظر سے، ۱۵-رہبر حجاج، ۱۶-رد تحقیق الکلام (یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے)، ۱۷-اہل دل کی دلآویز باتیں ۱۸-دست کار اہل شرف۔

محدث اعظمی ؒ کے اسفار:

محدث اعظمی ؒ کے اسی ''مختصر حالات زندگی'' کے صفحۂ اول پر آپ کے سفروں کا اس طرح تذکرہ ہے، آپ نے بیت اللہ شریف کا متعدد بار حج کیا ہے،سفر حج کے علاوہ علم کی تلاش وجستجو میں درج ذیل مقامات کا سفر کیا: حلب، بیروت، کویت، دمشق،صیدا بعلبک۔حلب کا سفر آپ نے دو بار فرمایا اور شہر لاذقیہ بھی آپ تشریف لے گئے۔

ناچیز راقم السطور کی تحقیق کے مطابق لاذقیہ وہ شہر ہے جس کے ظالم حاکم کا تذکرہ سورہ

کہف میں کیا گیا ہے، جومساکین وغرباء کی کشتیاں بجبر لے لیتا تھا، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم سفر حضرت خضر نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا تھا یا تختہ نکال دیا تھا (بحوالہ سفر نامہ ابن بطوطہ)

ملکِ شام کے مشہور شہر ''جبلہ'' بھی آپ تشریف لے گئے، دوبار بحرین کو بھی آپ نے اپنے شرف قدوم سے نوازا۔

ان سفروں میں بھی آپ کے علمی استفادہ وافادہ کی مجلسیں گرم رہا کرتی تھیں، سچ فرمایا ہے عارف شیراز حضرت سعدی علیہ الرحمہ نے ؎

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زدو بارگاہ ساخت

ان سفروں میں علمائے اسلام کی کثیر تعداد نے حاضری دے کر مولانا اعظمیؒ سے اجازت و سند حدیث حاصل کی جن کے نام نامی اسم گرامی یہ ہیں۔

محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے غیر ملکی تلامذہ:

۱-سابق شیخ ازہر الامام الأکبر عبدالحلیم محمود، ۲-الشیخ بہجۃ البیطار مرحوم، ۳-الشیخ عبداللہ سراج حلبی، ۴-الشیخ نورالدین عتر، ۵-الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ۶-الشیخ عبدالعزیز بن باز وغیرہ۔ پچیس علماء اسلام کے ناموں کا تذکرہ اجمالی تعارف محدث کبیر الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ صفحہ ۲ پر موجود ہے جو عرب ممالک کے ہیں جن کا شمار اساطین امت میں ہوتا ہے۔

یہ تھا محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا نہایت مختصر اور اجمالی تعارف۔

اولئک أبائی فجئنی بمثلھم

محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علماء عرب وعجم کی نظر میں

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب☆

حضرت محدث کبیر کی اعلی شخصیت تعریف وتعارف سے بالا تر ہے۔ آپ عالم اسلام کی نادر الوجود ہستیوں میں تھے، اور اپنے جملہ اوصاف اور متنوع علمی کمالات کے لحاظ سے منفرد اور بے مثال تھے۔ اس دور آخر میں ہندوستان کے ایسے با کمال عالم اور محدث تھے جن کو عالم اسلام میں محدث جلیل کی حیثیت سے قبولیت عام حاصل ہوئی، تمام دنیا کے علماء ومحدثین آپ کے خرمن علم کے خوشہ چیں ہیں۔ ان علماء میں ہندوستان سے زیادہ عرب علماء ومحدثین کی تعداد ہے جنھوں نے آپ کو امام کبیر، علامہ نحریر، اور محدث اعظم، جیسے اونچے القاب سے یاد کیا۔ ماضی قریب میں ایسی مقبولیت اور شہرت ہندوستان کے کسی عالم اور محدث کے حصہ میں نہیں آئی۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں خدمت حدیث کی ابتداء دسویں صدی ہجری کے نامور محدث شیخ علی متقی (صاحب کنز العمال) سے ہوئی اور اس کا ارتقائی سفر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی صلبی اور معنوی اولاد کی خدمات سے ہوتا ہوا اپنے نقطۂ عروج کو محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تک پہنچا۔

ہندوستان کے اہل علم نے چونکہ آپ کی علمی تحقیقات کا مطالعہ بہت کم کیا ہے، اس لیے آپ کے مرتبہ شناس اور عقیدت مند علماء ہندوستان سے زیادہ علماء عرب ہیں، جس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا افضال الحق قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

''مکہ مکرمہ کا نوخیز عالم مجھ سے دہلی میں ملا اور حضرت مولانا کے بارے میں پوچھنے لگا

☆ کھیری باغ روڈ، مئو

تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ تو اعظم گڈھ کے ہیں تم مکہ کے لوگ انھیں کیسے جانتے ہو؟ اس مکی عالم نے کہا کہ ہم ان کو اس طرح جانتے ہیں کہ جیسے اپنے باپ دادا کو جانتے ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ میں مئو جا کر حضرت علامہ سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں، ضرور جاؤں گا۔''
(۱)

آپ کی ولادت باسعادت ۱۳۱۹ھ بمقام مئو (ضلع اعظم گڈھ) ہوئی۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولانا محمد صابر بن عنایت اللہ ہے، جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدین میں تھے اور نہایت ہی متقی اور پاکباز تھے، جیسا کہ محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر سے ظاہر ہے ۔

ہوں صابر مسکین وولی کا میں جگر بند
دعویٰ نہیں ہوں شمس وقمر کا بیٹا
کیا ناز کروں اپنے فن پر اختر (۲)
فائق تھا کہیں مجھ سے حجر کا بیٹا (۳)

ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، مولانا ابوالحسن عراقی مئوی سے آپ نے شرح جامی اور دوسری کتابیں پڑھیں، حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا میرے اُستاذ محترم تھے، میں نے مولانا کے پاس شرح جامی وغیرہ متعدد کتابیں پڑھی ہیں۔ خط کی مشق بھی آپ ہی کے پاس بہم پہنچائی تھی۔'' (۴)

مولانا عبدالغفار صاحب مئوی نقش بندی خلیفہ حضرت چاند شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ٹانڈوی آپ کے استاذ خاص ہیں اور حدیث کی روایت بھی آپ انھیں سے کرتے ہیں۔ حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''آپ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ آپ کے تلامذہ میں مولانا ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین دار العلوم دیوبند تھے۔ ناچیز کو بھی آپ کی ہی خدمت میں کچھ شُد بُد حاصل ہوئی ہے''۔ (۵)

---

(۱) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ص ۱۶۶
(۲) اختر حسن آپ کا تاریخی نام ہے ۱۳۱۹ھ
(۳) حافظ ابن حجر کی جانب اشارہ ہے
(۴) اعیان الحجاج ص ۲۸۵ ج ۲
(۵) اعیان الحجاج ص ۲۸۳ ج ۲

مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں سے آپ نے دوران طالب علمی اور بعد فراغت بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، امام اعظمی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"طالب علمی کے دور کے علاوہ فراغت کے بعد بھی مولانا کی تصنیفات سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے"۔(۱)

آپ کے اساتذہ میں مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، علامہ شبیر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ، اور مولانا کریم بخش سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر علماء بھی ہیں۔

بیعت وخلافت:

حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"وہ میری زندگی کے نہایت مسعود ومبارک لمحات ہیں جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گزرے، مجھے حاضری کی سعادت پہلی بار اس وقت حاصل ہوئی، جب دارالعلوم دیوبند میں طالب علمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ۱۳۳۷ھ غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی زیارت کے مقصد سے حاضری ہوئی تھی، مگر خوش قسمتی سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہوگیا، پہلے سے جانے پہچانے متوسلین میں اس وقت حضرت مولانا فتح پوری صاحب سوانح اور خواجہ صاحب (مجذوب تخلص) خانقاہ میں موجود تھے۔ مولانا فتح پوری حضرت اقدس کی نشست گاہ کے پیچھے ایک تنگ حجرہ میں ذرا داہنے کو ہٹ کر بیٹھنے پر مامور تھے اور وہیں حضرت کے ملفوظات قلم بند کرتے تھے۔

مولانا فتح پوری کو کئی دن تک دیکھنے اور وقتاً فوقتاً اپنی اپنی قیام گاہ پر آنے جانے، ملنے، اور بات کرنے کا موقع ملا، عصر کے بعد خانقاہ کے دروازہ پر ایک چائے خانہ میں چائے پینے اور گفتگو کی بھی نوبت آئی، جس شب میں بعد نماز مغرب میں شرف بیعت سے مشرف ہوا تھا، اس کے بعد والے دن میں غالباً بعد نماز عصر حضرت مولانا فتح پوری نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے مٹھائی وصول کرنی چاہئے، ان کو حضرت نے زمانہ طالب علمی میں بیعت کرلیا، حالانکہ حضرت ایسا نہیں کیا کرتے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے۔"(۲)

---

(۱) اعیان الحجاج ص ۲۴۹ ج ۲ (۲) مقدمہ تذکرۂ مصلح الامت ص: د، ہ

حضرت محدث اعظمی ؒ کو اجازت بیعت وخلافت حضرت مولانا منیرالدین صاحب ؒ مہاجر مکی خلیفہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداداللہ صاحب ؒ مہاجر مکی کی طرف سے بواسطہ حاجی عبدالحمید صاحب اورنگ آباد (مئو) جب کہ وہ حج میں تشریف لے گئے تھے) حاصل ہے۔اس کے علاوہ آپ کو اجازتِ بیعت حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ؒ کی طرف سے بھی حاصل ہے۔حضرت شاہ صاحب ؒ کا آپ پر غایت درجہ وثوق واعتماد تھا۔مندرجہ ذیل خط سے جس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے،جس کو حضرت شاہ صاحب ؒ نے اپنے ایک عزیز خاص سے لکھوا کر ارسال فرمایا ہے:

مخدومنا المکرّم حضرت مولانا صاحب مدفیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

الحمدللہ حضرت والا دامت برکاتہم بخر وعافیت ہیں اور فرمارہے ہیں کہ خادم آپ کی خدمت میں لکھے کہ اسی سفر کے دوران قیام میں بعد مغرب بیت الخلاء جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ علماء حضرات میرے پاس آ گئے تو آپ نے فرمایا کہ آپ بیت الخلاء تشریف لے جائیں جب تک میں آپ کی نیابت کروں گا۔میں تو آپ سے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں،مگر چونکہ آپ نے خود ہی فرمایا ہے،اس لیے میں کہتا ہوں کہ آپ میری غیر موجودگی میں میری نیابت کریں اور میرا یہ خط میرے چند مخلص حضرات کو بھی دکھادیں۔مثلاً قاری (ریاست علی) صاحب،مفتی (نظام الدین) صاحب، حافظ یعقوب صاحب، بابا محمد خلیل صاحب،سیٹھ (عبدالرب) صاحب وغیرہم کو۔ والسلام

(دستخط عزیز خاص)(۱)

زہدواستغناء:

علماء ربانی اور مشائخ حقانی کی سب سے نمایاں صفت ہے، جو انھیں علماء سوء سے ممتاز کرتی ہے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حجۃ الاسلام امام غزالی کی وہ تحریر بھی نقل کر دی جائے جو حضرت امام نے علماء سوء کی تعریف میں تحریر فرمائی ہے:

وقد ورد فی العلماء السوء تشدیدات عظیمة، دلت علی انهم أشد الخلق

(۱) تذکرہ مصلح الامت ص: ح۔ط۔ی

عـذابـاً يوم القيٰمة فمن المهمات العظيمة معرفة العلامات الفارقة بين علماء الدنيا وعـلـمـاء الآخرة، ونعني بعلماء الدنيا علماء السوء الذين قصد هم من العلم التنعم بالدنيا والتوصل الى الجاه والمنزلة عند اهلها(۱)

ترجمہ: اورقرآن وحدیث میں علماءسوء کے بارے میں ایسی ایسی سخت وعیدیں آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز سب لوگوں سے زیادہ انھیں کوعذاب ہوگا،لہذاان علامات کا جاننااشدضروری ہواجوعلماءدنیاکوعلماءآخرت سے جداکرتی ہیں،اورہماری مرادعلماءدنیاسے وہ علماءسوء ہیں جن کا مقصداپنےعلم (دین) سے محض دنیاوی راحت وآرام ہےاوراسے جاہ طلبی کاذریعہ بنانا ہے، یااس کےذریعہ سےاہل جاہ کی نظروں میں وقیع بنناہے۔(۲)

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی عالم ربانی اورشیخ حقانی کی جیتی جاگتی تصویرنظرآتی ہے۔حبّ مال اورحبّ جاہ سے کوسوں دور تھے، نام ونمود اورشہرت سے بے نیاز تھے۔ان کی زندگی میں عرب وعجم کی طرف سے کئی ایک مناصب جلیلہ اور بڑی اونچی تنخواہیں پیش کی گئیں،لیکن اس مرد درویش نے ہمیشہ باوجودتنگی وعسرت کے''ما آبروئےفقروقناعت نمی بریم''کواپنا شعار بنائے رکھا،اور بوریہ نشینی کوعیش وعشرت کی زندگی پرترجیح دی۔

گو ہَوا ہے تندوتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرددرویش جس کوحق نے دیے ہیں اندازخسروانہ

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات مبارکہ سے زہدواستغناء کے چندواقعات پیش قارئین ہیں:

۱-حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ جس وقت مدرسہ مفتاح العلوم مئو(جس کی نشأۃ ثانیہ کاسہراآپ ہی کے سرہے) میں مدرس تھے،اس وقت مدرسہ کی طرف سے آپ کوصرف ۲۵؍روپیہ ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا۔اسی زمانہ میں مولانا سعیداحمد صاحب اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے جواس وقت مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تھے، حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کو وہاں آنے کی دعوت دی اور ۷۰۰ روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا۔لیکن حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی غیورطبیعت نے اس کوگوارانہیں کیا اورحضرت مولانا اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی

(۱)احیاءالعلوم ص۶۳ ج۱ (۲)تالیفات مصلح الامت ص۱۱۴ ج۱

خوبصورتی کے ساتھ معذرت فرمادی۔

۲-مولانا افضال الحق قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

''تقریباً ۳۵/برس پہلے جب مدینہ یونیورسٹی میں صدر کا عہدہ خالی ہوا تو جامعہ کی کمیٹی نے متفقہ طور پر طے کیا کہ مولانا اعظمی کو جامعہ کی صدارت کے لیے لایا جائے اور انھیں ۲۰/ہزار ریال مع لوازم رہائش پیش کیا جائے، عربوں نے تجویز بڑے شوق سے پاس کی اور حضرت مولانا کی منظوری کے لیے بڑے اہتما سے بھیجا، مگر ان کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ حضرت مولانا نے شکریہ کے ساتھ وہ تجویز واپس کردی، اور لکھ دیا کہ مجھے یہیں بیٹھ کر یہ خدمت انجام دینے دیجئے۔ غالباً اس کی اطلاع ان کے گھر والوں کو بھی نہیں ہوئی، مگر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے انتہائی حیرت ومسرت اور سر بلند کرکے یہ بات مولانا محمد منظور نعمانی کو بتائی اور انھوں نے مجھے یہ کہہ کر اطلاع دی کہ ہندوستان میں ایسے ایسے علم کے خادم اور دنیا سے بے تعلق حضرات موجود ہیں، اس لیے علم کا بھرم قائم ہے۔''(۱)

۳-مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں:

''اسمبلی کی ممبری ختم ہونے کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مولانا کے یہاں مالی تنگی محسوس کی گئی، اس زمانہ میں ندوہ نے طے کیا کہ سال بھر حضرت مولانا نے درس دیا ہے، یہ موقع ایسا ہے کہ حضرت مولانا کی مدد کی جائے اور سال بھر کی تنخواہ جوان دنوں نہیں لیتے تھے، بھیج دی جائے، چنانچہ دارالعلوم ندوہ کے ذمہ داروں نے ڈرافٹ حضرت مولانا کے نام بھیجا، مگر مولانا نے اسے وصول نہیں کیا بلکہ واپس فرمادیا اور لکھا کہ میں نے یہ طے کرکے پڑھانا شروع کیا تھا کہ اس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کروں گا۔''(۲)

۴-مئو جب ضلع بننے والا تھا تو مقامی کلکٹر کو اوپر سے یہ حکم آیا کہ ضلع کی افتتاحی تقریب میں حضرت مولانا کے ذریعہ ضلع بننے کا اعلان کرایا جائے۔ کئی بار مقامی حکام نے حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ پر حاضری دی اور اصرار کیا اور اعلی حکام کی سفارش بھی نقل کی، لیکن محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس تقریب میں جانے سے صاف انکار فرمادیا۔ اس موقع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض قریبی

(۱) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ص ۱۶۸ (۲) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ص ۱۵۱

لوگوں نے مشورہ بھی دیا کہ حضرت! شرکت فرمالیں ایک تاریخی چیز ہوگی، لیکن جن کے مقاصد جلیل اورعزائم بلند ہوں وہ ان خزف ریزوں کو کب نگاہ میں لاتے ہیں!

میں کہاں رکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے
ہے مجھے جانا بہت اونچا حدِ پرواز سے

۵- آپ کو از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی کا منصب پیش کیا گیا، اس کے لیے خاص طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مئو کا سفر کیا، مگر حالات نے اجازت نہیں دی۔

حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد صدارت تدریس پیش کی گئی، لیکن اس پر بھی معذرت کردی۔ حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک خط میں جو مفتی ظفیر الدین صاحب دارالعلوم دیوبند کے نام ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''علامہ کی وفات کے بعد دیوبند سے جو خط لکھا تھا، وہ پہلے مل گیا تھا، آج وطن سے بھیجا ہوا تمھارا خط ملا، تم نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بعید از قیاس نہیں ہیں.........مگر میں اپنے دل کو جہاں تک ٹٹولتا ہوں، میرے دل کے کسی گوشہ میں یہ تمنا نہیں ملتی۔'' (مکتوب ۲۵ر شوال ۸۷ھ)[(۱)]

نمونہ کے طور پر چند واقعات ذکر کیے گئے، ورنہ حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے جس کے لیے پورا دفتر درکار ہے ع

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

علماءِ عرب وعجم کی نظر میں:

ذیل میں ہم دنیا کے ممتاز اہل علم وقلم کے تأثرات نقل کررہے ہیں، جس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کس قدر عظیم وبلند وبالا تھی۔

(۱) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ص

الشیخ السید یوسف ہاشم الرفاعی:

کویت کے جید عالم دین اور سابق وزیر مواصلات ہیں، الالبانی شذوذہ واخطاءہ، حضرت محدث کبیر کی شیخ ناصر الدین البانی کے نظریات کے رد میں ۴ حصوں میں مشہور تصنیف ہے۔ شیخ یوسف ہاشم الرفاعی نے اس کے مقدمہ میں حضرت محدث کبیر ؒ کا تذکرہ اس عنوان سے شروع کیا ہے:

إنه إمام كبير، ومحقق جليل، ومحدث نبيل شهير، وهو العلامة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي الهندي (۱)

آپ کی ذات عالی، امام کبیر، محقق جلیل، محدث نبیل علامہ شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی الہندی کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔

آگے آپ کے علمی خدمات کا اعتراف ان جملوں میں کرتے ہیں:

خادم السنة النبوية بحقٍ وعلمٍ وادبٍ وورعٍ وتقوى الله سبحانه.....
وهو يقوم بتحقيق كتب السنة النبوية ونشرها، دون جعجعة وطنطنة، أودعايات وادعاءات فارغة خرقاء.....

آپ سنت نبویہ کے سچے خادم ہیں اور نہایت ہی ادب، کمال علم اور ورع اور تقویٰ کے ساتھ، بغیر خواہش نام ونمود اور شہرت کے اس خدمت جلیلہ میں لگے ہوئے ہیں۔ اس عظیم کام کا آپ کی طرف سے نہ کوئی پروپیگنڈہ ہے اور نہ ہی آپ نے خالی خولی بے کار قسم کا بلند بانگ دعویٰ ہی کیا ہے۔

آخر میں پورے عالم اسلام کی آپ کے ساتھ گرویدگی اور عقیدت مندی کا اظہار ان جملوں میں کرتے ہیں:

فإن اسم الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي مقرون عند كل عارفيه في المشرق والمغرب بالفضل والتقدير والإجلال والمحبة، والخضوع لعلمه ومعرفته بالسنة النبوية، وكبير خدمته لها وعظيم أدبه مع العلماء

(۱) الألباني شذوذه وأخطاءه ص۶

والائمة الأجلاء.

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا نام نامی سارے عالم میں ان کے جاننے والوں کے نزدیک علم وفضل، اجلال ومحبت اور بلندی شان کی ضمانت ہے۔ سب ان کی شان، عالی علم حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں ان کے علم ومعرفت اور ان کی عظیم الشان خدمات اور علماء اور ائمہ کے حق میں ان کے غایت حسن ادب کے قائل ومعترف ہیں۔

امام اکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود رحمۃ اللہ علیہ (سابق شیخ الازہر) مصر المتوفی ۱۹۷۸ء:

آپ کے بارے میں اتفاق ہے کہ صدیوں میں ایسے بلند پایہ شخص مصر کے امام اکبر ہوتے ہیں، حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی مدظلہ آپ کی بابت ''الفرقان'' میں لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ آج کے تجدد زدہ مصر میں آپ کی شخصیت اور خاص کر شیخ الازہر کے عظیم منصب پر ہونا بڑی خیر کا باعث تھا۔''(۱)

مزید فرماتے ہیں:

''راقم سطور نے مرحوم مغفور کو سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں حج کے موقع پر مکہ معظّمہ میں دیکھا تھا......... میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مصری عالم کو میں نے اس شکل وصورت میں دیکھا جو علماء دین وشریعت اور ''ورثۃ الانبیاء'' کی ہونی چاہیے۔ حکم شریعت اور سنت کے مطابق داڑھی، چہرہ پر ذکر اللہ اور تقوے کے آثار وانوار، باتوں سے معلوم ہوا کہ ہمارے اکابر کی طرح عالم بلکہ علامہ (اور پیرس یونیورسٹی کے پی۔ ایچ۔ ڈی) ہونے کے ساتھ راہ سلوک کے سالک بھی ہیں اور یہ اسی کے برکات ہیں''۔(۱)

آپ نے تقریباً ۲۰ر سال پہلے مکہ مکرمہ میں علماء عرب وعجم کے نمائندہ اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرمایا کہ:

''میں شہادت دیتا ہوں کہ سارے عالم میں کوئی ''محدث اعظم'' کے خطاب کا مستحق ہے تو مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ہیں''۔

حاضرین میں ہندوستان کے مشہور عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور

---

(۱) الفرقان دسمبر ۱۹۷۸ء

صاحب نعمانی بھی تھے۔

(The Sunnah In Islam Page-5 U.K. Islamic Academy 1989)

(۲) ''دنیا کی سب سے قدیم اور بڑی اسلامی یونیورسٹی ''جامعہ ازہر'' کے شیخ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود صاحب ۱۱؍نومبر ۱۹۷۵ء ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ کو جامعہ (اسلامیہ ڈابھیل) میں رونق افروز ہوئے، اس موقع پر ہندوستان اور گجرات کے دیگر اکابر علماء بھی تشریف فرما ہوئے، عوام کا ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا تھا۔ مقامی علماء کے علاوہ محدث جلیل علامہ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ اور فدائے ملت حضرت مولانا اسعد صاحب مدنی مدظلہ اور جنرل شاہنواز صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جلسۂ عام کی صدارت مولانا اعظمی صاحب نے فرمائی۔

شیخ الازہر کا عہدہ ملک مصر کا سرکاری عہدہ بھی ہے اس لیے شیخ الازہر کی آمد سرکاری حفاظت میں ہوئی تھی۔ شیخ کے ساتھ مصر کے دیگر ذمہ دار حضرات (نیز وزیر اوقاف محمد حسین ذہبی) بھی تھے''۔ (۱)

جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اوقاف موصوف نے حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا کہ:

أنت أعظم العلماء فی الهند. (آپ ہندوستان کے سب سے بڑے عالم ہیں)

اس پر شیخ الازہر نے بیچ میں ٹوک کر کہا کہ **بل فی العالم کله** (بلکہ تمام دنیا کے سب سے بڑے عالم ہیں)

''جامعہ کی طرف سے شیخ الازہر کو اعزازی عمامہ دیا گیا۔ اس عمامۃ الفضیلۃ والتکریم کو شیخ الازہر کے سر پر ہندوستان بلکہ دنیا کے مسلم ماہر حدیث مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ نے باندھا جس کو شیخ الازہر نے بخوشی قبول فرمایا''۔ (۱)

شیخ زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ مصری:

بقول حضرت محدث کبیر: ''عہد حاضر کے سب سے بڑے وسیع النظر عالم، اور فن حدیث و

(۱) تاریخ ڈابھیل ص ۱۸۳

رجال کے ماہر تھے'' شیخ زاہد کوثری استنبول (ترکی) کے رہنے والے فقہ حنفی کے بلند پایہ عالم اور وہاں کے شیخ الاسلام تھے۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا کے زمانہ میں علماء اور دین پر جو مظالم ڈھائے گئے، اس کے نتیجہ میں شیخ زاہد کوثری کو پہلے پھانسی کا حکم سنایا گیا جو بعد میں جلا وطنی میں تبدیل کر دیا گیا، چنانچہ شیخ نے مصر میں قیام فرمایا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مسلم شریف کی شرح ''فتح الملہم'' پر آپ ہی نے تقریظ رقم فرمائی ہے۔ علامہ زاہد کوثری نے **منیة الالمعی** کے مقدمہ میں محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کو علامہ نحریر والجہبز الخبیر، کے القاب سے یاد کیا ہے۔

هـذا وإنـي أشـكـر مـولانـا العلامة النحرير والجهبذ الخبير أباالمآثر حبيب الـرحـمـن الاعظمي السالف الزكر على تفضله بكتابة التعليقات بخط يده المباركة ومبادرته بإرسالها إلى هذا العاجز مع ما له من الأشغال الكثيرة (۱)

دوسرے مقام پر آپ کو استاذ جلیل، کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔

فـأدعـو الـلّٰـه سبـحـانـه أن يـطيل بقاء الأستاذ الجليل المشار إليه فى خير وعافية ويمتع المسلمين بعلومه النافعة ويكافئه مكافاة المحسنين إزاء هذا الفضل الجسيم. (۲)

مندرجہ بالا سطور کا مفہوم یہ ہے کہ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ اس زبردست استاذ کو خیر وعافیت کے ساتھ زیادہ دنوں تک باقی رکھے اور مسلمانوں کو ان کے علوم نافعہ سے فائدہ پہنچائے اور ان کو اس فضل عظیم کا بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

شیخ احمد محمد شاکر مصری (محدث وادی نیل):

مسند احمد کے مشہور شارح شیخ احمد محمد شاکر مصری رحمۃ اللہ علیہ نے مسند احمد کی پندرہویں جلد میں محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضل کا اعتراف ان جملوں میں کیا ہے:

''اس کتاب کی تیسری جلد ص ۳۶۵ میں درخواست کی گئی تھی کہ اہل علم وفضل مسند کی شرح اور تعلیق میں جو خامی رہ گئی ہے، اس کی نشاندہی فرمائیں۔ مگر اس سلسلے میں دس سال بعد سب سے پہلا ''استدراک وتعقیب'' ایک ہندوستانی عالم دین علامہ استاذ مولانا حبیب

---

(۱) نصب الرایہ ص ۸ ج ۴ (۲) نصب الرایہ ص ۶ ج ۴

الرحمٰن اعظمی خادم الحدیث جامعہ مفتاح العلوم، مئو، ضلع اعظم گڈھ، کی طرف سے موصول ہوا ہے۔ جن سے میری کوئی جان پہچان نہیں، مگر ان کی اس تحریر سے ان کے عمیق علم وفضل، وسیع مطالعہ اور دقیق بحث وتحقیق کا اندازہ ہوا۔ چنانچہ میں اس تحریر کو یہاں اس اقرار کے ساتھ شائع کر رہا ہوں کہ جو گرفت کی گئی ہے وہ درست اور یقیناً مولانا کا فضل وکمال مسلم ہے۔''(۱)

اس کے علاوہ شیخ احمد محمد شاکر نے جو مکتوب بطور شکریہ حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کو ارسال کیا ہے اس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

حضرة الأخ العلامة الكبير المحقق الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمي... جاء ني كتابكم الأول النفيس .... أما استدراكاتكم فكلها نفيسة عالية، ولا أقول هذا مجاملة .... وأشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة، وأرجو أن تزيدوني من إشاراتكم وإرشاداتكم خدمة للسنة النبوية المطهرة وأنتم -كما رأيت من عملكم- من أعظم العلماء بها في هذا العصر، فالحمدلله على توفيقكم .... ثم أكرر الرجاء أن لا تحرموني من آرائكم النيرة وتحقيقاتكم النفيسة ..... حفظكم الله وبارك فيكم.

كتبه المخلص:

أحمد محمد شاكر

مندرجہ بالا سطور کا مفہوم یہ ہے کہ:

آپ کا نفیس گرامی نامہ ملا، آپ کے تمام استدراکات نہایت عمدہ اور بلند رتبہ ہیں، میں یہ بات محض آپ کو خوش کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں، اس عظیم توجہ فرمائی پر خلوص دل کے ساتھ آپ کا شکر گذار ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ سنت نبویہ مطہرہ کی خدمت کے جذبہ سے مجھے مزید مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازیں گے، اور جہاں تک میں نے آپ

(۱) مسند احمد شرح وتعلیق احمد محمد شاکر ص ۱۵۱ ج ۱۵

کے اس کام کو دیکھ کر سمجھا ہے، میرا خیال ہے کہ آپ اس زمانہ میں سنت نبویہ کے عظیم تر علماء میں سے ایک ہیں۔

فالحمدللہ!

شیخ محمود شاکر مصری:

آپ محدث وادی نیل شیخ احمد محمد شاکر مصری کے چھوٹے بھائی اور مشہور فاضل ہیں۔ڈاکٹر محمد اسماعیل مدراسی ندوی مرحوم مصر سے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہاں (مصر) کے مشہور فاضل محمود شاکر صاحب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (مولانا اعظمی) بعض اعتبار سے ان کے بھائی مشہور محدث احمد شاکر مرحوم سے بھی بڑھے ہوئے ہیں''۔

(صدق جدید ص ۷ مورخہ یکم جولائی ۱۹۶۰ء)

شیخ علامہ بن باز:

سعودی عرب کے مفتی اعظم ہیں۔مولانا افضال الحق قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا (اعظمی) ایک مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے،مولانا اسعد صاحب بھی وہاں موجود تھے،انھوں نے شیخ عرب علامہ بن باز کی زیارت کا وقت مانگا اور وہ مقرر ہوگیا، جانے لگے تو حضرت مولانا کے پاس آئے اور علامہ کے پاس چلنے کے لیے کہا، حضرت مولانا تیار ہوگئے، وہاں پہنچے تو حسب معمول ہر شخص نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا کیوں کہ ابن باز نابینا محدث ہیں، ان کے یہاں ہر شخص کو اپنا نام اور مختصر تعارف کرانا ہوتا ہے۔جب کئی آدمی اپنا اپنا تعارف کرا چکے تو آخری نمبر حضرت مولانا کا تھا،مولانا نے فرمایا:

أنا حبیب الرحمن الاعظمی من الھند تو شیخ عرب اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ حضرت مولانا سے معانقہ فرمایا اور معذرت کی کہ آپ نے یہاں آکر مجھے شرمندہ کیا، مجھے معلوم ہوتا تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، پھر اپنی مسند پر مولانا کو بٹھا کر انھوں نے سکون پایا''۔(۱)

(۱) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ص ۱۶۶

شیخ ناصرالدین الالبانی:

مشہور عالم ومحدث اور منکرین تقلید میں سے ہیں، حضرت محدث کبیر ﷫ سے بوجہ حنفی ہونے کے شدید نظریاتی اختلاف رکھتے ہیں، بلکہ ان کا یہ نظریاتی اختلاف، اختلاف کی حدود پر باقی نہیں رہا، ان کی تصنیفات کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عداوت کی حد تک پہنچے ہیں، چنانچہ ان کے تشدد کا شاکی اہل علم کا معتدل سبھی طبقہ ہے، انھیں شاید اس دور میں اپنے علم وفضل کے علاوہ کسی اور کا علم تسلیم نہیں، بلکہ اس باب میں وہ متقدمین سے بھی آگے جانا چاہتے ہیں، مگر جادووہ جو سر چڑھ کر بولے، اس ادعاء ہمہ دانی کے باوجود حضرت محدث کبیر کے علم وفضل اور علومرتبت کے قائل ومعترف ہیں۔

''صحیح الترغیب والترہیب'' کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''واعلم أن مما شجعنی علی نشرهما أنني رأيت الكتاب المطبوع تحت عنوان......

وعلق عليه العالم الشهير الجليل الشيخ حبيب الرحمن الاعظمی''.

مزید رقمطراز ہیں: **''ومما زادنی رغبة في الإقبال عليه أن محققه الفاضل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمی قد صرح...** (۱)

مندرجہ بالا سطور کا مفہوم یہ ہے کہ اور معلوم ہونا چاہئے کہ مجھ کو ان (کتابوں) کی اشاعت پر اس چیز نے ابھارا جب میں نے مطبوعہ کتاب کو اس عنوان کے تحت دیکھا کہ اس کی تعلیق مشہور عالم جلیل شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی نے کیا ہے۔ شیخ البانی مزید فرماتے ہیں:

اور اس کی طرف توجہ کرنے میں میری رغبت اور زیادہ ہوگئی بوجہ اس کے کہ اس کی تحقیق فاضل محقق شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی نے کی ہے۔

حکماء عرب نے سچ فرمایا ہے:

الفضل ما شهدت به الاعداء (بزرگی تو وہی جس کی شہادت اپنے مخالفین بھی دیں)

اہل علم کا اختلاف اخلاص پر مبنی ہوتا ہے، نظریاتی اختلاف کے باوجود شیخ ناصرالدین الالبانی

---

(۱) صحیح الترغیب والترہیب الالبانی ص ۶۳

حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ سے کسی قدر ارتباط رکھتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ قبل دو عرب شیخ حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لیے مئو تشریف لائے۔ حضرت محدث کبیر علالت کے باعث اس وقت بات چیت نہیں کے برابر کرتے تھے، پھر بھی ان لوگوں سے گفتگو فرمائی۔ ان عرب شیوخ نے علامہ بن باز، شیخ ناصر الدین البانی اور ایک بڑے سعودی عالم کا حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کو سلام عرض کیا اور یہ فرمایا کہ وہ لوگ آپ کے حالات جاننے کے مشتاق ہیں۔ حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو میرا بھی سلام عرض کر دیں اور دعا فرمائیں کہ پھر ملاقات ہو۔ اس پر ان عرب شیوخ نے فرمایا اب انشاء اللہ آخرت میں ملاقات ہوگی۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ:

مشہور شامی عالم اور علامہ زاہد کوثری کے ارشد تلامذہ میں ہیں، علامہ کوثری کی ہی صحبت میں حضرت محدث اعظمی سے عقیدت پیدا ہوئی، اس لیے کہ استاذ محترم اپنی مجلس میں اکثر حضرت محدث کبیر کے علم و فضل کا تذکرہ فرماتے رہتے تھے۔ علامہ کوثری کے انتقال کے بعد آپ نے مکمل طور پر حضرت محدث کبیر سے رجوع فرمایا اور مئو تشریف لاکر حدیث کی اجازت لی اور محدث کبیر کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔

انھوں نے محدث کبیر کا نام ان تمام الفاظ میں لیا ہے اور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ (۱)

العلامة المحدث البارع الفقيه الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي صاحب التعليقات البديعة والتحقيقات النادرة العالم بالرجال والعلل، وتعليقاته السنية على سنن سعيد بن منصور والزهد لابن المبارك ومسند الحميدى واستدراكاته على الشيخ أحمد محمد شاكر في تعليقه على مسند أحمد ثم تعليقاته الحافلة على مصنف عبدالرزاق الذى يطيع الآن بعون الله كلها تنطق بسمو فضله وبسطة يديه في هذا العلم الشريف (۲)

ماحصل یہ ہے کہ حضرت محدث کبیر نے کتب حدیث کو گراں قدر تعلیق اور قیمتی و نادر تحقیق

---

(۱) اپنے ایک مراسلہ میں شیخ ابوغدہ نے حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کو ''شیخنا برکة العصر وشیخ الحديث في كل مصر'' کے القاب سے یاد کیا ہے۔

(۲) فقہ اہل العراق وحدیثہم ص ۸۲

سے مالا مال کیا ہے اور آپ علم اسماء الرجال کے بہت بڑے عالم ہیں، سنن سعید بن منصور، کتاب الزہد والرقائق، مسند حمیدی اور مصنف عبدالرزاق آپ نے اپنی قیمتی تعلیق کے ساتھ شائع کرائی ہے اور مسند احمد پر استدراک تحریر فرمایا ہے جو آپ کے وسیع مطالعہ اور عظیم علم وفضل پہ دال ہے۔ پھر مصنف عبدالرزاق جو اس وقت شائع ہورہی ہے، آپ کی بھرپور تعلیقات، یہ سب آپ کے فضل وکمال کی بلندی اور فن حدیث میں آپ کی زبردست مہارت کی شاہد ہیں۔

مولانا عبداللہ زمزمی مکی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ مکہ معظّمہ کے مشہور صاحب کرامت بزرگ گزرے ہیں، آپ کی ملاقات کے لیے حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک بار راقم سطور نے ان کے بارے میں حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا تو فرمایا کہ اصلاً یہ لوگ لاہور کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام غلام محمد تھا، باب ام ہانی پر ان کا کمرہ تھا، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کا ہی کمرہ تھا، مجھ سے بے پناہ محبت فرماتے تھے، جب بھی حجاز جانا ہوتا تو کمرہ کی کنجی میرے حوالے کردیتے تھے، اس زمانہ میں آج کی طرح آسانیاں نہیں تھیں، میں ان کا بہت ہی ممنون اور مشکور ہوں۔ یہ بھی فرمایا کہ کوئی میرے بارے میں ان سے پوچھتا تو فرماتے کہ وہ میرے شیخ ہیں۔ ایک بار حجاز جانا ہوا تو ان سے کسی نے بتادیا میں آیا ہوں تو ملاقات کے لیے دو بجے رات تک سڑک پر لیٹے رہے۔

حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ، شیخ رحمت اللہ سندی کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ رحمت اللہ سندی نے مناسک حج میں دو رسالے لکھے ہیں، بڑے کا نام ''جمع المناسک ونفع الناسک'' ہے۔ اسی کو ''المناسک الکبیر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۸۹ھ میں قسطنطنیہ میں چھپ بھی چکی ہے۔ مطبوعہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ جو مولانا عبداللہ زمزمی مرحوم کا ہدیہ اور ان کی بے پایاں محبت کی ایک یادگار ہے''۔(۱)

بابا خلیل صاحب مئوی راوی ہیں کہ ایک بار میں مولانا زمزمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ملاقات کے لیے گیا، میرے ہاتھ میں مولانا (حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی) کی کتاب رہبر حجاج تھی، انھوں نے پوچھا کون سی کتاب ہے؟ میں نے کہا مولانا اعظمی کی رہبر حجاج ہے۔ کتاب لے کر کھڑے ہوگئے،

---

(۱) اعیان الحجاج ص ۲۲۱ ج ۱

اور سر پر رکھ لیا اور کئی بار فرمایا کہ ''مولانا تو رہبر عالم ہیں، مولانا تو رہبر عالم ہیں''۔

شیخ علوی مالکی (محدث حرم پاک):

مولانا اقبال احمد اعظمی انگلینڈ سے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ علوی مالکی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے علماء جانتے ہیں، وہ شیخ حسن مشاط رحمۃ اللہ علیہ، اور شیخ ابراہیم کُردی رحمۃ اللہ علیہ، کہنا چاہئے کہ حرم پاک کے بلند پایہ علماء ومحدثین کی یہ آخری تین یادگاریں تھیں، ان تینوں کو حضرت مولانا (حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی) مدظلہ کی معیت میں ہی دیکھنے کی اس ناچیز کو بھی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ شیخ علوی رحمۃ اللہ علیہ جو ''سید'' بھی تھے مولانا سے لپٹے ہوئے ہیں اور بلک بلک کر رو رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں:

''میں یقین دلاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے راضی ہیں۔''

(مکتوب مولانا اقبال اعظمی بنام مولانا رشید احمد صاحب بن محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ)

۲/اکتوبر ۱۹۸۹ء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوی مالکی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تائید میں ہندوستان کے ایک بزرگ کا خواب ذکر کر دیا جائے:

''حضرت مولانا صوفی نصرت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ[1] جو سلسلہ تھانوی کے ایک بزرگ تھے، ٹانڈہ میں رہتے تھے۔ ایک بار وہ اور حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ گورکھپور میں تشریف رکھتے تھے، صوفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے داماد کے یہاں حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت تھی۔ بعد نماز عشاء کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دونوں بزرگ اپنی اپنی قیام گاہ پر چلے گئے۔ رات میں اچانک مولانا نصرت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت خراب ہوگئی، ڈاکٹر آئے، دوا دی گئی، اسی اثناء میں آپ کو نیند آگئی، جب بیدار ہوئے تو حاضرین سے فرمایا کہ:

''ابھی میں نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''حبیب الرحمٰن سے میرا سلام کہہ دیجیے اور کہہ دیجیے کہ وہ جس کام میں لگے ہیں لگے رہیں''۔ اس کے بعد مولانا نصرت علی صاحب نے فرمایا کہ ''اگر میرا انتقال ہو جائے تو

(۱) حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء ومشورے سے شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور انھیں کے خلیفہ ومجاز بھی ہوئے۔

مولانا اعظمی سے کہہ دیجیے گا میری نماز جنازہ پڑھادیں گے۔''

چنانچہ اسی رات مولانا نصرت علی صاحب کا انتقال ہوگیا، صبح کو لوگ حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور آپ سے رات کا پورا واقعہ بیان کیا، صوفی صاحب کی آخری خواہش کے مطابق حضرت حدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے ہی آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس واقعہ کے وقت مئو کے مولوی عبدالرزاق صاحب محلّہ علاء الدین پورہ بھی وہاں موجود تھے۔

مندرجہ بالا واقعہ راقم سطور کا خود محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ سے سنا اور تحقیق کیا ہوا ہے۔

المجمع العلمی العراقی کی رکنیت:

عراق کی مشہور علمی اکیڈمی ''المجمع العلمی العراقی'' نے محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات سے متأثر ہوکر اس کا معزز رکن منتخب کیا۔ وہاں کے ڈائرکٹر کے خط کا عربی متن حسب ذیل ہے:

۱۹۸۹/۳/۱۵م

۸/شعبان ۱٤۰۹ھـ

حضرة السيد الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمی

سلام الله عليكم ورحمته وبركاته، وبعد:

يسرنی أن أبلغكم بأن مجلس المجمع العلمی العراقی فی جلسته العاشرة المنعقدة فی الثانی والعشرين من شهر رجب سنة ١٤٠٩هـ الموافق الثامن والعشرين من شهر شباط سنة ١٩٨٩م قرر انتخابكم عضواً مؤازراً فيه تقديراً لمكانتكم العلمية الرفيعة ومجهوداتكم فی ميادين اللغة والثقافة مما يُعنی المجمع بدراسته.

وإننی إذ أهنئكم بهذا الإنتخاب الذی يوثق العلاقة العلمية والثقافية، أرجو تزويد المجمع بموجز عن سيرتكم العلمية وعناوين أبحاثكم المنشورة ليحفظ مع الإعتراز به فی سجلاته.

وتفضلوا بقبول فائق التقدير وأطيب التحيات.

الدكتور صالح أحمد العلی

رئيس المجمع العلمی العراقی

مندرجہ بالا سطور کا مفہوم یہ ہے کہ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کو عراق کی مشہور اور ممتاز علمی اکیڈمی کے ڈائرکٹر نے یہ اطلاق دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ ''المجمع العلمی العراقی''، کی مجلس نے اپنے ایک جلسہ میں آپ کی اعلیٰ ترین علمی اور تحقیقی خدمات اور زبان وادب کے میدان میں آپ کے گراں قدر کارناموں کے اعتراف میں ''المجمع العلمی العراقی'' کا معزز ونامور رُکن منتخب کیا ہے۔ انھوں نے اس انتخاب پر اپنی طرف سے دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے توقع ظاہر کی ہے کہ آپ کی رکنیت سے علمی اور ثقافتی روابط کو انشاءاللہ مزید ترقی ملے گی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ:

''**التنقيد السديد على التفسير الجديد**'' حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب خواجہ عبدالحی پروفیسر جامعہ ملیہ کی تفسیر پر ناقدانہ تبصرہ ہے۔ اس کتاب پر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے مندرجہ ذیل تقریظ رقم فرمائی ہے:

''احقر اشرف علی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایتِ شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا: **قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله، ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين. (مشكوٰة عن البيهقى)**

ماشاء اللہ قوت استدلال، حسن ادا، دفع شبہات، لین کلام، غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بارك الله تعالىٰ فى افادات المصنف وافاضاته.

۲۴ رصفر ۱۳۴۹ھ تھانہ بھون، **وقاها الله عن الفتن**''

(۲) نصرۃ الحدیث (منکرین حدیث کے رد میں) کی بابت حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوب گرامی میں ارشاد فرماتے ہیں:

"میں اپنے ضعف اور عذر سے خود شرمندہ ہوں، اور ہدیہ بسر وچشم قبول کرتا ہوں اور دعائے نافعیت کرتا ہوں۔ جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا"۔(۱)

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ:

"حضرت مولانا عبدالحی چشتی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت شیخ الاسلام فرماتے تھے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی تجویز پر مجلس شوریٰ (دیوبند) میں طے ہو گیا تھا کہ ہر وہ تجویز جس کا تعلق انتظام وانصرام کے بجائے دین وشریعت اور فقہی احکام سے ہو، اس کی تصدیق اور تصویب جب تک محدث اعظمی نہ فرمادیں نافذ العمل نہیں ہوگی"۔(۲)

(۲) مولانا عبدالباری صاحب دارالمصنفین اعظم گڈھ تحریر فرماتے ہیں:

"وہ (حضرت محدث الاعظمی) ایک زمانہ میں رجال پر عربی میں ایک کتاب بھی تالیف فرمارہے تھے، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان صاحب علیہ الرحمہ کے زمانہ قیام میں ان کا اکثر دارالمصنفین میں آنا جانا ہوتا تھا، وہ کتب خانہ میں رجال وطبقات وتراجم کی کتابوں کی الماریوں کے سامنے بیٹھ جاتے تھے اور اپنے کام میں مشغول ہوجاتے تھے، معلوم نہیں وہ پایہ تکمیل کو پہنچی یا نہیں، اس سلسلہ میں دارالمصنفین میں کئی کئی روز قیام ہوجاتا تھا"۔(۳)

اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ دوپہر میں کھانے کا وقت ہوا، دارالمصنفین بند ہوگیا، دسترخوان لگا تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نظر نہیں آرہے ہیں۔ لوگوں نے اِدھر اُدھر تلاش کیا، لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دیکھو کتب خانہ میں نہ ہوں۔ چنانچہ دارالمصنفین دوبارہ کھولا گیا، دیکھا گیا کہ مولانا اعظمی مطالعہ میں غرق ہیں اور ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ کتب خانہ دوبارہ کھولا گیا ہے، جب لوگوں نے آپ کو دوپہر کے کھانے کی اطلاع دی تو حیرت سے پوچھا کہ اچھا کھانے کا وقت ہوگیا۔ اسی زمانہ میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا اس دیار میں آنا ہوا تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ تو ایسے شخص ہیں کہ کتب خانہ میں ہی بند

---

(۱) نصرۃ الحدیث تاثر وتبصرہ طبع سوم (۲) ماہنامہ دارالعلوم دیوبند اپریل ومئی ۱۹۹۲ء
(۳) ریاض الجنۃ مارچ، اپریل ۱۹۸۹ء

ہو جاتے ہیں اور پورا واقعہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ کو سنایا۔ اس پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ جبھی تو اللہ تعالیٰ نے اتنا زبردست علم دیا ہے یا یہ فرمایا کہ اتنا بڑا بنایا ہے۔

امام العصر مولانا انور شاہ کشمیری:

الحاوی لرجال الطحاوی، محدث کبیر رحمۃ اللہ کی نادر اور نرالی تصنیف ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مرتب روداد مدرسہ مفتاح العلوم رقم طراز ہیں:

''طحاوی شریف جو علماء حنفیہ کے نزدیک نہایت مستند و معتبر کتاب ہے، بلکہ مَدرَک و مدار مذہب حنفیہ ہے، جس کے رجال کی تحقیق و تنقید امت محمدیہ پر بمنزلہ قرض کے تھی، آپ نے اس فرض وضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کمال تحقیق و تنقید کے ساتھ اس قرض کو جو صدیوں سے امت پر چلا آ رہا تھا ادا فرمایا۔''(۱)

یہ کتاب امام ابوجعفر طحاوی (متوفی ۳۲۱ھ) کی دو مشہور کتابوں شرح معانی الآثار اور شرح مشکل الآثار کے رجال پر لکھی گئی ہے۔ علامہ بدرالدین عینی نے صرف شرح معانی الآثار کے رجال پر مغانی الاخیار لکھی جس کا قلمی نسخہ دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اور اب طبع ہو چکی ہے۔ شرح مشکل الآثار کے رجال پر پوری دنیا میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ کے علاوہ کسی نے کام نہیں کیا ہے۔ یہ ایسا عظیم کارنامہ ہے جس سے حافظ مزی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی، جیسے ماہرینِ فنِ رجال کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اس کی تالیف ۱۳۴۸ھ میں مکمل ہو گئی تھی۔ جیسا کہ اس کے تاریخی نام ''انــہ والـلّٰــہ تـصنیفٌ شریف''، سے ظاہر ہے، یعنی صرف ۲۹ر سال کی عمر میں یہ کتاب لکھ کر فارغ ہو چکے تھے۔

اس کا کچھ حصہ حضرت مولانا نے اپنے استاذ مشفق بخاری زمانہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ کے پاس نظر ثانی کے لیے بھیجا تھا۔ ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ بیمار پڑ گئے، بواسیر کا سخت حملہ تھا، ڈابھیل سے دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے۔ علامہ اعظمی عیادت کے لیے دیوبند تشریف لے گئے اور بعد نماز عصر شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فرمایا کہاں سے آنا ہوا؟ مولانا نے فرمایا اعظم گڈھ سے۔ شاہ صاحب نے فرمایا وہ مولوی حبیب

---

(۱) روداد مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم مئو، اکتوبر ۱۹۳۰ء ص ۵

الرحمٰن اعظم گڈھی کون ہیں جنھوں نے طحاوی کے رجال پر کام کیا ہے؟ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا خادم حاضر ہے۔ یہ سننا تھا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کن کن کتابوں سے آپ نے مدد لیا ہے۔ فلاں کتاب کہاں سے اور کیسے دستیاب ہوئی۔ غرضیکہ بہت تعجب کے لہجہ میں اس طرح مختلف سوالات کرتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ پورا مسودہ لے کر ڈابھیل تشریف لائیے، انشاء اللہ ضرور نظر ثانی کروں گا۔ لیکن افسوس کہ چند دن کے بعد دیو بند ہی میں حضرت شاہ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے، اور یہ آفتاب علم ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ (۱)

علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ:

شاہ معین الدین ندوی مرحوم سید صاحب کے علمی حلقہ کی تفصیل میں تحریر فرماتے ہیں:

''علمی دائرے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوبکر شیث جون پوری، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ تعلقات تھے''۔ (۲)

پھر شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اگرچہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے لیکن حدیث اور فقہ پر گہری نظر تھی۔ اس لیے سید صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے''۔

ان دونوں بزرگوں کے تعلقات کے عینی شاہد مولانا ابوعلی آصفی (مولانا عبدالباری) دارالمصنفین اعظم گڈھ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا سید سلیمان صاحب علیہ الرحمہ کے زمانہ قیام میں ان (حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی) کا اکثر دارالمصنفین میں آنا جانا ہوتا تھا، دارالمصنفین میں کئی کئی روز قیام ہو جاتا تھا اور اس ضمن میں دونوں باکمالوں میں خوب خوب راز و نیاز کی باتیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے قدرداں، گرویدہ اور شیفتہ ہو گئے، دونوں صاحب ہمہ وقت ایک ساتھ رہتے تھے اور ایک ساتھ فجر کے بعد میلوں ٹہلتے تھے۔''

آخر عمر میں تو سید صاحب ان کے علم و فضل اور تفقہ کے بیت زیادہ قائل اور معترف

(۱) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ص ۲۰۶   (۲) حیات سلیمان ص ۶۳۷

ہو گئے تھے اور اپنی ہر تحریر پر نظر ثانی کے لیے مئو بھیجتے تھے اور ان کی توثیق کے بعد پریس میں دیتے تھے، وہ ان کو دار المصنفین میں اپنا جانشین اور رفقاء اور مصنفین کا نگراں بھی بنانا چاہتے تھے۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اعظم گڈھ کے زمانہ قیام میں ان کا کوئی دوست تھا تو یہی تھے۔ جب وہ اپنی ضرورت کے لیے دار المصنفین آتے تو ان کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے اور لطف صحبت کے لیے ہفتوں ان کو روک لیتے تھے''۔ (۱)

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اس واقعہ سے جہاں ایک طرف حضرت مولانا اعظمی کے علمی مقام اور کمال کا پتہ چلتا ہے، وہیں دوسری طرف سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بے نفس انسان ہونا بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسب علم اور مشورہ میں اپنے چھوٹوں سے بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ انور شاہ کشمیری کے جن تلامذہ کو دائرۂ علم سے تعبیر کیا ہے، ان میں محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی نام ہے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہوں، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوالمآثر محمد حبیب الرحمٰن اعظمی مئو، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، ان میں ہر ایک بجائے خود دائرۂ علم ہے''۔ (۲)

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ آزادی کے بعد کراچی تشریف لے گئے، ایک دفعہ جدائی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مفتی ظفیر الدین صاحب دار العلوم دیوبند کو تحریر فرمایا:

''آپ نے گیلانی جانے کا ذکر کیا ہے، ہندوستان میں ان دوستوں میں سے جن کے جیتے جی چھوٹ جانے کا افسوس ہے۔ ایک مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں اور دوسرے آپ کے استاذ مکرم مولانا حبیب الرحمٰن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ہندوستان کے مسلمانوں

---

(۱) ریاض الجنۃ مارچ، اپریل ۱۹۸۹ء ص ۳۷

(۲) معارف نومبر ۱۹۶۷ء ص ۳۵۰ بحوالہ یادرفتگاں طبع کراچی ۱۹۵۵ء ص ۴۵۳

کو مستفید فرمائے''۔ (۱)

علامہ شبیر احمد عثمانی:

اعلام مرفوعہ، حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مجلس کی تین طلاقوں کے باب میں موافق اور مخالف دلائل پر محققانہ تبصرہ ہے۔ نیز احادیث اور آثار کی روشنی میں وقوع طلاق ثلاثہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ثابت کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین میں مسلم شریف کا درس دیتے وقت جب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث آتی جسے غیر مقلدین حضرات ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک طلاق ثابت کرنے کے لیے بطور دلیل پیش کرتے ہیں تو علامہ عثمانی فرمایا کرتے تھے:

''اس حدیث کی بہترین توضیح اور تشریح کے لیے مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی کی اعلام مرفوعہ دیکھو۔ اس سے بہتر توضیح کسی نے نہیں کی یا یہ فرمایا، کہ اس سے بہتر توضیح میں بھی نہیں کر سکتا''۔ (۲)

الحاوی لرجال الطحاوی کے متعلق علامہ شبیر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

کاش (الحاوی) چھپ جاتی تو ہم کو بھی اپنے کام میں مدد ملتی، حق تعالیٰ کوئی سامان فرمادیں۔ (المآثر ج ۷ ش ۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ:

سنن سعید بن منصور پر تبصرہ کرتے ہوئے ''صدق جدید'' میں رقم طراز ہیں:

''ہندوستان کے خادمان حدیث اور ماہرین علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست تیار کی جائے، تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن (مئو ضلع مئو) ہوگا''۔ (۳)

مسند حمیدی جلد ثانی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس نایاب مسند کا پتہ لگانا بجائے خود ایک کارنامہ تھا، چہ جائیکہ اس کی پوری ترتیب وتہذیب، تصحیح ومقابلہ، تحشیہ اور متعدد فہرستوں اور اشاریہ دیباچہ وغیرہ کا اضافہ، یہ سعادت

(۱) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ص ۱۵۸
(۲) ترجمان الاسلام محدث اعظمی نمبر ص ۱۸۴
(۳) صدق جدید ۲؍ اگست ۱۹۶۸ء

وکرامت ایک ہندوستانی محقق مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے حصہ میں آئی، جس پر انھیں علمی ودینی طبقہ کی طرف سے جتنی بھی مبارک باد دی جائے کم ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

''علمی تحقیق وتدقیق اب تک مستشرقین ہی کا حصہ سمجھی جاتی رہی ہے، مولانا اعظمی سلمہ اللہ نے عین اُسی رنگ میں ڈوب کر ہندوستان کا نام سارے عالم اسلامی میں بلند کردیا ہے''۔(۱)

کتاب الزہدوالرقائق پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ہفتہ وار جریدہ ''صدق جدید'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''محدث وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی خدمات فن حدیث میں یوں بھی کچھ کم نہ تھیں، مستحق تہنئت وتبریک ہیں کہ اس نادر کتاب کی بھی تدوین کی سعادت انھیں کے حصہ میں آئی۔

کتاب اس قابل ہے کہ یورپ اور امریکہ جائے اور وہاں کے ماہرین اسلامیات دیکھیں کہ ہندوستان کے ایک قصبہ میں بیٹھ کر ایک گوشہ نشین نے وہ کام کردیا جو مستشرقین اپنے لامحدود ذرائع کے بعد ہی انجام دے پاتے ہیں۔(۲)

محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی گرانقدر خدمات پر حیرت واستعجاب کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''حیرت ہوتی ہے ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہوگئی ہے۔''(۳)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ **المطالب العالیه بزوائد المسانید الثمانية** پر تبصرہ کرتے ہوئے ''برہان'' میں رقم طراز ہیں:

''الشیخ الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ان محققین علماء میں سے ہیں جو اگرچہ اپنے

(۱) صدق جدید ۶/مارچ ۱۹۶۴ء

(۲) صدق جدید ۲/جون ۱۹۶۷ء

(۳) صدق جدید ۲/اگست ۱۹۶۸ء

وطن میں ''غریب شہر'' ہیں، لیکن عرب مما لک میں ان کے علم وفضل اور شہرت اور عظمت کا طوطی بولتا ہے اور اس شہرت وعظمت کی بنیاد حدیث کی وہ نادر اور اہم کتابیں ہیں جن کے مخطوطات کو آپ نے تحقیق وترتیب کے موجودہ علمی اصول کے مطابق ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔''(۱)

آپ کی کتاب ''صدیق اکبر'' جب پہلی بار طبع ہوئی تو اس میں بہت سی خامیاں اور غلطیاں رہ گئی تھیں۔ بہت سے اہل علم حضرات نے آپ کی توجہ اس طرف مبذول فرمائی، تصحیح کے لیے آپ کی نگاہ محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی جس کی تفصیل خود انہی کی زبانی سنیے:

''پھر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو-جن سے بڑھ کر فن حدیث اور اسماء الرجال کا محقق اور مبصر میرے نزدیک آج انڈو پاک میں کوئی عالم نہیں ہے- دیرینہ نیاز مندی کی بنا پر خط لکھا:

''اگر آپ صدیق اکبرؓ کو ایک مرتبہ ملاحظہ فرمالیں تو مجھے اطمینان ہو جائے۔ مولانا نے ازراہ شفقت بزرگانہ میری درخواست کو قبول فرمایا اور کتاب کا ایک ایک ورق پڑھ کر غلطیوں سے آگاہ فرمایا۔ میں نے نظر ثانی میں مولانا کے خط سے مکمل استفادہ کیا ہے اور اس غیر معمولی توجہ اور زحمت فرمائی کے لیے صمیم قلب سے شکر گذار ہوں''۔(۲)

محمد بن سعد المتوفی ۲۳۰ھ (واقدی کے شاگرد اور کاتب) کی کتاب 'طبقات بن سعد' صحابہ اور تابعین کے حالات وسوانح پر نہایت جامع اور مستند کتاب ہے۔ جرمنی کے پروفیسر سخاؤ نے ایڈٹ کر کے اس کو بارہ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس کے متعلق مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری نے اپنی کتاب ''اصح السیر'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ طبقات ابن سعد کو ایک غیر مسلم نے ایڈٹ کر کے چھاپا ہے، اس لیے یہ ایڈیشن معتبر اور مستند نہیں، کیونکہ اس میں ایڈیٹر نے کمی بیشی کر دی ہوگی۔ اس کے متعلق مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی جو اس زمانہ کے نامور محدث اور محقق ہیں، میں نے ایک خط کے ذریعہ ان سے اس بارے میں استصواب کیا تو مولانا نے تحریر فرمایا:

(۱) برہان دہلی، اپریل ۱۹۷۴ء (۲) مقدمہ صدیق اکبر طبع دوم

''پروفیسر سخاؤ پر شبہہ اور بدگمانی بالکل بے جا ہے، میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوطہ کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے دونوں میں عدم مطابقت نہیں پائی''۔

پھر حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اسی خط میں مولانا (اعظمی) محمد بن اسحاق اور واقدی کے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں:

''اگر چہ یہ دونوں حضرات بحیثیت محدث متکلم فیہ ہیں، لیکن بحیثیت مؤرخ ان کی عظمت مسلم ہے اور اس میں کلام نہیں ہوسکتا۔ (۱)

شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند:

حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ پڑھنے کے لیے جس وقت دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، داخلہ فارم میں ایک کالم عربی ادب کا تھا، حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ پہلے سے وہاں مقیم تھے، اس لیے انھوں نے مشورہ دیا کہ اس خانہ میں آپ لکھ دیں کہ مجھے ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ واضح رہے کہ علامہ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ دونوں ہی حضرت مولانا عبدالغفار صاحب رحمۃ اللہ علیہ مئوی کے شاگرد ہیں، اس لیے علامہ بلیاوی حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے علو استعداد سے واقف تھے اور حضرت محدث کبیر نے علامہ کے مشورہ پر لکھ دیا کہ مجھے ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جب یہ فارم شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا تو شیخ الادب نے حیرت سے فرماا کہ ایسا کون سا لڑکا ہے جس کو ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ الادب رحمۃ اللہ علیہ نے محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کو بلوا بھیجا۔ اس واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے حضرت محدث کبیر نے راقم سے فرمایا کہ اس وقت مجھے بخار تھا اور جب درسگاہ میں پہنچا تو حماسہ کا درس ہورہا تھا۔ شیخ الادب نے وہیں پر لڑکوں کے سامنے میرا امتحان لینا شروع کیا۔ اور جن چیزوں کو ہم نے پڑھا بھی نہیں تھا اس کو پوچھنا شروع کیا۔ شیخ الادب نے صرف، نحو، لغت، بلاغت غرضیکہ ادب کے ہر شعبہ میں امتحان لیا۔ محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی بتائے اور شیخ الادب کے تمام سوالوں کا نہایت ہی شافی جواب دیا۔ بہت دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شیخ الادب، محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت اور غیر معمولی استعداد دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اخیر میں داخلہ فارم پر لکھ دیا کہ واقعی اس لڑکے کو ادب

---

(۱) عثمان ذوالنورین ص۲۴

پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تھی محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی طالب علمی۔

مولانا عامر عثمانی مرحوم:

''تجلی'' (دیوبند) کے ایڈیٹر تھے، محدث کبیر الاعظمی کی کتاب ''رکعات تراویح'' پر تبصرہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا اعظمی فن حدیث میں قابل رشک، براعت ومہارت کے سرمایہ دار ہیں اور صرف ہندوپاک ہی کے نہیں دنیائے عرب کے ارباب نظر بھی ان کے کمال تبحر کے معترف ہیں''۔

آگے محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کمال کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی دقیق اور نازک نکات فن کو بھی اس سلاست وبلاغت کے ساتھ سپرد قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی کے بغیر بات آئینہ ہوجاتی ہے۔ ان کی قوت حافظہ کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن ان کے رشحات قلم میں فراست کا جو نور، جو گیرائی، جو عبور اور جو کامل دسترس پائی جاتی ہے اس سے خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ وہی روشن دراست، وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت اور وہی شان نقد''۔(۱)

''رکعات تراویح'' کی بابت تحریر فرماتے ہیں:

''امام عصر مولانا اعظمی کی تالیف ''رکعات تراویح'' ایک بیش بہا کتاب ہے... ٹھوس اور گہرا علم رکھنے والے بشرطیکہ علم کو سہارنے والا مضبوط دماغ بھی ان کے پاس ہو، انشاء اللہ یہی کہیں گے کہ مولانا اعظمی نے مسلک حنفی کے احقاق کا حق ادا کردیا ہے''۔

پھر ان کے ساتھ اپنی گرویدگی اور عقیدت مندی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''کاش مولانا اعظمی قریب ہوتے تو ہم ان سے بہت سیکھتے، آس پاس اونچی دکان والے تو بہت ہیں، مگر علم وتفقہ کی ایسی دکانیں اب نایاب ہوتی جارہی ہیں جن کا پکوان پھیکا نہ ہو، ہمارا تو خیال یہ ہے کہ اب زمانہ ہم جیسے نام کے علامہ تو ضرور پیدا کرے گا، شمس العلماء، حکیم الاسلام، ارسطوئے

---

(۱) تجلی دیوبند اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۵۵

دوراں اور مٹی کے بقراط بھی ضرور جنم لیتے ہی رہیں گے، لیکن انور شاہ کشمیری، شبیر احمد عثمانی اور حبیب الرحمٰن الاعظمی جیسے لوگوں کی مسند نہ جانے کب تک خالی رہے گی۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا ''ان کے بعد''(۱)

اخیر میں چند مبشرات ذکر کر کے مضمون ختم کرتا ہوں:

(۱) مولانا انظر صاحب شاگرد حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ واستاذ مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو راوی ہیں کہ ایک بار محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ، مولانا حکیم سعد اللہ صاحب مرحوم (جو شہر کے نامور حکیم اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے) نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مئو تشریف لائے ہوئے ہیں اور محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ سے ضیافت فرما رہے ہیں۔

حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ اس خواب کو بیان کر کے آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ خواب کی تعبیر ظاہر ہے کہ میں نے دنیا نہیں کمائی ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اتنی عمر اس فن (حدیث شریف) میں لگانے کے بعد اتنا بھی نصیب نہ ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ میں نے سب کچھ گنوا دیا اور کچھ نہ پایا۔

(۲) مفتی محمود صاحب مدرس مدرسہ مرقاۃ العلوم راوی ہیں کہ مولانا عبید اللہ آسامی جو کسی مدرسہ میں بڑے استاذ تھے، حضرت محدث کبیر سے حدیث شریف پڑھنے اور استفادہ کرنے کی غرض سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ انھوں نے دوران قیام خواب دیکھا کہ محدث امام داؤد ظاہری جو بڑے محدث گذرے ہیں، خواب میں فرما رہے ہیں کہ مولانا (اعظمی رحمۃ اللہ علیہ) کو میرا سلام کہہ دیجیے۔ انھوں نے جب اپنا خواب محدث کبیر سے بیان فرمایا تو بعد میں حضرت محدث کبیر نے بھی بطور تحدیث بالنعمت کے یہ خواب اپنے شاگردوں سے بیان فرمایا۔

(۳) مولوی سراج صاحب مالیگاؤں سے اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہم لوگ مولانا عبد الستار صاحب (سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے پاس بخاری شریف پڑھ رہے تھے۔ راویوں پر بحث کے دوران ابوالیمان حمصی کا تذکرہ آیا جو

(۱) تجلی دیوبند اکتوبر ۱۹۶۳ء

امام بخاری کے استاذ اور بڑے عالی مرتبت شخص ہیں۔ اسی دوران مولانا سراج صاحب نے خواب دیکھا کہ کوئی کہہ رہا کہ حدثنا ابو الیمان اور مذکورہ راوی اپنے گھر کے دروازہ پر نظر آنے لگے۔ داڑھی ٹھڈی پر تھی، بھر کلہ نہیں تھی، سر کے بال آگے نہیں تھے، سر کے پچھلے حصہ میں نصف دائرہ میں تھے، جیسا کہ ذہین لوگوں کا ہوتا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ آپ تشریف فرما ہیں۔ معاً بعد دیکھا کہ ان کی جگہ محدث کبیر ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی تشریف فرما ہیں۔ تعبیر بتلانے والے مولوی صاحب نے کہا کہ ابوالیمان امام بخاری کے استاذ ہیں اور فی زماننا وہی مرتبہ حضرت موصوف کا ہے۔ اس سے ان کی جلالت شان کا پتہ چلتا ہے۔

۸ر ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
۱۸ر ستمبر ۱۹۹۱ء

☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆

صفحہ ۳۴۲ کا بقیہ

اس وقت لوگوں کو علم ہوا کہ وہ اپنے وقت کے امام زیلعی رحمۃ اللہ علیہ، علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ، اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

ناگپور میں ان کی یادگار دارالعلوم مومن پورہ ہے جو کئی سال سے علم دین کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ حسنِ اتفاق تو دیکھیے کہ مولانا کا یہ ادنی عقیدت منداس عظیم الشان دینی ادارے کا یکم نومبر ۱۹۹۶ء سے ۶ جولائی ۲۰۰۳ء تک ناظم اور ۶ جولائی ۲۰۰۳ء سے ۲ جولائی ۲۰۰۶ء تک صدر رہا۔ ان کی چھوڑی ہوئی علمی میراث کا نگراں رہا۔ جب بھی اپنے کمرے میں داخل ہوتا نگاہ سب سے پہلے اس سنگِ بنیاد پر پڑتی جس پر ان کا اسمِ گرامی کندہ ہے۔ یوں ان کی یاد ہر لمحہ تازہ ہوتی رہتی۔ ان کی یاد آج بھی میرے دل میں جاگزیں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

محدث کبیر الاعظمی

مولانا محمد عثمان صاحب معروفی رحمۃ اللہ علیہ ☆

محدث کبیر کے حالات پر میرا مفصل مضمون ۸؍مئی ۱۹۹۲ء کے الجمعیۃ دہلی میں طبع ہوا تھا، وہی مضمون افادیت کے پیش نظر قومی آواز لکھنؤ اور دعوت دہلی کے ۲۵؍مئی کے شماروں میں بھی نقل ہوا۔ اب پھر اسی سے اور ترجمان الاسلام بنارس کے اعظمی نمبر سے قدرے اقتباس کرکے نہایت مختصر ضروری معلومات ہدیۂ ناظرین کررہا ہوں۔

محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مئوناتھ بھنجن پٹھان ٹولہ کے ایک معزز دینی وعلمی خاندان میں ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام اختر حسن ہے، آپ کے والد مولانا محمد صابر م ۱۳۶۵ھ بہت پرہیزگار اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ م ۱۳۶۲ھ کے مرید تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم والد محترم ہی سے حاصل کی اور ان کی تربیت وسرپرستی ۴۶؍برس کی عمر تک قائم رہی۔

مدرسہ فیضان العلوم بہادر گنج غازی پور میں عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا ابوالحسن صاحب عراقی مئوی م ۱۳۶۱ھ سے پڑھیں، پھر حضرت گنگوہی م ۱۳۲۳ھ کے تلمیذ مولانا عبدالغفار بن عبداللہ عراقی مئوی م ۱۳۴۱ھ سے مئو، گورکھپور اور مظہر العلوم بنارس میں ادب وغیرہ کی بیشتر کتابیں پڑھیں۔ مظہر العلوم ہی سے ۱۹۱۸ء میں مُلّا اور ۱۹۱۹ء میں مُلّا فاضل کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔

شوال ۱۳۳۷ھ جولائی ۱۹۱۹ء میں دارالعلوم دیوبند گئے، امتحان داخلہ میں امتیازی نمبر حاصل کیا تو دوبارہ حضرت شیخ الادب م ۱۳۷۴ھ نے مقامات حریری، دیوان متنبّی ودیوان حماسہ میں سخت امتحان لیا، تو پہلے سے زیادہ نمبر دے دیا۔

دیوبند میں علم ہیئت مولانا نبیہ حسن صاحب سے، جلالین مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سے اور بیضاوی مولانا غلام رسول صاحب سے پڑھی۔ اس سال مدرسہ میں فصلی بیماری پھوٹ پڑی، آپ بھی

☆ سابق استاد مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور

سخت بیمار ہوکر اواخر صفر میں گھر چلے آئے۔ صحت یاب ہوئے تو جمادی الاولی ۱۳۳۸ھ فروری ۱۹۲۰ء سے مظہر العلوم بنارس میں پندرہ روپیہ مشاہرہ پر مدرسی شروع کردی۔

ڈیڑھ سال مدرسی کے بعد شوال ۱۳۳۹ھ جون ۱۹۲۱ء میں دوبارہ دارالعلوم دیوبند جاکر دورۂ حدیث میں داخلہ لیا۔ علامہ انور کشمیری رحمۃ اللہ م ۱۳۵۲ھ سے ترمذی، علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ م ۱۳۶۹ھ سے مسلم اور میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ م ۱۳۶۴ھ سے ابوداؤد پڑھی۔

تحریک ترک موالات کی وجہ سے یہ زمانہ بڑا ہنگامہ خیز تھا، آپ کے سامنے حضرت شیخ الاسلام م ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء دیوبند سے ۱۵ر محرم ۱۳۴۰ھ ۱۸ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کرکے کراچی جیل بھیج دیے گئے، پھر ادھر آپ بیمار بھی پڑ گئے، تو بحکم والد مدرسہ سے رخصت لے کر ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں گھر چلے آئے۔

صحت کے بعد دارالعلوم مئو میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ م ۱۳۳۹ھ = ۱۹۲۰ء کے شاگرد مولانا کریم بخش سنبھلی رحمۃ اللہ سے بخاری وترمذی پڑھ کر شعبان ۱۳۴۰ھ اپریل ۱۹۲۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے، پھر یہیں مولانا سنبھلی سے قاضی حمد اللہ، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ کتب معقولات پڑھیں۔ ترمذی شریف علامہ کشمیری، مولانا سنبھلی رحمۃ اللہ اور مولانا عبدالغفار مئوی رحمۃ اللہ علیہ تین اساتذہ سے پڑھی۔ آپ کو سند واجازتِ حدیث مولانا سنبھلی رحمۃ اللہ، مولانا مئوی رحمۃ اللہ، اور مولانا عبدالرحمٰن بھوپالی رحمۃ اللہ سے ملی۔

فراغت کے بعد ہی شوال ۱۳۴۰ھ جون ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم مئو میں درجۂ علیا کے مدرس منتخب ہوئے، یہیں مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا محمد حسین بہاری سابق استاذ دارالعلوم دیوبند نے آپ سے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ دو برس کے بعد دارالعلوم مئو سے مستعفی ہوکر ۱۳۴۳ھ = ۱۹۲۵ء میں مظہر العلوم بنارس میں صدر المدرسین کے منصب پر فائز ہوئے، یہاں دوبارہ چار برس تدریسی خدمات انجام دیں، جونہی یہاں سے الگ ہوئے، طلبہ اور استاذ محترم مولانا ابوالحسن مئوی ناظم مفتاح العلوم مئو کے سخت اصرار سے شوال ۱۳۴۷ھ مارچ ۱۹۲۹ء سے مفتاح العلوم مئو کے صدر المدرسین مقرر ہوئے، اسی سال دورۂ حدیث جاری ہوا، اور مدرسہ کی نشأۃ ثانیہ ہوئی اور مدرسہ بہت جلد جامعہ بن گیا، یہیں سے آپ "بڑے مولانا" کے نام سے مشہور ہوئے، یہاں بائیس برس تک شیخ الحدیث، شیخ الجامعہ اور کبھی مہتمم رہ کر تدریس اور تصنیف وتالیف کا معیاری کام انجام دیا۔ بخاری وترمذی مکمل، ان

کے علاوہ جلالین، دیوان حماسہ وغیرہ مستقل زیر درس رہیں۔

۱۳۶۹ھ = ۱۹۵۰ء میں یہاں سے مستعفی ہوکر اپنے مکان میں تصنیف وتالیف میں منہمک ہو گئے۔

آپ کی طلب وخواہش کے بغیر مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے یوپی اسمبلی کا ممبر کانگریس نامزد کردیا، آپ نے کامیابی کے لیے کوئی بھی کوشش نہیں کی، مگر فروری ۱۹۵۲ء = ۱۳۷۱ھ کے جنرل الیکشن میں نوامیدواروں کے مقابلہ میں چھ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ ۱۳۷۶ھ = ۱۹۵۷ء تک اسمبلی کے ممبر رہے، اس دوران دارالمبلغین، اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اعزازی تدریس اور کتب بینی کرتے۔ مولانا علی میاں کے اصرار پر ندوہ میں ایک سال اعزازی درس بخاری بھی دیا۔

یکم ذوالحجہ ۱۳۹۲ھ ۷؍جنوری ۱۹۷۳ء کو جب آپ کے رفیق خاص مولانا عبداللطیف نعمانی مہتمم وصدر المدرسین مفتاح العلوم مئو رحلت فرما گئے تو پھر دوبارہ آپ اس کے مہتمم اور شیخ الجامعہ بنادیے گئے۔ چند سال تعلیمی وتنظیمی خدمت کر کے اس سے بعض وجوہ سے علیحدہ ہو گئے اور ۱۴۰۰ھ = ۱۹۸۰ء میں مئو کے اندر معیاری تعلیم کے لیے مرقاۃ العلوم اور المعہد العالی قائم کیا اور اس کی تعمیری، تنظیمی وتعلیمی ذمہ داری تاحیات سنبھالی۔ بخاری، ترمذی ہدایہ اخیرین وغیرہ خود پڑھاتے رہے۔ مدرسہ سے متصل ایک عظیم الشان وسیع وعریض جامع مسجد بنوائی۔

۱۳۷۳ھ = ۱۹۵۳ء سے ورکنگ کمیٹی جمعیۃ علماء ہند اور مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے تاحیات رکن رکین رہے، زیادہ تر آپ کی زیر صدارت مجلس شوریٰ منعقد ہوتی رہی۔

۱۳۶۴ھ = ۱۹۴۵ء میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ م ۱۴۰۳ھ = ۱۹۸۳ء نے مئو تشریف لاکر دارالعلوم دیوبند کے لیے صدارت افتاء کا منصب پیش کیا، پھر حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی م ۱۳۸۷ھ = ۱۹۵۳ء کے انتقال کے بعد صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کا عہدہ تجویز کیا گیا، مگر آپ نے عذر مقبول پیش کردیا۔

سعودی عرب، کویت، مصر وغیرہ کی بڑی بڑی تنخواہ اور بھتہ قبول نہیں کیا (اعظمی نمبر ص ۱۶۰)

مدینہ یونیورسٹی کی صدارت کے لیے ۲۰؍ ہزار ریال تنخواہ مع لوازم رہائش وغیرہ وہاں کی کمیٹی نے پیش کیا، مگر معذرت کردی (اعظمی نمبر ص ۱۶۸)

مشہور علمی اکیڈمی المجمع العلمی العراقی کے معزز رکن منتخب کیے گئے (اعظمی نمبر ص ۲۰۹)
حکومت ہند نے ۱۴۰۴ھ = ۱۹۸۴ء میں آپ کی علمی وتحقیقی خدمات پر اعزازی ایوارڈ عطا کیا۔

۲۸/صفر ۱۴۰۷ھ ۲/نومبر ۱۹۸۶ء کو کل ہند اجتماع دہلی میں بالاتفاق آپ امیر شریعت اور امیر الہند منتخب کیے گئے، حالانکہ آپ وہاں موجود بھی نہ تھے۔

جمعیۃ علماء ہند کے اکثر جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کرتے اور جمعیۃ کو مفید مشوروں سے نوازتے رہتے۔

قرب وجوار اور دور دراز علاقوں میں واعظ وخطیب اور مناظر کی حیثیت سے بھی تشریف لے جاتے، آخر میں بضرورت شدیدہ کسی مسجد ومدرسہ کا سنگ بنیاد رکھنے یا کسی اجلاس کا صدارتی افتتاح کرنے یا کہیں بخاری ختم کرانے یا کسی کی نماز جنازہ پڑھانے چلے جاتے تھے۔ بعد نماز جمعہ بالخصوص رمضان میں وعظ فرمایا کرتے، جس کے لیے دور دراز سے لوگ آکر آپ کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ شدت سے ادا کرتے تھے، اس میں کوئی بڑے سے بڑا شخص حائل نہیں ہوسکتا تھا، بڑے بڑے سیٹھوں کو تنبیہ کرتے کئی بار میں نے دیکھا۔

رافضیوں، رضا خانیوں اور غیر مقلدوں کے رد میں تحریری وتقریری عظیم کارنامہ انجام دیا اور ان کے ساتھ مناظروں میں ہمیشہ آپ ہی کامیاب رہے۔ ۲۴/۲۵/۲۶/ جمادی الاخری ۱۳۵۲ھ ۱۵/۱۶/۱۷/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ادری ضلع مئو میں مشہور مناظرہ ہوا، رضا خانی علماء مولوی حشمت علی ومولوی نعیم الدین وغیرہ شکست کھا کر چھپ کے بھاگ گئے۔ ۱۳۶۴ء = ۱۹۴۵ء میں ضلع بستی میں رضا خانیوں کو شکست فاش دی۔ مہوہ بسم اللہ ضلع گونڈہ میں آپ کو قرأت فاتحہ خلف الامام کا موضوع دیا گیا، اپنی طویل تقریر میں غیر مقلدین کے عظیم مجمع میں بہت سی حدیثوں سے مذہب احناف کو ایسا مبرہن کیا کہ غیر مقلدین علماء مولانا ثناءاللہ امرتسری وغیرہ جوابی تقریر ہی نہ کرسکے۔

کتب بینی آپ کا محبوب مشغلہ تھا، جہاں جاتے وہاں کے کتب خانوں سے خوب استفادہ کرتے، خاص کر مخطوطات اور قدیم قلمی کتابوں سے۔

حافظہ ایسا قوی کہ کتاب از براور ان کا حوالہ بقید صفحات وسطور۔ حافظہ کا امتحان دور متعلمی

میں مئو کے ایک شاعر نے یوں لیا کہ اپنی نئی نظم مشاعرہ میں سنا کر کہا کہ اس کو سناؤ! آپ نے اسٹیج پر وہ نظم حرف بحرف سنادی (اعظمی نمبر ص ۱۳۹)

آپ ایک عظیم المرتبہ جلیل القدر مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، مناظر، مبلغ، واعظ، مدرس، مؤلف، مصنف، محقق، نقاد، خطیب، ادیب، شاعر، مؤرخ اور اسماء الرجال کے زبردست عالم تھے۔ تدریس میں اور پھر شغل تدریس ترک کر کے صرف تصنیف وتالیف وتحقیق اور تنقیح وتصحیح میں زندگی وقف کردی۔

نام ونمود کی شہرتوں، مال وزر کی رغبتوں، منصب وعہدہ کے اعزازوں اور بڑی بڑی ملازمتوں کی پیش کشوں کو ٹھکرا کر اپنے سفالہ پوش مکان میں گوشہ نشین ہو کر علمی وتحقیقی وہ کام انجام دیا، جو بڑی بڑی اکیڈمیاں نہیں کرسکتیں۔

گوشہ نشینی کے باوجود بیرونی واردین کے ذریعہ باہر کے حالات سے بھی بے خبر نہیں رہتے تھے۔

دیگر مصنفین کے اصرار سے عدیم الفرصتی کے باوجود ان کی کتابوں پر نظر ثانی بھی کیا کرتے تھے، جیسے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی کتاب ''صدیق اکبر''، مولانا محمد میاں صاحب کی کتاب ''عہد زریں'' اور خاکسار کی کتاب ''حیات طاہر''، ''ایک عالمی تاریخ''، ''مشاہیر کو پا گنج'' وغیرہ۔

رویت ہلال میں آپ کا فیصلہ قریب کے چند اضلاع میں ایسا نافذ ہوتا کہ اختلاف کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔

تزکیہ نفس اور احسان وسلوک میں آپ کو بیعت واجازت کا شرف حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل تھا، پھر مکہ مکرمہ کے ایک سفر میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب م ۱۳۱۷ھ کے خلیفہ قاری منیر الدین صاحب نے اجازت وخلافت سے نوازا (اعظمی نمبر ص ۳۴ و ص ۲۳۴) حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد احسان وسلوک کا سلسلہ حضرت مولانا وصی اللہ فتح پوری رحمۃ اللہ علیہ م ۱۳۸۷ھ اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی م ۱۴۱۲ھ کے ساتھ قائم رہا۔ (۱)

۱۳۶۹ھ = ۱۹۵۰ء میں حج بیت اللہ کیا، پھر بار ہا اس سعادت سے سرفراز ہوئے۔ اپنی کتابوں کی طباعت ونگرانی کے لیے بیروت وحلب گئے، دمشق، صیدا، بعلبک، لاذقیہ، بحرین، مصر وغیرہ کا سفر کیا۔ یہ اسفار علمی افادہ واستفادہ سے بھرپور اور حسب موقع حج وزیارت کے بھی حامل

(۱) حضرت مولانا پرتاب گڈھی کے ساتھ صرف معاصرانہ تعلقات تھے، احسان وسلوک کا تعلق نہیں تھا (مسعود الاعظمی

رہے۔ایام حج میں مدرسہ فخریہ نزد حرم شریف میں جب آپ مقیم ہوتے تو مصر، شام، افریقہ وحجاز کے اہل علم آپ سے استفادہ کرتے اور روایت حدیث کی سند لیتے (اعظمی نمبر ص ۴۷)

شیخ ازہر عبدالحلیم محمود نے مصر سے ہندوستان آکر آپ سے سند واجازتِ حدیث حاصل کی، دستارِ فضیلت بندھوائی اور مصر کی دعوت دی (اعظمی نمبر ص ۱۵۲)

اجازتِ حدیث لینے والے بعض لوگوں کے نام: شیخ عبدالفتاح ابوغدہ شامی، شیخ اسماعیل انصاری ریاض، شیخ حماد انصاری استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ، شیخ سعدی ہاشمی مدرس جامعہ اسلامیہ مدینہ، شیخ عبدالعزیز ابوعیون السود حمص، سید صبحی السامرائی بغداد، شیخ حمدی عبدالمجید بغداد، استاذ زہیر الشاویش بیروت، استاذ عبدالستار ابوغدہ کویت، شیخ محمد علوی مالکی مکہ مکرمہ، شیخ محمد عوامہ مدینہ، شیخ نورالدین عتر دمشق، ڈاکٹر عبداللہ الجبوری ریاض، ڈاکٹر بشار عواد معروف بغداد، شیخ عبداللہ سراجی حلبی، شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ الحرم محمد امین کتبی مکی، شیخ محمد مغربی مکی، شیخ عبدالرحمٰن یمانی، شیخ ناصرالدین البانی، شیخ محمد علی حرکان قاضی جدہ، شیخ ابویسر عابدین دمشق، شیخ امین حسینی مفتی فلسطین، شیخ حسن خالد مفتی لبنان وغیرہ اور بہت سے اہل علم ہیں۔

استاذی مولانا عبدالستار صاحب معروفی سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ نے مجھ سے فرمایا کہ علم حدیث میں مجھے سب سے زیادہ فائدہ محدث اعظمی کی کتابوں سے ہوا۔

محدث کبیر کے علم وفضل کا جن اکابر علماء نے اعتراف کیا۔ان میں سے بعض حضرات کا مختصر بیان: شیخ الازہر عبدالحلیم محمود نے مکہ مکرمہ کی ایک علمی مجلس میں کہا کہ آج پورے عالم میں علم حدیث کے اندر آپ کا نام سب سے بڑی سند رکھتا ہے۔

اسی طرح مدیر الازہر نے مصر میں علماء عرب سے تعارف کرایا: **هـذا كبير المحدثين في العالم وأكبر هم في الهند** (اعظمی نمبر ص ۲۲)

محدث احمد محمد شاکر مصری کی تحریر: **انتـم كـمـا رأيـت من عملكم من أعظم العلماء بها في هذا العصر.**

مولانا ابوالوفا افغانی نے لکھا: **قل له نظير في علماء زماننا.**

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ حلبی کی تحریر: **العـلامة الـمـحدث البارع الفقيه الشيخ حبيب**

الرحمن الاعظمی صاحب التعلیقات البدیعة والتحقیقات النادرة، العالم بالرجال والعلل، وتعلیقاته السنیة .... کلها تنطق بسمو فضله وبسطة یدیه فی هذا العلم الشریف (اعظمی نمبر ص ۱۵۵)

ایک بار سفر حج میں شیخ عرب علامہ محدث ابن باز نابینا سے ملنے گئے، وہ اپنی مسند پر بیٹھے دیگر علماء سے ملتے رہے، جب آپ کا نمبر آیا تو کھڑے ہوئے، معانقہ کیا اور اپنی مسند پر بٹھا کر معذرت کی کہ مجھے علم ہوتا تو آپ سے ملنے کے لیے خود حاضر ہوتا (اعظمی نمبر ص ۱۶۶)

شیخ حرم سید علوی مالکی آپ سے لپٹ کر رونے لگے اور فرمایا: ''میں یقین دلاتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ آپ سے راضی ہیں''۔ (اعظمی نمبر ص ۲۷۷)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی کتاب ''التنقید السدید علی التفسیر الجدید'' پڑھ کر لکھا: ''ماشاء اللہ قوت استدلال، حسن ادا، رفع شبہات، لین کلام، غرض ہر پہلو سے اس شعر کا نمونہ پایا۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست''

اسی طرح آپ کی کتاب ''نصرۃ الحدیث'' دیکھ کر لکھا کہ ''بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محققانہ نہیں لکھ سکتا''۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی م ۱۳۹۷ھ نے تحریر کیا: ''ہندوستان کے خادمان حدیث اور ماہرین علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست تیار کی جائے، تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا ہوگا''۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی م ۱۴۰۵ھ نے لکھا۔ ''مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی جن سے بڑھ کر فن حدیث اور اسماء الرجال کا محقق اور مبصر میرے نزدیک آج انڈو پاک میں کوئی عالم نہیں''۔ (اعظمی نمبر ص ۱۵۸)

آپ کی کتاب ''رکعات تراویح'' کے تبصرہ میں مولانا عامر عثمانی نے لکھا: ''آس پاس اونچی دکان والے تو بہت ہیں، لیکن علم وتفقہ کی ایسی دکانیں اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں جن کا پکوان پھیکا نہ ہو۔ ہمارا تو خیال ہے کہ اب .....انور شاہ کشمیری، شبیر احمد عثمانی اور حبیب الرحمٰن الاعظمی جیسے لوگوں کی مسند نہ جانے کب تک خالی رہے گی''۔ (اعظمی نمبر ص ۲۰۹)

بہت سی کتابوں پر آپ کی تحقیقات وتعلیقات طبع ہوکر عالم اسلام میں خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ محدث کبیر کی کتابوں کے نام عام معلومات کے لیے درج ذیل ہیں: (۱) مسند حمیدی ۲ جلدیں، (۲) انتقاء الترغیب والترہیب لابن حجر، (۳) کتاب الزہد والرقائق لابن مبارک، (۴) سنن سعید بن منصور ۲ جلدیں، (۵) المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیۃ لابن حجر ۴ جلدیں، (۶) تلخیص خواتم جامع الاصول للمحدث محمد طاہر الفتنی، (۷) مصنف عبدالرزاق ۱۱ جلدیں، (۸) مجمع بحار الانوار محدث محمد طاہر پٹنی، (۹) کشف الاستار عن زوائد مسند بزار ہیثمی ۴ جلدیں، (۱۰) مصنف ابن ابی شیبہ ۴ جلدیں، (۱۱) تحقیق حیاۃ الصحابہ، (۱۲) کتاب الثقات لابن شاہین، (۱۳) فتح المغیث للسخاوی، (۱۴) الحاوی لرجال الطحاوی، (۱۵) الاتحافات السنیہ بذکر محدثی الحنفیہ، (۱۶) نصرۃ الحدیث، (۱۷) اعیان الحجاج ۲ جلدیں، (۱۸) رکعات تراویح، (۱۹) رکعات تراویح مذیل برانوار المصابیح، (۲۰) شارع حقیقی، (۲۱) احکام النذر لاولیاء اللہ، (۲۲) الاعلام المرفوعہ فی حکم طلقات المجموعہ، (۲۳) الازہار المربوعہ فی ردآثار المتبوعہ ۲ جلدیں (۲۴) تحقیق اہل حدیث (۲۵) دفع المجادلہ عن آیۃ المباہلہ، (۲۶) ارشاد الثقلین فی جواب اتحاد الفریقین، (۲۷) التنقید السدید علی التفسیر الجدید، (۲۸) ابطال عزاداری، (۲۹) تعزیہ داری سنی نقطۂ نظر سے، (۳۰) رہبر حجاج، (۳۱) رد تحقیق الکلام، (۳۲) اہل دل کی دل آویز باتیں، (۳۳) دست کار اہل شرف۔

ان کے علاوہ بہت سے مسودات بوسیدہ وکرم خوردہ ہوگئے اور کتنے ابھی محفوظ ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ آپ کے علوم ومعارف کے وارث وامین آپ کے بڑے صاحبزادہ مولانا رشید احمد صاحب ناظم مرقاۃ العلوم مئو نے محدث کبیر کے علمی نوادر کے افادۂ عام کے لیے ''المآثر'' نامی ایک معیاری علمی مجلّہ محرم ۱۴۱۳ھ سے جاری کیا ہے، خدا کرے اس کا اجراء مستقل اور دائم رہے۔

محدث کبیر تو پون صدی تک علمی کارناموں کو تام اور عام کرکے بعمر ترانوے سال دوشنبہ بوقت مغرب ۱۰؍رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ، ۱۶؍مارچ ۱۹۹۲ء کو واصل بحق ہوگئے اور دو لاکھ سے زائد روزہ داروں نے باچشم نم نماز جنازہ ادا کرکے آپ کو صحن مرقاۃ العلوم [1] میں سپرد خاک کردیا۔

برخاک پاک او مدام ابر سلامتی شود

۱۹۹۲ء

(۱) مرقاۃ العلوم کے صحن میں نہیں، بلکہ اس کے قریب ایک احاطے میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا (مسعود الاعظمی)

راقم الحروف نے پچاس سے زائد تاریخ رحلت برآمد کی ہے، ولادت، وفات اور مدتِ عمر کے چند مادے آپ بھی ذہن نشین کرلیں: اختر حسن، مناظر حسین، ظفر الحق، تلمیذ الحق، شیخ معارج الدین، بخت نورانی، زبدہ قضات، سے تاریخ پیدائش۔ مشغول اللہ، کلیم الغفار، غلام ناصر، اظہر شاہ، اختر صانع، اختر نعمانی، اختر قاسمی، خوش وقت، ظفر پیکر، سے تاریخ وصال اور محامد، فوز، نجم، چمن، طبعزاد، پاک حسب، سے مدت عمر کے اعداد برآمد کیے جاسکتے ہیں۔

محدث کبیر سے تعلق: حضرت سے عقیدت بہت پہلے سے تھی، ۶۴-۱۳۶۴ھ = ۱۹۴۵ء میں راقم الحروف نے مفتاح العلوم مئو میں تعلیم حاصل کی، اس وقت حضرت وہاں شیخ الجامعہ تھے، اب حضرت کی خدمت میں آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا جو تا آخر ۴۸ برس تک قائم رہا، حضرت کی نظر شفقت اور توجہ نے اردو تحریر کا سلیقہ سکھایا۔ میری کتاب ''حیات طاہر'' پر نظر ثانی فرما کر قیمتی مشورے دیے، اور ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ کو اس پر شاندار پیش لفظ تحریر فرمایا۔ دوسری کتاب ''ایک عالمی تاریخ'' کو دیکھ کر ۲۴ رشوال ۱۳۹۴ھ کو اس پر تقریظ لکھی۔ اسی طرح ۱۴۰۵ھ میں ''تذکرہ مشاہیر کوپا گنج'' ملاحظہ فرما کر نہایت حوصلہ افزاء تأثر رقم فرمایا۔ ۱۴۰۷ھ میں ''محاسن التواریخ'' نامی کتاب پر تقریظ کی درخواست کی تو فرمایا کہ ''تم مصنف ہو چکے ہو تقریظ کی ضرورت نہیں''۔ افسوس کہ اب اس قسم کی حوصلہ افزائیوں سے ہمیشہ کے لیے محرومی ہوگئی۔ ۱۳۸۹ھ میں مجھے طلب فرما کر اپنی تالیف ''اعیان الحجاج'' کی کتابت میرے سپرد کردی، جس کو بہت اہتمام سے میں نے لکھا، ۱۴۰۳ھ میں میری تالیف ''مشاہیر پورہ معروف'' منگوائی جس کو غالباً سعودی عرب روانہ فرمایا۔

آہ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ الحی ۱۹۹۲ء   روئے گل سیر ندیم کہ آخر بہار شد ۱۴۱۲ھ

نور مرقدہ القادر العظیم ۱۹۹۲ء

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ☆

میں نے ۱۹۷۲ء میں نجی طور سے بی اے اور ۱۹۷۴ء میں ایم اے (اردو) کیا۔ اس اثناء میں اسلامیہ ہائی اسکول (مومن پورہ، ناگپور) میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا، اس لیے کالج میں داخلہ نہ لے سکا۔ اسلامیہ اسکول کی ملازمت سے ۵ر مئی ۱۹۷۳ء کو علاحدہ ہوا تو خود کو مصروف رکھنے کے لیے تحقیقی کاموں کی شروعات کردی۔ اردو سے ایم اے کرنے کے بعد جب فارسی سے ایم اے کرنے کا خیال آیا تو ناگپور مہاودیالیہ، ناگپور کے شعبہ فارسی میں داخلہ لیا۔ اس سند کی جون ۱۹۷۶ء میں حصولیابی کے بعد عربی سے ایم اے کرنے کی غرض سے پھر اسی کالج کے شعبۂ عربی میں جولائی ۱۹۷۶ء میں داخل ہوگیا۔ لیکن عربی کے اساتذہ کی درس وتدریس میں غفلت ولاپرواہی کے باعث کالج سے دل اچٹ گیا۔ لہٰذا سال اول کا امتحان پاس کرنے کے بعد پھر کالج میں داخلہ لینے کی رغبت نہیں ہوئی اور میں نے نجی طور سے سال دوم کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔ نصاب میں جو کتابیں شامل تھیں ان میں **ماجدولین** اور **المسرح المجتمع** (توفیق الحکیم) کے علاوہ احمد شوقی کے چند مراثی بھی شامل تھے جن کی تفہیم میرے لیے مشکل تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے تایا حاجی محمد عبدالمتین سے اس پریشانی کا ذکر کیا، انھوں نے مجھ کو یہ کتابیں پڑھادینے کی درخواست مولانا قاری محمد حفیظ الرحمٰن مفتاحی سے کی جو اس زمانے میں مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم مومن پورہ ناگپور کے صدر مدرس تھے۔ مولانا نے درخواست قبول کی اور روزانہ بعد نماز مغرب پابندی سے میرے گھر آکر مجھ کو پڑھاتے رہے۔ میں تقریباً دس مہینے تک ان سے نصاب میں شامل کتابیں پڑھتا رہا۔

موصوف مئوناتھ بھنجن (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ عربی وفارسی کے جید عالم تھے، محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید تھے، انھیں محدثِ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی

☆ مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر

دارالعلوم کی صدر مدرسی کے لیے منتخب فرمایا تھا، جسے محدثِ اعظمی ﷫ کے چند معتقدین نے انھی کی تحریک پر قائم کیا تھا اور اس کی عالیشان عمارت کا سنگِ بنیاد بھی ان کے دستِ مبارک سے ۱۳ر فروری ۱۹۷۲ء کو رکھوایا تھا۔ وہ جب تک بقیدِ حیات رہے، اس درس گاہِ علمی کے سرپرستِ اعلی رہے اور اس کی تعمیر وترقی میں مخلصانہ حصہ لیا۔

استاذی مولانا قاری محمد حفیظ الرحمٰن مفتاحی کو اپنے استاذ محترم سے بے انتہا عقیدت ومحبت تھی، چنانچہ مجھ کو پڑھاتے وقت وہ اکثر ان کی بے لوث شخصیت اور زبردست علمی خدمات کا ذکر کرتے، ان کی تصنیفات وتالیفات کا تذکرہ کرتے اور دینی وعلمی سرگرمیوں کو اس طرح بیان کرتے کہ ان کی جلیل القدر شخصیت میرے دل میں اترتی چلی گئی اور میں بھی ان کا معتقد ہوگیا۔ یہ اسی اعتقاد کا نتیجہ تھا کہ جب مولانا قاری محمد حفیظ الرحمٰن مفتاحی مدرسے کی تعطیل کلاں میں اپنے وطن مئو تشریف لے جانے لگے تو میں نے ان سے حضرت مولانا کی تصنیفات وتالیفات کو خرید لینے کی خواہش ظاہر کی، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب رخصتِ کلاں کے اختتام پر وہ ناگپور تشریف لائے تو سلام کے بعد حضرت مولانا کی کتابوں کا ایک بنڈل میرے حوالے کیا اور یہ بھی بتایا کہ ناگپور کے ایک طالب علم کی ان کتابوں کی خریداری پر حضرت مولانا تعجب وحیرت کا اظہار کر رہے تھے، جب میں نے آپ کے علمی شوق کے متعلق تفصیلات بتائیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور دل کی گہرائیوں سے دعائیں دیں۔

حضرت مولانا کے رخصت ہوتے ہی میں نے بنڈل کھولا تو الاعلام المرفوعہ، الازہار المربوعہ، نصرۃ الحدیث، اعیان الحجاج، رہبر حجاج، **مسند الحمیدی، کتاب الزھد والرقائق، کتاب السنن** اور **المطالب العالیۃ** جیسی وقیع اور جامع کتابیں میری نگاہوں کے سامنے تھیں، میں نے ان کتابوں کو الماری میں سلیقے سے سجایا اور ایک ایک کر کے ان کا دلچسپی اور گہرائی سے مطالعہ کیا، انھیں کتابوں نے علمِ حدیث اور فن اسماء الرجال کے متعلق میری معلومات میں زبردست اضافہ کیا۔ خیال آیا کہ حضرت مولانا کی علمی خدمات کو موضوع بنا کر عربی میں پی ایچ ڈی کروں، لیکن ملازمت اور کاروباری مصروفیات کی وجہ سے اپنے اس خیال کی تکمیل نہ کر سکا۔

حضرت مولانا کا ناگپور سے گہرا تعلق تھا۔ یہاں ان کے معتقدین کا ایک بڑا حلقہ تھا جن میں حاجی محمد بشیر ممبر، بابو محمد حنیف، عبدالمجید انصاری اور حافظ محمد اسحاق جیسی با اثر شخصیتیں بھی شامل تھیں۔

وہ اکثر ان کی درخواست پر ناگپور آتے، وعظ ونصیحت کی مجلس منعقد ہوتی اور تقریباً ہفتہ عشرہ مقیم رہ کر رخصت ہوجاتے، چوں کہ میں ان کی بلند وبالا علمی شخصیت سے بے خبر تھا، کم عمر تھا، اس لیے شرفِ نیاز حاصل نہ کرسکا۔ ان سے میری پہلی ملاقات اگست ۱۹۸۲ء میں ہوئی، وہ اپنے معتقدین کی درخواست پر ناگپور تشریف لائے تھے، اور دارالعلوم مومن پورہ سے متصل مسجد قادر صاحب کے ایک حجرے میں ٹھہرائے گئے تھے، یہاں ان کا قیام تقریباً دس دن رہا، ان کی خدمت میں حاضری دی، استاذی مولانا قاری محمد حفیظ الرحمٰن نے تعارف کروایا تو بڑے تپاک سے ملے، قریب بیٹھایا اور دعائیں دیں، میں نے ڈرتے ہوئے انھیں دعوتِ طعام دی تو چہرے پر مسکراہٹ کے معمولی سے آثار نمودار ہوگئے، ابھی وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ان کے معتقدین نے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ آپ کھانا پکوا کر یہیں لے آئیں، ہم سب بھی اپنے اپنے گھر سے کھانا پکوا کر یہیں لے آتے ہیں اور سب ایک ساتھ مل کر کھاتے ہیں، حضرت مولانا کس کس کے گھر جائیں، دل شکنی نہ ہو، اس لیے یہیں ہم سب کے ساتھ کھاتے ہیں۔ یہ سن کر مولانا صاحب نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی، چنانچہ دوسرے دن بعد نماز ظہر ٹفن لے کر ان کے حجرے میں پہنچ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد محفلِ طعام آراستہ ہوئی، سب نے اپنا ٹفن کھولا اور دسترخوان پر سجادیا، حضرت مولانا سب کھانوں کا تھوڑا تھوڑا ذائقہ چکھتے رہے، کسی کی دل شکنی نہ کی۔

اِن آنکھوں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ بارعب اور پُرجلال تھا، لیکن اس پر بلا کا نور تھا، قد میانہ، جسم چوڑا، سینہ کشادہ، آنکھیں زاہدانہ، پیشانی چوڑی، ناک بڑی، دہانہ درمیانہ اور بال سفید وسیاہ تھے، لباس انتہائی سادہ پہنتے اور کھانا بہت ہی کم کھاتے، گفتگو بہت کم کرتے، خاموشی سے سب کی سنتے اور ضرورت کے وقت ہی کچھ کہتے، اگرچہ علمِ حدیث اور فن اسماء الرجال کے زبردست عالم تھے، لیکن ان کے پاس گھنٹوں بیٹھنے کے بعد بھی یہ شانِ علمیت نمایاں نہ ہوتی، یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ مجلس میں کوئی عظیم المرتبت عالم مسند نشیں ہے۔

اس قیام کے دوران ان کے معتقدین اور دارالعلوم کی انتظامیہ نے مسجد امان اللہ سیٹھ کے سامنے واقع میدان میں ایک مجلس وعظ ونصیحت بھی منعقد کی، حضرت مولانا نے علم کی افادیت واہمیت کے موضوع پر بہت ہی مختصر لیکن عالمانہ تقریر کی اور آخر میں یہ کہا کہ:

''کتابیں بہت لکھی جا چکیں، اتنی کہ سیکڑوں الماریاں بھر چکی ہیں، تقریریں بہت ہوچکیں، اتنی کہ ان کی آواز سے فضا لبریز ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح نہیں ہورہی ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو کہنے والوں میں اخلاص کی کمی ہے یا سننے والوں میں، لہذا دونوں اپنے اندر اخلاص پیدا کریں اور کہنے سننے سے زیادہ عمل کریں''۔

محدثِ اعظمی زبردست محدث اور عالم دین تھے، ان کا شمار برِّصغیر کے خادمانِ علم حدیث کی فہرست میں اول نمبر پر تھا، ان کے ہم عصروں میں ان سے بڑھ کر فنِ حدیث و اسماء الرجال اور اس کے متعلقات کا محقق ومبصر کوئی نہیں تھا، انھوں نے حدیث کی بیش قیمت قلمی کتابوں کو جہدِ مسلسل کے بعد دریافت کیا، انھیں پردۂ گمنامی سے باہر نکالا، ان کی نقلیں حاصل کیں، ان کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرکے ان کے نصوص کی تصحیح کی، ان پر تعلیق وتحشیہ کے علاوہ عالمانہ وفاضلانہ مقدمہ لکھا اور انھیں سائنٹفک انداز سے ایڈٹ کرکے اہلِ علم کے سامنے پیش کیا۔ اس اعتبار سے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (ف:۸۵۲ھ) کی کتاب **انتقاء الترغیب والترهیب**، امام ابوبکر عبداللہ بن زبیر قریشی اسدی حمیدی رحمۃ اللہ علیہ (ف:۲۱۹ھ) کی **مسند الحمیدی**، امام عبداللہ بن مبارک المروزی رحمۃ اللہ علیہ (ف: ۱۸۱ھ) کی **کتاب الزهد والرقائق**، امام سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ (ف:۲۲۷ھ) کی **کتاب السنن (المجلد الثالث)**، عبدالرزاق بن ہمام صنعانی رحمۃ اللہ علیہ (ف:۲۱۱ھ) کی **المصنف**، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (ف:۸۵۲ھ) کی **المطالب العالية**، امام عبداللہ بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ (ف:۲۳۵ھ) کی **المصنف** وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ حدیث کی ان ضخیم کتابوں کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی انھیں کی کوشش ومحنت سے جدید انداز سے ایڈٹ اور شائع ہوکر منظرِ عام پر آئیں اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مقدس ذخائر سے عالمِ اسلام نے پہلی بار استفادہ کیا۔ یہ ان کا ادبِ اسلامی پر اتنا بڑا اور زبردست احسان ہے کہ اسے رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

انھیں کتابوں کی اشاعت کے بعد ان کو عالمِ اسلام میں بے انتہا شہرت ومقبولیت ملی اور وہ عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ ان کے ان علمی کارناموں کو عرب ممالک کے جید عالموں اور شخصیتوں نے خوب سراہا اور اخلاص ومحبت سے خراجِ تحسین پیش کیا، یہی نہیں بلکہ ان کی

ذکاوت وعلمیت اورمحنت ومشقت کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا۔ان میں ڈاکٹرعبدالحلیم محمود (سابق شیخ جامعۂ ازہر، مصر)، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ (ریاض)، شیخ احمد محمد شاکر (مصر)، شیخ محمود شاکر (مصر)، مولانا عبداللہ زمزمی (مکہ)، شیخ مصطفیٰ احمد الزرقا (شام)، شیخ عبدالعزیز عبداللہ باز (ریاض)، شیخ ناصرالدین البانی (شام)، شیخ سید یوسف ہاشم الرفاعی (کویت)، شیخ شعیب ارناؤط (بیروت)، شیخ عابدالفاسی الفہری (مراکش)، شیخ علوی بن عباس مالکی (مکہ)، شیخ محمد عوامہ (مدینہ)، اورڈاکٹر طاہرنورولی (مکہ)، کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔عرب وعجم کے متعدد علمائے کرام سفر کی تکلیفیں برداشت کرکے ان کی خدمت میں تشریف لاتے اوران سے حدیث کی اجازت وسند حاصل کرتے۔اس سے بھی ان کی علمی شخصیت کی بلندی وبرتری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔سچ پوچھوتو ان کی ذات دائرۃ المعارف تھی۔

محدثِ اعظمی مئوناتھ بھنجن (یوپی) کی خاک سے اٹھے۔مختلف مدارس دینیہ سے علومِ دینیہ کا تکملہ کیا۔دارالعلوم (مئو)، مظہرالعلوم (بنارس) اورمفتاح العلوم (مئو) میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔لیکن نظریات کے ٹکراؤ کے باعث کہیں جم نہ پائے، گوشۂ تنہائی ہی راس آیا اوراسی گوشے میں بیٹھ کرزندگی کے اخیرلمحات تک علمِ حدیث کی خدمت کرتے رہے۔اس میں انہماک کا یہ عالم رہا کہ مقتدر جامعات کے ذمے داروں کی ملازمت کی پیش کش کوبھی ٹھکرادیا۔بس ایک سودا سرمیں سمایا رہا کہ حدیث نبوی ﷺ کے ان قلمی نسخوں کوکس طرح منظرِ عام پرلایا جائے جوکتب خانوں کی زینت ہیں۔

انھوں نے یہ محنت اپنے ایک معمولی سے گھرمیں بیٹھ کرکی، جومئو کی ایک غیرمعروف چھوٹی سی گلی میں واقع تھا اوراس کے سامنے سے گزرنے والے کو یہ احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ اس میں ایک ایسی ہستی سکونت پذیرہے جس کی علمیت کی دھاک علمائے عرب وعجم پربیٹھی ہوئی ہے۔ان کی سادگی اوررہن سہن کا یہ حال تھا ان کے شہرکے لوگ انھیں ''بڑے مولانا'' سے زیادہ نہیں جانتے تھے اوران کی حقیقی عظمت سے بے خبر تھے۔لیکن جب اس محدثِ جلیل نے ۱۶/ مارچ ۱۹۹۲ء کو اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی اور دوسرے دن ان کا جنازہ اٹھا تو مئو کی گلیاں اور شاہراہیں ان کے عقیدت مندوں سے بھرگئیں، تقریباً دولاکھ افراد ان کے جلوسِ جنازہ میں شریک تھے۔ بقیہ صفحہ ۳۲۸ پر

جید عالمِ دین، مفکر اسلام، محدث کبیر
علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی

شاہد صدیقی ☆

عالم اسلام کی بلند پایہ علمی شخصیت محدث کبیر، فقیہ ونامور مصنف اور تحریکِ آزادی کے ممتاز مجاہد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی طویل علالت کے بعد دسویں رمضان المبارک بروز دوشنبہ عین افطار کے وقت سے پہلے کی مبارک ساعت میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا کی وفات کا یہ المناک سانحہ حضرت کے اپنے آبائی وطن مئوناتھ بھنجن میں ۹۵ /برس کی عمر میں ۱۶/ مارچ کو شام ۶ بجکر ۷ منٹ پر پیش آیا۔ وفات حسرت آیات کی خبر پورے شہر، قرب وجوار ملک اور بیرون ملک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مشرقی اتر پردیش کے تقریباً تمام ہی اضلاع اور سبھی علاقوں سے عقیدت مندوں اور سوگواروں کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ اور بھاگلپور سے جن کی تعداد اگلے دن تدفین کے وقت تک لاکھوں میں ہوگئی، مئو کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا ہجوم نہیں دیکھا گیا، سارا شہر افسردگی اور غم واندوہ کی تصویر بن گیا۔ بیوپار منڈل نے عام بند کا اعلان کر دیا، تمام کاروباری ادارے بند ہوگئے۔

جنازہ دن میں تقریباً بارہ بجے روانہ ہوا، جو خاص شاہراہوں سے ہوتا ہوا ریلوے گراؤنڈ پہنچا، جنازہ اور تدفین میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم عقیدتمندوں کی بھی بڑی تعداد شامل تھی۔ نماز جنازہ مولانا عبدالجبار اعظمی نے پڑھائی۔ اس موقع پر ازدحام کو کنٹرول کرنے کے لیے ضلع انتظامیہ کی جانب سے زبردست اہتمام کیا گیا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اسلام کے ممتاز عالم وبلند پایہ فقیہ اور محدث ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث وفقہ پر دو درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ،

☆ایڈیٹر نئی دنیا دہلی

جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ اور عالم اسلام کے دوسرے بہت سے اداروں کے رکن تھے۔حدیث کی اہم کتابوں پر تحقیق وتعلیق کا کام کیا۔آپ کی اہم کتابوں میں مصنف عبدالرزاق،مسند حمیدی،سنن سعید بن منصور،المطالب العالیہ اور کتاب الزہد والرقائق وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا مرحوم کا تاریخی نام ''اختر حسن'' رکھا گیا تھا،لیکن آپ حبیب الرحمٰن کے نام سے مشہور ہوئے۔علامہ نے سب سے پہلے مئو کی قدیم دینی درسگاہ دارالعلوم ہی میں تعلیم حاصل کی،اس کے بعد دیگر مراکز علمی میں اپنے وقت کے جلیل القدر علماء سے فیض حاصل کرتے ہوئے ۱۳۳۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی [1] اور مظہر العلوم بنارس ودارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں تشنگان علوم اسلامیہ کو تسکین فراہم کرنے لگے،بعض وجوہات کی بنا پر ۱۳۴۷ھ میں جامعہ مفتاح العلوم کی بنیاد ڈالی جس میں شیخ الحدیث اور صدر مدرس کی حیثیت سے تادم آخر خدمات انجام دیتے رہے [2]۔

علامہ کا اصل رجحان فن حدیث سے متعلق غیر مطبوعہ کتابوں کو مرتب کرکے عوام کے سامنے پیش کرنے کی طرف تھا۔اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے برصغیر کے علاوہ عرب ممالک اور پورے عالم اسلام میں قدر ومنزلت کے مالک بن گئے تھے۔اس وقت فن حدیث،رجال حدیث اور متعلقات حدیث میں امتیازی مقام حاصل تھا،فن حدیث میں آپ کا اہم اور تحقیقی مشہور کارنامہ مصنف عبدالرزاق کی اشاعت ہے،جو گیارہ ضخیم جلدوں میں عربی میں ہے،بعض مسائل پر ایسی محققانہ کتابیں تصنیف کیں کہ حرف آخر بن گئیں۔رکعات تراویح کے موضوع پر خالص علمی اور تحقیقی انداز میں بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد سے تیرہویں صدی کے آخر تک دنیا کی کسی مسجد میں تراویح کی صرف آٹھ رکعتیں نہیں پڑھی گئیں۔ایک مجلس کی تین طلاقوں کی شرعی حیثیت اور اس کے بارے میں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا تحقیقی جواب احادیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں دیتے ہوئے ایک کتاب الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ ترتیب دی۔

حضرت علامہ نے اپنے آخری دور میں مئو ہی میں مرقاۃ العلوم کے نام سے ایک اور مقتدر

---

(۱) حضرت کا سال فراغت ۱۳۳۴ھ نہیں بلکہ ۱۳۴۰ھ ہے،دیوبند میں چند مہینے پڑھنے کے بعد دارالعلوم مئو سے فراغت حاصل کی تھی (مسعود الاعظمی)

(۲) بعض وجوہات کی بنا پر ۱۳۹۷ھ کے لگ بھگ مفتاح العلوم سے مفارقت اختیار کرلی تھی،اور ۱۳۹۹ھ میں المعہد العالی ومرقاۃ العلوم قائم کیا تھا (مسعود الاعظمی)

درسگاہ قائم کی، جہاں علم حدیث، فن رجال اور فقہ کے فارغین کو تحقیق اور ماہرانہ ریسرچ کی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں اور مولانا بذاتِ خود ان فضلاء کو اپنے علمی تبحر سے فیضیاب فرماتے تھے۔ چند سال قبل ممتاز علماء کرام، محدثین عظام اور مفتیان شرع متین کے اجتماع نے دہلی میں امیر الہند منتخب کیا تھا۔ تاکہ سیکولر ہندوستان میں مسلمانوں کی شرعی رہنمائی کی جاسکے، امارتِ شرعیہ کا کل ہند نظام آپ ہی کی نگرانی میں قائم کیا گیا۔ غیر سیاسی مزاج کے باوجود پنڈت نہرو کے اصرار پر اتر پردیش اسمبلی کے لیے الیکشن میں کھڑے تو ہوگئے، مگر ہر جگہ واضح الفاظ میں اعلان کرتے رہے کہ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں؛ اس لیے اگر مجھے اسمبلی کے لیے منتخب کریں تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں، اس کے باوجود بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ اندرا گاندھی سعودی عرب گئیں تو شاہ خالد سے پوچھا کہ ہندوستان آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہے؟ شاہ خالد نے کہا آپ حدیث کی فلاں کتاب پر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی سے حاشیہ لکھوادیں۔ واپسی میں اندرا گاندھی نے عرض کیا میں آپ کے بھروسہ پر شاہ خالد سے وعدہ کرآئی ہوں امید ہے کہ آپ مجھے شرمندہ نہ ہونے دیں گے۔ اور مولانا نے یہ کارنامہ بحسن وخوبی انجام دیا۔ پسماندگان میں دو صاحبزادے مولانا رشید احمد اور مولانا سعید احمد کے علاوہ چار صاحبزادیاں ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۳۵۱ کا بقیہ

میرے ایک عزیز نے مولانا سے میرا تعارف کراتے ہوئے میرے خاندانی پس منظر کو پیش کیا، تو مولانا نے کس قدر خفگی آمیز لہجہ میں مجھ سے فرمایا: تم نے ان باتوں کو کیوں پوشیدہ رکھا، تو میں نے عرض کیا۔ حضرت کبھی آپ نے دریافت نہیں فرمایا اور میرا مقصود بھی اپنے کو متعارف کرانا نہیں، بلکہ آپ سے فیض حاصل کرنا تھا، افسوس! یہ مولانا سے آخری ملاقات تھی اس کے بعد جب بھی حاضر ہوا، مولانا کو صاحب فراش پایا۔ کبھی غنودگی بلکہ زیادہ تر نیم بے ہوشی کی کیفیت رہتی۔ اور آخر وہ دن آیا جب ماہ رمضان میں رحمت کا عشرہ ختم ہو رہا تھا اور مغفرت کا عشرہ شروع ہو رہا تھا، عین افطار کے وقت خدا نے رحمت ومغفرت سے بنی حسین چادر سے ڈھانپ لیا۔ اب صرف ان کی یادیں دل میں باقی ہیں، اور جنازہ اس شان سے اٹھا کہ سارا مئو اور قرب وجوار آپ کی مشایعت میں تھا۔ اور ہر شخص جنازہ میں شرکت کو اپنی سعادت سمجھتا تھا۔

ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی

چند یادیں، چند سسکیاں، چند آنسو

مبشر اعجاز اعظمی ☆

آج سے قبل جنھیں ہم محدث جلیل، ابوالمآثر، امیر الہند جیسے عظیم الفاظ کے ساتھ یاد کرتے تھے، بلکہ ہر وقت ایسے القاب کی تلاش میں رہتے تھے جو حضرت مولانا کی شخصیت کے مکمل ترین ترجمان ہوں۔ مئو اور قرب و جوار کے لوگ، مسلم وغیر مسلم محبت وعقدیت سے ''بڑے مولانا'' کے لفظ سے یاد کیا کرتے تھے۔ آج انھیں کے نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منھ کو آرہا ہے اور دل ودماغ پر عجیب سی کیفیت چھا جاتی ہے۔

حضرت مولانا کی وفات کوئی ایسا حادثہ نہیں جو ناگہانی ہوا ہو، یا جس کا ہمیں وہم وگمان بھی نہ رہا ہو، مگر یہ صرف ایک انسان کی موت نہیں، بلکہ ایک عالم کی موت ہے (صحیح ترین لفظوں میں ایک عالم ساز کی موت) ایک ایسے وقت میں جب کہ دین سے بے اعتنائی برتی جارہی ہے، علوم حدیث وتفسیر سے شغف کم ہوتا جارہا ہے، بحث وتحقیق کا مزاج نہیں، سطحیت کا رنگ چھا رہا ہے، اوران قدسی صفات بزرگوں کے ساتھ ہی علوم بھی رخصت ہو رہے ہیں، اوران سے خالی ہوئی مسندیں نہ جانے کب تک پُر ہونے کی منتظر رہیں گی، اس پر آنکھیں جتنا بھی روئیں کم ہے، اہل علم کی جدائی کا غم اپنی جگہ، مگران کی وفات سے علم کا جونقصان ہوا کرتا تھا اہل نظر اس پر ماتم کیا کرتے تھے، اس لیے وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے تھے آج علم اٹھ گیا، یا اندھیرا چھا گیا۔ امام اعظم کی موت پر اکابرین ملت نے رنج وغم بھرے تاثرات پیش کیے، ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بہت بڑا عالم جاتا رہا،'' شعبہ بن الحجاج نے کہا کوفہ میں اندھیرا ہو گیا۔ جب امیر معاویہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سنی تو روتے ہوئے یہ جملہ کہا ''آج علم وفضل چلا گیا''۔ یہ جملہ اس شخص کے بارے میں فرما رہے ہیں جو ان کا سیاسی حریف رہ چکا ہے، بلکہ جنگ وجدال تک نوبت آچکی تھی۔ ان

☆ سابق اسکالر الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

لوگوں کے لیے ذاتی رنجش اور اختلافات حقیقت کے اعتراف میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔

مجھے الہ آباد کے دوران قیام بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی نوراللہ مرقدہ سے قربت ہوئی اور فرصت کے اوقات میں ان کی خدمت میں حاضر ہونا میرا مشغلہ بن گیا، اور حضرت بھی اپنی شفقتوں سے نوازتے رہتے تھے، اسی لیے جب وطن (مئوناتھ بھنجن) مراجعت ہوتی تو مولانا خطوط اور رقعات میرے سپرد کیا کرتے تاکہ مولانا اعظمی تک پہنچادوں۔ اور مولانا اعظمی بھی ان کے جوابات میرے ہی حوالے کیا کرتے۔ اس طرح مجھے ان دونوں بزرگوں کے درمیان واسطہ بننے کی سعادت حاصل ہوئی ع

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا

مگر افسوس ان میں سے اب کوئی نہیں رہا، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے۔ دل زخم خوردہ ہے اور جذبات مضمحل، صدمۂ فراق سے قلب وجگر زخمی اور حال یہ ہے کہ ؎

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

آج سے آٹھ سال قبل جب کہ میں درجہ یازدہم کا طالب علم تھا، نماز جمعہ کی صف بندی کے دوران مولانا کے بغل میں جگہ خالی ہوگئی، مولانا نے پیچھے مڑکر اشارے سے مجھے بلاکر اپنی بغل میں کھڑا کرلیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا سابقہ تھا جب مولانا سے اتنی قربت ہوئی۔ اس طرح مولانا کی شخصیت کے تابندہ نقوش میرے دل میں ثبت ہوگئے۔ پھر حضرت مولانا پرتاب گڈھی کے خطوط کے ساتھ حاضری نے مزید ان نقوش کو جلا بخشی۔ اگر چہ یہ ملاقاتیں مختصر ہوا کرتی تھیں، لیکن یہی مختصر ملاقاتیں محبت وعقیدت میں بتدریج اضافہ کا ذریعہ بنتی رہیں، اس دوران مجھے کبھی مولانا کی سخت گیری کا احساس نہیں ہوا، بلکہ حضرت پرتاب گڈھی کی وجہ سے مجھ پر شفقت میں اضافہ ہی ہوتا رہا، آپ کی شفقتیں اور عنایتیں مجھے حاصل ہوتی رہیں۔ ہر ملاقات میں خیریت دریافت کرتے اور دعاؤں سے نوازتے۔ مولانا کی ملاقات سے دل کی عجیب کیفیت ہوتی، اگر چہ تہی دامن ہی حاضر ہوتا اور واپسی پر بھی تہی دامنی ہی ساتھ ہوتی، مگر محسوس ہوتا کہ کچھ لے کر لوٹ رہا ہوں۔ اقبال نے کہا تھا ؎

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
الٰہی کیا دھرا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

ملک کی ایک معروف ترین یونیورسٹی میں ایک غیر مسلم ریسرچ اسکالر سے جن کا اسلام سے شغف حد سے بڑھا ہوا تھا، میری شناسائی ہوئی۔ان کے استاذ کی اسلام دشمنی اور تعصب نے انھیں اسلام کو سمجھنے کے لئے مجبور کیا۔اسی ذوق مطالعہ نے انھیں راہ ہدایت دکھلائی،لیکن استاذ کے خوف سے اسلام کو پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں۔ جب کہ انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے بے پناہ متاثر ہونے کی وجہ سے اپنا نام عمر فاروق تجویز کیا ہے۔ان کا یہ عالم ہے کہ تہجد کی نماز بھی فوت نہیں ہوتی،لیکن یہ ابھی تک راز ہے،اوراس وقت تک رہے گا جب تک انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں مل جاتی۔ان کے دوست اور احباب آج بھی انھیں غیر مسلم ہی جانتے ہیں۔انھیں جب دیکھتا ہوں تو علامہ اقبالؔ کا شعر ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے ؎

ہوں کافر ہندی دیکھ میرا ذوق و شوق

لب پہ صلوٰۃ ودرود دل میں صلوٰۃ ودرود

مذکورہ ریسرچ اسکالر نے حضرت مولانا کی ردفتنہ انکار حدیث میں لکھی قابل قدر تصنیف ''نصرۃ الحدیث'' کا مطالعہ کیا،کسی قدر اپنی اردو دانی اور میرے ہندی ترجمہ کی بدولت سمجھا۔اس کتاب نے مولانا کو غائبانہ ان سے متعارف کرایا۔جس کے مطالعہ سے وہ بے پناہ متاثر ہوئے تھے۔ اس کتاب کے بعض اقتباسات جوان کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن کی میں بھی اپنی بے علمی کی وجہ سے تشریح نہ کرسکا،تو میں نے ان مشکلات کا مولانا اعظمی سے ذکر کیا اور اس کی وضاحت چاہی۔مولانا نے بخوشی میری درخواست قبول فرمائی اور اس کا طویل جواب تحریر کرا کے میرے سپرد کیا۔اس ذرہ نوازی اور بے پناہ شفقت سے متاثر ہوئے بغیر میں نہ رہ سکا۔

حضرت مولانا کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو آپ کی سادگی،حق گوئی اور خودداری تھی۔ آپ کی حق گوئی نے کبھی چہروں کا امتیاز نہیں کیا۔جو کبھی غلط دیکھا،کسی سے بھی ہوئے دیکھا فوراً تنبیہ کی۔اپنے اور غیروں کا خیال کبھی حق کے اظہار کے لئے رکاوٹ نہیں بنا۔

حضرت مولانا نے تنہا اپنی ذات سے جو علمی کارنامے انجام دیئے اب اس ترقی یافتہ دور میں ان کاموں کے لئے بڑے بڑے ادارے اور اکیڈمیاں قائم کی جارہی ہیں۔حضرت مولانا نے اپنی بے پناہ دینی،تبلیغی،درسی مشغولیات کے باوجود جو علمی وتحقیقی خدمات انجام دیں اس پر علمائے عرب

وعجم نے وقتاً فوقتاً شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے۔لیکن پھر بھی اس قدر علمی وجاہت اور تبحر کے باوجود آپ کے مزاج میں علمی پندار اور عالمانہ غرور کا کوئی شائبہ نہیں تھا، بلکہ وہی سادگی، سادہ مزاجی، انکساری، آپ کی ہر بات سے ٹپکتی تھی، باتوں میں محبت کی گھلاوٹ، دل کو گرویدہ کردینے والی نگاہیں اور ساتھ ہی ساتھ شگفتگی اور زندہ دلی بھی۔

مولانا نے دنیاوی جھمیلوں سے بچپن سے ہی تنہائی کی زندگی اختیار کی اور گوشۂ خلوت میں بیٹھ کر علوم حدیث وقرآن کی خدمت کو مقصد زندگی بنالیا تھا۔

مولانا نے مختلف مدارس میں تعلیمی خدمات انجام دیں، لیکن ملازمت سے انسیت نہ ہونے کی بنا پر کنارہ کش ہوگئے، اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کی؛ لیکن پڑھنے لکھنے کا مشغلہ جاری رکھا، اسی دوران آپ نے علمی دنیا کے سامنے اپنے شاہ کار تحقیقی کارنامے پیش کئے۔مسند حمیدی (۲ جلد) سنن سعید بن منصور (۲ جلد) المطالب العالیہ (۴ جلد) مصنف عبدالرزاق (۱۱ جلد) الزہد والرقائق جیسی نایاب کتابوں کو جن میں سے بہت سی قلمی نسخوں کی شکل میں مختلف کتب خانوں میں تھیں، بڑی جانفشانی اور دیدہ ریزی سے ایڈٹ کیا اور ان پر بڑے ہی مبسوط اور مفصل مقدمے بھی تحریر کئے۔ موخر الذکر کتاب ''الزہد والرقائق'' جو دوسری صدی ہجری کے مشہور عالم امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ (استاذ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ) کی تصنیف ہے، جس کی زیارت سے اب تک بہت سارے جید علماء بھی محروم تھے، مولانا نے تصحیح وتعلیق کے ساتھ شائع کرایا۔اور عربی میں نہایت ہی شاندار مقدمہ بھی تحریر کیا اور بتلایا کہ زہد کیا ہے، اور اس کے کتنے درجے ہیں۔

آپ کی اردو تصنیفات میں اعیان الحجاج، الاعلام المرفوعہ، رکعات تراویح، دستکار اہل شرف، اور نصرۃ الحدیث بہت ہی مشہور ہیں۔نصرۃ الحدیث کے بارے میں مشہور صاحب قلم ماہر القادری یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''احادیث رسول کو مجروح کرنے اور انھیں (معاذ اللہ) ناقابل اعتبار ٹھہرانے کے لئے منکرین رسالت جو وسوسے مسلمانوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں، اور جو نکتے تراش رہے ہیں، اس کتاب نے نہ صرف ان کا ازالہ کیا ہے، بلکہ اس قسم کے تمام شیطانی وساوس اور منافقانہ الزامات کی جڑ کاٹ دی ہے۔اسی دور کا ایک منافق ہے جو ادب اور صحافت کی دنیا میں حق گو کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے ایک ایک الزام کے فاضل مؤلف نے پرخچے اڑا دیئے''۔

اسی کتاب کے بارے میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا یہ جملہ تو حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو مولانا اعظمی کو ایک مکتوب تحریر کیا ہے:

''بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا''

حضرت مولانا کا وعظ بھی خوب ہوا کرتا تھا، چھوٹے چھوٹے جملے مگر تاثیر سے بھرے ہوئے بڑے ہی پرسوز انداز میں ادا کرتے جو سامعین کے دلوں کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتے۔ جب ماہ رمضان آتا تو اس کی عظمت کچھ اس طرح بیان کرتے:

''ہم میں کتنوں کی عمر ۷۰ سال۔ ۶۰ سال۔ ۵۰ سال ہو چکی ہوگی۔ اور اپنی اپنی زندگی میں اتنے ہی رمضان بھی پائے۔ ہمیں محاسبہ کرنا چاہئے کہ ہم نے ان رمضان میں کیا کمایا۔ یہ رمضان جو ہمیں ملا ہے۔ اسے غنیمت جاننا چاہئے اور زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارنا چاہئے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک مسلمان اپنی ہر عبادت کو آخری تصور کر کے ادا کرے تو وہ اس عبادت کا حق ادا کر سکتا ہے''۔

یہ صفت جو صحابہ کرام میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ مولانا سامعین میں بھی یہی صفت پیدا کر دینا چاہتے تھے۔

حضرت مولانا اپنی بلند پایہ علمی خدمات کی بدولت دولت کا انبار لگا سکتے تھے، اور چاہتے تو عالیشان رہائش گاہ تعمیر کرا لیتے، آرام و آسائش کے سبھی سامان مہیا ہو جاتے، لیکن کبھی انھوں نے اپنے دامن کو کشکول نہیں بنایا، علم کو درہم و دینار سے نہیں تول، صرف رضائے الٰہی کے لئے دینی اور علمی خدمات انجام دیں، اور طالبان علوم دینیہ اور علم حدیث کے دیوانوں کو ہزاروں کتب کی ورق گردانی کی زحمت سے بچا لیا۔ علم و تحقیق کی سنگلاخ راہوں کو عبور کرنے کے لئے آسانیاں فراہم کر دیں، کہ پوری ملت آج ان کی مرہون منت بن چکی ہے۔ مولانا نے اپنی حیات مستعار ایک ایسے ماحول میں گذار دی جہاں صاف ستھری اور پاکیزہ ہوا بھی میسر نہ تھی اور اسی سرزمین کو اپنی ابدی آرام گاہ بھی بنا لیا ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

مولانا کی شخصیت اور ان کی عظمت کو سمجھنے کے لئے درج ذیل واقعات کا مطالعہ آپ کے لئے مفید ہوگا:

۱:- مولانا اقبال اعظمی (لندن) صاحبزادہ مولانا رشید احمد مفتاحی کے نام ایک مکتوب میں

تحریر کرتے ہیں:

"شیخ علوی مالکی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے علماء جانتے ہیں۔ وہ شیخ حسن مشاط رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ابراہیم کردی - کہنا چاہیئے کہ حرم پاک کے بلند پایہ علماء اور محدثین کی آخری یہ تین یادگاریں تھیں - ان تینوں کو مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی معیت میں دیکھنے کی اس ناچیز کو سعادت حاصل ہوئی۔ شیخ علوی جو "سید" بھی ہیں، مولانا سے لپٹے ہوئے ہیں اور بلک بلک کر رو رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔

"میں یقین دلاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے راضی ہیں"

مولانا اقبال اعظمی (لندن)

۲/اکتوبر ۸۶ء

۲:- سلسلۂ تھانوی کے ایک بزرگ مولانا صوفی نصرت علی ٹانڈوی ہیں، مولانا اعظمی صوفی صاحب کے داماد کے یہاں گورکھپور مدعو تھے، نماز عشاء سے فراغت کے بعد دونوں بزرگ اپنی اپنی قیامگاہ پر چلے گئے، اسی رات مولانا صوفی نصرت علی کی طبیعت خراب ہوگئی، دوا دی گئی، صوفی صاحب سو گئے، جب بیدار ہوئے تو کہنے لگے:

"ابھی میں نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ حبیب الرحمٰن سے میرا سلام کہہ دیجئے اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ وہ جس کام میں لگے ہیں لگے رہیں۔" اس کے بعد صوفی صاحب نے فرمایا کہ اگر میرا انتقال ہو جائے تو مولانا اعظمی سے فرما دیجئے گا کہ میری نماز جنازہ پڑھا دیں گے۔

چنانچہ اسی رات صوفی صاحب انتقال کر گئے۔ مولانا اعظمی سے رات کا واقعہ بیان کیا گیا۔ مولانا نے نماز جنازہ پڑھائی۔

مندرجہ بالا واقعات مولانا کے علو مرتبت کی شہادت دے رہے ہیں۔ جن سے اللہ کے رسول خوش ہو جائیں ان کی بلندی مرتبہ کا کیا پوچھنا۔ مولانا خود ایک نعت پاک میں اپنے بارے میں فرما رہے ہیں۔

جو مجھے ملا وہ ملا انہیں کی نگاہ لطف و کرم سے ہے
قلم و زبان حبیب کیا ہے انہیں کا فیض دوام ہے

بقیہ صفحہ ۳۴۵ پر

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی رہنمائیاں اور کرم فرمائیاں

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ☆

والدین کو اللہ تعالیٰ نے وجود انسانی ذریعہ بنایا ہے اور ان کے دلوں میں اولاد کی بے انتہا محبت والفت ودیعت فرمادی ہے، جس کا ثمرہ یہ ہے کہ وہ ساری مشقت واذیت برداشت کرتے ہیں اور اولاد کی پرورش وپرداخت اور تعلیم وتربیت میں پوری سعی اور جدوجہد کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کتاب وسنت نے اولاد پر والدین کے بہت سارے احسانات کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی خدمت گذاری کی تاکید کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے بعد کتاب وسنت میں والدین کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔

والدین کے بعد سب زیادہ محبت اور انس اساتذۂ کرام کو اپنے ہونہار تلامذہ سے ہوتا ہے اور ان کے بے شمار احسانات تلامذہ پر ہوتے ہیں، تعلیم وتربیت میں ان حضرات کی شفقت ومحبت کو بڑا دخل ہوتا ہے اور ان کی توجہ اور دعاؤں سے ہی تلامذہ کامیاب زندگی کے مالک ہوتے ہیں۔

مجھے جب سے عقل وہوش آیا حضرات اساتذہ کی للّٰہیت وخلوص کا دل ودماغ قائل ہوتا گیا اور ان کے احسانات سے سینہ معمور ہوتا رہا، میں اپنی طالب علمی سے برملا اپنے ساتھیوں سے یہ بات کہتا رہا، کسی نے مانا اور کسی نے نہیں تسلیم کیا؛ مگر خود اپنا دل کبھی اس کا منکر نہیں ہوا، بلکہ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اور تجربہ زیادہ ہوتا گیا اس یقین میں پختگی آتی گئی۔ اسی اذعان کا یہ اثر رہا کہ طالب العلمی کے ہر دور میں میں نے اپنے اساتذہ کی خدمت گذاری میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیا اور خدمت انجام دے کر خوش ہوا۔ میرے بعض ساتھی کہا کرتے تھے تم پڑھنے سے زیادہ خدمت استاذ میں لگے رہتے ہو اور ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور برافروختگی سے شکستہ دل نہیں ہوتے۔ میں فخر کے ساتھ کہتا تھا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اساتذہ کی خدمت کی توفیق حاصل ہے اور ان کی مجھ پر نظر کرم ہے۔

ابتدائی زندگی کے تقریباً آٹھ سال حضرت الاستاذ مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدظلہ کی

☆ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند

شاگردی میں رہا، جنھوں نے بچپن سے میری تعلیمی زندگی میں رہنمائی فرمائی اور اردو کی پہلی اور تعلیم الاسلام سے لے کر شرح وقایہ تک سبقاً سبقاً پڑھایا اور صرف ونحو میں مضبوط بنایا اور فقہ سے مناسبت پیدا کی، اور اخیر کے تین چار سال دوسرے اساتذہ کے ساتھ حضرت الاستاذ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ گذارے، اور جامعہ مفتاح العلوم مئو میں رہ کر ہدایہ اولین سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم حاصل کی۔ اب یہ سارے اساتذہ کرام اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

اس وقت اس مقالہ میں محدث کبیر نور اللہ مرقدہٗ کے احسانات اور کرم فرمائیوں کا تذکرہ مقصود ہے، جن کا سایۂ عاطفت ابھی سال بھر پہلے تک میرے سر پر قائم تھا اور میں ہر سال پابندی سے حاضر ہو کر دعائیں لیا کرتا تھا، اور برابر خط وکتابت رکھتا تھا، حضرت اقدس کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے میرے نام خطوط کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی، میری سعی ہے کہ سارے خطوط چھپ کر علماء اور طالب علموں کے سامنے آ جائیں۔

سر دست بتانا چاہتا ہوں کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے میری سر پرستی کس طرح فرمائی؟ اور ان کی رہنمائی سے مجھے اور میری زندگی کو کیا رہبری حاصل ہوئی؟ میں کسی مقالہ میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت سے کیا کتابیں پڑھیں؟ اور حضرت نے کس شان سے پڑھایا؟! حضرت کے درس میں عبارت خوانی زیادہ تر میرے حصہ میں آئی، حضرت کبھی کبھی ہنس کر فرماتے تھے کہ تم نے سبھوں کی طرف سے پڑھنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور بلا معاوضہ، آواز تو بلا شبہہ تیز صاف اور بلند ہے، مگر جسم پر گوشت نہیں ہے جس سے اندازہ ہو سکے کہ دونوں وقت اچھا کھاتے بھی ہو۔

میری خط وکتابت اگست ۱۹۴۲ء کے بعد شروع ہوئی، اس سال حضرت کے پاس ہم لوگوں کے دو اسباق تھے: جلالین شریف اور حماسہ، اخیر سال میں ہندوستان چھوڑ وتحریک شروع ہوگئی، ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کانگریس نے یہ تجویز پاس کی اور ورکنگ کمیٹی کے سارے ممبران گرفتار ہو کر قلعہ احمد آباد جیل پہنچا دیے گئے، اس کے دوسرے دن سے طلبہ میدان میں نکل آئے اور انگریزی حکومت کے خلاف جلسے جلوس شروع ہو گئے، مئو میں سب سے پہلے آزادی کی اس جنگ میں مفتاح العلوم کے عزیز طلبہ نکلے اور پھر دوسرے طلبہ نے بھی اور عوام وخواص نے بھی شرکت کی، دو تین دنوں

تک مقرر تنہا خاکسار رہا، بڑی مشکل سے چوتھے دن اپنے بوڑھے ساتھی مولانا زین الدین سے تقریر کروائی، وہ کہتے تھے کہ ظفیر تم خود بھی ڈوبے اور مجھے بھی پھنسایا۔ امریکن فوج جونہی برطانیہ کی مدد میں آئی، ہم دونوں کے نام وارنٹ جاری ہوگئے اور وارنٹ بھی بغاوت کے، اس وقت کی سیاست کے مطابق گیارہ دنوں مئوشہر میں چھپ کر رہنا پڑا، اور کئی دن فاقے کے بھی گذارے، مدرسہ نے میرا نام خارج کردیا اور پولیس کو بتادیا گیا کہ مدرسہ نے اس کو نکال دیا اور وہ بھاگ گیا۔

گیارہ دنوں کے بعد مشورہ ہوا کہ میں مئو سے نکل جاؤں، خیریت اسی میں ہے، اب بھی اس وقت کی پریشانیوں کو سوچ کر دل لرز جاتا ہے؛ مگر اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانہ میں کوئی خاص اثر نہیں تھا، ہنستا بولتا تھا اور جیسا ساتھیوں کا مشورہ ہوتا تھا کرتا تھا، سوال یہ تھا کہ مئو چھوڑ کر کہاں جاؤں، میری جان پہچان محدود تھی، چلنا پھرنا ممنوع تھا کہ کہیں پولیس کی نظر میں نہ آجاؤں، اساتذہ سے ملنے کی ہمت نہیں تھی کہ میری وجہ سے ان پر کوئی حرف نہ آنے پائے اور ان کی خفگی کا بھی خطرہ تھا۔

میں ان دنوں محلّہ چھتر پورہ کی ایک مسجد کے کمرہ میں رہتا تھا اور اس مسجد کا امام تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری وجہ سے اہل محلّہ بھی خوف زدہ ہیں اور میرے قیام کو اپنے لیے مضر سمجھ رہے ہیں، انھوں نے دبے جملوں میں کہا بھی کہ جگہ بدل لو۔

حالات نے جب مجبور کردیا تو ۲۴؍اگست ۴۲ء کو مئو چھوڑ دیا اور یکہ وتنہا پیدل بہادر گنج ضلع غازی پور پہنچا، منشی عبدالباری مرحوم کے یہاں قیام کیا اور دو ایک دن بعد وہاں سے کشتی کے ذریعہ بلیا شہر اور وہاں سے پیدل دربھنگہ کے لیے روانہ ہوا اور بڑی مصیبتوں سے دوچار ہوکر ۳؍ستمبر ۴۲ء کو آٹھ بجے دن میں اپنے وطن پہنچا۔ اس کی پوری تفصیل میرے اس مقالہ میں پڑھ سکتے ہیں، جو رسالہ برہان دہلی نومبر ودسمبر ۸۳ء اور جنوری ۸۴ء میں تین قسطوں میں ''۱۹۴۲ء کا ایک یادگار سفر'' کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے اور ۳۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اسی سلسلہ میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا سب سے پہلا خط میرے نام موصول ہوا۔

''عزیزم ظفیر سلمہٗ! السلام علیکم

تمھارے گھر کے حالات معلوم ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ صبر جمیل واجر جزیل عطا فرمائے، مولوی عبداللطیف صاحب دو ماہ جیل میں نظر بند رہنے کے بعد آگئے، مدرسہ میں پڑھانے

لگے، تمھاری نسبت میرا خیال ہے کہ تم کو توقف کرنا چاہیے، جن دولڑکوں نے تقریر کی تھی ان کے ناموں کی تفتیش ہورہی تھی، خبرنہیں اب کیا ہورہا ہے۔

اس سال تم کیا پڑھنا چاہتے ہو؟ بہر حال دوبارہ حالات معلوم کرنے کے بعد آنا ہو تو آنا، یوں نہ چلے آنا'' (مکتوب ۴/نومبر ۴۲ء از مئو)

حضرت الاستاذ مولانا عبداللطیف نعمانی رحمۃ اللہ علیہ یا کسی دوسرے مولوی نے کوئی تقریر نہیں کی تھی، بلکہ یہ لوگ خاموش تھے، پوری تحریک ہم طلبہ کے ہاتھوں میں تھی؛ مگر چونکہ کانگریس کے ذمہ دار تھے، اس لیے احتیاطاً سبھوں کو حکومت نے نظر بند کردیا تھا اور جیل بھیج دیا تھا، طلبہ کو حکم یہ تھا کہ وہ اپنے کو گرفتار نہ ہونے دیں۔

عرض یہ کرنا ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت مئو آ گیا تو گرفتار کرلیا جاؤں گا، اس لیے بطور خود خط لکھ دیا؛ چنانچہ میں ایک سال روپوش رہا، مئو نہیں گیا، سال برباد تو نہیں ہوا، اس لیے کہ مدرسہ حمیدیہ گودنا ضلع سارن چلا گیا اور کچھ پڑھتا رہا، نصابی کتابیں البتہ نہیں پڑھ سکا۔

خط و کتابت حضرت والا سے ہوتی رہی مگر بہت کم، پورا پتہ نہیں لکھتا تھا، وہی وارنٹ کا خوف، اور احتیاط، اب میں نے تقریریں بند کر رکھی تھیں کہ خواہ مخواہ علمی نقصان ہوا، اب سوچا کہ بولنے کے بجائے لکھنا شروع کردیا جائے، اس سال مشکوٰۃ وغیرہ پڑھتا رہا، جتنا بھی ہوسکا، اب خیال بلکہ عقل کا تقاضا تھا کہ دورۂ حدیث پڑھ لیا جائے، رجب ۶۲ھ میں حضرت الاستاذ کا دوسرا خط ملا، اس میں تحریر فرمایا:

''میں سمستی پور جلسہ میں جارہا تھا، چھپرہ کے ایک ملاقاتی نے باصرار چھپرہ اتارلیا، اس لیے وارث العلوم بھی چلا گیا کہ شاید تم وہاں ہو، (مکتوب گرامی یکم رجب ۶۲ھ)

یہ شفقت و محبت تھی ایک استاذ کو اپنے ایک بہت معمولی شاگرد سے کہ چھپرہ اترے تو شاگرد کے دھیان میں اس شہر کے مدرسہ میں تشریف لے گئے، میں اسی مدرسہ سے پڑھ کر مئو پہنچا تھا؛ مگر اس وقت چھپرہ سے ایک اسٹیشن آگے بلیا لائن پر ریوِل گنج میں تھا، پہلے اطلاع ہوتی یا چھپرہ سے کوئی اطلاع ملتی تو یقیناً چھپرہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتا۔

اسی خط میں آگے تحریر فرمایا:

''مدرسہ (مفتاح العلوم) میں سال آئندہ دورہ ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ اور امید ہے جماعت کافی بڑی ہوگی، اگر تم آنا چاہو گے تو انتظام ہو جائے گا''۔ (ایضاً)

منشا یہ تھا کہ اس وقت اگر چہ اخراج حکومت کو دکھایا گیا تھا؛ مگر دوبارہ داخلہ کرلیا جائے گا، اس کی طرف سے اطمینان رکھو۔ اس خط سے ٹوٹی ہوئی ہمت میں تھوڑی زندگی آئی اور مایوسی میں امید کی کرن چمکی۔

شوال ۱۳۶۲ھ میں پھر میں نے خط لکھا اور ساتھیوں سے حالات معلوم کیے، معلوم ہوا کہ وارنٹ مجرم کے نہ ملنے سے منسوخ ہو چکا ہے، خطرہ نہیں ہے۔ میں نے گھر والوں کے مشورہ سے ہمت کی اور ڈرتے ڈرتے مئو پہنچ گیا اور دورۂ حدیث میں شریک ہو گیا اور تھوڑے دنوں کے بعد خوف جاتا رہا، تقریریں تو تقریباً کم کردی تھیں، البتہ لکھنے کی مشق بڑھا دی، ہر ہفتہ ایک مضمون لکھ لیا کرتا تھا اور چار مضامین کا مجموعہ قلمی ماہنامہ تیار کرلیتا تھا، جسے ساتھی پڑھا کرتے تھے۔

اللہ اللہ کر کے شعبان ۱۳۶۳ھ میں سالانہ امتحان ہوا اور اس طرح ہم نے دورۂ حدیث مکمل کرلیا، اس سال حضرت الاستاذ کی خدمت کا زیادہ موقع ملا۔ فراغت کے بعد میں مئو میں رک گیا اور حضرت والا سے ہمت کر کے ایک دن درخواست کی کہ مجھے ایک سال کے لیے دارالمصنفین اعظم گڈھ میں رکھوا دیں، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ (م ۱۳۷۳ھ) سے آپ کے کافی مراسم تھے اور استاذ محترم برابر جاتے آتے بھی تھے، فرمانے لگے غیر ندوی کو غالباً نہیں رکھتے ہیں یوں موقع آیا تو سید صاحب سے ضرور تذکرہ کروں گا۔ وسط شعبان کے بعد حضرت کا دارالمصنفین اعظم گڈھ کسی کام سے جانا ہوا۔

میری خوش قسمتی ملاحظہ ہو! بوقت ملاقات ایک دن گفتگو میں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت الاستاذ سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں ایک مولوی کو فقہ میں تیار کروں، آپ اپنا کوئی شاگرد دیں۔ حضرت کے کان میں میری بات پڑی ہوئی تھی، فرمایا: میرا ایک شاگرد اس کی تمنا بھی رکھتا ہے۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس کی صرفی نحوی اور فقہی صلاحیت مضبوط ہونی ضروری ہے۔ حضرت اقدس نے فرمایا: میری نظر میں وہ ہر طرح مناسب رہے گا، مجھے اس کی استعداد پر اطمینان

ہے اور میں اسے آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا تا کہ آپ خود بھی اطمینان فرمالیں۔

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے واپس آکر یہ سارا قصہ سنا کر فرمایا: تم کسی دن جا کر مل آؤ۔ میں نے دو دن کے بعد عرض کیا کہ جانے کا ارادہ کرلیا ہے، ایک خط تحریر فرمادیں، حضرت نے خط دے دیا، میں لے کر اعظم گڈھ حاضر ہوگیا دو دن قیام رہا، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی، خط دیا، اپنے پاس بٹھایا، پہلے کسی حدیث کے متعلق پوچھا کہ یہ کہاں ملے گی؟ میں نے کہا مشکوٰۃ شریف میں ہے۔ فرمایا دیکھیے وہ حدیث کی الماری ہے، مشکوٰۃ لیں اور یہ حدیث نکال کر لائیں۔ میں نے وہ حدیث نکال کر سامنے رکھ دی، پھر تھوڑی دیر بعد فرمایا: اس خط میں فلاں راوی کے متعلق پوچھا گیا ہے، اسماء الرجال کی الماری سے فلاں کتاب نکال کر راوی کا نام تلاش کریں اور نکال کر لائیں۔ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد ہوئی اور اس راوی کا نام بھی مل گیا اور صفحہ کھول کر سامنے رکھ دیا۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ خوش ہوئے، جب خطوط کے جواب لکھنے سے فراغت ہوئی تو اب پوچھا آپ کہاں سے آئے؟ میں نے کہا مئو سے، اچھا مولانا نے بھیجا ہوگا، جواب میں عرض کیا جی ہاں! کرسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہاں بیٹھ جایئے اور اطمینان سے بیٹھیں۔

دریافت فرمایا: آپ کیا چاہتے ہیں؟ عرض کیا ایک سال آپ کی خدمت میں یہاں رہنا چاہتا ہوں، فرمانے لگے: پڑھنے کی دو غرضیں ہوتی ہیں، کبھی دنیا سامنے ہوتی ہے، سو دیکھ رہے ہیں میں بوڑھا ہو چکا ہوں، تجربہ یہ ہے کہ اس راستہ میں دنیا نہیں ملتی ہے، ہوسکتا ہے کچھ لکھنا پڑھنا آجائے؛ دوسری غرض دین ہے، سو ماشاء اللہ آپ نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کرلی ہے، اس کا تعلق عمل سے ہے، مزید پڑھنے کا کچھ حاصل نہیں ہے، وقت برباد کرنا ہے۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی یہ باتیں بڑے اچھے اور دل نشیں انداز میں فرمائیں، میں غور سے سنتا رہا حضرت بولتے رہے۔

میں ابھی طالب علم تھا، مدرسہ سے کہنا چاہئے ابھی نکلا ہی تھا، سوچا خاموشی مناسب نہیں کچھ عرض کرنا ہی مناسب ہوگا، میں ذرا سنبھلا اور جواب میں کہا حضرت والا! میں اپنے دل کی بات بھی صاف صاف کہنا چاہتا ہوں، فرمایا ضرور کہیں، عرض کیا کہ اس وقت میں نہ دنیا کی طلب میں آیا اور نہ دین کی تلاش میں، حضرت کی خدمت میں اس لیے حاضری ہوئی ہے کہ بچپن سے اس وقت تک جو

کچھ میں نے پڑھا ہے اس سے مجھے اپنے علم پر اعتماد حاصل نہیں ہوا ہے اور جسے رسوخ فی العلم کہتے ہیں اس سے تہی دامن ہوں، دل چاہتا ہے آپ کی خدمت میں رہ کر علم میں رسوخ پیدا ہو جائے یا تھوڑا بہت اپنے اوپر اعتماد ہو جائے، علمی مناسبت پیدا ہو جائے اور ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کی مشق ہو جائے۔

میں نے محسوس کیا کہ حضرت سید صاحب میرے اس جواب سے خوش ہوئے اور اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا، فرمایا جائیے کھانا کھا کر آرام کیجیے، پھر ظہر بعد ملاقات ہوگی۔ یہ گرمی کا موسم تھا۔

دوسرے دن فرمایا: آپ کو ایک سال ندوہ میں تعلیم حاصل کرنا ہوگا، اس کے لیے درخواست لکھ کر دے جائیں میں اپنی سفارش لکھ کر بھیج دوں گا، شوال میں وہاں جا کر داخلہ لے لیں۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد اویس نگرامی صاحب اور مولانا ابوالعرفان صاحب دونوں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیر تربیت تھے، میں مہمان مولانا محمد اویس صاحب کا تھا، ان دونوں کے مشورہ سے درخواست لکھ کر پیش کر دی اور واپس مئو آ گیا، یہ شعبان ۱۳۶۳ھ کی بات ہے۔

مئو آ کر یہ سارا ماجرا حضرت الاستاذ کو سنایا، سن کر فرمایا کہ میں نے کہا تھا کہ غیر ندوی کو قبول نہیں کرتے، وہی ہوا، پھر ہنس کر فرمایا: ایک سال ندوہ میں رہو گے ندوی لکھنا شروع کر دو گے، حالانکہ سب کچھ ہم نے کیا۔ دو تین دن کے بعد حضرت سے اجازت لے کر میں وطن آ گیا۔

حضرت الاستاذ کی محبت وشفقت ملاحظہ ہو، اس کے باوجود میرا خیال برابر رکھا، چنانچہ اسی سال رمضان میں خط آیا تو اور باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا:

''میں ۳۰ر شعبان کو پھر اعظم گڈھ گیا تھا، امید تو معلوم ہوتی ہے آگے اللہ جانے''

(مکتوب ۶ر رمضان ۱۳۶۳ھ)

اس سے ظاہر ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی ہوگی اور محسوس کیا ہوگا کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے امتحان میں ظفیر کامیاب رہا۔

دوسرا گرامی نامہ آیا تو اس میں لکھا:

''کل پرسوں تک شاید میرا جانا اعظم گڈھ ہو تو یاد دہانی کر دوں گا اور اگر نہ ہوا تو خط لکھ دوں گا۔ (مکتوب ۴ر شوال ۶۳ھ مئو)

اللہ اللہ حضرت الاستاذ کی اس شفقت کا کوئی اندازہ کرسکتا ہے! اسی خط میں یہ بھی لکھا: ''اس سال امید ہے کہ مدرسہ کا سالانہ جلسہ (دستار بندی) ہوگا، ابھی تاریخ مقرر نہیں ہوئی'' (ایضاً) چنانچہ صفر ۶۴ ۱۳ھ میں یہ جلسہ ہوا اور اسی میں ہم لوگوں کی دستار بندی ہوئی۔

اتفاق کی بات اس رمضان میں سخت بیمار ہوگیا اور میری یہ بیماری محرم ۶۴ھ تک رہی تا آنکہ حضرت سید صاحب قدس سرہ کا خط آگیا۔

''مولانا کا نہ کوئی خط آیا نہ ملاقات ہوئی نہ آپ نے اپنے اسانید وغیرہ بھیجے اور وقت بھی زیادہ گذر گیا اور تعلیم کا سہ ماہی امتحان بھی گذر چکا، آپ بالفعل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی خدمت میں آجائیں'' (مکتوب ۲۴/ذی الحجہ ۶۳ھ)

آپ سمجھ سکتے ہیں اس کا مجھ پر کیا اثر ہوا ہوگا، سوچا ایک سال ۱۹۴۲ء کی تحریک میں برباد ہوا، دوسرا سال یہ بھی برباد گیا، مگر مجبوری تھی کرتا کیا، ادھر میری قسمت مجھے آواز دے رہی تھی کہ گھبراؤ نہیں، قدرت انتظام کرے گی۔ میں انہی غموں سے دوچار تھا کہ حضرت الاستاذ جن کی بے پناہ شفقت کے سایہ میں جی رہا تھا، دو چار دنوں کے بعد ہی اس بیماری میں گرامی نامہ موصول ہوا۔

''سلام مسنون و دعائے عافیت کے بعد معلوم ہو کہ رمضان سے لے کر اس وقت تک ایسی الجھنوں میں تھا کہ تم کو بلا واسطہ خط لکھنے کی نوبت نہیں آئی، بہر حال اب غور وفکر کے بعد تمھارے حق میں میں نے یہی بہتر خیال کیا ہے کہ چند دنوں یہیں مدرسہ میں رہو، مدرسہ سے کھانے کے علاوہ کچھ وظیفہ مقرر کردیا جائے گا، فتویٰ نویسی یا تدریس جس کا تم کو شوق ہو اس کی مشق ہم لوگوں کی زیر نگرانی کرو اس کے بعد دیکھا جائے گا، لہٰذا اگر صحت ہوگئی ہو تو جلد آجاؤ۔

میں نے اس سال کمیٹی میں اپنی تجویز رکھ کر پاس کرالی ہے کہ مدرسہ میں اپنے یہاں کے فارغ التحصیل دو تین لڑکوں کو مختلف شعبوں میں رکھ کر ان سے مختلف چیزوں میں مشق کرائی جائے، اگر تمھارے آنے میں دیر ہو تو فوراً مطلع کرو اور اندازہ سے اپنے آنے کی تاریخ بتاؤ''۔ (۲۶/ذی الحجہ ۶۳ء)

بیماری و مایوسی کے عالم میں حضرت الاستاذ ﷫ کا یہ مکتوب گرامی پیام زندگی لے کر آیا،

مسرت اس کی کہ اساتذہ کی نظر میں اس بندہ کی ایک جگہ ہے اور انھوں نے از راہ کرم یاد رکھا اور پھر ایسے وقت میں کہ جب مسافر راستہ کی تلاش میں ایک چوراہے پر کھڑا ہے کہ کوئی بندۂ خدا رہبری کا فریضہ ادا کرے اور کسی اچھی راہ پر ڈال دے جو منزل مقصود تک پہنچانے والی ہو۔

میں نے جواب میں لکھا کہ محرم کے دوسرے تیسرے ہفتہ میں انشاءاللہ حاضری ہوگی۔اس خط نے مرض کے بوجھ کو بھی بہت کچھ ہلکا کر دیا،صحت کی رفتار تیز ہوگئی اور ۱۳/۱۴ محرم ۶۴ھ کو مفتاح العلوم مئو حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ساتھیوں نے بتایا ابھی چند دن ہوئے شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الاسلام حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تھے اور ان حضرات کے سخت اصرار پر دیوبند جانے کا مولانا کا فیصلہ ہوگیا ہے،وہاں صدر مفتی کے فرائض انجام دیں گے سن کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ کیا ہوا!۔

حضرت الاستاذ نے بھی بوقت اطمینان فرمایا کہ یہ صورت پیش آئی،تم کو میں نے اپنے اعتماد پر بلایا تھا،اب بتاؤ کیا ہو؟ عرض کیا: حضرت مجھے مفتاح العلوم میں سردست رکھوادیں۔فرمایا ٹھیک ہے،مولانا عبداللطیف صاحب سے کہہ دوں گا وہ انتظام کردیں گے تم مل لینا،چنانچہ حضرت الاستاذ مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے ہی ملاقات میں فرمایا: بہت بہتر ہوا تم آگئے،مولانا محمد یحییٰ صاحب اور مولانا عبدالجبار مستعفی ہوچکے ہیں،بڑے مولانا دیوبند جانے والے ہیں،تم سے ایک مدرس کا کام لے لوں گا،حضرت الاستاذ مولانا اعظمی نے بھی مولانا نعمانی سے فرمادیا کہ ظفیر کا انتظام آپ کے ذمہ ہے،چنانچہ ہوگیا،چار پانچ اسباق عربی کے نیچے درجوں کے دے دیے گئے،سال بھر تدریسی فرائض اور ساتھ ہی افتاء کا کام انجام دیتا رہا،بیس روپیہ بعد میں وظیفہ بھی منظور کیا گیا،اس کے بعد ندوہ کے راستہ نگرام مدرسہ معدن العلوم کا صدر مدرس بنایا گیا،روانگی سے پہلے حضرت الاستاذ کی خدمت میں خط لکھ کر معلوم کیا تو گرامی نامہ آیا۔

اب جب کہ تمھارا مشورہ طلب خط پہنچا تو یہ دوسرا خط لکھ رہا ہوں،میرے نزدیک موجودہ حالات میں یہ بہتر ہے کہ نگرام کی ملازمت قبول کرلو،نگرام میں رہ کر تعلیم کے ساتھ مطالعہ بھی کروگے تو بہت کافی نفع ہوگا،مولانا اویس کے والد صاحب سے بہت مدد ملے گی انشاءاللہ۔

(مکتوب ۲۴/اکتوبر ۱۹۴۵ء)

نگرام میں یکسوئی سے پڑھنے پڑھانے میں لگ گیا، حضرت الاستاذ کو اس کی خبر ملی تو خوشی کا اظہار فرمایا اور لکھا ''یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم یکسوئی کے ساتھ کام کر رہے ہو۔ محنت کا یہی وقت ہے اور اس وقت کی محنت بہت کام آئے گی، میرا حال یہ ہے کہ اسی عمر میں تھک گیا، اب کام نہیں ہوتا، مطالعہ سے جی گھبراتا ہے اس لیے اس وقت کو غنیمت سمجھو۔

(مکتوب ۲۸/جنوری ۴۶ء)

اس سے پہلے جب ابتداءً نگرام پہنچا تھا اور کام شروع کیا تھا تو حضرت مولانا نے لکھا:

''خط پہنچا، حالات معلوم ہوئے، انشاءاللہ یہ صورت (تدریس کی) مفید تر ہوگی، محنت سے مطالعہ کر کے پڑھاؤ اور مولانا (انیس صاحب) کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھاؤ، طلبہ میں سچی مذہبیت اور دینداری کا جذبہ پیدا کرو، خود بھی استقلال اور اخلاص سے کام کرو، آج عالم و مولوی کہے جانے والے بہت ہیں مگر صحیح معنوں میں عالم عنقا ہو رہے ہیں'' (مکتوب ۳/ ذی الحجہ ۶۴ھ)

ایک خط میں یہ بھی لکھا:

''خوشی ہوئی اس سال تم نے بیضاوی پڑھانے کی ہمت کی خداوند تعالیٰ مدد فرمائے۔''

(مکتوب ۱۶/ذیقعدہ ۶۵ھ)

دیکھ رہے ہیں قدم قدم پر حوصلہ افزائی اور رہنمائی فرمائی جا رہی ہے، نگرام میں ہی ایک زمانہ میں خیال آیا کہ ایک سال پھر حضرت الاستاذ کی خدمت میں گذارا جائے اور جو علمی کمزوری رہ گئی ہے اس کو دور کیا جائے، حضرت نے اس کے جواب میں لکھا:

''تکمیل کا خیال بہت مبارک خیال ہے! میں اپنی سستی و مشغولیت کی وجہ سے کسی سے کیا وعدہ کروں، خصوصاً اس وقت کہ علمی کام میں نے تقریباً چھوڑ رکھے ہیں، صرف تین اسباق مدرسہ جا کر پڑھا آتا ہوں، میں کیا کہوں مجھے تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ علم کی روشنی ہندوستان میں برابر کم ہوتی جا رہی ہے، مدرسہ کی تعداد بڑھ رہی ہے اور علم کم ہوتا جا رہا ہے، علماء کو بھی احیاء علم کا خیال نہیں، ایسے افراد شاذ و نادر دیکھنے میں آتے ہیں، جن کو علمی ترقی کا خیال ہو، بڑے بڑے مدرسہ میں بھی غوغا کے سوا کچھ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ رحم

فرمائے''

(۲۱فروری ۴۷ء)

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا، مگر اس کے ساتھ ہی مسلم کشی کا دور شروع ہوگیا، مسلمانوں کے لیے سفر کرنا مشکل ہوگیا، اخیر دسمبر ۴۷ء میں بڑی مشکل سے لکھنؤ سے دربھنگہ آیا، اب بھائیوں نے طے کردیا کہ تم کو نگرام نہیں جانا ہے، لمبا سفر ہے، آس پاس میں جی چاہے تو کوئی ملازمت کرلو، چنانچہ ۸؍جنوری ۱۹۴۸ء کو دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر کی ملازمت کرلی، وہ نسبتاً بہت قریب جگہ تھی، گو کتابیں اس وقت نہیں کے درجہ میں تھی۔ حضرت الاستاذ کو اس کی خبر دی تو تحریر فرمایا:

''بہت حال سانحہ اگر پسند ہے تو وہیں قیام کرلو، نگرام سے جی اکتا گیا ہے تو بے دلی کے ساتھ وہاں رہنے سے اچھا یہی ہے کہ دوسرا انتظام کرلیا جائے''

(۱۲؍ربیع الاول ۱۳۶۷ھ)

اسی خط میں یہ بھی لکھا کہ ڈابھیل سے ایک مدرس کی مانگ ہے تم تیار ہو تو وہاں لکھوں، اس وقت میرے پاس ڈابھیل سے متواتر خطوط اور تار آرہے ہیں کہ کوئی ایسا مدرس دیجیے کہ مشکوٰۃ وجلالین وغیرہ بخوبی پڑھا سکے، اگر تم تیار ہو تو میں وہاں لکھوں'' (۱۲؍ربیع الاول ۶۷ھ)

میں ابھی ۳؍ربیع الاول ۶۷ھ کو ہی سانحہ پہنچا تھا اس لیے معذرت کرنی پڑی، پھر وہ جگہ بھی بہت دور تھی جس کے لیے گھر والے قطعاً تیار نہیں تھے، یہاں بتانا یہ ہے کہ حضرت الاستاذ کے پیش نظر میری علمی ترقی تھی، دور نزدیک کی بات نہیں تھی، پھر سانحہ میں کتابیں بالکل ابتدائی تھیں۔

میں نے اپنی مجبوریوں کی وجہ سے سانحہ کے قیام کو ترجیح دی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے حضرت کو یہ بات پسند نہیں تھی، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بہار میں علمی ترقی کا ماحول نہیں تھا۔

ابھی دس ماہ گذرے ہوں گے کہ پھر حضرت کے خطوط ڈابھیل کے سلسلہ میں آنے لگے اور تحریر فرمایا: ''میں نے ڈابھیل جو خط لکھا تھا اس کے جواب میں ایک تار اور ایک خط آیا ہے اور بہت تاکید کی ہے کہ اگر منظور کرلیں تو بہت جلد بھیج دیجیے'' (یکم اکتوبر ۴۸ء)

چند دن کے بعد دوسرا خط حضرت کا ملا:

تمھارے سب خطوط مل گئے، میں نے پرسوں تار دے دیا ہے کہ مولوی ظفیر الدین

ایک سو پچیس سے زائد پر راضی ہو گئے ہیں، میرے خیال میں اواخر ذی الحجہ میں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔(۱۸/اکتوبر ۴۸ء)

اب جانا ضروری ہو گیا، سانحہ مدرسہ کے مہتمم صاحب کو حضرت کے سارے خطوط دکھائے اور حکم استاذ کا مسئلہ سمجھایا، بڑی مشکل سے اس پر راضی ہوئے کہ دو ماہ کی چھٹی دیتا ہوں، آپ وہاں سے ہو آئیں کہ حضرت کی بات رہ جائے، مگر ضرور آئیں۔

ہمت کر کے پہلے مئو حاضر ہوا کہ میں ڈابھیل کا راستہ نہیں جانتا تھا اور ٹکٹ بنوا کر وہاں سے تنہا روانہ ہوا اور حضرت الاستاذ کے ارشاد کے مطابق یکم محرم الحرام ۱۳۶۸ھ کو لمبا سفر طے کر کے ڈابھیل پہنچ گیا اور پڑھانا شروع کر دیا؛ مگر ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی بخار آنا شروع ہو گیا، جسم پہلے سے نحیف تھا ہی، گھبراہٹ شروع ہو گئی، وہاں کے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ کا یہاں رہنا آپ کی صحت کے لیے مضر ہوگا، چنانچہ صحت گرتی ہی گئی دو تین ماہ بعد مجبور ہوا کہ ڈابھیل چھوڑ دوں، مولانا کو خط لکھا اور وہاں سے رخصت لے کر مئو حضرت کی خدمت میں پہنچا، میری صحت دیکھ کر حضرت ملول خاطر ہوئے، فرمایا: مولانا عبدالجبار کو بھیجا تھا ان کی صحت وہاں خوب اچھی ہو گئی اور تم مر کر آئے، آب وہوا کے موافق آنے کی بات ہے، فرمایا: مظہر العلوم بنارس چلے جاؤ، عرض کیا حضرت اب تو صحت پر توجہ دینا ضروری ہے، گھر جا کر دو تین ماہ آرام کروں، فرمایا: یہ بھی ضروری ہے۔

دیکھ رہے ہیں کہ ایک استاذ اپنے شاگرد کی علمی ترقی کے لیے کتنا کوشاں ہے اور کس کس طرح اسے لائق وفائق بنانے کے درپے ہے۔

نگرام کے قیام میں ''نظام مساجد'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی، خواہش ہوئی کہ پہلی کتاب ہے، پہلے حضرت الاستاذ نظر سے گذر جائے، اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

''میں کوشش کر رہا ہوں کہ لکھنے کا سلسلہ پھر شروع کروں، اس میں کامیابی ہوئی تو نظام مساجد پر کچھ لکھنے سے انکار نہیں''۔ (۹/شوال ۶۸ھ)

اسی زمانہ میں ''تاریخ مساجد'' کے مواد کی فراہمی میں مشغول تھا، حضرت سے رہنمائی چاہی تو لکھا: ''تاریخ المساجد کا مواد اردو تاریخ جدولیہ میں بھی ہے، اقبال نامہ جہانگیری میں بھی دو ایک مسجدوں کا ذکر یاد آتا ہے، بنارس کی دو ایک مختصر تاریخیں میں نے پڑھی تھیں،

موقع ہوگا تو اس کو تلاش کراؤں گا، جونپور کی جامع مسجد کی نسبت مجھے یاد ہے کہ ۸۵۲ھ میں
بنی ہے، بہت سی تاریخوں میں جامع دمشق کا ذکر موجود ہے، ہندوستان کی تاریخیں پڑھی
جائیں تو بہت سی مسجدوں کا حال منتشر طور پر ان میں موجود ہے، انشاء اللہ میں خیال رکھوں گا
اب ایسی جو بات نظر سے گذرے گی تم کو اطلاع دوں گا (۱۰/جون ۵۰ء)

میں سوچتا ہوں کہ استاذ محترم کو اپنے عزیز شاگرد کا کس قدر خیال ہوتا ہے اور اس کی کس کس طرح حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، چنانچہ ایک ماہ کے اندر دوسرا خط حضرت کا موصول ہوا، یہ خط بنارس سے لکھا گیا ہے:

''عزیزم سلمہ اللہ۔ السلام علیکم

میں دل بہلانے کو دو ایک دن کے لیے بنارس آ گیا ہوں، یہاں پہنچ کر ایک کتاب دیکھنے کا موقع ہوا، اس میں بنارس کی مسجدوں کی ایک فہرست درج ہے، اس کی رو سے بنارس میں ۲۶۶ مسجدیں ہیں، مسجدوں کا پورا پتہ، نام متولی وغیرہ بھی درج ہے۔

قدیم شاہی مسجد کا تفصیلی تذکرہ بھی کیا ہے، اس کتاب کا نام ''مرقع بنارس'' ہے میں نے عزیزم مولوی محمد عبدالحمید مکی مدرس مظہر العلوم کچی باغ بنارس سے کہہ دیا ہے کہ مذکورہ بالا فہرست کی ایک نقل تمھارے پاس بھیج دیں''۔ (مکتوب ۵/جولائی ۵۰ء)

دیکھیے! حضرت الاستاذ کی کیسی شفقت و محبت تھی اور اپنے ایک معمولی شاگرد کا کس قدر لحاظ و پاس تھا اور اس کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کا کتنا اہتمام تھا اور اس کی علمی زندگی میں کیسی مدد اور کرم فرمائی تھی۔

''تاریخ مساجد'' کا جو پہلا حصہ شائع ہوا ہے اور الحمد للہ حضرت کی زندگی میں چھپا ہے، اس میں مرقع بنارس کا بکثرت حوالہ ہے، میں نے یہ کتاب لکھنؤ کے ایک مکتبہ سے قیمتاً منگوائی تھی اور اس سے مجھے بڑی مدد ملی۔

ایک خط میں تحریر فرمایا:

''برہان دہلی میں تمھارے مضامین پڑھتا رہتا ہوں، ۱۵/اگست کو جو معارف شائع ہوگا اس میں ایک مختصر مضمون حقیر کا بھی ہوگا، اس میں تعلیقات درایہ علامہ قاسم شائع

ہور ہے ہیں، وہ ایک رسالہ کے ذیل کے طور پر مصر سے بھی شائع ہور ہے ہیں۔ میں نے ہی اس کی ایک نقل مصر بھیجی تھی''۔ (۹/شوال ۶۹ھ)

دوسرے گرامی نامہ میں رقم فرمایا:

''میں بمعیت مولوی عبدالجبار صاحب ۸/ستمبر کو حجاز روانہ ہو رہا ہوں، دعا کرتے رہنا، میں بھی انشاء اللہ تعالیٰ دعا کروں گا، اسی جہاز سے مولانا عبدالشکور لکھنوی، مولانا عبدالحق مدنی، مولانا فخر الدین اور مولوی قاسم شاہ جہاں پوری وغیرہم بھی جارہے ہیں'' (۶/ستمبر ۵۰ء از بمبئی)

اس سے بڑھ کر کرم فرمائی اور دلدہی اور کیا ہوگی کہ دیار مقدس کی روانگی کی اطلاع بمبئی سے دے رہے ہیں اور لکھتے ہیں کہ تمھارے لیے وہاں پہنچ کر دعا کروں گا۔

واپسی کے بعد لکھا:

''میں ۶ یا ۷/نومبر کو مئو واپس آ گیا تھا، بمبئی کے اخبارات میں کئی دفعہ میری واپسی کی اطلاع شائع ہوئی تھی، میں نے خیال کیا کہ اخبارات کے ذریعہ شاید تم کو بھی اطلاع مل گئی ہو، اس لیے براہ راست اطلاع نہیں بھیجی۔

بمبئی میں مولانا عتیق الرحمٰن (عثمانی) مدیر برہان بھی ملے تھے اور دیر تک تمھاری نسبت مجھ سے سوالات کرتے رہے، ''نظام مساجد'' کے چھپوانے کا خیال بھی انھوں نے ظاہر کیا، میں نے تمھارے باب میں اطمینان بخش کلمات کہے اور انھوں نے حسن ظن کی بنا پر یہ کہا کہ یہ تعلق ہی کافی سے زیادہ ہے۔ برہان میں تمھارا مضمون پڑھا، **زادک اللّٰہ علماً واسعدک فی الدارین ونفعک بالعلم وعلمک ما ینفع وسلک بک مسلک محبتہ ورضاہ والسلام** (حبیب الرحمٰن الاعظمی ۱۱/ربیع الثانی ۷۰ھ)

استاذ مکرم نے کہاں کہاں یاد کیا اور یاد رکھا، اپنے معمولی شاگرد کو کیسے بڑھایا اور روشناس کرایا، اس کی حوصلہ افزائی فرمائی اور اخیر میں کتنی اور کیسی نفع بخش دعائیں بے ساختہ ایک نادان شاگرد کو دانا بنانے کے لیے زبان قلم سے نکل رہی ہیں، ایک محدث کبیر ولی صفت اور خدارسیدہ بزرگ کی یہ دعائیں رائیگاں ہوں گی، دل کہتا ہے ہرگز نہیں، شاگرد کے ظرف کے مطابق بہت کچھ قبول ہو کر رہیں

گی انشاء اللہ۔اور غالباً یہی دعائیں دنیا وعقبی کے لیے کارساز بنیں گی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

''تاریخ مساجد'' کی تالیف کے سلسلہ میں ایک دفعہ خط لکھا تھا، مگر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن میں یہ اس طرح راسخ ہوا کہ برابر خبر گیری فرماتے رہے، ایک خط میں پھر دریافت فرمایا:

''میں نے کئی خط میں تاریخ مساجد کی نسبت دریافت کیا تھا کہ تمھارے پیش نظر دنیا کی تاریخ مساجد ہے یا تاریخ مساجد ہند یا اور کچھ؟ یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ممکن ہے میں بھی حوالے بتا سکوں، اس سلسلہ میں اب تک کیا کام ہوا ہے؟ الفرقان میں تمھارا مضمون پڑھا بارک اللہ فیک'' (مارچ ۵۰ء)

استاذ اپنے شاگرد کا مضمون پڑھ لے یہی سعادت شاگرد کے لیے بہت ہے، چہ جائیکہ خوشی کا بھی اظہار ہو اور دعائیں بھی دے، پھر شاگرد کی توانائی میں کیسے اضافہ نہ ہوگا اور اس کا حوصلہ کیونکر نہیں بڑھے گا! سچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد اساتذہ کرام کی دعاؤں سے ہی جو کچھ بھی تھوڑا بہت ہوا ہے ورنہ اپنے پاس کچھ نہیں ہے۔

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ خاص سے ''اسلام کا نظام مساجد'' نامی کتاب ندوۃ المصنفین دہلی سے چھپی، جب کہ خاکسار کی ملاقات نہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سے تھی اور نہ مرحوم مولانا اکبرآبادی سے، اور نہ خاکسار لکھنؤ سے آگے کبھی گیا تھا، یہ صرف فضل خداوندی تھا۔ میرے پاس اس کے نسخے آئے تو میں نے سب سے پہلے اس کا ایک نسخہ بہت شوق سے استاذ محترم کی خدمت میں بھیجا، حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا:

''نظام مساجد کی ایک جلد اور کئی خطوط ملے، مگر میں اب اپنی ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہتا ہوں، مدتوں سے سکون واطمینانِ قلب نصیب نہیں، تردداتِ وافکار کا ہجوم ہے، ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ مطالعہ میں جی لگتا ہے نہ تصنیف وتالیف میں۔ نظام مساجد کو جگہ جگہ سے دیکھا، جی بہت خوش ہوا، کاش پہلا زمانہ ہوتا تو میں انشاء اللہ تعالیٰ کئی جگہ نفس مضمون کے متعلق اور بعض بعض مقامات پر تعبیر اور ادائے مفہوم کے باب میں مفید مشورہ دیتا''۔

(یکم ذیقعدہ ٧٠ھ)

دراصل حضرت پر اپنے والد بزرگوار کی وفات کا بڑا گہرا اثر پڑا، گھر کا کوئی انتظام حضرت کے

سپرد نہ تھا، یہ بالکل بے فکر اپنے لکھنے پڑھنے میں ہمہ تن مشغول رہا کرتے تھے، ۴۵ سال کی عمر تک سارا بوجھ آپ کے والد بزرگوار کے سر رہا، مگر ان کے انتقال سے یہ سارا بوجھ آپ کے سر آ گیا، اس خط میں اپنی پریشانی کا اور بھی تذکرہ ہے، استاذ کو اپنے شاگرد سے بے انتہا محبت ہوتی ہے، یہ لکھ کر محسوس فرمایا کہ ظفیر پر اس کا اثر ہوگا تو اخیر میں یہ جملہ بھی لکھا:

''میں جواب لکھ کر پچھتا تا ہوں کہ شاید یہ جواب تمھارے لیے انتظار سے زیادہ رنج دہ ہوگا۔ واللہ المستعان'' (ایضاً)

کوئی اس محبت کا اندازہ لگا سکتا ہے، حضرت الاستاذ باپ سے زیادہ شفیق تھے اور میرے لیے آپ کے قلب میں بڑی جگہ تھی، بتایا جائے آخر ایسے استاذ کے سایہ کے اٹھ جانے کا غم کیسے نہ ہو! اور ان کی یاد کیسے نہ آئے! اور کیونکر نہ ستائے (**نورا للّٰہ مرقدہ وجعل الجنة مثواہ**) اس سب کے ساتھ ''نظام مساجد'' پڑھ کر حضرت والا نے خوشی محسوس فرمائی کہ ایک عزیز نے محنت کی اور کام کی ایک کتاب مساجد کے نظام پر لکھ دی، جس میں مساجد سے متعلق ساری آیتیں اور ساری حدیثیں یکجا ہو گئیں اور بہت دنوں کے بعد سعودیہ حکومت اور دوسرے علماء نے مسجدوں کے نظام کی اہمیت محسوس کی، الحمد للہ اس موضوع پر سب سے پہلے خاکسار کے قلم سے ایک کتاب آئی اور پسند کی گئی۔

ایک خط آیا تو دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ:

''رسالہ دار العلوم میں تمھارا مضمون پڑھا جی خوش ہوا، زیادہ خوشی کی یہ بات ہے کہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہو، کام میں لگے رہنا انشاء اللہ رائیگاں نہ جائے گا''۔

اسی خط میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ:

''میں نے پرسوں نرسوں عربی میں ایک مقالہ ''**رحلة السيد أحمد الشهيد إلى الحجاز** '' کے عنوان سے لکھا ہے، صاف ہو جائے تو ممکن ہے اس کو الحج مکہ میں اشاعت کے لیے بھیج دوں''۔ (یکم محرم الحرام ۱۳۷۱ھ)

ایک خط میں لکھا:

''میں اپنے فیصلہ پر قائم ہوں، مدرسہ کے لوگ بہت چاہتے ہیں مگر میرا جی کسی طرح نہیں چاہتا'' (ایضاً)

بندہ کے دوسرے خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

''اب اصل میں پڑھانے کو میرا جی نہیں چاہتا، ورنہ مدرسہ مفتاح العلوم والے اب تک بہت کوشاں ہیں'' (۱۲؍صفر ۱۴۰۱ھ)

ایسا معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں حضرت بہت دل برداشتہ تھے، آگے اسی خط میں یہ بھی لکھا:

''میرے خیال میں آج کل ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے جس سے عربی خواں طلبہ میں دینی ولولہ اور علم وتحقیق کا جوش پیدا ہو، کچھ نہیں تو عربی زبان میں مہارت اور اس پر قدرت حاصل کرنے کا جذبہ ابھرے، غور سے دیکھو کہ ہمارے مدارس کی پیداوار اب کیا اور کتنی رہ گئی ہے''۔

یہ اصل میں پڑھانے سے دل اچاٹ ہونے کی وجہ ہے کہ طلبہ میں پڑھنے اور علم کا شوق ناپید ہوتا جارہا ہے، بطور خانہ پری یہ سب کچھ ہورہا ہے پھر کیا جی لگے۔

مضمون لمبا ہوتا جارہا ہے، اب یہاں حضرت کی اس خصوصی سند کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا جو حضرت نے لکھ کر عنایت فرمائی، ایک انقلاب میں جب یہ سند ضائع ہوگئی تو مجھے بڑا غم ہوا، بہت سی کوشش کیں کہ کوئی اسے واپس کردے مگر کامیابی نہیں ہوئی، میں نے کئی سال بعد حضرت کو خطوط لکھے کہ میری سند کوئی اڑا لے گیا دوسری سند لکھ دی جائے، مگر حضرت ٹالتے گئے، بعض نئے شاگردوں سے فرمایا کہ اب تو ظفیر دوسروں کو سند دینے لگا ہے، اب لے کر کیا کرے گا، بات پہنچی مگر جی نہیں مانا، مئو خدمت اقدس میں حاضری ہوئی تو انتقال سے دو سال پہلے خود بھی عرض کیا: حضرت سند لکھ دیں کوئی چیز تو میرے پاس رہے، فرمایا: دیکھوں گا، تحریر نہیں فرمایا، ابھی جب میں نومبر ۹۲ء میں مئو حاضر ہوا تو برادر مکرم مولانا رشید احمد مہتمم مدرسہ مرقاۃ العلوم مئو نے فرمایا: ایک خوشخبری ہے، میں نے کہا: سنایئے، کہنے لگے ابا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ سند کاغذات میں ہاتھ آگئی، جس کی نقل کتابت کرا کر آپ کو بھیجی گئی تھی، پوری عبارت ابا کے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ میں بہت خوش ہوا، میں نے کہا اصل تو یہیں رہنے دیجئے، نقل مرحمت فرمادیجیے، چنانچہ اس کی نقل مولانا موصوف نے میرے حوالہ کی، اور اصل تحریر ہم کئی آدمیوں نے پڑھی اور دیکھی، حضرت الاستاذ کی یہ سند اس وقت میری سب سے گراں قدر دولت ہے، اس پر جس قدر مجھے فخر ہو کم ہے، سند یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ الکبیر المتعال والصلوٰۃ والسلام علی سید نا محمد واصحابه والآل وبعد فان اخانا الصالح الفاضل المبرز علی اقرانه المولوی ظفیر الدین بن محمد شمس الدین (من رساتیق دربھنگه) وقد الیّ والتزم حضور مجالس دروسی فی التفسیر والحدیث والفقه وغیر ذلک من العلوم العقلیة والنقلیة، وجد واجتهد فی تلقی الدروس وتفهمها حتیٰ اضطلع من هذه العلوم کلها واتقنها بحیث عرف فضله بین رفقائه وتقدمه علی اقرانه ثم انه عاد الی اهله فلم یزل مشتغلا بالمطالعة مکبا علی الدرس والتدریس معتنیاً بالتالیف والتصنیف وقد ظهر بعض مصنفاته، فقوبل بالاستحسان والتقدیر، ووصف المصنف بالاجارة، هذا وارجو من الله تعالیٰ ان یکون له شان فی المستقبل وهذه شهادتی له بالنبوغ والفضل والبراعة، وانه عندی مرشح للافادة والتریس، بارک الله فی حیاتہٖ وزادۂ علماً ووفقه لما یحبه ویرضاه، وکان ذلک فی غره ذی القعدة من سنة اربع وسبعین وثلٰثمائته والف من الهجرة النبویة علی صاحبها الف صلوٰۃ وتحیة والحمد للّٰہ اولا واٰخرا.

وانا الفقیر الیٰ رحمة مولاه الغنی
ابوالمآثر حبیب الرحمن الاعظمی مذهباً
والمئوی مسکناً عامله الله بلطفه

اپنے ایک تلمیذ کے لیے ایسی سند خود استاذ مکرم کے قلم فیض رقم سے کس قدر عزت افزائی اور اس کی خوش بختی ہے جس کے لیے یہ لکھی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس تحریر کی لاج رکھے اور تلمیذ کو کسی لائق بنادے۔

یہ سند اس وقت عطا ہوئی جب خاکسار سانحہ ضلع مونگیر کے دارالعلوم معینیہ میں صدارت تدریس پر فائز تھا۔ اور میری دو کتابیں نظام مساجد اور نظما عفت وعصمت ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکی تھیں۔

اس وقت یہ مقالہ اسی پر ختم کرتا ہوں، انشاء اللہ دوسری قسط پھر پیش کرنے کی سعی کروں گا۔

ذرۂ آفتابِ تابانیم

مولانا ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی٭

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ سے اس ناچیز کا ربط وتعلق صرف ذاتی نہیں، بلکہ خاندانی بھی رہا ہے۔ حضرت مولانا ابتدا ہی سے مطالعۂ کتب کے دلدادہ تھے، ہند اور بیرون ہند کے اہم کتب خانوں اور ان کے علمی نوادرات سے متعلق معلومات میں وہ برابر اضافہ کرتے رہتے تھے۔ حضرت کے وطن مئو ناتھ بھنجن سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع قصبہ گھوسی میں راقم کے جد امجد مولانا محمد صاحب، علی صاحب [۱] (مولود ۱۲۰۹ھ مطابق ۹۵-۱۷۹۴ء متوفی جمادی الاخری ۱۲۸۱ھ مطابق نومبر ۱۸۶۴ء) کا بہت اہم اور قیمتی کتب خانہ تھا۔ اسی کتب خانہ کے تعلق سے ہمارے گھرانے سے ان کے روابط استوار ہوئے۔ مولانا صاحب علی کی وفات کے بعد ان کا کتب خانہ ان کے دو بیٹوں کے درمیان تقسیم ہوا، بڑے بیٹے کا نام محمد عبدالقادر (متوفی ۲۵ مارچ ۱۹۱۳ء) اور چھوٹے کا محمد نصیر (متوفی ۳۰ نومبر ۱۹۲۹ء تھا۔ اول الذکر بڑے زبردست اور جید الاستعداد عالم تھے، وہ علوم عربیہ کے علاوہ سنسکرت سے بھی خوب واقف تھے، مناظروں اور علمی مذاکرات کے لیے پنڈتوں سے بھی ربط وضبط رکھتے تھے، انھوں نے دعوائے امامت بھی کیا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی نے ''مقدمۂ حیات شبلی'' میں ان کا اور ان کے قیمتی کتب خانے کا ذکر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا محمد عبدالقادر کی وفات کے بعد ان کی اولاد واحفاد میں علم دین کا سلسلہ باقی نہیں رہا، اس کے نتیجے میں ان کے کتب خانے کا بیشتر حصہ ضائع ہوگیا۔ حضرت مولانا اعظمی نے مولانا محمد عبدالقادر صاحب کے پوتے جناب عبدالرحمٰن (متوفی یکم جولائی ۱۹۸۷ء) بن علاء الدین صاحب (متوفی ۲ فروری ۱۹۳۲ء) سے ملاقات کرکے باقی ماندہ چند قلمی اور مطبوعہ کتابیں حاصل کی تھیں اور انھیں دارالعلوم مئو کے کتب خانے میں داخل کردیا تھا۔ [۲] مولانا صاحب علی صاحب کے کتب خانے کا وہ حصہ جو راقم

٭ پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کے پردادا مولوی محمد نصیر صاحب سے متعلق تھا، بہت دنوں تک اپنی اصل حالت میں برقرار رہا، گذشتہ تیس چالیس سال کے عرصے میں اگر چہ اس کی کماحقہٗ حفاظت نہ ہوسکی، لیکن اس کا معتد بہ حصہ بحمدہ تعالیٰ اب بھی موجود ومحفوظ ہے۔ مولانا اعظمی اس ذخیرۂ کتب اور اس کے نوادرات سے بھی پوری طرح واقف تھے، چنانچہ ایک ملاقات کے دوران مجھ سے فرمایا کہ تمھارے یہاں کے کتب خانے میں ''الذخیرۃ'' نام کی فقہ حنفی کی ایک قلمی کتاب تھی۔ یہ نادر وکم یاب ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ دوبارہ حاضری کا موقع ملا تو میں نے دریافت کیا کہ کیا اس سے مراد ''ذخیرۃ العقبیٰ'' ہے؟ فرمایا کہ نہیں، یہ دونوں دو الگ الگ کتابیں ہیں۔ افسوس ہے کہ موجودہ کتابوں میں یہ کتاب کہیں نظر نہیں آئی۔

راقم نے حضرت مولانا کی زیارت پہلے پہل کب اور کس طرح کی؟ سارا منظر اب بھی نگاہوں کے سامنے ہے۔ غالباً ۱۹۶۶ء کا سال تھا کہ میرے والد ماجد مولانا وقار احمد صاحب مرحوم (متوفی ۱۷رجون ۱۹۶۹ء) مئو تشریف لے گئے، میں بھی ان کے ہمراہ تھا، میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال رہی ہوگی، میں اس سے پہلے مئو کبھی نہیں گیا تھا، بہر حال اس دن والد صاحب نے مئو میں مختلف حضرات سے ملاقاتیں کیں، دوپہر تک کا وقت انھوں نے مولانا ادریس صاحب کے مکان پر گذارا، سہ پہر کے وقت چوک میں ایک دوکان پر مولانا عبداللطیف نعمانی سے ملاقات کی، پھر نماز عصر کے بعد وہ کسی گلی کے اندر واقع ایک مکان کے پاس پہنچے، جہاں مکان کے سامنے کسی قدر کشادہ جگہ تھی اور عرض میں تین چار، چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، ان میں سے بیچ کی چارپائی پر ایک معمر شخصیت تشریف فرما تھی اور داہنے، بائیں کی چارپائیوں پر دوسرے مختلف حضرات بیٹھے ہوئے تھے، لیکن سب کا رخ انھیں معمر شخصیت کی جانب تھا۔ یہ حضرت مولانا اعظمی تھے، لیکن میں نے اس وقت تک حضرت اعظمی کا نام سنا تھا نہ ان کے رتبۂ علمی سے واقف تھا، چنانچہ میں نے حیرت واستعجاب کے ساتھ دیکھا کہ میرے والد ان کے قریب پہنچ کر بہت ہی مؤدبانہ انداز میں بیٹھ گئے، بالکل اس طرح جیسے شاگرد استاذ کے سامنے بیٹھتا ہے، والد نے کچھ علمی استفسارات بھی کیے، جن کی تفصیل تو مجھے یاد نہیں، ہاں اس قدر یاد ہے کہ حضرت حسن بصری سے متعلق کچھ باتیں انھوں نے دریافت کی تھیں، جس کے جواب میں حضرت مولانا نے کچھ ارشاد فرمایا تھا۔ بہر حال یہ پہلا نقش تھا، جو حضرت کی شخصیت سے متعلق میرے دل ودماغ پر ثبت ہوا۔

اس کے بعد ۷۲-۱۹۷۱ء میں جب میں مظاہر علوم، سہارنپور میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا، بخاری شریف کے درس کے دوران، استاد گرامی حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہ العالی کی زبانی ادب واحترام کے انداز میں حضرت اعظمی کا نام نامی سننے میں آیا۔ چنانچہ تعلیمی سال کے اختتام کے معاً بعد ایک دن مئو حضرت کے دردولت پر حاضر ہوا۔ حضرت شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آئے۔ میں نے اس حاضری بلکہ حضوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دریافت کیا کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ دیگر ائمۂ مجتہدین کے مذاہب کے رواج نہ پانے کے اسباب کیا ہیں؟ حضرت نے مختصر لیکن جامع انداز میں اس کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد میں نے احادیث کے مختلف قدیم مجموعوں کے متعلق معلوم کیا کہ اب ان کا کہیں سراغ ملتا ہے یا نہیں؟ افسوس کہ اس وقت ان تمام کتابوں کے نام یاد نہیں، لیکن ایک سوال امام نسائی کی ''سنن کبریٰ'' سے متعلق بھی تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے علم میں دنیا کے معروف کتب خانوں میں اب اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ (۳) اس کے بعد حضرت کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضری دینا میرا معمول بن گیا۔ ہر ملاقات میں راقم کی مصروفیات اور مشاغل کے بارے میں ضرور دریافت فرماتے۔ میں چونکہ جامعہ اسلامیہ بنارس سے متعلق تھا۔ اس لیے یہاں کے دیگر اساتذہ کے بارے میں بھی معلوم کرتے کہ وہاں اور کون لوگ ہیں؟ کیا پڑھاتے ہیں؟ وغیرہ۔ میں بھی ہر ملاقات میں استفادہ کی غرض سے کوئی نہ کوئی سوال ضرور کرتا تھا۔ لیکن حضرت اس پر کبھی خفگی یا ناراضگی کا اظہار نہیں فرماتے تھے، بلکہ ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ جواب مرحمت فرماتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحقیق سے الرباط، المغرب سے شائع شدہ ''سیرۃ ابن اسحاق'' کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ کی الماری میں یہ ''سیرۃ ابن اسحاق'' کا جو نسخہ نظر آرہا ہے، کیا یہ پہلی بار شائع ہو رہا ہے؟ فرمایا جی ہاں، پہلی بار، پھر فرمایا کہ اس کے علاوہ ''سیرۃ'' کا بقیہ حصہ کہیں بھی دستیاب نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو جو کچھ ملا انھوں نے شائع کر دیا ہے۔ اسی ملاقات میں میں نے عرض کیا کہ حسن الصغانی کی ''العباب الزاخر'' کا بھی کہیں پتہ چلتا ہے؟ فرمایا کہ ہاں مصر کے کتب خانوں میں دستیاب ہے، البتہ ہندوستان میں نہیں ہے۔ مصر ہی سے کویت وغیرہ میں مائیکرو فلم منگالیا گیا ہے۔

۱۹۷۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ۸۵/سالہ جشن تعلیمی کے موقع پر حضرت بھی

لکھنؤ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں ایک دن بعد نماز عصر مہمان خانے کے سامنے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی بعض مؤقر عرب علماء کے ہمراہ تشریف فرما تھے، جن میں شیخ الازہر عبدالحلیم محمود بھی تھے کہ اسی دوران حضرت مولانا اعظمی اس طرف تشریف لائے میں نے دیکھا کہ حضرت کو دیکھتے ہی یہ تمام حضرات اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے حضرت اعظمی کا عرب علماء سے بہت عمدہ انداز میں تعارف کرایا۔ اس کے بعد حضرت اعظمی عرب علماء سے دیر تک عربی میں گفتگو فرماتے رہے۔

غالباً ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۰ء کے دوران حضرت کے پوتے مولوی ازہر صاحب جامعہ اسلامیہ بنارس سے بحیثیت مدرس وابستہ رہے۔ اس نسبت سے حضرت کے یہاں میری آمد ورفت کچھ بڑھ گئی۔ اسی زمانے میں میں نے ''قصیدہ اصل، ہیئت اور حدود'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اشاعت سے قبل یہ مضمون حضرت کی نگاہ سے گذر جائے مین مسودہ لے کر حاضر خدمت ہوا اور عرضِ مدعا کیا۔ حضرت نے اسے رکھ لیا۔ اپنی علالت اور علمی مشغولیات کی وجہ سے اسے بالاستیعاب تو نہ پڑھ سکے، لیکن اس کا ایک حصہ ملاحظۂ گرامی سے گذار کر اس پر یہ فقرہ اپنے قلم سے تحریر فرمایا: ''جہاں تک دیکھ سکا ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے''۔

اسی طرح میں نے اپنا ایک اور مضمون ''علوم دینیہ اور مطبع نول کشور'' اشاعت سے قبل بہ نظرِ اصلاح حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت نے اسے بھی ملاحظہ فرما کر زبانی اس پر اطمینان کا اظہار فرمایا۔ البتہ بعض مصنفین کے سنین وفات کے سلسلے میں شبہہ ظاہر کیا۔ ۱۹۸۲ء میں ماہنامہ ''الرشاد'' اعظم گڑھ (شمارہ جنوری، فروری ۱۹۸۲ء) میں غزوۂ بنی نضیر کے باعث ومحرک سے متعلق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ابن اسحاق اور عام سیرت نگاروں نے غزوۂ بنی نضیر کے اصل باعث کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس میں سہوِ کتابت کا دخل ہے۔ نیز اس پر یہ اشکال بھی واقع ہوتا ہے کہ قتل جب ایک مسلمان نے کیا تھا تو دیت کی ادائیگی میں یہودیوں کو کیوں شریک کیا گیا؟ اس لیے اس سلسلے میں مصنف عبدالرزاق اور سننِ ابوداؤد کی روایت کو قبول کر لینا چاہیے۔ راقم نے ڈاکٹر صاحب کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے ایک مضمون تحریر کیا اور بعض روایات کی تغلیط کے بجائے دونوں طرح کی روایتوں میں جمع وتطبیق کی کوشش کی۔ اس مضمون

کی تسوید کے دوران مختلف امور کے سلسلے میں حضرت سے مراجعت کے لیے ایک سے زائد مرتبہ حاضر خدمت ہوا۔ حضرت نے حل طلب امور کے سلسلے میں نہایت عالمانہ اور محققانہ انداز میں رہنمائی فرمائی۔

جامعہ اسلامیہ بنارس میں ۷۸-۱۹۷۷ء میں ہدایہ جلد رابع کا درس مجھ سے متعلق ہوا، تو میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ ہدایہ کے لیے کس شرح کا مطالعہ زیادہ مفید ہوگا، حضرت نے فرمایا کہ علامہ بدرالدین عینی کی ''البناية في شرح الهداية'' کا۔ میں اس وقت تک اس کتاب کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ کتاب بھی کم یاب تھی۔ دوبارہ حاضر ہوکر عرض کیا کہ ''البناية'' کے مطالعے کا آپ نے مشورہ دیا تھا۔ مجھے حصۂ چہارم کی ضرورت ہے۔ اب تک نہیں مل سکی۔ دارالمصنفین میں بھی صرف دو حصے ہیں۔ فرمایا کہ ''ہاں نایاب کتاب ہے، صرف ایک بار مطبع نول کشور سے چھپی ہے۔ میں نے مولوی عبدالکریم صاحب ساکن یوسف پور محمد آباد ضلع غازی پور سے لے کر مفتاح العلوم مئو، کے کتب خانے میں داخل کردی ہے''۔ راقم نے مفتاح العلوم کے بعض ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا، لیکن انھوں نے اسے دینے سے معذرت ظاہر کی۔ بہرحال کئی ماہ کی تگ ودو کے بعد بنارس ہی کے ایک مدرسے کے کتب خانے سے حاصل کر کے اسے مسلسل مطالعے میں رکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت کی اصابت رائے کا بھی اندازہ ہوا۔

حضرت کا حافظہ متقدمین محدثین کے انداز کا تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میں دارالمصنفین اعظم گڈھ میں وہاں کی قلمی کتابوں کی فہرست دیکھ رہا تھا، اس میں ایک کتاب کا نام سامنے آیا۔ ''القول الصواب في مسائل الخضاب'' آگے مصنف کے نام کے تحت درج تھا۔ ''مولوی تراب علی'' پھر بین القوسین لکھا تھا۔ (گھوسی اعظم گڈھ) گھوسی کے محلّہ قاضی پورہ میں عثمانی شیوخ کے خانوادے میں ایک صاحب مولوی تراب علی، گذرے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان کا نسب نامہ بھی لکھا ہے۔ میرا ذہن ان کی طرف منتقل ہوا، اور پھر اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں تحقیق کا اشتیاق پیدا ہوا۔ سوءِ اتفاق کہ کتاب لاپتہ تھی، یعنی الماری میں اپنی متعینہ جگہ پر موجود نہ تھی۔ اس لیے اس کتاب کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لکھنؤ جانا ہوا۔ وہاں ایک الماری میں ندوۃ العلماء کے کتب خانے میں بھی ''القول الصواب في مسئلة

الخضاب ''نام کی ایک کتاب نظر آئی، یہ مطبوعہ تھی اور اس پر سالِ طباعت ۱۲۸۰ھ لکھا ہوا تھا۔لیکن اس کے مصنف مولوی تراب علی لکھنوی تھے۔اب الجھن یہ پیش آئی اصل مصنف کون ہے؟ تراب علی گھوسوی یا تراب علی لکھنوی؟ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ابھی صرف اتنا ہی عرض کیا تھا کہ دارالمصنفین کی فہرست میں فلاں کتاب کے مصنف کا نام تراب علی گھوسوی درج ہے، یہ کون صاحب ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ دارالمصنفین کے فہرست نگار کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ مولوی تراب علی لکھنوی کی تصنیف ہے۔۱۲۸۰ھ میں چھپ چکی ہے۔اپنے موضوع پر معتبر ومستند اور جامع کتاب ہے۔اس کا حجم ایک متوسط رسالے کا ہے''۔حضرت نے اس کتاب کو نہ معلوم کب دیکھا ہوگا، لیکن انھیں اس کا موضوع، اس کی قدر و قیمت اور سالِ اشاعت وغیرہ سب کچھ بالکل مستحضر تھا۔ میں عرض کیا کہ دارالمصنفین ہی میں ایک اور کتاب بھی نظر آئی تھی ''**القول الصواب فی مسئلة الخطاب**''۔فرمایا کہ ''ہاں یہ حضرت تھانوی کا رسالہ ہے اور اس کا موضوع انگریزوں کے زمانے میں ملنے والے خطابات ہیں، مثلاً شمس العلماء وغیرہ''۔

نادر اور کم یاب کتابوں کے بارے میں حضرت کی معلومات غیر معمولی طور پر وسیع تھیں۔ ایک مرتبہ مجھے علامہ ذہبی کا ایک قلمی رسالہ موسوم بہ ''**ذکر اسماء من تکلم فیه وهو مؤثق**'' ایک جگہ نظر آیا۔حضرت کے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب کے واسطے سے دریافت کیا کہ یہ رسالہ چھپ چکا ہے یا نہیں؟ جواب میں مولانا رشید احمد صاحب نے لکھا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ:

''یہ مصر میں ایک دوسری کتاب کے ساتھ ضمناً طبع ہو چکا ہے''۔

مرزا محمد حارثی بدخشی کی کتاب ''تاریخ محمدی'' نادر و کمیاب کتاب ہے، ہندوستان میں اس کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب تھا اور وہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ تھا۔نامور محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی کے لیے ہندوستان پرنٹنگ ورکس رام پور سے ۱۹۶۰ء میں اس کتاب کا آخری جزء شائع کر دیا تھا میں نے مولانا رشید احمد کے ذریعہ مطبوعہ حصہ حضرت کی خدمت میں بھیجا، مئو پہنچ کر مولانا رشید احمد صاحب نے لکھا کہ حضرت نے اسے دیکھ کر فرمایا:

''اچھا یہ کتاب چھپ گئی، میں تو رام پور کے کتب خانے میں اس کا مطالعہ کر چکا ہوں''۔

بلاشبہہ حضرت اعظمی ایک نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا وسیع مطالعہ، غیر معمولی حافظہ، علم حدیث میں تخصص و امتیاز اور تفقہ اپنی مثال آپ تھا۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی علم وفضل کے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ حضرت نے باوصف علالت وضعف از راہِ شفقت وخورد نوازی ۳۱/ جنوری ۱۹۸۱ء کو راقم کی شادی کی تقریب میں شرکت کی غرض سے گھوسی غریب خانے پر قدم رنجہ بھی فرمایا تھا۔

فهـا أنـا أتـمثـل ببيت أبى نواس حين قال في رثاء محمد الأمين بن هارون الرشيد:

طوى الموت ما بيني وبين محمد وليـس لـمـا تطوى المنية ناشر

حواشی:

(۱) مولانا صاحب علی بن ملک دولت علی صدیقی گھوسوی اپنے عہد کے معروف عالم تھے، انھوں نے متوسطات تک عربی درسیات کی تعلیم جون پور میں حاصل کی، مولانا سخاوت علی جونپوری ان کے اساتذہ میں تھے۔ اس کے بعد انھوں نے کلکتہ جا کر مولانا محمد وجیہ کلکتوی اور مفتی محمد مراد صدر مفتی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) سے تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۰ء تک دارالانشاء عالیہ کلکتہ میں گورنر جنرل ہند کے میر منشی کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد حج کے لیے تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی سے بیعت ہوئے اور سند حدیث بھی حاصل کی۔ ہندوستان واپس آ کر قبل از وقت پنشن حاصل کر لی۔ ۱۸۳۹ء میں محلّہ ملک پورہ قصبہ گھوسی میں ایک جامع مسجد اور اس سے متصل ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی (حال موسوم مدرسہ ناصر العلوم) اسے پورے برصغیر ہند وپاک میں سلسلۂ شاہ ولی اللہی کی سب سے قدیم دینی درسگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مولانا صاحب علی صاحب کا ۳۵ سال کی مدت پر محیط روزنامچہ موجود ومحفوظ ہے۔ ان کی نقل کی ہوئی بعض قلمی کتابیں بھی موجود ہیں۔ شاہ اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان سے متعلق ایک استفتاء پر انھوں نے لکھا تھا: "**مـا خـطـر ببـالـي قدح في تقوية الايـمان، إلى الآن، بل فهمت أن لا يقدح فيه أحد إلا من يوسوسه الشيطان**"۔ مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی نے "**نزهة الخواطر**" کی ساتویں جلد میں آپ کے مختصر حالات تحریر فرمائے ہیں۔

(۲) ان کتابوں میں امام غزالی کی شہرہ آفاق کتاب "احیاء علوم الدین" کا چار جلدوں پر مشتمل ایک دیدہ

زیب قلمی نسخہ بھی تھا۔ جو بعض احباب کی اطلاع کے مطابق دار العلوم مئو کے کتب خانے میں اب بھی محفوظ ہے۔

(۳) حضرت اعظمی کی یہ گفتگو ۱۹۷۲ء کے اواخر کی ہے، ممکن ہے اس وقت تک امام نسائی کی ''السنن الکبریٰ'' کے نسخوں کا پتہ نہ چلا ہو۔ اب ترکی میں اس کتاب کے بعض ناتمام نسخے دستیاب ہوگئے ہیں، بلکہ اس کی چند جلدیں چھپ بھی گئی ہیں۔ میں نے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہ العالی [افسوس کہ حضرتِ استاد ۱۱ جولائی ۲۰۱۷ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ نوراللہ مرقدہٗ] کے پاس اس کتاب کی بعض جلدیں دیکھی ہیں، جسے **دار الکتب العلمیة** بیروت نے **دکتور عبدالغفار سلیمان البغدادی** اور سید کسروی حسن کی تحقیق سے ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۱ء میں شائع کیا ہے۔

نوٹ: حضرت کو سنن کبریٰ ناتمام کا قلمی نسخہ دستیاب ہوگیا تھا، چنانچہ کشف الاستار کے حواشی میں حضرت نے اس کا حوالہ متعدد جگہوں پر دیا ہے۔ (مدیر)

اضافہ:

اس مضمون کی تحریر و اشاعت کے مدتوں بعد ایک بار جب ۲۸ /اپریل ۲۰۰۵ء کو دارالمصنفین حاضری ہوئی تو معلوم ہوا کہ قلمی کتابیں از سر نو مرتب کر کے رکھی گئی ہیں۔ اس وقت میں نے مخطوطات کی نئی فہرست دیکھ کر ناظر کتب خانہ سے ''القول الصواب فی مسئلة الخضاب'' طلب کی۔ اب کے وہ اس کی تلاش میں گئے تو کتاب اپنی جگہ پر مل گئی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس کے پہلے صفحے پر کاغذ کی ایک چٹ لگی ہوئی تھی جس پر مصنف کا نام 'مولوی تراب علی گھوسوی' لکھا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے بتایا کہ یہ سید سلیمان ندوی کی تحریر ہے۔ اس کے بعد میں نے اس قلمی نسخے کا ترقیمہ دیکھا تو اس کی عبارت حسب ذیل تھی:

> ''نسخۂ متبرکہ مسمّٰی بہ ''القول الصواب فی مسائل الخضاب'' تصنیف کردہ مولوی حاجی ابوالبرکات رکن الدین مولانا تراب علی، ادامہ اللہ بالخلق المجید، بہ خطِ بدخطِ من صاحبِ... ملتِ حنیفہ، ساکن گھوسی خاص محلّہ بیسواڑہ ضلع اعظم گڑھ، مقام سگڑی خاص دروازہ شیخ بدلو، وقت نواخت پہر روز، روز چہارشنبہ، بتاریخ بیست جمادی الاولیٰ ۱۲۸۱ھ، برائے خاطر شریف مولوی صاحب مجمعِ علوم نقلی و عقلی مولوی محمد علیم اللہ صاحب... زیب تحریر یافت۔''

ترقیمہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ مصنف کے نام کے بعد دراصل کاتب نے اپنے بارے میں ''ساکن گھوسی خاص محلّہ بیسواڑہ، ضلع اعظم گڑھ'' کے الفاظ تحریر کیے تھے۔ سید صاحب مرحوم کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے اسے مصنفِ کتاب کی نسبت وطنی پر محمول کر لیا۔

ان تفصیلات کے ذکر سے اس طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ مولانا اعظمی نے اوّلِ وہلہ میں جس چیز کو غلط فہمی پر مبنی بتایا تھا، اصل قلمی نسخے سے مراجعت کے بعد وہ درحقیقت غلط فہمی ہی نکلی۔ فللّٰہِ درّہ وذکاءہ۔

☆☆

سخنہائے گفتنی

مولانا نظام الدین اسیر ادروی صاحب☆

آہ، آج استاذ محترم، محدث جلیل ابوالمآثر حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ نہیں رہے، کل ہم جنھیں غایت ادب واحترام کے ساتھ دامت برکاتہم، ادام اللہ فیوضکم لکھا کرتے تھے آج ہم نور اللہ مرقدہٗ، برد اللہ مضجعہٗ لکھنے پر مجبور ہیں، حضرت مولانا مرحوم کا مقام ومرتبہ کیا تھا؟ ہمارے جیسے طالب علم کیا بتا سکتے ہیں۔ لیکن آپ کی عظمت، عزت وشہرت، ادب واحترام، اور عقیدت ومحبت کے نظارے ہم نے اپنی مادی آنکھوں سے جو دیکھے ہیں صرف انھیں کی ترجمانی ہو سکتی ہے۔

آج کی دنیا میں عزت وشہرت حاصل کرنے کی بہت سی راہیں ہیں، لیکن یہ عزت وشہرت عارضی ہوتی ہے، جو وقت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ چلی جاتی ہے، سیاسی شخصیتوں کی شہرت وعزت ایک تیز رو آندھی کی طرح ہوتی ہے جو ہر درخت کو جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے، ہر شاخ لرزہ براندام ہو کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہے، اس عزت وشہرت میں ایک انجانا سا خوف ہوتا ہے کچھ ذاتی مفادات کی توقعات کی کارفرمائی ہوتی ہے، ان شخصیتوں کو حقیقی عقیدت ومحبت حاصل نہیں ہوتی، اسی لیے یہ عزت وشہرت دیر پا نہیں ہوتی، ایک آندھی تھی، آئی اور گذر گئی، نہ اس کے آنے کی خوشی تھی نہ جانے کا غم۔

اس کے برخلاف علمی ودینی شخصیتوں کی عزت وشہرت، ادب واحترام، عقیدت ومحبت کی حیثیت نرم رو، گلبار اور عطر بیز نسیم سحر کی ہوتی ہے، نہ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے، نہ درخت لچکتے ہیں، نہ شاخیں جھکولے کھاتی ہیں، عقیدت واحترام کی نرم رو اور سبک رفتار ہوا کوئن آف نائٹ کی بھینی بھینی خوشبو اپنے دامن میں لے کر فضا میں لٹاتی ہوئی چلی جاتی ہے اور جہاں تک جاتی ہے مشام جاں کو معطر کرتی جاتی ہے، روح کو نشاط حاصل ہوتا ہے، دل کیف وسرور میں ڈوب جاتا ہے، یہ کیف

☆ سابق مدیر "ترجمان الاسلام" بنارس۔

وسرور، یہ روحانی انبساط یہ وجدانی نشاط ہر شخص کے دل ودماغ میں رچ بس جاتا ہے، متاع زندگی اور سرمایۂ حیات بن جاتا ہے کہ انسان اس کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔

استاذ محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی عزت وشہرت ان کا ادب واحترام، ان کی ذات کے ساتھ اخلاص وعقیدت کچھ اسی طرح کا تھا، وہ نہ اسٹیج کے شعلہ بیاں آتش نوا خطیب تھے، نہ آگ لگادینے والا قلم ان کے ہاتھوں میں تھا، شہرت ونام ونمود کے سارے وسائل وذرائع مفقود تھے، لیکن اس کے باوجود کتنے دلوں میں آپ کی عظمت وعزت آپ کا ادب واحترام آپ کی ذات سے مخلصانہ بے لوث اور بے غرض عقیدت پیوست تھی؟ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب آپ کے سفر آخرت کی اطلاع اطراف وجوانب میں پھیلی، عوام وخواص دیوانہ وار اس طرح آئے جیسے عقیدت وتعلق کا کوئی غیر مرئی ہاتھ ان کو کھینچ کر اس مقام پر لے جارہا ہے جہاں آپ کا جنازہ رکھا ہوا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا وسیع وعریض میدان آدمیوں کا جنگل نظر آنے لگا۔

....

مولانا مرحوم برسہا برس سے ایک نیم تاریک، خام سفالہ پوش مکان میں ہر طرح سے یکسو ہو کر بیٹھ گئے تھے، چٹائیوں کا فرش زمین پر، چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئیں، آپ نیم سجدہ کی حالت میں ہمہ وقت مطالعہ یا کچھ لکھنے میں مصروف نظر آتے تھے، آپ کے مکان کی چہار دیواری کے باہر طوفان ہی کیوں نہ گذر جائے، آپ کے انہماک میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، عام طور سے جلسوں میں شرکت بھی کم کردی تھی، اگر کہیں شریک بھی ہوئے تو چند صدارتی کلمات ارشاد فرما کر بات ختم فرمادیتے تھے، صرف رمضان میں بعد نماز جمعہ آپ مفصل اور سوز وگداز سے بھرے ہوئے لہجہ میں وعظ کہتے تھے، سامعین صاف محسوس کرتے تھے کہ یہ الفاظ مولانا اعظمی کی زبان سے تو ضرور نکل رہے ہیں، لیکن درحقیقت یہ ان کے دل کی آواز ہے، شہر سے باہر کے لوگ جمعہ کے دن اسی لیے آپ کی مسجد میں نماز ادا کرنے آتے تھے، یہ زور بیان یہ سوز وگداز کا انداز دوسرے مقامات پر نہیں ہوتا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آپ دنیا کے ہنگاموں سے بیزار ہوچکے ہیں، دل خلوت وتنہائی کے لیے مجبور کرتا ہے اور بادل ناخواستہ عوامی اجتماع میں شریک ہورہے ہیں۔ جب کسی کے سامنے عظیم مقاصد ہوتے ہیں تو اس کی مصروفیت اور یکسوئی کا یہی حال ہوتا ہے وہ دنیا والوں سے بیگانہ بن کر رہ جاتا ہے۔

لیکن کچھ مخلصین ، بے لوث و بے غرض عقیدت و اخلاص رکھنے والے اس گوشۂ تنہائی میں عقیدت مندانہ حاضری دیتے تھے، موقع ومحل اور مزاج دیکھ کر گفتگو کر لیتے تھے، مولانا موصوف بھی اپنی تصنیفی مصروفیتوں اور مطالعہ کی دماغ سوزیوں سے قدرتی طور پر تکان محسوس فرماتے تو ان حاضری دینے والوں سے ان کے ذہن ومزاج اور فہم وادراک کے مطابق شگفتہ گفتگو فرماتے، آنے والوں سے ان کی آبادی، وہاں کے مدرسوں اور وہاں کے اہل علم کے حالات پوچھتے یا آنے والے ازخود بیان کرتے، آپ توجہ سے سنتے، خاص خاص اہل علم کے بارے میں معلومات حاصل کرتے، شہر میں اگر کوئی نئی یا اہم بات ہوتی تو اس کو دریافت فرماتے، انھیں آنے والوں کے ذریعہ ہر طرح کی معلومات آپ کو حاصل ہوتی رہتی تھیں، اپنے شاگردوں کے بارے میں بھی آپ کا علم مفصل تھا، کون کہاں پڑھاتا ہے؟ کیا پڑھاتا ہے؟ مطمئن ہے یا غیر مطمئن؟ اگر کسی ادارے نے مدرس کی ضرورت کا اظہار کیا ہے تو آپ اپنی معلومات کی روشنی میں اپنے جس شاگرد کو اس کا اہل سمجھتے اس کو مطلع فرماتے، اگر وہ تیار ہو جاتا تو اس کو تعارفی خط دیتے، غرضیکہ اس گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر بھی باہر سے بے خبر نہیں رہتے تھے، لیکن اس خلوت کدہ سے باہر اسی وقت آتے جب کسی مسجد یا مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھنا ہو، یا کسی ادارے کا افتتاح یا بخاری شریف ختم کرانی ہے۔

....

کئی برسوں سے آپ چلنے پھرنے سے معذور تھے، کرسی پر بٹھا کر لوگ اٹھاتے، سنگ بنیاد کی جگہ پہنچاتے، ہاتھوں میں اینٹیں اٹھا کر دیتے اور آپ انھیں بنیاد میں رکھ کر دعا فرماتے، لوگ مطمئن ہو جاتے اور فخر محسوس کرتے کہ حضرت نے سنگ بنیاد رکھا ہے، انتقال سے کچھ دنوں پہلے قصبہ بہادر گنج ضلع غازی پور میں ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور دعا فرمائی تھی، پھر اس کے بعد گوشۂ تنہائی سے نکلنے کی نوبت نہیں آئی اور آپ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

....

رویت ہلال کا مسئلہ اس علاقہ میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا، رمضان اور عید کے موقع پر اگر عام رویت نہیں ہوئی تو ضلع اعظم گڈھ، ضلع مئو اور ضلع غازی پور سے آنے والوں کا اژدحام مولانا موصوف کی رہائش گاہ پر ہو جاتا اور یہ مجمع اتنا بڑھ جاتا کہ لوگوں کو اس اژدحام کو سنبھالنے کے لیے بڑی دقتیں اٹھانی

پڑتی تھیں، یہ اژدحام بلاوجہ نہیں تھا رویت ہلال کے مسئلہ میں مولانا موصوف کا فیصلہ ہی ان اضلاع میں قابل قبول تھا، کسی دوسرے کی بات سننا بھی گوارا نہیں تھا۔ مولانا موصوف کے علم وفضل، زہد وتقویٰ اور فقہی بصیرت پر اعتماد کا یہ حال تھا کہ دوسرے مکتبہ فکر کے اہل علم بھی مولانا ہی کے فیصلے کے منتظر رہتے تھے۔ اور جب آپ فیصلہ فرما دیتے تو اس کو بخوشی تسلیم کرتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے، جس آبادی میں چند لوگوں نے چاند دیکھا ہے تو وہاں کے اہل علم ان کو لے کر سیدھے حضرت مولانا کی قیام گاہ پر آجاتے، اسی طرح اطراف وجوانب میں جہاں بھی رویت کا ثبوت ملتا، ان شاہدوں کو حضرت کے سامنے پیش کیا جاتا، آپ قانون شہادت کے جملہ شرائط کی روشنی میں شہادت لیتے، جرح فرماتے اور پھر فیصلہ فرماتے اور یہ فیصلہ فوراً مجمع عام میں سنا دیا جاتا اور مذکورہ بالا تینوں ضلعوں میں اس فیصلہ کی خبر آناً فاناً پھیل جاتی اور اس پر عمل کیا جاتا اور اختلاف کا دروازہ بند ہو جاتا۔

....

عوام تو کیا خواص کو بھی مولانا موصوف کے اس گوشۂ تنہائی کی مصروفیتوں کی قدر و قیمت کا صحیح علم نہیں تھا، یا کم از کم اس کی عظمت واہمیت سے واقفیت نہیں تھی، اسی لیے ہمہ وقت ملاقات نہیں ہوسکتی تھی، بس کچھ مخصوص اوقات ہی میں ملنے والے بار پاتے تھے، ہزاروں صفحات کے قدیم ترین مخطوطوں کا پڑھنا، یا اس کی مائیکرو فلم پر نظر جما کر پھر ان کو نوٹ کرنا بالعموم رسم الخط بھی قدیم سے قدیم تر ہوتا تھا، یہ انتہائی دماغ سوزی کا کام تھا، یہ کام ایک دم سکون چاہتا تھا، آدمیوں کی آمد ورفت، بات چیت، گفتگو ذہنی انتشار کا سبب تھی، اس لیے مولانا موصوف سے ہمہ وقت ملاقات مشکل تھی، اسی یکسوئی اور گوشۂ تنہائی کا یہ فیض ہے کہ گیارہ ضخیم جلدوں کی مصنف عبدالرزاق کے علاوہ اکثر چار جلدوں اور دو جلدوں پر مشتمل قدیم ترین مصنفین کی کتابیں تحقیق وتعلیق کے بعد شائع ہوئیں، ان میں سے بعض کتابوں پر کئی کئی سال مسلسل صرف ہوئے۔ بالخصوص مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ برسہا برس کی شبانہ روز کی دماغ سوزی کے بعد علمی دنیا کے سامنے آئیں اور ان سے دوسروں کے لیے استفادہ کی راہیں کھلیں، اگر ان مصروفیتوں میں کوئی دخل انداز ہوتا تو آپ اس سے سخت کبیدگی محسوس فرماتے، کبھی کبھی آپ کا رویہ بھی سخت ہو جاتا لیکن تضییع اوقات منظور نہیں تھی۔

....

انھیں جاں سوز مصروفیتوں کی وجہ سے طبیعت انتہائی حساس ہوچکی تھی، مزاج میں قدرے تندی اور زود رنجی پیدا ہوگئی تھی، بعض معمولی باتوں کا بھی کبھی اتنا اثر لیتے تھے کہ اس تاثر کا دور کرنا بھی دوسروں کے لیے دشوار ہوجاتا، اس میں زیادہ دخل مولانا موصوف کے زہد وتقویٰ اور امور شریعت میں غایت احتیاط کا تھا، چونکہ مزاج نازک اور طبیعت حساس بہت تھی، اس لیے باتوں کا اثر دیر تک رہتا تھا، عوام سے براہ راست رابطہ تو بہت کم تھا لیکن بعض امور میں عوامی قسم کے لوگوں کی دخل اندازی ہوجاتی تھی، ایسے لوگوں کے طرز خطاب، انداز گفتگو اور لب ولہجہ کی خشونت آپ کے لیے ناقابل برداشت ہوجاتی تھی، بعض افراد بعض اداروں سے دل برداشتگی برسوں قائم رہی، وہ اسی نازک مزاجی کا اثر تھا اپنے نقطۂ نگاہ پر بہت مضبوطی سے جمے رہتے تھے، مداہنت اور منھ دیکھے کی بات آپ کے لیے ناممکنات میں سے تھی، اپنے تجربات ومشاہدات کے ذریعہ اشخاص مدارس یا اداروں کے بارے میں آپ کو جو علم حاصل تھا اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے اور اس کا برملا اظہار فرماتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہمیشہ پاس وخیال تھا، بڑی سے بڑی شخصیت آپ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی، آپ ہر وقت تنبیہ فرماتے تھے اور بلا خوف لومۃ لائم اظہار حق فرمادیتے تھے، جو آپ کے بلند منصب کے لیے ضروری بھی تھا۔

....

چلنے پھرنے کی معذوری کی وجہ سے بعض مخلص اور جاں نثار خدام حاضر خدمت رہتے اور سہارا دے کر اٹھاتے بٹھاتے تھے، کرسی پر بٹھا کر مدرسہ یا مسجد تک پہنچاتے تھے، کبھی کبھی آپ کی صحت تشویشناک صورت اختیار کرلیتی تو ہر طرف سراسیمگی پھیل جاتی، ایک ارادت مند مخلص ماہر ڈاکٹر ہمہ وقت نگرانی رکھتے، انھیں کے مشورے کے مطابق علاج مسلسل چلتا تھا، اخیر سال میں صورت حال مستقل تشویشناک رہنے لگی، آخر کے کئی مہینے تو ایسے گذرے کہ ڈاکٹر نے لوگوں کی ملاقات پر پابندی عائد کردی تھی، بولنے اور بات کرنے سے سختی کے ساتھ ممانعت کردی، ملک کے اکابر علماء ومشاہیر زعماء آئے اور صرف دیکھ کر واپس چلے گئے، کیونکہ بات کرنے کی اجازت نہیں تھی، عام طور پر غفلت یا نیم بے ہوشی کی کیفیت رہتی تھی، آخری مہینہ تو بالکل امید وبیم اور آس ویاس کے درمیان گذر رہا تھا، عقیدت مندوں اور زیارت کے لیے آنے والوں کے دل آنے والے خطرات کے قدموں کی چاپ محسوس کرکے

دھڑ کتے رہتے، وصال کا پورا دن بیہوشی میں گذرا، ۱۰ر رمضان المبارک کا دن ختم ہورہا تھا، عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا، قبل افطار صورت حال انتہائی تشویشناک ہوگئی، ادھر موذن نے مغرب کی اذان دی، ابھی اذان کی گونج فضاؤں میں باقی ہی تھی کہ طائر روح اسی مقدس اور پاکیزہ فضا میں پرواز کرگیا، عقیدت مندوں نے باچشم نم انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا ان کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہوگئی، آدھی صدی سے زیادہ عرصہ تک جو ذات اسلامی علوم وفنون کے لیے مسیحا بن کر رہی، آج اس نے خود موت کے سامنے سپر ڈال دیا اور اس سفر کے لیے رخت سفر باندھ لیا جہاں سے کبھی واپسی نہیں ہوتی۔

....

جنازہ کی مشایعت کرنے والوں اور نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی کثرت بھی عنداللہ متوفی کی مقبولیت کی ایک علامت ہے، تاریخ میں اس کی ایک مثال موجود ہے، امام احمد بن حنبل اسلامی تاریخ کی مشہورترین شخصیت ہیں، جب خلق قرآن کے مسئلہ پر سرکاری علماء اور قضاۃ نے خلیفہ کو ورغلایا تو خلیفہ نے دربار میں مباحثہ کرایا، مگر مخالفین نے امام صاحب کی کسی بھی دلیل کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، قاضی القضاۃ اور دوسرے سرکاری علماء نے امام صاحب کو گمراہ ہی کہا، ان کو کوڑے لگوائے، برسوں جیل میں بند رکھا، لیکن امام صاحب اپنے مسلک پر مضبوطی سے جمے رہے، ان کو اپنے مسلک کے برحق ہونے کا یقین کامل تھا، کربناک سزاؤں کے باوجود آپ کے پائے ثبات میں ادنیٰ سی بھی جنبش نہیں پیدا ہوئی، لیکن مخالفین آخر تک امام صاحب کو گمراہ، بدعقیدہ گردن زدنی کہتے رہے تب امام صاحب نے اپنے مخالفین سے کہا:

بیننا و بینکم یوم الجنائز [(۱)] اب جس دن ہمارے تمھارے جنازے اٹھیں گے، وہی فیصلے کا دن ہوگا۔

یعنی جس کی نماز جنازہ میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگی وہ عنداللہ حق پر ہوگا۔ اب اس کے بعد کا واقعہ تاریخ کی زبان سے سنئے علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ امام صاحب کے انتقال کے بعد ان کی نماز جنازہ میں شریک ہونے الوں کی تعداد انتہائی محتاط اندازے کے مطابق کم ازکم آٹھ لاکھ تھی، ان کے علاوہ عورتوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی [(۲)]۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء (ذہبی) ج ۱۱ ص ۳۴۰ (۲) سیر اعلام النبلاء

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مخالفین میں سب سے نمایاں نام بغداد کے قاضی القضاۃ احمد بن ابی دُواد کا ہے، جنھوں نے امام صاحب کو ''ضال مضل'' کہا اور بدعقیدہ کہہ کر سزائیں دیں، ان کے بارے میں مؤرخ اسلام حافظ ابن کثیر کہتے ہیں:

لم يحتضر أحد بموته ولم يلتفت إليه ولما مات ما شيّعه الا قليل من أعوان السلطان (۱)	اس کی موت کے وقت کوئی نہیں آیا نہ کسی نے کوئی توجہ کی جنازہ کے ساتھ سوائے چند سرکاری کارندوں کے اور کوئی نہیں تھا۔

امام صاحب کے دوسرے مخالف اور ان کو بدعقیدہ اور گمراہ کہنے والے حارث بن اسد المحاسبی تھے، حالانکہ زہد وتقویٰ میں ان کی شہرت تھی لیکن ان کے بارے میں بھی یہی مورخ اسلام تحریر فرماتے ہیں۔

لم يصلّ عليه الا ثلثة أو أربعة من الناس (۲)	ان کی نماز جنازہ میں صرف تین یا چار آدمی شریک ہوئے

امام احمد بن حنبل کی زبان سے نکلا ہوا، جملہ **بيننا وبينكم يوم الجنائز علىٰ رؤس الاشهاد** فیصلے کا دن بن گیا اور عنداللہ مقبولیت کا فیصلہ ہو گیا۔

جنازہ کی نماز اور جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کی کثرت اگر عنداللہ مقبولیت کی علامت ہے تو کہا جا سکتا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ خداوند قدوس کے مقبول اور مقدس ترین بندوں میں سے تھے، آپ خود غور کریں کہ مولانا موصوف عرصہ دراز سے گوشہ خلوت میں رہتے تھے، عوام سے بقدر ضرورت ہی رابطہ تھا، ایک گمنام اور غیر مشہور گلی میں آپ کی سکونت تھی، اس راستے سے گذرنے والا کوئی بھی شخص یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس گلی کے ایک عام سفالہ پوش مکان میں ایک ایسی عظیم الشان شخصیت ہے کہ بقول حفیظ بنارسی ؎

دشت عجم سے تابہ عرب جس کی دھوم تھی

لوگوں پر آپ کی عظمت، علوے شان اور عنداللہ مقبولیت کا راز اس وقت کھلا جب ان کا جنازہ دیکھا، شہر کے سارے مسلم وغیر مسلم حیرت واستعجاب کی نگاہوں سے انسانوں کے اس سیلاب عظیم کو دیکھ رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہم کو خبر بھی نہیں تھی کہ اس شہر میں کوئی اتنی عظیم شخصیت بھی رہتی

(۱) البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۱۰ ص ۳۴۲ (۲) حوالہ مذکور

ہے، ابتدائے شب میں جب آپ سفر آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں اس وقت گنتی کے چند افراد موقعہ پر موجود ہیں، لیکن صبح ہوتے ہی سفید پوش انسانوں سے مئو کی گلیاں، سڑکیں، شاہراہیں بھر گئیں، مولانا کی رہائش گاہ کے چاروں طرف مسلمانوں کا جم غفیر اس طرح چھا گیا جیسے کسی بہت بڑے دریا میں ایک بیک طوفانی سیلاب آ گیا ہو۔

....

نماز جنازہ میں تخمیناً دو لاکھ مسلمان شریک ہوئے، میرے محدود علم ومطالعہ کے مطابق اس پوری صدی میں ہندوستان میں کسی عالم دین کا اتنا بڑا جنازہ نہیں اٹھا، جس کی نماز جنازہ اتنے مقدس ترین اور اتنے بڑے مجمع نے ادا کی ہو، مولانا موصوف کے سوا دوسری کوئی مثال نہیں ملتی، دو لاکھ مسلمانوں کا خالص یہ مجمع اور پھر اس مجمع کا ہر ہر فرد روزے سے، گرمیوں کا موسم ہے، ٹھیک دو پہر میں جنازہ اٹھتا ہے، ایک میل پا پیادہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں لوگ مشایعت کرتے ہیں اور جب ریلوے گراؤنڈ میں پہنچتے ہیں جہاں نماز جنازہ ادا کی جانے والی ہے پورے لق دق میدان میں ایک درخت کا بھی سایہ نہیں، موسم گرما کا تمتمایا ہوا سورج سروں پر چمک رہا ہے، اس کی کرنیں روزہ داروں کے بھوکے پیاسے جسم پر تیر کی طرح برس رہی ہیں، اب دن کے دو بج جاتے ہیں، دھوپ کی تمازت اپنے شباب پر آ جاتی ہے۔ دو لاکھ روزہ رکھے ہوئے مسلمانوں کا مقدس ومنتخب روزگار مجمع حضرت مولانا اعظمی کی نماز جنازہ پڑھتا ہے۔ دعائے مغفرت کرتا ہے، درجات کی بلندی کی دعائیں مانگتا ہے، کیا ہندوستان میں ایسی کوئی دوسری مثال پیش کی جا سکتی ہے؟

یہ شرف، یہ افتخار صرف محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا، مولانا موصوف کے زہد وتقویٰ، خلوص وللہیت، علم وفضل، علوم اسلامی کی بے لوث اور بے غرض اشاعت اور ساری زندگی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی شب وروز خدمت اور بے پناہ جذبۂ احیاءِ سنت کے پیش نظر ہمارا ایمان ہے کہ جب آپ کی مقدس روح ملاءِ اعلیٰ میں پہنچی ہوگی تو رحمت خداوندی کہہ رہی ہوگی **فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی** اور جنت کے فرشتے صف بستہ استقبال کے لیے کھڑے رہے ہوں گے اور پورے انبساط سے کہہ رہے ہوں گے

سلام علیکم طبتم فیھا خالدین

....

''ترجمان الاسلام'' کا یہ شمارہ درحقیقت اسی عظیم المرتبت شخصیت کی جناب میں ایک حقیر سا ہدیۂ محبت اور معمولی سا نذرانۂ عقیدت ہے، ظاہر ہے کہ جس کی عظمت وشہرت کے لیے عالم اسلام کی فضا بھی تنگ ہو، اس کے فضل وکمال کو چند صفحات میں کیسے سمیٹا جا سکتا ہے؟ پھر ہم کو وہ بہتر تعاون بھی حاصل نہ ہوسکا جس کی ہمیں توقع تھی۔ سیاسی گروپ بندی، نظریاتی بعد، علاقائیت، نسلی برتری کا فخر وغرور یہ سب اتنی بری بلائیں ہیں کہ کھلی ہوئی اور روشن حقیقتوں کو بھی تسلیم کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں، دل مطمئن ہی نہیں مرعوب بھی ہے، دماغ قائل ہی نہیں اس کے فضل وکمال کے آستانے پر سربسجود ہے، لیکن مصلحت کے آہنی پنجہ کی گرفت زبان وقلم پر اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس سے اعتراف کا ایک لفظ بھی نہیں نکل سکتا، دمکتے ہوئے سورج پر خاموشی، بے اعتنائی اور بے نیازی کا کثیف دھواں اتنا گہرا اور دبیز پھیل جاتا ہے کہ اس کی تابناک کرنوں کو سطح زمین تک پہنچنے کے سارے روزن بند کردینا چاہتا ہے، لیکن یہ دھواں مصلحتوں کا اٹھایا ہوا ہے اس لیے عارضی ہے، سورج کے کرنوں کی اَنی میں دھویں کی دبیز چادر کو پار کرجانے کی بھرپور قوت ہے، اس لیے سچائی پر زیادہ دیر تک پردہ نہیں ڈالا جا سکتا، ہم نے بعض مشاہیر اور اونچے منصبوں پر فائز شخصیتوں سے جو علمی ودینی محفلوں میں عزت واحترام کی جگہوں پر بٹھائی جاتی ہیں، ان سے قلمی تعاون کی درخواست کی، ان کے قلبی تاثرات کے چند الفاظ کے لیے دست سوال دراز کیا، لیکن انھوں نے ہماری طرف نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی جب کہ وہ معمولی معمولی افراد پر صفحوں کے صفحے سیاہ کردیتے ہیں، لیکن عالم اسلام کی اتنی عظیم المرتبت شخصیت کے سلسلہ میں ان کے پاس الفاظ کا قحط پڑ گیا۔ اس کے باوجود ہمارے دلوں میں ان کا ادب واحترام ہے اس لیے اپنی محرومی کے باوجود ہم ان کے شکرگذار ہیں کہ انھوں نے اپنی شان استغناء کا مظاہرہ کرکے ہم کو یہ سبق دیا کہ آنکھیں کھول کر چلنا سیکھو، وقت اور حالات کی مصلحتوں اور تقاضوں کو پہچانو! کہاں صداقتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے، کہاں سامعہ شگاف آوازوں کو بھی سننے سے انکار کردیا جاتا ہے۔ یہ احسان ان کا کم نہیں کہ ان کی وجہ سے ہمارے دلوں کو یہ یقین حاصل ہوا کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی، ہر رنگین پتھر یاقوت وزمرد اور لعل بدخشاں نہیں ہوتا۔

....

مولانا مرحوم کی شخصیت کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن پر مفصل اور سیر حاصل گفتگو کرنے

کی ضرورت ہے، آپ کے علمی مقام ومرتبہ کا اندازہ آپ کی تصانیف آپ کی تحقیقات وتعلیقات میں انفرادیت کا مفصل اور غائر مطالعہ کر کے ہی کیا جاسکتا ہے، ضرورت ہے کہ تمام علمی شاہکاروں کا گہرا مطالعہ کیا جائے، آپ نے اپنے بے پایاں علم اور وسعتِ معلومات کی روشنی میں بہت سے موقعوں پر جو اپنی محققانہ رائیں دی ہیں ان کو جمع کیا جائے اور دلائل وشواہد کے حوالے سے آپ کی انفرادیت کی قدر وقیمت سے علمی دنیا کو روشناس کرایا جائے تبھی آپ کی شخصیت سے عقیدت وتعلق کا حق صحیح طور پر ادا کیا جاسکتا ہے، یہ کام فرصت چاہتا ہے اس کے لیے نگاہ نکتہ رس اور دقیقہ بین کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ابھی بہت ہی معمولی کام ہوا ہے، اس کی ایک معمولی جھلک اس شمارے میں بھی آپ کو مل سکتی ہے، اس پر مزید تحقیق وتفتیش سے کام لینے کی ضرورت ہے، اس کی سب سے بہتر جگہ تو مولانا موصوف کی ایک مکمل اور جامع سوانح حیات ہے کاش کوئی اہل علم اس بار گراں کو اٹھالے اور اس کا حق ادا کردے ہم ترجمان الاسلام میں جو کچھ پیش کررہے ہیں وہ ایک نذرانۂ عقیدت کے سوا کچھ نہیں۔

....

اس خصوصی اشاعت کے سلسلہ میں ہمارے مخلص اور بے لوث دوستوں اور بعض دوسرے اہل علم نے ہمارے ساتھ جو تعاون کیا، ہم ان کا کس زبان وقلم سے شکریہ ادا کریں، اس کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں، ان حضرات نے ہماری درخواست کو شرف پذیرائی بخشا، ہماری عزت افزائی فرمائی، اپنے مضامین ارسال فرما کر جس اخلاص کا انھوں نے ثبوت دیا ہے اس کی قدر وقیمت کو کم کرنا پسند نہیں کرتے، اب رسالہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، آپ کے جذبات آپ کی تمناؤں کی پیاس اس آب زلال سے کتنی بجھی ہے اس کا اندازہ تو مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے، ہم آپ کے خیالات جاننے کے متمنی ہیں، ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا ہم قرآن کے الفاظ میں یہی کہہ سکتے ہیں۔

وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ

مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا قضیہ

دلائل وشواہد کی روشنی میں

مولانا نظام الدین اسیر ادروی ☆

محدث کبیر حافظ ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ کی مشہور عالم کتاب "**المصنف**" جس میں اکیس ہزار سے زیادہ روایتیں ہیں ۱۹۷۲ء میں پہلی بار محدث جلیل ابوالمآثر حضرت العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ کے ساتھ شائع ہوئی، تو پوری علمی دنیا میں انتہائی عزت واحترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا، قدر ومنزلت کے ہاتھوں سے لی گئی، عقیدت وشوق کی نگاہوں سے پڑھی گئی، روایتوں کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ امت کی نگاہوں سے اوجھل تھا، جب مولانا اعظمی کی سالہا سال اور شبانہ روز کی جاں سوزی اور جد وجہد کے بعد منظر عام پر آیا تو عالم اسلام ہی نہیں یورپ کے علمی حلقوں میں بھی حیرت واستعجاب کے ہاتھوں لیا گیا، ہر علمی مجلس میں اس کا تذکرہ، علم حدیث کی ہر مقدس محفل میں اس کا ذکر خیر چل پڑا اور مولانا مرحوم کی شہرت کو جیسے شہپرِ جبریل مل گیا اور پوری علمی دنیا مولانا مرحوم کا نام انتہائی عظمت واحترام کے ساتھ لینے پر مجبور ہوگئی۔

اعتراض کا ایک پہلو:

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی علمی تحقیق کو حرف آخر نہیں کہا جاسکتا، گفتگو کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے اور کچھ ذہنوں میں شک وارتیاب کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ ''المصنف'' کی اشاعت کے بعد بھی ایک ایسا پہلو نکل آیا اور اس پر گفتگو چل پڑی، المصنف کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس کا ایک مکتوب ایک رسالہ میں شائع ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ:

> ''مصنف'' کی آخری دو جلدوں میں جامع معمر بن راشد چھپی ہے اور اس کے آڈیٹر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو انتباہ نہ ہوا کہ یہ ایک الگ کتاب ہے، مصنف

☆ سابق مدیر ''ترجمان الاسلام''، بنارس۔

عبدالرزاق نہیں، بلکہ عبدالرزاق کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے''

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب عرصہ دراز سے فرانس میں مقیم ہیں اور حیدر آباد کے ایک علمی گھرانے کے فرد فرید ہیں اور مخلصانہ علمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور آج عالم اسلام میں مخطوطات وآثار کے ماہر تسلیم کے جاتے ہیں اور ساری دنیا میں مخطوطات کی تلاش وجستجو میں سفر کرتے رہتے ہیں، مخطوطات کے بارے میں ان کی رائے دلائل پر مبنی ہوتی ہے اور دلائل میں وزن ہوتا ہے، اس لیے آسانی کے ساتھ اس کو رد نہیں کیا جا سکتا، مکتوبات نبوی کی دریافت اور ان کی تحقیق کے سلسلہ میں وہ عالمی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور یورپ کے محققین سے علمی وتحقیقی جنگ لڑتے رہتے ہیں اور فتح وظفر کا پرچم انھیں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ فرانسیسی، انگریزی، عربی اور اردو میں اس موضوع پر ان کے مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں وہ ایک خاص موضوع ''کتباتِ مدینہ'' پر لکچر کے لیے بلائے جاتے ہیں۔

مولانا اعظمی کا جواب:

جب ڈاکٹر صاحب موصوف کا ''مصنف'' کے بارے میں یہ مکتوب شائع ہوا اور مولانا اعظمی کی نگاہوں سے گذرا تو مولانا نے اس کے جواب میں ایک مختصر مضمون لکھا، جس میں ڈاکٹر حمید اللہ کے موقف کی تردید فرمائی جب کہ ان کے مکتوب میں اپنے شک وشبہہ کے دلائل وشواہد پیش نہیں کیے گئے تھے، صرف ایک دعویٰ تھا دعویٰ کی بنیاد کیا تھی اس کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں لکھا تھا، اس لیے مولانا موصوف کا جواب اس اظہار شک پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکا اور مولانا موصوف ڈاکٹر صاحب کو مطمئن نہ کر سکے۔ مولانا مرحوم نے اپنے مختصر مضمون میں کتاب الجامع جو مصنف عبدالرزاق کی دسویں جلد کے صفحہ ۳۱۳ حدیث نمبر ۱۹۴۱۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۴۶۸ پر ختم ہوتی ہے پھر گیارہویں جلد میں حدیث نمبر ۱۹۷۳۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۴۷۱ حدیث نمبر ۲۱۰۳۳ پر تمام ہوتی ہے اور مصنف عبدالرزاق کی تقریباً ڈیڑھ جلدوں میں ایک ہزار چھ سو چودہ حدیثوں کا مجموعہ ہے اس کو ڈاکٹر صاحب نے معمر کی کتاب الجامع قرار دیا تھا، مولانا اعظمی نے اس حصہ کو مصنف ہی کا ایک حصہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ مولانا موصوف نے اپنے مضمون میں اپنے موقف پر درج ذیل دلائل وشواہد پیش کیے تھے۔

۱-مولانا اعظمی نے کتاب الجامع کو مصنف عبدالرزاق کا ہی ایک حصہ قرار دینے کی پہلی

دلیل کے طور پر شیخ محمد سعید سنبل کی کتاب الاوائل کا حوالہ دیا ہے اوران کی یہ عبارت نقل کی و بالسند المتقدم إلى الامام الحجة عبدالرزاق الصنعانی أخبرنا معمر عن ثابت عن أنس رضی اللّٰہ عنہ قال، کان شعر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم إلیٰ أنصاف أُذنیه، وھو آخر مصنفه.

یہ روایت مصنف عبدالرزاق میں شامل کتاب الجامع کی آخری روایت ہے اور شیخ سعید سنبل نے اس کو مصنف کی آخری حدیث لکھا ہے، یعنی ان کے نزدیک یہ کتاب الجامع مصنف ہی کا ایک جزء ہے اسی لیے انھوں نے یہ عبارت لکھی وھو آخر مصنفه.

۲- دوسری دلیل میں آپ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب بستان المحدثین کے ایک اندراج کو پیش کیا ہے، شاہ صاحب کی عبارت یہ ہے:

''طرفہ این است کہ مصنف خود را ختم کردہ است بشمائل، وشمائل را ختم بر ذکر موئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام کردہ می گوید حدثنا معمر عن ثابت عن أنس رضی اللّٰہ عنه، قال کان شعر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم إلیٰ أنصاف أذنیه.

شاہ صاحب نے بھی کتاب الجامع کی اس آخری حدیث کو مصنف کی آخری حدیث قرار دیا ہے، یعنی انھوں نے بھی کتاب الجامع کو مصنف ہی کا جزء تصور کیا۔

۳- مولانا نے تیسری دلیل یہ دی ہے کہ مصنف کے آخری حصہ میں شامل کتاب الجامع اگر معمر بن راشد کی ہوتی تو اس میں وہ روایتیں نہ ہوتیں جنھیں عبدالرزاق نے اپنے دوسرے شیوخ سے لیا ہے، اس داخلی شہادت کے سلسلہ میں مولانا نے مصنف کی دسویں جلد کی سات روایتیں اور گیارہویں جلد کی ۲۸ روایتیں پیش کی ہیں، ان روایتوں کو عبدالرزاق نے معمر کے بجائے اپنے دوسرے شیوخ حدیث سے لیا ہے، اگر یہ حصہ معمر کی کتاب الجامع ہوتی تو ان ۳۵ روایتوں کے اس میں شامل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی ہے، اس لیے قطعیت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب الجامع معمر بن راشد کی نہیں ہے، بلکہ مصنف ہی کا ایک جزء ہے، اس لیے مصنف کے ساتھ کتاب الجامع کے شائع ہونے پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عبدالرزاق کی کوئی کتاب الجامع ہے؟ کہ اس کو عبدالرزاق کی

کتاب الجامع تسلیم کرلیا جائے؟ اس سلسلہ میں مولانا اعظمی نے کشف الظنون کا حوالہ دیا ہے اور تحریر فرمایا کہ اس میں عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر موجود ہے، اس کے علاوہ مصر کے فواد سید اور شیخ ناصرالدین البانی کے حوالے سے مولانا نے بتایا کہ عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ایک نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے اور فواد سید کی یہ تصریح بھی نقل کی ہے کہ اس مخطوطے پر ۵۵۸ھ کا ایک سماع درج ہے، اس کے علاوہ اور دوسرے سماعات کا بھی اندراج ہے۔

کیا جوابات اطمینان بخش ہیں:

مولانا اعظمی کا مضمون انھیں دلائل وشواہد پر مشتمل تھا، لیکن کیا یہ جوابات ایک محقق عالم کے لیے تسلی بخش ہیں اور وہ مطمئن ہو جائے گا؟ مجھے اس میں شک ہے کیونکہ مولانا اعظمی نے اپنے ثبوت میں جن دو بزرگوں کے نام لیے ہیں، یعنی شیخ سعید سنبل اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہما اللہ ان دونوں کا مقام ومرتبہ عظمت واحترام اپنی جگہ مسلم ہے، علم حدیث کی خدمات اور اس کی نشر واشاعت میں ان کی جدوجہد سے کون انکار کرسکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا شمار متاخرین میں ہے، مخطوطات ابھی عام نہیں تھے اور ہر عالم کی رسائی وہاں تک مشکل بھی تھی، اس لیے ایسے تحقیق طلب مسئلہ میں ان کی رائے میں وہ وزن نہیں ہوگا جو ایک محقق اور مخطوطات کے ذخیروں سے واقف شخص کے لیے اطمینان بخش ہو، دوسری بات یہ کہ ان دونوں حضرات نے اس سلسلہ میں کوئی تحقیق نہیں فرمائی کہ یہ کتاب الجامع معمر بن راشد کی ہے یا عبدالرزاق کی؟ بس اتنا ہوا کہ مصنف عبدالرزاق کے متداول نسخوں میں ضمیمہ کے طور پر کتاب الجامع لکھی ہوئی ملی، اس لیے انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ بھی مصنف ہی کا ایک حصہ ہوگا، اس لیے انھوں نے حوالے میں مصنف عبدالرزاق کا نام لے لیا، اور کتاب الجامع کو ذیلی عنوان کے طور پر تسلیم کرلیا، کسی نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ عبدالرزاق کی ایک کتاب الجامع ہے جو مصنف کے آخر میں لکھی ہوئی ہے۔ اور معمر بن راشد کی یہ کتاب الجامع نہیں ہے، اس لیے اس موضوع پر گفتگو کی گنجائش اب بھی باقی رہ جاتی ہے اور یہ کوئی قطعی ثبوت نہیں بن رہا ہے کہ مصنف کے آخر میں عبدالرزاق کے استاذ معمر ابن راشد کی کتاب الجامع نہیں ہے، بلکہ خود عبدالرزاق کی اپنی کتاب الجامع ہے۔

تیسری داخلی شہادت میں ۳۵ روایتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اگر یہ معمر کی کتاب الجامع ہوتی تو اس میں یہ روایتیں کیوں ہیں؟ جب کہ عبدالرزاق نے ان روایتوں کو دوسرے

شیوخ حدیث سے لیا ہے، یہ داخلی شہادت شک وشبہات سے خالی نہیں ہے، ایک معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ عبدالرزاق نے اپنے استاد معمر کی کتاب الجامع کو اپنی کتاب مصنف کا ضمیمہ بنایا تو جس باب سے متعلق ان کو اپنے دوسرے شیوخ سے جو روایتیں ملیں ان کو اس موقع پر لکھ دیا ہوگا، تاکہ مسئلہ زیر بحث پر اور روشنی پڑ جائے، یہی وجہ ہے کہ ان روایتوں کی تعداد بہت محدود ہے کیوں کہ کتاب الجامع میں ایک ہزار چھ سو چودہ روایتیں ہیں، اس کے مقابلہ میں دوسرے شیوخ کی روایتیں صرف ۳۵ ہیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عبدالرزاق نے اپنے استاذ کی کتاب میں بہت زیادہ اضافہ پسند نہیں کیا ہوگا، اس لیے گنتی کی چند روایتوں پر اکتفا کیا، اس لیے مولانا اعظمی کے ان دلائل وشواہد کے باوجود بحث اب بھی تشنہ رہ گئی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا جوابی مضمون:

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس بحث کو اٹھایا تھا کہ مصنف کے آخر میں جامع معمر شائع ہوگئی ہے، جب کہ وہ ایک مستقل کتاب ہے اور دوسرے کی ہے، اسے المصنف کے ساتھ نہیں شائع ہونا چاہئے تھا اور اگر شائع کرنا تھا تو وہاں یہ وضاحت ضروری تھی کہ بطور ضمیمہ معمر کی کتاب الجامع مصنف کے عام مخطوطوں میں ملتی ہے، اس لیے ہم بھی مصنف کے آخر میں اس کو شائع کر رہے ہیں۔ اسی اعتراض کے پیش نظر مولانا اعظمی نے کتاب الجامع کو عبدالرزاق کی تصنیف قرار دینے کے سلسلے میں اپنے مضمون میں دلائل دیئے تھے، لیکن ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے، مولانا اعظمی کے اس مضمون کے بعد انھوں نے اپنے ایک مضمون میں اپنے شک وشبہہ یا دعویٰ کے وجوہ واسباب پر روشنی ڈالی اور پوری تحقیق وتفتیش کے بعد اپنے نقطۂ نگاہ کا پھر اعادہ کیا کہ یہ کتاب الجامع معمر بن راشد ہی کی ہے، مصنف عبدالرزاق کا جزء اور حصہ نہیں ہے، انھوں نے کئی ٹھوس اور مضبوط دلیلیں دی ہیں، وہ مختصر طور پر درج ذیل ہیں:

۱- جامع معمر بن راشد کے ترکی میں دو مخطوطے ہیں، جن پر نام بھی صرف جامع معمر بن راشد ہے اور جن میں مندرجات بھی ایک چھوٹی کتاب کے ہیں۔ جلد میں اور کوئی چیز نہیں ان میں ایک جو بہت ہی قدیم ہے ۳۶۴ھ کا لکھا ہوا ہے وہ انقرہ میں ہے، دوسرا مماثل نسخہ استانبول میں ہے، ان کا ایڈیشن ایک ترکی رفیق نے اشاعت کے لیے تیار کیا ہے، انھیں مصنف عبدالرزاق سے کوئی

دلچسپی نہیں تھی، میں نے جامع معمر کے ان دونوں مخطوطوں کے مندرجات کا مصنف عبدالرزاق کے باب کتاب الجامع سے مقابلہ کیا،تو پتہ چلا کہ وہ ہو بہو ایک ہی چیز ہیں۔فرق ہے تو وہی جو عام طور پر ایک ہی کتاب کے دو مخطوطوں میں ہوتا ہے،مکرر عرض کرتا ہوں کہ ان دونوں مخطوطوں پر جامع معمر درج ہے جامع عبدالرزاق نہیں۔

۲-مولانا اعظمی نے دو محدثین کی وضاحت کا ذکر فرمایا تھا اس سلسلہ میں ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے تحریر کیا کہ مصنف عبدالرزاق کے جو متداول نسخے دنیا کے مختلف ملکوں میں ملتے ہیں ان میں کتاب الجامع کتاب کے آخر میں موجود ہے اگر ایسا ہی ایک نسخہ سعید سنبل یا حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی کی نظر سے گذرا ہو اور انھوں نے کچھ لکھا ہو اور کچھ خیال آرائی کی ہو تو قصور ان کا نہیں، بے خیالی میں ہر کسی سے ایسا ہی ہوسکتا ہے اگر کسی نے ان کو توجہ دلائی ہوتی اور اس کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہتے تو وہ اہم چیز ہوتی۔موجودہ صورت حال سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

۳-مولانا اعظمی نے جو داخلی شہادت پیش کی تھی وہ بھی ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کے نزدیک کوئی خاص وزن نہیں رکھتی،ان کا کہنا ہے کہ اگر جامع معمر میں جو مصنف کا ضمیمہ بن گئی ہے چند ایسی حدیثیں ہیں جو عبدالرزاق نے معمر سے نہیں بلکہ کسی اور شیخ سے لی ہیں تو اس سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا،مصنف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے (یعنی ۹ ½ جلدوں تک) ان میں کثرت سے حدیثیں عبدالرزاق عن معمر کی سند سے ملتی ہیں،اس سے وہ جامع معمر کا جزء نہیں بن جاتیں۔ سیرت ابن ہشام میں دیکھئے ابن ہشام نے کچھ چیزیں حذف کردی ہیں کچھ چیزیں اپنی طرف سے بڑھائی بھی ہیں،سیرت ابن اسحاق مطبوعہ مراکش سے اس کا پتہ آسانی سے چل سکتا ہے،ایسا بارہا ہوتا ہے کہ کتاب راوی کی طرف منسوب کردی جائے،ابن حبیب کی ایک کتاب ان کے شاگرد اور راوی سکری کی طرف مخطوطے میں منسوب ہوگئی ہے،ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

۴-مولانا نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر کیا تھا اور دلیل میں کشف الظنون کا حوالہ دیا تھا اور ثبوت میں مصر کے فواد سید کے اس مخطوطے کو دیکھنے کو بیان کیا تھا،اس دلیل نے بھی ڈاکٹر صاحب کو متاثر نہیں کیا اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں:

دمشق کے مخطوطے کو مصر کے فواد سید نے عبدالرزاق کا قرار دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انقرہ

اور استانبول کے مخطوطوں سے ناواقف تھے، ترکی کے فوادسزگین اشاعت کے لیے جامع معمر کو تیار کرنے کے بعد دمشق گئے اور وہاں کے مخطوطے کو دیکھا، پھر رباط جاکر وہاں کے بھی مخطوطے کو دیکھا، وہ اپنی جرمن کتاب "تاریخ تالیفاتِ عربی" میں لکھتے ہیں کہ جامع کے راوی عبدالرزاق ہیں اور انھوں نے اسے اپنی مصنف کا ذیل بنایا ہے اور اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور یہ کہ اصابہ ابن حجر جلد۴ صفحہ ۱۳۱ اور صفحہ ۶۰۳ میں بھی جامع معمر کے اقتباسات ہیں۔

۵-ڈاکٹر صاحب نے مزید ثبوت اور شہادت کے طور پر آخری بات یہ لکھی ہے کہ میری دانست میں پرکھنے کا بہتر معیار یہ ہے کہ داخلی شہادت پر جائیں، معمر بہت قدیم مؤلف ہیں، ان کے استاذ ہمام بن منبہ کے وقت حدیثوں کے مجموعوں میں کوئی تبویب مطلق نہیں ہوتی تھی، معمر گویا تبویب کا آغاز کرتے ہیں، لیکن وہ زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھے، ان کے شاگرد عبدالرزاق تبویب کو مزید ترقی دیتے ہیں اور فقہی ابواب پر کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ، عیدین، جنائز، زکوٰۃ، صیام، عقیقہ وغیرہ کی حدیثیں مرتب کرتے ہیں اور ان کتابوں کے تحت وہ ذیلی ابواب دیتے چلے جاتے ہیں، یہ چیزیں صرف مصنف میں ملتی ہیں، کتاب الجامع میں نہیں ملتیں، اس کا نہج بالکل الگ ہے اور تبویب نسبۃً ابتدائی حالت میں ہے، مصنف میں کتاب الاشربۃ اور کتاب البیوع کی حدیثیں دوبارہ الگ مقام پر یعنی جامع معمر میں نہ ہوتیں اگر دونوں ایک ہی کتاب کے اجزاء ہوتے تو دوجگہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، یہی حال مصنف میں حضرت عمر کی وصیت کا ہے جو مصنف میں ہے اور جامع معمر میں بھی ہے اور یہ بعض دیگر تفصیلوں پر مشتمل ہے، ایسی اور چیزیں ملتی ہیں جو اندرونی شہادت ہیں۔

کیا یہ شواہد قول فیصل ہیں؟:

ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا اعظمی کی ہر دلیل کو بڑے ٹھوس اور وزن دار دلائل کے ساتھ رد کر دیا اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ دنیا میں جامع معمر کے مخطوطے موجود ہیں اور وہ ہو بہو وہی ہیں جو مصنف میں بطور ضمیمہ شائع کیا گیا ہے، اس لیے قطعیت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مولانا اعظمی سے چوک ہوگئی اور اس کو مصنف کا ہی ایک حصہ مان کر اس کو شائع بھی کر دیا ہے۔

یوں تو ڈاکٹر صاحب نے جامع معمر کا قدیم ترین نسخہ دریافت کر کے ایک بہت ہی بڑا اور اہم

ثبوت فراہم کردیا ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جامع معمر کا یہ مخطوطہ ۴۶۳ھ میں لکھا گیا ہے یعنی حضرت معمر کی وفات کے دوسو گیارہ سال بعد اس لیے قدرتی طور پر یہ خیال آتا ہے کہ اس مخطوطہ کی سند کیا ہے؟ کیا یہ معمر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مخطوطے سے نقل کیا گیا ہے؟ اگر نہیں، تو معاملہ پیچیدہ ہوجاتا ہے اور شک وشبہہ کا دروازہ کھل جاتا ہے، کیونکہ یہ مخطوطہ المصنف کے مرتب عبدالرزاق متوفی ۲۱۱ھ کے ۱۵۳ سال بعد لکھا گیا، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی ذہین عالم نے مصنف ہی سے اس کتاب الجامع کو نقل کرلیا ہو اور چونکہ تمام روایتیں حضرت معمر سے ہیں اس لیے اس کو جامع معمر لکھ دیا ہو، ایسی مثالیں موجود ہیں، جیسے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں سہل انگار پی ایچ ڈی کرنے والے ہوتے ہیں، عرب ممالک میں بھی ایسے سہل انگار دکتوراۃ کرنے والے بھی ہورہے ہیں، انھوں نے مصنف کی کتاب المغازی نقل کر کے اس کا نام مغازی زہری رکھ دیا اور ڈگری حاصل کرلی، اس لیے ایسی دلیل کی ضرورت ہے جس سے ثابت ہوجائے کہ یہ جامع معمر مصنف سے براہ راست نقل نہیں کی گئی، اسی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب یہ بھی تصریح کردیتے کہ دوسرے شیوخ حدیث سے جو ۳۵ روایتیں مصنف کی کتاب الجامع میں ہیں وہ اس مخطوطے میں نہیں ہیں، اس سے اس یقین میں اضافہ ہوتا کہ یہ مخطوطہ مصنف سے نہیں نقل کیا گیا ہے، پھر بھی یہ احتمال باقی رہ جاتا کہ نقل کرنے میں کاتب نے بالقصد ان روایتوں کو چھوڑ دیا اور صرف حضرت معمر ہی کی روایتیں لی ہوں میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ امام عبدالرزاق کی وفات کے تقریباً ۱۶۰ سال گذرجانے پر مصنف کے بہت سے مخطوطے تیار ہوگئے اور پوری دنیا میں پھیل گئے اور ڈیڑھ صدی بعد یہ مخطوطہ لکھا گیا تو ذہن میں اس خیال کا آنا فطری ہے کہ متداول نسخوں سے کسی نے یہ جامع معمر تیار کردی ہے اگر اس مخطوطے پر سند ہوتی، سماعات کا اندراج ہوتا اور یہ بتادیا جاتا کہ معمر کے کس شاگرد کی روایت پر یہ مشتمل ہے اور اس راوی سے کاتب تک جتنے واسطے پڑتے ہیں اس کا ترتیب وار اندراج ہوتا تو شک وارتیاب کے دروازے بند ہوجاتے۔

ڈاکٹر صاحب نے مولانا اعظمی کی دوسری دلیل کو کوئی اہمیت نہیں دی جس میں کہا گیا تھا کہ شیخ سنبل اور شاہ عبدالعزیز دہلوی نے کتاب الجامع کو مصنف کا جزء مانا ہے، ڈاکٹر صاحب کی دلیل میں وزن ہے کیونکہ ایسے اہم اور تحقیق طلب مسئلہ میں جب تک تحقیق وتفتیش کا حق ادا نہ کرلیا جائے علمی دنیا میں وہ

دعویٰ قابل پذیرائی نہیں ہوسکتا اگر ان محدثین کے سامنے یہ مسئلہ اسی اہمیت کے ساتھ پیش کیا جاتا اور وہ دلائل وشواہد کی روشنی میں فیصلے کرتے تو یقیناً علمی دنیا میں اس رائے کو قدر ومنزلت حاصل ہوتی موجودہ صورت میں کسی محقق کے لیے ان علماء کا صرف نام لے لینا کافی نہیں ہے۔

مولانا اعظمی کی تیسری دلیل میں بھی ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کوئی وزن نہیں انھوں نے متعدد مثالیں دے کر اپنے موقف کو صحیح ثابت کردیا ہے۔اور اپنے دعوے کو مضبوط بنادیا ہے۔

چوتھی دلیل کے طور پر مولانا اعظمی نے مصر کے فواد سید کے بارے میں لکھا تھا کہ انھوں نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کے مخطوطے کو دیکھا ہے اور مخطوطے کا سال کتابت بھی بتادیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس داستان کے اگلے حصہ کو بیان کر کے حیرت زدہ کردیا اس آخری حصہ کا مولانا اعظمی کو علم نہیں تھا ڈاکٹر صاحب نے انھیں مصر کے سید فواد اور ترکی کے فواد اور سزگین کی تصریحات کو پیش کر کے اس مشاہداتی شہادت کی قدر ومنزلت کو ختم کردیا، جواب اور جواب الجواب کے بعد بھی مسئلہ اپنی جگہ پر رہا اور کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوسکا۔

قول فیصل:

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں دلائل وشواہد پیش کیے تو مولانا اعظمی نے ضرورت محسوس کی کہ اپنی تحقیق کو تفصیلی طور پر اہل علم کے سامنے پیش کردیں اس لیے ایک دوسرا مضمون لکھا جس میں مدلل اصولی بحث کے بعد آپ نے متنازع فیہ مسئلہ پر تحقیق وتفتیش کی روشنی میں کچھ دوسرے دلائل اور کچھ نئی شہادتیں تحریر فرمائیں۔آپ نے ایسے مخطوطات کا پتہ چلایا جو جامع عبدالرزاق کے نام سے پائے جاتے ہیں اور ان پر سماع کی تصریح روای کے نام کی وضاحت بھی ہے مولانا اعظمی نے جس مخطوطے کو دریافت فرمایا ہے اس کے مستند اور قابل اعتماد ہونے کی شہادتیں بھی پیش کی ہیں آپ نے تحریر فرمایا کہ عبدالرزاق سے اس کی روایت کرنے والے الحافظ الحجۃ احمد بن منصور الرمادی ہیں اور یہ نسخہ اہل علم میں معروف ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کا سماع کیا ہے اور اس کو مخطوطہ پر تحریر بھی کردیا ہے اس کے دو حصے مولانا کی نگاہ سے گذرے ہیں اس کے جزء اول کے کاتب الامام الحافظ المفید ابوالفتح نصر بن ابی الفرج حصری متوفی ۶۱۹ھ ہیں اس مخطوطہ کے سرورق پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

''الجزء الأول من كتاب الجامع عن عبدالرزاق بن همام أبي بكر

الصنعانی''

اور یہ بھی اس مخطوطہ پر تحریر ہے کہ یہ مخطوطہ ابوبکر احمد بن منصور الرمادی اور ابوعلی اسماعیل بن محمد بن صالح الصفار کی عبدالرزاق سے روایت کے مطابق ہے۔ پھر عبدالرزاق کے ان دوشاگردوں سے جن لوگوں نے روایت کی ہے ان کے نام بھی اس پر درج ہیں اور کاتب نسخہ تک کی سند محفوظ ہے، اس کتاب الجامع کا دوسرا جزء مشہور محدث ابوالمحاسن القرشی کے قلم سے ہے، اس کی بھی سند پیش کی ہے، یہ ایک بڑی شہادت ہے۔ مولانا اعظمی نے اپنے اس مضمون میں پانچ ناقابل تردید دلائل وشواہد پیش کیے ہیں، وہ بالترتیب درج ذیل ہیں:

۱- جامع عبدالرزاق کا نسخہ جو ابوالفتح نصر بن ابی الفرج الحصری متوفی ۶۱۹ھ کا مخطوطہ ہے، اور پورا ان کے قلم کا لکھا ہوا ہے، ان کے ثقہ وضابط ہونے پر ائمہ رجال کا تقریباً اتفاق ہے، ان کا سماع ابن النقطہ، ابن النجار، ابن الدبیثی اور ذہبی سے ثابت ہے اور خود اپنے قلم سے اپنے سماع کے اندراجات بھی کردیئے ہیں۔ یہ ساری تفصیل اس مخطوطہ کے سرورق پر موجود ہے اور یہ بھی وضاحت ہے کہ اس کتاب الجامع کا ان کو خزیفہ سے سماع حاصل ہے۔

۲- انھوں نے اس مخطوطہ پر لکھا ہے کہ جامع عبدالرزاق کے جزء اول کو میں نے مشہور امام وحافظ حدیث ابوالمحاسن القرشی کے مخطوطے سے نقل کیا ہے، اور ابوالمحاسن کے بارے میں ابن الدبیثی، ابن الحصری اور ذہبی کی صراحت ہے کہ وہ ثقہ ہیں، حافظ حدیث ہیں، روایتوں کا سماع اور کتابت ان کا ہر شک وشبہہ سے بالا ہے، ائمہ رجال نے یہ بھی غیر مبہم لفظوں میں لکھا ہے کہ وہ صحیح النقل ہیں، علامہ ذہبی نے ''**الصالح الحافظ محدث بغداد**'' کے شاندار لفظوں سے ابوالمحاسن کا تذکرہ کیا ہے، ابوالمحاسن کے مخطوطے پر یہ عبارت ہے:

''جامع عبدالرزاق کا یہ وہ جزء ہے جس کا سماع پوری ایک جماعت کو حاصل ہے''

مولانا اعظمی نے ان مشہور محدثین کے نام شمار کرائے ہیں جن کو اس مخطوطے کا سماع حاصل ہے اور مخطوطہ کے سرورق پر ان کے نام بھی ثبت ہیں، ان محدثین میں عبدالوہاب بن الصابونی متوفی ۵۵۶ھ، عبدالواحد بن حسین بن عبدالواحد البارزی متوفی ۵۶۲ھ، خزیفۃ الوزانی متوفی ۵۶۲ھ سماع کرنے والی جماعت میں شامل ہیں۔

۳-جامع عبدالرزاق کے اس جزء کی قرأت مشہور محدث ثابت الکیلی نے شیخ حسین بن طلحہ کے سامنے کیا اور ان سے رجب ۴۹۲ھ میں روایت کی اجازت حاصل کی، اور اس کو نصر بن ابی الفرج الحصری نے اپنے قلم سے لکھا ہے، مزید توثیق کے لیے نصر الحصری نے مشہور محدث ابن الاخضر کے مخطوطے سے بھی نقل کیا ہے، اور ابن الاخضر کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل نے **ثقةً، ثابتاً، مأموناً فی السماع، واسع الروایة** کے الفاظ کہے ہیں، اور یہ ابن الدبیثی، ابن النجار، ضیاء المقدسی اور برزالی جیسے ائمہ فن کے شیخ اور استاذ ہیں، اس توضیح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشہور محدثین میں امام نصر بن ابی الفرج، حافظ ابوالمحاسن القرشی، حافظ ثابت الکیلی، امام ابن الاخضر اور مسندة العراق فخر النساء شہدة ان لوگوں میں شامل ہیں، جنھوں نے علی بن طلحہ سے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا سماع کیا ہے اور ہر ایک کو پورا یقین ہے کہ یہ عبدالرزاق کی کتاب الجامع ہے، اور جامع معمر نہیں ہے۔

۴-اسی طرح ایک اور محدث حافظ الحدیث عمر بن الحاجب متوفی ۶۳۰ھ کو بھی یقین کامل تھا کہ یہ مخطوطہ جس کو نصر بن ابوالفرج نے نقل کیا ہے عبدالرزاق کی کتاب الجامع ہے، جامع معمر بن راشد نہیں، اسی یقین کے ساتھ اس مخطوطہ کو حاصل کیا اور اس کو وقف کیا اور خود اپنے قلم سے اس پر یہ تحریر کیا:

> ''میں نے اس کا مقابلہ ابن الانماطی کے مخطوطے سے کیا ہے، یہ جامع عبدالرزاق کا جزء اول ہے جو ''**باب حب المال**'' پر ختم ہوتا ہے، اس کا سماع شیخہ صالحہ شہدة بنت ابی الفرج الابری سے مجھے حاصل ہوا، شہدة نے ابوعبداللہ الحسین بن طلحہ سے سنا انھوں نے اس کا سماع ابوالحسین بن بشران سے کیا، انھوں نے ابواسماعیل الصفار سے، انھوں نے ابوبکر الرمادی سے اور رمادی نے امام عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی سے سماع کیا۔''

مولانا اعظمی نے مخطوطہ کی پوری سند نقل کر کے مخطوطہ کی قدر و قیمت ہی کو واضح نہیں کر دیا، بلکہ آپ نے کسی کے لیے شک وشبہہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

۵-محدثہ شہدة بنت ابوالفرج کے سامنے ابوعبداللہ محمد بن المحسن بن ابی المضاء نے قرأت کی، سماع کرنے والوں میں ابوالفتح نصر بن ابی الفرج ابن الحصری، ابوالفضائل عبداللہ بن سلامة بن مسلم المصری اور ان کے صاحبزادے ابوالحسن علی اور دوسرے لوگ ہیں، یہ قرأت وسماع ۵۷۱ھ میں ہوا، اور مخطوطہ پر اس کا اندراج موجود ہے۔

عمر بن الحاجب کا یہ بھی بیان ہے کہ میں نے اس کے علاوہ ایک مخطوطہ محدث دمشق ابوالمواہب کا بھی دیکھا ہے جو یہی عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ہے۔

مولانا کی اس تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ الامام الحافظ ابوالمواہب متوفی ۵۸۶ھ محدث دمشق اور الحافظ البارع مفید الشام تقی الدین ابن الانماطی المتوفی ۶۱۹ھ محدث شام اور مسند الدیار المصریہ العلامہ علی بن ہبۃ اللہ المصری المتوفی ۶۴۹ھ اوران کے والد ابوالفضائل ہبۃ اللہ یہ تمام جلیل القدر علماء ومحدثین کو یقین کامل ہے کہ یہ عبدالرزاق کی کتاب الجامع ہے، جو مصنف کے آخر میں ہے، جامع معمر نہیں۔

۶-مولانا اعظمی نے مزید شہادت یہ تحریر فرمائی ہے کہ امام نصر بن ابوالفرج کے مخطوطہ پر الامام الحافظ عبدالغنی المقدسی المتوفی ۶۰۰ھ محدث الاسلام کے ہاتھ کی تحریر ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ یہ جامع عبدالرزاق کا جزء اول ہے، جو محدثۂ وقت حضرۃ شہدۃ کے سامنے پڑھا گیا، سیدہ شہدۃ کو حسین ابن طلحۃ النعالی سے سماع حاصل ہے، انھوں نے ابوالحسن بن بشران سے انھوں نے اسماعیل الصفار سے، انھوں نے رمادی سے، انھوں نے امام عبدالرزاق الصنعانی سے سماع کیا ہے اور اجازت حاصل کی ہے، ان میں ابوالفتح اوران کے صاحبزادے اور ابوالفضائل ہبۃ اللہ بن سلامہ بن مسلم المصری اور ان کے صاحبزادے ابوالحسن علی اوران کے ملازم فرج الحلبی شامل ہیں اوران کو سماع حاصل ہے اور یہ سماع جمادی الاولیٰ ۵۷۱ھ میں ہوا، ذہبی نے عبدالغنی مقدسی کو محدث الاسلام لکھا ہے اور وہ کتاب الجامع کو جامع عبدالرزاق سمجھتے اور لکھتے ہیں، جامع معمر نہیں۔

۷-اسی جزء کو عبدالقادر الرمادی نے سیدہ شہدۃ کے سامنے پڑھا اوران سے اجازت حاصل کی، یہ ۵۶۶ھ کا واقعہ ہے، ان کو بھی اس کے جامع عبدالرزاق ہونے میں کوئی اشتباہ اور شک نہیں ہے۔

مولانا نے مزید تفصیلات دی ہیں جن سے یقین واعتماد میں اضافہ ہوتا ہے، آپ نے بتایا کہ نصر بن ابی الفرج کو جامع عبدالرزاق سے غایت شغف تھا، اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، دوسروں کو پڑھنے کے لیے دیتے تھے، اہل علم بڑے محدثین کے سامنے پڑھ کران سے اجازت لیتے تھے، اور یہ اہل علم اس مخطوطہ پر اپنے سماعات کو درج بھی کر دیتے تھے۔ یہ مخطوطہ ۵۵۸ھ میں خزیفہ بن سعد کے سامنے پڑھا گیا اور انھوں نے اجازت دی، ۵۵۹ھ میں عبدالواحد البارزی سے پڑھا گیا، پھر سیدہ

شہدۃ کے سامنے ۵۷۱ھ میں پڑھا گیا۔ یہ تمام سماعات اس مخطوطہ پر موجود ہیں۔ ابن ابی الفرج اتنے فیاض تھے کہ اپنا نسخہ علماء حدیث کو عاریتاً دیتے اور ان کو اجازت دیدیتے کہ وہ اپنا سماع مخطوطہ پر لکھ سکتے ہیں، ایک زمانے تک یہ مخطوطہ ان کے پاس رہا اور لوگوں کو عاریتاً دیتے رہے، یہاں تک کہ حافظ الحدیث عمر بن الحاجب الامینی کو یہ نسخہ مل گیا اور اپنی لائبریری میں اس کو داخل کر کے ہمیشہ کے لیے وقف کر دیا، لیکن اس مخطوطے کی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی ہے، بلکہ کچھ اور آگے جاتی ہے، حافظ الحدیث احمد بن محمود الجوہری المتوفی ۶۴۳ھ اس کو مصر لے جاتے ہیں اور اس کو مشہور عالم علی بن ہبۃ اللہ المعروف بہ ابن الجمیزی کے گھر لے گئے، جوہری نے قرأت کی، ۶۲۴ھ کا ان کا سماع اس مخطوطہ پر درج ہے، جوہری کے الفاظ ہیں:

''قرأت هذا الجزء الأول من جامع عبدالرزاق على الشيخ على ابن هبة الله المعروف بابن الجميزى.''

جوہری نے صرف جزء اول کو پڑھ کر اس کی اجازت لی تھی، اب ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس کے بقیہ اجزاء کیسے حاصل ہوں، اس کی تفتیش و جستجو میں لگ گئے، آخر ان کو کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا دوسرا تیسرا اور چوتھا حصہ بھی حاصل کر لیا، ان کو اپنے ہاتھوں سے نقل کیا اور جزء اول کے ساتھ جوڑ کر کتاب کو مکمل کر دیا، پھر یہ مکمل نسخہ لے کر آپ شام گئے اور مسندۃ الشام کریمہ بنت عبدالوہاب کے سامنے پڑھ کر ان سے اجازت لی اور اپنے قلم سے نصر ابن ابی الفرج کے نسخہ کے آخری ورق پر اپنے سماع و اجازت کو لکھ دیا ان کے الفاظ ہیں:

قرأت جميع هذا الجزء الأول وما بعده من الأجزاء الأربعة وهو جميع كتاب الجامع لعبدالرزاق بن همام الصنعانى على الحرة الأصيلة أم الفضل كريمة ابنة عبدالوهاب.	میں نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کے چاروں جزؤں کو محدثۂ شام سیدۃ ام الفضل کریمہ بنت عبدالوہاب کے سامنے پڑھا (اس طرح انھوں نے ایک مستند محدثہ وقت سے سماع و اجازت حاصل کی)

اپنے سماع و اجازت کی توضیح کے بعد علامہ جوہری نے محدثہ شام ام الفضل حضرۃ کریمہ بنت عبدالوہاب کی سند بھی تحریر کر دی کہ ان کو کس محدث سے اجازت حاصل ہے اور ان لوگوں کے بھی

اسما برتحریر کردیئے جنھوں نے سیدہ کریمہ سے ان چاروں اجزاء کو پڑھ کر سند واجازت حاصل کی، یہ ۶۴۰ھ کا واقعہ ہے۔

۸-مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور مخطوطہ کا ذکر کیا ہے، جو بہت صاف خوشخط لکھا ہوا ہے، اس کے لکھنے والے حافظ ابن حجر عسقلانی کے ممتاز شاگرد اور جلیل القدر محدث تقی الدین قلقشندی ہیں، آپ نے لکھا ہے کہ میں نے خود اس مخطوطہ کو دیکھا ہے، اس مخطوطہ کے سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے:

''الجزء الأول من كتاب الجامع تأليف الإمام عبدالرزاق بن همام الصنعاني''

اس مخطوطہ پر سند بھی لکھی ہوئی ہے، یہ مخطوطہ عبدالرزاق کے دو شاگرد ابوبکر احمد بن منصور الرمادی اور اسماعیل الصفار کی روایت کے مطابق ہے، قلقشندی نے اپنے استاذ حافظ ابن حجر عسقلانی سے پڑھ کر اس مخطوطہ کی اجازت حاصل کی، انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اس مخطوطہ کو دوسرے لوگوں نے بھی پڑھ کر ان سے سند واجازت لی ہے، ان لوگوں کے اسماء گرامی اس مخطوطہ پر ثبت کردیئے ہیں، یہ سماع واجازت کا واقعہ ۸۴۳ھ کا ہے۔

۹-مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے آخری شہادت یہ پیش کی ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے مصنف کے آخر میں شائع ہونے والی کتاب الجامع کو عبدالرزاق کی تصنیف مانا ہے۔ انھوں نے اپنی مشہور عالم کتاب فتح الباری ج ا ص ۸۹ پر لکھا ہے کہ:

''بخاری نے **باب إفشاء السلام من الإسلام** میں حضرت عمار کی ایک موقوف روایت نقل کی ہے۔ معمر نے اپنی کتاب الجامع میں بھی موقوف ہی نقل کیا ہے اور عبدالرزاق نے اپنی کتاب مصنف میں حضرت معمر سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے عبدالرزاق کی روایت کے سلسلہ میں مصنف کا نام لیا ہے، اور یہ روایت مصنف کی کتاب الجامع کے آخر میں ہے، یعنی ابن حجر نے اس کتاب الجامع کو بھی مصنف ہی کا ایک حصہ مانا ہے، ورنہ صرف معمر کی کتاب الجامع کا حوالہ کافی تھا، عبدالرزاق کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

داستان تمام ہوگئی:

میں نے اب تک آپ کو وہ روداد سنائی ہے، جو مصنف عبدالرزاق میں کتاب الجامع کے شامل ہونے سے متعلق تھی، اس مسئلہ کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اٹھایا تھا، ڈاکٹر صاحب کی علمی عظمت مسلّم ہے، ان کی تحقیق وتفتیش کی قدر وقیمت سے پورا عالم اسلام ہی نہیں واقف ہے، بلکہ یورپ کی دانشگاہوں میں ان کا نام ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی مخلص، بےلوث، بے غرض، متواضع اور منکسر المزاج ہیں، ان کا مقصد نہ اعتراض کرنا تھا اور نہ اپنی ہمہ دانی کا اظہار مقصود تھا، انھوں نے اپنی تحقیق وتفتیش کی روشنی میں یہ سمجھا کہ یہ مصنف کے آخر میں جو کتاب الجامع شائع ہوگئی وہ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے، مصنف عبدالرزاق کا حصہ نہیں ہے۔ ان کا یہ خیال یقین میں اس وقت بدل گیا جب انقرہ اور استانبول میں انھوں نے جامع معمر کے نام سے دو مخطوطے دیکھے، اور مصنف کی کتاب الجامع سے مقابلہ کیا، تو دونوں میں بہت کم فرق نظر آیا، اس لیے ان کو یقین ہوگیا کہ مولانا اعظمی سے چوک ہوگئی، انھوں نے زیادہ تحقیق نہیں فرمائی، اگر انھوں نے مزید تحقیق وجستجو سے کام لیا ہوتا تو مصنف میں اس کو شامل نہ کرتے اور مصنف گیارہ جلدوں کے بجائے ۹ ۱/۲ (ساڑھے نو) جلدوں میں تمام ہوجاتی۔

مولانا اعظمی نوراللہ مرقدہ اگر چہ اپنے خام سفالہ پوش مکان کے نیم تاریک خلوت کدہ میں رہتے اور ان کو وہ وسائل میسر نہ تھے جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو حاصل ہیں، مگر وہ ایسا دل ودماغ رکھتے تھے جس کو ''جام جہاں نما'' کہا جاسکتا ہے، تحقیق وتفتیش کی کوتاہی کا یہ الزام کچھ ہلکا نہیں تھا، اس سے یہ تأثر پیدا ہوسکتا ہے کہ کام سرسری کیا گیا ہے اور تحقیق کا حق پورا پورا ادا نہیں کیا گیا ہے، اس لیے آپ نے پہلے تو ایک ہلکا پُھلکا مضمون اس شک وشبہہ کے جواب میں قلم بند کردیا؛ لیکن جب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے اعتراض اور شک وارتیاب کے وجوہ واسباب کو تفصیل سے بیان کیا اور اس کو رسالے میں شائع کرادیا، تب مولانا مرحوم نے ایک مفصل مضمون عربی زبان میں تحریر فرمایا اور اس میں دلائل وبراہین کا انبار لگادیا، جس کی روداد میں نے آپ کو سنائی۔

ڈاکٹر صاحب کا اعتراض صرف دو مخطوطوں کی بنیاد پر تھا، جو ان کو اتفاقاً مل گئے تھے، انھیں کا ذکر انھوں نے بڑی شدومد سے فرمایا تھا، لیکن مخطوطہ چوتھی صدی کا تھا، اس لیے اس کی سند کی ضرورت تھی، کاتب

کون ہے؟ کس مخطوطے سے نقل کیا گیا؟ معمر بن راشد کے کس شاگرد نے اس مخطوطہ کی روایت کی؟ کن لوگوں کو مخطوطے کا سماع حاصل ہے؟ اور کس ترتیب سے یہ روایتیں موجودہ مخطوطے کے کاتب تک پہنچیں؟ اور کاتب مخطوطہ سے لے کر معمر بن راشد تک کی سند کیا ہے؟ ان تمام اہم اور ضروری پہلوؤں کو ڈاکٹر صاحب نے نظر انداز کر دیا جب کہ ان مخطوطوں کو بطور دلیل پیش کرنے کے لیے یہ توضیحات ضروری تھیں، ان کے بغیر مخطوطے کی کوئی قدر و قیمت نہیں بنتی ہے، اس کے برخلاف مولانا مرحوم نے اپنے ثبوت میں جتنے مخطوطات کو پیش کیا ہے، ہر ایک کی سند عبدالرزاق تک پہنچائی ہے اور ان مستند محدثین کا نام بنام ذکر کیا جن کو مخطوطے کا سماع حاصل تھا، جن لوگوں نے شیخ کے سامنے مخطوطے کی قرأت کی، وہ تلامذہ جو اس قرأت کے وقت موجود تھے، جن کو شیخ نے اجازت دی، اس کو مفصل بیان کر کے دریافت کردہ مخطوطہ کی قدر و قیمت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا، مولانا کی یہ دلیل قول فیصل اور اس بحث کے لیے حرف آخر بن گئی، اس تفصیلی بیان کے بعد ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے پھر دوسرا کوئی مضمون نہیں لکھا یا، تو وہ مطمئن ہو گئے، یا اس بحث کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھا اور خاموش ہو گئے۔

میرے نزدیک تو یہ بحث بے نتیجہ تھی، کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے جو مخطوطے دیکھے بقول ان کے ہو بہو وہی تھے جو مصنف کے آخر میں شائع شدہ کتاب الجامع میں ہے، دو جگہ لکھے جانے سے روایتوں کی صحت وصداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ان کو یہ تسلیم کر لینا چاہئے تھا کہ یہ عبدالرزاق کی روایت ہے، اس لیے مصنف میں ہونا ہی چاہئے تھا، میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خود عبدالرزاق کا بیان ہے:

قال عبدالرزاق: كتبت عن معمر عشرة آلاف حديث.	میں نے حضرت معمر بن راشد کی دس ہزار روایتوں کو قلم بند کیا ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۱ ص ۱۹۰)

کتاب الجامع میں کل ۱۶۱۴ روایتیں ہیں، جب کہ پوری مصنف میں ۲۱۰۳۳ روایتیں ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر عبدالرزاق نے معمر کی ساری روایتوں کو مصنف میں لے لیا ہوگا تو کتاب

الجامع کے علاوہ بقیہ جلدوں میں معمر کی ۸۳۸۶ روایتیں ہوں گی اور جس روایت کو جس باب سے متعلق سمجھا وہاں ان کو درج کردیا اور ڈیڑھ ہزار یہ متفرق روایتیں مصنف کے آخر میں آ گئیں تو اس پر اعتراض کیسے کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ ساڑھے آٹھ ہزار روایتوں پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟

ہوسکتا ہے کہ مصنف کی ترتیب کے وقت عبدالرزاق نے بھی متفرقات کے طور پر اپنی کتاب الجامع کو مرتب کر کے مصنف میں شامل کردیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب مصنف کا کوئی ایسا مخطوطہ پیش نہیں کرسکے، جو کتاب الجامع سے خالی ہو، اس لیے معلوم ہوا کہ عبدالرزاق کے زمانہ سے ہی یہ کتاب الجامع مصنف کا جزء رہی ہے اور وہی ابویعقوب اسحاق ابن ابراہیم الدبری اس کتاب الجامع کے بھی عبدالرزاق سے راوی ہیں، جن کی روایت سے پوری مصنف مرتب ہوئی ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب کو یہ اعتراض امام عبدالرزاق پر کرنا چاہئے، مولانا اعظمی پر نہیں، مولانا کے دلائل وشواہد کی روشنی میں ان کے موقف کو ہر اہل علم ہر محقق صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

استاذ محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی عظمت کا راز اسی طرح کے عظیم الشان علمی وتحقیقی کارناموں میں پوشیدہ ہے، جن سے عام اہل علم کو واقفیت نہیں، اسی طرح کے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے پوری علمی دنیا مولانا مرحوم کا نام عظمت واحترام کے ساتھ لینے پر مجبور ہے، ہم تلامذہ کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس نابغۂ روزگار شخصیت کے فیوض وبرکات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئے، مگر ان کی شفقتوں اور عنایتوں کے قربان جایئے کہ جاتے جاتے بھی ہمارا سر فخر سے اونچا کر گئے، اور ہمیں یہ موقع دے گئے کہ ہم سر اونچا کر کے کہہ سکتے ہیں:

اولٰئک آبائی فجئنی بمثلھم

إذا جمعتُنا یا جریر المجامعُ

مولانا الاعظمی کی تحقیق مصنّف عبدالرزاق

از: ڈاکٹر محمد صہیب ☆

احادیث کی کتابیں مختلف طرز پر مرتب کی گئی ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے خاص اصطلاحی نام بھی رکھے گئے ہیں، اس اعتبار سے کتب احادیث کی چھ بڑی قسمیں ہیں............:

۱-جوامع،۲-مسانید،۳-معاجم،۴-اجزاء،۵-رسائل،۶-اربعینات۔

جامع حدیث کی وہ کتاب کہلاتی ہے جس میں آٹھ طرح کے مضامین........۱-عقائد،۲-احکام،۳-رقاق،۴-آداب،۵-تفسیر،۶-تاریخ،۷-فتن اور ۸-مناقب جمع کیے گئے ہوں، (۱) جوامع کثیر تعداد میں لکھی گئیں، ان ہی میں ایک جامع عبدالرزاق بھی ہے، جو مصنف عبدالرزاق کے نام سے زیادہ مشہور ہے، بعض علما کا خیال ہے کہ مصنف وہ کتاب ہے جو فقہی ابواب پر مرتب کی گئی ہو، حالاں کہ یہی تعریف سنن کی بھی کی جاتی ہے، ابتداءً سنن کو مصنف ہی کہا جاتا تھا، ڈاکٹر محمود طحان لکھتے ہیں:

هو الكتاب المرتب على الأبواب الفقهية والمشتمل على الأحاديث المرفوعة والموقوفة والمقطوعة........(۲)

مصنف وہ کتاب ہے جو فقہی ابواب پر مرتب ہو اور مرفوع، موقوف ومقطوع حدیثوں پر مشتمل ہو۔

ڈاکٹر محمود طحان نے آگے چل کر ''مصنَّف'' اور ''سنن'' کا فرق بھی واضح کیا کہ مصنف میں مرفوع، موقوف اور مقطوع سب ہی حدیثیں پائی جاتی ہیں، جب کہ سنن میں احادیث مرفوعہ کے علاوہ موقوف ومنقطع حدیثیں شاذ ونادر ہی پائی جاتی ہیں، اسی لیے احادیث موقوفہ ومقطوعہ کو اصطلاح میں ''سنن'' نہیں کہا جاتا ہے۔(۳)

☆۵۶اپی/۹بی اےشمس نگر، کریلا باغ، الہ آباد۔

امام عبدالرزاق:

عبدالرزاق بن ہمام بن نافع صنعانی (۱۲۶ھ-۲۱۱ھ) جلیل القدر امام حدیث تھے، محدثین اور اہل فن نے ان کے علم وکمال کا اعتراف کیا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''عبدالرزاق نے اپنی کتاب سے جو بھی بیان کیا ہے وہ اصح ہے'' (۴)، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''معمر سے روایت کرنے میں عبدالرزاق کی حدیث، بصریوں کی روایت کردہ حدیث سے زیادہ محبوب ہے'' (۵)، حافظہ کا حال یہ تھا کہ سترہ ہزار حدیثیں ان کو یاد تھیں (۶)، امام عبدالرزاق کے مشائخ وتلامذہ میں کبار محدثین کے نام ملتے ہیں۔

امام عبدالرزاق کو مائل بہ تشیع کہا جاتا ہے مگر وہ خود فرماتے ہیں کہ مجھے کبھی بھی شرح صدر نہ ہوا کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ترجیح دوں، اللہ حضرات شیخین اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہما پر رحمت نازل کرے جو ان سے محبت نہ کرے وہ مومن نہیں۔ (۷)

امام عبدالرزاق کی شہرۂ آفاق تصنیف مصنف:

احادیث کا قدیم مجموعہ اور مصنف ابن ابی شیبہ سے پہلے کی تصنیف ہے، اس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں، اس میں اکیس ہزار تینتیس حدیثیں ہیں، احادیث وآثار کا یہ ایک قیمتی ذخیرہ تھا، جس سے بہت سے فقہاء ومحدثین نے استفادہ کیا، دوسری صدی ہجری میں تصنیف کردہ کتب احادیث اکثر موضوعات اور عنوانات کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہیں، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مصنف عبدالرزاق کا شمار کتب احادیث کے تیسرے طبقہ میں کیا ہے۔ (۸)

مصنَّف کی تحقیق:

مصنف کی اہمیت وعظمت کی بنا پر مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی خواہش تھی کہ اسے جدید معیار کے مطابق شائع کیا جائے، ان کے لائق شاگرد مولانا محمد میاں سملکی مدیر مجلس علمی نے اسی خیال سے مصنف کے مختلف نسخے حاصل کیے اور شاہ صاحب کے ہی شاگرد مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی سے درخواست کی کہ اس کی تحقیق فرمائیں (۹)، کیوں کہ وہ اس سے قبل حدیث کے کئی قدیم ترین اور نادر ونایاب ذخائر انتقاء الترغیب والترہیب، کتاب الزہد والرقائق، سنن سعید بن منصور اور مسند حمیدی کو تحقیق وتحشیہ کے بعد منظر عام پر لا چکے تھے، اسی لیے مولانا محمد میاں سملکی کی نظر انتخاب ان ہی پر

پڑی۔ افسوس ہے کہ مولانا الاعظمی مصنف پر مقدمہ نہ لکھ سکے اور دنیا سے رخصت ہوگئے (۱۰)، ورنہ اچھی طرح معلوم ہوجاتا کہ ان کو کہاں سے مصنّف کے مخطوطات دستیاب ہوئے تھے اور انھوں نے کس نسخے کو اصل قرار دیا تھا، نیز اس کی تحقیق میں کن طریقوں کو اپنایا تھا۔

اندازاً مولانا کو جتنے بھی نسخے ملے سب ناقص تھے، سوائے ''مراد ملا'' آستانہ کے نسخے کے کہ وہ کامل تھا، البتہ اس کی بھی جلد اول اور جلد پنجم کے شروع میں کچھ نقص تھا (۱۱)، مصنف کے شروع میں مکتبۂ اسلامی دمشق اور مراد ملا آستانہ کے جن دو مخطوطوں کے عکس دیے گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے ان دونوں نسخوں سے ایڈیٹنگ میں خاص طور سے مدد لی ہے، ان کے علاوہ حیدرآباد کا بھی نسخہ ان کے پیش نظر تھا اور تحقیق کے دوران ڈاکٹر حمید اللہ کے والد کا نسخہ بھی ملا جس سے مولانا نے استفادہ کیا۔

مولانا الاعظمی نے مصنف عبدالرزاق کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل خدمات انجام دیں:

۱- مخطوطات میں جو اغلاط تھے، خواہ وہ غلطی راوی کے نام میں ہو یا حدیث کے الفاظ میں، ان سب کی حوالوں سے تصحیح کی۔

۲- مشکل الفاظ کی تشریح و توضیح کی۔

۳- اختلاف نسخ کو بیان کر کے کسی ایک کو مرجح قرار دیا۔

۴- احادیث کی تخریج کی اور ان مجموعہ ہائے حدیث اور متداول کتابوں کے حوالے دیے جن میں حدیثیں موجود ہیں، حدیث کی سند پر نقد و جرح کر کے اس کا درجہ متعین فرمایا۔

۵- حدیث کے کسی شارح و محشی سے کوئی چوک ہوگئی ہے تو اس پر تنبیہ فرمائی اور مصنف میں اس کی تصحیح کی۔

۶- مصنف ابن ابی شیبہ کا جو قلمی یا مطبوعہ نسخہ مولانا کے پاس تھا، وہ مکمل اس میں لے لیا گیا ہے۔ (۱۲)

۷- مسند حمیدی کی تحقیق میں مولانا نے کتب اصلیہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے، لیکن مصنف عبدالرزاق میں کتب شبہ الاصلیہ اور کتب غیر اصلیہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ (۱۳)

مولانا الاعظمی کی مسلسل دس برسوں کی جاں فشانی اور جاں سوزی کے بعد ''مصنف

عبدالرزاق'' پایۂ تکمیل تک پہنچی، بیروت سے مصنف کے پہلے ایڈیشن کی عمدہ طباعت بھی مولانا کی ہی رہین منت ہے، انھوں نے اس کی طباعت اپنی نگرانی میں کرائی، ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء (۱۳۹۰ھ سے ۱۳۹۲ھ) کے دوران یہ کتاب گیارہ جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

جامع عبدالرزاق یا جامع معمر؟

کتاب الجامع مصنف کی حدیث نمبر ۱۹۴۱۹ جلد دس سے شروع ہوتی ہے اور حدیث نمبر ۲۱۰۳۳ جلد گیارہ پر ختم ہوتی ہے، ''مصنف'' کے اس حصہ کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ یہ (جامع) عبدالرزاق کی تصنیف ہے یا ان کے استاذ معمر بن راشد کی؟ اس مسئلہ کو سب سے پہلے زیر بحث لانے والے مشہور محقق جناب ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم ہیں، مولانا الاعظمی کی تحقیق ہے کہ کتاب الجامع عبدالرزاق کی تصنیف ہے معمر بن راشد کی نہیں، ڈاکٹر حمید اللہ مولانا الاعظمی کی تحقیق پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مصنف عبدالرزاق کی آخری دو جلدوں میں جامع معمر بن راشد چھپی ہے اور اس کے آڈیٹر مولانا اعظمی کو انتباہ نہ ہوا کہ یہ ایک الگ کتاب ہے مصنف عبدالرزاق نہیں، بلکہ عبدالرزاق کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے''۔ (۱۴)

مولانا الاعظمی نے ڈاکٹر حمید اللہ کے اس نقد پر مختصر مگر تیز جوابی مضمون تحریر فرمایا، لکھتے ہیں کہ:

''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کسی خام مسلم مستشرق کی باتوں میں آگئے........

مصنف عبدالرزاق کی آخری کتاب، کتاب الجامع کو جامع معمر قرار دینے والوں نے اس کی اکثر حدیثوں کو بہ روایت معمر پا کر اپنے استشراق کے زور سے اس کو جامع معمر یقین کرلیا، وہ اور کچھ نہیں پوری کتاب الجامع کو حرفاً حرفاً پڑھ لیتے تو یہ دعویٰ کرتے ہوئے ان کو خود شرم محسوس ہوتی''۔ (۱۵)

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں مندرجہ ذیل شواہد پیش کیے:

۱- کتاب الاوائل میں شیخ محمد بن سعید بن سنبل مکی نے مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث ''**كان شعر رسول الله صلى الله عليه وسلم الى انصاف أذنيه**'' نقل فرمایا اور اس کے

بعد تحریر فرمایا ''و آخر مصنفه''، یعنی یہ حدیث مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جامع جو مصنف میں ہے جامع عبدالرزاق ہی ہے۔

۲- شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ بستان المحدثین میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ایک دل چسپ بات ہے کہ امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف شمائل پر ختم کی اور شمائل کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کے ذکر پر ختم فرمایا، یعنی شاہ صاحب بھی اسی کے قائل ہیں کہ یہ مصنف کا آخری حصہ ہے۔

۳- داخلی شہادت کے طور پر مولانا نے جلد دس سے سات اور گیارہ سے اٹھائیس حدیثوں کی نشان دہی فرمائی، جن کا کوئی تعلق معمر سے نہیں ہے بلکہ ان کو عبدالرزاق نے دوسرے شیوخ سے روایت کیا ہے۔

۴- صاحب کشف الظنون نے امام عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر کیا ہے اور فؤاد سید نیز شیخ البانی نے لکھا ہے کہ الجامع لعبدالرزاق کا ایک نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے، اس نسخہ پر ۵۵۸ھ کا ایک سماع بھی درج ہے۔(۱۶)

مولانا الاعظمی نے دلیل کے طور پر سب سے پہلے شیخ محمد سعید بن سنبل کی تحریر پیش کی اور لکھا:

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ محمد اسحاق کے شیخ الشیخ کو بھی انتباہ نہیں ہوا''۔

دوسری دلیل میں شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر پیش کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں:

''لیجیے شیخ المشائخ کو بھی انتباہ نہیں ہوا''۔

مندرجہ بالا شواہد کی حیثیت تائیدی تو ہوسکتی ہے، داخلی شہادات اور مخطوطات سے براہ راست پیش کیے جانے والے دلائل کی نہیں ہے اور جہاں تک انتباہات کی بات ہے تو بہت سے متقدمین علما کی رائے سے متاخرین نے دلائل کی بنیاد پر اختلاف کیا اور ان پر نقد کیا، عین ممکن ہے کہ پہلے کے محقق کی رسائی وہاں تک نہ ہو، جہاں تک بعد کے محقق کی ہے، جیسا کہ خود مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نے حضرت شاہ عبدالعزیز کی اس بات کو حقیقت سے دور بتایا کہ مسند حمیدی کی پہلی حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مولانا مسند حمیدی کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ شاہ صاحب کو مسند حمیدی کا نسخہ نہ ملا ہو اور انھوں نے کسی مصنف سے نقل کیا ہو اور اسی پر اعتماد کر بیٹھے ہوں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مسند حمیدی کی پہلی حدیث حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے(۱۷)، بالکل

یہی احتمال یہاں بھی ہوسکتا ہے کیوں کہ یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ عبدالرزاق کی جامع ہے معمر کی نہیں، یہ بھی امکان ہے کہ مصنف میں پائے جانے کی وجہ سے اس کو مصنف کا ہی جزء سمجھ لیا ہو، البتہ وہ حدیثیں جن کی مولانا نے نشان دہی فرمائی ہے اپنی جگہ ایک مضبوط دلیل ہے۔

مخطوطات کی غواصی کرنے والے اور تحقیق کے غوامض ورموز سے واقف وباخبر ڈاکٹر حمید اللہ کو مولانا الاعظمی کے ان جوابات نے مطمئن نہیں کیا، ڈاکٹر صاحب نے مفصل ایک جوابی مضمون تحریر فرمایا جو ماہنامہ ''الرشاد'' (جون، جولائی ۱۹۸۳ء) میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے مولانا الاعظمی کے ہر جواب کا دلائل سے رد کیا اور بالآخران کا اصرار اسی پر رہا کہ جامع ''مصنف'' کا جزء نہیں بلکہ جامع معمر ہے۔

جو وجوہ واسباب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے تحریر فرمائے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- ترکی میں ڈاکٹر صاحب کو جامع معمر بن راشد کے دو مخطوطے ملے، جن پر نام بھی صرف جامع معمر کا تھا اور جن کے مندرجات بھی ایک چھوٹی کتاب کے تھے، ایک ۳۶۴ھ کا تحریر کردہ انقرہ میں تھا، دوسرا مماثل نسخہ استانبول میں تھا، ڈاکٹر صاحب نے دونوں مخطوطوں کے مندرجات کا مقابلہ مصنف عبدالرزاق کے باب کتاب الجامع سے کیا تو انھیں ہو بہو ایک ہی چیز پایا۔

۲- ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے بہ قول مصنف عبدالرزاق کے جو متداول نسخے دنیا کے مختلف ملکوں میں ملتے ہیں ان میں ''کتاب الجامع'' کتاب کے آخر میں ہے، اگر ایسا ہی نسخہ شیخ سعید بن سنبل یا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی نظر سے گزرا ہو اور انھوں نے کچھ لکھا ہو اور کچھ خیال آرائی کی ہو تو قصور ان کا نہیں، بے خیالی میں ہر کسی سے ایسا ممکن ہے، اگر کسی نے انھیں توجہ دلائی ہوتی اور اس کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہتے تو وہ اہم چیز ہوتی۔

۳- اگر جامع معمر میں جو مصنف عبدالرزاق کا ضمیمہ بن گئی ہے چند ایسی حدیثیں ہیں جو عبدالرزاق نے معمر سے نہیں بلکہ کسی اور شیخ سے روایت کی ہوں تو اس سے بھی ڈاکٹر صاحب کے مطابق کچھ ثابت نہیں ہوتا، مصنف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے (۹،۲/۱ ویں جلدیں) ان میں کثرت سے حدیثیں ''عبدالرزاق عن معمر'' ملتی ہیں، اس سے وہ جامع معمر کا جزء نہیں بن جاتیں، ایسا بارہا ہوتا ہے کہ کتاب راوی کی طرف منسوب کر دی جائے، ابن حبیب کی ایک کتاب ان کے شاگرد اور راوی سکّری کی طرف منسوب ہوگئی ہے۔

۴-دمشق کے مخطوطے کو مصر کے فؤادسید نے عبدالرزاق کا قرار دیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی وجہ یہ بتائی کی فؤادسید انقرہ اور استنابول کے مخطوطوں سے واقف نہ تھے، ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ترکی کے مسٹر گبن جامع معمر کو اشاعت کے لیے تیار کرنے کے بعد دمشق اور رباط گئے، ان دونوں جگہوں کے مخطوطوں کو بھی دیکھا، مسٹر گبن اپنی جرمن کتاب تاریخ تالیفات عربی میں لکھتے ہیں کہ جامع کے راوی عبدالرزاق ہیں اور انھوں نے اسے اپنی مصنف کا ذیل بنایا ہے اور اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور یہ کہ اصابہ ابن حجر جلد۴ ص ۳۱۱، ص ۳۰۶ میں بھی جامع معمر کے اقتباسات ہیں۔

۵-ڈاکٹر حمیداللہ صاحب لکھتے ہیں کہ معمر بہت قدیم مؤلف ہیں، ان کے استاد ہمام بن منبہ کے وقت حدیث کے مجموعوں میں کوئی تبویب نہیں ہوتی تھی، معمر گویا تبویب کا آغاز کرتے ہیں، پھر ان کے شاگرد تبویب کو مزید ترقی دیتے ہیں اور فقہی ابواب پر حدیثیں مرتب کرتے ہیں اور ان کتابوں کے تحت وہ ذیلی ابواب دیتے جاتے ہیں، یہ چیزیں صرف مصنف میں ملتی ہیں، کتاب الجامع میں نہیں ملتیں، اس کا نہج بالکل علاحدہ ہے اور تبویب نسبتاً ابتدائی حالت میں ہے، مصنف میں کتاب الاشربہ اور کتاب البیوع کی حدیثیں دوبارہ الگ مقام پر (یعنی جامع معمر میں) نہ ہوتیں، اگر دونوں ایک ہی کتاب کے اجزاء ہوتے تو دو جگہ ذکر کی ضرورت نہیں تھی، یہی حال مصنف میں حضرت عمرؓ کی وصیت کا ہے جو مصنف میں بھی ہے اور جامعمر میں بھی ہے اور دیگر تفصیلوں پر مشتمل ہے۔ (۱۸)

مولانا الاعظمی نے مصنف عبدالرزاق کے ایک ایک حرف پر بڑی بالغ نظری سے تحقیق کی تھی، انھوں نے ڈاکٹر حمیداللہ کے جوابی مضمون پر ایک مفصل جواب تحریر فرمایا جو عربی مجلّہ ''البعث الاسلامی'' میں شائع ہوا، انھوں نے اس مضمون میں مخطوطات پر بحث کی اور مخطوطات کے ناقلین کے اندراجات پیش کر کے بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ یہ مصنف کا ہی جزء ہے، معمر بن راشد کی جامع نہیں، مولانا کی اس محققانہ بحث کی ہم یہاں تلخیص پیش کرتے ہیں:

مولانا الاعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ احمد بن منصور رمادی نے امام عبدالرزاق سے مصنَّف کے اس حصہ (جامع) کی سماعت الگ سے کی ہے، یہ طریقہ اجازت حدیث لینے دینے کے لیے متداول اور رائج رہا ہے، رمادی کی روایت کردہ جامع کے جزء اول کا ایک نسخہ اور ایک دوسرے نسخہ کے

جزءاول کا کچھ حصہ میری نظر سے گزرا ہے، جس نسخہ میں جزءاول کا پورا حصہ ہے وہ دوسرے نسخہ سے قدیم ہے اور حافظ ابوالفتح نصر بن ابوالفرج حصری متوفی ۶۱۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مولانا نے مخطوطات میں درج سماعات یا روات کے جن اندراجات کا ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل میں نہ جا کر اختصار کے ساتھ ان کے پیش کردہ دلائل نقل کیے جاتے ہیں:

۱- حافظ نصر بن ابوالفرج کے مخطوطہ کے سرورق پر یہ عبارت رقم ہے: ''**الجزء الاول من كتاب الجامع عن عبدالرزاق بن همام أبي بكر الصنعاني**''۔ اس نسخہ میں سماع کی تفصیل بھی درج ہے جس سے اس مخطوطہ کی صحت وثقاہت کے بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

۲- حافظ نصر اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ جامع عبدالرزاق کے جزءاول کو اس نسخہ سے نقل کیا ہے جس میں حافظ ابوالمحاسن القرشی کی تحریر میں یہ صراحت ہے: ''جامع عبدالرزاق کے اس جزء کی ایک جماعت نے شیخ حسین بن طلحہ سے سماعت کی ہے، ان سماعت کرنے والوں میں ...... قرأت وسماع کا یہ واقعہ ۴۹۲ھ کا ہے''۔

امام نصر بن ابوالفرج نے ابن اخضر کی تحریر سے نقل کیا کہ: ''جامع عبدالرزاق کے جزءاول کی سماعت ابن طلحہ سے ۴۹۰ھ میں ایک جماعت نے کی جن میں قابل ذکر مشہور کاتبہ شہدہ بنت ابی نصر ہیں''۔

۳- حافظ عمر بن حاجب متوفی ۶۳۰ھ کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ جامع عبدالرزاق کا جزءاول ہے، انھوں نے نصر کا تحریر کردہ نسخہ حاصل کیا اور اس کے سرورق پر تحریر فرمایا کہ انھوں نے حافظ تقی الدین بن انماطی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر کردہ نسخہ دیکھا ہے، نصر کے نسخہ پر انماطی کے نسخہ کا ایک اقتباس بھی نقل کیا کہ جامع عبدالرزاق کے جزءاول اور آخری جزء کو حب مال کے باب تک جمادی الاولیٰ ۵۷۱ھ میں فلاں فلاں نے عبدالرزاق سے روایت کیا ہے، انماطی نے اپنی تحریر میں ابوالمواہب صصری کی تحریر کا حوالہ دیا ہے۔

۴- مولانا الاعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ ابولمواہب صصری، حافظ تقی الدین انماطی، علامہ علی ابن ہبۃ اللہ مصری اور ان کے والد ابوالفضائل ہبۃ اللہ سب ہی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جزء جامع عبدالرزاق کا جزءاول ہے، جامع معمر کا نہیں۔

۵-نصر کے نسخہ کے اخیر میں حافظ عبدالغنی مقدسی متوفی ۶۰۰ ھ کی ایک سماعت درج ہے کہ امام عبدالرزاق کی جامع کے اس جزء اول کی سماعت شیخہ عالمہ شہدہ سے فلاں فلاں راویوں نے کی ہے۔امام عبدالقادر رہاوی نے بھی اس جزء کی شیخہ شہدہ سے ۵۶۶ ھ میں سماعت کی ہے اور اس جزء کو عبدالرزاق کی جامع جزء اول قرار دینے پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

نصر کا نسخہ حافظ احمد بن محمود جوہری تک پہنچتا ہے، انھوں نے اس نسخہ کو ۶۲۴ ھ میں ابن الجمیزی سے پڑھا،ابن جوہری اپنی سماعت کے بارے میں رقم طراز ہیں:''**قرأت هذا الجزء الأول من جامع عبدالرزق .... على الشيخ الفقيه المعروف بابن الجميزى**''۔

ابن جوہری نے جامع کا دوسرا،تیسرا اور چوتھا حصہ بھی حاصل کیا اور ان کونقل کر کے جزء اول کے ساتھ ملحق کردیا اور ان چاروں اجزاء کو مسندۃ الشام کریمہ بنت عبدالوہاب سے پڑھ کر اجازت حاصل کی،ابن جوہری نصر بن ابوالفرج کے نسخہ کے آخری صفحہ پر اس مکمل جامع کی سماعت کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں کہ:

''**قرأت جميع هذا الجزء الأول وما بعده من الأجزاء الأربعة وهو جميع كتاب الجامع لعبدالرزاق بن همام على الحرة الأصيلة أم الفضل كريمة ابنة عبدالوهاب**''۔

(میں نے اس جزء اول اور بعد والے اجزاء یعنی چاروں اجزاء جو عبدالرزاق بن ہمام کی مکمل کتاب الجامع ہے، کی کریمہ بنت عبدالوہاب کے سامنے قرأت کی۔)

یہ پوری بحث تو ایک نسخہ کی ہوئی،مولانا الاعظمی کی نظر سے جو دوسرا نسخہ گزرا تھا اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تقی الدین قلقشندی کا نسخہ ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ ان ہی کا مکتوبہ ہے،اس مخطوطہ کے بھی پہلے ورق پر یہ عبارت رقم ہے:''**الجزء الأول من كتاب الجامع تاليف الامام عبدالرزاق بن همام الصنعانى**'' اس مخطوطہ پر بھی سند درج ہے۔(۱۹)

مولانا نے البعث الاسلامی کے اسی شمارہ میں ذاتی نسخہ میں ضمیمہ کے طور پر ایک اور دلیل پیش کی جس کو المآثر نے شائع کیا ہے، لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر بھی کتاب الجامع کو جامع عبدالرزاق

ہی مانتے ہیں، امام بخاری نے **افشاء السلام من الاسلام** کے باب میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے ایک موقوف حدیث نقل فرمائی ہے، اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''معمر نے بھی اس کو اپنی جامع میں موقوف ہی روایت کیا ہے، عبدالرزاق نے اس کو معمر سے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے''، جب اس حدیث کی تلاش ہوئی تو مصنف عبدالرزاق کے آخری حصہ میں ملی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حجر بھی اسی کے قائل ہیں کہ اتنا حصہ جامع عبدالرزاق کا ہے جامع معمر بن راشد کا نہیں۔(۲۰)

مولانا کی بحث ان کی دقت نظری اور وسعت مطالعہ کا ثبوت ہے، جو مضبوط تحقیقی شواہد پر مشتمل ہے، انھوں نے اپنے موقف کے اثبات کے لیے دلائل کے انبار لگا دیے، غالباً ڈاکٹر صاحب کا کوئی مضمون اس کے جواب میں نہیں آیا، یا تو مولانا الاعظمی کے ان دلائل نے ان کو مطمئن کر دیا ہو، یا وہ بحث کو طول نہ دینے کے خیال سے خاموش ہو گئے ہوں۔ مولانا الاعظمی کو ڈاکٹر حمید اللہ کے جواب کا انتظار تھا، جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک گرامی نامہ مورخہ ۲۲ / ربیع الاول ۱۴۰۶ھ میں پروفیسر عبدالرحمٰن مومن ممبئی کو لکھا تھا۔(۲۱)

....

مصنف ابھی زیر طبع ہی تھی کہ مولانا الاعظمی کی ملاقات شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حرم شریف میں ہوئی، حضرت شیخ مولانا سے لپٹ کر رونے لگے اور فرمایا کہ آپ نے بہت بڑا کام انجام دیا اور اسلاف کا قرض اتار دیا(۲۲)۔

مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے سلسلہ میں مولانا الاعظمی جب بیروت میں قیام پذیر تھے تو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے انھیں یہ مکتوب تحریر فرمایا:

''شاہ ولی اللہ ثانی کی یہ خدمت حدیث عند اللہ ماجور، عند الناس مشکور ہوگی''۔(۲۳)

تعلیقات:

آخر میں مولانا الاعظمی کی تعلیقات وحواشی کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں:

۱- ج:۱ص۱۹۷ح۷۶۴- **عبدالرزاق عن معمر عن أيوب عن يزيد بن سفيان** ......الخ

مولانا الاعظمی نے ''سفیان'' پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے کہ اصل نسخہ میں ''**یزید بن سفیان**'' کے بجائے ''**یزید بن فلان** ''رقم تھا اور مصنف ابن ابی شیبہ ا:۱۲۲ میں عبدالوارث کے طریق سے ''**عن ایوب عن یزید بن سفیان** '' ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ اگر کاتبوں نے کوئی تصرف نہ کیا ہو تو میرے خیال میں ''**یزید بن سفیان** '' ابوالمہزم بصری ہیں، جن کا ذکر ابن ابی حاتم وغیرہ نے کیا ہے، ورنہ تو میرے نزدیک صحیح ''**یزید ابو العلاء** '' ہے اور وہ یزید بن عبداللہ بن الشخیر مطرف کے بھائی ہیں، جن کی کنیت ''ابوالعلاءٗ'' ہے، مطرف سے روایت کرتے ہیں، تہذیب میں ان کا تذکرہ ہے۔

۲- ج:۲ص۲۸۷-**عبدالرزاق عن معمر عن الزهری عن ابن المسیب عن ابی هریرة ....** الخ۔

مولانا اس حدیث کی تخریج فرماتے ہیں کہ اس کو مسلم نے ابن عیینہ کے طریق سے **عن الزهری عن سعید** اور ابراہیم بن سعد کے طریق سے **عن الزهری عن سعید و ابی سلمی** (ا:۲۲۰) اور بخاری نے ابن ابی ذئب کے طریق سے **عن الزهری عن سعید و ابی سلمه** روایت کیا ہے۔ (الفتح ۲:۹۷)

۳- ج:۴ص۲۲۳ح ۷۵۸۱ میں ایک لفظ ''**عطاش** '' آیا ہے، اس لفظ کی تشریح مولانا ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''**داءٌ یصیب الانسان فیشرب الماء فلا یروی**'' یعنی عطاش ایک ایسا مرض ہے جو اگر کسی کو لگ جائے تو پانی پیتا رہے گا لیکن اسے سیرابی نہیں ہوتی اور پیاس نہیں بجھتی۔

مراجع و مآخذ

(۱) لامع الدراری ا:۴۳-۴۴ شیخ محمد زکریا کاندھلوی، الجمعیۃ پریس دہلی ۱۳۷۹ھ (۲) اصول التخریج و دراسۃ الاسانید، ص۱۳۴، ڈاکٹر محمود طحان، دارالقرآن بیروت ۱۹۸۱ء، طبع سوم (۳) ایضاً (۴) التاریخ الکبیر، ق:۲ ج ۳: ۱۳۰، امام بخاری، مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۵۹ء، طبع اول (۵) تہذیب التہذیب، ۶: ۲۷۵، ابن حجر عسقلانی، تحقیق مصطفیٰ عبدالقادر عطی، دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان ۱۹۹۴ء، طبع اول۔ (۶) الاعلام، ۳: ۳۵۳، خیرالدین زرکلی، دارالعلم للملایین بیروت لبنان۔ (۷) تہذیب الکمال بحوالہ سیر اعلام النبلاء، ۹: ۵۷۴۔ (۸) حجۃ اللہ البالغہ، ا: ۳۸۹، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، دار احیاء العلوم بیروت ۱۹۹۲، طبع دوم (۹) مصنف

عبدالرزاق، مقدمہ الناشر، عبدالرزاق بن ہمام، تحقیق مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مجلس علمی ڈابھیل ۱۹۷۲ء۔ (۱۰) شیخ نذیر حسین، مدیر اردو انسائکلو پیڈیا آف اسلام کے نام ۵/فروری ۱۹۷۹ء کے ایک مکتوب میں مولانا نے مقدمہ نہ لکھ سکنے کے اسباب تحریر فرمائے ہیں کہ: ''مصنف عبدالرزاق کے مقدمہ کا بہت کثرت سے اور نہایت شدید تقاضا ہے، لیکن کچھ تو میری طبیعت ٹوٹ گئی، کچھ دوسرے اہم ہی کاموں میں انہماک، پھر برسوں تک شدید ترین علالت کا سلسلہ، ان اسباب کی بناپر اب تک کچھ نہ لکھ سکا، حافظہ میں مواد فراہم ہے، ان کو اوراق پر منتقل کرنے کی نوبت نہیں آرہی ہے'' (المآثر، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء) (۱۱) مصنف عبدالرزاق.....تنبیہ۔ (۱۲) معلم الامۃ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ، ص ۲۱۶، ڈاکٹر حنیفہ رضی، ندوۃ المصنفین دہلی۔ (۱۳) المآثر، نومبر تا جنوری ۹۷-۱۹۹۸ء، ص ۳۵۔ (۱۴) الرشاد، جلد ۳ شمارہ ۲۷، ص ۵۷۔ (۱۵) الرشاد، مئی ۱۹۸۳ء، ص ۴۵-۴۶، الفرقان، جون، جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۴۷-۵۷۔ (۱۶) ایضاً۔ (۱۷) مسند حمیدی ۱: ۲۱-۲۲، ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی، تحقیق مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مجلس علمی ۱۹۶۳ء۔ (۱۸) الرشاد، جون جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۵-۲۷۔ (۱۹) البعث الاسلامی، عدد ۱۰، جلد ۲۹، ص ۶۶ تا ۷۵۔ (۲۰) المآثر، ج ۱۲، شمارہ ۳، ص ۸۲۔ (۲۱) دارالعلوم، مئی ۱۹۹۵ء، ص ۲۹۔ (۲۲) ترجمان الاسلام، ۱۱، ۱۲، ص ۲۰۳۔ (۲۳) حیات ابوالمآثر، ص ۵۶۵، ایڈیشن ۲۰۰۰ء، مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مئو۔

❖❖❖❖❖❖

صفحہ ۴۲۹ کا بقیہ

اس کے باوجود ڈاکٹر الیاس اعظمی صاحب کا یہ فرمانا ''اب بھی یہ موضوع بحث وتحقیق کا متقاضی ہے کہ مصنّف عبدالرزاق کا وہ حصہ جسے ڈاکٹر صاحب نے جامع معمر قرار دیا ہے اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟'' موجب حیرت ہے۔

میں نے یہ سطریں اس لیے سپرد قلم کی ہیں کہ ڈاکٹر الیاس اعظمی نے لکھا تھا کہ:

''ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے جو سوالات اٹھائے تھے، مولانا الاعظمی نے براہ راست اس کا جواب نہیں دیا''۔

امید ہے کہ احقر کے جواب سے ڈاکٹر الیاس صاحب کو تشفی ہوگئی ہوگی۔

جامع معمر یا جامع عبدالرزاق

از: مسعود احمد الاعظمی ☆

معارف ستمبر ۲۰۰۶ء میں ڈاکٹر محمد صہیب صاحب کا مضمون ''مولانا الاعظمی کی تحقیق مصنف عبدالرزاق'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، یہ مضمون محنت سے لکھا گیا ہے اور اس میں امام عبدالرزاق اور ان کی مصنف کے مختصر تعارف کے بعد ''جامع عبدالرزاق یا جامع معمر؟'' کی ایک ذیلی سرخی قائم کی گئی ہے، اس میں تقریباً سات صفحات میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اور محقق فاضل ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہما اللہ کی تحریروں کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

اکتوبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں ''معارف کی ڈاک'' کے کالم میں صفحہ ۳۰۷-۳۰۸ پر ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا، جس میں انھوں نے ڈاکٹر محمد صہیب صاحب کی بعض باتوں پر نقد ونظر کی زحمت گوارا فرمائی ہے، ڈاکٹر محمد الیاس صاحب کی تنقید کے بعد ڈاکٹر محمد صہیب صاحب کی طرف سے وضاحتی تحریر کا انتظار رہا، لیکن جب چھ مہینے کی مدت گزر جانے کے بعد بھی ان کی طرف سے کوئی تحریر سامنے نہ آسکی تو راقم کو اپنے معروضات پیش کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

اصل قضیہ: یہ ہے کہ جب مصنَّف عبدالرزاق محدث جلیل حضرت مولانا الاعظمی کی تحقیق سے شائع ہوئی، تو اس کے تقریباً دس برس بعد مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے ایک مضمون لکھا کہ المصنف کی آخری جلدوں میں جو کتاب الجامع ہے وہ مصنف عبدالرزاق نہیں بلکہ ان کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے، لیکن مولانا اعظمی کو یہ انتباہ نہیں ہوا کہ یہ ایک الگ کتاب ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی یہ تنقید ماہنامہ ''الرشاد'' اعظم گڈھ میں چھپی تھی، جس کا ایک مختصر اور سرسری سا جواب مولانا اعظمی نے سپرد قلم فرمایا تھا اور وہ الرشاد (مئی ۱۹۸۳ء) اور الفرقان (جون-جولائی ۱۹۸۳ء) میں طبع ہوا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو علامہ اعظمی کا جواب مطمئن نہ کرسکا اور انھوں نے اپنے

☆ مدیر مجلّہ المآثر، (مرقاۃ العلوم) مئو۔

دعوے کی تائید کے لیے الرشاد کے جون-جولائی ۱۹۸۳ء کے شمارے میں ایک اور مضمون شائع کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے اپنے موقف پر اصرار کو دیکھ کر علامہ اعظمی نے ایک نہایت مبسوط اور مفصل مضمون عربی زبان میں حوالۂ قلم فرمایا اور یہ دار العلوم ندوۃ العلما سے شائع ہونے والے مجلّہ البعث الاسلامی میں رجب ۱۴۰۵ھ مطابق مارچ - اپریل ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا، اس میں علامہ اعظمی نے اپنے موقف کی تائید میں نہایت قوی اور پر زور دلائل پیش کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ جس کو ڈاکٹر صاحب جامع معمر کہہ رہے ہیں، وہ جامع معمر نہیں بلکہ جامع عبدالرزاق ہی ہے۔

میں اس وقت مولانا کے ان دلائل وشواہد کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا، ان کو ستمبر کے معارف میں ڈاکٹر محمد صہیب صاحب کے مضمون میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، میرے پیش نظر ڈاکٹر محمد الیاس صاحب کے مراسلے کے کچھ مندرجات کی وضاحت ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''مولانا الاعظمی نے ''البعث الاسلامی'' میں جو جوابی مضمون لکھا تھا، مقالہ نگار نے اس کے ماہ وسال کی تصریح نہیں کی ہے، وہ غالباً ڈاکٹر صاحب مرحوم کی نظر سے نہیں گزرا، اس لیے کہ انھوں نے ایک سال بعد مئی، جون ۱۹۸۴ء کے ''الرشاد'' میں ایک اور مراسلہ لکھا جس میں انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں مزید دلائل فراہم کیے''۔
>
> (معارف، ص ۳۰۷، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

جیسا کہ ابھی اوپر میں عرض کر چکا ہوں کہ البعث الاسلامی میں مولانا الاعظمی کا مضمون مارچ - اپریل ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا، اس لیے ۱۹۸۴ء میں شائع ہونے والے الرشاد کے مراسلے سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی نظر سے نہیں گزرا، نیز ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جیسے باخبر اور وسیع الاطلاع عالم کے بارے میں یہ رائے نہیں قائم کی جاسکتی ہے کہ ایسا مضمون جو ان کے موقف کے رد میں ہو ان کی نظر سے نہ گزرا ہو، یا کم از کم ان کو اس کی اطلاع نہ ہوئی ہو، اس لیے جون ۱۹۸۴ء کے مراسلے کی بنا پر ڈاکٹر محمد الیاس صاحب نے یہ جو نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> ''گویا دونوں محققین نے خیال کیا کہ ان کا موقف قابل پذیرائی رہا، اس سے واضح ہے کہ دونوں اپنے اپنے موقف پر قائم رہے''۔

درست نہیں ہے، بلکہ اس سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے موقف میں لچک پیدا

کرتے ہوئے حضرت مولانا الاعظمی کے موقف کوتسلیم کرلیا، ورنہ جس طرح اپنے موقف کی تائید وتقویت میں اس سے پہلے تین مضمون زیب قرطاس فرما چکے تھے، اسی طرح البعث الاسلامی والے مضمون کا جواب بھی سپرد قلم فرماتے، لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو ڈاکٹر الیاس صاحب یا اور جن حضرات کے قلب میں تردد ہو، ان کو یہ مان لینا چاہیے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے علامہ اعظمی کے موقف کو قبول کرتے ہوئے اس کو جامع عبدالرزاق تسلیم کرلیا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر محمد الیاس صاحب نے لکھا ہے:

''البعث میں مولانا اعظمی نے جو مضمون لکھا تھا وہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا، البتہ فاضل مقالہ نگار نے اس کا جو خلاصہ پیش کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے جو سوالات اٹھائے تھے، مولانا الاعظمی نے براہ راست ان کا جواب نہیں دیا بلکہ اپنے موقف کی تائید میں مزید دلائل فراہم کیے ہیں''۔

ڈاکٹر الیاس صاحب کے ان فقروں کی نسبت میں کئی باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ البعث میں مولانا الاعظمی کے مضمون کو پڑھے بغیر اس اہم بحث میں ان کو کسی طرح کی رائے زنی نہیں کرنی چاہیے تھی، البعث کوئی عنقا قسم کی شئے نہیں ہے جو دستیاب نہ ہو، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں پہنچتا ہے، کچھ نہیں تو دارالمصنفین سے زحمت فرما کر جلد نمبر ۲۹ شمارہ نمبر ۱۰ کی فائل نکال کر ملاحظہ فرما سکتے تھے، جس کا حوالہ صہیب صاحب نے اپنے مضمون میں دیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مولانا الاعظمی نے اگر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے سوالات کا براہ راست جواب نہ دے کر اپنے موقف کی تائید میں مزید دلائل پیش کیے ہیں اور پھر ان دلائل کے بعد جو مارچ - اپریل ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئے ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی مہر خموشی کا ٹوٹنا اور مولانا الاعظمی کے پیش کردہ دلائل کا جواب دینا ثابت نہیں ہے تو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے انکار پر اب کسی کو اصرار کیوں ہے اور یہ کیوں نہیں تسلیم کرلیا جاتا کہ ڈاکٹر صاحب نے متواتر اور پیہم دلائل کے بعد ایک انصاف پسند اور وسیع الظرف محقق کی طرح مولانا الاعظمی کے موقف سے اتفاق کرلیا تھا۔

رہا ڈاکٹر محمد الیاس صاحب کا یہ کہنا کہ مولانا الاعظمی نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے اٹھائے

ہوئے سوالات کا جواب نہیں دیا تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مولانا الاعظمی کو ڈاکٹر صاحب کے موقف سے اتفاق بھی ہوگیا تھا، ان سوالات کا جواب نہ دینے کی متعدد وجہیں ہوسکتی ہیں، ممکن ہے حضرت اعظمی نے ڈاکٹر صاحب کے سوالات کو قابل اعتنا نہ سمجھا ہو یا اپنے دلائل کے بعد ان کا جواب دینے کی چنداں حاجت نہ محسوس کی ہو، یا اس جیسی اور بھی کوئی وجہ ہوسکتی ہے؛ لیکن اگر ڈاکٹر الیاس صاحب کو ان کے جواب ہی پر اصرار ہے تو راقم السطور سے اس کو ملاحظہ فرمالیں:

ذیل میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے سوالات یا اشکالات کو ترتیب سے نقل کرکے ان پر اپنے معروضات پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ڈاکٹر حمید اللہ کے اشکالات ڈاکٹر صہیب صاحب کے خلاصے کے ساتھ ذکر کیے جارہے ہیں:

''ترکی میں ڈاکٹر صاحب کو جامع معمر بن راشد کے دو مخطوطے ملے جن پر نام بھی صرف جامع معمر کا تھا اور جن کے مندرجات بھی ایک چھوٹی کتاب کے تھے، ایک ۳۶۴ھ کا تحریر کردہ انقرہ میں تھا، دوسرا مماثل نسخہ استانبول میں تھا، ڈاکٹر صاحب نے دونوں مخطوطوں کے مندرجات کا مقابلہ مصنّف عبدالرزاق کے باب کتاب الجامع سے کیا، تو انہیں ہو بہ ہو ایک ہی چیز پایا''۔

اس کی نسبت سب سے پہلی گزارش تو یہ کرنی ہے کہ مخطوطات اور قلمی نسخوں میں ایسا ہوتا ہے کہ کتاب کوئی ہوتی ہے اور کاتب یا ناقل نسخہ تسامح کی وجہ سے یا راوی کو دیکھتے ہوئے نام کسی دوسرے مصنف کا لکھ دیتا ہے، چنانچہ ''سنن سعید بن منصور'' کی روداد پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو اس کے نسخے کا سراغ ترکی کے ایک کتب خانے میں لگا تھا، اس کے سرورق پر بجائے ''سنن سعید بن منصور'' کے ''مصنف ابن أبی شیبہ'' لکھا ہوا تھا، پھر تحقیق کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ یہ سنن سعید ہے نہ کہ مصنف ابن ابی شیبہ۔

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے انقرہ اور ترکی کے دو نسخوں کو جو حوالے کے طور پر پیش کیا ہے تو ضروری نہیں کہ دونوں کی اصل دو ہو، بلکہ یہ ممکن ہے کہ استانبول والا نسخہ انقرہ والے نسخے ہی کی نقل ہو، جس کی تائید ڈاکٹر صاحب کے الفاظ ''مماثل نسخہ'' سے بھی ہوتی ہے۔

انقرہ والے نسخے کی نسبت ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے صحیفۂ ہمام بن منبہ کے دیباچے میں

تحریر فرمایا ہے:

''اس کا ایک نسخہ جامعۂ انقرہ کے شعبۂ تاریخ کے کتب خانے میں......... ہے اور ناقص ودریدہ لیکن بہت قدیم ہے، یعنی ۳۶۴ھ میں اندلس (اسپین) کے شہر طلیطلہ (ٹولیڈو) میں لکھا گیا ہے''۔ (۱)

جس نسخے کا وصف قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ ناقص ودریدہ ہونا بھی ہو وہ باوجودیکہ بہت قیمت، اہمیت کا حامل اور نادرۂ روزگار ہوتا ہے؛ لیکن ایسے نسخوں کے تصرفات زمانہ کا شکار ہونے کی گنجائش بھی بہت ہوتی ہے، لہذا اس کی روشنی میں کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جاسکتی ہے، جب کہ اس کے خلاف شواہد وقرائن بھی ہوں۔

دوسرا نسخہ جس پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم ومغفور نے اپنے دعوے کی بنیاد رکھی ہے، وہ استانبول کا مماثل نسخہ ہے، اس کا وصف ڈاکٹر صاحب ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

''دوسرا نسخہ کامل ہے اور استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں (۵۴۱) پر ہے اور ۶۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے''۔ (۲)

اس نسخے کی بابت راقم الحروف اپنے معروضات قدرے تفصیل سے پیش کرنا چاہتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱- اس نسخے کو بروکلمان نے بھی اپنی تاریخ (۱۱/۴) میں ''فیض الله ٥٤١'' کے لفظ سے درج کیا ہے، لیکن اس کے جو عنوان اختیار کیا ہے وہ ''المصنف فی الحدیث'' ہے۔

جب فیض اللہ آفندی ۵۴۱ نمبر ہی نسخے پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تصریح کے مطابق جامع معمر تحریر ہے اور بروکلمان کی تحریر کے مطابق المصنف لکھا ہوا ہے، تو اس صورت میں اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔

۲- میرے پیش نظر علامہ اعظمی کے مخطوطات میں سے چار اوراق پر مشتمل ایک مخطوطے کی زیروکس کاپی ہے، اس میں سرورق پر بالکل اوپر لکھا ہوا ہے: ''**كتاب الجامع لمعمر بن راشد**''۔

اس کے نیچے داہنی طرف ایک مہر ثبت ہے جس پر ''**جامعة أم القرىٰ / مكة المكرمة**''

---

(۱) صحیفہ ہمام بن منبہ، ص ۵۵، مطبوعہ حیدرآباد، ۱۹۵۶ء طبع چہارم۔ (۲) ایضاً۔

کندہ ہے۔

اس کے نیچے درمیان میں یہ عبارت مرقوم ہے: ''**النسخة مصورة من مكتبة فيض الله آفندی، استنبول – تركيا، برقم ٥٤١ من (١٩٢- ١٢١٣)** اور بالکل نیچے ہندسوں میں یہ نمبر ٣١٧٢ ہے۔

۳۱۷۲ نمبر تو بہ ظاہر جامعہ ام القری کا اندراج نمبر معلوم ہوتا ہے، اس پوری تفصیل میں ''**برقم ٥٤١ من (١٩٢- ١٢١٣)**'' کے علاوہ سب زیروکس کی روشنائی ہے، جو فقرہ مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ بعد میں قلم سے لکھا ہوا ہے۔

اس نسخے کی لوح کی پوری عبارت سے اگر چہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامع معمر کا نسخہ ہے جو فیض اللہ آفندی کے اسی نسخے کی فوٹو کاپی ہے جس کا حوالہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے دیا ہے۔

لیکن جب ہم اس نسخے کے آخری الفاظ پر نظر ڈالتے ہیں تو نتیجہ برعکس برآمد ہوتا ہے، اس کے خاتمے کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''**تم كتاب الجامع بحمد الله وعونه وقوته وبتمامه تم جميع كتاب المصنف لأبي بكر عبدالرزاق بن همام بن نافع الصنعاني اليماني والحمد لله رب العالمين بما هو أهله وصلى الله على محمد نبيه وآله وسلم تسليماً في الثالث والعشرين من جمادى الأولى سنة ست وست مائة**''.

دیکھیے اس نسخے کے مطابق کتاب کے سرورق سے اگر چہ اس کا جامع معمر ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی داخل اور اندرونی شہادت اس کے جامع عبدالرزاق ہونے کی مثبت اور مؤید ہے۔

۳- فیض اللہ آفندی کے نسخے میں صرف کتاب الجامع نہیں ہے، بلکہ کچھ اجزاء کتاب العقول کے اور کتاب الایمان والنذور، کتاب الفرائض، کتاب اہل الکتابین، کتاب العقیقۃ، کتاب الاشربۃ اور آخر میں کتاب الجامع ہے۔(۱)

جب یہ تمام ابواب وکتب مصنف عبدالرزاق کے اجزاء ہیں، تو اسی کے ساتھ شامل کتاب الجامع کو الگ کر کے کسی دوسرے مصنف کی کتاب قرار دینے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

---

(۱) تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب حیات ابوالمآثر جلد ثانی کا مطالعہ فرمائیں۔

۴- یہ حال صرف مکتبۂ فیض اللہ آفندی کے نسخے کا نہیں ہے، بلکہ تقریباً یہی کیفیت حیدرآبادی نسخے کی بھی ہے۔ اس میں بھی کتاب العقول کے بعد کتاب الایمان والنذور، کتاب الفرائض، پھر کتاب اہل الکتابین، کتاب العقیقۃ، کتاب الاشربۃ اور آخر میں کتاب الجامع ہے، تو کیا یہاں بھی عدم انتبار کی بنیاد پر جامع معمر مصنف عبدالرزاق کے ساتھ شامل کردی گئی ہے؟

ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں جو دلائل وشواہد پیش کیے ہیں اور ان کے دعوے کے جو وجوہ ہوسکتے ہیں، ان میں یہ سب سے اول ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ صرف یہی ایک دلیل ان کے پاس ہے، باقی جو ہیں وہ سب شواہد اور مؤیدات کے قبیل سے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے انکار کی دوسری وجہ یہ ہے:

> ''مصنف عبدالرزاق کے جو متداول نسخے دنیا کے مختلف ملکوں میں ملتے ہیں، ان میں ''کتاب الجامع'' کتاب کے آخر میں ہے، اگر ایسا ہی نسخہ شیخ سعید بن سنبل یا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی نظر سے گزرا ہو اور انھوں نے کچھ لکھا ہو اور کچھ خیال آرائی کی ہو تو قصور ان کا نہیں، بے خیالی میں ہر کسی سے ایسا ممکن ہے''۔

ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کا یہ بیان واضح نہیں ہے، وہ مصنف عبدالرزاق کے متداول نسخے میں کتاب الجامع کو اس کے آخر میں بتاتے ہیں تو اس سے ان کی مراد جامع معمر ہے یا جامع عبدالرزاق؟ اگر جامع عبدالرزاق مراد لے رہے ہیں تو مسئلہ بالکل صاف ہے کہ مصنّف کے آخر میں جامع عبدالرزاق ہے، جامع معمر نہیں ہے؛ اور اگر یہ مقصد ہے کہ وہ ہے تو جامع معمر لیکن متداول نسخوں کے آخر میں ہونے کی وجہ سے شیخ سعید بن سنبل اور حضرت شاہ عبدالعزیز نے خیال آرائی کرکے اس کی آخری حدیث کو مصنف عبدالرزاق کی حدیث سمجھ لیا تو یہ بات احتیاط کے منافی ہے، جب تک وہ ''کتاب الجامع'' تحقیق سے جامع معمر نہ ثابت ہوجائے، اس وقت تک ان حضرات کے طرز عمل کو خیال آرائی سے تعبیر کرنا خود تخیل پر مبنی ہے، جب ''کتاب الجامع'' مصنف عبدالرزاق کے قلمی نسخوں میں کتاب کے آخر میں پائی جاتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ مصنّف کا جز نہ قرار دے کر جامع معمر کہا جائے؟ حالانکہ اس کو مصنّف کا جز قرار دینا واقع کے مطابق اور جامع معمر کہنا صرف ایک مفروضے پر مبنی ہے۔

مولانا الاعظمی نے اپنے پیش کردہ دلائل میں کتاب الجامع سے تقریباً پینتیس (۳۵) ایسی

حدیثیں پیش کی تھیں جن کا معمر سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان کو عبدالرزاق نے دوسرے شیوخ سے روایت کیا ہے، یہ ایک اہم داخلی شہادت اوراس کے جامع عبدالرزاق ہونے کی بہت قوی دلیل ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس استدلال واستشہاد کا جو جواب دیا ہے، وہ ڈاکٹر صہیب کے الفاظ میں یہ ہے:

''اگر جامع معمر میں جو مصنف عبدالرزاق کا ضمیمہ بن گئی ہے چند ایسی حدیثیں ہیں جو عبدالرزاق نے معمر سے نہیں، بلکہ کسی اور شیخ سے روایت کی ہوں تو اس سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا، مصنف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے.....ان میں کثرت سے حدیثیں ''عبدالرزاق عن معمر'' ملتی ہیں، اس سے وہ جامع معمر کا جز نہیں بن جاتیں، ایسا بارہا ہوتا ہے کہ کتاب راوی کی طرف منسوب کردی جائے، ابن حبیب کی ایک کتاب ان کے شاگرد اور راوی سکری کی طرف منسوب ہوگئی ہے''۔

مولانا الاعظمی نے ۳۵ روایات کو معمر سے بے تعلق بتایا ہے تو وہ بہ ظاہر ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر ہے، راقم نے جب کتاب الجامع کا تتبع کیا تو تقریباً پچاس (۵۰) روایات ایسی ملیں جن کا معمر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں غیر معمر سے روایات ہونے کے باوجود اس کو معمر کی تصنیف بتانا ناقابلِ فہم ہے، اگر اس کو معمر کی تصنیف قرار دیا جائے تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ شاگرد (عبدالرزاق) نے استاذ (معمر) کی کتاب میں تصرف کر کے اس کو اپنی کتاب میں شامل کرلیا ہے، ظاہر سی بات ہے کہ کسی محدث کی یہ کارروائی امانت ودیانت کے خلاف اور محدثین کی روش اوران کی احتیاط کے منافی ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس سے کچھ نہیں ثابت ہوتا، کیوں کہ اتنا تو ضرور ثابت ہوگا کہ عبدالرزاق نے اپنے شیخ کی کتاب میں کچھ تصرف اور الحاق کر کے اپنی تصنیف کے ساتھ شامل کرلیا ہے یا اپنی طرف منسوب کرلیا ہے۔

آگے ڈاکٹر صاحب کی یہ عبارت ہے کہ:

''مصنَّف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے، ان میں کثرت سے حدیثیں ''عبدالرزاق عن معمر'' ملتی ہیں، اس سے وہ جامع معمر کا جزء نہیں بن جاتیں''۔

مولانا الاعظمی کے فرمانے کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ اگر مصنَّف کے آخر میں طبع شدہ

کتاب الجامع، جامع معمر ہوتی تو معمر کے سوا ان کے دوسرے اساتذہ وشیوخ کی وہ روایتیں کہاں سے آتیں جن میں معمر کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے، اب عبدالرزاق کی وہ روایات جو معمر کے واسطے سے مروی ہیں، وہ جامع معمر کا جزء بن سکتی ہیں یا نہیں، اس کو اس بحث سے کیا تعلق؟

مثال کے طور پر محدثین کی تصنیف کردہ بہت سی کتب حدیث میں بہت سے صاحب تصنیف محدثین کے واسطے آتے ہیں جن کو فضیلت تقدم کے ساتھ شرف تصنیف وتالیف بھی حاصل ہے، مثلاً مسلم اور ابن ماجہ کی کتابوں میں ابن ابی شیبہ کی بہ کثرت روایات ہیں، اسی طرح اور بعد کے مصنفین کی کتابوں میں ابوداؤد طیالسی، مسدد بن مسرہد، اسحاق بن راہویہ وغیرہ کے بہت سے واسطے ملتے ہیں یا معمر ہی کو لے لیجیے کہ ان کی روایت سے شاید ہی حدیث کی کوئی کتاب خالی ہو تو کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ ان مصنفین کی وہ روایات جو بعد کے مرتبین حدیث نے اپنی کتابوں میں ان کے واسطے سے ذکر کی ہیں، ان متقدم مصنفین کی کتابوں میں بھی ضرور ہونی چاہئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فن کا شناسا کوئی بھی شخص یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرسکتا، لہٰذا اس امر کو الزامی جواب کے طور پر کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے؟

رہا ابن حبیب کی کتاب کا ان کے کسی شاگرد کی طرف منسوب ہوجانا تو یہ کسی دوسری کتاب کے خلاف دلیل اور حجت نہیں ہوسکتا، کیوں کہ جب پوری کتاب عبدالرزاق کی تسلیم کی جاچکی ہے تو اس کا ایک جزء جو مصنف ہی کے ساتھ شامل ہے اور اس کو روایت کرنے والے عبدالرزاق کے وہی شاگرد اور شاگرد کے شاگرد (الی آخر الراوی) ہیں، تو اس کو مصنَّف سے الگ کرنے اور اس کا جز نہ ماننے کا محرک آخر کیا ہوسکتا ہے؟

مسئلہ مبحوث عنہا میں تو یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مصنَّف تمام تر عبدالرزاق کی ہے، اس کے صرف گیارہویں سے کچھ زائد حصے کو ڈاکٹر صاحب ان کے استاذ معمر کی تصنیف قرار دے رہے ہیں، لیکن جب وہ مختلف فیہ حصہ بھی کتاب کے متعدد قلمی نسخوں میں مصنف ہی کے ساتھ شامل ہے اور اس کے تمام رواۃ وہی ہیں جو مصنف کے ہیں اور اس حصے کی کچھ حدیثوں کو محقق علماء نے مصنف عبدالرزاق کی حدیث قرار دیا ہے، تو سکّری کی طرف منسوب کتاب کی نظیر سے اس کا کیا مقابلہ؟

معمر کون تھے؟

امام عبدالرزاق صنعانی محدث معمر بن راشد کے بہت حاضر باش اور عزیز وقریب شاگرد

تھے، عبدالرزاق خود کہتے ہیں کہ: **جالست معمر بن راشد سبع سنین** [۱]، یعنی میں سات سال تک معمر کی مجلس میں شریک رہا۔

اورامام احمد کہتے ہیں کہ: **کان عبدالرزاق یحفظ حدیث معمر** [۲]، عبدالرزاق معمر کی حدیثوں کورٹا کرتے تھے اور خود عبدالرزاق کہتے ہیں: **کتبت عن معمر عشرۃ آلاف حدیث** [۳] یعنی میں نے معمر سے دس ہزار حدیثیں قلم بند کی ہیں۔

جس شاگرد کو اپنے شیخ واستاذ سے یہ کثرت ملازمت، تعلق خاطر اور ان کی حدیثوں کے ضبط وحفظ کا اس قدر اہتمام ہو تو ظاہر ہے کہ ان سے اپنی کتاب میں کثرت سے روایتیں لی ہوں گی اور اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ استاذ وشیخ نے ایک خاص نہج پر کوئی کتاب تصنیف کی ہو تو شاگرد نے اس کو اور وسعت دے کر اسی نہج پر خود بھی تصنیف کی ضرورت محسوس کر کے کتاب لکھی ہو۔

ڈاکٹر صہیب صاحب نے ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب مرحوم کے انکار کی چوتھی وجہ جو بیان کی ہے، وہ یہ ہے:

> ''ترکی کے مسٹر گبن جامع معمر کو اشاعت کے لیے تیار کرنے کے بعد دمشق اور رباط گئے، ان دونوں جگہوں کے مخطوطوں کو بھی دیکھا، مسٹر گبن اپنی جرمن کتاب تاریخ تالیفات عربی میں لکھتے ہیں کہ جامع کے راوی عبدالرزاق ہیں اور انھوں نے اسے اپنی مصنَّف کا ذیل بنایا ہے اور اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور یہ کہ اصابہ ابن حجر جلد ۴، ص ۳۰۶، ۳۱۱ میں بھی جامع معمر کے اقتباسات ہیں''۔

حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نسخۂ انقرہ کے سرورق پر ''جامع معمر'' لکھا ہوا دیکھ کر اس کو معمر کی کتاب قرار دینے پر اس قدر مُصر ہیں، جب کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ممکن ہے کہ کاتب یا نسخہ نویس نے غلطی سے اس پر ''جامع معمر'' لکھ دیا ہو۔ کیا مسٹر گبن نے اس کو جامع معمر سمجھا ہے تو یہ سند اور حجت ہے؟ اور ان سے پہلے متعدد محقق اہل علم اس کو جزو مصنف قرار دے چکے ہیں تو ''یہ خیال آرائی'' یا

(۱) تذکرۃ الحفاظ (۱/۳۶۴)، میزان الاعتدال (۲/۳۴۲)۔
(۲) ایضاً۔
(۳) تذکرۃ الحفاظ (۱/۱۹۰)

''بے خیالی میں ہوئی چوک'' ہے۔

اور اگر بالفرض یہی مان لیا جائے کہ عبدالرزاق نے ''جامع معمر'' کو اپنی مصنف کا ذیل بنالیا ہے اور اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے، تو اس تذئیل واضافہ کے بعد اس کو عبدالرزاق کی کاوش اور ان کی مصنف کا جزء تسلیم کرنے میں آخر کیا پریشانی اور حرج ہے؟ اور اس حصے کو مصنف کے ساتھ شائع کرنے پر عدم انتباہ کا الزام کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ بلکہ اس کو مصنف کے جزء کے طور پر شائع کرنا تو عبدالرزاق کی مرضی ومنشا کے عین مطابق ہے۔

اور اگر اصابہ میں جامع معمر کے اقتباسات کا ہونا اس کے جامع معمر ہونے کی دلیل ہوسکتی ہے تو اس کے جامع عبدالرزاق ہونے کی اس سے قوی دلیل یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے ایک حدیث کے لیے مصنف عبدالرزاق کا حوالہ دیا تو وہ حدیث اسی کتاب الجامع میں ملی جو مصنف عبدالرزاق کے آخر میں ہے۔ علامہ اعظمی نے ''البعث'' والے مضمون میں طباعت کے بعد اپنے نسخے میں ''اضافہ'' کے عنوان کے ماتحت لکھا ہے:

"ومما يدل دلالة واضحة أن كتاب الجامع جزء من مصنف عبدالرزاق أن الحافظ قال في موقوف عمار الذى علقه البخارى فى باب افشاء السلام من الإيمان: "أن معمراً رواه فى جامعه (يعنى موقوفاً) وكذا رواه عبدالرزاق فى مصنفه عن معمر انتهى" وقد فتشنا عن هذا الموقوف فى مصنف عبدالرزاق فلم نجده إلا فى كتاب الجامع الذى هو آخر كتب المصنف لعبدالرزاق انظر المصنف". (۱۰/ ۳۸٦)

یعنی کتاب الجامع کے مصنف عبدالرزاق کا جزء ہونے کی ایک روشن دلیل یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی اُس موقوف روایت کے بارے میں جس کو بخاری نے **باب افشاء السلام من الإيمان** میں تعلیقاً ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ اس کو معمر نے اپنی جامع میں اور اسی طرح عبدالرزاق نے بہ واسطۂ معمر اپنی مصنف میں روایت کیا ہے، مولانا الاعظمی فرماتے ہیں کہ ہم نے جب اس موقوف روایت کی جستجو مصنف عبدالرزاق میں کی تو وہ ہم کو صرف اس کتاب الجامع میں ملی جو مصنف عبدالرزاق کی آخری کتاب ہے۔ دیکھیے مصنف، جلد ۱۰، ص ۳۸٦۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے انکار کی پانچویں وجہ ڈاکٹر محمد صہیب صاحب نے درج ذیل

الفاظ میں بیان کی ہے:

''معمر بہت قدیم مولف ہیں، ان کے استاذ ہمام بن منبہ کے زمانے میں حدیث کے مجموعوں میں کوئی تبویب نہیں ہوتی تھی، معمر گویا تبویب کا آغاز کرتے ہیں، پھران کے شاگرد تبویب کومزید ترقی دیتے ہیں اور فقہی ابواب پر حدیثیں مرتب کرتے ہیں اوران کتابوں کے تحت وہ ذیلی ابواب دیتے جاتے ہیں، یہ چیزیں صرف مصنف میں ملتی ہیں، کتاب الجامع میں نہیں ملتیں، اس کا نہج بالکل علاحدہ ہےاورتبویب نسبتاً ابتدائی حالت میں ہے''۔

شاگرد (عبدالرزاق) نے اگرچہ تبویب کومزید ترقی دیتے ہوئے فقہی ابواب پر حدیثیں مرتب کی ہیں، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے جامع کے نام سے کچھ نہیں لکھا ہے، دیکھیے عبدالرزاق کے جامع لکھنے کوعلامہ محمد جعفر کتانی نے **الرسالة المستطرفة** میں ذکر کیا ہےاور لکھا ہے:

وجامع عبدالرزاق سوى المصنف هو كتاب شهير وجامع كبير خرج أكثر أحاديثه الشيخان والأربعة'' [۱] جامع عبدالرزاق ان کی مصنف کےعلاوہ ہے، وہ ایک مشہور کتاب اور بڑی جامع ہے، اس کی اکثر حدیثوں کی صحاح ستہ کے مصنفین نے تخریج کی ہے۔

اسی طرح صاحب کشف الظنون نے بھی امام عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر کیا ہےاور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ رمادی کے روایت کردہ جامع کے دو قلمی نسخے ہیں جن پر روایت اور سماع کرنے والوں کی ایک پوری جماعت کا نام درج ہےاوراس جماعت میں اجلۂ محدثین ہیں اور سب اس کو جامع عبدالرزاق کہتے ہیں اوران دونوں نسخوں کے سرورق پر موٹے قلم سے جامع عبدالرزاق لکھا ہے، ایک نسخے پر ہے:

''الجزء الأول من كتاب الجامع عن عبدالرزاق بن همام أبى بكر الصنعانى'' اوردوسرے نسخے کی عبارت یہ ہے: **''الجزء الأول من كتاب الجامع تاليف الإمام عبدالرزاق بن همام الصنعانى''**۔

اس کے بعد ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کی یہ تحریر:

''مصنَّف میں کتاب الاشربہ اور کتاب البیوع کی حدیثیں دوبارہ الگ مقام پر (یعنی

---

(۱) الرسالة المستطرفة، ص: ۳۱

جامع معمر میں) نہ ہوتیں، اگر دونوں ایک ہی کتاب کے اجزاء ہوتے تو دو جگہ ذکر کی ضرورت نہیں تھی، یہی حال مصنف میں حضرت عمرؓ کی وصیت کا ہے جو مصنف میں بھی ہے اور جامع معمر میں بھی ہے اور دیگر تفصیلوں پر مشتمل ہے''۔

تعجب خیز ہے، کیوں کہ اہل علم سے مخفی نہیں کہ حدیث کی کتابوں میں ایک ہی حدیث متعدد بار مکرر وسہ کرر آتی ہے، صحاح ستہ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں اور اگر آپ مسند امام احمد اٹھا کر دیکھیں تو اس میں ایک ہی حدیث دسیوں مقام پر مذکور ملتی ہے۔

اور اگر مصنف عبدالرزاق ہی کی بات کی جائے تو اس کی کتاب الجامع دسویں جلد صفحہ ۳۷۹ سے شروع ہوتی ہے اور اسی جلد میں اس سے پہلے کتاب **أهل الكتابين** ہے، اس کی بہت ساری حدیثیں چھٹی جلد کی حدیثوں میں آچکی ہیں، حالانکہ اگر آپ مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع دیکھیں تو اس میں اور مصنف میں بہت کم حدیثیں مکرّر ملیں گی۔

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے (اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے) مصنف کی جلد ۹ کے کتاب الاشربہ میں لفظ ''السادس'' کو بہ کثرت دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ یہ حدیثیں کتاب الجامع میں بھر مکرر ہیں، حالانکہ بات یہ نہیں ہے، بات دراصل یہ ہے کہ حضرت مولانا الاعظمی کو مراد ملا کا جو مخطوطہ ملا تھا، وہ صرف پانچ جلدوں (اصل مخطوطے کی پانچ جلدوں) پر مشتمل تھا اور صرف ایک جلد مکتبہ فیض اللہ آفندی کے قلمی نسخے کی تھی، مولانا الاعظمی کی **کتاب الاشربة** کی تعلیقات میں لفظ ''**سادس**'' سے مراد فیض اللہ آفندی کا نسخہ ہے، جس میں صرف کتاب الجامع نہیں بلکہ **کتاب الاشربة** اور بعض دیگر کتب بھی ہیں۔

اور اگر اسی پر اصرار ہو کہ مکرر ہونے کی وجہ سے کتاب دوسری ہوگئی تو اس کا جوب کیا ہوگا کہ خود کتاب الجامع میں بھی بعض حدیثیں مکرر ہیں، مثلاً حدیث نمبر ۲۰۳۵۹ اور ۲۰۳۶۶ مکرر ہے، اسی طرح حدیث نمبر ۲۰۴۴۶ اور ۲۰۴۸۳ مکرر ہے۔

راقم کے خیال میں مصنّف کے اس حصے کے جامع معمر ہونے کی کوئی قطعی اور صریح دلیل نہیں ہے، لیکن اس کے جامع عبدالرزاق ہونے کے متعدد داخلی اور خارجی دلائل وشواہد موجود ہیں جن کو مولانا اعظمی نے پیش کیا ہے۔ بقیہ صفحہ ۴۱۶ پر

محدث جلیل الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی ژرف نگاہی

مولانا عبدالحفیظ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ ☆

بات ۱۹۸۵ء کی ہے، جب میں اپنی کتاب ''بائبل اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم'' مرتب کر رہا تھا، کتاب میں یہود ونصاریٰ کے نظریات ومزعومات کا علمی وتحقیقی جائزہ لیا گیا ہے، اس میں ایک طویل بحث اس موضوع پر بھی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح اللہ ہیں اور زمانۂ شیرخوارگی میں ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل اور حرم محترم حضرت ہاجرہ کو مکہ مکرمہ پہنچا دیا تھا، یہود حضرت اسماعیل کے بجائے حضرت اسحٰق کو ذبیح باور کراتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی ناروا کوشش کرتے ہیں کہ کم از کم سولہ سال کی عمر میں حضرت سارہ کی شکایت پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ ماجدہ کو جلاوطنی کی سزا سنائی اور حق وراثت سے محروم کرتے ہوئے مکہ مکرمہ چلے جانے کا حکم صادر فرمایا۔

''بائبل اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم'' میں یہود کے اس نظریہ کی تردید توریت کے حوالوں سے کرتے ہوئے توریت سے بھی اس کا ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح ہیں، اور زمانۂ شیرخوارگی میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ خود پہنچایا تھا؛ مگر تعجب ہے کہ ذبیح کے مسئلہ میں ہمارے علماء خود دو زمروں میں منقسم ہیں، علماء کا ایک گروہ حضرت اسماعیل کو ذبیح قرار دیتا ہے اور دوسرا گروہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح گردانتا ہے، گو دوسرے زمرے کے علماء کی تعداد بہت کم ہے، اور ہوسکتا ہے کہ اسرائیلی روایات نے ان کو غلط فہمی میں ڈال دیا ہو، یا اسرائیلی روایات نے مسئلہ کو پیچیدہ بنا دیا ہو۔

اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ورودِ مکہ کے سلسلہ میں اسی صدی کے چند علماء نے اختلاف رائے کیا ہے، سرسید احمد خان، علامہ عنایت رسول چریاکوٹی اور علامہ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو سن رشد تک پہنچنے کے بعد مکہ پہنچایا گیا، اور بخاری کی وہ روایت جس

☆ لوہرسن، سدھارتھ نگر

میں چاہ زمزم کی تاریخ بیان کی گئی ہے، غیر مرفوع ہونے کی وجہ سے نا قابل اعتبار ہے۔ علامہ عنایت رسول تحریر فرماتے ہیں کہ:

واضح ہو کہ یہ حدیث مرفوع نہیں ہے یہ قول ابن عباس کا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ان کے وقت کا ماجرا نہیں ہے، کسی سے سن کے کہا ہوگا، لہٰذا بمقابلۂ آیاتِ تورات موثق نہیں ہوسکتا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کمال سنگدلی پر دلالت کرتا ہے، انبیاء کی یہ شان نہیں ہے۔
(بشریٰ ص ۱۶)

طرفہ تماشا یہ کہ سرسید مرحوم تورات کی روایات کو تضاد بیانی کا شکار بتاتے ہوئے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایات کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، سرسید لکھتے ہیں کہ:

اصل یہ ہے کہ خود توریت مقدس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر کی نسبت جب وہ نکالے گئے نہایت اختلاف پایا جاتا ہے بعض درسوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت بچے تھے اور بعض سے پایا جاتا ہے کہ سولہ سترہ برس کے تھے۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۷)

توریت کی آیات میں تضاد کا نمونہ پیدائش باب ۲۱ کی آیات ۸-۹ اور ۱۴ میں دیکھا جا سکتا ہے، اس کے باوجود علامہ سید سلیمان ندوی بھی تورات کے بیانات کو ہی قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

قرآن مجید سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام علیٰحدگی سے پہلے سن تمیز کو پہنچ چکے تھے۔ (ارض القرآن ج ۲ ص ۴۳)

علامہ مرحوم نے اس دعویٰ کے ثبوت میں آیات قرآنیہ سے استدلال کیا ہے، اور بخاری کی روایت جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:

''بخاری کی کتاب الرویا اور کتاب الانبیا میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جو حدیث اسماعیل علیہ السلام کی شیر خوارگی کے متعلق ہے، وہ مرفوع نہیں ہے، یعنی اس کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا۔ (بجز چند خاص ضمنی فقروں کے) اس لیے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اسرائیلیات میں سے ہے اور اس کا ثبوت آج بھی موجود ہے، بخاری میں اس کے متعلق جو طویل حدیث ہے وہ بجز جرہم اور مکہ کے ذکر کے مدراش اور تالمود میں بعینہ حرف بحرف مذکور ہے'' (ارض القرآن ج ۲ ص ۴۴)

علامہ مرحوم اور سرسید نے اس سلسلہ میں جو ثبوت فراہم کیے ہیں، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا سید محمد میاں نے ان کا علمی جائزہ لیا ہے، اور حضرت علامہ نے جو آیات قرآنیہ استدلال میں پیش فرمائی ہیں، ان پر مولانا سیوہاروی نے طویل گفتگو کی ہے، ان دونوں بزرگوں کی علمی تنقید واستدراک نے مجھے ایک حد تک مطمئن تو کر دیا تھا، لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث پر حافظ ابن کثیر کی تنقید جب نظر سے گذری تو ایک بار پھر خلجان پیدا ہوا اور حدیث کے کئی مشہور عالموں سے بالمشافہ گفتگو کی اور خطوط بھی لکھے، لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوا، بالآخر حضرت محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں یہ خط لکھا:

باسمہ تعالیٰ

حضرت محدث جلیل دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج گرامی؟

آنجناب کے عزیز ترین اوقات میں سے تھوڑا سا وقت بخاری شریف کی ایک روایت کا مقام وحیثیت سمجھنے کے لیے درکار ہے، میں نے کئی کتابوں سے استفادہ کیا، لیکن زیر تحقیق روایت کے سلسلہ میں کوئی اطمینان بخش حل نظر نہیں آیا۔

یہ روایت حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بہ زمانۂ شیر خوارگی مکہ مکرمہ پہنچانے سے متعلق ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے شیر خوار بچہ حضرت اسماعیل اور اپنی بیوی حضرت ہاجرہ کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آئے تھے.................. روایت بخاری جلد اول کے صفحہ ۴۷۴، اصح المطابع پر مذکور ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری کی اس روایت پر تیز تنقید کی ہے۔

وكان بعض هذا السياق متلقى من الاسرائيليات ومطرز بشئ من المرفوعات.

(البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۱۵۷)

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ارض القرآن میں اور علامہ عنایت رسول چریا کوٹی نے اپنی کتاب بشریٰ میں اور سرسید احمد خاں نے خطبات احمدیہ میں اس روایت کو نا قابل اعتبار قرار دیا ہے اور اسرائیلی کہا ہے۔

ان حضرات میں حافظ ابن کثیر کی تنقید زیادہ وقیع اور قابل توجہ ہے, لیکن علامہ عینی نے صرف ابن کثیر کی تنقید کا ذکر کیا ہے، روایت پر کلام کرنے سے احتراز کیا ہے حافظ ابن حجر نے بھی روایت پر کوئی بحث نہیں کیہے۔

سید سلیمان ندوی نے روایت کے پایۂ اعتبار سے ساقط ہونے کے متعدد وجوہ بیان کیے ہیں۔

۱-روایت موقوف ہے اور موقع موقع سے ارشادات رسول سے استشہاد کیا گیا ہے۔

۲-روایت میں ''وادی غیر ذی زرع'' میں چھوڑ جانے کے بعد مسلسل خبر گیری مذکور نہیں ہے، صرف دو مرتبہ مکہ میں تشریف آوری کا ذکر ہے، وہ بھی حضرت اسماعیل کے جوان ہونے کے بعد، جب کہ فطرت کا تقاضا تھا کہ خبر گیری کے لیے برابر آمد و رفت جاری رہتی۔

۳-روایت میں جو قرآنی دعا منقول ہے وہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کے بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع............ میں من ذریتی اس کا واضح ثبوت ہے، جب کہ روایت میں ایام رضاعت میں پہنچانا مذکور ہے۔

حضرت والا! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو ناقابل اعتبار قرار دینے سے یہود کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے اور موجودہ توریت کے بیان کی توثیق بھی ------ یہی نہیں بلکہ چاہ زمزم کی تاریخ بھی افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔

از راہ عنایت بخاری کی موقوف روایتوں کی حیثیت اور بالخصوص زیر بحث روایت پر محدثانہ نقطۂ نظر سے اپنے فیصلہ کن خیالات کا اظہار فرمائیں۔

محترم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب قصص القرآن جلد اول میں اور حضرت مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ نے ''عہد زریں کی مثالی حکومتیں'' جلد اول میں اس روایت کو قابل اعتبار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن جواب میں عقلی موشگافیاں ہی نظر آتی ہیں، انداز محققانہ اور محدثانہ نہیں ہے، جب کہ میری منشاء روایت کو موثق اور معتبر ہی دیکھنا ہے، کیونکہ اسی روایت کی بنیاد پر میں نے یہود کے خلاف اپنی زیر ترتیب کتاب ''بائبل اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم'' میں تفصیلی گفتگو کی ہے، اور یہود کے نظریہ کی تردید کرنے میں اپنے تئیں کوئی کسر نہیں اٹھائی ہے۔

ازراہ کرم زحمت فرما کر محققانہ جواب سے نوازیں۔

جزاک اللہ خیر الجزاء

والسلام علیکم

عبدالحفیظ رحمانی

لوہرسن ضلع بستی-۲۰/مارچ ۱۹۸۵ء

حضرت محدث الاعظمی رحمہ اللہ نے میرے ان سوالات کو نہ صرف یہ کہ قابلِ اعتنا سمجھا، بلکہ اظہار مسرت کے بعد جو جواب عنایت فرمایا اس سے زیر تحقیق روایت کی حیثیت واضح ہوجاتی ہے، اور علامہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیاتِ قرآنیہ سے جو ثبوت فراہم کیے ہیں، ان کی حقیقت بھی عیاں ہوجاتی ہے، محدث الاعظمی کے الفاظ یہ ہیں:

''جب تک یہ محقق نہ ہوجائے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اہل کتاب سے استفادہ وتلقی کا موقع ملا ہے، اس وقت تک ان کی کسی روایت کو متلقی من الاسرائیلیات کہنا جرأت بے جا ہے، اگر وہ روایت مرفوع نہیں ہے، تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ وہ خاندانی روایت ہے جو سلف سے خلف تک پہنچی ہے۔

اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس حدیث پر جرح کی ہے، انھوں نے اس کو غور سے نہیں پڑھا ہے، اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ جو فقرے مرفوع ہیں وہ پہلے کے غیر مرفوع کی تصدیق کرتے ہیں یا ان پر متفرع ہیں۔ مثلاً **قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم (فلذلک سعی الناس بینھما)** اس غیر مرفوع بیان کی تصدیق کرتا ہے جس میں حضرت ہاجر کے صفاومروہ کے درمیان آنے جانے کی تفصیل ہے اور اس آنے جانے کے سبب کی بھی تصدیق ہے، کیونکہ سبب ومسبب میں تفریق کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اسی طرح **قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یرحم اللّٰہ أم اسماعیل لو ترکت زمزم أو قال لم تغرف لکانت زمزم عینا معینا.** اس سے پہلے جو غرف ہاجر کا بیان ہے (اور وہ غیر مرفوع ہے) اس کی تصدیق کرتا ہے، اس لیے میرے نزدیک تو پورا بیان مرفوع کے حکم میں ہے۔

ذریۃ کا اطلاق اولاد اور اولادِ اولاد، موجودین اور جن کا وجود متوقع ہے سب پر ہوتا ہے۔

(۱)وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لاَ يَنَالُ عَهْدِيْ الظَّالِمِيْنَ.

(۲)وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَكَ.

(۳)اِجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلوٰةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ

کو بغور پڑھیے۔

ذُرِّيَّةٌ کا اطلاق نساء پر بھی ہوتا ہے۔حدیث (لا تقتلوا ذرية) اور قول عمر (أحجُّوا الذرية) میں ذریۃ سے مراد نساء ہیں۔نہایہ ابن اثیر دیکھیے۔نیز جلالین میں ﴿أسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ کی تفسیر (وهو اسماعيل مع امه هاجر) سے کی ہے۔ان باتوں کے پیش نظر (أسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ) میں قطعاً اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا کہ اس وقت اسحاق علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے۔تامل صادق درکار ہے قرآن کریم میں ﴿وفدينٰه بذبح عظيم﴾ کے بعد ﴿وبشرناه باسحاق نبياً من الصالحين﴾ کا ذکر ہے،جس کا ظاہر یہ ہے کہ (أسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ) کا واقعہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کے بہت پہلے پیش آیا۔

حاشیہ جمل میں ہے: وكان يزور هما على البراق كل يوم من الشام.

۵۳۸/۲

حبیب الرحمٰن الاعظمی

محدث الاعظمی رحمہ اللہ کے اس محققانہ جواب کے بعد مزید کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے اور یہ بات غور وفکر کو ذرا مہمیز کرنے کے بعد سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا ہے، اس کی تصدیق نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی سے ہوگئی ہے۔انداز بیان یہ بتا رہا ہے کہ حضرت ہاجر کا یہ واقعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کر رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زبانی جو کچھ سنا اس پر نکیر نہیں فرمائی، بلکہ چند موقعوں پر اپنے ارشادات سے تصدیق فرمائی۔رہی سنگ دلی کی بات تو وہ حاشیہ جمل کی عبارت کے بعد بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔پھر اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں سنگ دلی اور شفقت کو تولنا عجیب سی بات ہے، ورنہ پھر حلقوم اسماعیل پر چھری پھیرنا کون سی رحمت ومحبت تھی؟

عبدالحفیظ رحمانی

لوہرسن سدھارتھ نگر۔۵/ستمبر ۱۹۹۲ء

حضرت محدثِ جلیل اور ردِ غیر مقلدیت

مولانا جمیل احمد نذیری ☆

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی تصحیح وتعلیق اور مفید حواشی کے ساتھ علوم حدیث کے جن مخطوطات کو زیور طبع سے آراستہ کر دیا، وہ علمی دنیا کے لیے بیش قیمت تحفہ ہیں، پورے عالم اسلام میں ان کی دھوم ہے، ان کے ذریعہ عام دینی خدمت جو ہوئی وہ اپنی جگہ، فقہ حنفی کے اساطین علم کی تصانیف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ (متوفی ۱۵۰ھ) کے فقہی مستدلات کا ذخیرۂ حدیث اور ان کے تلامذہ کے علمی کارنامے دنیا کے سامنے آئے۔

بہت سے لوگ تلاش حدیث میں صحیحین یا حد سے حد صحاح ستہ کو آخری منزل باور کرتے ہیں، حالانکہ امام بخاری رحمۃ اللہ، امام مسلم رحمۃ اللہ سمیت کسی محدث نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے اپنی کتاب میں ساری احادیث صحیحہ کا استیعاب کیا ہے۔

علامہ ابن الصلاح رحمۃ اللہ (م ۶۴۳ھ) فرماتے ہیں:

لم يستوعبا الصحيح فى صحيحيهما ولا التزما ذلك فقد روينا عن البخارى أنه قال: ما أدخلت فى كتاب الجامع إلاما صح وتركت من الصحاح لملال الطول وروينا عن مسلم أنه قال: ليس كل شئ عندى صحيح وضعته ههنا يعنى فى كتابه الصحيح [1]

شیخین نے صحیح بخاری وصحیح مسلم میں احادیثِ صحیحہ کا نہ استیعاب کیا ہے نہ اس کا التزام کیا ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ کا خود اپنا بیان ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے اپنی کتاب جامع بخاری میں احادیث صحیحہ ہی شامل کی ہیں اور بہت سی احادیثِ صحیحہ کو طوالت کے خوف سے چھوڑ بھی دیا ہے اور امام مسلم رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ جو

☆ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور

(۱) مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۰

بھی حدیثیں میرے نزدیک صحیح ہوں سب کو
میں نے اپنیکتاب صحیح مسلم میں جمع کردیاہو۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۶۹ھ) لکھتے ہیں:

قد ظن أناس أنهما قد التزما أن يخرجا كل ما صح من الحديث فی كتابيهما فاعترضوا عليهما بأنهما لم يقوما بما التزما به وليس الامر كذالک فقد روى عن البخارى أنه قال: ما ادخلت فی كتابی الجامع إلا ما صح وتركت جملة من الصحاح خشية أن يطول الكتاب وروى عن مسلم ...... قال: إنما أخرجت هذا الكتاب وقلت هو صحاح ولم أقل ان ما لم أخرجه من الحديث فی هذا الكتاب فهو ضعيف الخ (۱)

بہت سے لوگوں کا گمان ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وامام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے التزام کیا تھا کہ ہر صحیح حدیث کی وہ بخاری ومسلم میں تخریج کریں گے، چنانچہ اسی گمان کی بنا پر انھوں نے اعتراض کیا کہ وہ دونوں اس بات پر قائم نہیں رہے جس کا انھوں نے التزام کیا تھا۔ حالانکہ معاملہ ایسا نہیں ہے، اس لیے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے اپنی کتاب جامع میں صحیح احادیث ہی داخل کی ہیں، لیکن کتاب کی طوالت کے خوف سے کچھ صحیح احادیث چھوڑ دی ہیں، اور ...... امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا میں نے اس کتاب میں سب صحیح حدیثیں جمع کی ہیں، لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ جو حدیث میں نے اس کتاب میں نہیں لکھی وہ ضعیف ہے۔

آگے علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بحث کی ہے کہ صحیحین بلکہ صحاح ستہ کے مؤلفین نے جو احادیث صحیحہ اپنی کتابوں میں درج نہیں کیں ان کی مقدار کیا ہے؟ وہ کم ہیں یا زیادہ؟

حقیقت یہ ہے کہ صحاح ستہ کے پہلے کے مولفین ہوں یا بعد کے، انھیں جتنی احادیثِ صحیحہ یاد تھیں ان سے انتخاب کرکے انھوں نے اپنی کتابیں ترتیب دیں، اس انتخاب کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بہت سی احادیث صحیحہ ان سے درج ہونے سے رہ گئیں، جنھیں بعد کے محدثین نے اپنی کتب میں شامل کیا۔

(۱) مقدمہ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ص۹۴

ان میں سے بعض وہ ہیں جو شرط شیخین پر ہیں اور صحیحین کی روایات سے کسی طرح کم درجہ کی نہیں ہیں۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کی تعلیقات وحواشی سے شائع شدہ کئی مخطوطاتِ حدیث وہ ہیں جن کی احادیث فقہ حنفی کی تائید میں ہیں اور ان کے مؤلفین (امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ م ۲۵۶ھ، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ م ۲۶۱ھ، امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ م ۲۷۵ھ، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ م ۲۷۹ھ، امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ م ۳۰۲ھ، امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ م ۲۷۳ھ) سے پہلے کے لوگ ہیں۔ مثلاً:

۱-امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ امام ابوبکر عبداللہ بن الزبیر قریشی اسدی حمیدی (م ۲۱۹ھ) کی تالیف مسند الحمیدی ۲ جلدیں۔

۲- امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید، امیر المؤمنین فی الحدیث امام عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۸۱ھ) کی تالیف کتاب الزہد والرقائق۔

۳-امام شیخ ابوعثمان سعید بن منصور مروزی (م ۲۲۹ھ) کی تالیف سنن سعید بن منصور۔

۴-امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ امام عبدالرزاق بن ہمام بن نافع رحمۃ اللہ علیہ (م ۲۱۱ھ) کی تالیف **المصنف لعبدالرزاق** ۱۱ جلدیں۔

۵-امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۲۳۵ھ) کی تالیف **المصنف لابن أبی شیبہ** اس کی ۳ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، بقیہ زیر طبع ہیں۔

ان کتب حدیث کی بہت سی روایات فقہ حنفی کی مؤید ہیں، ان کی اشاعت سے فقہ حنفی کو بہت فائدہ پہنچا، وہ ذخیرۂ حدیث جو مخطوطات کی صورت میں بوسیدہ اوراق میں بند تھا، اہل علم کے سامنے آیا اور فقہ حنفی پر زبان طعن دراز کرنے والوں کے لیے تازیانہ بنا۔

یہ محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ علمی خدمت ہے جسے فن حدیث سے خصوصی ممارست اور فقہ حنفی سے خاص لگاؤ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کا وہ کارنامہ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں جب انھوں نے ترک تقلید اور اس سے اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کیا اور عامۃ الناس کو اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا۔

''ردغیر مقلدیت'' میں محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف نہ صرف امام ابوحنیفہ اور فقہ حنفی کا دفاع ہے، بلکہ فقہ، فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اور محدثین عظام رحمۃ اللہ علیہم کی طرف سے بھی دفاع ہے، ''اہل حدیث'' کے

خوبصورت پردہ میں ترک تقلید کے داعی جس انداز سے نوجوان نسل کو ذہنی وفکری بے راہ روی میں مبتلا کررہے ہیں، جو دینی نقطہ نظر سے بے حد خطرناک ہے۔

ترکِ تقلید کی خطرناک روش سے اسلاف کی بے اعتباری، بے اعتمادی، اور بے وقعتی پیدا ہوتی ہے۔ ان پر زبان اعتراض دراز کرنے اور پگڑیاں اچھالنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جب کہ اسلاف پر اعتماد ہی دین کی اصل بنیاد ہے، اسلاف کا احترام ہو ان سے عقیدت ومحبت ہو، ان پر اعتماد ہو، ان کی ممنونیت اور فرماں برداری کا جذبہ ہو، ان سے بدگمانی اور تنفر نہ ہو، یہی دین اور اسلامی تاریخ کا تقاضا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

إن الأمة اجتمعت علىٰ أن يعتمدوا على السلف فى معرفة الشريعة فالتابعون اعتمدوا فى ذلک على الصحابة وتبع التابعين اعتمدوا على التابعين وهكذا فى كل طبقة اعتمدوا العلماء على من قبلهم والعقل يدل على حسن ذلک لأن الشريعة لا يعرف إلا بالنقل والاستنباط والنقل لا يستقيم إلا أن يأخذ كل طبقة عمن قبلها بالاتصال (۱)

امت کا اتفاق ہے کہ شریعت کی معرفت میں سلف پر اعتماد ہونا چاہئے۔ چنانچہ تابعینؒ نے اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ پر اعتماد کیا، تبع تابعینؒ نے تابعینؒ پر اعتماد کیا، ایسے ہی ہر طبقہ میں ہوتا آیا کہ انھوں نے اپنے سے پہلے کے علماء پر اعتماد کیا۔ عقل اس کی خوبی اور عمدگی پر دلالت کرتی ہے، اس لئے کہ شریعت بغیر نقل واستنباط کے نہیں جانی جاسکتی اور نقل اس وقت تک درست نہیں جب تک ہر طبقہ اپنے سے پہلے والے طبقہ سے بالاتصال نہ لے۔

ترکِ تقلید سے سب سے زیادہ جو تأثر پیدا ہوتا ہے وہ یہی کہ اسلاف پر اعتماد اور ان کا احترام ختم ہوجاتا ہے۔ ترک تقلید کی مخالفت اسی لیے کی جاتی ہے تاکہ اسلاف پر اعتماد جو قرآن وحدیث کی روشنی میں امتِ مسلمہ کے ایک مخصوص دینی ذہن ومزاج کا آئینہ دار ہے، ہر قسم کی دراندازیوں سے محفوظ رہے۔

تقلید کا انکار، تمام فقہی مسالک، فقہاء اور محدثین کی بے وقعتی کو ظاہر کرنا ہے اور ترکِ تقلید

(۱) عقد الجید ص ۳۶

اوراس کے متعلقات کا ردو ابطال ان سب کی طرف سے دفاع کا فریضہ انجام دینا ہے۔اس اعتبار سے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ردغیر مقلدیت پر جو کتابیں، رسائل اور مضامین قلم بند فرمائے ہیں، وہ جہاں ان کی تبحر علمی کے شاہکار ہیں، وہیں ان کی ائمہ اربعہ رحمہم اللہ سمیت جمہور فقہائے امت اور محدثین عظام رحمہم اللہ کے ساتھ بے پناہ محبت کے آئینہ دار بھی۔

سر دست ہم دو موضوعات کو لیتے ہیں جن پر محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ نے ردغیر مقلدیت کرتے ہوئے دلِ پُرسوز، ذہن نکتہ رس اور قلم حقیقت رقم سے مسئلہ کے مالہٗ وما علیہ کو بالکل واشگاف کر دیا ہے، قارئین دیکھیں گے کہ ان موضوعات پر لکھنا صرف فقہ حنفی کا دفاع نہیں، بلکہ ائمۂ اربعہ سمیت جمہور فقہائے عظام اور محدثین کرام کی جانب سے دفاع ہے، کیونکہ یہ سارے موضوعات سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ترک تقلید کے داعی جب ان پر تنقید کا تیشہ چلاتے ہیں تو ان کی زد سے کوئی نہیں بچ پاتا۔

ہمارے دو موضوعات یہ ہیں:

۱-اصحاب الحدیث کے مفہوم کو نیا معنی پہنانا۔

۲-تقلید پر اعتراضات۔

تحقیق اہل حدیث:

علمائے متقدمین کے یہاں دو اصطلاحیں معروف تھیں: ایک اصحاب الحدیث یا اہل الحدیث، دوسری اصحاب الرائے یا اہل الرائے۔ یہ دونوں اصطلاحیں علماء کے دو طبقوں اور ان کے کام کی نوعیت کو بتاتی ہیں۔اصحاب الحدیث وہ علماء کہلاتے تھے جو حفظ حدیث اور روایتِ حدیث میں انہماک واشتغال رکھتے تھے، اور استنباط مسائل سے شغف نہ تھا، اصحاب الرائے وہ علماء کہلاتے تھے جو استخراج واستنباطِ مسائل میں مشغول تھے اور حفظ حدیث وروایت حدیث کی طرف ان کی زیادہ توجہ نہ تھی، بلکہ ان احادیث سے مستنبط مسائل کی طرف ان کا زیادہ دھیان تھا۔گویا محدثین کرام کو اصحاب الحدیث یا اہل الحدیث کہا جاتا تھا اور فقہائے عظام رحمہم اللہ کو اصحاب الرائے۔[1]

---

(۱) اس موضوع پر حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے درس ترمذی ج ۱ ص ۸۶ تا ص ۸۸ پر بڑی عمدہ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اصحاب الرائے صرف اہل کوفہ اور فقہائے احناف نہ تھے، بلکہ تمام مشتغلین بالفقہ کو اصحاب الرائے کہا جاتا تھا، البتہ فقہائے احناف اور اہل کوفہ کی استخراج مسائل میں خصوصی مہارت وممارست کی بنیاد پر بعد میں اصحاب الرائے عام طور پر یہی حضرات کہلانے لگے۔ (جمیل ۱۲)

لیکن غضب یہ ہوا کہ جو اصطلاح محدثین کے لئے استعمال ہوتی تھی غیر مقلد فرقہ نے اس کو اپنے اوپر منطبق کر لی، اور اتنا ہی نہیں کیا بلکہ احادیث کریمہ میں حفظ حدیث اور روایت حدیث سے اشتغال رکھنے والوں کے لئے جو فضائل وارد ہوئے ہیں ان کا مصداق بھی خود قرار دینے لگا، اس سلسلے میں یہ لوگ اتنا آگے نکل گئے کہ ضعیف بلکہ موضوع احادیث سے بھی استدلال کرنے سے نہ چوکے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (جو غیر مقلدین کے شیخ الاسلام کہلاتے ہیں) نے خود تسلیم کیا ہے کہ آج کل کے عام اہل حدیث ''محدثین والی اصطلاح کے اہل حدیث'' نہیں ہیں۔ [1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کل کے غیر مقلدین جو کہ اپنے آپ کو ''اہل حدیث'' کہتے ہیں، اپنے فضائل ومناقب میں وہ احادیث پیش کریں جن کا تعلق محدثین اور حفظِ حدیث وروایتِ حدیث سے انہماک واشتغال رکھنے والوں سے ہو تو کیا یہ صحیح ہوگا؟

ہر معقولیت پسند یہی جواب دے گا کہ صحیح نہ ہوگا۔ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی یہی کہے گا کہ یہ احادیث کو غلط محل میں استعمال کرنا ہے۔ لیکن مقام تعجب ہے کہ اپنے فرقہ کے فضائل ومناقب میں وہ ساری حدیثیں، غیر مقلدین کے تمام چھوٹے بڑے علماء دھڑلے سے استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں اور بار بار توجہ دلانے کے باوجود بھی باز آنے کے لیے تیار نہیں۔

آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس مئو آئمہ الٰہ آباد منعقدہ اپریل ۱۹۴۳ء کے خطبۂ صدارت میں مولانا ابوالقاسم صاحب بنارسی [2] نے اپنے فرقہ کے فضائل میں جو بے بنیاد دعوے کئے تھے ان میں سے چند یہ تھے:

۱- اہلحدیث نام پیغمبر علیہ السلام کا مقرر فرمایا ہوا ہے۔

ثبوت میں یہ حدیث پیش کی کہ ''قیامت میں اہلحدیث سیاہی اور دواتوں سمیت آئیں گے'' اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا تم اہلحدیث ہو جنت میں جاؤ۔

۲- یہ نام صحابۂ کرام کا قبول کردہ ہے، چنانچہ (الف) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے کو

---

(۱) دیکھئے فتاویٰ ثنائی جلد اول ص ۱۳۵ تا ص ۱۳۷

(۲) مولانا محمد ابوالقاسم سیف بنارسی ابن مولانا محمد سعید ابن کھڑک سنگھ غیر مقلدین کے مشہور عالم تھے، اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ سعیدیہ محلّہ دارانگر بنارس میں پوری عمر درس دیا، چھوٹے بڑے چار درجن مناظرانہ رسائل لکھے ہیں، ان کے والد نے اسلام قبول کرنے کے بعد بنارس میں سکونت اختیار کر لی تھی، مولانا محمد ابوالقاسم کی وفات ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔

اہلحدیث کہا۔(ب) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اہلحدیث کہا گیا۔(ج) امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اہلحدیث تھے۔(د) سفیان ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ پہلے پہل امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہی مجھ کو اہلحدیث بنایا۔

یہ اور انہیں جیسے دیگر دعووں کی حقیقت واشگاف کرنے کے لیے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس خطبۂ صدارت پر تفصیلی نگاہ ڈالی اور ''تحقیق اہلحدیث'' کے نام سے محققانہ تنقید فرمائی۔ پہلی بات کے جواب میں لکھا کہ:

''یہ حدیث جعلی ہے اور جعلی حدیث سے سند پکڑنا بالاتفاق حرام ہے''۔

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں:

''لطف یہ کہ اس حدیث کو مقلد علماء (ذہبی رحمۃ اللہ علیہ) خطیب اور سیوطی رحمۃ اللہ علیہ) نے تو موضوع لکھا ہی ہے ایک غیر مقلد ''امام'' نے بھی اس کو موضوعات (جعلی حدیثوں) میں شمار کیا ہے، علامہ شوکانی کی کتاب الفوئد المجموعہ ص ۳۰ ملاحظہ کیجئے۔ اور مقلدین کی تحقیق دیکھنی ہو تو لآلی مصنوعہ ج ۱ ص ۱۱۲ میں یہ تصریح پڑھئے:

قال الخطیب: موضوع (الیٰ) قال فی المیزان: وضع ھذاالحدیث علی الطبرانی . یعنی خطیب نے کہا ہے کہ یہ حدیث جعلی ہے........میزان میں کہا (رقی نے) اس حدیث کو طبرانی کے نام پر بنالیا ہے''۔(۱)

دوسروں سے ہر ہر مسئلہ پر حدیث صحیح مرفوع متصل کا مطالبہ کرنے والے اپنے مطلب کے لیے جعلی اور موضوع حدیث کتنی ''شان'' سے پیش کرتے ہیں، یہ اس کی انتہائی عبرتناک مثال ہے۔ محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ آگے لکھتے ہیں:

''پھر اگر بالفرض یہ حدیث جعلی نہ بھی ہوتی تب بھی اس سے مولوی ابوالقاسم کا مدعا حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے کہ اس میں اصحاب الحدیث کا جو لفظ واقع ہوا ہے اس سے تارکین تقلید کی وہ جماعت جو براہ راست عمل بالحدیث کی مدعی ہو، مراد نہیں ہے، بلکہ اہل علم کی وہ جماعت مراد ہے جو کتابت ودرس حدیث کا مشغلہ رکھتی ہو، چنانچہ اس کی بین دلیل

(۱) تحقیق اہل حدیث ص ۴ مطبوعہ احناف دارالاشاعت والتبلیغ مئو آئمہ الہ آباد

بـأيديهم المحابر کا لفظ ہے، یعنی ''ان کے ہاتھوں میں دواتیں ہوں گی'' ظاہر ہے کہ دو اتیں ہاتھوں میں لیے ہوئے آنا کتابت کا مشغلہ رکھنے والے ہی کا کام ہوسکتا ہے، دوسری بین دلیل یہ ہے کہ یہ جعلی حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے: **يحشر الله أصحاب الحديث وأهل العلم** (یعنی اللہ حدیث اور علم والوں کو محشور فرمائے گا) لآلی مصنوعہ ج اص ۱۱۳، دیکھئے اس میں اصحاب الحدیث کے ساتھ اہل العلم کہہ کر واضح کر دیا گیا ہے کہ اصحاب الحدیث سے مراد علمائے حدیث اور اس کے لکھنے پڑھنے والے ہیں۔

تیسری بین دلیل اس جعلی حدیث کے وہ الفاظ ہیں جن کو مولوی ابوالقاسم صاحب نے کسی مصلحت کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے اور وہ یہ ہیں: **طالما كنتم تصلون على النبى فى الدنيا** یعنی اللہ تعالیٰ اصحاب الحدیث کو یہ کہہ کر جنت میں بھیجے گا کہ تم ہمارے نبی (ﷺ) پر دنیا میں درود بہت پڑھتے رہے۔

دیکھئے یہ الفاظ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ اصحاب الحدیث سے حدیث لکھنے پڑھنے والے مراد ہیں، اس لیے کہ کثرتِ درود انھیں کا مشغلہ ہے چاہے کتابۃً یا تلفظاً، نیز ان الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ان کے جنتی ہونے کا سبب ''ترک تقلید'' یا ''ادعائے عمل بالحدیث'' نہیں ہے، بلکہ کثرت درود، اور مولوی ابوالقاسم صاحب خود بھی خوب سمجھ سکتے ہیں کہ کثرتِ درود مقلدین کا مشغلہ ہے یا غیر مقلدین کا، میں نے اس جعلی حدیث کے الفاظ اصحاب الحدیث کی جو مراد لکھی ہے وہی امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے بھی ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ انھوں نے اس حدیث کو **حديث فى حشر العلماء بالمحابر** کے عنوان سے یاد کیا ہے (دیکھو میزان ذہبی)۔[1]

دوسرا دعویٰ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ''اہل حدیث'' ہونے کا تھا، اس کے متعلق محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''ان تمام حوالوں میں بھی اصحاب الحدیث یا اہل الحدیث سے وہی حدیثوں کی روایت کرنے والے یا ان کو یاد کرنے والے، درس دینے والے اور لکھنے والے مراد ہیں،

(۱) تحقیق اہل حدیث ص ۵ و ۶

تارکین تقلید یا مدعیان عمل بالحدیث کسی طرح مراد نہیں ہو سکتے، چنانچہ اس سلسلے میں پہلی بات انھوں نے یہ لکھی ہے، کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے کو اہل حدیث کہا، لیکن افسوس ہے کہ پوری بات نہیں لکھی، ورنہ صاف کھل جاتا کہ اہل حدیث سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مراد کیا ہے، مولوی صاحب نے اس کے لیے تاریخ خطیب وتذکرہ کے جس مقام کا حوالہ دیا ہے، اس مقام میں ابوبکر بن ابی داؤد کا ایک خواب مذکور ہے کہ ابوبکر بن ابی داؤد جس زمانہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیثوں کی تصنیف میں مصروف تھے، اسی زمانہ میں انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا، گھنی ڈاڑھی، گندمی رنگ، موٹے کپڑے پہنے ہوئے، ابوبکر کہتے کہ میں نے ان کو دیکھ کر کہا: مجھے جناب سے محبت ہے ''انھوں نے جواب دیا کہ میں دنیا میں پہلا صاحب حدیث ہوں''۔

''اس پورے واقعہ کو سامنے رکھ کر اب مولوی ابوالقاسم صاحب ہی بتائیں کہ اگر صاحب حدیث سے ان کے اصطلاحی معنی یعنی عامل بالحدیث مراد ہیں، تو کیا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پہلے، صحابہ میں کوئی عامل بالحدیث نہیں تھا؟ یا مولوی صاحب کے لفظوں میں یہ کہ جس طرح حدیث کو جماعت اہل حدیث نے اپنا پروگرام بنایا ہے، اس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پہلے کسی صحابی نے نہیں بنایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولوی صاحب یہ کہنے کہ ہرگز جرأت نہیں کر سکتے۔ لہذا صاحب حدیث کے وہ معنیٰ یہاں نہیں ہو سکتے جو مولوی صاحب کہتے ہیں، بلکہ صاحب حدیث کے معنی وہی ہیں کہ حفظِ حدیث وروایتِ حدیث کا مشغلہ رکھنے والا، اور کچھ شبہہ نہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اہتمام حفظ حدیث وکثرتِ روایت وغیرہما کے لحاظ سے اولیت کا درجہ حاصل ہے؛ اور اس معنی کے لیے ایک کھلا ہوا قرینہ یہ ہے کہ تصنیف حدیث کے وقت یہ خواب نظر آیا، ترک تقلید یا عمل بالحدیث کے وقت نہیں''۔ (۱)

پھر محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غیر مقلدین کے دلائل کا حال دیکھئے کہ کہیں موضوع حدیث سے استدلال کرتے ہیں، کہیں ایسے خواب سے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے کئی

---
(۱) کتاب مذکور ص ۶ و ۷

صدی بعد کا ہے، دلائل کی قوت کا اندازہ اس سے ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اہل حدیث کہے جانے کے دعوے کے متعلق محدثِ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''تاریخ بغداد کی عبارت یہ ہے: **أصحاب الحديث ثلاثة: عبدالله بن عباس في زمانه والشعبي في زمانه والثوري في زمانه** یعنی اصحاب الحدیث تین ہیں؛ ابن عباس رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ میں اور شعبی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں اور ثوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں۔ دیکھئے اس عبارت میں اگر اصحاب الحدیث سے اہل حدیث مراد لئے جائیں تو جس طرح اس سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اہل حدیث ہونا ثابت ہوگا اسی سے یہ بھی ثابت ہوگا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے زمانے سے لے کر ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ تک صرف تین ہی اہل حدیث ہوئے، لہذا اسی ص ۵ میں مولوی ابوالقاسم صاحب کا لکھنا غلط ہوگیا کہ ''تمام صحابہ اہل حدیث تھے اور ''صحابہ وتابعین سب اہل حدیث تھے''۔ (۱)

مزید لکھتے ہیں:

''اسی سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تمام صحابہ اہل حدیث تھے'' (ص ۵) مولوی ابوالقاسم صاحب نے اس کے لیے تذکرۃ الحفاظ ص ۷۲ ج ۱ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۲ تو درکنار دس بیس صفحے آگے پیچھے بھی یہ مضمون نہیں ہے۔ (۲)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا ابوالقاسم صاحب کے دعویٰ کی حقیقت بتاتے ہوئے حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اگر مولوی صاحب کی نظر وسیع ہوتی تو اسی ایک بات سے ان کی سمجھ میں آ سکتا تھا کہ کتابوں میں اہل الحدیث کے لفظ سے کیا مراد ہوا کرتی ہے۔ مولوی صاحب اگر احسان مانیں تو میں ان کو بتاؤں کہ جو فقرہ انھوں نے لکھا ہے وہ **أول من صيرني محدثاً أبو حنيفة** کا ترجمہ ہے۔

---

(۱) کتاب مذکور ص ۱۱ (۲) ایضاً

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ کا مقولہ تاریخ ابن خلکان ج اص ۲۱۱ میں انھیں الفاظ میں مذکور ہے، ترجمہ کرنے والے نے محدث کا ترجمہ اہل الحدیث کر دیا، پس جب اہل حدیث بنانے سے محدث بنانا مراد ہے، تو مولوی ابوالقاسم صاحب نے بعد میں جو فقرہ اپنی طرف سے لکھا ہے (۱) وہ یوں ہونا چاہئے کہ امام اعظم محدث تھے، اور دوسروں کو (بلکہ سفیان بن عیینہ جیسوں کو بھی) محدث بنایا کرتے تھے''(۲)۔

یہ چند نمونے تھے جس سے پتہ چلا کہ غیر مقلد علماء کس کس طرح تلبیس کرتے تھے اور حضرت محدث جلیل علیہ الرحمہ نے ان کی خوب خوب قلعی کھولی، مولانا ابوالقاسم صاحب نے جن جن حضرات کے متعلق دعویٰ کیا تھا کہ وہ انھیں کی طرح فرقۂ اہل حدیث سے تعلق رکھتے تھے، ہر ایک کی حقیقت واضح کی۔

ہماری تلاش وجستجو کے مطابق کسی غیر مقلد عالم میں تحقیق اہل حدیث کا جواب لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی، اگر کوئی صاحب دعویدار ہوں تو پیش کریں، ہم اس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ غیر جانبدارانہ محاکمہ ہو سکے، اور دیکھا جا سکے کہ مولانا ابوالقاسم صاحب و دیگر غیر مقلد علماء کی ان تلبیسات کا کیا جواب دیا گیا ہے۔

''تحقیق اہل حدیث'' ۱۸×۱۲/۸ سائز کے ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے سارے مندرجات پر گفتگو کا موقع نہیں، اب محدث جلیل رحمۃ اللہ کی وہ عبارت ملاحظہ فرمائیں جو انھوں نے۔ ''اہل حدیث کس کو کہتے ہیں؟'' کے عنوان کے تحت رقم فرمائی ہے:

> ''اصل یہ ہے کہ آج اہل حدیث اس کو کہتے ہیں جو عامی غیر مجتہد ہونے کے باوجود کسی امام کی تقلید واتباع کا قائل نہ ہو، ہمارا دعویٰ ہے کہ اہل حدیث کی یہ اصطلاح بالکل حادث وبدعت ہے۔ اس معنی میں کبھی کسی کو اہل حدیث نہیں کہا گیا اور ایسے اہل حدیث کا وجود بجز اس دور متاخر کے اور کبھی نہ تھا۔

---

(۱)(۱) یعنی یہ فقرہ امام اعظم اہل حدیث تھے اور دوسروں کو اہل حدیث بنایا کرتے تھے، یہ فقرہ بدل کر اہل حدیث کی جگہ ''محدث'' ہونا چاہئے تاکہ مراد صحیح رہے۔

(۲) کتاب مذکور ص ۱۴-۱۵

مولوی ابوالقاسم صاحب نے زمانہ قدیم میں جن لوگوں کا اہل حدیث ہونا دکھایا ہے، وہ یا تو اہل حدیث بمعنی راوی وخادم تھے، یا اہل حدیث بمعنی شافعی المذہب و مالکی المذہب تھے، یا اہل حدیث بمعنی اہل سنت و جماعت تھے، لفظ اہل حدیث کا ان تین معنوں میں بولا جانا ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں، بلکہ خود مولوی ابوالقاسم صاحب کے بیانات سے بھی یہ ثابت ہے، لہذا اب تک انھوں نے جو محنت کی ہے وہ تو سب اکارت گئی، اب کوشش کر کے متقدمین کی کتابوں سے کوئی ایسی عبارت پیش کریں جس میں ''عامی غیر مقلد'' کو اہل حدیث کہا گیا ہو''۔

فرقۂ اہل حدیث کی طرف سے ایسی کوئی عبارت آج تک نہ پیش کی جا سکی، آج بھی اگر کوئی غیر مقلد اپنی جماعت کے فضائل ومناقب بیان کرنے یا لکھنے پر آتا ہے تو وہی ساری عبارتیں پیش کر دیتا ہے، جو مولانا ابوالقاسم صاحب بنارسی نے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس مئو آئمہ کے اپنے خطبۂ صدارت میں درج کی تھیں، جن کی حقیقت حضرت محدث اعظمی ﷫ کی محققانہ تنقید سے واشگاف ہو چکی ہے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری ﷫ کا ایک علمی سوال:

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری ﷫ متوفی ۱۳۶۷ھ نے اپنے اخبار اہل حدیث ۵/ دسمبر ۱۹۴۳ء میں علمائے دیوبند سے ایک سوال کیا، جس کا عنوان رکھا ''ایک علمی سوال''، اس میں تقلید کی تعریف میں کچھ عبارتیں نقل کرنے کے بعد علماء دیوبند کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ آپ لوگ مسائل دینیہ کو بالدلیل جانتے ہیں، ایسا جانتے ہیں کہ نہ صرف طلباء کو سمجھانے کی قدرت رکھتے ہیں، بلکہ ان کو عالم بالدلیل بناتے ہیں، تو کیا آپ حضرات کی علمی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر آپ کو مقلد کہا جائے یا غیر؟

یہ ایک سوال ہے جس کے لیے میں نے آپ حضرات کو متوجہ کیا ہے، میں اپنا عندیہ عرض کئے دیتا ہوں، کسی شخص کو مقلد کہنا اس کے عالم ہونے کی نفی کے برابر ہے، اس لیے آپ حضرات کو مقلد کہنے سے علاوہ تعریفات مذکورہ کے مجھے امام غزالی سخت مانع ہوئے ہیں۔ گویا وہ فرماتے ہیں کہ دیوبند علماء چونکہ مسائل کو دلیل کے ساتھ جانتے ہیں اس لیے

ان کومقلد نہ کہو۔ کیونکہ (**ليس ذلك التقليد طريقاً إلى العلم لافي الأصول ولا في الفروع** حوالہ مذکور)

تقلید علم کا درجہ نہیں ہے اور نہ علم[1] کا ہے، بلکہ جہالت کا درجہ ہے، یہی معنی ہیں علماء اصول کے اس قول کے۔

إنما التقليد وظيفة الجاهل. پس آپ حضرات ان اصولی حوالجات کے ماتحت اعلان فرمائیں کہ آپ کومقلد کہیں یا غیر۔ بینوا توجرا۔

پس اب اس امر کا فیصلہ کہ آپ کومقلد کہیں یا غیر، آپ حضرات کے جواب پر موقوف ہے''

مولانا امرتسری رحمۃ اللہ نے اس سوال کے ذریعہ اپنی دانست میں علمائے دیوبند کو بری طرح گھیر لیا تھا، سب جانتے ہیں کہ علمائے دیوبند خود کو امام اعظم رحمۃ اللہ کا مقلد کہتے ہیں اور غیر مقلدیت ان کے نزدیک گمراہی کا راستہ ہے۔ دوسری طرف تقلید کی مذکور فی السوال تعریفات سے، مقلد سے علم کی نفی اور تقلید جاہلوں کا طریقہ ثابت ہوتا تھا، اور ظاہر ہے کہ یہ بھی علمائے دیوبند کے ہرگز شایان شان نہ تھا۔

مولانا امرتسری رحمۃ اللہ کو اس سوال پر اتنا ناز تھا اور اسے وہ اتنا ''لاجواب'' سمجھتے تھے کہ نہ صرف علمائے دیوبند بلکہ عالم اسلام کے تمام علمائے مقلدین، شوافع، مالکیہ، حنابلہ تک کو چیلنج کر دیا۔ دیکھئے طمطراق کا یہ انداز۔

''اس مضمون کو میں نے بوجہ خاص خطاب حضرات دیوبندیہ سے کیا ہے، مگر دراصل یہ خطاب جملہ ان علماء کو ہے جو مسائل دینیہ کو دلیل کے ساتھ جانتے ہوں، خواہ وہ بریلی کے ہو، یا لکھنؤ کے، دہلی کے ہوں یا لاہور کے، پنجاب کے ہوں یا ہندوستان کے، سندھ کے ہوں یا بنگال کے، عرب کے ہوں یا عجم کے، سب میرے مخاطب ہیں، وہ علماء اصول کی تصریحات ملحوظ رکھ کر اپنے لیے جو نام تجویز فرمائیں ہم اس کو قبول کریں گے۔[2]

---

(۱) یہاں ''اہل علم'' ہونا چاہئے لیکن فتاویٰ ثنائیہ میں اسی طرح چھپا ہے۔ فتاویٰ ثنائیہ ج ۱ ص ۱۵۲

(۲) فتاویٰ ثنائیہ ج ۱ ص ۱۵۲

مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے اس ''لا ینحل'' سوال کو حل کرنے کے لیے علمائے دیو بند کی طرف سے جو شخصیت کھڑی ہوئی، وہ تھی محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ کی، جب آپ نے علمی سوال کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ جس سوال کو مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے بے انتہا مشکل جانا تھا، جس کے بارے میں ان کا تصور تھا کہ کوئی جواب نہیں دے سکتا، وہ انتہائی کمزور اور بے حیثیت نکلا۔

محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کا جواب نقل کرنے سے پہلے ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ مولانا امرتسریؒ کی غلطی کی بنیاد کیا تھی۔

دراصل تقلید کی تعریفات میں علم کی نفی سے ''علم اجتہادی'' کی نفی تھی، نہ کہ مطلقاً علم کی، یعنی مقلد کو ملکۂ اجتہاد حاصل نہیں ہوتا اور یہ بلا شک وشبہہ صحیح ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ مقلد کو دلیل کا قطعی علم ہی نہیں ہوتا، درست نہیں۔ اسی طرح بعض اصولیین نے مجتہد کے لیے ''عالم'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اب ظاہر ہے کہ مقلد کے لیے ''عالم'' کے بالمقابل ''جاہل'' ہی بولا جائے گا، اسی اعتبار سے تقلید کو ''جاہل'' یعنی غیر مجتہد کا طریقہ عمل بتایا گیا، لیکن یہ ''عالم'' و ''جاہل'' ایک خاص اصطلاح کے ''عالم'' و ''جاہل'' ہوئے، نہ کہ ہماری عرفی اصطلاح کے عالم و جاہل۔

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ یا تو اس فرق کو سمجھ نہ سکے، یا پھر جان بوجھ کر مغالطہ دے رہے تھے۔

اب محدث جلیل علیہ الرحمۃ کا جواب ملاحظہ کیجیے (۱)۔

''مولوی ثناء اللہ صاحب نے اصول فقہ کی کتابوں سے تقلید کی تعریف میں کچھ عربی عبارتیں نقل کر کے یہ سوال قائم کیا ہے کہ علماء حنفیہ جو مسائل کے دلائل جانتے ہیں، ان پر تقلید کی تعریف جو اصول کی کتابوں میں درج ہے، صادق نہیں اور نہ ان کو مقلد کہنا درست ہے۔

مولوی صاحب کا یہ سوال اس خوش فہمی پر مبنی ہے کہ **من غیر معرفة دليله** میں معرفت

---

(۱) یہ جواب ایک اشتہار کی شکل میں ہے جس کا عنوان ہے، مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کے علمی سوال کا جواب باصواب، اس پر جواب دہندہ کی حیثیت سے سکریٹری جمعیۃ الاحناف مئو ضلع اعظم گڈھ (یوپی) چھپا ہوا ہے، سکریٹری جمعیۃ الاحناف در اصل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ہیں، چونکہ حضرت کی حیات میں احقر کو نام کی تصریح کی اجازت مل گئی تھی، اس لیے بالصراحت نام لکھ رہا ہوں۔ (جمیل ۱۲)

سے مطلق جاننا اور سمجھنا مراد ہے، اسی وجہ سے آپ کو سمجھ میں نہیں آتا کہ مجتہد کے بیان کیے ہوئے مسائل کو جاننے والا ان مسائل کے دلائل پڑھنے اور جاننے کے بعد مقلد کیونکر کہلا سکتا ہے، حالانکہ اگر اصول فقہ کی کتابوں پر آپ کی نظر ہوتی تو آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ معرفت، مطلق جاننے کا ہم معنی نہیں، بلکہ معرفتِ دلیل سے دلیل کا وہ خاص علم مراد ہے جو مجتہد کے ساتھ مخصوص ہے۔ شرح جمع الجوامع سے تقلید کی تعریف کی تفریع ذکر کرنے کے لیے مولوی صاحب نے جو مختصر سا ٹکڑا نقل کیا ہے اس کے متصل یہ عبارت ہے: **لأن معرفة الدليل إنما تكون للمجتهد لتوقفها على سلامته عن المعارض بناء على وجوب البحث عنه وهي متوقفة على استقرار الأدلة كلها ولا يقدر على ذلک إلا المجتهد** یعنی معرفت موقوف ہے اس بات کی معرفت پر کہ یہ دلیل معارض سے سالم ہے کیونکہ اس کی بحث بھی ضروری ہے اور یہ موقوف ہے تمام دلائل کے استقراء پر جس کی قدرت صرف مجتہد کو ہوسکتی ہے۔

پس اگر کوئی عالم وہ آیتیں اور حدیثیں جانتا ہے جن سے مسائل شرعیہ ماخوذ ہیں، تو اصول فقہ کی اصطلاح کی رو سے اس کو فہم ماخذ حاصل ہے، لیکن معرفت دلیل حاصل نہیں ہے، تشنیف السامع شرح جمع الجوامع میں ہے: **قوله من غير معرفته فصل، خرج به الأخذ مع المعرفة، فذلک مجتهد ان عرف حق المعرفة والا فهو فی رتبة التقليد وان جزم على فهم الماخذ.** یعنی **من غير معرفته** فصل ہے جس سے معرفت دلیل کے ساتھ دوسرے کا بتایا ہوا مسئلہ ماننا نکل گیا کہ وہ (جسے معرفت دلیل حاصل ہو) مجتہد ہے بشرطیکہ پوری معرفت حاصل ہو، ورنہ وہ درجہ تقلید ہے اگر چہ مسئلہ کا ماخذ (آیت یا حدیث) سمجھنے پر جزم رکھتا ہو۔

نتیجہ جس آیت یا حدیث سے مسئلہ ماخوذ ہو اس کا جزمی اور قطعی طریق سے سمجھ لینا بھی تقلید کے خلاف نہیں ہے، دلائل کی پوری معرفت بمعنی مذکور ضروری ہے۔ پھر کیا کسی تارکِ تقلید کو پوری معرفت کا دعویٰ ہے؟ لہٰذا اس زمانے کے علماء خواہ دیوبند کے ہوں، یا بریلی کے، لکھنؤ کے ہوں یا دہلی کے، پنجاب کے ہوں یا بنگال کے، ہندی ہوں یا سندھی، عربی ہوں یا عجمی، اپنے کو مقلد کہتے ہوں یا غیر مقلد، حقیقت میں سب مقلد ہیں، اس لیے کہ کسی کو

اصطلاحی معرفت دلیل حاصل نہیں ہے''۔(۱)

محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ''مذکورہ بالا جواب کی مزید تائید'' کے عنوان سے آگے بتاتے ہیں کہ اجتہاد وتقلید دو متقابل دو چیزیں ہیں۔ مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے رسالہ فقہ وفقیہ ص ۵ میں اس کا اعتراف کیا ہے، دوسرے رسالہ اجتہاد وتقلید ص ۴۲ میں فقیہ اور مجتہد کو ہم معنی لکھا ہے اور مجتہد وہ ہوتا ہے جو ہر حکم شرعی فرعی کو دلیل سے مستنبط کرنے کا ملکہ رکھے۔ (حاشیہ چلپی بر تلویح ص ۴۴۰) مجتہد کی یہ تعریف مولانا امرتسریؒ کو بھی تسلیم ہے (اجتہاد وتقلید ص ۴۲) پھر نتیجہ کے تحت لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ ہدایہ پڑھنے پڑھانے والے علماء چونکہ ہر حکم شرعی فرعی کو دلیل سے استنباط کر سکنے کا ملکہ نہیں رکھتے، اس لیے وہ مجتہد نہیں ہیں اور جب مجتہد نہیں ہیں تو یقیناً علمائے اصول کی اصطلاح کی بنا پر وہ مقلد ہیں، اور جب علمائے اصول کی اصطلاح کے بموجب ان کا مقلد ہونا ثابت ہو گیا تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تقلید کی تعریف میں انھوں نے جس معرفت دلیل کی نفی کی ہے اس سے مطلق معرفت مراد نہیں ہے، بلکہ وہی معرفت مراد ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ورنہ تناقض وتہافت لازم آئے گا''۔(۲)

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۴؍مارچ ۴۴ء میں اس کا جواب الجواب لکھا، جو فتاویٰ ثنائیہ ج ا ص ۱۵۳ تا ص ۱۵۵ بعنوان ''علمی سوال کا جواب الجواب متعلق تقلید علماء'' شائع ہوا۔ اس میں فرماتے ہیں:

''جواب مذکور کا خلاصہ یہ ہے کہ مجیب نے میری منقولہ تعریفات تقلید کو صحیح مان کر لکھا ہے کہ دلیل کی پوری معرفت ہدایہ وغیرہ پڑھنے سے نہیں ہوتی کیونکہ معرفت دلیل اس کو کہتے ہیں کہ دلیل کو پورے طور پر جاننا، بالفاظ دیگر یہ جاننا کہ اس کا معارض کوئی نہیں۔ اور یہ منسوخ بھی نہیں وغیرہ۔ ایسا جاننا مجتہد کا خلاصہ ہے۔(۳)

میں کہتا ہوں مجیب نے جو کچھ لکھا ہے بالکل صحیح ہے۔''(۴)

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد مولانا

---

(۱) اشتہار مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کے علمی سوالوں کا جواب باصواب

(۲) اشتہار مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کے علمی سوالوں کا جواب باصواب

(۳) خلاصہ کے بجائے خاصہ ہونا چاہئے مگر چھپا خلاصہ ہی ہے

(۴) فتاویٰ ثنائیہ ج ا ص ۱۵۴

امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کا سوال خود بخود ختم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے ''جواب الجواب پر تبصرہ'' کے عنوان سے جو اشتہار شائع فرمایا اس میں لکھتے ہیں:

ہم نے ''جواب باصواب'' میں معرفت دلیل کی جو مراد اصول کی کتابوں سے ذکر کی تھی، اس سے وہ معرفت مراد ہے جو مجتہد کے ساتھ خاص ہوتی ہے، مولوی صاحب نے اس کو صحیح تسلیم کرلیا ہے اور بالکل غیر مشتبہ لفظوں میں اقرار کرلیا ہے کہ ''مجیب نے جو کچھ لکھا ہے بالکل صحیح ہے''

مولوی صاحب کے اس اعتراف حق کے بعد مطلع بالکل صاف ہے، اس لئے کہ اب تقلید کی تعریف خود مولوی صاحب کے اقرار کے بموجب یہ ہوئی کہ کسی قول کی دلیل کی پوری معرفت جس پر مجتہد ہی قادر ہوسکتا ہے، حاصل ہوئے بغیر اس کو قبول کرنا تقلید ہے۔ اور حضرات دیوبند جو مولوی صاحب کے مخاطب خاص ہیں انھوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال اسی طرح قبول کیا ہے کہ ان کو اقوال کی دلیلوں کی پوری معرفت جو مجتہد کا حصہ ہے، حاصل نہیں ہے، لہذا ان پر تقلید کی تعریف بے تامل صادق ہے اور وہ یقیناً مقلد ہیں''۔ (۱)

مولانا ثناء اللہ صاحب کو اپنے ''مایہ ناز علمی سوال'' کا بھرپور جواب مل چکا تھا، مگر اب وہ کج بحثی پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ مگر علمائے دیوبند تو دلائل کی مجتہد والی معرفت تامہ رکھتے ہیں۔ لہذا وہ مقلد کیسے کہلا سکتے ہیں؟ سنئے انھیں کے الفاظ میں:

''مگر مجیب صاحب نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ جن علماء کی نسبت میرا سوال ہے وہ تو دلیل کی معرفت تامہ رکھتے ہیں۔ اب میں مجبوراً چند علماء کے اسماء گرامی بطور مثال پیش کر کے پوچھتا ہوں کہ مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم، مولانا انور شاہ دیوبندی مرحوم، مولانا محمود الحسن مرحوم، مولانا حسین احمد سلمہ، مولانا اشرف علی مرحوم، مولانا احمد رضا بریلوی مرحوم ومجدد مائۃ حاضرہ، وغیرہ اکابر علماء حنفیہ کو بھی دلیل کی معرفت تامہ حاصل تھی یا نہ تھی؟ (۲)

یہ تو خوب رہی، علماء دیوبند کہیں کہ ہم کو مجتہد والی معرفت دلیل حاصل نہیں، لہذا ہم امام ابوحنیفہ

(۱) اشتہار، مولوی ثناء اللہ صاحب کے جواب الجواب پر تبصرہ، شائع کردہ جمعیۃ الاحناف مئو ضلع اعظم گڈھ یوپی
(۲) فتاوی ثنائیہ ج ۱ ص ۱۵۴

کے مقلد ہیں اور مولانا امرتسری ؒ زبردستی انھیں باور کرائیں کہ آپ لوگوں کو مجتہد والی معرفتِ دلیل حاصل ہے، لہذا آپ لوگ مقلد نہیں ''غیر'' ہیں۔ اصل میں یہ ذہن ومزاج کا فرق تھا، سطحی علم رکھنے والا بہت جلد ''ابل'' جاتا ہے اور گہرائی رکھنے والا اپنی حقیقت کا ادراک رکھتے ہوئے لب کشائی کرتا ہے، قوتِ اجتہاد اور دلائل کی معرفتِ تامہ اتنی آسان چیز نہیں جتنی غیر مقلد علماء تصور کرتے ہیں اور اپنے لیے راستہ صاف کرنے کے لیے دوسروں کی حوصلہ افزائی اور مرتبہ شناسی کی رشوت دیتے ہیں، اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح ہم مقلد نہیں ''غیر'' ہیں۔ اسی طرح علماء دیو بند بھی۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی ؒ ''مدعی سست، گواہ چست''، کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب جانتے ہیں کہ ''جواب باصواب'' میں معرفتِ دلیل کی جو مراد بتائی گئی ہے اس کو صحیح ماننے کے بعد ''صیاد خود اپنے دام میں آجائے گا''، اس لیے انھوں نے اس دام سے نکلنے کے لیے یہ فرمایا کہ ''جن علماء کی نسبت میرا سوال ہے وہ تو دلیل کی معرفت تمام رکھتے ہیں'' لیکن یہ تو وہی مثل ہوئی کہ ''مدعی سست گواہ چست'' اس لیے کہ حضرات دیو بند اپنے لیے دلیل کی معرفتِ تامہ (جو مجتہد کا حصہ ہے) کے حصول سے صاف انکار کرتے ہیں، اگر مولوی ثناء اللہ صاحب کو اس میں کچھ تامل ہو تو جن حضرات کے نام انھوں نے لکھے ہیں، ان میں سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہٗ، بفضلہٖ تعالیٰ بقید حیات ہیں، انھیں پر مدار فیصلہ رکھ دیں، وہ اگر کہہ دیں کہ مجھ کو معرفت تامہ حاصل ہے، تو ہم اعلان کر دیں گے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب اس بحث میں حق بجانب ہیں، اور اگر انکار کریں تو مولوی صاحب اعلان کریں کہ ان کا مجیب اس بحث میں حق بجانب ہے، بولئے مولانا! ع

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا[1]

اس مرحلہ پر مولانا امرتسری ؒ پیچھے ہٹنے لگے، ذرا گریز وفرار کا انداز ملاحظہ کیجئے:

''مجیب نے دوسرے اشتہار میں یہ بھی سوال کیا کہ تم علماء دیو بند میں مولانا حسین احمد

(۱) اشتہار، مولوی ثناء اللہ صاحب کے جواب الجواب پر تبصرہ

صاحب سے پوچھو کہ وہ معرفتِ تامہ رکھتے ہیں یا نہیں؟

مجیب نے اس سوال کو مدار فیصلہ قرار دیا ہے، میں کہتا ہوں مولانا حسین احمد (نجاہ اللہ من قید الفرنگ) کو پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ نے ان کو درس دیتے ہوئے دیکھا ہوگا، اگر نہیں دیکھا تو جب رہا ہوکر آئیں گے تو آپ دیکھ لیجئے گا وہ اپنے مذہب کا اثبات اور فریق مخالف کا ابطال معرفتِ تامہ سے کرتے ہیں یا معرفتِ ناقصہ سے۔ [(۱)]''

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں:

''مشتہرین نے مولانا حسین احمد صاحب سے دریافت کرنے کو لکھا ہے، اس کی ضرورت نہیں ہے، ہم مئو ہی کی جماعت احناف کو مخاطب کر کے پوچھتے ہیں کہ وہ اپنا حلفیہ بیان شائع کرے کہ ہمارے علماء کو مسائل شرعیہ کی معرفتِ تامہ نہیں ہے [(۲)]''

جب مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہ کو ان لوگوں میں شامل کیا جنھیں ان کے بقول دلائل کی معرفتِ تامہ حاصل تھی اور اس فہرست میں سوائے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے اس وقت کوئی حیات نہ تھا اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں کے جواب کو مدار فیصلہ بنا دیا، تو ہمارے نزدیک حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھ لینا انتہائی ضروری ہو چکا تھا۔ مگر مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''اس کی ضرورت نہیں'' یہ ضرورت شاید بلکہ یقیناً اس لیے نہیں تھی کہ مولانا ثناء اللہ صاحب کو یقین تھا کہ جواب

---

(۱) فتاویٰ ثنائیہ ج ۱ ص ۱۵۷۔ خیال رہے کہ محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں لکھا تھا، ہم نے اپنے اشتہار نمبر ۳ مطبوعہ الفقیہ ۲۱/اپریل ۷ مئی ۴۴ء میں بتایا کہ ہم حاضر ہوکر دیکھ چکے ہیں، وہ علماء اپنے درس میں مذہب حنفی کی حمایت اس بصیرت تامہ کے ساتھ کرتے ہیں جو ایک مقلد کا حصہ ہوسکتی ہے، لیکن وہ بصیرت تامہ جو ایک مجتہد کا حصہ ہوسکتا ہے وہ نہ ان کو حاصل ہے نہ ابن حزم کو نہ شوکانی کو نہ میاں صاحب کو، ہمارے اس جواب نے مولوی ثناء اللہ صاحب کے رخش قلم کی ساری جولانی ختم کردی اور وہ اس کے بعد اس سوال وجواب میں ایک حرف بھی نہ بول سکے، نہ ان کے اعوان وانصار ہی میں سے کوئی لب ہلانے کی جرأت کرسکا۔ اب اگر مولوی صاحب میں ذرہ برابر بھی حقانیت، دیانت اور انصاف ہوتا تو ان کو علی الاعلان اپنا سوال واپس لینا چاہئے تھا، اور بلاخوف لومۃ لائم ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا کہ ساری عمر جس شبہہ کو وہ حل نہ کر سکتے تھے ہم نے کتنی آسانی سے حل کر کے بڑی غلط فہمی سے ان کو نجات دلا دی، لیکن وہ بجائے انقیاد للحق کے اس فکر میں پڑ گئے کہ میرے علمی سوال نے میری علمی شہرت کا جنازہ نکال دیا، اب کوئی اور بات بنانی چاہئے (اشتہار غیر مقلد کی حقیقت ماخوذ فرقۂ غیر مقلدین ص ۱۶ مطبوعہ نوجوانان احناف مئو ناتھ بھنجن)۔

(۲) حوالہ مذکور

ان کے موافق نہ ملے گا اور ان کے ''علمی سوال'' کی مزید رسوائی کا سامان ہو جائے گا۔

آخر میدانِ بحث سے گریز وفرار نہیں تو اور کیا ہے؟

مئو کی جماعتِ احناف سے جس حلفیہ بیان کا مطالبہ ہوا اس کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے ''مسائل شرعیہ کی معرفتِ تامہ'' حالانکہ بحث یہ تھی کہ مسائل شرعیہ کے دلائل کی معرفتِ تامہ، دونوں میں فرق بالکل ظاہر ہے، یہاں بھی مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ میدان سے ہٹ رہے ہیں۔

کسی امام کا مقلد، اپنے امام کے کسی قول کے دلائل معلوم کر لینے کے بعد اسی کی روشنی میں اپنے امام کو مصیب اور دوسرے کو مخطی قرار دے، اپنے امام کے دلائل کے ذریعہ دوسرے امام کے اقوال کی تردید کرے تو تو یہ شخص صرف دلائل جان لینے اور اس کے اوپر پوری پوری بحث کر لینے کی وجہ سے امام کی طرح درجۂ اجتہاد پر فائز نہیں ہو سکتا، وہ صرف دلائل کا ناقل کہلائے گا نہ کہ مجتہد۔

لیکن مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم نوا غیر مقلد علماء محض دلائل کے جان لینے اور اس کی بنیاد پر دوسرے مذاہب پر رد کرنے والے کو درجۂ اجتہاد پر اٹھا دیتے ہیں کیونکہ خود کو بھی اتنے ہی پر اجتہاد کا اہل سمجھ بیٹھتے ہیں۔

اب ہم محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحریر پر بحث کا دائرہ سمیٹتے ہیں جو انھوں نے مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے ہی متعلق قلم بند کی ہے۔

> ''مولوی صاحب کو توضیح ص ۲۱ کی یہ عبارت بہت پہلے سنائی جا چکی ہے کہ **فإن العالم بمائة مسألة من ادلتها لا يسمى فقيهاً.** یعنی دلائل کے ساتھ سو مسئلے کا بھی عالم ہو تو وہ مجتہد نہیں کہلائے گا۔ اور مجتہد نہیں کہلائے گا تو لامحالہ مقلد کہلائے گا، پس معلوم ہوا کہ مسائل کو دلائل سے جاننے والا بھی مقلد ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔''(۱)

ردِ غیر مقلدیت پر دیگر کارنامے اور تصانیف:

ردِ غیر مقلدیت پر حضرت محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کے دو مباحث سامنے آئے، دونوں بحثوں کو کچھ تفصیل کے ساتھ ہم نے اس لیے پیش کیا کیونکہ ان پر نسبۃً کتابیں اور مضامین بہت کم لکھے گئے، غیر مقلدین کی طرف سے ان موضوعات کو اچھالا بہت جاتا ہے۔ دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ حضرت محدث

(۱) مولانا ثناء اللہ صاحب اور بحث تقلید ص ۱۱ شائع کردہ جمعیۃ الاحناف مئو ناتھ بھنجن

جلیل رحمۃ اللہ علیہ کا طریقۂ بحث اور طرز استدلال سامنے آجائے کہ وہ معترض کو کس طرح اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہیں کہ اسے فرار کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

ہم یہ بھی واضح کردیں کہ مذکورہ بالا مباحث پر محدث اعظمی کی بس جستہ جستہ تحریریں ہی سامنے لائی گئی ہیں، ورنہ صورتِ حال یہ ہے کہ:

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لیے

رد غیر مقلدیت پر محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کی دیگر تصانیف یہ ہیں۔

۱-استدراکات علی تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی للشیخ عبدالرحمٰن المبارکفوری

۲-رکعات تراویح (بیس رکعات تراویح کے موضوع پر)

۳-رکعات التراویح بردانور المصابیح

۴- **الأعلام المرفوعه فی حکم الطلقات المجموعه**

بیک وقت تین طلاق کے موضوع پر

۵- **الأزهار المربوعه فی رد الآثار المتبوعه** دوجلدیں

۶- رد تحقیق الکلام غیر مطبوعہ [1] قرأت خلف الامام کے موضوع پر غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری کے رسالہ کارد۔

رد غیر مقلدیت پر محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے مضامین ہفتہ وار'' العدل'' گوجرانوالہ (پاکستان) میں شائع ہوئے۔''رکعت تراویح'' اور اعلام مرفوعہ کی متعدد قسطیں ''العدل'' ۱۹۳۳ء و ۱۹۳۴ء کے مختلف شماروں میں شائع ہوئیں۔ کچھ مضامین ہفتہ وار ''الفقیہ'' امرتسر میں بھی چھپے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے رد غیر مقلدیت سے متعلق جس موضوع کو لیا، رد و تحقیق کا حق ادا کردیا۔ ان کی تحریریں اور تصانیف بعد والوں کے لیے ماخذ و مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

---

(۱) ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ص۱۴، ۱۵ اپریل و مئی ۱۹۹۲ء

رکعاتِ تراویح

تحقیق وتحریر: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی علیہ الرحمہ

تلخیص: مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی ☆

اردو داں طبقہ کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ حضرت محدث اعظمی نے اپنے بعد جو اپنے قیمتی وعلمی آثر چھوڑے ہیں وہ جہاں عربی زبان میں ہیں ان میں سے اردو زبان میں بھی کئی چیزیں اردو دانوں کے استفادہ کے لیے موجود ہیں، ان میں سے حضرت کی اردو تالیفات میں تراویح کی بیس رکعت کی سنیت وثبوت سے متعلق ایک رسالہ ہے، جو انتہائی جامع ومفید ہے، اور اپنے موضوع پر محدثانہ اصول کی رو سے بڑا محقق ومدلل ہے، اور کمال یہ ہے کہ اس کے باوجود نہ بہت مفصل ہے اور نہ ہی متفرق ابحاث پر مشتمل ہے، رسالہ ۱۳۷۷ھ میں خاص پس منظر اور تقاضے کی وجہ سے تیار کیا گیا تھا، ان صفحات میں اس رسالہ کی ضروری تلخیص پیش کی جارہی ہے۔

حاصل رسالہ:

محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ جزء اول میں حضرت نے ایک دعویٰ کیا ہے اور اس کو ثابت فرمایا ہے، اور جزء ثانی میں اہل حدیث حضرات کے دعویٰ کا تذکرہ کرکے اس کا مکمل رد فرمایا ہے۔

مولانا علیہ الرحمہ نے یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ عہد فاروقی سے کم از کم بیس رکعت تراویح پر امت کا عملاً اجماع چلا آرہا ہے۔

اور اہل حدیث حضرات کے جس دعویٰ کو رد فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ تراویح کی بیس رکعت کا بسند صحیح نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت ہے اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ودیگر خلفاء راشدین سے۔

☆ جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ، یوپی۔

تراویح کی بیس یا زائد رکعات پر عہد فاروقی سے امت کا اجماع:

محدث اعظمی علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ کی ابتدا مذکورہ اجماع کے دعویٰ اور اس کے اثبات سے کی ہے، فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے فرقۂ اہل حدیث نے رکعات تراویح کے بارے میں تقریباً سو برس سے جو شور وغوغا مچا رکھا ہے اس کا وجود پہلے کبھی نہیں تھا۔

تمام دنیائے اسلام میں بیس یا بیس سے زیادہ رکعتیں پڑھی جاتی تھیں .... نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے لے کر اس غوغا سے پہلے تک دنیا کی کسی مسجد میں تراویح کی صرف آٹھ رکعتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں یعنی

تقریباً ساڑھے بارہ سو برس تک مسلمانان اہلسنت بیس اور بیس سے زائد ہی کو سنت اور قابل عمل سمجھتے رہے۔ (۱)

اس کے بعد حضرت نے اس دعویٰ کے دلائل پیش فرمائے ہیں اور اخیر میں فرمایا ہے:

''بیس اور بیس سے زائد پر امت محمدیہ کے اس قدیم عمل درآمد کو سامنے رکھئے اور ائمہ سلف وخلف کے اس کو پسند اور اختیار کرنے کے مقابلے میں آٹھ رکعت پر عمل کو سامنے رکھئے اور کتابوں کی ورق گردانی کیجئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد سے تیرہویں صدی کے اواخر تک دنیائے اسلام میں کسی ایک جگہ بھی اس پر عمل ہونے کا ذکر آپ کو نہیں مل سکتا اور پوری قوت صرف کرنے کے بعد اس طویل مدت میں آٹھ پر عمل درآمد کی تصریح کہیں بھی نہیں دکھائی جا سکتی اور اس کا کوئی گھٹیا ثبوت بھی نہیں پیش کیا جا سکتا۔ (۲)

اور اس قسم کے اجماع کی کیا اہمیت ہے؟ اس کے لیے خطیب بغدادی کی کفایہ سے حضرت عبداللہ بن مبارک کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

إجماع الناس علی شئ أوثق فی نفسی من سفیان عن منصور عن إبراھیم عن علقمة عن ابن مسعود (۳)

---

(۱) رکعات تراویح ص ۳۱ (۲) ایضاً ص ۳۶
(۳) الکفایہ للخطیب ص ۴۳۴

یعنی ایک طرف کسی بات پر لوگوں کا اتفاق ہو اور دوسری طرف کوئی روایت جو بسلسلۂ سفیان از منصور از ابراہیم از علقمہ از ابن مسعود مروی ہو، تو باوجودیکہ یہ سلسلہ دنیا کی سب سے صحیح سندوں میں شمار ہوتا ہے، پھر بھی میرے نزدیک اس سے زیادہ قابل اعتماد لوگوں کا اتفاق ہے۔(۱)

اس دعوائے اجماع کو مدلل کرتے ہوئے حضرت نے ذکر فرمایا ہے کہ خلفاء راشدین میں سے حضرت ابوبکر کے بعد تینوں خلفاء کے عہد کا عمل اور حضرت عمر حضرت علی رضی اللہ عنہما کے حکم، نیز صحابہ میں سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وحضرت معاذ ابوحلیمہ رضی اللہ عنہ کا عمل یہی تھا، بعض اکابر تابعین، نیز حضرت نافع وامام مالک وغیرہ کے واسطے سے مدینہ منورہ ومکہ مکرمہ کا یہی تعامل ثابت ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ وحضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے اسود بن یزید واسود بن غفار، نیز حارث اعور کا عمل یہی تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سعید بن جبیر، وزرارہ بن ابی اوفی نیز مشہور تابعی حضرت ابومجلز کا عمل یہی تھا اور اس طرح بصرہ وکوفہ کا یہی تعامل ثابت ہوتا ہے، ائمہ اربعہ کے علاوہ سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مبارک حتی کہ داؤد ظاہری کا مذہب بھی یہی نقل کیا گیا ہے، اور ان نقول وبیان مذاہب کو ان الفاظ پر ختم کیا گیا ہے۔

''یہ تھے عہد فاروقی سے لے کر تیسری صدی کے تقریباً وسط تک کے علماء وائمہ کے مذاہب، رکعات تراویح کے باب میں، اور یہ تھا اس عہد کے مسلمانوں کا معمول، مکہ ومدینہ، کوفہ وبصرہ، بغداد اور بلاد خراسان میں''(۲)

اور اس کے خلاف اگر کچھ منقول ہے، جیسے سنن سعید بن منصور وغیرہ کی گیارہ پر حکم وعمل کی روایت، تو وہ یا تو ابتداء عہد پر محمول ہے، کہ ابتداءً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا ورنہ اصولاً ناقابل اعتبار ہے، تفصیل آگے آرہی ہے۔

اہل حدیث حضرات کا دعویٰ:

رسالہ کا دوسرا حصہ اور بقول حضرت اعظمی اصل رسالہ اور اصل بحث اہل حدیث حضرات کے دعویٰ اور اس کے رد کے سلسلہ میں ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں فرقہ اہل حدیث کا دعویٰ ہے کہ:

(۱) رکعات تراویح ص۴۴ (۲) ایضاً ص۴۵

۱-تراویح کی آٹھ ہی رکعتیں آنحضرت ﷺ سے بسند صحیح ثابت ہیں۔

۲-اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی آٹھ ہی کا حکم دیا ہے اور اس کے خلاف جو قول ہے خواہ بیس یا بیس سے زائد، وہ نہ تو آنحضرت ﷺ سے بسند صحیح ثابت ہے، اور نہ کسی ایک خلیفہ سے بسند صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے اس کا حکم دیا۔

ان حضرات کے دعویٰ میں چونکہ حضور ﷺ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں ہی سے آٹھ رکعات کے ثبوت کی بات کی گئی ہے، اس لیے ان کے دو دعویٰ قرار دیئے گئے ہیں اور حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کا الگ الگ جائزہ لے کر رد کیا ہے۔

حضور ﷺ وسلم سے آٹھ رکعت کا ثبوت:

اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر دو روایات پیش کی جاتی ہیں۔اول جو سب سے اہم دلیل ہے وہ بخاری وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مشہور روایت ہے کہ حضور ﷺ رمضان یا غیر رمضان کسی موقع پر شب میں گیارہ رکعت سے زائد نہیں پڑھا کرتے تھے۔اس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ:

اولاً تو اس روایت میں تراویح کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، تراویح رمضان کی راتوں کے ساتھ مخصوص نماز ہے اور یہ عام ہے، متعدد محققین کے بیان وعمل سے اس کی تائید ہوتی ہے، حافظ ابن حجر نے تہجد سے اس کا تعلق ذکر کیا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ وغیرہ جو کہ تراویح کی رکعات کے کسی معین عدد کے ثبوت کا موقف نہیں رکھتے ان کے موقف کا مقتضیٰ بھی یہی ہے۔اور ابن نصر نے اپنی معروف کتاب ''قیام اللیل'' میں تراویح سے متعلق باب کے اندر اس حدیث کا سرے سے کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے اور اکابر ومحققین کی ایک جماعت نے بچند وجوہ نماز تہجد ونماز تراویح کا الگ الگ ہونا ذکر کیا ہے اور ثابت کیا ہے۔

ثانیاً یہ کہ خود حضرت عائشہ سے ہی صحیحین وغیرہ کی بعض معروف روایات میں حضور اکرم ﷺ سے تیرہ رکعات نقل کی گئی ہیں، جس کی روشنی میں محققین حتی کہ اہل حدیث حضرات نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت عائشہ کی زیر بحث حدیث میں حضور اکرم ﷺ کی بعض یا اکثر راتوں کے عمل کا تذکرہ ہے، اس لیے بعض راتوں میں گیارہ سے زائد کا ثبوت ہوسکتا ہے اور وہ اس معروف روایت

کے معارض ومخالف نہ ہوگا۔

دوسری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، ان کی بھی دو روایات پیش کی جاتی ہیں، مگر حضرت اعظمی کی رائے میں ابن حبان وابن خزیمہ والی روایت ہی اصل ہے، اور خصوصیت سے رمضان کے متعلق ہے، اس میں رمضان کی کسی رات میں آٹھ رکعت اور تین رکعت پڑھانے کا تذکرہ ہے۔

اس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا ہے کہ رمضان میں باجماعت نماز تراویح ادا کرنے کو کئی صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے اور اس انداز میں کہ حافظ ابن حجر وغیرہ تعدد واقعہ کے قائل ہیں، مگر ان میں رکعات کی تعداد کا تذکرہ صرف حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے، جس کے بعض طرق میں اس کی بھی تصریح موجود ہے کہ ایک رات میں ایسا ہوا، گویا ہر مرتبہ نہیں، اور بقول طبرانی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے اس بیان کو صرف ایک شخص عیسیٰ بن جاریہ نے روایت کیا ہے، اور یہ شخص علماء رجال کے اختلاف کے باوجود راجح یہ ہے کہ مجروح ہے، اور نہ اس کا کوئی مؤید ہے اور نہ متابع اور مجموعی طور پر اس کی سند بقول علامہ نیموی متوسط نہیں بلکہ گھٹیا ہے[1] لہذا یہ لائق احتجاج نہیں ہوسکتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آٹھ ہی کے حکم کا ثبوت:

اہل حدیث حضرات کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح گیارہ رکعت کا ہی حکم دینا ثابت ہے، یعنی آٹھ تراویح کی اور تین رکعات وتر کی، جیسا کہ سائب بن یزید سے ان کے شاگرد محمد بن یوسف نے نقل کیا ہے، اور اسے امام مالک وسعید بن منصور وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

لیکن یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ یہ اثر اس لائق نہیں ہے کہ اس کو حجت بنایا جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سائب بن یزید کے شاگرد محمد بن یوسف کے واسطے سے اس اثر کو ان کے پانچ شاگردوں نے نقل کیا ہے اور ان پانچوں کے درمیان کافی اختلاف ہے، ایک تو عدد کا، کہ کوئی اکیس، کوئی تیرہ اور کوئی گیارہ نقل کرتا ہے، دوسرا یہ کہ بعض نے اس عہد کا عمل ذکر کیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم نہیں، حکم تو صرف امام مالک نے یا یحییٰ نے نقل کیا ہے، اور اگر واقعہ ایک ہونے کی وجہ سے حکم کا اعتبار ہر ایک کے بیان ونقل میں کرلیا جائے تو بھی عدد کا اختلاف ہے ۱۱-۱۳-۲۱ کا اور

---

(۱) رکعات تراویح ص ۱۵۴-۱۵۵

''ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ اگلے محدثین میں سے کسی ایک محدث سے بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے تیرہ اور اکیس کے مقابلہ میں گیارہ کو ترجیح دی ہے، محدثین نے اگر ترجیح دی ہے تو تیرہ یا اکیس کو، ورنہ یوں تطبیق دی ہے کہ پہلے گیارہ رکعتیں تھیں، بعد میں اضافہ کر دیا گیا، دیکھو مصابیح ص۴۴، زرقانی شرح مؤطا، وتحفۃ الاخیار ص۲۹۱۔''(۱)

بہرحال اس روایت کی بنیاد پر حضرت عمرؓ سے گیارہ کے ہی حکم کے ثبوت کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔

پھر جب کہ حضرت سائب بن یزید کے اس اثر کو ان کے ایک دوسرے شاگرد یزید بن خصیفہ نے بھی روایت کیا ہے، اس کو یزید سے ان کے دو شاگردوں نے روایت کیا ہے، ابن ابی ذئب اور محمد بن جعفر، اور دونوں نے ان سے بالاتفاق یہ نقل کیا ہے کہ عہد فاروقی میں لوگ بیس رکعات تراویح ادا کیا کرتے تھے، اس بیان میں محمد بن یوسف کے شاگردوں کی طرح یزید کے شاگردوں کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ابن ابی ذئب والی روایت بیہقی کی سنن کبریٰ میں ہے اور محمد بن جعفر والی بیہقی کی دوسری کتاب ''معرفۃ السنن والآثار'' میں ہے۔ اول کی سند کو امام نووی و امام عراقی وغیرہ نے اور دوسری کی سند کو علامہ سبکی و ملا علی قاری نے صحیح قرار دیا ہے۔(۲)

اس تحقیق کو پیش کرنے کے بعد حضرت محدث اعظمی فرماتے ہیں:

ایسی حالت میں اصول وانصاف کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یزید کی روایت پر اعتماد کیا جاتا اور اہلحدیث کے وجود سے قبل اس پر اعتماد کیا گیا۔ مگر حضرات اہلحدیث نے محمد بن یوسف کی مختلف فیہ و مشکوک روایت پر اعتماد کر کے انصاف کا جنازہ نکال دیا''(۳)

بیشک ابن ابی ذئب کی روایت میں ''ابن فنجویہ'' آئے ہیں، لیکن:

''ابن فنجویہ کی علمی شہرت اور محدثین میں ان کی مقبولیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت چاہئے کہ وہ بھی سنن نسائی کے اس نسخہ کے جو ہندوستان میں متداول ہے ایک راوی ہیں جنھوں نے ابن السنی سے اس کو سنا ہے''۔(۴)

(۱) رکعات تراویح ص۱۹۳ (۲) رکعات تراویح ص۱۹۵-۱۹۴ بحوالہ تحفۃ الاحوذی ج۲ ص۷۵
(۳) ایضاً ص۱۹۵ (۴) رکعات تراویح ص۲۰۱

اور ابن الصلاح وخطیب وغیرہ کی تصریح کے مطابق اس قسم کے معروف محدثین ورواۃ کی ثقاہت کے لیے ائمۂ فن کی طرف سے باقاعدہ تصریح کی ضرورت نہیں ہوتی، ذہبی ابن الاثیر، سمعانی وغیرہ سب نے ان کا تذکرہ کیا ہے، بلکہ ابن الاثیر نے ان کو ''حافظ'' کہا ہے اور بیہقی نے سنن کبریٰ میں ان سے بکثرت روایات لی ہیں۔ (۱)

اس صورت حال میں ان کو مجہول کہہ کر روایت کو غیر معتبر قرار دینا درست نہیں ہے۔

محمد بن جعفر والی روایت کی سند میں ابوطاہر اور ابوعثمان آئے ہیں، ابوطاہر کو سبکی وغیرہ نے ''امام اصحاب الحدیث'' اور ''امام المحدثین والفقہاء'' جیسے القاب سے یاد کیا ہے، ان کو نیشاپور کے لوگوں نے منصب قضاء ومشیخت تفویض کیا، ظاہر ہے کہ یہ چیز تو دو چار کی توثیق سے کہیں بڑھ کر ہے، خطیب نے اپنی کتاب کفایہ میں اس انداز کی تصریح کی ہے۔ (۲)

ابوعثمان جن کا نام عمرو بن عبداللہ ہے وہ بھی ذہبی وغیرہ کے ذکر کردہ بعض اصول وقواعد کے مطابق ثقاہت کی عدم تصریح کے باوجود معتمد ہیں اور ان کی روایت صحیح ہے۔ (۳)

پھر یہ کہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کی مؤید ہیں اور بالخصوص سنن کبریٰ کی روایت جس کی سند کی تصحیح نووی وعراقی وغیرہ جیسے ائمۂ فن نے کی ہے، وہ معرفۃ السنن والی روایت کی مؤید ہے۔ اور ان کی صحت وقوت کو دیکھتے ہوئے محمد بن یوسف والی روایت کو ان کا معارض نہیں کہا جاسکتا، بلکہ یہ اس کے مقابلے میں راجح ہیں، یا پھر بقول ابن عبدالبر وبیہقی وغیرہ یہ توجیہ کی جائے گی کہ

''پہلے وہ لوگ گیارہ رکعات پڑھا کرتے تھے، اس کے بعد بیس رکعات تراویح اور تین رکعت وتر پڑھنے لگے''(۴)۔

---

(۱) ایضاً ص ۱۹۷ تا ۲۰۲ (۲) رکعات تراویح ص ۲۲۲-۲۲۱
(۳) ایضاً ص ۲۲۹ (۴) ایضاً ص ۲۳۲-۲۳۱

امام ربانی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

سلسلۂ بیعت، زہد واخلاق

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب☆

رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کار نبوت کے جو تین فرض عطا ہوئے ہیں: تلاوت احکام، تعلیم کتاب وحکمت، اور تزکیہ، یہ تینوں فرض امت مسلمہ پر بھی بطور کفایہ عائد ہیں۔ چنانچہ قرناً بعد قرنٍ اکابر ائمہ امت نے ان تینوں فریضوں کی ادائیگی میں پوری توجہ اور کوشش مبذول فرمائی ہے اور انھیں کے مجاہدات کا نور ہے جس سے کاشانۂ اسلام میں روشنی ہے، نبوت کے یہ تینوں فرض اس آیت میں یکجا ہیں:

رَسُولاً مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوا عَلَيۡهِمۡ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتَابَ وَالۡحِكۡمَةَ

ایک رسول انھیں میں سے جو اللہ کی آیتوں کو پڑھ کر سناتا اور ان کو پاک وصاف کرتا اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ان تینوں فرائض کو بحسن وخوبی انجام دیا، لوگوں کو احکام الٰہی اور آیات ربانی پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب الٰہی اور حکمت ربانی کی باتیں سکھائیں اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنی صحبت، فیض تاثیر اور طریق تدبیر سے پاک وصاف بھی کیا۔ نفوس کا تزکیہ فرمایا۔ قلوب کے امراض کا علاج کیا اور برائیوں اور بدیوں کے زنگ اور میل کو دور کر کے اخلاق انسانی کو نکھارا اور سنوارا۔ یہ دونوں ظاہری وباطنی فرض یکساں اہمیت سے ادا ہوتے رہے، چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کے تین قرنوں تک یہ دونوں ظاہری وباطنی کام اسی طرح توأم رہے، جو استاد تھے وہ شیخ تھے، اور جو شیخ تھے وہ استاذ تھے، وہ جو مسند درس کو جلوہ دیتے تھے وہ خلوت کے شب

☆ کھیری باغ روڈ، مئو

زندہ دار اور اپنے ہم نشینوں کے تزکیہ وتصفیہ کے بھی ذمہ دار تھے، ان تینوں طبقوں میں استاد اور شیخ کی تفریق نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد وہ دور آنا شروع ہوا جس میں مسند ظاہر کے درس گو، باطن کے کورے اور باطن کے روشن دل، ظاہر سے عاری ہونے لگے اور عہد بعہد ظاہر و باطن کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی، تا آنکہ علوم ظاہر کے لیے مدارس کی چہار دیواری اور تعلیم وتزکیۂ باطن کے لیے خانقاہوں اور رباطوں کی تعمیر عمل میں آئی اور وہ مسجد نبوی جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے، اس کی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں تقسیم ہوگئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس سے علماء دین کی جگہ علماء دنیا نکلنے لگے اور باطن کے مدعی علم شریعت کے اسرار وکمالات سے جاہل ہوکر رہ گئے۔

تاہم اس دور کے بعد بھی ایسی مستثنٰی ہستیاں پیدا ہوتی رہیں، جن میں نور نبوت کے یہ دونوں رنگ بھرے تھے اور غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں جن بزرگوں سے فیوض پہنچے اور پھیلے وہ وہی تھے جو ان دونوں کے جامع تھے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جن سے علم معقول ومنقول نے جلوہ پایا، علم حقیقت نے بھی انھیں کے ذریعہ ظہور پایا۔ حضرت شیخ ابوالنجیب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف شیخ طریقت ہیں تو دوسری طرف مدرسہ نظامیہ کے مدرس۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ امام وقت اور شیخ طریقت دونوں ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کو علماء ظاہر سمجھا جاتا ہے جیسے حضرات محدثین امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ، ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ وہ بھی اس جامعیت سے سرفراز تھے۔ متوسطین میں علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن قیم رحمہما اللہ کو ناواقف باطن سے خالی سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے احوال وسوانح ان کی برکات باطنی سے لبریز ہیں۔ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی ''منازل السالکین'' وغیرہ کتابیں پڑھئے تو اندازہ ہوگا کہ وہ آرائش ظاہر اور جمال باطن دونوں سے آراستہ تھے۔

ہندوستان میں جن بزرگوں کے دم قدم سے اسلام کی روشنی پھیلی وہ حقیقت میں وہی تھے جن کی ذات میں مدرسہ اور خانقاہ کے کمالات کی جامعیت تھی کہ وہ اسوۂ نبوت سے قریب تر تھے۔ اس لئے ان کا فیض بعید سے بعید تر حصہ تک پھیلتا چلا گیا۔ آسمان دلی کے مہر و ماہ اور تارے شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ تک کو آپ ایک ایک کر کے دیکھیں تو ظاہر و باطن کے علوم والوں کی یکجائی کا نظارہ آپ کو ہوگا اور اس سے ان کے علمی وروحانی برکات کی وسعت کی حقیقت

آشکارا ہوجائے گی۔ وہ علوم کی تدریس کے وقت **یعلمهم الکتاب و الحکمة** کا جلوہ دکھاتے تھے اور حجروں میں بیٹھ کر ''**یزکیهم**'' کی جلوہ ریزی فرماتے تھے۔

پھر ان کے بعد ان کے فیوض و برکات کے جو حامل ہوئے، جن کی نشاں دہی چنداں ضروری نہیں کہ ''**سیما هم في وجوههم من اثر السجود.**'' ان سے دنیا کو جو فیوض پہنچا اور دین کی اشاعت و تبلیغ اور قلوب و نفوس کے تزکیہ و تصفیہ کا جو کام انجام پایا وہ بھی ظاہر و باطن کی اسی جامعیت کے آئینہ دار تھے اور آئندہ بھی سنن الٰہیہ کے مطابق دین کا فیض جن سے پھیلے گا وہ وہی ہوں گے جن کے اندر مدرسیت اور خانقاہیت کی دوسوتیں ایک چشمہ بن کر بہیں گی ''**مرج البحرين يلتقيان**'' آنکھوں کا نور شب بیداری سے بڑھتا اور زبان کی تاثیر ذکر کی کثرت سے پھیلتی ہے۔ رات کے راہب ہی اسلام میں دن کے سپاہی ثابت ہوئے ہیں۔ سوانح و تراجم کا سیزدہ صد سالہ دفتر اس دعویٰ کا شاہد ہے۔ زبان کی روانی اور قلم کی جولانی دل کی تابانی کے بغیر سراب کی نمو سے زیادہ نہیں خواہ وہ اس وقت کتنا ہی تابناک نظر آتا ہو مگر وہ مستقل اور مستقبل وجود سے محروم ہے۔

''پیام برقوم'' از علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی دینی دعوت ص ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳)

''دل کی تابانی'' کے حصول کے لیے قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو بیک وقت محدث، مفسر، فقیہ اور صوفی ہیں تحریر فرماتے ہیں:

> بداں اسعدک اللہ تعالیٰ ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورت ایمان و اسلام و شریعت است و مغز و حقیقت او در خدمت درویشاں باید جست (مالا بدمنہ۔ کتاب الاحسان)
>
> جانو! اللہ تعالیٰ تم کو نیک بخت بنائے کہ یہ بیاں جو گذرا یہ تو ایمان و اسلام اور شریعت کی ظاہری صورت تھی، باقی اس کا مغز درویشوں کی خدمت میں تلاش کرنا چاہئے۔

پھر ذرا آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

> نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جست و بداں نور سینۂ خود را روشن باید کرد (ایضاً)
>
> پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو بزرگوں کے سینے سے حاصل کرنا چاہئے اور اس نور سے

اپنے سینے کو روشن اور منور کرنا چاہئے۔

امام ربانی حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت:

''تذکرۂ مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ'' (مرتب حضرت مولانا قمرالزماں صاحب دامت برکاتہم خلیفہ اعظم حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ) کے مقدمہ میں امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''وہ میری زندگی کے نہایت مسعود و مبارک لمحات ہیں جو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں گذرے، مجھے حاضری کی سعادت پہلی بار اس وقت حاصل ہوئی جب دارالعلوم دیوبند میں طالب علمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ۱۳۳۷ھ میں غالباً ذی الحجہ کی تعطیل میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی زیارت کے مقصد سے حاضری ہوئی تھی، مگر خوش قسمتی سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔ پہلے سے جانے پہچانے متوسلین میں اس وقت حضرت مولانا فتح پوری صاحبِ سوانح اور خواجہ صاحب (مجذوب تخلص) خانقاہ میں موجود تھے، مولانا فتح پوری حضرت اقدس کی نشست گاہ کے پیچھے ایک تنگ حجرہ میں سامنے ذرا داہنے کو ہٹ کر بیٹھنے پر مامور تھے اور وہیں حضرت کے ملفوظات قلمبند کرتے تھے، مولانا فتح پوری کو کئی دن تک دیکھنے اور وقتاً فوقتاً اپنی قیام گاہ پر آنے جانے، ملنے اور بات کرنے کا موقع ملا۔ عصر کے بعد خانقاہ کے دروازہ پر ایک چائے خانہ میں چائے پینے اور گفتگو کی بھی نوبت آئی۔ جس شب میں بعد نماز مغرب میں شرف بیعت سے مشرف ہوا تھا اس کے بعد والے دن میں غالباً بعد عصر حضرت مولانا فتح پوری نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب! مولوی حبیب الرحمٰن صاحب سے مٹھائی وصول کرنی چاہئے، ان کو حضرت نے زمانہ طالب علمی میں بیعت کرلیا، حالانکہ حضرت ایسا نہیں کیا کرتے یہ ان کی خصوصیت ہے''۔

(تذکرہ مصلح الامت ص: د-ہ)

یہ خصوصیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بالعموم بچوں اور طالب علموں کو بیعت نہیں کرتے تھے، فراغت

اور تکمیل کے بعد اس کی اجازت ہوتی تھی، مگر مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے غیر معمولی حالات کی بناء پر ان کی خواہش و درخواست پر بیعت کرلیا تھا''۔

(حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی دینی دعوت، ص:۵۴)

ایک غلطی کا ازالہ:

ابھی حال ہی میں ایک کتاب ''بزرگوں کے خطوط بنام مولانا سید سلمان حسینی ندوی'' نظر سے گزری ہے، مرتب محمد عبدالرشید ندوی ہیں۔ ''بزرگوں پر توضیحی حواشی'' محمود الحسن ندوی نے لکھے ہیں، ان حواشی پر مولانا سید سلمان حسینی کی ''سند'' ملاحظہ ہو:

''بزرگوں پر توضیحی حواشی کا کام عزیزم محمود حسن حسنی سلمہ کے سپرد کیا گیا تھا، جس کو انھوں نے بخوبی انجام دیا'' (ایضاً ص ۶)۔ حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے ''توضیحی حواشی'' کے تحت رقم طراز ہیں:

''بیعت وسلوک کا باقاعدہ تعلق عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ سے قائم کیا اور ان کے خلیفہ ہوئے''۔ (بزرگوں کے خطوط ص ۲۴)

تحقیق کے لیے آبلہ پائی اور کوہ کنی کی ضرورت ہے، اس راہ پُر خار میں سرسری مطالعے اور ظنیات کی کوئی حیثیت نہیں ہے، حیرت ہے کہ مولانا سید سلمان حسینی جیسے بلند پایہ عالم نے کس طرح ''عزیزم محمود حسن حسنی'' پر اعتماد کیا اور ایک غلط اور غیر محققانہ بات لکھنے کے باوجود ''بخوبی انجام'' دینے کی سند بھی عنایت فرمادی۔

امام ربانی حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق سے محمود حسنی صاحب کا یہ حاشیہ اس لیے زیادہ افسوسناک ہے، کہ یہ تحریر ''حیات ابوالمآثر'' کی طباعت کے بارہ سال بعد لکھی گئی ہے اور ضلع مئو کے قریب لکھنؤ میں مقیم شخص نے سپرد قلم کیا ہے، پھر بھی محشی نے مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی۔

امام ربانی مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کے تعلق سے ایک دوسری تحریر بھی پڑھ لیں:

حافظ سید محمد اکبر شاہ بخاری (کراچی) تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کا صوفیانہ مسلک حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک ہے، آپ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور انہی کے مسلک ومشرب پر قائم رہے،

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی بہت عزت کرتے تھے جیسا کہ ''التنقید السدید'' کی تقریظ سے اوراس تحریر سے جو حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی معرکۃ الآرا کتاب ''نصرۃ الحدیث'' پڑھ کر آپ کو بھیجی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز متوسلین میں شمار کیے جاتے ہیں اور انہی کے اصول کے مطابق زندگی گذاری ہے''۔

(کاروان تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ص ۲۳۰ مطبوعہ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ = دسمبر ۱۹۹۷ء)

مندرجہ بالا تحریر ''حیات ابوالمآثر'' کی طباعت کے تین سال قبل لکھی گئی ہے اور محقق ہندوستان (لکھنؤ) کے بجائے پاکستان (کراچی) سے تعلق رکھتے ہیں؛ لیکن کس قدر تلاش، جستجو اور تحقیق کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد احمد پرتا بگڈھی رحمۃ اللہ علیہ سے نہ بیعت تھے اور نہ ان کے خلیفہ تھے۔ دونوں بزرگوں کا تعلق ایک دوسرے سے نیاز مندانہ تھا۔ راقم سطور جس وقت تعلیم کے سلسلہ میں الہ آباد میں مقیم تھا، اسی زمانہ میں ایک دن اپنے شیخ واستاد حضرت مولانا حافظ شاہ محمد قمر صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم کے ہمراہ حضرت پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جو اس وقت سیوئیں منڈی میں مقیم تھے، بعد نماز عصر حاضری ہوئی۔ سبھی لوگ نیچے بیٹھے ہوئے تھے، حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ایک تخت پر استراحت فرمارہے تھے اور مولوی لئیق صاحب مرحوم حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا پیر دبا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد راقم نے دیکھا کہ حضرت پرتاب گڈھی رحمۃ اللہ علیہ اپنی نشست گاہ سے اٹھ کر حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے تخت کے پاس آئے اور آپ کا پیر دبانے لگے، تھوڑی دیر کے بعد مولوی لئیق مرحوم سے یہ فرما کر چلے گئے کہ ''مولوی لئیق ذرا اچھی طرح دباؤ''۔

اجازت وخلافت:

حضرت مولانا قمر الزماں صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا اعظمی کی آمد ورفت برابر حضرت مصلح الامت کی خدمت میں رہی اور جانبین سے بہت ہی خاص تعلق تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ آپ کی ضیافت کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ کو آپ سے غایت تعلق ومحبت تھی، چنانچہ ایک مکتوب کے ضمن میں یہ تحریر فرمایا ہے:

گر بسر وچشم من نشینی　　　　نازت بکشم کہ نازنینی

آپ کی رضا، مرضی، خوشنودی ملحوظ رکھوں گا، آپ کو راضی کر کے عندیہ معلوم کر کے کام کروں گا۔ زیادہ کیا عرض کروں میرے لیے دعا فرمایئے کہ آپ لوگوں سے محبت کروں۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ (تذکرہ مصلح الامت حصہ دوم: ۱۹۵،۱۹۴)

ایک دوسرا والا نامہ جسے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عزیز خاص سے لکھوا کر ارسال فرمایا ہے، جس سے آپ کے غایت درجہ وثوق واعتماد کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

''مخدومنا المکرّم حضرت مولانا صاحب مد فیوضہم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

الحمدللہ حضرت والا دامت برکاتہم بخیر وعافیت ہیں اور فرمارہے ہیں کہ خادم آپ کی خدمت میں لکھے کہ اسی سفر کے دوران قیام میں بعد مغرب بیت الخلا جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ علماء حضرات میرے پاس آگئے تو آپ نے فرمایا کہ آپ بیت الخلاء تشریف لے جائیں جب تک میں آپ کی نیابت کروں گا، میں تو آپ سے کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ مگر چونکہ آپ نے خود ہی فرمایا ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ آپ میری غیر موجودگی میں میری نیابت کریں اور میرا یہ خط میرے چند مخلص حضرات کو بھی دکھلا دیں۔ مثلاً قاری صاحب، مفتی صاحب، حافظ یعقوب صاحب، بابا محمد خلیل صاحب، سیٹھ صاحب وغیرہ کو۔ والسلام

(دستخط عزیز خاص) (تذکرہ مصلح الامت جلد اص: ی)

دیکھیے کس لطیف انداز میں حضرت مصلح الامت رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو اجازت وخلافت سے نوازا:

''میں تو آپ سے کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ مگر چونکہ آپ نے خود ہی فرمایا ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ آپ میری غیر موجودگی میں میری نیابت کریں''۔

یہ جملہ کس قدر تواضع اور فنائیت سے لبریز ہے اور اس سے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت اور قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اب آخری ملاقات کی کیفیت خود حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ سے سنئے، تحریر فرماتے ہیں:

''۱۳۸۷ھ میں حرمین کا شوق غالب آیا اور ۱۱ رشعبان ۱۳۸۷ھ کو مظفری جہاز سے حجاز کے لیے روانہ ہوئے، یہ ناچیز ان کی مشایعت اور رخصت کرنے کی غرض سے جہاز میں ان سے ملاقات کرنے گیا اور دو گھنٹہ وہاں رہا، رخصت کے وقت دیر تک معانقہ کیا، حضرت شیخ نے اپنی حد درجہ محبت و شفقت کی وجہ سے ناچیز کے سر اور ہاتھ کا بوسہ دیا اور عطر عود کی ایک شیشی ہدیہ کی، ناچیز اسی دن بمبئی سے روانہ ہوا اور جمعہ کے دن مئو وارد ہوا، سنیچر کے دن مغرب کے بعد آٹھ بجے یہ خبر پہنچی کہ مولانا نے جہاز میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، یہ خبر بمبئی سے بذریعہ ٹیلیگرام ہوئی تھی، مت پوچھو کہ اس خبر سے مجھ پر کیا گذری''

(حیات ابوالمآثر جلد ۱ ص ۶۸۹)

زہد و استغناء:

یہ علماء ربانی اور مشائخ حقانی کی سب سے نمایاں صفت ہے، جو انھیں علماء سوء سے ممتاز کرتی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تحریر بھی نقل کر دی جائے جو امام موصوف نے علماء سوء کی تعریف میں تحریر فرمائی ہے:

وقد ورد في العلماء السوء تشديدات عظيمة دلت على أنهم أشد الخلق عذاباً يوم القيامة فمن المهمات العظيمة معرفة العلامات الفارقة بين علماء الدنيا وعلماء الآخرة، ونعني بعلماء الدنيا علماء السوء الذين قصدهم من العلم التنعّم بالدنيا والتوصُّل الى الجاه والمنزلة عند أهلها (تالیفات مصلح الامت ج ۱ ص ۱۷۷)

ترجمہ: اور قرآن و حدیث میں علماء سوء کے بارے میں ایسی ایسی سخت وعیدیں آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز سب لوگوں سے زیادہ انہی کو عذاب ہوگا، لہٰذا ان علامات کا جاننا اشد ضروری ہوا جو علماء دنیا کو علماء آخرت سے جدا کرتی ہیں، اور ہماری مراد علماء دنیا سے وہ علماء سوء ہیں جن کا مقصد اپنے علم (دین) سے محض دنیاوی راحت و آرام ہے اور اسے جاہ طلبی کا ذریعہ بنانا ہے، یا

اس کے ذریعہ سے اہل جاہ کی نظروں میں وقیع بننا ہے۔

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی عالم ربانی اور شیخ حقانی کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے، حب مال اور حب جاہ سے کوسوں دور تھے، نام ونمود اور شہرت سے بے نیاز تھے، محض إن أجري الا علی اللہ پہ نظر تھی۔ ان کی زندگی میں عرب وعجم کی طرف سے کئی ایک مناصب جلیلہ اور بڑی اونچی تنخواہیں پیش کی گئیں، لیکن اس مرد درویش نے ہمیشہ باوجود تنگی وعسرت کے ''ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم'' کو اپنا شعار بنائے رکھا، اور بوریہ نشینی کو عیش وعشرت کی زندگی پر ترجیح دی ؎

گو ہَوا ہے تند وتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہاہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

یہاں حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات مبارکہ سے زہد واستغناء کے چند واقعات ہدیہ ناظرین ہیں:

۱:-حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ رقم طراز ہیں:

امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ندوۃ المصنفین کی طرف سے 'ترجمان السنۃ' کی تصنیف وتالیف کا کام کر رہے تھے، لیکن اس کام کی رفتار اتنی سست تھی کہ ارباب ندوۃ المصنفین کو اس کی تکمیل کے سلسلے میں برابر فکر لاحق تھی، اس صورت حال کے پیش نظر ندوۃ المصنفین کے اس وقت کے ناظم حضرت مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم نے حضرت والد صاحب سے درخواست کی کہ آپ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں، اور اس کے لیے انھوں نے اس زمانہ کے لحاظ سے ایک معقول حق الخدمت کی پیش کش کی، لیکن والد صاحب اپنے مشاغل اور خاص مزاج کی وجہ سے اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اسی اثنا میں والد مرحوم کے رفیق اور دوست حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کسی کام کے لیے دہلی گئے۔ وہاں مولانا عثمانی صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تو مولانا عثمانی کہنے لگے کہ مولانا -یعنی والد مرحوم- کے پاس کھیت اور زمین جائداد وغیرہ بہت زیادہ ہے کیا؟ مولانا ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رہائشی مکان کے علاوہ مولانا کے پاس کھیت اور جائداد کے نام پر ایک انچ زمین بھی نہیں ہے، یہ جواب سن کر مولانا عثمانی ورطۂ حیرت میں پڑ گئے کہ اس کے باوجود اتنی بڑی پیشکش کو رد کر دیا! مولانا ایوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نے فرمایا کہ مولانا کا بس یہی خاص مزاج ہے۔(حیات ابوالمآثر جلد ثانی ص ۲۴)

۲:-حضرت مولانا سید محمد یحییٰ صاحب ندوی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا(سعید احمد)اکبرآبادی حضرت کے بے حد قدرداں تھے،اور حضرت اعظمی بھی ان سے بہت بے تکلف تھے،مولانا اکبرآبادی نے آپ سے عرض کیا کہ مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس کے عہدے سے سبکدوش ہورہے ہیں،آپ اس منصب کو قبول فرمالیں، یہاں آپ کے ذوق کے مطابق ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ ہے،جس میں بہت سے مخطوطات ونوادرات کا ذخیرہ ہے،حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مولوی سعید!میں ملازمت نہ کرنے کا عہد کرچکا ہوں۔

مدرسہ عالیہ کی صدر مدرسی کوئی معمولی عہدہ نہیں تھا،منصب وجاہ دنیا سے حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی بے رغبتی وبے نیازی کا یہ پہلا نقش تھا جو میرے لوح قلب پر مرتسم ہوگیا(ایضاً ص ۳۰،۲۹)

۳:-علامہ ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے دیوبند تشریف لے جارہے تھے،راستے میں لکھنؤ میں قیام فرمایا،میں اس وقت ندوہ میں بحیثیت مہمان مقیم تھا،حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اپنے عزیز شاگرد مولانا منظور نعمانی کے یہاں تھا............ کچھ دنوں کے بعد حضرت پٹنہ تشریف لائے تو میں نے پوچھا کہ حضرت مولانا ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صدر مدرسی کا عہدہ کن کے سپرد ہوا،فرمانے لگے کہ مولانا عبدالصمد اور مولانا منت اللہ میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ صدر مدرسی کا عہدہ قبول فرمالیں،آپ کے علاوہ کوئی اور اس کا حقدار نہیں ہے،میں نے کہا کہ آپ لوگ یہ عہدہ میرے سپرد کررہے ہیں،اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری اہلیت اور صلاحیت کے معترف ہیں،تو آپ لوگوں کے اس اعتماد کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ اس کے مجھ سے زیادہ حقدار مولانا فخرالدین ہیں،اس لیے ان ہی کے سپرد کردیا جائے،اور پھر اسی پر مجلس شوریٰ نے فیصلہ کردیا،اس طرح ایک بار پھر حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کے اہم منصب کو خوش اسلوبی سے ٹال دیا۔(ایضاً ص ۳۵)

۴:-ایک دفعہ مشکلات نے اس طرح چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا کہ صرف آپ کے مقربین ومخصوصین ہی کو اس کا علم تھا،اس وقت مفتی ظفیر الدین صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ مولوی یحییٰ یہ میرے استاذ ہی کا دل وجگر ہے کہ صبر وشکر اور استغنا کے ساتھ اس کا تحمل کررہے ہیں،ان ہی

حالات اور شیخ الازہر کی پیشکش ہی کے زمانے میں کویت کی طرف سے موسوعہ فقہیہ کی ترتیب کے لیے وہاں سے آپ کے پاس نہایت اونچی تنخواہ اور رہائشی سہولیات کے ساتھ کویت میں قیام کے لیے دعوت آئی، تو ملاقات ہونے پر احقر نے عرض کیا کہ حضرت آپ کویت والی دعوت قبول کیوں نہیں فرما لیتے؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمھاری ہی طرح دوا اور دنیاداروں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا، پھر فرمایا کہ مولوی یحییٰ! یہ صحیح ہے کہ اگر میں وہاں چلا جاؤں تو تمھاری خانقاہ کے احاطے سے بڑا میرا احاطہ ہو جائے گا۔ مصر کے لیے شیخ الازہر کی پیشکش پر بھی میں نے وہاں جانے کی ترغیب دینی چاہی تو اس وقت بھی اسی طرح بے نیازانہ جواب دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف قناعت واستغناء بلکہ غیرت وخودداری کے بھی نہایت بلند مقام پر فائز تھے۔ (ایضاً ص ۳۷، ۳۱)''

حسن اخلاق:

درج ذیل واقعات راقم سطور کے ذاتی مشاہدات ہیں جنھیں آپ پڑھ کر حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم الشان اخلاق کا اندازہ کر سکتے ہیں، جو صحیح معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی جانشین کے ہی اخلاق ہو سکتے ہیں۔

۱:- جس وقت نند گنج غازیپور میں راقم سطور کا مطب تھا، حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ مئو سے بنارس جاتے اور لوٹتے وقت اکثر وبیشتر اس ناچیز کے مطب میں قدم رنجہ فرماتے اور خدمت کا موقع عنایت فرماتے اور مطب کی ایک معمولی بنچ پر بے تکلف لیٹ کر استراحت فرماتے۔ شہنشاہ علم وزہد کی یہ تواضع قابل دید تھی۔

۲:- ایک مرتبہ غازیپور میں جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے ہوئے تھے، ماہر امراض چشم ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری کے گھر پر قیام تھا۔ ہم لوگ تقریباً ۷-۸ نفر نند گنج سے حضرت سے ملاقات کی غرض سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ پر حاضر ہوئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ایک کپ چائے آئی۔ حضرت نے ایک یا دو گھونٹ پی کر چائے کی پیالی ناچیز کی طرف بڑھا دی اور فرمایا کہ میرے لئے اتنی کافی ہے، ہم لوگوں نے ایک ایک دو دو گھونٹ بطور تبرک پی کر ختم کر دیا۔ غور فرمائیں مسافرت میں بھی لوگوں کی دلجوئی کا کس قدر اہتمام ہے۔

۳:- ایک بار حضرت رحمۃ اللہ علیہ بنارس سے واپس ہوتے ہوئے نند گنج مطب میں تشریف لائے،

حضرت کو استنجا کی حاجت تھی، فراغت کے لیے مطب کے قریب ایک غیر مسلم کے گھر لے گیا، فارغ ہونے کے بعد جب حضرت کو لے کر باہر آیا تو دیکھا کہ کار حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو لینے کے لیے گھر کے باہر کھڑی ہے، تب مجھے احساس ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ضعف زیادہ ہے اور دور چلنا پڑ گیا، بہت زیادہ ندامت کا احساس ہو، الیکن حضرت کے چہرے پر کسی قسم کے ناگواری کے آثار نہیں تھے۔ مئو حاضر ہونے پر احقر نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! تکلیف ہوئی معاف فرمائیں گے۔ فرمایا تکلیف تو ہوئی لیکن کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ اب بھی جب کبھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو عجیب کیفیت ہوتی ہے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق کریمانہ یاد آتے ہیں ۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں   اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

۴:-۱۹۸۴ء میں مئو میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، بہت سے مسلمان جیل میں تھے۔ اس کے بعد مئو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ناچیز کی موجودگی میں ایک صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دینے آئے تھے، حضرت نے ان صاحب سے فرمایا کہ بہت سے لوگ جیل میں بند ہیں اور دعوت کھانے سے انکار فرمایا۔ اس واقعہ سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شفقت علی الخلق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۵:-مظہر العلوم بنارس میں ختم بخاری کی تقریب تھی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مئو سے بنارس جاتے ہوئے احقر کے مطب کے سامنے گاڑی رکوائی اور فرمایا کہ آج مظہر العلوم میں بخاری کا ختم ہے، احقر نے عرض کیا کہ حضرت! حاضر ہوں گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی محبت کو کیا کہوں صرف اتنی اطلاع فرما کر تشریف لے گئے۔

۶:-ایک بار مئو حاضر خدمت ہونے پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیفات ''**التنقید السدید**'' ''**دفع المجادلة**''، اور ''ارشاد الثقلین'' عنایت فرمائیں، جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی محبت کی یادگار ہیں اور ناچیز کے پاس محفوظ ہیں۔

ذکر حبیب
(کچھ یادیں کچھ تأثرات)

مولانا عطاء الرحمٰن عطاء مفتاحی☆

مخدوم گرامی!

اثرک اللّٰہ علی اھل الزمن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

المآثر کا دوسرا شمارہ نظر نواز ہوا، نگاہوں نے عقیدت کے سجدے لٹائے، معنوی خوبیوں کا اعتراف تو اہل کمال فرمائیں گے، ظاہری محاسن پر دل مرحبا کہتا رہا۔ رب کریم اسے قبول تام بخشے اور اہل علم وفن کی توجہات اور محبتوں کا مرکز بنائے۔ (آمین)۔

ایک نظم آج سے چار سال قبل لکھی تھی، بھیج رہا ہوں، حال کے صیغے کو ماضی سے تبدیل کرتے ہوئے دل جن کیفیات کا شکار ہوا ہے انھیں بیان نہیں کرسکتا۔ **لو اقسم علی اللّٰہ لأبرہ** کا ذکر کتابوں میں آیا ہے۔ حضرت اقدس رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کی ذات بابرکات کے طفیل اس کا مشاہدہ میرے قصبہ کے سینکڑوں افراد اور خود میری گنہگار آنکھوں نے کیا۔ غالباً ۸۱ء کا جون تھا، حضرت مخدوم اپنے اس خاک پا کی حقیر دعوت پر پورینی تشریف لائے، وہی چوہے اور اونٹ والی مثال تھی، مگر اللہ رے شفقت! گرمی کی شدت کے باوجود خندہ جبینی لمحہ بھر کو رخصت نہ ہوئی، ایک موقع پر برف طلب فرمایا، اس غلام نے ۱۲ر کلومیٹر دور ایک شخص کو برف کے لیے شہر بھیجا، ۹ ربجے کا گیا ہوا فرستادہ ایک بجے تک جب نہ لوٹا تو اس کمترین خادم کا ندامت سے وہ حال ہوا کہ نہ پوچھیے۔ حضرت فرمارہے تھے کاش بارش ہوجائے، موسم ٹھنڈا ہوجائے۔ زمین جل رہی تھی، آسمان آگ برسا رہا تھا، بادل کا کوئی ٹکڑا دور، دور تک ناپید تھا، واللہ اعلم پھر کہاں سے گھٹا اٹھی اور چند سو گز کے دائرے میں ژالہ باری کرکے دوبارہ آسمان صاف کرگئی، مصنوعی برف لانے والا ناکام لوٹا، قدرتی برف کے اولے ڈش میں بھرے گئے، تلووں پر ملے گئے، موسم یوں معتدل گویا فروری مارچ کا مہینہ ہو، سارے لوگ انگشت

☆ مہتمم الجامعۃ الحسبیبیہ پورینی بھاگلپور

بدنداں عقل توجیہ سے قاصر، کیسے ہوگیا؟ شام کو وعظ کا جلسہ تھا، لوگ توقع کے خلاف امنڈ آئے، بیرونی مہمانوں کی کثرت اور چاول صرف ۴۰ رکلو، غلام نے حضرت سے صورت حال بیان کی، حکم ہوا کھانے پر چادر ڈال دو اور اللہ کا نام لے کر کھلانا شروع کردو۔ میں نے متعلقہ افراد کو یہ پیغام دے کر لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرادیا کہ بیرونی مہمان کھانا کھالیں۔ غلام تو یہ اعلان کر کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور ذمہ داروں نے میز بانی کے فرائض سنبھال لیے، تقریباً ۱۰ ربجے رات جب ذمہ داروں نے دوبارہ اعلان کی تاکید کی تو مجھے خیال آیا کہ چاول تو کم تھا، ذرا دیکھوں تو حال کیا ہے؟ تفتیش پر ایک ذمہ دار نے میرا ہاتھ پکڑا اور مطبخ لے گئے، وہاں ایک چٹائی پر نصف چٹائی بھر چاول ڈھکا ہوا تھا، اور تقریباً پندرہ کلو چاول اُبل رہا تھا، مجھے بتایا گیا کہ سات بجے شام سے ایک قطار میں ۶۰ رافراد بیٹھ کر اب تک مسلسل تقریباً چار سو افراد کھا چکے ہیں، مزید دریافت پر میری حیرت یہ کہہ کر بڑھائی گئی کہ بچے ہوئے اور ابل رہے چاول انھیں چالیس کلو چاولوں کا بقیہ ہیں، بار بار کے اعلان پر جب کوئی کھانے والا نہ آیا تو ایک بجے رات کو کنڈیاں کھٹکھٹائی گئیں کہ بھائیو! یا تو تم چل کر کھالو یا پھر کھانا لے آؤ، ورنہ گرمی سے پختہ چاول خراب ہوجائے گا۔ اس واقعے کے درجنوں شاہد یہاں موجود ہیں جو اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا سفر اس غلام کی دعوت پر تین سال پیشتر بھاگلپور کا ہوا، جہاں حضرت کا عظیم الشان بے مثال استقبال کیا گیا، تیسرے دن ایک مسجد کے افتتاح کے لیے تقریباً تیس کلومیٹر دور جانا تھا، قریب کے ایک مدرسے سے بھی دعوت آئی جسے حضرت نے قبول نہ فرمایا، مدرسے کے مہتمم صاحب نے جب بہت اصرار کیا تو اس غلام نے اپنی حماقت سے رائے دی کہ واپسی دوسرے راستے سے ہو جس میں مذکورہ مدرسہ واقع ہے اور رہبری کے لیے حضرت کے خادم سفر محمد قاسم صاحب کی جیپ آگے بڑھادی گئی، حضرت نے دیکھا تبسم فرمایا اور فرمایا اچھا! تو قاسم میاں آگے چل رہے ہیں۔ واللہ العظیم دو تین منٹ ہوئے ہوں گے کہ قاسم بھائی کی جیپ کنارے ہوکر رک گئی اور حضرت کی کار اپنے راستہ پر بڑھ گئی۔ اس ناکارہ غلام کی بے چینی کا جو عالم تھا اسے خدا ہی بہتر جانتا ہے، آدھ گھنٹہ بعد جیپ آتی دکھائی دی، قاسم بھائی منزل پر پہنچتے ہی دست بستہ معافی مانگنے لگے، میں حیران کہ معاملہ کیا ہے، حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا جاؤ معاف کیا۔ تب قاسم نے بتایا کہ اچانک

گاڑی لڑکھڑانے لگی، اور ایسا لگا کہ بس اب گیر بکس ٹوٹ جائے گا، مجبوراً گاڑی کنارے کر دینی پڑی اور جب حضرت کی کار آگے بڑھ گئی تو چند منٹوں میں گاڑی بالکل ٹھیک ہوگئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ قاسم بھائی تو سرگذشت سنا رہے تھے اور میں ندامت سے پسینے پسینے کہ یا اللہ میں نے یہ کیا حماقت کر ڈالی۔

یہ تینوں واقعات حضرت کی ذات سے متعلق مشاہدے میں آئے جن کی کوئی عقلی توجیہ میرے نزدیک ممکن نہیں اور جنھیں صرف حضرت کی کرامت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

میں تو اتنا ناکارہ ہوں کہ حضرت کی غلامی کی نسبت پر بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ اس عالی نسبت کے حقوق بھی مجھ سے ادا نہیں ہو پاتے۔ سعی کر رہا ہوں کہ حضرت کی حیات مبارکہ میں حضرت کی سرپرستی میں قائم ہونے والی اس یادگار الجامعۃ الحبیبیہ کی خدمت کر کے خود کو تسکین دوں اور کوشش کروں کہ اس کا افادہ وسیع سے وسیع تر ہو۔ جملہ متعلقین کی خدمت میں بصد ادب ہدیۂ سلام عرض ہے۔

والسلام

ناکارہ: عطاء الرحمٰن مفتاحی

....

نبی کے پیارے حبیب داور حبیب رحمان اعظمی تھے

حقیقتاً وارث پیمبر، حبیب رحمان اعظمی تھے

امام فنِ حدیث وقرآں، حدیقۂ مصطفیٰ کے نگراں

سراپا حقانیت کے پیکر حبیب رحمان اعظمی تھے

حدیث رگ رگ میں جنکی پنہاں، حدیث ہی جنکا دین وایماں

حدیث ہی جن کا تکیہ بستر، حبیب رحمان اعظمی تھے

درود ہر دم لبوں پہ جاری اسی میں گزری ہے عمر ساری

فدائے ذات رسول انور ﷺ حبیب رحمٰن اعظمی تھے

غزالیؔ وبیہقیؔ دوراں، تھے باغ نعمانؔ کے نگہباں

کہ بحر تحقیق کے شناور حبیب رحمان اعظمی تھے

عقیدتوں کا خراج دے کر گئے ہیں خود جن کو شیخ از ہر
ائمہ فن کے ایسے محور حبیب رحمان اعظمی تھے

یہ شیخ بو غدہ شیخ ایمن یہ بادہ نوشانِ حکمت و فن
گئے ہیں جنکے یہاں سے پی کر حبیب رحمان اعظمی تھے

وہ ساقیٔ جام مصطفیٰ تھے، وہ چشمۂ فیض باخدا تھے
ہجوم پیاسوں کا جن کے در پر حبیب رحمان اعظمی تھے

وہ بزم رشد و ہدیٰ کی زینت، وہ شیخ کامل شہ طریقت
کہ رہبرانِ ہدیٰ کے رہبر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

کتاب زہد ومصنفین ومطالب ومسند حمیدی
ہے جن کی تعلیق ان کتب پر حبیب رحمان اعظمی تھے

سعید منصور کی سنن ہو یا کشف استار علم و فن ہو
بکھیرے ہیں جس نے ان پہ گوہر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

لکھی گئیں شرحیں برطحاوی ہے آپ کی شرح سب پہ حاوی
نگار علمی کے آئینہ گر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

ادائے فقر ان کو ایسی بھائی، نہ سوئے دولت نظر اٹھائی
غنا وصبر ورضا کے خوگر حبیب رحمان اعظمی تھے

محقق بے مثال کہیے، محدث باکمال کہیے
مفسر وحیِ ربّ اکبر حبیب رحمٰن اعظمی تھے

نہ پوچھئے بس مقام ان کا عطا ہے ادنیٰ غلام ان کا
سپہر عظمت کے مہر انور حبیب رحمٰن اعظمی تھے

محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

از: ڈاکٹر عبدالمعید صاحب☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہ ہمارے دور کی ان عظیم شخصیات میں سے تھے جن کے محض تصور سے دل کو ڈھارس اور روح کو اطمینان نصیب ہوتا تھا کہ قحط الرجال کے اس زمانے میں بفضلہٖ تعالیٰ ان کا سایۂ رحمت پوری امت کے لیے ایک سائبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسی شخصیات جو علم وفضل، سلامت فکر، ورع وتقویٰ اور اعتدال وتوازن کی خصوصیات جمع کر لینے کے ساتھ امت کی فکر میں گھلتی ہوں اور جن کے دلِ دردمند میں عالم اسلام کے ہر گوشے کے لیے یکساں تڑپ موجود ہو۔ خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اصلاً دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعلیم وتربیت یافتہ تھے، لیکن اس کے بعد انھیں اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند سے بھی اکتساب فیض کی توفیق عطا فرمائی تھی اور اس طرح ان کی ذات میں برصغیر کے ان دونوں عظیم اداروں کے محاسن جمع فرما دیے تھے، پھر علم ظاہر کے مجمع البحرین کو اللہ تعالیٰ نے علم باطن کا بھی حصۂ وافر عطا فرمایا۔ انھوں نے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت وصحبت سے فیض حاصل کیا اور طریقت کے میدان میں بھی حضرت رائے پوری قدس سرہ کے خلیفۂ مجاز کی حیثیت سے آپ کا فیض دور دور تک پھیلا۔

آپ کی اردو عربی تصانیف اتنی ایمان افروز، فکر انگیز اور معلومات آفرین ہیں کہ وہ دل کو ایمان ویقین سے سرشار کرنے کے علاوہ دین کا صحیح مزاج ومذاق انسان پر واضح کرتی ہیں اور اسے افراط وتفریط سے ہٹا کر اعتدال کے اس جادۂ مستقیم پر لے آتی ہیں جو ہمارے دین کا طرۂ امتیاز ہے، ان

☆ کھیری باغ روڈ، مئو

تحریروں میں علم وفکر کی فراوانی کے ساتھ بلا کا سوز وگداز ہے جو انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا، خاص طور پر مغربی افکار کی یورش نے ہمارے دور میں جو فکری گمراہیاں پیدا کی ہیں اور عالم اسلام کے مختلف حصوں میں جو فتنے جگائے ہیں، ان پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر بڑی وسیع وعمیق تھی اور انھوں نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعے ان فتنوں کی تشخیص اور ان کے علاج کی نشاندہی اتنی سلامت فکر کے ساتھ اتنے دلنشیں انداز میں فرمائی ہے کہ عہد حاضر کے مؤلفین میں شاید ہی کوئی دوسرا ہمسری کر سکے۔

مولانا ندوی مدظلہ کو جو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے، وہ کم کسی کے حصے میں آئی ہے، اور اس تمام شہرت اور ناموری کا سبب ہے آپ کا علم وفضل، وسعت مطالعہ، وفور علم، ادب وتاریخ پر دست گاہ کامل، عربی ادب میں بے نظیر مہارت اور اصلاح وتبلیغ کے لیے سعی پیہم اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے اوصاف ومحاسن جن کا وصف وبیان مجھ جیسے ہیچمداں کے بس سے باہر ہے۔ متانت وسنجیدگی، سلیقہ مندی وسلیم الطبعی، سادگی وبے نفسی اور انکسار وتواضع ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں اور ان کی انھی خوبیوں نے انھیں باکمال بنادیا ہے۔ دین کا درد اور اشاعت اسلام کی فکر انھیں ہر آن ہر لمحہ بے قرار وبیتاب کیے رہتی ہے۔ مسلم معاشرے کا انتشار وافتراق، مسلمانوں کا دینی تعلیمات سے انحراف اور ان کا تہذیبی وثقافتی انحطاط وارتداد ان کو ہر پل بے چین وبے کل کیے رہتا ہے۔ اور یہی فکر ان کو ہر دم متحرک اور پابرکاب رکھتی ہے اور وہ سارے عالم کے مسلمانوں کو ان کا مقصد حیات ''کنتم خیر امة'' ہونے کا احساس دلاتے پھرتے ہیں۔

ذخیرہ مکاتیب پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق کا آغاز غالباً اُس وقت ہوا، یا پہلے سے تعلق تھا تو اس میں مضبوطی اُس وقت آئی، جب حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۵۲ء میں اتر پردیش کے اسمبلی کے رکن منتخب ہوکر لکھنؤ گئے اور آپ کا قیام سرکاری قیام گاہ کے بجائے امام اہلسنت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ مدرسہ دارالمبلغین میں ہوا، اسی دوران ندوہ کے شیخ الحدیث شیخ حلیم عطا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا اور حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش اور اصرار پر ندوہ میں بخاری شریف وغیرہ کا درس دینا شروع کردیا، پنج سالہ انتخاب کے بعد جب اسمبلی کی رکنیت ختم ہوگئی تو حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ گھر چلے آئے، مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت کوشش کی کہ آپ کے

درس حدیث کا سلسلہ ندوہ میں جاری رہے۔لیکن حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے اور گھر پر ہی رہنا پسند فرمایا۔

مندرجہ ذیل اقتباسات سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ میں محدث اعظمی کا کیا مرتبہ اور مقام تھا۔

۱- رائے بریلی سے لکھے ہوئے ۱۸/۴/۵۷ کے مکتوب میں ''مقالات کوثری'' کا حوالہ آیا ہے،مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کتاب ہدیہ میں ملی تھی۔شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب ہدیہ کرتے وقت کتاب کی پیشانی پر یہ عبارت تحریر فرمائی:

''بسم اللّٰه الرحمن الرحيم. أهدى هذا السفر الجليل إلى الأستاذ المفتال الداعي إلى اللّٰه تعالىٰ بلسانه وبيانه: سيدى الشيخ أبى الحسن على الحسنى الندوى سلمه اللّٰه تعالىٰ لسان صدق وداعية حق لخير الإسلام والمسلمين. راجياً أن يتقبله من تلميذ مؤلفه ومرتجي دعواته الصالحة. عبدالفتاح أبوغده حلب''

١٤/ من رجب ١٣٧٦ھ

ترجمہ:اس عظیم کتاب کو استاد کرم فرما،زبان وقلم سے خدا کی طرف دعوت دینے والے سیدی ابوالحسن علی ندوی کی خدمت میں ہدیہ کرتا ہوں،اللہ تعالیٰ ترجمان حق اور اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی کے سچے داعی کے طور پر ان کی حفاظت فرمائے،یہ امید کرتے ہوئے کہ مصنف کتاب کے شاگرد اور ان کی صالح دعاؤں کے امیدوار کی طرف سے اس کو قبول فرمائیں گے۔عبدالفتاح ابوغدّہ-حلب-۱۴/رجب ۱۳۷۶ھ۔

مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ۱۸/اپریل کے خط میں اس کتاب کو حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ہدیہ کرنے کا ذکر ہے،مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کو ہدیہ کرتے وقت شیخ ابوغدّہ رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کے نیچے ہی یہ عبارت تحریر فرمائی:

وبدوري أتشرف باهدائه الى من هو أولى منى بهذا الكتاب الجليل صاحب الفضيلة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي حفظه اللّٰه تعالىٰ وامتع

به. أنا الفقير إليه تعالى أبو الحسن علي الحسني ٢/ ١١ / ٧٦

ترجمہ: میں اپنی جانب سے اس عظیم کتاب کو اُس ذات کی طرف ہدیہ کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں جو اس کے مجھ سے زیادہ مستحق ہیں فضیلت مآب شیخ حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خدمت میں، اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے اور ان سے فائدہ پہنچائے۔ ابوالحسن علی حسنی ۷۶/۱۱/۲

۲-آپ محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے فضل وکمال سے کسی حد تک متاثر اور معترف تھے، اس کا ثبوت وہ مکتوب ہے جسے آپ نے مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی کے پاس ۱۷ فروری ۱۹۸۰ء کو لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

''فیصل ایوارڈ کے متعلق چونکہ آپ نے دریافت فرمایا ہے، اس لیے لکھتا ہوں کہ اس مرتبہ وہ تین عنوانوں سے تھا، خدمت اسلام کے عنوان سے مجھے اور ڈاکٹر محمد ناصر سابق وزیر اعظم انڈونیشیا اور بانی مسجومی پارٹی کو اسی ترتیب سے دیا گیا ہے، محمد ناصر صاحب بڑے مرد مجاہد اور خادم دین ہیں، اور ہر طرح اس کے مستحق ہیں، ایک ''دراسات اسلامیہ'' میں امتیازی کام کرنے کے عنوان سے ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی صاحب کو ان کی خدمت حدیث پر دیا گیا ہے، مصطفیٰ اعظمی فاضل دیوبند ہیں اور عربی اور انگریزی میں ان کا اولین تدوین حدیث پر اچھا کام ہے، تیسرا ''درسات ادبیہ'' پر دو مصریوں کو ملا ہے۔ ہمارے خیال میں ''دراسات علمیہ'' پر سب سے زیادہ مستحق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ تھے، شاید کسی نے توجہ نہیں دلائی''۔

(فکر اسلامی صفحہ ۸۲ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء)

۳-مؤلف ''حیات ابوالمآثر'' ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی تحریر فرماتے ہیں:

ایک دفعہ دار العلوم ندوہ میں مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دست بوسی کی سعادت اس حقیر کو حاصل ہوئی تو اس وقت انھوں نے فرمایا کہ:

''مولانا اگرچہ میرے استاذ نہیں ہیں، لیکن میں ان کو استاد ہی کی طرح سمجھتا ہوں، اور میں نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔''

۴- مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ باقاعدہ محدث اعظمی سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ ۱۳۷۵ھ میں دمشق کا ان کا ایک طویل دورہ ہوا، اس وقت ۲۱/رمضان ۱۳۷۵ھ کو وہاں سے ایک خط لکھا جس میں علاوہ دیگر باتوں کے تحریر فرمایا:

''جو تمنا باصرار و تکرار ظاہر کی تھی اس کے متعلق ابھی تک کوئی واضح و قطعی جواب نہیں ملا، بڑی آرزو ہے کہ آپ سے استفادہ کی منظّم اور مستقل شکل پیدا ہو، اگر یہ خوشخبری میں سن لیتا تو بڑی مسرت کے ساتھ واپسی ہوتی، اگر کوئی رائے قائم ہو تو مطلع فرمایا جائے''۔

۵- ۱۶/رجب ۱۳۷۶ھ کو لکھنؤ سے لکھتے ہیں:

''اس وقت کے علماء میں، میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کسی سے اتنی مناسبت اور عقیدت ہے، جتنی آپ سے، خصوصیت کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد مجھے اس جامعیت اور ذوق و ''ثقافت'' کا کوئی دوسرا عالم نظر نہیں آتا، یوں یکفنی علماء اپنے اپنے فن کے اور بھی ہوں گے، مگر میرے ذوق کی تشفی اور جگہ نہیں ہوتی''۔

۶- یکم محرم ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۴/مئی ۱۹۶۴ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''میری یہ عجب بد قسمتی اور عجیب سوء اتفاق، کہ میں ایک طرف تو آپ سے ایسا گہرا نیاز مندانہ تعلق رکھتا ہوں اور آپ سے ایسی علمی عقیدت ہے جو کسی دوسری معاصر شخصیت سے نہیں، نہ ہندوستان میں نہ ہندوستان سے باہر مصر و شام میں، اگر چہ یہ ایک تحسین ناشناس ہے اور میرا اعتراف کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن بہر حال واقعہ ہے........''۔

۷- ''مجمع بحار الانوار'' کی اشاعت کے سلسلہ میں ۱۰ محرم الحرام ۸۴ھ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''تصحیح و مقابلہ کے ابتدائی کام کے بعد اس کا آخر میں آپ کی نظر سے گذرنا ضروری ہے کہ بحمد اللہ لغت اور حدیث پر آپ کی نظر وسیع بھی ہے، عمیق بھی ہے، ہمیں تلاش کے بعد بھی آپ کی ذات گرامی سے بہتر ماہر فن نہیں مل سکتا۔''

۸- محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مجمع بحار الانوار'' کا مقدمہ لکھ کر جب مولانا علی میاں صاحب

رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۱/ ج، ث، ۸۷ھ مطابق ۲۶، ستمبر ۶۷ء کو ایک خط میں تحریر فرمایا:

''ماشاءاللہ بڑا فاضلانہ مقدمہ ہے، اس فن کی ارتقا اور عہد بعہد تالیفات کا جائزہ لے لیا ہے، کتاب کے خصائص مبصرانہ ہیں، انھیں تحقیقات اور خصوصیات کی بنا پر میرے دل میں آپ کی جو قدر و منزلت ہے، اس کو خدا جانتا ہے۔''

۹-۱۱/ رمضان ۸۶ھ، دسمبر ۶۶ء کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''......ایک کتاب لکھنی شروع کی ہے جس کا نام تجویز کیا ہے ''الارکان الاربعۃ في ضوء الکتاب والسنۃ وفي اسلوب العصر الحدیث'' اس کتاب میں، میں نے مستند شارحین امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ، مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات و معارف بھی نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ میری خواہش تھی کہ محدثانہ اور فقہی حیثیت سے آپ کی نظر پڑ جائے تا کہ صناعات حدیث، اور فقہ کے سلسلہ میں کوئی لغزش باقی نہ رہے۔''

۱۰- شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''اوجز'' کے مقدمہ پر حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے توسط سے حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ لکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، ۲۹/۴/۷۱ کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''عرصہ ہوا ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا، جس میں حضرت شیخ کا پیغام پہنچایا تھا کہ مقدمہ اوجز پر اگر کچھ اظہار خیال فرمایا جائے تو اس کو براہ راست بیروت بھیج دیں تا کہ وہاں چھپنے والے رسالے کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔''

۱۱- ندوہ کا ۸۵ سالہ اجلاس ہونے والا تھا، اس کے تعلق سے ۲۹/ شعبان ۹۵ھ کو لکھتے ہیں:

''عربی میں چھپا ہوا پروگرام پہنچا ہوگا، ہماری بڑی خواہش اور ضرورت ہے کہ کسی موضوع پر آپ بھی عربی میں کوئی مقالہ تیار فرمائیں، یہ اجلاس کے لیے بڑے فخر و زینت کی بات ہوگی .... آپ جس موضوع پر بھی لکھنا پسند فرمائیں ہمارے لیے فخر و مباہات کی بات ہوگی''۔

مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط کے مزید اقتباسات حسب ذیل ہیں، جس سے مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کا محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے تئیں قلبی لگاؤ، عقیدت اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے:

۱۲- مجھے آپ سے ملنے کا شوق بھی ہے اور ضرورت بھی، آج ہی رات خواب میں بہت دیر تک زیارت کرتا رہا۔ ۲۲/اکتوبر ۶۵ء۔

۱۳- آپ کی تحریر وسفارش ہمارے لیے ارشاد وحکم کا درجہ رکھتی ہے۔ ۲۰/رمضان = ۱۸/اکتوبر۔

۱۴- اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر صحت وعافیت کے ساتھ رکھے اور سلف کے مآثر کا آپ سے احیاء ہوا۔ ۹/۲/۹۱ھ۔

۱۵- اللہ تعالیٰ موانع سفر باحسن وجوہ دور فرمائے اور جو عظیم کام آپ کے ذریعہ شروع ہوا ہے وہ تکمیل کو پہنچے۔ ۱۱/اگست سنہ درج نہیں ہے۔

۱۶- حدیث وسنت کی جیسی خدمت اللہ تعالیٰ آپ سے لے رہا ہے وہ موجب صد شکر ومنت ہے۔ **ذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء** (غیر مورخ)۔

آخر میں محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے اہل بیت میں سے ایک فرد کا خواب ذکر کر دینا مناسب ہے:

> ''قریبی فرد کا بیان ہے کہ وہ اس دن جس دن مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ۱۲/بجے دن میں رحلت ہوئی، کوئی کتاب پڑھ رہے تھے، دن کے دس بجے ہوں گے کہ ان کی آنکھ لگ گئی، اسی دوران انھوں نے خواب دیکھا کہ مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ مرقاۃ العلوم کی مسجد میں چند آدمیوں کے اجتماع سے خطاب فرما رہے ہیں، دوران تقریر مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''مولانا سے میرے تعلقات بہت اچھے تھے''۔ مراد محدث کبیر تھے، اسی کے چند گھنٹے بعد یہ روح فرسا خبر سننے میں آئی کہ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ واصل بحق ہو گئے۔ **رحمهما الله وغفر لهما جمع بينهما دار الكرامة.**

مآخذ:

۱- حیات ابوالمآثر

۲- نقوش رفتگاں

۳- سہ ماہی مجلہ المآثر، عنوان، ''اہل علم کے خطوط بنام محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ''

محدث اعظمی اور جامعہ مظہر العلوم

مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی رحمۃ اللہ علیہ ☆

جامعہ مظہر العلوم بنارس (موسسہ ۱۳۱۰ھ) کی تاریخ کے زریں اور سنہری ادوار میں وہ دور بھی ہے، جب عراقیِ وقت ابوالانوار حضرت مولانا عبدالغفار صاحب المئوی یہاں بحیثیت مدرس تشریف لائے اور مسند تدریس کی زینت بنے۔ آپ ابوحنیفہ زماں جنید دوراں امیر المومنین فی الحدیث والفقہ حضرت مولانا ابومسعود رشید احمد ایوبی انصاری گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ آپ بہت بڑے ادیب، فقیہ اور محدث تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے شرف تلمذ ہی آپ کے بلند پایہ عالم دین ہونے کی بہت بڑی سند ہے۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر میں مظہر العلوم آپ کی مبارک تشریف آوری سے مشرف ہوا، اسی دور میں علامۃ الاعلام والامام الہمام محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ بحیثیت طالب علم اس مدرسہ میں داخل ہوئے۔ آپ مولانا عبدالغفار صاحب المئوی کے تلمیذ خاص تھے، سفر وحضر ہر حال میں آپ اپنے استاذ محترم کے ساتھ رہتے تھے، آپ مئو میں پھر گورکھپور میں ان کے ساتھ رہ کر علم حاصل کرتے رہے، اسی لیے جب وہ بنارس جامعہ مظہر العلوم میں مدرس ہوکر تشریف لائے تو آپ بھی ان کی خدمت میں پہنچ کر مظہر العلوم میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مولانا کے اساتذۂ کرام کی مبارک فہرست میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے بعد انھیں کا نام سب سے روشن ہے۔ مولانا کی خداداد صلاحیتوں کو نکھارنے اور جلا بخشنے بالخصوص فن حدیث اور عربی ادب کا پاکیزہ ذوق پیدا کرنے میں انھیں کی نظر کرم اور انھیں کی تعلیم وتربیت کا دخل ہے، مولانا نے اعیان الحجاج کے اندر خصوصیت کے ساتھ اس بات کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ: ''آپ حضرت گنگوہی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ آپ کے تلامذہ میں مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند تھے۔ ناچیز کو

☆ سابق شیخ الحدیث جامعہ مظہر العلوم بنارس

بھی آپ ہی کی خدمت میں کچھ شد بد حاصل ہوئی ہے، آپ کی وفات ۱۳۵۱ھ میں ہوئی [1]''

(دیکھئے اعیان الحجاج ص ۲۸۳ ج ۲)

مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ مظاہرالعلوم کے اندر طالب علمی میں مدرسہ کی مقررہ تعلیم کے ساتھ ''مُلا'' اور ''مُلا فاضل'' (اس زمانہ کے بہت نہایت اعلیٰ قابلیت کے امتحانات) کی تیاری بھی کرتے رہے، چنانچہ آپ نے ۱۹۱۸ء میں ''مُلا'' کا اور مارچ ۱۹۱۹ء میں مُلا فاضل کا امتحان دیا اور اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوکر امتیازی پوزیشن حاصل کی۔

تذکرہ نساجین کے اندر مولانا حاجی حکیم قادر بخش سہسرامی متوفی ۱۳۳۷ھ مرید و مسترشد حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں جو مولانا نے یہ لکھا ہے کہ: ''میں نے بنارس میں ان کے وعظ بہت سنے ہیں'' وہ اسی دور طالب علمی ہی کی بات ہے۔ (ص ۹۰)

مظاہرالعلوم کے اندر اپنے دور طالب علمی کا تذکرہ مولانا نے ''تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی رحمۃ اللہ علیہ'' ص ۱۰، اور جامعہ ہذا کے رجسٹر معائنہ میں ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔

''گورکھپور سے غالباً ۱۹۱۷ء کے اواخر میں مولانا عبدالغفار صاحب بنارس منتقل ہوگئے تو میں بھی ان کی خدمت میں پہنچا اور مدرسہ مظاہرالعلوم سے ۱۹۱۸ء میں ''مُلا'' کا اور مارچ ۱۹۱۹ء میں ''مُلا فاضل'' کا امتحان دیا۔

اب معائنہ رجسٹر کی عبارت ملاحظہ فرمائیے وھو ھذا:

''عهدي بها متقادم فقد دخلتها اول مرة فى ۱۳۳۵ھ طالباً فى صحبة شيخنا المحدث الفقيه أبي الانوار عبدالغفار المئوي وقد أخذت عدتي للاشتراک فى امتحان ''ملا'' وفاضل'' (رجسٹر معائنہ)

ان عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مظاہرالعلوم میں گذرے ہوئے دور طالب علمی کی مولانا کی نگاہ میں کتنی اہمیت تھی۔ یہی مبارک دور مظاہرالعلوم کے ساتھ مولانا کے قلبی تعلق اور محبت کا بنیادی سبب تھا اور بحمداللہ یہ تعلق کم اور کیف ہر اعتبار سے بڑھتا ہی گیا اور ان کی آخر حیات تک قائم و دائم رہا۔

اس کے بعد آپ کا دوسرا دور مظاہرالعلوم میں مدرسی کا ہے، آپ نے تدریس کی مبارک

(۱) اعیان الحجاج میں غالباً سہو قلم ہوا ہے، حضرت مولانا عبدالغفار صاحب کا سال وفات ۱۳۴۱ھ ہے۔ (مسعود الاعظمی)

خدمات کا آغاز یہیں سے فرمایا ہے۔اس سے قبل آپ نے کسی ادارہ میں تدریس کی خدمت انجام نہیں دی تھی، حضرت حق نے یہ اولیت مظہر العلوم ہی کے لیے مقدر فرمائی تھی، اس لیے بمشیت ربانی اس کے اسباب بھی پیدا ہوگئے۔ ہوا یہ کہ مظہر العلوم سے پڑھنے کے بعد آپ نے شوال ۱۳۳۷ھ غالبًا جولائی ۱۹۱۹ء میں دارالعلوم دیوبند جاکر پہلی دفعہ داخلہ لیا، اس سال مدرسہ میں بیماری کا بہت زور تھا، فصلی بیماری پھوٹ پڑی تھی، جس کی وجہ سے مولانا بھی سخت بخار میں مبتلا ہوگئے۔آپ کی تشویشناک حالت دیکھ کر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے آپ کو مولوی یعقوب صاحب سکروری کے ساتھ گھر بھیج دیا(۱)۔

دارالعلوم دیوبند سے واپسی محرم ۳۸ھ کے بعد ہی کسی مہینہ میں ہوئی تھی بیماری کی وجہ سے دوسرے سال یعنی ۱۹۲۰ء میں آپ دارالعلوم دیوبند تشریف نہیں لے جاسکے، بلکہ مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں پڑھانے کے لیے مدرسِ سوم کی حیثیت سے پندرہ روپئے ماہوار پر آپ نے ملازمت قبول فرمالی۔اس زمانہ میں مدرس سوم عربی کی تنخواہ پندرہ روپئے خشک ہوا کرتی تھی۔اس ملازمت سے معلوم ہوتا ہے کہ مظہر العلوم کی نظر انتخاب مولانا پر ان کے دور طالب علمی ہی سے تھی، اس دور کا تذکرہ مولانا اس طرح کرتے ہیں کہ **ثم دخلتها ثانياً مدرساً أدرس فيها مبادئ العلوم**'' (رجسٹر معائنہ جامعہ مظہر العلوم)

پھر شوال ۱۳۳۹ھ میں دوبارہ دیوبند تشریف لے جاکر آپ نے دورۂ حدیث میں شرکت کی؛ لیکن چونکہ یہ زمانہ ۱۳۳۹ھ اور ۱۳۴۰ھ کا تھا، تحریک آزادی کی اہم کڑی ترک موالات شدت اختیار کرچکی تھی، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ گرفتار ہوچکے تھے، اسی اثناء میں آپ کو بخار آگیا۔

جس سے آپ کے والد محترم مولانا محمد صابر صاحب مرید و مسترشد حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز کو بہت تشویش لاحق ہوگئی، بالآخر انھوں نے مولانا کو خط لکھا کہ مہتمم صاحب سے رخصت لے کر مکان چلے آؤ؛ چنانچہ صفر یا ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں مولانا مئو چلے آئے، صحت یابی کے بعد مسئلہ دورۂ حدیث کی تکمیل کا تھا، اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں کہ صحت یابی کے بعد اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ دارالعلوم مئو میں دورے کی کتابیں تمام کرلوں، خوش قسمتی سے مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی

(۱) دیکھئے تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی

دارالعلوم مئو میں تشریف لا چکے تھے اور ان کے پاس ہمارے صرف ایک رفیق مولوی عبدالمجید صاحب دورہ پڑھ رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ شریک ہوگیا۔ شعبان ۱۳۴۰ھ میں دورۂ حدیث ختم ہوا۔ اور شوال ۱۳۴۰ھ میں بصیغۂ مدرسی وہیں میرا تقرر ہوگیا۔ (دیکھئے تذکرہ ص ۱۴)

مولانا دارالعلوم مئو میں تقریباً تین سال مدرس رہے، اس کے بعد مستعفی ہوکر پھر مظہر العلوم ہی میں تشریف لے آئے اور صدارت تدریس کے منصب پر فائز ہوئے، اس وقت مظہر العلوم میں صدارت تدریس کا مشاہرہ پچاس روپئے تھا، جیسا کہ مولانا کے ایک مکتوب سے معلوم ہوا، جو مخدومی و معظمی مشفقی و محسنی استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالجبار صاحب المئوی مدظلہ العالی کے نام ہے، اس خط کی نقل میرے پاس موجود ہے۔

مولانا عبدالجبار صاحب المئوی مدظلہ العالی مولانا کے تلمیذ رشید ہیں اور ابتدا ہی سے ان کے معتمد، مقرب اور راز داں رہے ہیں، مولانا کی نگاہ میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ مولانا عبدالجبار صاحب نے بھی مولانا کی جیسی خدمت کی ہے اور ان کے آگے اپنے کو جیسا مٹایا ہے، اس کی مثال فی زماننا ملنی بہت ہی مشکل ہے۔ مولانا نے ''**كشف الأستار عن زوائد البزار على الكتب الستة**'' کے مقدمہ میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''**خويصتي الشيخ عبدالجبار المئوی الذی هو مني بمنزلة الهيثمي من العراقي في الملازمة والصحبة، ولكن أين أنا وهو وأين العراقي والهيثمي**''

میرے مقرب اور ہمہ وقت میری خدمت کے لیے مستعد رہنے والے مولانا عبدالجبار صاحب کا معاملہ ہمہ وقت معیت اور صحبت و رفاقت کے اعتبار سے میرے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ محدث ہیثمی کا اپنے استاذ حافظ عراقی کے ساتھ تھا، لیکن کہاں عراقی اور ہیثمی؟ اور کہاں میں اور یہ؟

اس عبارت سے جہاں مولانا عبدالجبار صاحب مدظلہ کی شخصیت کا قابل رشک ہونا سمجھ میں آتا ہے، وہیں محدث جلیل کی غایت تواضع کا بھی پتہ چلتا ہے۔

جس طرح حضرت مولانا عبدالغفار صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب مظہر العلوم میں مدرس ہوکر تشریف لائے، تو ان کی معیت میں ان کے ہیثمی (مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ) مظہر العلوم میں طالب علم کی حیثیت سے آئے، اسی طرح جب محدث اعظمی یہاں صدر مدرس منتخب ہوکر تشریف لائے، تو ان کے ہیثمی مولانا

عبدالجبار صاحب بھی ان کی معیت میں تکمیل فنون کے طالب بن کر تشریف لائے اور ۱۳۴۴ھ - ۱۳۴۵ھ دوسال مظہرالعلوم میں رہ کر حضرت مولانا سے فنون کی تکمیل فرمائی۔ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مدظلہٗ اگر چہ دارالعلوم مئو سے فارغ ہو چکے تھے، لیکن معقولات اور تفسیر وغیرہ کی اہم کتب رہ گئی تھیں۔ مولانا عبدالجبار صاحب مدظلہٗ نے اس مدرسہ میں بیضاوی شریف، جلالین شریف، سراجی صدرا، حمداللہ، قاضی مبارک وغیرہ اہم کتابیں پڑھ کر فنون کی تکمیل کی ہے۔ مولانا عبدالجبار صاحب مدظلہٗ کے ساتھ پڑھنے والے لوگوں میں کوئی مولوی محمد رمضان صاحب تھے، جو قاضی مبارک پڑھنے میں ان کے شریک درس تھے۔ محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مکتوب بنام مولانا عبدالجبار صاحب مدظلہٗ ہے، جو بنارس سے ان کے نام ۱۹ر محرم ۴۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مکتوب ایک ایسے کاغذ پر ہے جو اس وقت کے نظام الاسباق کا ایک ٹکڑا ہے جس پر بہ مطابق ذیل اس طرح مرقوم ہے:

نمبر شمار	اسمائے طلبہ				
۱	عبدالجبار	بیضاوی شریف	جلالین شریف	قاضی مبارک	سراجی
۲	محمد رمضان	قاضی مبارک			

اس کی فوٹو کاپی میرے پاس محفوظ ہے، یہ نظام الاسباق تکمیل فنون کے دوسال میں سے کسی ایک سال کا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ مظہرالعلوم میں تقریباً تین سال صدر مدرس رہے۔ اس دور کی ابتدا حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مدظلہٗ کے بیان سے ۱۳۴۴ھ اور انتہا ۲۸ر جمادی الاولیٰ ۴۶ھ کے بعد کی کوئی قریبی مدت معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے نام بنارس سے مولانا کے خطوط کا سلسلہ ۲۸ر جمادی الاولیٰ ۴۶ھ کے ایک مکتوب پر منتہی ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بات بھی جوڑ لی جائے کہ مولانا اعظمی اس سے قبل ان کو ایک ایسا خط لکھ چکے تھے، جس سے یہ واضح تھا کہ مولانا بعض وجوہ کی بنا پر مظہرالعلوم سے مستعفی ہو جانے کا عزم مصمم کر چکے ہیں تو دور صدارتِ تدریس کی انتہاء مدت مذکور ہی قرار پاتی ہے، اس دور کا ذکر مولانا نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ ''**وثالثاً حين رشحت لرئاسة التدريس بها فمكثت على هذا المنصب حوالي ثلاثة أعوام**'' (رجسٹر معائنہ جامعہ مظہرالعلوم)

مولانا امان اللہ صاحب مئوی مظہر العلوم کے قدیم مدرس تھے، وہ آپ کے دور میں مدرس دوم تھے، مولانا کے خطوط جو مولانا عبد الجبار صاحب مدظلہٗ العالی کے نام بنارس سے لکھے گئے ہیں، ان میں مولانا امان اللہ صاحب کا تذکرہ ملتا ہے۔

جامعہ مظہر العلوم بنارس میں حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے جن علماء کرام نے پڑھا ہے، ان میں سے جن حضرات کا علم مجھے ہوسکا ہے، ان کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

۱:-مولانا عبد الحمید صاحب مکی رحمۃ اللہ علیہ بنارسی سابق مفتی مظہر العلوم بنارس۔

۲:-مولانا محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ صاحب بنارسی سابق ناظم اعلیٰ جامعہ مظہر العلوم بنارس۔

۳:-استاذ العلماء مولانا عبد الجبار صاحب مئوی رحمۃ اللہ علیہ مدظلہٗ العالی۔ سابق شیخ الحدیث جامعہ ہذا واستاذ حال مرقاۃ العلوم مئو۔

۴:-مولانا محمد عمر صاحب مبارک پوری مدظلہٗ العالی، آپ نے ۱۳۴۶ھ میں مولانا سے ہدایہ اول، مختصر المعانی، ہدیہ سعیدیہ وغیرہ پڑھا ہے۔

۵:-مولانا محمد خلیل صاحب بنارسی رحمۃ اللہ علیہ: مولانا محمد عمر صاحب مبارک پوری کے شریک درس تھے، مگر ان سے معمر تھے اور بعض کتابوں میں مولانا عبد الجبار صاحب مدظلہٗ کے بھی شریک درس رہے ہیں۔

۶:-مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب بنارسی رحمۃ اللہ علیہ: یہ بھی مولانا محمد عمر صاحب مبارک پوری کے شریک درس تھے۔

مظہر العلوم کے لیے سب سے زیادہ قابل فخر چیز مولانا کے وہ نیک تاثرات ہیں جو اس ادارہ کے ساتھ ان کے قدیم قلبی تعلق ومحبت پر دلالت کرتے ہیں اور اس ادارہ کے لیے سند فضیلت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا کے تاثرات جامعہ مظہر العلوم کے رجسٹر معائنہ پر ثبت ہیں، چونکہ عربی میں ہیں اس لیے ہم ان کو اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

عهدي بها متقادم، فقد دخلتها أول مرة في سنة ١٣٣٥هـ طالبا في صحبة شيخنا المحدث الفقيه أبي الانوار	جامعہ مظہر العلوم بنارس سے میرا تعلق پرانا ہے، ۱۳۳۵ھ میں، میں پہلی مرتبہ استاذ محترم محدث وفقیہ ابوالانوار حضرت مولانا عبد الغفار

عبدالغفار المئوي وقد أخذت عدتي للاشتراک في امتحان "ملا" و "فاضل" ثم دخلتها ثانياً مدرساً أدرس فيها مبادئ العلوم، وثالثاً حين رُشِّحت لرياسة التدريس بها فمكثت على هذا المنصب حوالى ثلاثة أعوام، فمن يتيسر له مثل ما تيسر لي من الفرصة ويكون عهده بجامعة مثل عهدى بجامعة مظهر العلوم فلا بد أن يكون سبرها واختبرها فعلى هذا الأساس أقول:

إن جامعة مظهر العلوم تؤدى رسالتها وتنهض باداء خدمتها منذ سنة ۱۳۱۰ هـ وقد قامت بتثقيف كثير من العلماء المبرزين وتزويدهم قدراً كافياً من العلم وإعدادهم حتى يتخرجوا علماء بارزين مثل الشيخ أبوالعرفان الندوى المدرس بدارالعلوم (ندوة العلماء لكناؤ) والشيخ مجيب اللّٰه الندوى مدير جامعة الرشاد (اعظم گڈه) والعالم أبى الحسن الحيدرى (المتقاعد عن تدريس مجيديه كالج الٰه آباد) والمفتى الكبير الشيخ محمد

مئوی کی معیت میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا ''ملا'' اور فاضل کے امتحانات کے لیے یہیں سے تیاری کی۔ پھر دوبارہ مدرس سوم کی حیثیت سے یہاں آیا اور تیسری مرتبہ میرا تعلق اس جامعہ سے اس وقت قائم ہوا جب مجھ کو جامعہ کی صدارت تدریس کا منصب تفویض کیا گیا، جس پر میں تقریباً تین سال تک برقرار رہا، جس شخص کو اتنے مواقع میسر ہوئے ہوں اور اس کا تعلق اتنا گونا گوں اور قریبی رہا ہو، اس نے یقیناً جامعہ کو پرکھا اور جانچا ہوگا، اس لیے میرا یہ کہنا اعتبار کی نظروں سے دیکھا جائے گا کہ جامعہ مظہر العلوم ۱۳۱۰ھ سے اپنے پیغام کی تبلیغ اور فرض منصبی کی ادائیگی میں مشغول ہے، جامعہ نے بہت سے علماء کی تعلیم وتربیت کا کام انجام دے کر ان کو اس لائق بنایا کہ وہ یہاں سے ممتاز عالم بن کر نکلے، مثلاً مولانا ابوالعرفان ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا مجیب اللہ ندوی مہتمم جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ، مولانا ابوالحسن حیدری سابق پروفیسر مجیدیہ انٹر کالج الہ آباد، مفتی کبیر مولانا محمد ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مفتی شہر بنارس وامام جامع مسجد گیان باپی، ان کے علاوہ ممتاز فضلاء کی ایک طویل

فہرست ہے۔ إبراهيم البنارسي (مفتی بنارس وإمام جامع گيان باقی) وكثير ين سواهم

اسی قدیم قلبی تعلق کی بنا پر کبھی کبھی از راہ محبت و ذرہ نوازی اپنا اور ہم لوگوں کا دل بہلانے کے لیے از خود تشریف لا کر مشرف فرماتے۔ سفر میں جاتے ہوئے اور سفر سے واپس آتے ہوئے بھی اکثر مظہر العلوم میں قیام فرماتے تھے، اہل مدرسہ بھی مدرسہ کے ہر پروگرام اور تقریب کے لیے غایت عقیدت و محبت کی بنا پر آپ ہی کو مدعو کرتے تھے اور آپ ان کے خلوص و محبت کو دیکھتے ہوئے اپنے ضعف اور پیری کے باوجود تشریف لا کر ممنون و مسرور فرماتے۔ ختم بخاری کی تقریب میں ہر سال آپ ہی تشریف لاتے اور درس حدیث کے بعد ناصح امین کی طرح طلبہ، مدرسین، منتظمین سب کو اپنے وعظ میں نصیحت فرماتے۔ ان کے فرائض منصبی کی طرف توجہ دلاتے اور کوتاہیوں پر تنبیہ فرماتے اور بحمد اللہ سب لوگ نہایت خندہ پیشانی سے آپ کی نصیحتوں کو سن کر ممنون ہوتے اور احسان مانتے تھے۔

کئی سال تو ایسا ہوا ہے کہ ضعف و نقاہت اور مرض کی تکلیف کے باوجود تشریف لائے ہیں اور ان کی اس محبت اور ذرہ نوازی کو دیکھ کر اہل مدرسہ اور مخلصین کی آنکھیں نم ہو گئی ہیں۔ آپ مدرسہ کی ضیافت میں اہتمام اور تکلف کو پسند نہیں فرماتے تھے، غایت تعلق کی بنا پر فرماتے کہ دیکھو میرے لیے کسی قسم کا تکلف نہ ہو اور فرماتے کہ شاہی مہمان کی حیثیت سے میں نے نہایت پر تکلف دعوتیں کھائی ہیں، اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے کہ اتنے اتنے موٹے گدوں پر سویا ہوں؛ لیکن مجھے مدرسہ کی چٹائی پر جو سکون اور یہاں کی دال بھات میں جو لذت و حلاوت ملتی ہے، وہ اور کہیں نہیں پاتا۔ آپ کی توجہات اور دعاؤں سے مدرسہ کو بہت نفع پہنچا ہے۔ استاذ العلما حضرت مولانا عبد الجبار صاحب مئوی مدظلۂ العالی جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور صاحب ''نعمت المنعم'' مولانا نعمت اللہ صاحب استاذ حال دار العلوم دیوبند آپ ہی کی وجہ سے مظہر العلوم تشریف لائے، ایک طویل عرصہ تک یہاں رہے اور سچ تو یہ ہے کہ وقت کے ان دونوں بحر العلوموں کے ذریعہ مولانا نے مدرسہ کو مجمع البحرین بنا دیا تھا، علوم کے ان سرچشموں سے طلبہ و اساتذہ خوب خوب سیراب ہوئے اور ان کے فیوض سے مستفیض ہوئے۔ ان حضرات کے اخلاق کریمانہ اور شفقت بزرگانہ کا تو سب کے دلوں پر سکہ ہی بیٹھ گیا، یہاں مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہ کو ''شیخ'' اور حضرت مولانا عبد الجبار صاحب کو ان کی غایت شفقت و محبت کی بنا پر

''دادا'' کے پیار بھرے لقب سے سب لوگ یاد کرتے تھے (بارک اللہ فی عمرہما) ان حضرات کے زمانہ میں مدرسہ میں خیرات وبرکات کا بہت ظہور ہوا، دورۂ حدیث کی خوب چہل پہل اور بہار رہی اور بحمد اللہ ابھی تک باقی ہے، یہ مولانا ہی کی دعاؤں اوران کی توجہات عالیہ کی برکات ہیں ؎

واللہ تیرے فیض سے باران محبت
ہے آج بھی سر سبز گلستان محبت

حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مدظلہ نے **''التصویبات لما في حواشي البخاري من التصحيفات''** کومظہر العلوم ہی میں بخاری شریف پڑھانے کے دوران لکھا ہے اور وہ کتاب اسی مدرسہ سے شائع ہوئی **فله الحمد والمنة.**

حضرت ابوالمآثر رحمۃ اللہ علیہ کے مظہر العلوم کے ساتھ گوناگوں قلبی تعلقات کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کے کچھ مآثر علمیہ اور یادگاروں سے بھی جامعہ کو نوازا ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم **''أوضح المسالک إلى ألفية ابن مالک'' تاليف العالم الشهير جمال الدين أبي محمد عبدالله بن يوسف بن هشام الانصاری** ہے۔ جو ان کی مفید تعلیقات سے مزین ہے اور جامعہ مظہر العلوم کے کتب خانہ کی زینت بنی ہوئی ہے، یہ تعلیقات سرورق سے لے کر کتاب کے صفحہ ۱۸۶ تک نہایت جلی اور عمدہ خط میں پھیلی ہوئی ہیں، ہر تعلیق کے بعد ان کا دستخط موجود ہے، کہیں حبیب بن الصابر ہے، تو کہیں حبیب الرحمٰن، اور کسی جگہ حبیب الرحمٰن الاعظمی، حبیب الرحمٰن المئوی ہے، تو دوسری جگہ حبیب بن المولوی محمد صابر ثبت ہے۔ مولانا کی تعلیقات کے ساتھ مزین یہ گرانمایہ کتاب فن نحو کے رجسٹر کے اندر ۳۷ میں درج ہے۔ مولانا کی یہ تعلیقات ان کے طالب علمی یا مدرسی کے دور کی معلوم ہوتی ہیں، میرا رجحان دور طالب علمی ہی کی طرف ہے، اس لیے کہ ۳۰ رجنوری ۱۹۱۹ء جیسا کہ اس کا ذکر نیچے آرہا ہے، ان کی طالب علمی ہی کا دور ہے۔ واللہ اعلم۔

کتاب کے آخر میں بانسی کاغذ پر ان کے دو شعر بھی مع ان کے دستخط کے مرقوم ہیں، لکھتے ہیں: **لأختر من سكنة مئو**

؎ مرے نصیب کہ وہ خود ہی حال دل پوچھیں
اثر ضرور ہے کچھ نالۂ سحر میں بھی

اس آسماں کا رخ پھیردوں جدھر چاہوں
دیا ہے یہ طپشِ دل نے اختیار مجھے

حررہ العاصی ۔حبیب الرحمٰن اختر مئوی

۳۰/جنوری ۱۹ء

مولانا نے اول اول اپنا تخلص شوق رکھا تھا، لیکن پھر اختر لکھنے لگے تھے، میرے وطن عزیز کوپا گنج ضلع مئو کے مشہور اور جلیل القدر عالم دین حکیم مولانا اسد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر مولانا اعظمی نے اپنے قطعہ تاریخ وفات میں اختر ہی تخلص رقم فرمایا ہے۔تذکرہ مشاہیر کوپا گنج میں مولانا محمد عثمان معروفی مدظلہ العالی لکھتے ہیں کہ ان کی تاریخ وفات مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اختر ملا فاضل استاذ دار العلوم مئو نے یوں کہی ہے ۔

در جوار رحمت غفار چوں نازل بشد — خیر مقدم گفت رضوان ودر جنت کشاد
غوطہا در لُجۂ تاریخ چوں اختر ببرد — داد غواصی در تاریخ او مغفور باد
۱۳۴۰

(تذکرہ مشاہیر کوپا گنج ص۸۲)

مولانا نے اپنی مندرجہ ذیل مشہور نعت شریف میں حبیب تخلص بھی استعمال فرمایا ہے، یہ نعت شریف مظہر العلوم کی تقریبات میں مولانا کی موجودگی میں بارہا پڑھی گئی ہے۔

وہ جہاں کا رمز وجود ہے وہ مدار کار نظام ہے — وہ خدا کی شانِ جمال کا بخدا کہ مظہر تام ہے
کرو یاد معرکہ بدر کا پڑھو فتح مکہ کا واقعہ — وہ خدا کا قہر وجلال تھا یہ نبی کی رحمتِ عام ہے
سبھی انبیاء کرام کا ہے مقام سب سے بلندتر — وہ ہلال چرخ کمال تھے مرا شاہ بدر تمام ہے
جوغذائے روح وسکون دل ہے انھیں کی پاک حدیث ہے — جو مریضِ دل کے لیے شفا ہے انھیں کا پاک کلام ہے

جو مجھے ملا وہ ملا انھیں کی نگاہ لطف وکرم سے ہے
قلم وزبانِ حبیبؔ کیا ہے انھیں کا فیضِ دوام ہے

اس موضوع کو طول دینے سے اگر چہ میرے مضمون کا تسلسل خلل پذیر ہورہا ہے، لیکن کیا کروں ۔

توبہ ہزار بار کی تھی میرے اختیار کی
توبہ مگر بہار کی مجھ سے نبھی نہیں

اب ہم پھر مآثر ہی کی باتیں کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ مولانا کی دوسری یادگار مظہر العلوم کی شہادت الفضیلۃ کا متبرک خطبہ ہے، جو مولانا ہی کا لکھا ہوا ہے اور مظہر العلوم کی شہادت الفضیلت کے لیے باعثِ فضیلت بلکہ دستار فضیلت ہے۔ فلہ الحمد والمنۃ خطبہ کی عبارت:

الحمد للّٰہ الذی نوّر قلوبنا بنور العلم والیقین، ورفع لنا أعلام الھدیٰ، وأوضح لنا معالم الدین، والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد الذی امتن اللّٰہ ببعثہ فقال عز من قائل ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾

اللّٰھم اجعل صلوتک علی نبینا وعلیٰ آلہ وصحبہٖ نجوم الھدیٰ وأعلام التقی وعلی التابعین لھم الذین سلکو امسلکھم، واقتفوا أثرھم من أئمۃ العلم لا سیما المجتھدین منھم ومتبعیھم أجمعین، أما بعد!

....

تیسری یادگار مصنف عبدالرزاق مطبوعہ بیروت سے متعلق ہے، جب یہ کتاب آپ کی تعلیقات وتحقیقات کے بعد زیور طبع سے مزین وآراستہ ہوئی اور اس کے نسخے آپ کی خدمت میں پہنچے، تو جس مطبوعہ نسخہ پر آپ نے حسب عادات المصنفین قرأت ونظر ثانی کے دوران جگہ بہ جگہ مختلف جلدوں میں تعلیقات وحواشی یا اضافات تحریر فرمائے تھے۔ آپ نے وہی گراں مایہ نسخہ اہل مدرسہ کی خواہش پر از راہ تعلق ومحبت مدرسہ کو قیمتاً مرحمت فرما دیا، تا کہ مظہر العلوم کے لیے ان کی یہ یادگار مابہ الامتیاز اور قابل صد رشک وافتخار بنی رہے۔ **رحمہ اللّٰہ رحمۃ واسعۃ وطاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ، آمین.**

☆.....☆☆.....☆☆.....☆

☆.....☆☆.....☆

☆.....☆

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور رسالہ معارف

از: ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ☆

ماہ نامہ معارف بلاشبہہ علوم ومعارف کا گنجینہ ہے۔ اردو رسائل وجرائد کے درمیان اس کا یہ امتیاز بھی لائقِ صد افتخار ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے سو سال پورے کر لیے ہیں۔ معارف صدی کی مناسبت سے یہ دوروزہ سیمینار بھی اپنے طرز کا ایک منفرد سیمینار ہے۔

معارف کے امتیاز کے بہت سے پہلو ہیں۔ ازانجملہ اس کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اپنے لائق وفائق مدیر سید سلیمان ندوی اور دیگر نامور رفقائے دارالمصنفین کے گراں ارز مضامین ومقالات کی وجہ سے اس نے علمی وادبی حلقوں کو بہت جلد اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ اہلِ علم بہ طورِ خاص اس کا مطالعہ کرتے اور اس کی فائلیں محفوظ رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں مضامین ومقالات لکھ کر اپنی اور رسالے کی توقیر میں اضافہ بھی کرتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں ایک اہم اور قابلِ ذکر نام محدثِ جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی [۱۹۰۱ء-۱۹۹۲ء] کا بھی ہے۔

مولانا اعظمی کا شمار نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے علمائے کبار میں کیا جاتا ہے۔ وہ علمائے متقدمین کی طرح جامع العلوم والفنون تھے۔ بالخصوص علم حدیث اور اس کی مختلف شاخوں میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی سیرت وشخصیت اور علمی خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے دو جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی کی ''حیاتِ ابوالمآثر'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مولانا اعظمی نے اپنی پختہ علمی استعداد، درس وتدریس کی اعلیٰ صلاحیت اور تحریر وتصنیف پر قدرت کی بنا پر اپنے عہد کے اکابر علما کا اعتماد کم عمری ہی میں حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے مرشد ومُربّی حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور اساتذۂ کرام میں علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے حق میں کلمات تشجیع وتحسین ارشاد فرمائے ہیں۔ مدیر معارف مولانا سید سلیمان ندوی کا نام نامی بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ وہ باوجودیکہ عمر اور علمی شہرت وعظمت میں مولانا اعظمی سے فائق وبرتر تھے، لیکن ان کی

☆ پروفیسر شعبۂ اردو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

حذاقتِ علمی کے معترف ومداح تھے۔ اس لیے بہ طورِ خاص ان کے ساتھ انس ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے۔ مولانا اعظمی بھی دارالمصنفین کے کتب خانے سے استفادے اور سید صاحب سے ملاقات ومذاکرات کے لیے وقتاً فوقتاً اعظم گڑھ جاتے رہتے تھے۔ سید صاحب کے پاکستان منتقل ہوجانے کے بعد مکتوب بنام مفتی ظفیر الدین مؤرخہ ۲۰/اگست ۱۹۵۱ء میں اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب دام ظلہٗ کا تہہِ دل سے ممنون ہوں کہ مجھ کو بھولے نہیں ہیں۔ مجھ کو بھی کسی کے پاکستان چلے جانے کا کوئی رنج نہیں۔ لیکن حضرت مولانا شبیر احمد رحمۃ اللہ علیہ اور سید صاحب کے پاکستان منتقل ہوجانے کا صدمہ دل سے کبھی نہیں جاسکتا۔ پہلے جب کبھی جی گھبراتا تھا تو دن بھر کے لیے اعظم گڑھ چلا جاتا تھا۔ سید صاحب سے جی بھر کے باتیں ہوتی تھیں۔ اور سارا غم غلط ہوجاتا تھا افسوس کہ اب یہ سہارا بھی نہیں رہا۔ شاید نومبر میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے دارالمصنفین گیا تھا، پھر جب سے آج تک نوبت نہیں آئی''۔
>
> (حیات ابوالمآثر ۱/۵۳۳)

جہاں تک 'معارف' کا تعلق ہے تو اس میں مولانا اعظمی کا پہلا مضمون 'جوّ ادساباط' کے عنوان سے اپریل ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ نہایت معلومات افزا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ جوّ ادساباط ایک عرب تھے جنھوں نے ہندوستان میں تیرہویں صدی ہجری میں عیسائی مبلغین کی ملمع کاری کا پردہ چاک کیا اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملادیا۔ اس مضمون میں اولاً جوّ ادساباط کے سلسلۂ نسب اور خاندانی حالات تحریر کیے گئے ہیں پھر خود جوّ اد کے احوال وکوائف بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد تبلیغِ مسیحیت کے مقابلے کے سلسلے میں جوّ اد کی خدمات کا مفصل بیان کیا گیا ہے۔

اس مضمون کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جوّ اد نے مسیحیت کے مقابلے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ ظاہری طور پر اسلام چھوڑ کر مسیحیت میں داخل ہوگئے اور پھر خود کو انجیل کا عربی ترجمہ کرنے پر مامور کرالیا۔ بعض معمولی وقفوں کے ساتھ وہ اس کام میں چودہ برس تک مصروف رہے۔ مگر در پردہ وہ مسیحیت کے جال کا تار و پود بکھیرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دو معرکہ آرا کتابیں لکھیں۔ جن میں ایک کا نام 'الصراصر الساباطیة' اور دوسری کا 'البراھین الساباطیة' ہے۔ اول الذکر شائع نہ ہوسکی، لیکن ثانی الذکر شائع ہوئی اور مصنف نے اسے خفیہ طور پر مفت تقسیم کرایا۔ اس کتاب کی تصنیف و

اشاعت میں جوّادکو کن کن مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟ اس کی تفصیلات بھی مضمون میں پیش کی گئی ہیں۔ پورا مضمون نادر اور مفید معلومات سے پُر ہے۔ جوّاد عربی کے علاوہ فارسی اور اردو سے بھی واقف تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ۳۰ تک پہنچتی ہے، جن میں بیشتر عربی میں اور بعض فارسی اور اردو میں ہیں۔ حیرت ہے کہ خیرالدین زرکلی کی الأعلام جوّاد ساباط کے ذکر سے خالی ہے۔

معارف میں مولانا اعظمی کا ایک اور مضمون اگست ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے: ''الدراية فی تخريج أحاديث الهداية کا ایک نادر نسخہ'' الدراية کے مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔ ان کی یہ کتاب زیلعی کی نصب الراية کی تلخیص ہے۔

مولانا نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ ان کا پیش نظر نسخہ خود مصنف کی زندگی میں اور تصنیف کے صرف تین سال بعد ۸۳۰ھ میں لکھا گیا ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کاتب ابوالفتح محمد بن احمد خطیب طوخی نویں صدی ہجری کے مشہور عالم وکاتب ہیں۔ سخاوی کی 'الضوء اللامع' میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے مشہور بزرگ وعالم مولانا غلام یحیٰ بہاری قدس سرہٗ کی ملک رہ چکا ہے۔

ان تمام خصوصیات سے بڑھ کر اس نادر نسخے کا امتیاز یہ ہے کہ اس پر حافظ ابن حجر کے بلند پایہ شاگرد، جلیل القدر مصنف اور نویں صدی کے مشہور حافظِ حدیث علامہ قاسم بن قطلو بغا کے تعلیقات وحواشی ثبت ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ نسخہ خود علامہ قاسم کے مطالعے میں رہ چکا ہے اور اس پر خود ان کے دستِ مبارک سے تعلیقات درج ہیں۔

ان تعلیقات کی اہمیت یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے جلیل القدر محدث جن احادیث کی تخریج میں ناکام رہے ہیں، علامہ قاسم نے اپنی تعلیقات میں ان کی نشان دہی فرمائی ہے۔ ذیل میں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> حدیث ''لا نكاح إلا بشهود'' کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے: 'لم أره بهذا اللفظ'' اس پر علامہ قاسم فرماتے ہیں: ''قلت أخرجه محمدبن الحسن فی الأصل بلاغاً ووصله الخطيب من حديث علی۔''

مولانا اعظمی نے پیش نظر مضمون میں اس طرح کے ۲۹/استدراکات نقل کیے ہیں۔ اس سے اس

مضمون کی افادیت نیز مولانا کے ذوقِ تحقیق کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آخر میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مولانا نے ان استدراکات کو "تعلیقات الحافظ قاسم بن قطلوبغا علی الدرایة" کے عنوان سے "منیة الألمعی بما فات الزیلعی" کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں ہی مصر سے شائع کرادیا تھا۔

مولانا اعظمی کا ایک اور مضمون ''مبارق الأزھار کس کی تصنیف ہے؟'' کے عنوان سے معارف، جنوری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ مولانا نے اس مضمون کی تمہید میں بتایا ہے کہ عبداللطیف بن ملک یا ابن فرشتہ ایک مشہور مصنف اور نامور عالم ہیں۔ ان کی تصنیفات میں مشارق الأنوار کی شرح مبارق الأزھار کو بہت شہرت ومقبولیت حاصل ہے۔ یہ شرح استنبول سے چھپ کر شائع بھی ہوچکی ہے۔ لیکن قاضی سید نورالدین حسین نے معارف (جولائی ۱۹۴۹ء) میں اور ڈاکٹر سید باقر علی نے معارف (اکتوبر ۱۹۵۰ء) میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ یہ کتاب ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے جو احمد آباد کے باشندے تھے اور ان کے والد کا نام عبدالملک بنبانی تھا۔

مولانا اعظمی نے پیش نظر مضمون میں مذکورہ بالا دونوں مقالہ نگاروں پر تعقب کیا ہے اور دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ دونوں فاضل مقالہ نگاروں کا نیا انکشاف معیار تحقیق پر پورا نہیں اترتا اور تاریخی اعتبار سے کسی طرح قابل تسلیم نہیں ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ وہ تمام مصنفین جنھوں نے ابن فرشتہ کا حال لکھا ہے یا جنھوں نے مبارق الأزھار کا ذکر کیا ہے سب اس کو عبداللطیف بن الملک کی تصنیف بتاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو الضوء اللامع، الشقائق النعمانیه، أعلام الاخیار، شذرات الذهب، فوائد بهیه، إتحاف النبلاء، کشف الظنون اور مقدمۂ شرح وقایہ وغیرہ۔ بلکہ ''مبارق'' کے مصنف نے خود اپنے نام کی تصریح اس طرح کی ہے: "وبعد فیقول العبدالضعیف عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملك۔" حاصلِ گفتگو کے طور پر مولانا نے بتایا ہے کہ عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی احمد آبادی ایک دوسرے بزرگ ہیں جو مبارق الأزھار کے مصنف نہیں ہیں۔

مولانا نے اپنے اس مضمون میں اصل موضوعِ بحث کے علاوہ بھی دونوں فاضل مقالہ نگاروں کی متعدد غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا ہے، جس سے ان کی وسعتِ مطالعہ بالخصوص طبقات وتراجم کی کتابوں پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان سب سے قطعِ نظر مولانا کا یہ مضمون بعض ایسے اہم علمی نکات پر مشتمل

ہے جنھیں خود ان کی دریافت کہنا چاہیے۔ مثلاً وہ یہ بتاتے ہیں کہ سخاوی نے الضوء اللامع میں بالعموم انھیں اعیان کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نویں صدی ہجری میں وفات پائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ سخاوی نے اس کتاب میں بعض ایسے عالموں کا بھی ذکر کر دیا ہے جن کی وفات دسویں صدی ہجری میں ہوئی ہے مگر ان کا ذکر انھوں نے ایسے انداز میں کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ ابھی زندہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نکتے کی طرف وہی متوجہ کر سکتا ہے جس نے 'الضوء اللامع' کا ایک سے زائد بار بہ نظرِ غائر اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو۔ یہ محض خوش گمانی نہیں بلکہ اس ضمن میں مولانا اعظمی کی ایک تصریح بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی 'حیاتِ ابوالمآثر' میں رقم طراز ہیں:

''اس کتاب کی پہلی جلد کے سرورق پر علامہ اعظمی کے قلم سے یہ عبارت منقوش ہے: 'طالعت هذا الكتاب كله أعني اجزاء ه الاثنى عشرقبل اليوم بسنوات مستعيراً إياه من مكتبة دارالمصنفين ثم لما اشتريته لمفتاح العلوم شرعت فى قراء ته ثانياً سنة ۱۳۶۹ھ۔'' (۱/۴۸۶)

مولانا اعظمی کا ایک اور مضمون ''پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں'' ہے۔ یہ معارف میں دو قسطوں میں اکتوبر، نومبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی تمہید میں مولانا رقم طراز ہیں:

''پورب کے خطے میں جو اولیاے کرام آسودۂ خاک ہیں اور ان کو شہرت دوام وقبول عام حاصل ہے، ان میں ایک برگزیدہ ہستی حضرت شاہ طیب بنارسی قدس سرہٗ کی ہے۔ ایک عرصے سے مجھے حضرت موصوف کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کا شوق تھا اور اس شوق میں مجھے "مناقب العارفین" کی تلاش وجستجو تھی جس کو ان کے حالات میں ان کے صاحبزادے شاہ محمد یسین قدس سرہٗ نے تصنیف فرمایا ہے۔ خوش قسمتی سے بنارس میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا اور میں اس کے مطالعے سے بہرہ ور ہوا۔

مجھے اس کتاب میں اچھا خاصا تاریخی وعلمی مواد نظر آیا۔ اس لیے میں نے اردو میں اس کا خلاصہ قلم بند کر لیا اور آج اسی خلاصے کو ناظرین معارف کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔''

اس طویل مضمون میں شاہ طیب بنارسی کے علاوہ جن دیگر بزرگوں کے احوال قلم بند کیے گئے ہیں، ان میں سے چند کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

شاہ محمد یسین، شیخ تاج الدین جھونسوی، مولانا خواجہ کلاں، شیخ نصیرالدین، شاہ حسن داؤد بنارسی، شیخ فرید بنارسی، خواجہ مبارک بنارسی، مخدوم محمد عیسیٰ تاج جون پوری۔

مولانا اعظمی کا پیش نظر مضمون اگر چہ 'مناقب العارفین' فارسی کا اردو خلاصہ ہے، لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ تادم تحریر اصل فارسی قلمی کتاب 'مناقب العارفین' زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہے۔ اس کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب تھا جو جامعہ مظہر العلوم، کچی باغ، بنارس کے کتب خانے کی زینت تھا۔ راقم حروف نے ۲۰-۲۲ سال قبل اس کی زیارت کی تھی۔ موجودہ صورتِ حال کا علم نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنے اس مضمون پر خود ہی استدراک بھی تحریر فرمایا تھا جو معارف میں جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے اپنی بعض فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان کی اصلاح فرمائی ہے۔ اس سے مولانا کی احتیاط پسند طبیعت اور تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا اعظمی کا ایک اور معرکہ آرا مضمون ہے ''الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟'' یہ معارف میں فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ نہایت محققانہ مضمون ہے جو دو اہل علم ڈاکٹر حمید اللہ اور قاضی اطہر مبارک پوری کے درمیان اختلاف رائے کے بعد محاکمے کے طور پر تحریر کیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "الذخائر والتحف" جب ڈاکٹر حمید اللہ کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی تو انھوں نے اس کے مصنف قاضی الرشید بن الزبیر کی نسبت مقدمے میں لکھا کہ ان کا حال ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا، مگر کتاب کی اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوری نے معارف دسمبر ۱۹۶۰ء میں اپنی یہ تحقیق پیش کی کہ قاضی الرشید بن الزبیر کا تفصیلی ذکر تاریخ ابن خلکان میں موجود ہے اور وہ پانچویں نہیں، چھٹی صدی کے ایک جامع الفنون عالم تھے۔ قاضی صاحب کے مضمون کی اشاعت کے بعد بھی ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے یہی رہی کہ الذخائر والتحف کے مصنف پانچویں صدی ہجری کے ہی کوئی عالم تھے۔

مولانا اعظمی نے اپنے محاکمے میں اولاً یہ بتایا ہے کہ قاضی الرشید بن الزبیر جن تین شخصیتوں کا لقب بتایا گیا ہے وہ تینوں معروف ہیں۔ ایک تو وہی ابن خلکان والے القاضی الرشید، ان کا نام احمد ہے۔ دوسرے ان کے والد علی ہیں اور تیسرے ان کے دادا ابراہیم ہیں۔ اس کے بعد مولانا نے یہ بتایا ہے کہ والد اور دادا ان دونوں کا تذکرہ ہمارے دونوں فاضلوں کو نہیں مل سکا ہے، حالانکہ ان دونوں کا

ذکر ''الطالع السعید'' مطبوعہ مصر ۱۳۳۳ھ میں موجود ہے۔ علی کی نسبت یہ مذکور ہے کہ وہ فاضل، شاعر اور رئیس تھے اور ان کی وفات ۵۲۵ھ میں ہوئی ہے۔ اور ابراہیم کی نسبت یہ مرقوم ہے کہ وہ ۴۷۳ھ میں اضلاع قوص کے حاکم تھے۔ رشید ومہذب ان کے پوتے تھے۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ احمد اور علی کا زمانہ چھٹی صدی ہے اور ابراہیم کا زمانہ پانچویں صدی ہے۔

مضمون کے اگلے حصے میں مولانا نے اُن دلائل کا جائزہ لیا ہے جن کی بنا پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے الذخائر والتحف کی تصنیف کا زمانہ پانچویں صدی ہجری قرار دیا ہے۔ پھر اخیر میں محاکمہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ:

> ''ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد ہمارے نزدیک ان ہی کی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے اور ہمارا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ 'الذخائر والتحف' ابن خلکان والے القاضی الرشید کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے دادا القاضی الرشید ابراہیم کی تصنیف ہے۔''

مولانا اعظمی نے اس مضمون میں بھی حسب معمول اصل بحث سے قطع نظر متعدد اضافی معلومات بہم پہنچائی ہیں نیز مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ بھی فرمایا ہے۔

اب راقم حروف یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ جناب سہیل شفیق کے مرتبہ ''اشاریہ معارف اعظم گڑھ'' سے حاصل شدہ معلومات کے پیش نظر میرا خیال تھا کہ معارف میں مولانا اعظمی کے یہی پانچ مقالات شائع ہوئے ہیں، جن کا تعارف گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا۔ لیکن بعد میں حیات ابوالمآثر جلد اول سے مراجعت کے بعد معلوم ہوا کہ معارف میں مولانا اعظمی کی کچھ اور تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے:

۱- دو متبرک اجازت نامے	دسمبر	۱۹۳۷ء
۲- تخریج زیلعی	جولائی	۱۹۴۰ء
۳- دِینَوَر اور مشائخ دینور	اکتوبر	۱۹۶۵ء
۴- ابوعبید کی غریب الحدیث	اکتوبر	۱۹۶۷ء
۵- غریب الحدیث	فروری	۱۹۶۸ء
۶- فہرست مخطوطاتِ پنجاب یونیورسٹی، لاہور	اپریل	۱۹۷۹ء

افسوس ہے کہ وقت کی قلت اور پیش نظر مضمون کی طوالت کی وجہ سے ان سب مضامین ومقالات کا تفصیلی تعارف سرِ دست ممکن نہیں۔ البتہ اپنے چند تاثرات کا پیش کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(الف) مولانا اعظمی ماہ نامہ معارف کے مستقل اور صاحب نظر قاری تھے اور بالعموم اس میں شائع ہونے والی تحریروں کو وہ بہ غور پڑھتے تھے اور جب کبھی کسی مقالہ نگار کی اصلاح وتصویب کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو اسے متنبہ فرما دیتے تھے اور اس ضمن میں بہت سی نئی اور مفید معلومات بھی پیش کر دیتے تھے۔ فنونِ حدیث اور کتبِ طبقات وتراجم سے متعلق ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ تحقیق منسوبات سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ ان موضوعات سے متعلق ان کے استدراکات نہایت وقیع اور محققانہ ہیں۔

(ب) مولانا کے مضامین ومقالات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر بحث اور ہر گفتگو میں حسنِ ترتیب کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کے مقالے کے اجزا میں بہ نظرِ غائر بھی تقدیم وتاخیر کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

(ج) مولانا اپنی تحریروں میں ایجاز بیانی اور لفظی کفایت شعاری کا بھی شعوری طور پر اہتمام فرماتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں آرائشی جملے اور فقرے یا غیر ضروری مرادفات نظر نہیں آتے۔

مولانا اعظمی کا سانحۂ وفات ۱۱ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء کو پیش آیا۔ اپریل ۱۹۹۲ء کے معارف میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ''محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی'' کے عنوان سے مبسوط تعزیتی مضمون تحریر فرمایا۔ موقع ومحل کی مناسبت سے یہاں اس کا ایک مختصر اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مولانا سلیس، شگفتہ، پُر مغز اور حشو وزوائد سے پاک اردو لکھتے تھے جو ماقلّ ومادلّ کا نمونہ ہوتی تھی۔ مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے معارف اور برہان میں متعدد محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان میں سے اکثر میں کسی مصنف یا مقالہ نگار کی فروگذاشتوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اور یہ بڑے بیش قیمت ہیں جن سے علمی وتحقیقی کام کرنے والے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔''

انھیں معروضات پر اس گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اسے تحسینِ ناشناس پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

جنھیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں

از : مفتی عبدالباطن نعمانی ☆

محدّث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہٗ سے عقیدت ومحبت مجھے وراثت میں ملی ہے۔خانوادۂ ابراہیمی سے حضرت ؒ کوایک خاص تعلق خاطر رہا ہے۔ یہاں صرف دوواقعات نقل کرر ہاہوں جن سے اس تعلق کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

۱-حضرت اقدس کا معمول تھا کہ بنارس تشریف لاتے یا بنارس سے گذرتے تو غریب خانہ پرضرورتشریف لاتے۔جنوری ۱۹۸۶ء میں جب بلادعرب کےایک علمی سفرسے واپس ہوئے تو حسب معمول مئو جانے سے قبل گھر تشریف لائے،لیکن اس باران کی تشریف آوری ایسے وقت میں ہوئی کہ ان کے ہمیشہ کے میز بان اور خانوادۂ ابراہیمی کے بزرگ تر فرد میرے بڑے ابا حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب ؒ کا جسد خاکی تجہیز وتکفین کے انتظار میں تھا۔

میرے والد مفتی بنارس وخطیب شاہی مولانا عبدالسلام نعمانی نوراللہ مرقدہٗ کو حضرت کی تشریف آوری کی خبر ہوئی،تو انھوں نے حضرت ؒ سے درخواست فرمائی کہ بڑے ابّا کی نماز جنازہ وہی پڑھائیں۔میرے والدمحترم ؒ اور مولانا اعظمی ؒ کے مابین خاندانی تعلق کےعلاوہ شفیق استاذ وشاگرد کا بھی تعلق تھا۔حضرت نے یہ درخواست قبول فرمائی مگر یہ کہتے ہوئے کہ:

''میں نے ہی نکاح پڑھایا تھا میں ہی نماز جنازہ بھی پڑھاؤں؟''

۲-تقریباً دو برس ہوئے میرے برادرمحترم جناب شمیم طارق صاحب (سب ایڈیٹر اردو بلٹز۔بمبئی) نے ہفت روزہ بلٹز میں ''ستارہ جو آفتاب بن گیا'' کےعنوان سے علم حدیث کی اہمیت وضرورت اوراس علم میں علماء ہند کی بےمثال خدمات کے آئینہ میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ؒ کی شخصی اور علمی خوبیوں کا بڑا عالمانہ تعارف کرایا تھا۔اس سے پہلے مدارس اسلامیہ

☆ مدرسہ مظہرالعلوم وامام جامع مسجد گیان باپی بنارس

سے تعلق نہ رکھنے والے حلقوں میں مولانا اعظمی ﷫ کی شایان شان کوئی مضمون نہیں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون حضرت اقدس ﷫ کی حیات ہی میں شائع ہوا اور آپ نے خود بھی اسے ملاحظہ فرمایا۔

برادر محترم کبھی کسی درسگاہ سے وابستہ رہے ہیں نہ ہی مولوی یا عالم ہیں۔ جب وہ بنارس آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ ادب، صحافت، شاعری اور تاریخ وتصوف سے آپ کا تعلق تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن ہندوستان میں علم حدیث اور حضرت مولانا ﷫ کی خدمات جلیلہ پر یہ مضمون لکھنے کی ترغیب وتحریک کیسے ہوئی؟ تو برادر محترم نے جواب دیا کہ پہلی بات تو یہ کہ حضرت ﷫ کا ہی روحانی تصرف اور فیض عام تھا کہ مجھ جیسے بے علم و بے عمل شخص کو اس باب میں قلم اٹھانے کی توفیق ہوئی۔

دوسری بات یہ کہ خیر امت پر اللہ پاک کا ایک خاص کرم یہ ہے کہ اکثر شر سے بھی خیر کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ دور حاضر میں ابلیس اور اس کی ذریت نے انکار نبوت کی مختلف صورتوں اور شکلوں کو رائج کرنے کی کوششیں کیں مگر ناکام رہے، اس کے بعد اس نے انکار کلام نبوت کے فتنے کی آبیاری کی کوششیں کیں۔

ایک طرف تو دنیاداروں میں وہ طبقہ پیدا ہوا جس نے حدیث کو غیر ضروری کہا، اسے مشکوک بتایا، یا کسی اور شکل میں اس کی عظمت کا منکر ہوا، اور دوسری طرف خود کو دیندار کہنے والوں میں ایسے لوگ سر اٹھانے لگے جو قرآنی احکام وتعلیم کے لئے حدیث کو غیر ضروری بتاتے تھے، یا حدیث کو ماننے کے مدعی تو تھے مگر عملاً اپنے بزرگ، شیوخ اور اصحاب سلسلہ کے احوال واقوال کو حدیث پر ترجیح دیتے تھے۔ -------- یہ دونوں ہی فتنے ابلیس اور اس کی ذریت کی مجلس ہی میں طے پائے ہوئے تھے، اس لیے مجھ جیسے لوگوں کو اس کی خبر پہلے ہوئی کیوں کہ ابلیس کے ہم نشیں ہم ہی جیسے لوگ ہیں۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ اس نے فتنہ کے سد باب کے لیے ہم سے بھی کچھ کام لے لیا اور شر سے خیر کا پہلو نکل آیا۔

ان دونوں واقعات سے ظاہر ہے کہ میری تربیت میں حضرت ﷫ کی محبت وعقیدت کا اثر مل رہا ہے۔

لیکن میں اس مضمون کو محض اس عقیدت کی بنیاد پر لکھنا نہیں چاہتا جو مجھے وراثت میں ملی ہے۔ میں علمی شواہد کی بنیاد پر اس مضمون کو مکمل کرنا چاہتا ہوں تا کہ وہ بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت ومحبت سے خود کو بہرہ ور کرسکیں جو اس سعادت سے محروم ہیں۔

ملفوظات عزیزی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ تجربے میں ہے کہ خادم حدیث کی عمر اگر سو برس سے بھی زیادہ ہو جائے تب بھی اس کے ہوش وحواس میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس کی جیتی جاگتی مثال حضرت رحمۃ اللہ علیہ خود تھے، جو آخری لمحے تک حدیث میں علمی انہماک وجستجو فرماتے رہے۔

مکہ معظّمہ میں علمائے عرب وعجم کے نمائندہ اجتماع میں جہاں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہ العالی اور مولانا منظور نعمانی بھی شامل تھے، سابق شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ فی زمانہ عرب وعجم میں اگر کوئی محدث کہلانے کا مستحق ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ہیں۔

آپ کے شاگرد اور حدیث میں سند حاصل کرنے والے دنیا بھر میں موجود ہیں، بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اخلاف اور اسلاف کے درمیان کی کڑی حضرت رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس کڑی کو ہٹا دینے کی صورت میں درس حدیث اور اجازت حدیث کا تسلسل باقی نہیں رہے گا۔

برصغیر میں حدیث کی اہم کتابوں پر شرحیں لکھنے اور حاشئے تحریر کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ حضرت محدث الاعظمی کی تصنیفات وتالیفات کو اسلاف کی اسی روایت کی توسیع قرار دینا یا حدیث میں اکابر کی تحقیقی خدمات کے تسلسل کی ایک اہم کڑی کہنا بہت صحیح ہے۔ اسی روشنی میں ان کی اہمیت وحقیقت اور افادیت کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

محدث اعظمی کا ایک غیر مطبوعہ خط

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب آرزو☆

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی علیہ الرحمہ سے اسلامیات کا کون طالب علم ہے جو واقف نہیں۔ ہندوستان، پاکستان اور شرق اوسط کے علماء میں جس نے ان کی مرتب کردہ مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی، کتاب الزہد والرقائق للامام عبداللہ بن مبارک، سنن سعید بن منصور، المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ للحافظ ابن حجر العسقلانی، کشف الاستار عن زوائد مسند بزار للہیثمی، مختصر الترغیب والترہیب لابن حجر، مصنف ابن ابی شیبہ دیکھی ہے، وہ ان کی جلالت علمیہ کا ضرور قائل ہوگا۔

افسوس ہے کہ ایسے جلیل القدر عالم سے صرف ایک بار ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی لغات حدیث کی ایک اہم کتاب مجمع بحار الانوار کی ترتیب وتصحیح میں دلچسپی لے رہے تھے اور اس کے قلمی نسخوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے مخطوطات سے میری دلچسپی اور واقفیت کا کچھ اس طرح ان سے ذکر کیا کہ انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، مولانا تقی امینی نے -جن کے یہاں وہ قیام پذیر تھے- مجھے مولانا اعظمی کے ورود علی گڈھ کی خبر دی اور رات کے کھانے پر مدعو کرلیا۔ میں مولانا کی زیارت کا خود مشتاق تھا، ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا اور دیر تک ان کے پاس بیٹھا اور ان کے علم سے مستفید ہوتا رہا۔ ان کا حافظہ بہت مضبوط تھا اور علم متحضر، تبحر علمی کے باوجود، انھیں خلیق اور متواضع پایا۔ ان میں وہی سادگی اور انکسار دیکھا جو قدیم عالموں اور صوفیوں میں پایا جاتا تھا۔ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مرحوم اس علمی سفر میں ان کے ساتھ تھے، مجمع بحار الانوار کے ذکر پر میں نے عرض کیا، کتاب واقعی اس لائق ہے کہ آپ جیسا محدث ومحقق اسے مرتب کرے۔ والد علیہ الرحمۃ کے کتاب خانے میں اس کا قدیم مطبوعہ نسخہ (ہندوستان میں لیتھو کا چھپا ہوا) موجود ہے، آپ فرمائیں تو حاضر کردوں تاکہ تصحیحات

☆ سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

واضافات واستدرکات آپ اسی نسخے پر کریں اور پوری کتاب آپ کونقل کرانے کی ضرورت نہ ہو۔ فرمایامطبوعہ نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ دوسرے دن میں نے انھیں اور مولانا عبدالحفیظ کو کتب خانے کی سیر کرائی اور وہاں کے نفائس مخطوطات اوران کے ذوق کی کتابیں دکھائیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ یہاں تشریف لائے ہیں تو ذخیرہ مولانا عبدالحی لکھنوی ضرور دیکھیے ،اس میں حدیث ومتعلقات حدیث کی کچھ نادر کتابیں محفوظ ہیں۔ میں اس زمانے میں سبط ابن العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) کے تصنیف کردہ متعلقات حدیث کے تین رسالے **الاغتباط بمن رمي بالاختلاط، التبيين لأسماء المدلسين** اور **تذكرة الطالب المعلم بمن يقال انه مخضرم** مرتب کررہا تھا، جواس ذخیرے میں محفوظ تھے اور سب کے سب سبط ابن العلقمی کی تحریرات وتعلیقات سے مزین تھے۔ یہ بظاہران کے کتب خانے کے نسخے تھے جواور کتابوں سے بچھڑ کر حلب سے لکھنؤ اور پھر وہاں سے علی گڈھ آکر محفوظ ہوگئے تھے۔ مولانا اعظمی نے بڑی توجہ اور شوق سے ان نسخوں کا مطالعہ کیا۔

اس ملاقات کے بعد پھر ان کی زیارت کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ ان سے غائبانہ تعارف بہت پہلے ان مضامین سے ہوا تھا، جو وہ معارف (اعظم گڈھ)، برہان (دہلی) اور دوسرے رسالوں میں لکھتے رہے تھے، پھر ان کی مرتب کردہ کتابیں دیکھنے کا موقع ملا۔ خط وکتابت بھی زائد نہیں ہوئی، کچھ ان کی علمی مصروفیات کا بھی خیال رہا۔ مصروفیات کے باوجود خط وکتاب میں انھیں بہت پابند پایا۔ دو تین خط میں نے انھیں لکھے اوران کا جواب فوراً آیا۔ ایک خط میں میں نے ان سے پوچھا تھا کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فتح المنان فی تائید مذہب النعمان جو مسلک احناف کی تائید میں احادیث کا ایک مجموعہ ہے، کہاں ملے گا؟ میرے والد حضرت مولانا ظفرالدین قادری علیہ الرحمۃ مؤلف صحیح البہاری اس کتاب کے بڑے قدرداں تھے اوراس کی تعریف میں انھیں ہمیشہ رطب اللسان پایا۔ مولانا کا فوراً جواب آیا کہ اس کے دو نسخے مئوناتھ بھنجن اعظم گڈھ، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ دوسرے گرامی نامے میں انھوں نے پوچھا تھا کہ آپ کے والد علیہ الرحمۃ نے مؤذن الاوقات مختلف مقامات کے لیے مرتب کی تھی، اگر اعظم گڈھ کے لیے بھی مرتب کی ہو تو اس کا ایک نسخہ بھیج دیجیے۔ یہ دونوں خط اس وقت تلاش کرنے پر بھی نہیں مل سکے تیسرا خط محفوظ تھا جس کا متن پیش کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ گزارشات پیش کررہا ہوں۔

(۱) ابتداء میں جن کاغذوں کا ذکر ہے وہ صدر جمہوریۂ ہند کے ایوارڈ کے لیے میں نے ان سے طلب کئے تھے کہ ان کے علمی کوائف وزارت تعلیمات کو بھیجنے تھے۔ میں ان کی گوشہ نشینی اور دنیاوی معاملات سے کنارہ کشی کی وجہ سے بھی اپنا فرض سمجھتا تھا کہ حکومت ہند کو متوجہ کروں۔

(۲) اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں، اسے ۱۹۸۴ء کے اواسط کا ہونا چاہیے، اس لیے کہ مولانا کو یہ ایوارڈ ۱۴/ اگست ۱۹۸۴ء کو تفویض ہوا تھا۔

(۳) مولانا نے راقم الحروف اور دوسرے اصحاب کی اس تحریک کو کچھ پسند نہیں کیا، جیسا کہ الفاظ ''میرے خیال میں پہلے میرا عندیہ معلوم کرنا ضروری تھا'' سے ظاہر ہوتا ہے، اس سے ان کی اعلیٰ شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

(۴) علامہ ناصر الدین البانی کے کچھ رسائل جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس اور دوسرے مقامات پر نظر سے گزرے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مولانا نے ان کی رد میں **الالبانی شذوذه وأخطاؤه** لکھ کر شائع کی ہے۔ میری طلب پر مولانا نے اس کے چاروں حصے فوراً بطور ارمغان بھیج دیے۔

(۵) ناشرین کتب کے رویے کا ذکر مولانا نے ایک فقرے میں دیکھیے کس انداز میں کیا ہے۔

> ''جن کتابوں کی تحقیق میں نے کی ہے ان کے ناشرین نے صرف ایک نسخۂ بطور خیرات کے مجھے عطا فرمایا ہے''۔

مصر میں ڈاکٹر طہ حسین اور الاستاذ احمد محمد شاکر کے بھائی الاستاذ محمود محمد شاکر کے بارے میں سنا تھا کہ دار المعارف یا کوئی پبلشر کسی کتاب کا مسودہ آپ کے لیے بھیجتا تھا تو مسودہ سننے اور پڑھنے اور اپنے دینے کا معاوضہ ایک ہزار مصری پونڈ پیش کرتا تھا۔ الاستاذ عبدالسلام محمد ہارون، الاستاذ محمود محمد شاکر، الاستاذ محمد ابوالفضل محمد ابراہیم، الاستاذ احمد فراج، الدکتور محمد یوسف نجم، الدکتور احسان عباس، الاستاذ محی الدین عبدالحمید کی مرتب کردہ کتابوں پر انھیں ہمیشہ بہت اچھا معاوضہ ملا۔ مولانا اعظمی کی دینداری، حدیث شریف سے شغف اور علم سے محبت تھی کہ وہ معاوضے کی پرواہ کیے بغیر اپنے علمی کاموں میں ہمیشہ مصروف رہے۔

خدا احادیث نبوی کے اس خادم کو جزائے خیر دے، انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے، ان کی تربت ٹھنڈی رکھے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

مکتوب گرامی حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

''فاضل گرامی ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ایک دن اچانک ایک صاحب اعظم گڈھ سے آئے، فرمانے لگے کہ فلاں صاحب نے آپ کی تاریخ پیدائش اور تصنیفات کی فہرست مانگی ہے، میں نے کہا آج میں مصروف ہوں کل کسی کے ہاتھ بھجوادوں گا، انھوں نے کہا میں رک جاؤں؟ میں نے کہا ممکن ہے کل بھی فرصت نہ مل سکے تو آپ کو تکلیف ہوگی۔ وہ میرے یہاں سے چلے گئے، دوسرے دن میں نے اپنے لڑکے سے لکھوا کر ایک طالب علم کے ہاتھ اعظم گڈھ مطلوبہ چیزیں بھجوادیں، جو صاحب آئے تھے انھوں نے بتایا نہیں کہ مقصد کیا ہے، طالب علم نے بھی آ کر کچھ نہ بتایا، پھر کئی دن کے بعد وہی صاحب آئے کہ مولوی رشید احمد صاحب کو کچھ کاغذات لے کر علی گڈھ جانا ہے، میں نے کہا ان سے بات کیجیے، وہ چلے گئے، پھر میں نے آدمی بھیج کر کہلا دیا کہ رشید احمد نہ جائیں گے، اگر میرا یا ان کا کوئی کام ہے تو آپ چلے جایئے مصارف سفر رشید احمد دے دیں گے، وہ مصارف لے کر چلے گئے، لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ کس مقصد کے لیے یہ دوا دوش ہو رہی ہے، اتفاق سے جن کے پاس وہ صاحب مئو میں مقیم ہوئے تھے وہ ایک دن آ گئے تو وہ کہنے لگے کہ مجھے تحقیق تو نہیں ہے مگر غالباً اگست والے سرکاری اعزاز کے حصول کے لیے یہ کوشش ہو رہی ہے، اور اب معلوم ہوا کہ جناب کا بھی اس میں ہاتھ ہے، چونکہ آپ نے نیک نیتی کے ساتھ میرے ساتھ ایک بہتر سلوک کیا ہے اس لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں، مگر میرے خیال میں پہلے میرا عندیہ معلوم کرنا ضروری تھا۔

''الالبانی شذوذه وأخطاؤه'' اگر آپ کے پاس نہیں ہے تو میں اس کو بھجوا سکتا ہوں، باقی جن کتابوں کی تحقیق میں نے کی ہے ان کے ناشرین نے صرف ایک نسخہ بطور خیرات کے مجھ کو عطا فرمایا ہے، باستثنائے ''مطالب عالیہ'' مگر اس کے نسخے بھی ایک ایک کر کے ختم ہو گئے، مصنف عبدالرزاق مجلس علمی ڈابھیل ضلع بلساڑ (سورت) نے شائع کی ہے، میں اس کے ناظم کو لکھوں گا، کہ ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کتب خانہ کے لیے ضرور ہدیۃً بھیجا جائے''۔

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

آہ، والد مرحوم

مولانا رشید احمد ابن محدث اعظمی رحمۃ اللہ ☆

والد مرحوم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ کا سانحۂ وفات ہمارے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا، ان کا سایۂ عاطفت ہمارے سروں پر ابر رحمت بن کر رہا، ان کی شفقتوں اور عنایتوں نے ہمیں غم دنیا سے بے نیاز کر رکھا تھا، ان کی عظمت وشہرت کے گھنے سائے میں ہم دنیا کے مشاہیر علماء، اکابر مشائخ اور اسلامی دانشوروں اور مفکروں سے ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل کرتے تھے، اور میزبانی کے فرائض ادا کرکے ہم خود کو خوش نصیب انسانوں میں تصور کرتے تھے، اور جب عظمت وشہرت کا یہ آفتاب عالمتاب غروب ہوگیا تو ہمارے جذبات کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا، ہمارے حوصلوں اور امنگوں کی دنیا تاریک ہوگئی، دل جذبات سے خالی اور زندگی روحانی نشاط سے محروم ہوگئی، نگاہیں، نگاہیں خلاؤں میں والد مرحوم کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں اور ہر بار تھکے قدموں سے واپس ہوکر ہماری کربناک زندگی کو اور بھی کربناک بنا دیتی تھیں۔

لیکن جب اس حادثہ جانکاہ کی خبر پورے ملک میں اور ملک کے باہر پھیلی اور عام ہوئی، تو مشاہیر علماء، مشائخ، اسلامی دانشوروں اور مفکروں کے ٹیلیگرام اور تعزیت ناموں کا تانتا بندھ گیا۔ اس وقت ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہم جن اکابر کی خاک پا کے برابر بھی نہیں، جب ان کی آنکھیں اس المناک حادثہ پر نمناک ہیں، تاجداران علم وفن کی محفلوں میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے، محدثین عالم اور اسلامی علوم وفنون کے محققین اس کو اپنا غم سمجھتے ہیں اور طالبان علوم نبوی ہمارے غم میں برابر کے شریک ہیں، تو ہم اپنا غم بھول گئے اور ہمیں ندامت ہوئی کہ ہم تو صرف خون کے رشتے سے اس حادثۂ جانکاہ کو یاد کر رہے تھے اور اسلامی دنیا والد مرحوم کے زندۂ جاوید اور عظیم الشان کارناموں کے تسلسل کے ختم ہونے کا ماتم کر رہی تھی، اور ظاہر ہے کہ یہ غم ہمارے غم سے کہیں بڑھا ہوا ہے، اس لیے قدرتی طور پر ہمارے

☆ ناظم مدرسہ مرقاۃ العلوم، وسرپرست، رسالۂ ہذا۔

سروں پر صبر وسکون کا سایہ گہرا اور گھنا ہوتا چلا گیا اور ہم اس روح فرسا سانحہ کو انگیز کر گئے۔

ہم ان تمام حضرات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے ہمیں خطوط اور تعزیت نامے لکھے، ہمارے سروں پر اپنا دست شفقت رکھا اور ہمارے غموں کو ہلکا کیا، جن اکابر نے ہمیں تعزیت نامے تحریر فرمائے، ٹلیگرام کے ذریعہ ہماری اشک شوئی فرمائی، جن اداروں نے تعزیتی جلسے کیے، اور تعزیتی تحریریں منظور کیں اور مولانا مرحوم کی علمی ودینی خدمات اور کارناموں کو خراج تحسین پیش کیا، ہم ان سب کے ممنون ہیں، ان کی ایک فہرست اور تاثرات نیچے دے رہے ہیں:

فضیلۃ الشیخ عبداللہ سُبَیِّل امام حرم (مکہ مکرمہ) ٹیلیگرام:

ہم آپ کے والد محترم کے حادثۂ وفات کی خبر سن کر بہت زیادہ رنجیدہ ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ (ریاض) سعودیہ عربیہ:

حضرت مولانا کی وفات عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت ہے، یہ مرضی الٰہی ہے کہ اس نے آپ کو اپنے جوار میں بلالیا، میں پریشان کن سفر میں تھا، اور مسلسل کاموں میں گھرا ہوا رہا، اس لیے تاخیر سے یہ خط لکھ رہا ہوں، حالانکہ میرا دل مولانا کے انتقال سے انتہائی غمزدہ تھا، ''**الشرق الأوسط**'' میں جب انتقال کی خبر پڑھی، تو مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

چند ماہ ہوئے کہ میں نے مولانا مرحوم کو ایک خط لکھا تھا، جس میں میں نے اپنے دوست محمد رشید اور اپنے بیٹے سلمان کے لیے روایت حدیث کی اجازت طلب کی تھی، اگر وہ خط ملا ہو اور اس وقت مولانا زبانی گفتگو سے معذور رہے ہوں اور میرا خط سننے کے بعد اشارے سے بھی اجازت دی ہو تو مجھے مطلع کردیں، کیونکہ حدیث میں بھی اور خود ہمارے امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی **الإشارة أشهر طرق التعريف** کی صراحت ہے، اگر بات پوری ہوگئی تو مجھ کو بتایئے تاکہ میں اجازت طلب کرنے والے عزیزوں اور دوستوں کو اجازت کی اطلاع دیدوں۔

میرے دوست الشیخ محمد عوامہ نے بھی آپ کو خط لکھا ہے اور مولانا مرحوم کے کچھ رسائل آپ سے وہ لینا چاہتے ہیں تاکہ مولانا کی یاد تازہ رہے۔

الشیخ محمد عوامہ مدینہ منورہ:

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی وفات کی خبر ملی، آپ تنہا اس مصیبت میں گرفتار نہیں ہیں، بلکہ یہ تمام امت مسلمہ کے لیے بڑی مصیبت ہے أعلی اللّٰہ مقامہ فی علیین، مولانا کی حیات میں علمی حلقوں میں کوئی خلا محسوس ہی نہیں ہوتا تھا، لیکن آپ کے انتقال کے بعد اب ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے کہ اس کا پُر ہونا موجودہ حالات میں ممکن نظر نہیں آتا۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند...(ٹیلیگرام):

حضرت مولانا کے سانحۂ ارتحال پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ٹیلیگرام میں بتایا کہ آج ہم نے عالم اسلام کے سب سے بڑے محدث کو کھودیا اور ہماری صفوں میں ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے کہ اب اس خلا کا پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ:

بڑی شرمندگی اور احساس تقصیر کے ساتھ تعزیت کا یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں، میری صحت تقریباً ایک ماہ سے زیادہ کمزور اور متاثر ہے، اس حالت میں نہ ہوتی تو قدیم تعلقات اور جانے والے کی جلالتِ شان اور حقوق کی بنا پر میں تعزیت کے لیے حاضر ہوتا، لکھنؤ میں نہ ہونے کی وجہ سے مجھے کسی قدر تاخیر سے اطلاع ملی، جس دن سے یہ خبر سنی ختم خواجگان کے بعد جو روزانہ نماز عصر کے بعد ہوتا ہے حضرت مولانا کے لیے دعاء مغفرت ورفع درجات ہوتی ہے، انشاء اللہ دارالعلوم کھلنے پر اہتمام سے ایصال ثواب بھی کیا جائے گا۔

ڈاکٹر محمد طاہر نورلی (مکہ مکرمہ):

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی خبر وفات سے انتہائی صدمہ پہنچا، آپ کی وفات سے امت اسلامیہ ایک عظیم المرتبت عالم اور ایک ایسے امام وقت سے محروم ہوگئی جس نے عظیم الشان علمی خدمات انجام دیں، اور احادیث رسول کی حفاظت کے لیے اہم ترین کارنامے انجام دیئے، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ خداوند قدوس ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں بلند مقام دے۔

یو، کے اسلامک اکیڈمی (برطانیہ):

آخر جس آنے والے صدمہ کے خیال سے ہم لرزاں وترساں تھے، وہ آخر پیش آکر رہا إنـــا

للّٰہ و إنا إلیه راجعون. یہ غم تنہا آپ کا نہیں، بلکہ پوری اسلامی دنیا کا غم ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر وحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ:

محدث جلیل مخدومنا مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے حادثۂ وفات کی خبر حقیقۃً علمی حلقوں کے لیے صاعقہ اثر ثابت ہوئی، اس حادثے سے ہندوستان کا وہ امتیاز بظاہر اب ختم ہوگیا جس کا اعتراف علامہ رشید رضا مصری نے برملا کیا تھا کہ اس آخری دور میں علم حدیث کی خدمت کا سہرا ہندوستان کے سر بندھا، اس لیے یہ خسارہ صرف ایک خاندان یا ایک ملک کا نہیں، بلکہ پورے برصغیر کا خسارہ ہے۔

مفتی نظام الدین صاحب صدر مفتی دار العلوم دیوبند:

صدمہ جانکاہ کی خبر نے کچھ دیر کے لیے مدہوش کردیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے احقر کو جس قدر محبت وعقیدت تھی، اس کو زبان وقلم ادا کرنے سے قاصر ہیں اور بجز صبر چارہ نہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال محض ایک کنبہ وخاندان کے لیے نہیں، بلکہ سارے عالم اسلام کے لیے ہے۔ آپ کی ذات گرامی عالم اسلام میں مغتنمات روزگار اور بے مثال تھی، ممتاز ترین علماء میں بھی انگلیوں پر گنے چنے چند افراد کے اندر بھی ممتاز ونمایاں تھی۔

مولانا محمد رابع حسنی ندوی استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ:

حضرت مولانا بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے اور فن حدیث میں ان کا مقام بہت بلند تھا، ان کی وفات سے علوم حدیث کے حاملین اور مسلمان علماء اور رہبران ملت کی صف میں غیر معمولی نقصان ہوا ہے، جس کی تلافی جلد مشکل ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شفقتوں سے میں ذاتی طور پر متمتع ہوا ہوں اور عقیدت ومحبت کا بہت قریبی تعلق رکھتا رہا ہوں، اور ان کو اپنا استاذ سمجھتا رہا ہوں اور ان کے وجود کو ملت اسلامیہ کا قیمتی سرمایہ تصور کرتا رہا ہوں۔

مفتی ظفیر الدین دار الافتاء دار العلوم دیوبند:

ہم سب کا محور ومرکز جاتا رہا، ہمارا علمی ماویٰ ختم ہوگیا، ہمارا آفتاب وماہتاب روپوش ہوگیا، وہ گو تنہا تھے مگر ایک جماعت اور پوری اکیڈمی پر بھاری تھے، ہم جیسے ہزاروں کے استاذ تھے، مربی تھے، پیشوا تھے، ہمارے درد اور بیماریوں کی دوا اور شفاء تھے، کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے سب کچھ مولانا ہی تھے،

ہمارے ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر بلکہ عرب وعجم کے مایۂ ناز محدث جلیل، علوم نبوی کے ماہر وحامل اور محدث کبیر تھے، جن کی مہارتِ علم نبوت پر علماء کرام کو فخر تھا اور سر اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ علم حدیث کا ایسا استاذ، رہنما دوسرا نظر نہیں آتا۔

مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی دارالافتاء دارالعلوم دیوبند:

مجھے اس وقت رہ رہ کر حضرۃ الاستاذ مولانا مرحوم کے کمالات، ان کی خوبیاں اور دوسری بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں، میرے ساتھ کس درجہ تعلق ومحبت اور شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ آہ! میں آج اپنے مربی ومشفق اور سب سے بڑے محسن ومعتمد استاذ اور روحانی باپ سے محروم ہوگیا۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

مفتی منظور احمد مظاہری قاضی شہر کانپور:

حقیقت یہ ہے کہ علم وفضل کا آفتاب غروب ہوگیا، استاذ الاساتذہ، مرجع العلماء کی جدائی اور ان کے فیوض علمیہ سے محرومی پر علماء برسوں آنسو بہاتے رہیں گے، اب کون ہے جو اہل علم کے لیے وجہ تسکین بنے گا۔ اللہ اپنے خزانہ غیب سے کوئی فرد جلیل کا مثل نہیں تو قریب المثل عطا فرمادے، دل ودماغ افسردہ ہیں، قلم میں کوئی طاقت باقی نہیں رہی کہ اس وقت مزید کچھ عرض کرسکوں، اس وقت تو جی چاہتا ہے کہ کوئی مرد حقانی ہمیں تعزیت کرتا، ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔

مولانا اقبال احمد ندوی مبعوث دارالافتاء ریاض (نائیجریا):

حضرت مولانا کے حادثۂ وفات کی خبر ملی، یہ صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت بن گیا، یہ عظیم حادثہ آپ پر تنہا نہیں گذرا ہے، بلکہ عالم اسلام اس صدمہ سے دوچار ہے، مولانا مرحوم نے اپنے قلم اور اپنی زبان کو حدیث نبوی کی خدمت کے لیے وقف کررکھا تھا۔ بلا خوف لومۃ لائم اپنے عہد شباب سے سفر آخرت کے وقت تک اس کام میں لگے رہے، مولانا ہمارے لیے بہت بڑا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں، جو حدیث نبوی، عمل اسلامی اور فکرِ اسلامی کے میدان میں ہے۔ آپ کی وفات سارے عالم اسلام کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مولانا بدرالحسن القاسمی الصفات (کویت):

حضرت مولانا کی وفات کا غم پوری امت کا غم ہے، ایسی باکمال ہستیاں تاریخ میں کبھی کبھی

پیدا ہوتی ہیں، مولانا مرحوم کے علمی کارناموں کی بہت بڑی اہمیت ہے، کاش ان پر کوئی کام کرتا، معلوم نہیں انھوں نے کیسے کیسے علمی جواہر چھوڑے ہیں؟

مولانا عبدالخالق زلفی (سعودیہ عربیہ):

ایک خط کے ذریعہ حضرت مولانا کے انتقال کی اندوہناک خبر ملی، جس کو پڑھ کر دل چور چور ہوگیا، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون. شب وروز دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

مولانا ظفر احمد، عدن (یمن):

مولانا کے سانحۂ ارتحال کی خبر پڑھ کر بے حد صدمہ ہوا، مئو کی سرزمین سے ایک بہت بڑی ہستی چلی گئی، جس پر لوگوں کو ناز تھا۔

المعہد الاسلامی، واٹروال، جوہانسبرگ (ساؤتھ افریقہ):

حضرت مولانا مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کے حادثۂ وفات کی خبر ملی، خدا مغفرت فرمائے اور آخرت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس خلا کو پُر کرنے والا اس وقت کوئی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہی اب ہماری رہبری اور نصرت فرمائے اور مولانا مرحوم کی عظیم خدمات کو علماء اسلام اور امت مرحومہ کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند بنائے۔

مولانا محمد سعید ریاض (سعودیہ عربیہ):

مسلمانوں کے لیے عموماً اور ہم لوگوں کے لیے خاص طور پر بہت بڑا ملی وعلمی حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔

نظامت تعلیمات دارالعلوم دیوبند:

محدث کبیر، فخر المحدثین، امیر الہند، مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے خصوصی ممبر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی وفات کی خبر سن کر ہم ہمدردانِ دارالعلوم کو بے حد صدمہ ہوا۔ حضرت ہمارے استاذ اور روحانی باپ تھے، ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند:

حضرت مولانا مرحوم کا سانحۂ ارتحال پوری ملت اسلامیہ کے لیے ایک عظیم حادثہ ہے، خدا

وند کریم حضرت مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔

مظاہر علوم (دار جدید) سہارنپور:

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی وفات نے دل و دماغ کو ناقابل برداشت جھٹکا لگادیا، مولانا کی ذات موجودہ علمی کم مائیگی کے دور میں قرون اولیٰ کے علمی امتیازات کے علمبردار تھی، ان کی علمی خدمات اوران کی بلند وبالا شخصیت کی اسلامی ادارے اور علوم دین سے تعلق رکھنے والے ایک عرصہ تک کمی محسوس کرتے رہیں گے۔

مظاہر علوم (وقف) سہارنپور:

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے انتقال کی خبر کلفت اثر معلوم ہوکر افسوس، قلق اور رنج ہوا۔ حضرت اس دور کے اجل علماء میں تھے، علم حدیث اور اسماء الرجال میں تو ان کو بڑا ملکہ اور ید طولیٰ حاصل تھا، وہ علم حدیث کے باکمال حضرات میں ایک نمایاں اعلیٰ اور امتیازی حیثیت کے مالک تھے، ان کی وفات کا حادثہ فاجعہ علمی دنیا کا زبردست خسارہ ہے۔

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد:

حضرت امیر الہند کا سانحۂ وفات نہ صرف ان کے خاندان کے لیے، بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے درد وکرب کا باعث بنا۔

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل:

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی دردناک خبر وفات سنی تو تھوڑی دیر کے لیے تو سکتہ کا عالم رہا، پھر دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں درجات عالیہ سے نوازے۔ ہم سب حضرت مولانا کے فراق میں درد وغم کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔

مولانا باقر حسین صدر دارالعلوم الاسلامیہ بستی:

بلاشبہہ مولانا ایک عظیم عالم دین اور عصر حاضر میں علم حدیث وفقہ میں کمال ومہارت کا لاثانی نمونہ تھے، ان کی رحلت سے صرف ہندوستان ہی نہیں، بلکہ عالم اسلام میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا پُر ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے، حدیث کے متعدد نایاب مخطوطوں کو دریافت کرکے ان کی تصحیح وتعلیق کے بعد شائع کرنا ایسا عظیم اور زندہ جاوید کارنامہ ہے جس کی نظیر دور حاضر تو کیا پچھلی کئی صدیوں میں مشکل سے ملے گی۔

مولانا غیاث الدین مرکز اسلامی الٰہ آباد:

حضرت المحدث الجلیل علیہ الرحمۃ والرضوان کی خبر وفات سن کر دل پر جو اثر ہوا اس کا بیان زبان وقلم سے کس طرح ہوسکتا ہے؟ آج کل تو یہ رسم بن گئی ہے کہ کسی کے بھی انتقال پر ''**موت العالم موت العالم**'' جیسے جملے کہہ دیئے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح کے جملوں کا اصلی مفہوم کھوسا گیا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک زبان وقلم میں احتیاط تھی اس طرح کے جملے اور الفاظ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی جیسی شخصیت سے امت کی محرومی کے موقع پر استعمال ہوتے تھے، ان کے قلم سے حدیث نبوی کی جو عظیم ونادر خدمات ہوئیں ان کے صلہ میں انھیں اپنے رب کے حضور کیا سرخ روئیاں حاصل ہوئی ہوں گی، اس کا اندازہ اس مادی دنیا کے رہنے والے کیا کر سکتے ہیں!

دارالعلوم اسلامیہ ماٹلی والا بھڑوچ (گجرات):

المعہد العالی کے سرپرست، امیر شریعت ہند، محدث اعظم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے انتقال پر ملال کی خبر سن کر انتہائی صدمہ ہوا، جس کا اظہار زبان وقلم سے دشوار ہے۔

ضیاء الرحمٰن انصاری سابق مرکزی وزیر حکومت ہند:

حضرت اقدس کے انتقال نے علمی حلقہ میں جو خلا پیدا کر دیا ہے، اس کا پُر ہونا ناممکن نہیں تو اس دور قحط الرجال میں دشوار اور محال ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کی قبر اطہر کو منور فرمائیں اور اپنے جوار رحمت میں قبول فرمائیں۔

مولانا عمار احمد، افضل المعارف، الٰہ آباد:

بلاشبہہ اس عظیم شخصیت کی رحلت اس صدی کا عظیم ترین سانحہ ہے، اکابرینِ امت کا ایک ایک کر کے اٹھ جانا ہمارے لیے بڑی محرومی کا سبب ہے، احقر نے خود بھی ایصال ثواب کیا اور انشاء اللہ کرتا رہے گا اور مدرسہ میں بھی ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا گیا۔

سلیم شیروانی ایم۔ پی الٰہ آباد:

سانحہ عظیم کی خبر ابھی ابھی ٹیلیفون سے سرفراز صاحب کے ذریعہ ملی، افسوس کہ یہ بدنصیب اس موقع پر حاضر نہ ہوسکا۔

مولانا سید احمد ہاشمی، ناظم عمومی ملی جمعیۃ علماء (دہلی):

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی شیخ الحدیث اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

بیسویں صدی کے اختتام اور پندرہویں صدی ہجری کے اوائل کا یہ ایسا عظیم حادثہ ہے، جس کی تلافی بظاہر ممکن نہیں، یہ شمع شاید آخری شمع تھی، دورتک اندھیرا اور سناٹا نظر آتا ہے، افسوس کہ اسلاف کی یہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی فیا ویلاہ، ویا حسرتاہ۔

ڈاکٹر ابواللیث (مکہ مکرمہ):

مولانا دیوبندی برادری کے تاج تھے، دیوبندی خاتم کے نگینہ تھے، مایہ ناز عالم، محدث وادیب اور جامع کمالات مصنف تھے، مولانا نے جو خلا چھوڑا ہے وہ میرے علم کی حد تک خلاء ہی رہ جائے گا، نہ ویسا اب کوئی محقق ہے، نہ ویسا محدث، نہ ویسا کوئی با کمال مصنف۔

جمعیۃ علماء مہاراشٹر (بمبئی):

حضرت مولانا کی بے مثال علمی وعملی شخصیت اور ایک بافیض عالم اور سادہ زندگی گذارنے والی متقی شخصیت اور خزانۂ علم کے سانحۂ ارتحال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر ہونا ناممکن ہے، ہماری درخواست ہے کہ مولانا کی یادگار میں ایک اکیڈمی قائم کی جائے، جس کے ذریعہ مولانا کے علمی نوادرات کو شائع کیا جائے۔

ابوبکر محمد الہاشمی دائرۃ المعارف حیدرآباد:

آج صبح آٹھ بجے ریڈیو خبروں میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کی خبر صاعقہ بن کر قلب ودماغ پر گری اور ہمارے گھر میں صف ماتم بچھ گئی، کئی گھنٹے گذر چکے مگر دل ودماغ میں قابو نہیں، سارے شہر حیدرآباد خاص کر علمی حلقوں میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی، دائرۃ المعارف کے علماء بھی سخت رنجیدہ ہیں۔ اللّٰھم ارفع درجاته فی أعلی علیین.

ابوالبقاء ندوی نائب ناظم جامعۃ الفلاح بلریا گنج:

مولانا مرحوم سے میں نے ایک سال ندوۃ العلماء میں حدیث کا درس لیا ہے، اس طور پر شاگردی کا شرف مجھے حاصل ہے، رمضان میں حاضری کا ارادہ تھا، مگر اللہ کو یہ سعادت دینی منظور نہ تھی اور علم وتحقیق کا آفتاب اپنی ضیاء پاشیوں کے بعد غروب ہو گیا۔

مولانا عبدالعلیم فاروقی دارالمبلغین لکھنؤ:

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مولانا مرحوم ہم سب کے مخدوم ومطاع، عالم اسلام کے آفتاب

وماہتاب تھے۔اس دور کی تاریخ حدیث ان کے تذکرے کے بغیر کسی طرح مکمل نہیں ہوسکتی، انشاء اللہ اس سلسلے میں ان کی مساعی اور بے نظیر خدمات عنداللہ مقبول ہیں اور دنیا میں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں، کاش ہم بے توفیقوں کو ان کے علوم و فیوض کا کوئی ذرہ نصیب ہوجائے، جدامجد امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی سے حضرت کو جو قربت و اُنس تھا، اس سے آنجناب واقف ہوں گے، نہ معلوم کتنی علمی وتحقیقی کتابیں صرف امام اہلسنت کے ایماء پر تحریر فرمائیں۔

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، ضلع دھولیا، مہاراشٹر:

یہ حقیقت ہے کہ حضرت مولانا کی وجہ سے عام علمائے دیوبند کو بڑی تقویت تھی، اس لیے پوری جماعت میں ایک زبردست خلا پیدا ہوگیا ہے۔

الجامعۃ العالیۃ العربیۃ مئو:

۲۲/ مارچ ۱۹۹۲ء: جامعہ عالیہ عربیہ مئو میں اراکین و اساتذہ اور خصوصی حضرات کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں درج ذیل قرارداد تعزیت منظور ہوئی۔

جامعہ عربیہ عالیہ مئو کے اراکین و اساتذہ منتظمین کا یہ اجتماع علم حدیث وفقہ حدیث میں آفاقی شہرت یافتہ اور ملاعلی قاری اور علامہ طحاوی جیسے شیوخ کی یاد دلانے والی ہستی حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے، حضرت مولانا کی شخصیت علم وعمل، زہد وتقویٰ، سادگی واستغناء میں اپنی مثال آپ تھی، آپ نے درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور تعلیق کے میدان میں وہ بلند مقام حاصل کیا کہ ہندو بیرون ہند میں آپ کو قبول خاص وعام حاصل ہوا، اہل علم کے لیے یہ دور بڑی آزمائش کا دور ثابت ہورہا ہے، جس میں بڑے بڑے اہل علم سیاسی آب وگل میں لت پت نظر آرہے ہیں لیکن الحمدللہ مولانا مرحوم خود کو صاف بچالے گئے، آپ کی عظمت اور مستقل مزاجی میں مومنانہ شان تھی، افسوس ملت کا یہ گنج گرانمایہ ہم سے روپوش ہوگیا۔

جامعہ عربیہ دارالعلوم مئو:

یہ خبر بڑے رنج وغم، درد وکرب، یاس وحسرت اور گہرے صدمے کے ساتھ سنی گئی کہ حافظ ابوزرعہ اور حضرت امام بخاری کی جلالت علمی کے سچے جانشیں، جنید وشبلی کے زہد وتقویٰ کے امین، فقیہ ملت، بیہقی ہند، محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے طویل علالت کے بعد

جان جاں آفریں کو سپرد کردی اور ہمیشہ کے لیے خدا کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔

جامعہ عربیہ مفتاح العلوم مئو:

حضرت مولانا مرحوم قرآن وحدیث اور فقہ کے بلند پایہ استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے، ان کی تصنیف کردہ کتابیں علماء کے حلقوں میں شہرت پذیر اور مقبول ہوئیں، حضرت مولانا مرحوم ایک عظیم یادگار بقیۃ السلف تھے، مولانا موصوف کی شہرت نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ پوری دنیائے اسلام میں تھی، ان کے تلامذہ اور ان سے نسبت رکھنے والوں میں عرب وعجم کے جید علماء شامل ہیں۔

مدرسہ دینیہ غازی پور:

افسوس کہ حضرت مولانا کے وصال سے ایک کبھی نہ پُر ہونے والا خلا پیدا ہوگیا، مولانا کے وصال کا غم تنہا آپ کا اور آپ کے خاندان کا غم نہیں، صرف مئو کا بھی نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام کا غم ہے۔

مدرسہ کرامتیہ دارالفیض جلال پور (فیض آباد):

محدث جلیل، فقیہ نبیل حضرت اقدس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب امیر الہند کے حادثۂ رحلت سے عالم اسلام میں غم ویاس، کرب وملال کا وہ شدید احساس ہے جس کی تعبیر لفظوں میں ممکن نہیں، اس دور قحط الرجال میں ایسی یگانۂ روزگار شخصیات......ملت کے لیے رشد وہدایت کا روشن منارہ تھیں، افسوس ایسی عظیم شخصیت......درمیان سے اٹھ گئی۔

مولانا عبدالحفیظ رحمانی لوہرسن:

حضرت محدث جلیل، زبدۂ محدثین، گوہر شب تاب، اسماء الرجال کی ژرف نگاہی میں ممتاز، گلشن علمی کے گلِ سرسبد، دیدہ ور اہل قلم اور مجلس روحانیت کے صدر نشیں تھے، محدث جلیل اپنی ذات سے ایک انجمن اور بیت العلم تھے۔

مذکورہ بالا اسماء گرامی کے علاوہ بھی ہمارے بہت سے کرم فرما حضرات نے ہمیں خطوط لکھے، ان کی فہرست درج ذیل ہے:

شری کلپناتھ رائے وزیر مرکزی حکومت ہند
مولانا رشید احمد فریدی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل
پروفیسر عبدالرحمٰن مومن بمبئی یونیورسٹی بمبئی
جامعہ فارقیہ صبرحد ضلع جونپور

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور — مدرسہ فرقانیہ شہر گونڈہ
مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف — جمعیۃ علماء ہند نئی دہلی
مدرسہ تعلیم القرآن اورنگ آباد (دکن) — ڈاکٹر ریاض احمد انصاری مالیگاؤں
حافظ محمد سراج صاحب مالیگاؤں — جمعیۃ علماء مئو
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جے پور — عبدالحمید صاحب انصاری ناگپور
مولانا حبیب الرحمٰن نعمانی صدر مومن کانفرنس — مولانا احمد نصر صاحب بنارس
ڈاکٹر علی منظر صاحب انصاری کلکتہ — عبدالخالق لودی مالیگاؤں
ڈاکٹر اشفاق احمد صدر شعبۂ اردو کنور سنگھ ڈگری کالج بلیا — مولانا عطاء الرحمٰن جامعہ حبیبیہ پورینی بھاگلپور
جمعیۃ علماء ضلع بستی — مولانا قمر الزماں صاحب بیت المعارف الٰہ آباد
جمعیۃ علماء گورکھپور — مسلم فنڈ مبارکپور
کمال جعفری جامعہ نگر نئی دہلی — مسلم انٹر کالج مئو
مولانا صفات اللہ صاحب مدنی دار القرآن مئو — مدرسہ تعلیم الدین مئو
ارشاد احمد صاحب صابری منزل الٰہ آباد — جمعیۃ علماء خیر آباد
مدرسہ منبع العلوم خیر آباد — احمد سجاد قاسمی ایس جی گرلس ہائی اسکول
مولانا عبدالرشید مکی صولتی (بستی) — مولانا محمد زبیر اعظمی
مولانا حبیب احمد ناظم مدرسہ نعمانیہ کٹرہ الٰہ آباد — مولانا علیم اللہ صاحب جونپور
مدرسہ فیضان العلوم بہادرگنج — مدرسۃ المساکین بہادرگنج
جمعیۃ علماء اترپردیش لکھنؤ — مدرسہ جامع العلوم کوپاگنج
ٹیچرس ایسوسی ایشن مفتاح العلوم مئو — مولانا شمیم احمد شیخ الحدیث مفتاح العلوم مئو
مولانا فضل اللہ قاسمی ادروی (بمبئی) — مولانا اسرار الحق مولانا فضیل احمد صدر الدین انصاری
ناظم مدرسہ دار العلوم ناگپور — مولانا عبدالقادر صاحب رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند وغیرہ

خطوط اور تاثرات

ادارہ

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

مولانا سید انظر شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ☆

''ترجمان الاسلام'' کا مولانا اعظمی نمبر نظر نواز ہوا، جو ایک باکمال شخصیت کا جاندار اور آپ کی فنی چابک دستیوں کا دل آویز نمونہ ہے، اگر یہ عرض کروں کہ میں نے ایک ایک سطر پڑھی تو مبالغہ ہوگا نہ خلاف واقعہ کا اظہار، اپنے تاثرات بھیجنے کے لیے خود مستعد تھا کہ گرامی نامہ بھی موصول ہوا، اس وقت عمر ساٹھ سے متجاوز ہے، ساٹھا پاٹھا بھی نہیں بلکہ انحطاط توانائیوں کے تعاقب میں ہے، عمر عزیز لا یعنی مشاغل میں گذر گئی، نہ کچھ کیا نہ کرایا، نہ کچھ آیا، گیا، دوسروں کے علمی کارنامے سامنے آتے ہیں تو حسرت سے یہ پڑھ لیتا ہوں ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

تاہم شعور کے تقریباً چالیس برس اس طرح گذرے کہ والد مرحوم کی نسبت کی بنا پر اکابر کے یہاں حاضری اور دید وشنید کے بڑے مواقع میسر آئے، اپنی عادت یہ بھی رہی کہ جب کسی نمایاں ونامور شخصیت سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی تو حسب توفیق استفادہ، تحریکات سے متعلق ان کے تاثرات اور مشہور شخصیتوں کے بارے میں خیالات جاننے کی ضرور کوشش کی؛ چنانچہ حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے تین بار جماعتِ اسلامی کے بارے میں سوال کیا، مولانا صبغۃ اللہ مدراسی ایک زمانہ میں جماعت اسلامی سے نہ صرف متاثر، داعی رہے ہیں، ایسے داعی کہ دعوت ان کے سراپا پر چھا گئی تھی، خدا جانے کتنی بار میں نے ان کو کُریدا اور کھود کر جماعت اسلامی کے بارے میں ان کے تاثر جاننے چاہے، مگر اس چالیس سالہ شعوری کدو کاوش میں دو عجیب شخصیتوں سے سابقہ رہا، ایک مرحوم مولانا یوسف صاحب بنوری، دوسرے ممدوح

☆ سابق شیخ الحدیث دار العلوم (وقف) دیوبند

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، اول الذکر بے تکان بولتے اور ہر وقت ''ہل من مبارز'' کا نعرہ وردزبان، کراچی میں وہی میرے میزبان تھے، شب وروز ان کے ساتھ گذرے، علم قوی، معلومات مستحضر، حافظہ بے نظیر، ہزاروں اشعار نوک زبان، چنانچہ ایک رات کراچی کے سمندر میں مجھے لے کر تفریح کررہے تھے، بیت الخلاء کا تذکرہ آ گیا، تو مرحوم نے عربی میں سولہ سترہ نام بتا کر وہ اشعار بھی سنائے جن میں عرب شعراء نے ان اسماء کو استعمال کیا، پاکستان میں ان کی شخصیت مجمع البحرین تھی، جدید وقدیم حلقہ میں یکساں مقبول، قائد بھی آتے، دانشور بھی، اہل علم بھی، اہل دل بھی، پرانے خیالات کے حامل بھی، جدید رجحانات کے پیکر بھی، صحافی بھی، انشاء پرداز بھی، شاعر بھی اور نثر نگار بھی، خدا جانے ماہر القادری مرحوم کو کتنی بار مرحوم کے یہاں دیکھا اور سنا، بڑے جوش وولوے کے آدمی تھے، نسلاً سید، وطناً پٹھان دونوں نسبتیں دست وگریبان رہتیں، کبھی کسی کی بے عنوانی پر چیختے، پھر خود ہی دیوار گریہ ہو جاتے، حرم میں ایک مرتبہ اس حال میں دیکھا ایک یمنی مولانا کے سر سے پھلانگ گیا، مرحوم آپے سے باہر ہو گئے، زجر وتوبیخ پر ہی اکتفا نہ کیا، بلکہ ہاتھوں سے تادیب بھی فرمادی، دوسرے ہی لمحہ یہ منظر سامنے تھا کہ مولانا اس کے پاؤں میں سر اقدس ڈالے ہوئے طلب عفو کررہے ہیں اور بڑی رقم کا ہدیہ دے کر اسے قلباً خوش کرنے کی کوشش میں ہیں۔

پاکستان کے وزیر اعظم بھٹو سے ''ختم نبوت'' کے مسئلہ پر اُلجھے، ظاہری آداب کو بالائے طاق رکھ کر بھٹو پر اس طرح بپھر پڑے جیسا کہ ایک غضبناک استاذ اپنے شاگرد پر، قریب تھا کہ مرحوم حسبِ عادت گوش مالی فرمادیں، بھٹو بولے کہ کیا وزارتِ عظمیٰ سے استعفا دیدوں؟ مولانا مرحوم جیب سے قلم نکال کر بولے ''بسم اللہ'' ابھی استعفاء دیدیجئے، آپ ایسے نااہل وزارت کے اہل نہیں۔

فجر کے بعد سے آمد ورفت شروع ہوتی اور مرحوم گرم گفتار ہو جاتے، نصف شب کے بعد چارپائی پر لیٹتے تو مجھ سے سرگرانی کی شکایت فرماتے، میں عرض کرتا کہ حضرت آپ اتنا کیوں بولتے ہیں؟ بے تکلف جواب تھا کہ یہ بزاخفش میری کمزوری پا گئے، آکر دو چار کلمات تعریف کہتے ہیں، اپنی تعریف سن کر میرا نفس پھول جاتا ہے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر بولتا ہوں۔

آہ۔ اب ایسی شخصیتوں کی کمیابی نہیں، بلکہ نایابی پر ہزاروں حسرتیں سوگوار لہجہ میں کہتی ہیں ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

بقاعدہ ''بِضِدِّهَا تَبَیَّنُ الْاَشْیَاءُ'' دوسری شخصیت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی، کم آمیز، کم سخن، کم گو، گویا کہ ؎

آنرا کہ خبر شد خبرش باز نہ آمد

دارالعلوم کی رکنیت شوریٰ کی بنا پر بارہا ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی، آپ نے بخاری شریف میں پڑھا ہوگا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے نامی گرامی شاگرد ابوحمزہ رضی اللہ عنہ کو وفد عبدالقیس کی حاضری اور رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گفتگو کی داستان خاص طور پر سنائی، شارحین نے لکھا ہے کہ ابوحمزہ کے سامنے یہ داستان سرائی اس وجہ سے تھی کہ ابوحمزہ کا عبدالقیس سے خصوصی تعلق ہے۔

چنانچہ مولانا مرحوم پہلی ملاقات میں حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات سناتے رہے، اگر چہ مرحوم کو استفادہ کی مختصر مدت ملی، مگر ذہین وفطین افراد کے لیے قلیل وکثیر کا فرق کوئی حیثیت نہیں رکھتا فرمایا کہ:

''مجھ پر منطق کا غلبہ تھا، درس میں اکثر اشکالات منطقی ہوتے، اس پر ایک دن حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ شیخ الرئیس تو گرم گرم جگہ چلا گیا، تم بھی وہی چلے جاؤ، حضرت شاہ صاحب کے درس میں طلبہ کی نشاط کے لیے مزاح بھی چلتا، چنانچہ ایک پنجابی طالب علم جو کچھ پوچھتا تو کہتا ''بندہ پرور! میرا یہاں ایک سوال ہے'' جواباً فرماتے ''بندہ نواز! وہ کیا ہے؟ حضرت علامہ اپنی ذہانت کی وجہ سے نام رکھنے میں بھی طاق تھے، شیطان کا نام ''معجون فلاسفہ'' رکھا تھا، کسی طالب علم کا نام یحیٰی ہوتا تو عموماً یوحنا فرماتے''۔

ظاہر ہے کہ شیخ الرئیس کے لیے گرم گرم جگہ کا تذکرہ نہ کوئی فتویٰ ہے نہ کوئی شرعی فیصلہ اور آخرت کی بات کون جانے، اس لیے اسے مزاح کے ذیل میں لینا چاہئے، دوسرا واقعہ مولانا مرحوم نے یہ سنایا کہ:

''رجال طحاوی پر میں اپنی تالیف حضرت کو بھیج چکا تھا، دیوبند حاضری پر میں نے عرض کیا کہ اعظم گڈھ سے آنا ہوا ہے، تو فرمایا کہ ''یہ مولوی حبیب اعظم گڈھ میں کون ہیں جنھوں نے رجال طحاوی پر کتاب لکھی ہے؟ عرض کیا کہ خادم حاضر ہے، پھر بڑا اکرام فرمایا''۔

ہاں تو بات یہ ہے کہ حسب دستور اس خاکسار نے مولانا مرحوم سے کچھ سوالات کیے، جن میں کچھ علمی تھے اور کچھ مولانا کے تاثرات جاننے کے لیے، تو مرحوم ''ہوں ہاں'' کر کے رہ گئے، اس وقت تو (خدا تعالیٰ معاف فرمائے) یہی خیال ہوا کہ ''اونچی دکان پھیکا پکوان'' کا معاملہ ہے، لیکن مولانا کی تالیفات مطالعہ میں آئیں اور اب آپ کا ترجمان الاسلام کا اعظمی نمبر تو یقین ہے کہ میرے ان سوالات کو درخور اعتناء نہ سمجھا، یا مجھے جواب کے لیے نااہل گردانا اور اپنے اس تاثر میں موصوف حق بجانب بھی تھے، میرا معاملہ ''چار پایہ بر وکتاب چند'' سے زیادہ نہیں، اس سے کیا ہوتا ہے کہ ایک نامور درس گاہ سے بظاہر سند فراغ لی اور چالیس برس سے معلم الصبیانی پیشہ ہے، بات وہی ہے کہ خر عیسیٰ اگر بمکہ رود، چوں بیاید ہنوز خر باشد، بہرحال ''ترجمان'' پڑھ کر اب کہہ سکتا ہوں ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے، کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اور آپ تو پہلے ہی سے اسیر ہیں کاش کہ ان سیاسی خیالات کی اسارت سے آپ کو رہائی ملے، جو پچاس سال پہلے ہماری دینی درس گاہوں کی دین تھے، پھر آپ کہہ سکیں گے: ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو، آئے مجھے شکار کرے

انظر شاہ (دیوبند)

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ☆

شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجلّہ ''ترجمان الاسلام'' کا وہ خاص نمبر مجھے از راہ عنایت بھیجا، جسے آپ نے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہ کی یاد میں شائع کیا ہے، پہلے تو فہرست مضامین پر نظر ڈالی تو اسی سے طبیعت خوش ہوئی اور اندازہ ہوا کہ یہ ایک نادرۂ روزگار، فرد فرید جو اس دور انحطاط میں علم وفن اور ملت کی آبرو تھا، اس کی حمایت وکارناموں کا معنوی اعتبار سے کیسا حسین مرقع ہوگا، پھر ایک ایک کر کے اس کے مضامین پڑھے، معلومات میں اضافہ ہوا، علم کی خاموش اور بے لوث خدمت کی ایک تصویر مجسم ہو کر نگاہوں کے سامنے آموجود ہوئی، دنیا سے بے

☆ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

نیازی اور بوریہ نشینی کے وقار اور اعتبار کا ایک اور سبق پڑھا، جس میں ''سخنہائے گفتنی'' میں آپ کی درد بھری خوبصوت انشاء سے ایک خاص لطف وحلاوت پیدا ہے۔

قابل مبارک باد ہیں آپ کہ حضرت مولانا کی وفات کے بعد اس قدر کم عرصہ میں ایسا اچھا اور مفید مجموعۂ مضامین شائع کیا، کاغذ وطباعت کی کمزوریوں کے باوجود اس کی قدر وقیمت اور علمی شان وافادیت میں کوئی کمی نہیں آئی، سبھی مضامین خواہ علمی ہوں یا تاثراتی ایک خاص جذبے سے لکھے گئے ہیں، جس میں علم اور خاص طور پر علم حدیث سے گہرے تعلق ومحبت اور صاحب علم سے پر خلوص عقیدت کی وجہ سے ایک دل آویز کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

عرصہ کے بعد کسی مجلّہ کا ایسا مفید خاص نمبر دیکھنے کو ملا، اس کے مضامین کو پڑھئے تو مطالعہ کے دوران پڑھنے والے کو ایک روحانی کیف محسوس ہوتا ہے اور یہ اس لیے کہ ان میں ایک ایسے حاملِ فراستِ مومن اور ایک ایسے مرد درویش کی داستان ہے، جسے اللہ کے رسول ﷺ اور اس کی احادیث سے عشق تھا اور جس نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو تمام کی تمام اس عشق کی راہ میں کھپا دیا تھا۔

اب حضرت مولانا اس دنیا میں نہیں آئیں گے، لیکن ان کی یاد برابر آتی اور اہل علم واہل دل کے دلوں کو گرماتی رہے گی۔

آپ کا مخلص

ضیاء الحسن فاروقی

پروفیسر بدرالدین الحافظ☆

ثقافتی آثار اور تہذیبی ورثہ کو آنے والی نسلوں کے ذہنی کشکول میں منتقل کرنے کے لیے کبھی اہرام مصر، دیوار چین اور اشوک کے کتبات سے کام لیا گیا تھا۔

اب اگر اکیسویں صدی یا اس کے بعد عقدہ ہائے احادیث نبوی کو حل کرنے والے ہندوستان میں بیسویں صدی کی تحقیق وتدقیق کے آثار تلاش کریں گے تو ترجمان الاسلام کے آئینہ میں محدث کبیر کی تصویر دیکھ کر سمجھ لیں گے، کلی کن مشکلوں سے پھول بنتی ہے گلستاں میں، ترجمان الاسلام کا محدث کبیر نمبر ایک کمپیوٹر ہے، جس میں ۲۸ رموضوعات کے تحت مختلف ماہرین فن حدیث

☆ سابق صدر شعبۂ عربی، بی-ایچ-یو، بنارس

نے اپنی عرق ریزی اور جدو جہد کے فن پاروں کو بھر دیا ہے، اب آئندہ نسلیں آتی رہیں گی اور اپنی ضرورت کے مطابق بٹن دبا کر اپنی مرضی کا مواد حاصل کرتی رہیں گی۔

میں اسے ارباب ادارت کا کمال کہوں یا محدث کبیر کے شیدائیوں اور شناساؤں کی معجز بیانی کہ انھوں نے اس حسن ترتیب سے یادگاری نمبر کو اپنی کاوشوں کا مرقع بنایا ہے کہ اب ؎

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

میں اور مجھ جیسے ہزاروں لوگ آج بھی ایسے ہوں گے جنھیں نہ کبھی محدث کبیر کی مصاحبت نصیب ہوئی نہ رفاقت، نہ ہمسفر رہے نہ ہم قیام، کسی کو ایک جھلک دیدار کے بعد تشنہ کامی کا جام ملا تو کوئی اس کے لیے بھی ترسا ہی کیا۔ اچھا تو اب آیئے صلائے جام ہے یاران نکتہ داں کے لیے، اگر چہ اس گنجینۂ علم حدیث کا فانی جسم تو اب تہ خاک جوار رحمت میں ابدی نیند سو رہا ہے، البتہ اس کے گنجہائے گراں مایہ کی نشاندہی کے لیے یہ خصوصی نمبر حاضر ہے، اس کوزہ میں سمندر کی کچھ لہریں نظر آئیں گی جن کی تہوں میں اصداف سے گوہر تلاش کرسکیں تو کر لیجئے۔

مجھے خصوصی نمبر پر کچھ لکھنے کے لئے جو تاخیر ہوئی، اس کی ذمہ دار صفحے پر کوئن آف نائٹ کی بھینی بھینی خوشبو ہے، جس نے مشام جاں کو معطر کرتے ہوئے روح کو ایسا نشاط بخشا کہ دل کیف وسرور میں ڈوب گیا اور آگے بڑھنے کا ہوش ہی کہاں تھا۔

جب آگے بڑھا تو دیکھا یہاں تو علوم ومعارف کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، جس کا ساحل ہی سے نظارہ کر لینے میں جان کی عافیت سمجھی، اور کنارے جو کچھ ہاتھ لگا وہ حاضر خدمت ہے۔

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کا مضمون محدث کبیر کے علمی کارہائے نمایاں کے پہلو بہ پہلو آپ کے اسفار اور وطن سے دور دیار غیر میں علمی کاوشوں کا مرقع ہے۔

مولانا اعجاز صاحب نے محدث کبیر کے استدراکات اور علمی تحقیق کی باقی مثالوں کے علاوہ ص ۶۷، ۶۸ پر آپ کی قوت علمیہ کی جو تفصیل پیش کی ہے اس سے قدماء میں آپ کی شخصیت کی قد آوری مسلم ہو جاتی ہے۔

مولانا مجیب الغفار صاحب کے گراں قدر مضمون میں عرب علماء عبدالفتاح ابوغدہ یا احمد شاکر مصری کی گراں قدر آراء کی روشنی میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے، کہ محدث کبیر کی علمی کاوش نے خود ان کی

شخصیت کو جو رفعت عطا کی وہ تو الگ ہے، اس سے مسلمانانِ ہند کو ایک حیرت انگیز سر بلندی نصیب ہوئی ہے، جس کا ذکر مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب نے بھی کیا ہے۔

کتاب الجامع کے تذکرہ میں مولانا اسیر ادروی صاحب نے عقیدت واعترافِ تبحر علمی کے شانہ بشانہ دیانت وحق گوئی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اس طرح یہ مضمون تحلیل وتجزیہ وحق وصداقت کا آئینہ دار ہے۔

مولانا افضال الحق جوہر قاسمی نے شخصیت وعوامل کی بحث میں اس انداز سے نظر ڈالی ہے کہ محدث کبیر کی شخصیت کے اچھوتے گوشے سامنے آجاتے ہیں۔

محدث کبیر کا محدثانہ انتقاد وبصیرت اور علم اسماء الرجال میں ملکۂ تامہ کی امثلہ مولانا زین العابدین کے مقالہ کی امتیازی خصوصیات ہیں، مگر ص ۸۳ پر عربی متن اور اردو ترجمہ کی مطابقت میں کمی محسوس ہوئی۔

یہ مجموعہ حقیقتاً تو حدیث نبوی کے درس وتدریس سے تعلق رکھنے والوں کے لیے ایک سرمایہ ہے، مگر عام علمی ذوق رکھنے والوں کے لیے بھی اس شخصیت کا یادگاری تحفہ۔

دشت عجم سے تابہ عرب جس کی دھوم ہے
وہ اعتبار گلشن و ویرانہ چل بسا

(بدرالدین)

مولانا ظفیر الدین صاحب☆

ترجمان الاسلام کا خصوصی نمبر موصول ہوا، اس کا ایک ایک حرف پڑھ گیا، بعض مضمون دوبارہ بھی پڑھا، اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو جزائے خیر دے، بڑا ہی عمدہ مجموعہ نکالا اور بڑا ہی قیمتی، اتنا جلد اور اس قدر بہتر، حیرت ہوتی ہے، بڑے قیمتی مضامین یکجا ہو گئے، ''حرف آغاز'' بھی پڑھا اور ''سخنہائے گفتنی'' بھی، خوب ہی لکھا، سخنہائے گفتنی کو اشکبار آنکھوں سے پڑھا اور دو مرتبہ پڑھا۔

سارے مضامین قیمتی ہیں، بہت ساری معلومات سامنے آئیں، حضرۃ الاستاذ کے علمی رخ کی نقاب کشائی بھی بہت دل پذیر انداز میں آئی، اللہ تعالیٰ لکھنے اور محنت کرنے والوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

☆مفتی دارالعلوم دیوبند

یہ سب آپ دونوں کے اخلاص، محنت اور جفاکشی کا ثمرہ ہے، بھرتی کا مضمون کوئی بھی نہیں، بعض باتوں کی تکرار بھی مزے سے خالی نہیں، حضرۃ الاستاذ کے علم وعمل کے بہت سارے پہلو مضامین میں آگئے اور زندگی کے مختلف گوشے بھی، اور انشاء اللہ آئندہ پرچے میں بھی کچھ مضامین آئیں گے، آپ کے یہ پرچے مولانا کی سوانح حیات کے پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔

غالباً یہ لیتھو سے چھاپا گیا ہے، کاغذ بھی معیاری نہیں معلوم ہوتا، مگر پھر بھی بہت قیمتی ہے، ہر پڑھنے والے کے دل سے آپ حضرات کے لئے دعائیں نکلیں گی اور انشاء اللہ وہ مقبول بھی ہوں گی، مدیر اعلیٰ کو تو یہ اعزاز رسالہ کے منظر عام پر آتے ہی حاصل ہوا کہ وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے، ان کو میری طرف سے مبارک باد دیجئے۔

اخیر میں ایک بار پھر شکریہ ادا کرنے کو جی چاہتا ہے کہ بڑا کارنامہ آپ نے انجام دیا، تاریخ میں آپ حضرات کے نام سنہرے حرفوں سے لکھے جائیں گے، تین چار ماہ میں تین سو صفحات کا یہ بیش بہا مجموعہ اس آب وتاب سے آجانا آپ حضرات کے درد دل اور اخلاص وللّٰہیت کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائے اور زاد آخرت بنائے۔

محمد ظفیر الدین
مفتی دارالعلوم دیوبند

ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی ☆

آپ کی نوازشات بے پایاں کے لیے از حد ممنون ہوں، یہ کرم کیا کم تھا کہ آپ ترجمان الاسلام پابندی سے بھیجتے آئے ہیں، اس پر کرم مزید یہ کہ مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ خاص نمبر عنایت فرمایا، سچ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی عظمت وشوکت کا جو سکہ سنا سنایا بیٹھا تھا، وہ آپ کے وقیع نمبر نے دلائل وبراہین کے ساتھ بٹھا دیا، اس کو ابھی سرسری نظر سے دیکھا ہے اور بعض مضامین پڑھ بھی ڈالے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ نے مولانا اعظمی کی جلالت ومرتبت کے عین مطابق یہ خاص نمبر نکالا ہے، مقالات میں اب تک مولانا اعجاز احمد صاحب کا مضمون بہت پسند آیا، دوسرے مضامین بھی بہت معیاری ہیں، ان کی ترتیب وتبویب بھی اچھی ہے، رسالے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مزید توفیق دی تو کچھ مفصل لکھوں گا، سر دست یہ عرض کرتا

☆ ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

ہوں کہ مجموعی تاثر بہت اچھا ہے، آپ کے وقیع وجلیل نمبر نے یہ احساس اور افتخار بخشا کہ ہمارے خاکستر میں ایسی بھی چنگاری تھی، افسوس کہ ہم سب مردہ پرست لوگ ہیں، مرنے کے بعد اپنے اکابر کا احترام کرتے اور ان کا گن گاتے ہیں، اوران کی زندگی میں ان سے کماحقہٗ فیض واستفادہ نہیں کرتے، جی چاہتا ہے کہ اس وقیع نمبر کے مقالات ومضامین کے ساتھ دوسرے اہم مقالات جو آپ کے پاس اب تک پہنچ چکے ہیں ان کی از سرنو کتابت کرا کے عمدہ انداز سے مولانا مرحوم پر ایک کتاب شائع کردیں، وہ ہم جیسے طالب علموں کے لیے مزید مشعل راہ ہوگی، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وعافیت میں رکھے اور اسی طرح علمی کام لیتا رہے، تا کہ ہم طالب علموں کو دین کی ودنیا کی سرخ روئی حاصل کرنے کا موقع مل سکے۔

آپ کا۔محمد یٰسین مظہر صدیقی

مولانا افضال الحق جوہر قاسمی ☆

دہلی جاتے ہوئے مئو میں ''ترجمان'' نظر آیا، اس میں آپ نے بڑے سلیقے سے حضرت مولانا کی زندگی کے تمام اہم گوشے شائع کریئے ہیں۔ ماشاء اللہ، عرب ممالک میں ان کی پذیرائی ہوئی، اس کے اسباب اورنوعیت پر بھی کوئی مضمون ہونا چاہئے تھا، شاید آئندہ آئے۔آپ نے میرے مضمون کا ایک صفحہ حذف کردیا، ایڈیٹر کے قلم اور داروغہ کی زبان کون روک سکتا ہے، مگر میرے بھائی اس مسئلے کا حل نکالئے کہ امیر یا حاکم یا قاضی کی موجودگی میں شرعی پنچایت کالعدم ہے، اس کا فیصلہ باطل ہے اور آپ کی دہلی والی امارت دونوں کام کررہی ہے، شرعی پنچائت والے حیران ہیں کہ کیا کریں؟ میں نے اس کا حل حضرت مولانا کی مجتہدانہ بصیرت سے تلاش کر کے لکھا بھی، تو آپ کو پسند نہیں آیا، آپ نے مصلحت سے اس کو حذف کردیا اور اس کا حل بتایا نہیں، آخر جو لوگ مبتلا ہیں وہ کیا کریں؟ کون طے کرے گا مشکل؟ براہ کرم آپ اسے پھر پڑھ لیجئے، اگر وہ حل ہے تو ٹھیک ہے اور اگر اس میں کوئی جملہ یا تشریح نامناسب ہے تو حذف کردیجئے اور اگر وہ حل نہیں ہے، تو اس مسئلے کا پھر حل کیا ہے اسے سامنے لائیے، میں شکرگذار ہوں گا۔

افضال الحق

دارالعلوم گورکھپور

☆ دارالعلوم رسول پور، گورکھپور

مولانا اعجاز احمد اعظمی ☆

جمعرات ۶ رصفر کو مئو پہنچا تو ترجمان الاسلام رکھا ہوا ملا، ٹائیٹل دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی مگر اندر کھول کر دیکھا تو انقباض محسوس ہوا، کاغذ گھٹیا، طباعت مہمل اور پڑھا تو کتابت بھی ناقص، البتہ مضامین اپنی معنویت کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک، مضامین کے لحاظ سے یہ خصوصی نمبر کامیاب تر، لیکن کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے ناکام تر، آپ کے دونوں مضامین بہت پسند آئے، خوب لکھا ہے، پہلے مضمون میں آپ کے جذبات عقیدت ومحبت نے الفاظ وعبارت کے آئینہ میں حضرت محدث کبیر قدس سرہ کا ایسا نقش جمیل تیار کیا ہے جسے دیکھ کر حضرت کے جاننے والے تو ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' پکار اٹھیں اور جو نہیں جانتے ان کے لیے تعارف کا ایک دل آویز سامان مہیا ہوگیا۔

اور دوسرے مضمون میں آپ نے حضرت محدث کبیر کے دریائے علم کے تموج کو جس عمدہ انداز میں پیش کیا ہے اس کا کیا کہنا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دریا ساکن تھا، پھر آہستہ آہستہ اس میں لہریں اٹھنی شروع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں طغیانی آ گئی، ایک پر ایک دلائل، میں تو پڑھ کر مبہوت ہوگیا، حضرت محدث کبیر کے علم کو ہم لوگوں نے تو جانا ہی نہیں اور اب کچھ جاننے کی نوبت آ رہی ہے تو وہ جنت کو سدھار چکے، اللہ تعالیٰ ان کے فیض علم سے ہم لوگوں کو مستفیض فرمائے۔

اعجاز احمد اعظمی

ڈاکٹر رشید الوحیدی ☆☆

سچ بتاؤں؟ بہت بہت مبارک ہو، ترجمان الاسلام مولانا محدث اعظم نمبر ابھی چند مضامین پڑھے ہیں، شروع سے آپ کے مضمون ''مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا قضیہ'' تک، مولانا اعجاز احمد، پروفیسر عبدالرحمٰن مومن، ضیاء الدین اصلاحی، قاضی اطہر مبارک پوری صاحب وغیرہم کے اور خود آپ کے مضمون کے بعد آپ کا یہ شکوہ کہ بعض اہم شخصیتوں نے ہمارے سوال پر ہماری طرف نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالی، مجھے اچھا نہیں لگا، آپ کو ضرورت ہی نہیں تھی، ایسے اذہان کے در پر دریوزہ گری کرنے کی۔ آپ نے جیسا موقر، بھرپور، جامع نمبر تیار کر دیا ہے، اس سے حضرت محدث اعظم

☆ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ

☆☆ ریڈر اسلامک اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ جامعہ ملیہ دہلی

کے کاموں کی اہمیت بہت کافی واضح ہوجاتی ہے اور ابھی تو اس سمندر میں جانے کیسے کیسے جواہر ملیں گے، آپ کے مضمون نگار حضرات اس قدر بھاری، صاحب علم و تحقیق نظر آئے، اور ہیں بھی، کہ یہ حضرات اگر مستقل حضرت محدث اعظم کا تذکرہ لکھنے بیٹھیں تو اس کا حق ادا کردیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ مجھے تو یہ کوئی نمبر، یا تذکرہ، یا میگزین، یا مضامین کے مجموعے سے کہیں زیادہ حدیث، اصول حدیث، فن رجال، مخطوطات کے تقابلی مطالعہ و تحقیق وتحشیہ کی تاریخ معلوم ہوتا ہے۔ شاید یہ اصول ہو کہ جس فن وکمال کی شخصیت ہوتی ہے، اس کے تذکرے سے وہی اثرات ذہن پر مرتب ہوتے ہیں، الحمدللہ بڑی خیریت گذری کہ میرا پھسپھسا مضمون آپ کو نہ مل پایا، آپ شرما حضوری میں شامل فرمادیتے اور میں کہیں منھ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔

کاغذ ذرا کمزور ہے، باقی اور کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کمزوری بھی سوبار گوارا، بادشاہ گدڑی میں بھی بادشاہ ہے، اور اطلس وکمخواب کس کام کے اگر اندر سے کچھ نہ نکلے---مولانا عبیداللہ اسدی کی توجہ سے حضرت محدث اعظم کے فقہی میدان میں کام کے ڈھنگ پر اشارہ ملا، نیز اس میدان میں آپ کی کاملیت وجامعیت کا اندازہ ہوا، کاش دو ایک موضوع پر اور بحث فرمادیتے تاہم آپ نے بہت کرم فرمایا۔ ایک کتاب کی تلخیص پیش فرمائی۔ مولانا افضال الحق قاسمی کی تحریر نہایت شگفتہ، سلیس اور پھر matter (مواد) بھی بہت نایاب اور قیمتی۔ مولانا ظفیر الدین صاحب نے ایک کامیاب، شفیق، محسن، عظیم عالم استاذ کی حیثیت سے حضرت محدث اعظم کا کامیاب نقشہ پیش کیا ہے۔ غرض آپ کے اس گلدستہ میں ہر پھول نئے رنگ اور نئی خوشبو لئے ہوئے ہے، کوئی رنگ پھیکا نہیں۔ اور کوئی خوشبو ایسی نہیں جو مشام جاں کے پورے ماحول کو معطر ومست نہ کرگئی ہو، اللہ ہی جزائے خیر دے۔

ضرورت ہے کہ بھائی رشید صاحب مولانا مرحوم کے ادارے میں یا مئو میں مولانا محدث اعظم کے کاموں پہ مشتمل ایک اکیڈمی بنائیں، وہاں حضرت کی کتابیں موجود رہیں، ان کے غیر مطبوعہ کاموں کی طباعت اور چھوڑے ہوئے کاموں پر غور فرمائیں، تحقیق کا انتظام ہو، ملک اور عالم اسلام ان کی حوصلہ افزائی کرے۔ خادم سب سے آگے ہے۔

آپ کا

رشید الوحیدی

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ☆

مجھے ترجمان الاسلام کا شدت سے انتظار تھا، جب ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ شائع ہوگیا ہے، تو میں نے ظفر مسعود سلمہ سے منگوایا، ماشاءاللہ، کم مدت میں آپ لوگوں نے اتنا وقیع اور جامع یادگاری نمبر شائع کردیا، جو حضرت مولانا مرحوم کی زندگی کے علمی پہلو ہی کو نہیں، بلکہ مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ آپ کا مقالہ، مصنف عبدالرزاق اور جامع معمر، کے بارے میں بہت متوازن اور باوقار تجزیہ کا حال ہے، دوسرے مضامین بھی قابل قدر ہیں، البتہ مضامین کی فہرست نہ ہونے سے مضامین کی تلاش میں الجھن ہوتی ہے، بہرحال جتنا اور جیسا کام ہوگیا، قابل اطمینان ہے اور شاید اول وآخر ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوری

مولانا محمد حنیف ملی ☆☆

پہلے آپ اس علمی اور سوانحی دستاویز پر مبارکباد قبول فرمایئے کہ آپ نے ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات، کارنامے، زندگی اور کمالات پر ایک ایسا مرقع پیش فرمایا ہے، جو حضرت کی زندگی پر کسی موسوعہ سے کم نہیں۔ میں نے اعظمی نمبر بصد شوق وانہماک از اول تا آخر مطالعہ کیا، بلاشبہ، ترجمان الاسلام کا یہ نمبر آپ حضرات کی کاوشوں کا کھلا ہوا اعتراف ہے، آپ نے جن بزرگوں اور رفقاء کے مضامین ومقالات یکجا فرمادیا ہے، ان کے پڑھنے سے مولانا مرحوم کی زندگی کے بعض ایسے گوشے سامنے آئے جو میرے لیے بالکل نئے ہیں۔ مفتی ظفیر الدین صاحب کا مضمون بطور خاص غور سے پڑھنے کے لائق، ہے اس میں مہد سے لحد تک تمام اہم علمی وثقافتی کارناموں کو یکجا کردیا گیا ہے اور دوسرے مضامین میں قباء ریشمیں میں تکمہ زریں سے کم نہیں ہے، آپ نے بعض بزرگوں کی طرف سے عدم التفات کا شکوہ کیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں آپ نے جو مضامین یکجا فرمادیا ہے وہ دراصل روح ترجمان ہیں۔ یہ ایک علمی گلدستہ ہے جسے پڑھ کر ان دوستوں کو بھی ضرور احساس ندامت ہوگا جو اس بزم میں شریک نہ ہوسکے، میری خواہش ہے کہ حضرت کی زندگی پر مکمل جائزہ اور

☆ محلّہ حیدرآباد، مبارک پور، ضلع اعظم گڈھ
☆☆ شیخ الحدیث معہد ملت، مالیگاؤں

خدمات وکارناموں کا سوانحی خاکہ آپ کے زرنگار قلم سے کتابی شکل میں ضرور آنا چاہئے۔

مخلص محمد حنیف ملی

عرفات ظفر اعظمی ☆

ترجمان الاسلام کا خصوصی شمارہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نمبر نظر نواز ہوا، دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی، اس سلسلہ میں آپ کو غیر معمولی کدوکاوش اور سخت جدوجہد کرنی پڑی ہوگی، بہر حال اس نمبر کی اشاعت پر جو ایک علمی وتاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، میری جانب سے پرخلوص مبارکباد قبول کیجئے، مذکورہ نمبر میں شامل تمام مضامین بہت ہی جامع اور قابل قدر ہیں، البتہ اس نمبر کے مطالعہ کے بعد ناچیز کو چند کمیاں نظر آئیں جن کو میں رقم کرنے کی ہمت کررہا ہوں۔

ایک تو یہ ہے کہ اس میں محدث الاعظمی کی فکری وعلمی زندگی اور ان کے زہد وتقویٰ کے ساتھ ساتھ مولانا کے امتیازات وکمالات اور ان کے علمی وتحقیقی کارناموں پر ابھی مفصل ومستند مضامین کی ضرورت تھی، نیز مولانا کی سیاسی خدمات پر کچھ لکھا ہی نہیں گیا، اس سلسلہ میں آپ کو برصغیر ہندوپاک کی بعض اہم شخصیات اور مختلف مکتبہ خیال کے لوگوں سے انٹرویو لینا چاہئے تھا، جس سے مولانا کی زندگی کے گوناگوں پہلو اور متنوع اوصاف وکمالات سامنے آجاتے اور عالم عرب کے جید علماء ومحققین سے بھی مضامین اور انٹرویو حاصل کرنا چاہئے تھا، جس سے اس نمبر کا حسن دوبالا ہو جاتا۔

آخر میں میں مدارس اسلامیہ اور یونیورسٹیوں کے طلباء سے یہ گذارش کروں گا کہ وہ مولانا کے فکر اور ان کے علمی وتحقیقی کارناموں کو اپنے ریسرچ کا موضوع بنائیں۔

مخلص، عرفات ظفر اعظمی

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

اخبار الجمعیۃ دہلی

خدا جزائے خیر دے محترم مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی اور مولانا اسیر ادروی کو کہ انھوں نے اپنے بے لوث جذبۂ دل، سچی لگن، قابل تحسین کاوش ومحنت، مخلصانہ سعی بلیغ، جگر کاری اور حسن اہتمام کا

☆ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڈھ)

ثبوت دیتے ہوئے سہ ماہی رسالہ ''ترجمان الاسلام'' کا محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن نمبر شائع فرمایا ہے، بلاشبہ طبقۂ اہل علم کے لیے ایک گرانقدر علمی تحفہ بھی ہے اور حضرت کو خراج عقیدت اور اعتراف کمالات وخدمات کا قابل تقلید نمونہ بھی۔

ترجمان الاسلام کا یہ خصوصی نمبر حضرت محدث کی زندگی، علمی، تحقیقی خدمات وکمالات عبقری صلاحیتوں کا ایک اعترافی مرقع ہے، اگر چہ یہ حضرت کی وسیع خدمات وکمالات کا مکمل اعتراف وجائزہ نہیں ہے، تاہم حضرت کے حالات زندگی اوران کی علمی تحقیقی کارناموں کی تحقیق وتفتیش کی راہ اور شب تاریک میں قندیل رہبانی اور چراغ راہ کا کام تو دے ہی سکتا ہے۔

پروفیسر محمد اجتباء ندوی ☆

مجلّہ ''ترجمان الاسلام'' کا محدث الہند مخدوم معظم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق خصوصی شمارہ پیش نظر ہے، ۳۰۳ صفحات پر مشتمل ہے، اور انتہائی گراں مایہ، گرانقدر، بیش قیمت اور مفید مضامین، تاثرات اور چند نظموں و تاریخ وفات کا مجموعہ ہے، عرب وعجم کے متعدد اساطین علم وفکر اور محدثین کرام کی قلمی کاوشوں اور نگارشات سے مالا مال ہے، فاضل انشاء پرداز اور فکر انگیز صاحب قلم مدیر مجلّہ جناب مولانا اسیرؔ ادروی صاحب نے اس مشکبار گلدستہ کو ''ترجمان'' کے صفحات میں خوشنما انداز سے سجا کر گلاب کی ایک خوبصورت ودلکش اور عطر بیز پنکھڑی ''سخنہائے گفتنی'' کے عنوان سے اس طرح پرو دی ہے کہ حضرت محدث اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کی شخصیت، خدمات، کارنامے اور مکارم ومآثر کی چلتی پھرتی تصویر نظر آتی ہے۔ جس کے لیے مدیر محترم مولانا ادروی صاحب اوران کے رفقاء کار جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس کے فاضل اساتذہ مبارکباد وشکریہ کے مستحق ہیں۔ انھوں نے حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق یہ خصوصی اشاعت کا تحفہ پیش کرکے بہت سے عقیدت مندوں، وابستگان علم وفکر اور طالبان حدیث کی آرزوؤں کی بڑی حد تک تکمیل کردی، حضرت رحمہ اللہ کے علم وتحقیق اور خدمات کے اور بھی گوشے ہیں جن کی جانب مجلّہ میں اشارے ملتے ہیں، توقع ہے کہ آئندہ اس کی تکمیل کا سلسلہ جاری رہے گا۔

☆ صدر شعبۂ عربی وفارسی الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ﷫ صاحب نے بڑی خاموشی، گمنامی، تواضع، انکساری اور اخلاص وللٰہیت کے ساتھ اپنی علمی زندگی اور دین وفکر کی خدمات کا آغاز کیا تھا، اسی وجہ سے اس وقت تک ان کی جانب، سورج کی روشنی اور سرچ لائٹ پر نظر رکھنے والے حضرات توجہ نہ کر سکے، جب تک کہ ان کا منفرد اور امتیازی تحقیقی کام منظر عام پر آ کر چشم پوشی اور نظر اندازی کی حدوں کو پار نہ کر لیا، اور مصر کے نامور وممتاز محقق شیخ احمد محمد شاکر، شیخ زاہد الکوثری، شیخ عبد الفتاح ابوغدہ اور دوسرے عرب وعجم کے محققین وعلماء نے مہر تصدیق نہ ثبت کر دی، اس کی مکمل تفصیل رسالہ کے قیمتی مضامین میں ذکر کی گئی ہے، تاہم تحقیق وعلم اور فکر کے قدر داں شروع ہی سے حضرت مخدوم معظم ﷫ کی قدر ومنزلت جانتے اور ان کے رتبہ شناسا رہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ العالی اپنے مختصر مگر جامع تاثر میں حضرت ﷫ کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کے بعد قمطراز ہیں:

''اس علمی تفرد وامتیاز کے علاوہ مولانا کے اخلاق، فہم وفراست، ملت کے مسائل ومفادات سے واقفیت وفکر مزید براں ہے، اس لیے نہ صرف علمی حلقہ میں ایک عظیم خلاء پیدا ہوا ہے، بلکہ ملت کے صف قیادت میں ایک بڑی جگہ خالی ہوگئی ہے، جس کا پُر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے''۔

رسالہ کے صفحات حضرت محدث اعظم ﷫ کے شاگردوں، عقیدتمندوں، واقف کاروں اور ہم عصروں کے مفصل اور بھرپور مضامین سے پُر ہیں، جن سے حضرت ﷫ کی زندگی، کارناموں اور خدمات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور قاری کے لیے بے حد مفید اور ہمت افزا ہیں۔ مضمون نگاروں کی فہرست میں کچھ ایسے علماء ومحققین ہیں کہ جو اپنی ذات سے انجمن ہیں، ان کی چند سطروں پر ہی دریا کو کوزہ میں سمونے کے مثل صادق آتی ہے۔ پرفیسر عبد الرحمٰن مومن صاحب، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب، ممتاز محقق وصاحب قلم عالم وادیب قاضی اطہر مبارک پوری، مفتی محمد ظفیر الدین صاحب، مفتی عبید اللہ اسعدی صاحب، اور مولانا زین العابدین صاحب وغیرہم، بطور نمونہ کے یہ چند اسماء گرامی تحریر ہیں، سب کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے، یوں (جیسا کہ میں گذشتہ سطروں میں تذکرہ کر چکا ہوں) تمام ہی نگارشات مفید اور نفع بخش ہیں اور حضرت محدث اعظم ﷫

کے بارے میں ایک دستاویزی مجموعہ ہیں۔

مولانا زین العابدین صاحب کے عالمانہ مفصل مضمون میں ایک لفظ کھٹکتا ہے، ایک حدیث پر گفتگو کرتے وقت حضرت مولانا مدظلہٗ نے ایک مسلک کے بارے میں ''لا مذہبی'' استعمال کیا ہے، میرے ناقص خیال میں یہ مناسب نہیں ہے، علمی اور تحقیقی قلم وزبان کو محتاط اور شائستہ ہونا چاہئے۔

اس تاثراتی تحریر میں نہ معلوم موزوں ہوگا یا نہیں، مگر جی چاہتا ہے کہ میں (اور اللہ ''میں'' سے بچائے) معذرت کے ساتھ چند الفاظ حضرت محدث اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے تعلق کے بارے میں لکھوں۔

مجھے اپنی بدنصیبی پر افسوس ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل نہ ہوسکا، لیکن بارہا ملاقاتوں، مجلسوں اور واسطوں سے استفادہ کا موقع ملا، اور اس طور سے میں اپنے کو حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد سمجھتا ہوں۔ ۱۹۵۲ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طالب علم تھا، لکھنؤ کے محمد علی لین میں واقع مرکز جماعت تبلیغ میں جہاں اس زمانہ میں حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہٗ اور حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی مدظلہ کا مستقل قیام تھا، میں بھی اسی گلی میں اپنے برادر معظم مولانا مرتضیٰ صاحب مدظلہ کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا اور صبح شام ان بزرگوں کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا، اسی دوران پہلی بار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی اسی مبارک مجلس میں زیارت کا شرف حاصل ہوا، تعارف ہوا، اور پھر مرکز و دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۵۵ء تک برابر نیاز حاصل ہوتا رہا، چونکہ برادر معظم مولانا مرتضیٰ صاحب اور استاد گرامی حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی (جن سے میں بے حد مانوس تھا اور اور درجہ کے علاوہ بھی ان سے اسباق پڑھتا اور استفادہ کرتا رہتا تھا) اور حضرت محدث اعظم کے مابین بڑی بے تکلفی تھی، اس تعلق سے حضرت نے بڑی شفقت اور عنایت کا برتاؤ کیا، میں جب مولانا بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ پڑھنے یا پوچھنے آتا اور حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کمرہ میں تشریف فرما ہوتے تو مولانا بلیاویؒ ڈانٹ کر مجھے ان کے پاس بھیج دیتے اور فرماتے کہ اتنے بڑے محدث، عالم اور ادیب کے ہوتے ہوئے میرے پاس آتے ہو، مجھے فائدہ پہنچا اور اندازہ بھی ہوا کہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ میں مذکورہ تینوں صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں، اور تدریس وافادہ کا انداز بھی بڑا پیارا اور دل میں اتر جانے والا تھا۔

چند برس بعد عالم عربی میں جن علماء، محدثین اور محققین سے ملاقاتیں ہوئیں، انھوں نے حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ بڑے بلند الفاظ میں کیا۔ مجھے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ صاحب سے ۱۹۵۶ء میں حلب (شام) میں نیاز حاصل ہوا اور اس وقت سے آج تک استاذ و شاگرد جیسا تعلق محکم بنیادوں پر قائم ہے، ریاض (سعودی عرب) میں کئی برس ایک ہی یونیورسٹی میں تدریس کے سلسلے میں شرف رفاقت بھی حاصل ہوا، تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی اور مختلف مسائل وشخصیات کے بارے میں گفتگو ہوتی۔ علماء ہند کے تذکرہ کے وقت حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ضرور آتا، ان کا نام آتے ہی آنکھیں اشکبار ہوجاتیں، شیخ ابوغدہ مدظلہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے بے حد مداح، فریفتہ اور گرویدہ وقدردان ہیں۔

۱۹۷۳ء کے آخر میں، سعودی وزارت تعلیم کی دعوت پر ریاض گیا۔ ۷۴ء کے حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ریاض سے مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام مدرسہ فخریہ میں ہے، پہلی فرصت میں حاضر ہوا، کئی برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی، لپٹا لیا، شفقت ومحبت سے حالات پوچھتے رہے، کمرہ کے ایک کونہ میں بڑی سادگی، تواضع اور انکساری سے تشریف فرما تھے، اور عرب وعجم کے علماء ومحدثین اور محققین خدمت میں حاضر ہوتے تھے، سند حدیث لیتے تھے اور تاثر وعقیدت سے مالا مال لوٹتے تھے، اسے آپ علامہ حضرت قاضی اطہر مبارک پوری صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

> ''ہم نے متعدد بار یہ منظر دیکھا کہ مولانا ایام حج میں حرم شریف کے سامنے مدرسہ فخریہ کے چھوٹے سے دفتر میں تشریف رکھتے تھے اور مصر وشام، حجاز اور افریقہ وغیرہ کے اہل علم مولانا کی خدمت میں نیاز مندانہ انداز میں حاضر ہوکر استفادہ کرتے تھے اور قدماء کے طریقہ پر ان سے حدیث کی روایت کی سند لیتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مولانا ہندوستان میں علم حدیث کے آخری سالار قافلہ تھے''۔

خدمتِ حدیث نبوی کی برکت، علم وعمل کی ہم آہنگی، اخلاص وللہیت، تواضع وانکساری، حسن اخلاق، اور حسن سلوک کی بناء پر مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ میں بڑی کشش، جاذبیت اور محبوبیت پائی جاتی تھی، عقیدت واحترام سے بے اختیار خراج تحسین اُمڈا پڑتا تھا، کبھی کسی لمحہ، قومی، علاقائی، نسلی اور ذات

برادری کے فرق واختلاف کا احساس تک نہ ہوا۔ اسلام کا یہ بھی ایک نمایاں وامتیازی وصف ہے جس نے ہمیشہ دلوں میں سرور اور آنکھوں نور پیدا کیا۔

میرا یقین ہے کہ مجلّہ ''ترجمان الاسلام'' کا یہ خصوصی شمارہ مسلمانوں کے تمام طبقوں، گروہوں اور جماعتوں کے لیے یکساں طور سے مفید اور نفع بخش ہوگا۔

پروفیسر ایم اے حفیظ بنارسی ☆

ترجمان الاسلام کا خصوصی شمارہ بہ یاد محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہ بہت پہلے مل چکا ہے اور میں اس کی درق (ورق گردانی ؟) سے فیضیاب بھی ہو چکا ہوں، مگر میری ناسپاسی دیکھئے کہ اس گرانقدر صحیفہ سے جو نشاط و بہجت، جو عرفان وآگہی، جو کیف وسرور حاصل ہوا، اس کے متعلق اس قدر تاخیر سے آپ کو لکھ رہا ہوں۔

ترجمان الاسلام کی خصوصی اشاعت کی تعریف وتوصیف کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں بس یوں سمجھ لیجئے کہ:

آفتاب آمد دلیل آفتاب

آپ حضرات نے اس شمارے کو تاریخی دستاویز اور یادگار مجلّہ بنانے میں جتنا خون جگر صرف کیا، عرق ریزی وجانفشانی کی، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں ایسے کاموں کے کرنے کا کچھ تجربہ ہے، مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے ان کی خدمات اور ان کے علمی مرتبہ کو پیش کرنے میں آپ نے بہت کچھ کیا ہے، جتنے بھی مضامین ہیں معیاری ہیں اور ان کو سلیقہ سے سجایا گیا ہے، کس کس چیز کی داد دوں بس یوں سمجھئے:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

مولانا مرحوم کی ذات گرامی اتنی خوبیوں کی حامل تھی کہ سب کا احاطہ ایک جریدہ میں مشکل ہے۔

ہر چند وصفت می کنم لیکن تو زاں بالاتری

والی بات ہے۔

☆ صدر شعبۂ انگریزی (پوسٹ گریجویٹ) مہاراجہ کالج آرہ

مولانا حبیب الرحمٰن ندوی

ترجمان کا خصوصی نمبر ملا، سب تو نہیں متعدد مضامین پڑھ چکا ہوں، ہر صفحہ پر آپ کے خامۂ گہربار کی ضیاباری نظر آئی۔ پروفیسر عبدالرحمٰن مومن صدر شعبۂ عمرانیات بمبئی یونیورسٹی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر رسالہ معارف اعظم گڈھ اور قاضی اطہر صاحب کے علاوہ آپ کا مضمون ''مصنف عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا قضیہ'' وغیرہ بہت خوب اور قابل مطالعہ ہیں، آپ کا اداریہ تو میں نے متعدد بار پڑھا، پھر بھی سیری نہ ہوئی، مولانا کی شخصیت کا وہ نقشہ جو ہم سب کے سامنے تھا اور پھر ان کے جنازہ کی منظرکشی اس سے زیادہ بہتر طور پر نہیں کی جاسکتی۔ علمی موضوعات میں تفصیل کی گنجائش ہے، اس کو کہیں سے بھی شروع کیا جاسکتا ہے، لیکن آنکھوں دیکھی بات کی صحیح منظرکشی ہر شخص کے بس کی بات نہیں، میرے خیال میں یہ خصوصیت بہت کم اہل قلم میں پائی جاتی ہے، میں خاص طور پر آپ کی تحریر کے اس پہلو پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

حبیب الرحمٰن ندوی

مولانا برہان الدین سنبھلی ☆

ترجمان الاسلام کی خصوصی اشاعت بیادگار محدث جلیل...... باصرہ نواز ہوا، واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اتنے کم وقت میں ایسا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے جس کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔ فجزاکم اللہ خیرالجزاء۔

حضرت محدث جلیل کی زندگی کے بہت سے وہ گوشے سامنے آگئے جو بہت سوں کی نگاہوں سے اوجھل تھے (اور سچ تو یہ ہے کہ اب بھی بہت کچھ مخفی رہ گئے) یوں تو ہر مضمون بالخصوص شروع کے چند مضامین (راقم کے مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کو مستثنیٰ کرکے) بہت ہی معلومات افزا اور چشم کشا ہیں، طباعت وکتابت وغیرہ بھی ایسی نہیں کہ جس پر شکایت کا موقع ہو یا آپ کو معذرت کی ضرورت، حضرت والا کی

☆ استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ

ذات وکمالات- جہاں تک راقم کی معلومات کا تعلق ہے- کے اعتراف میں گروپ بندی، علاقائیت یا نسلی برتری جیسی مذموم صفات حائل نہیں ہوئیں، سب ہی نے حضرت کے اس امتیاز کا اعتراف کیا جو حضرت سے تھوڑا بہت بھی واقف تھا یا ہے، رہا حضرت پر کچھ نہ لکھنا اس کے اور بھی نا قابل قدح اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً وقت کی کمی، راقم کا اندازہ ہے کہ اگر سال بھر کے بعد یہ نمبر شائع ہوتا تو شاید آپ کو یہ گلہ نہ ہوتا (والغیب عنداللہ) بہر حال مکرر اس قیمتی اشاعت پر مبارک باد پیش خدمت ہے۔

احقر برہان الدین

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا نعمت اللہ اعظمی ☆

ترجمان الاسلام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نمبر ملا، نمبر دیکھ کر طبیعت بیحد خوش ہوئی، یہ ہم لوگوں پر ایک قرض تھا جس کو آپ نے باحسن وجوہ ادا کرنے کی کوشش فرمائی اور اس میں آپ کامیاب بھی ہیں، یہ آپ حضرات کے خلوص کی برکت ہے، قدرت کی طرف سے وقت کے وقت انعام مل گیا کہ ان کی نمائندگی کا حق آپ کے مدرسہ کو مل گیا اور مولانا ابوالقاسم صاحب مجلس شوریٰ دار العلوم (دیوبند) کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے۔

نعمت اللہ

دار العلوم دیوبند

☆ استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

حیات ابوالمآثر

(سوانح عمری محدث کبیر حضرت علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ)

از: مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ☆

ہمیں یہ بیش قیمت کتاب وصول ہوئی، جو محدث کبیر حضرت علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی، ان کے عظیم الشان کارناموں، حدیث وسنت کے میدان میں ان کی عظیم الشان خدمات، اور محدثین کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ اسلامی ودینی علوم، فقہ اسلامی اور علم اصول کے انتہائی بلند مقام پر فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو معانی حدیث کے فہم، مفہوم سنت کی تشریح اور بحث وتحقیق کا غیر معمولی مَلکہ عطا فرمایا تھا۔ وہ ایک متبحر عالم، بلند پایہ محدث، اصول عربیت کے بہت بڑے رمز شناس تھے۔ تبحر علمی، کثرت مطالعہ، دقت نظر، گہرائی وگیرائی، اور علمی حقائق کی تہ تک رسائی، اور کھرے کھوٹے کے درمیان تمییز جیسی متنوع صفات میں ان کے زمانے میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔

یہ کتاب جو ان کے مفصل حالات زندگی اور کارناموں پر مشتمل ہے، جس کے اندر علوم اسلامیہ، بالخصوص علم حدیث، فن اسماء الرجال، راویوں اور حدیث کی سند میں آنے والے افراد میں ان کی علمی مہارت اور خصوصیات وامتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ کتاب اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ان کی شخصیت علم کا ایک موجزن سمندر اور ایک کوہ گراں کی طرح تھی۔ وہ ایک جلیل القدر محدث، عظیم المرتبت عالم، عربی زبان وادب کے اداشناس تھے۔ فصیح اور شستہ عربی میں گفتگو کرتے تھے، اور ان کی عربی تحریروں میں ادب کا نکھار، زبان کی فصاحت اور شگفتگی، اور اسلوب کی خوبصورتی نظر آتی ہے۔

ان کی یادگار بہت سی ایسی بیش قیمت تصنیفات اور متقدمین کی کتابوں پر حواشی وتعلیقات ہیں، جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اسی طرح ان کے کارناموں میں قدیم مخطوطوں اور قلمی کتابوں کی تحقیق وتعلیق اور حاشیہ نگاری ہے، جو بہت اہمیت اور قدر وقیمت کے حامل ہیں۔ علمی ادارے، عالمی شخصیتیں اور دنیا کے تحقیقی

☆ مدیر البعث الاسلامی ومہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ادارے ان سے استفادہ اوران کی خدمات کے حصول کے بہت خواہش منداور متمنی رہا کرتے تھے۔

کتاب کے مصنف ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے بات کو پیش کرنے اور معلومات وواقعات سے نتائج نکالنے اور اس عظیم المرتبت وکوہ پیکر شخصیت کی زندگی کا نقشہ کھینچنے کا حیرت انگیز سلیقہ عطا فرمایا ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر یہ کتاب اس عظیم عبقری شخصیت کی بھر پور تاریخ ہے، اور ایک انسائیکلوپیڈیا کی طرح ہے جس میں علوم ومعارف کے خزانے محفوظ کر دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کے علمی حصوں اور بنیادی معلومات کو عربی زبان میں منتقل کیا جائے، تاکہ عرب اسلامی ملکوں میں اس کو شائع کیا جائے، اور علمی ودینی حلقوں میں اس کا نفع زیادہ سے زیادہ ہوسکے، **والحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات.**

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

صفحہ ۵۶۲ کا بقیہ

اس نے کوئی بزم خانقاہ بھی نہیں سجائی جہاں مریدان باصفا کو ''تقدس'' کی تلقین کی جاتی اور ''عظمت'' کی خوراک دے کر آگے کے مرحلے کے لیے انہیں تیار کیا جاتا۔ اس نے اپنے لیے نئی راہ ورسم بھی نہیں بنائی کہ کسی مکتبۂ فکر کی طرح ڈالی جائے اور اس کام کے لیے افراد کی برین واشنگ کی جائے، وہ جاہ ومنصب سے دور، بوریہ نشیں بن کر سفالہ پوش مکان میں رہ کر، عزت کی تمنا اور صلہ وستائش سے بے پرواہ ہوکر خادم دین وملت اور شہپرِ علم وعرفان بنا رہا۔

غزالی وبیہقئ دوراں، تھے باغ نعمان کے نگہباں
کہ بحر تحقیق کے شناور، حبیب رحمٰن اعظمی تھے

کتاب ظاہری و باطنی حسن ورعنائی سے آراستہ ہے، اس کی دونوں جلدوں کی طباعت اور کاغذ عمدہ اور معیاری ہے، پروف ریڈنگ کی کوئی غلطی نظر سے نہیں گزری، یہ بھی ایک حیرت ناک امر ہے۔ آخر میں میں ہر اُس طالب علم (اور مدرس) کو جو اس بات کا متمنی رہتا ہو کہ راہ علم میں کوئی اس کے آتش شوق کو بھڑکا تا رہے، اسے مشورہ دوں گا کہ کم از کم ایک مرتبہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کر لے۔

تبصرہ

حیات ابوالمآثر (جلد ثانی) مصنّفہ ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی

پر ماہنامہ ''معارف'' کا تبصرہ

[ماہنامہ ''معارف'' کے اکتوبر ۲۰۱۱ء کے شمارے میں ''حیات ابوالمآثر (جلد ثانی)'' پر ایک جامع اور وقیع تبصرہ شائع کیا گیا ہے، تبصرہ مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی کے قلم سے ہے، ''معارف'' اور اس کے تبصرہ نگار کے شکریہ کے ساتھ اس اشاعت میں اس کو شامل کیا جارہا ہے (ادارہ)]

قریب دس سال پہلے محدث کبیر وشہیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی سوانح عمری شائع ہوئی تھی، اس میں ان کی زندگی کے حالات وواقعات جمع کیے گئے تھے، نجی زندگی کی تفصیلات کی اہمیت کم نہیں؛ لیکن سوانح کی اصل افادیت صاحب سوانح کی عملی زندگی سے ہے اور یہی مقصود اصلی ہے۔ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اصلاً علوم اسلامیہ خصوصاً حدیث شریف کی خدمت سے عبارت ہے اور یہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے لیے ایک جدا دفتر کی ضرورت ہے، زیر نظر کتاب اس ضرورت کی بہترین تکمیل ہے، جس میں تفسیر وحدیث، فقہ وافتا، تاریخ وتذکرہ، زبان وادب، فلسفہ وکلام، تصوف وہیئت جیسے موضوعات پر مولانائے مرحوم کی عربی، فارسی اردو تصانیف، تراجم، مقالات غرض ہر تحریری نقش کو اجاگر کیا گیا، ان کے مخطوطات ومسودات کی نشاندہی کی گئی اور یہ سب اس سلیقہ کے ساتھ کہ گویا قاری کے لیے علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلو پیڈیا سامنے آگئی۔ دفاع حنفیت، مولانا مرحوم کی علمی زندگی کا اہم باب ہے، قدرتاً اس باب میں ایسے مسائل پر دلچسپ اور چشم کشا مباحث ہیں، جن کے ذکر سے ہندی مسلمانوں کا مذہبی معاشرہ آج بھی پر شور ہے، لیکن ردشیعیت، رد بدعات، رد انکار حدیث جیسے مباحث بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اس کے علاوہ علمی وتحقیقی نگارشات کے چند منتخبات جیسے

''ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات، مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے، الذخائر والتحف، غریب الحدیث'' وغیرہ معلومات کا خزینہ ہیں، تخریج زیلعی اور زجاجۃ المصابیح کا تعارف اور اس پر مولانا کے تبصرے ان کی غیر معمولی نظر کا ثبوت ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات پر مولانا اعظمی نے چند اشعار کہے تھے اور تاریخ وفات بھی نکالی تھی۔ مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی، سنن سعید بن منصور اور الحاوی جیسی کتابوں کے مرتب، محقق اور تعلیق نگار کی یہ شاعرانہ صلاحیت قابل حیرت ہے۔ بعض اشعار پر یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ یہ وزن سے ساقط ہیں، اس کے متعلق مولانائے مرحوم نے ایک خط میں بحر رمل مسدس محذوف اور بحر سریع مطوی موقوف کے فرق کو جس طرح واضح کیا یہ ان کی عبقریت کا مظہر ہے۔ ان کی عربی تصنیفات و تالیفات کے متعلق بھی مکمل معلومات دیے گئے ہیں۔ ''الحاوی لرجال الطحاوی'' کے نام سے انھوں نے شرح معانی الآثار اور شرح مشکل الآثار دونوں کتابوں کے رجال و رواۃ کو جمع کیا، لائق مرتب نے اس غیر مطبوعہ کتاب کی چند جھلکیاں اس سلیقہ سے پیش کی ہیں کہ کتاب کی طباعت کا اشتیاق دو چند ہو گیا ہے۔ شیخ ناصر الدین البانی کی شہرت علم حدیث کے جدید شیخ و امام کی ہے، مولانا اعظمی نے ان کی بعض غلطیوں اور مسامحات کی نشاندہی کی، چار اجزاء میں ''الالبانی شذوذہ واخطاءہ'' کے نام سے یہ کتاب شائع ہوئی تو مولانا کی وسیع و دقیق نظر کا اعتراف کیا گیا۔ مولانا اعظمی کے کارناموں میں مصنف عبدالرزاق کی تحقیق بھی شامل ہے، کتاب کی اشاعت کے بعد جامع عبدالرزاق یا جامع معمر کے عنوان سے ایک علمی قضیہ سامنے آیا، اس قضیہ کی پوری تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔ غرض یہ کتاب محدث شہیر کی علمی زندگی کا جامع ترین مرقع بن گئی ہے، علماء اور علوم نبوت کے طلبہ کے لیے اس کے مطالعہ میں افادیت ہی افادیت ہے، آغاز میں محدث کبیر کے صاحب زادے مولانا رشید احمد اعظمی کے علاوہ مولانا محمد یحیی ندوی اور پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمٰن مومن کی معلومات افزا تحریریں ہیں، ان پر مستزاد لائق مصنف کا مبسوط مقدمہ جس میں گویا پوری کتاب کا عطر آ گیا ہے، البتہ مولانا محمد یحیی ندوی کی نہایت موثر اور البیلی تحریر میں نظر اس جملے پر ٹھٹکی ''خدا بخش لائبریری، حضرت اعظمی کی علمی چراگاہوں میں سے ایک تھی'' اتفاق سے مولانا ندوی سے گفتگو کا موقع ملا، انھوں نے بڑی صراحت سے فرمایا کہ یہ جملہ غلطی سے آ گیا اور یہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔

تبصرہ

حیات ابوالمآثر (دوجلدیں)

مولانا نور عالم خلیل امینی☆ ترجمہ: محمد افضل قاسمی

یہ کتاب اردو زبان میں کئی سال پہلے شائع ہوئی تھی، اور اردو داں طبقے میں اس کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی تھی، اس کتاب کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ عصر حاضر میں ہندوستان کے سب سے عظیم محدث کی زندگی کے احوال اور کارناموں پر مشتمل تھی، وہ شخصیت جو اپنے علمی کارناموں، حدیث کے بے پناہ علم ومطالعہ، اور دوسری وتیسری صدی ہجری کے تصنیف وتدوین کردہ حدیث کے مخطوطات پر اپنی تحقیقی خدمات کی وجہ سے شہرۂ آفاق تھی، جس نے حدیث کے ان قلمی نسخوں کی تلاش وجستجو اور دریافت کر کے اپنی تحقیق وتعلیق کے بعد ان کو عالم عرب واسلام کے مشہور کتب خانوں سے شائع کرایا۔

اسلامی علوم وفنون کی نابغۂ روزگار شخصیت محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۹ھ-۱۴۱۲ھ = ۱۹۰۱ء-۱۹۹۲ء) اپنے دور میں تشنگان علم ومعرفت اور اہل علم وفضل کا سب سے بڑا مرجع تھے، ان کی شخصیت اپنے معاصر علماء ومحدثین میں بے مثال اور بے نظیر تھی۔ علوم حدیث اور فن اسماء الرجال میں بالخصوص اور جملہ علوم اسلامیہ میں بالعموم گہرائی وگیرائی اور بصیرت وژرف نگاہی میں یگانہ وممتاز تھے۔ ملک وبیرون ملک کے معاصر علماء تفسیر واصول تفسیر، اصول حدیث اور اس کے متن ورجال، فقہ وافتاء، سیرت اور تاریخ وتذکرہ، زبان وادب، نحو وصرف ولغت وبلاغت اور علم عروض میں آپ کو استاذ تسلیم کرتے تھے؛ حتی کہ آپ کے زمانے کے اہل علم نے علم ہیئت اور فلسفہ وکلام اور ان علوم میں بھی آپ کے تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے، جن سے علم حدیث کے ساتھ اشتغال رکھنے والے بالعموم دور رہتے ہیں۔

☆ایڈیٹر ماہنامہ الداعی (عربی) واستاذ دارالعلوم، دیوبند

علاوہ بریں حضرت مولانا مرحوم عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر اس قدر دستگاہ اور عبور رکھتے تھے کہ ان زبانوں کے ماہرین اور ادا شناس حضرات آپ کا شمار ان زبانوں کے ادیبوں میں کرتے تھے، مولانا مرحوم تینوں ہی زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ان تینوں زبانوں میں آپ نے جو کتابیں اور تحریریں یادگار چھوڑی ہیں، وہ سلاست وروانی، ایجاز واختصار اور زبان کی حلاوت میں ممتاز ہیں۔ آپ کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صعوبت، لفظی ومعنوی پیچیدگی وژولیدگی، درازگفتاری اور مضمون کی خشکی سے پاک وصاف ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے غیر معمولی علم، علوم کتاب وسنت کے ساتھ اشتغال، بحث وتحقیق، تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کی طرف بالکلیہ انقطاع نے آپ کو صرف ایک ماہر اور متبحر عالم کی حیثیت سے روشناس کرایا، اور آپ کا ادبی پہلو پوشیدہ اور پردۂ خفا میں رہ گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قادر الکلام ادیب اور انشا پرداز کی حیثیت سے آپ کی شہرت نہیں ہوسکی، اور عربی وفارسی واردو میں آپ کی ادیبانہ نثر نگاری کا چرچا نہیں ہوسکا، اور یہ ضرورت اب بھی باقی ہے کہ صاحب طرز نثر نگار اور انشا پرداز ادیب کی حیثیت سے آپ کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے، اور آپ کی نابغۂ روزگار وعبقری شخصیت کے اس پہلو کو بھی اجاگر کیا جائے۔

اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ دنیا میں موجود حدیث شریف کے قلمی نسخوں اور ان کی قدر وقیمت کے سب سے بڑے واقف کار اور شناسا تھے۔ اور ان کی تلاش وجستجو، مقابلہ وموازنہ، تصحیح وتدوین اور ان کو قابل طباعت واشاعت بنانے کی سب سے زیادہ توفیق آپ کو ملی۔ آپ کی توجہ خاص طور سے ایسے مخطوطات حدیث کی تلاش وجستجو پر تھی، جن کی تصنیف وتدوین صحاح ستہ سے پہلے عمل میں آئی ہے۔ اس لیے کہ مستشرقین حدیث کی حجیت میں یہ کہہ کر شک پیدا کرتے تھے کہ صحاح ستہ وغیرہ کی تدوین کا کام تیسری صدی ہجری میں ہوا ہے، اس سے پہلے حدیثوں کی روایت زبانی طور پر ہوتی تھی، اور صرف زبانی روایت پر دار ومدار ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس طویل مدت میں حدیثیں محفوظ رہی ہوں اور ان میں ردوبدل نہ ہوا ہو۔ اس اعتراض کے پیش نظر علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث شریف کے ایسے قلمی نسخوں کی فکر دامن گیر ہوئی، جن کی تدوین دوسری صدی یا تیسری صدی ہجری کے اوائل میں ہوئی ہو۔ مثال کے طور پر امام عبداللہ بن مبارک متوفی ۱۸۱ھ کی کتاب **الزھد والرقائق**، امام وحافظ ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ = ۸۲۷ء کی کتاب **المـصـنَّف**، جو ۱۱ ضخیم

جلدوں میں شائع ہوئی ہے، امام وحافظ ابوبکر عبداللہ بن الزبیر حُمیدی متوفی ۲۱۹ھ=۸۳۴ء کی **مسند الحمیدی**، امام وحافظ سعید بن منصور بن شعبہ خراسانی مکی متوفی ۲۲۷ھ=۸۴۸ء کی **سنن سعید بن منصور**، اورامام عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ=۸۴۹ء کی **المصنف** ہے۔

ان کے علاوہ مولانا مرحوم نے حدیث کے بعض دوسرے مجموعوں پر بھی اپنی توجہ مبذول کی، جومخطوطوں کی شکل میں تھے، اور محدثین کے نزدیک مخصوص اہمیت رکھتے تھے، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ=۱۴۴۹ء کی **المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية**، اورابن حجر ہی کی **مختصر الترغيب والترهيب**، مولانا مرحوم نے ان دونوں کتابوں کے بھی قلمی نسخوں کا مقابلہ، تصحیح متون اوران پرتعلیق وحاشیہ نگاری کی خدمت انجام دے کر عالم عرب کے بعض کتب خانوں سے شائع کرایا۔اسی طرح امام شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی متوفی ۹۰۲ھ=۱۴۹۷ء کی کتاب **فتح المغيث بشرح ألفية الحديث**، اورامام ابوحفص عمر بن احمد بن عثمان ابن شاہین متوفی ۳۸۵ھ=۹۹۵ء کی **ثقات ابن شاهين**، اورحافظ ابوالحسین علی بن ابی بکر بن سلیمان الہیثمی متوفی ۸۰۷ھ=۱۴۰۵ء کی **زوائد مسند البزار** کوبھی ایڈٹ کرکے زیورتعلیق سے آراستہ کیا۔

اس سلسلے کی آپ کی ایک اہم کتاب جوخودآپ کی تصنیف ہے، **الحاوي لرجال الطحاوي** ہے، یہ وہ کتاب ہے جس کی تحسین وستائش دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث آپ کے استاذ علامہ محمد انورشاہ کشمیری (۱۲۹۲-۱۳۵۳ھ=۱۸۷۵-۱۹۳۳ء) نے کی تھی۔

مولانا مرحوم کے زندہ جاوید علمی کارناموں میں ایسے باطل فرقوں اور گمراہ جماعتوں کا رد وابطال ہے، جواپنے کو''اہل قرآن'' کہتے ہیں اورحدیث کی حجیت کا انکار کرتے ہیں، اوراپنے اس باطل خیال ونظریے کی وجہ سے دین ومذہب کے بہت سے ایسے احکام کا انکار کرتے ہیں، جن کے متعلق قرآن میں کوئی نص نہیں وارد ہوئی ہے۔آپ نے ان لامذہبیوں کا بھی رد کیا ہے، جوائمہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، اوردین کے احکام میں سہولت کا راستہ تلاش کرتے ہیں، مثلاً تراویح میں بس آٹھ ہی رکعت مانتے اوراس پرعمل کرتے ہیں۔مولانا نے پہلے فرقے کے رد میں ''نصرۃ الحدیث'' جیسی کتاب تصنیف فرمائی، اور دوسرے فرقے کے جواب میں متعدد کتابیں اور رسالے تصنیف فرمائے، اور یہ ثابت کردکھایا کہ آنحضرت ﷺ اورسیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے عہد میمون سے تراویح کی

بیس رکعتوں پر بالاتفاق عمل ہوتا رہا ہے۔ بریلویوں اور بدعتیوں کے رد میں بھی آپ نے کتابیں تصنیف کی ہیں، اور مختلف مقامات میں ان کے ساتھ متعدد مناظرے بھی کیے ہیں۔

آپ کے منفرد علمی کارناموں میں شیخ ناصرالدین البانی (۱۳۳۳ھ - ۱۴۲۰ھ=۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کا رد ہے، جس میں ان کی تحریروں اور حدیثی تحقیقات میں ان کی غلطیوں کو اجاگر کیا ہے، اور **الألبانی شذوذه وأخطاء ه** کے نام سے شہرۂ آفاق کتاب تصنیف کی ہے، جو ۱۴۰۴ھ=۱۹۸۳ء میں کویت کے مکتبہ **دارالعروبة للنشر والتوزیع** سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں البانی صاحب کی سنگین اور سخت ترین غلطیوں کی گرفت اور ان کی نشاندہی کی گئی ہے، وہی البانی جنھوں نے اپنی علمی تحقیقات سے عرب علماء کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا، مولانا مرحوم نے البانی صاحب کے خاص طور سے ان شکوک وشبہات کو موضوع گفتگو بنایا ہے، جن کو وہ اسلاف اور ائمہ متبوعین کے خلاف اٹھایا کرتے تھے، اللہ تعالی البانی صاحب کے اوپر رحم اور ان کی لغزشوں کی بخشش فرمائے۔

حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ عظمت وعبقریت کی ایک زندہ وتابندہ مثال تھے، آپ نے زندگی کا سفر بڑے شہروں اور علمی وثقافتی مراکز سے دور ایک دورافتادہ مقام میں طے کیا۔ مئوشہر، جو آپ کا مقام پیدائش ہے، اور اتر پردیش کے ایک دم مشرقی علاقے میں واقع ہے، جس کو علم وثقافت میں دہلی اور دیوبند سے کوئی نسبت نہیں ہے، وہاں انھوں نے تعلیم وتربیت حاصل کی، اور اسی چھوٹے سے شہر کے ایک ادارے مدرسہ ''دارالعلوم'' سے فراغت پائی۔ مولانا مرحوم کی زندگی میں کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ آپ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کی معروف دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں جو برصغیر میں شرعی علوم کا مرکز اور دینی تعلیم کا گہوارہ اور از ہر ہند سمجھا جاتا ہے، اس میں داخل ہوئے، لیکن پہلی دفعہ بیمار ہوجانے کی وجہ سے تقریباً تین مہینے کے بعد ہی وطن واپس لوٹ گئے، اور دوبارہ داخلہ لینے کے بعد تقریباً چار مہینے دارالعلوم میں رہے، اور اس دفعہ بھی بیماری ہی کی وجہ سے واپس وطن روانہ ہوگئے۔ گویا خداوندقدوس کی طرف سے یہ مقدر نہیں تھا کہ اس عظیم ادارے سے آپ کی فراغت وتکمیل ہو، اس کے بجائے ایک ایسے مدرسے سے فارغ التحصیل ہونا مقدر تھا جو تعلیمی نظام، فقہی مذہب اور مسلک ومشرب میں دارالعلوم دیوبند ہی کے تابع ہے۔ بایں ہمہ شرعی علوم اور ان کے علاوہ ان دیگر علوم میں جن کی دارالعلوم دیوبند میں تعلیم دی جاتی تھی، ایسا فضل وکمال حاصل کیا، جس نے آپ کو علماء ومشائخ

دیوبند کی صف اول میں لاکھڑا کیا، اوراس کے عام اساتذہ سے فائق و برتر کردیا۔

مولانا مرحوم کو باکمال بنانے میں جو صفات وخصوصیات مددگار ثابت ہوئیں، ان میں آپ کا غیر معمولی حافظہ ہے، جو علم ومعرفت سے تعلق رکھنے والی ہر بات کو اخذ کر کے اس طرح ضبط کر لیتا تھا کہ مطالعہ وتدریس اور تصنیف وتالیف کے وقت آپ کو دغا نہیں دیتا تھا۔ حدیث وعلوم حدیث میں حصول کمال کے لیے قوت یادداشت ہی بنیادی اور اولین شرط ہوتی ہے، کیونکہ کمزور حافظہ والے کے بس میں نہیں ہے کہ حدیث کے متون، اس کی اسانید، اس کے رجال ورواۃ کے حالات، اس کے معانی اور کسی حدیث کی مختلف روایات کو ضبط کر سکے، اور روایت وتعدد طرق سے کسی حدیث کے قوت وضعف اور صحت وسقم کا پتہ لگا سکے۔

اسی طرح آپ کو ذہانت وفطانت، سرعت ادراک اور فہم وبصیرت، اصابت رائے اور فکر ونظر کے توازن سے بھی حظ وافر ملا تھا، اسی کے ساتھ مثالی بردباری اور زندگی کے تمام معاملات میں سادگی پسندی سے بھی بہرہ مند تھے۔ کم گوئی اور خاموش طبعی کا یہ حال تھا کہ بے ضرورت کبھی زبان نہیں کھولتے تھے، اور اپنے اس وصف میں بھی وہ طبقۂ علماء میں ممتاز تھے، مگر جب گفتگو کرتے تو نہایت سوچ سمجھ کر اور عقل ودانش سے بھرپور گفتگو کرتے، جب کوئی لفظ زبان سے نکالتے یا زبان قلم پر لاتے، تو پوری طرح ناپ تول کر لکھتے یا بولتے۔ آپ کی زبان سے نکلا ہوا لفظ ہو، یا قلم سے نکلی ہوئی تحریر، کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کی حامل ہوتی ہے، اور زبان کے لحاظ سے سلیس، آسان، شستہ وشائستہ اور قلب کی گہرائی میں اتر جانے والی ہوتی ہے۔

آپ کی شخصیت کی سادگی، بے لوثی اور بے نفسی کا یہ حال تھا کہ آپ کو دیکھنے والا اول وہلہ میں یہ یقین نہیں کر سکتا تھا، کہ وہ علم اور شہرت وناموری کے اعتبار سے عالم گیر سطح کے عالم کے سامنے ہے۔ بڑے لوگوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ان کے وطن میں ان کی قدر ومنزلت نہیں ہوتی، اور وہ اپنے شہر سے باہر دوسری جگہوں میں سونے سے تولے جاتے ہیں، لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے اس نابغۂ زمانہ اور یگانۂ روزگار عالم کو دیکھا ہے، کہ ان کے شہر کے لوگ ان کے اوپر جان قربان کرتے تھے، اور حیرت انگیز حد تک ان کا احترام کرتے تھے، اور نہایت خوش دلی اور اخلاص کے ساتھ ان کی ہر قسم کی خدمت برکت سمجھ کر کیا کرتے تھے، اور گویا صرف آپ کی ایک ذات تھی جو اس کہاوت سے

مستثنیٰ تھی کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔

حضرت محدث الاعظمی ﷫ نے جاہ ومنصب، مال ودولت اور شہرت وناموری کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، عرب کی حکومتوں، بڑی بڑی عالمی شہرت یافتہ یونیورسٹیوں نے بڑی بڑی تنخواہوں کے عوض اور بھر پور سہولیات اور آسائش وآرام کا لالچ دے کر آپ کی علمی خدمات حاصل کرنی چاہی، لیکن آپ نے اپنے وطن اور معمولی سے مکان میں رہ کر قوت لایموت پر قناعت کرتے ہوئے درس ومطالعہ، تصنیف وتالیف اور تحقیق وتعلیق میں مشغول رہنے کو ترجیح دی، حتی کہ ایک ایسا وقت آیا کہ بعض مدارس میں جو تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، ان سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی، تاکہ یکسوئی کے ساتھ درس ومطالعہ اور بحث وتحقیق کا کام انجام دے سکیں، اس وقت آپ کے پیش نظر حدیث کے ان مخطوطات کی تحقیق وتعلیق تھی، جو صدیوں سے اہل علم اور محدثین کی نگاہوں سے پوشیدہ اور ان کی دسترس سے باہر تھے۔

آج بہت سے نام نہاد ''عالم ومحقق'' جو گہرائی وگیرائی اور ضبط تو درکنار، علم میں بھی آپ کے مرتبہ ومقام کے عشر عشیر کو نہیں پہنچ سکتے، حد درجہ اس کی خواہش اور حرص رکھتے ہیں کہ ان کی شہرت پوری دنیا میں پھیل جائے، اور جاہ ومنصب، دولت وثروت، اور آسائش وراحت کے وسائل ان کو حاصل ہوجائیں، ان کے سامنے امراء واغنیاء اور تعلیم یافتہ حضرات دست بستہ کھڑے رہیں، ذرائع ابلاغ اور پروپیگنڈے کی مشنریاں ان کے نام کا ڈنکا بجائیں، دنیا کی ہر زبان میں ان کے بارے میں گفتگو ہو، اور تذکرہ نگار وانشاپرداز حضرات ان کی شخصیت کو سب سے بڑا بنا کر پیش کریں، اور ان کو عہد گزشتہ اور دور حاضر کا سب سے بڑا عالم ظاہر کریں۔ مگر مولانا اعظمی ﷫ نے ان میں سے کسی چیز کی بھی خواہش نہیں کی، بلکہ اس طرح کی باتیں آپ کے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی نہیں آئی ہوں گی، لیکن اللہ نے اپنی حکمت سے ان کی شہرت چاردانگ عالم میں پھیلا دی، خواہ عرب ہو یا عجم ان کو سب جانتے تھے، اور دور ونزدیک ہر جگہ کے لوگوں نے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا، علماء اور طلبہ سب آپ کے منبع علم سے سیراب ہوئے، اور چاہے آپ کو دیکھ کر ہو یا آپ کی کتاب پڑھ کر، ہر شخص نے آپ کے فضل وکمال کو تسلیم کیا ہے۔

برادر فاضل ومحقق حضرت مولانا مرحوم کے نواسے ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی نے یہ بہت اچھا کام کیا ہے، خداوند قدوس ان کو اس قسم کے کاموں کی مزید توفیق عنایت فرمائے، کہ انھوں نے آپ کی

شخصیت اور علمی کارناموں کو دیکھا، پڑھا اور مطالعہ کیا، اور اردو زبان میں دو ضخیم جلدوں میں آپ کی مفصل سوانح عمری تیار کردی۔ اس کتاب کی پہلی جلد میں حضرت مولانا مرحوم کی زندگی کے عام حالات وواقعات کو سپردقلم کیا گیا ہے، اور دوسری جلد آپ کی علمی زندگی اور تصنیفی وتحقیقی کارناموں کے لیے مخصوص ہے، پہلی جلد بڑی تقطیع کے ۷۳۲ صفحات پر مشتمل ہے، اور دوسری کے صفحات کی تعداد ۵۸۷ ہے، اور دونوں جلدوں نے مولانا مرحوم کے بارے میں پُرمغز معلومات اور بھرپور مواد فراہم کرکے آپ کی زندگی کے ہر اس گوشے اور پہلو کا احاطہ کرلیا ہے، جس کو جاننے کی خواہش مولانا کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے کسی قاری کی ہوسکتی ہے۔ یہ کام حضرت محدث الاعظمی ؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی کی زیرنگرانی پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ اللہ تعالی ان کی حفاظت فرمائے، ان کی عمر کو دراز فرمائے اور اپنی مرضی اور پسندیدہ کاموں کے لیے صحت وعافیت کے ساتھ باقی رکھے۔ مولانا مدظلہ ایک نیک صالح عالم ہیں، اپنے عظیم والد کی طرح بولتے کم ہیں، اور کام بہت کرتے ہیں، باصلاحیت افراد کو علمی کام کے لائق بنانے کی عجیب اور حیرت انگیز استعداد رکھتے ہیں، اور اپنے والد مرحوم کے علمی کاموں کی حفاظت، تدوین وترتیب اور نشر واشاعت کی غیر معمولی حرص اور تڑپ رکھتے ہیں، چنانچہ انھوں نے اس کے لیے متعدد تعمیری اور مفید اقدامات کیے، اللہ تعالی ان کو بہتر بدلہ عطا فرمائے، آمین۔

پہلی جلد کے شروع میں بڑے بڑے علماء ومشائخ اور قلم کاروں کی تقریظات وتاثرات اور مقدمے ہیں، جس میں مولانا مرحوم کے صاحبزادے مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کی تحریر بھی ہے۔ اس کے بعد یہ کتاب گیارہ ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں مصنف نے مولانا مرحوم کے خاندان، نام ونسب اور وطن پر گفتگو کی ہے۔ دوسرے باب میں آپ کی ولادت، تعلیم وتربیت اور ان درسگاہوں کے بارے میں تفصیلات سپرد قلم کی گئی ہیں، جہاں آپ نے تعلیم حاصل کی ہے، کون کون سا امتحان دیا، اس سلسلے میں کہاں کہاں قیام کیا، کیا کیا سندیں حاصل کیں، اور کن کن اہل علم کے دامن سے وابستہ اور متعلق رہے ہیں۔ کتاب کا تیسرا باب آپ کے ان اساتذہ کے تذکروں کے لیے مخصوص ہے، جن کے خرمن علم سے خوشہ چینی اور کسب فیض کیا ہے۔ چوتھے باب کے تحت آپ کی تدریسی سرگرمیوں اور زندگی میں پیش آنے والے دیگر احوال وعوارض کو قلم بند کیا گیا ہے، کن مدارس میں درس وتدریس کی خدمت

انجام دی، کہاں کہاں کا علمی سفر کیا، کون کون سی کتابیں زیر درس رہیں، اور آپ کے خامۂ گہر بار سے کیا کیا تصانیف عالم وجود میں آئیں۔ یہ اس کتاب کا نہایت معلومات افزا باب ہے، جس میں مولانا کی تصانیف کے متعلق بھی کافی موادفراہم کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں ان کے مشہور اور نامور تلامذہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور چھٹا باب آپ کی خانگی زندگی، اہل وعیال اور اولا دواعقاب کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ساتویں باب میں آپ کا حلیہ، لباس وپوشاک، طرز حیات، اخلاق وعادات، سیرت وکردار اور مکارم اخلاق کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی باب کے تحت آپ کی قوت حافظہ، ذکاوت وذہانت، دقت نظر، قوت استدلال، شوق مطالعہ، پابندیٔ اوقات، ایفائے عہد، کم گفتاری، قوت ارادی، بلند حوصلگی، ثاقب نظری، رواداری اور مردم سازی کی صلاحیت جیسے اوصاف وخصوصیات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آٹھویں باب کے تحت تزکیہ واحسان اور اس میں آپ کے بلند مقام اور بیعت وخلافت کا تذکرہ ہے، جلیل القدر عالم ومربی اور عظیم مصلح حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ= ۱۸۶۲-۱۹۴۳ء) کے ساتھ آپ کے ربط وتعلق اور اس مقصد کے لیے ان کی خدمت میں حاضری وباریابی کا تذکرہ ہے۔ نویں باب میں آپ کے خوابوں، بشارتوں اور کرامتوں کا بیان ہے۔ دسویں باب میں آپ کے بارے میں ہند وبیرون ہند کے بلند پایہ اہل علم کے خیالات وتاثرات کو جمع کیا گیا ہے۔ اور گیارہویں باب میں آپ کے شاعرانہ کلام کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس میں قابل ذکر چیز آنحضرت ﷺ کی شان اقدس میں نعتیہ اشعار اور بلند پایہ اہل علم کی وفات پر آپ کے مراثی ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ان غزلوں کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے، جو آپ کی شاعرانہ طبیعت اور جولانیٔ فطرت کی پیداوار ہیں، آپ کا یہ شاعرانہ کلام عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں موجود ہے۔

مولانا مرحوم نے ہند وبیرون ہند کے اہل علم اور بلند پایہ شخصیتوں کی وفات پر اپنے قلبی تاثرات اور رنج وغم کے جذبات قلم بند کیے تھے، جو کم الفاظ میں اتھاہ معانی اور پُر اثر وپُر شوکت تعبیرات ہیں، مولانا کے قلم سے نکلی ہوئی یہ تحریریں بہت ہی اعلی اور بلند ادبی اسلوب کا نمونہ ہیں، اور پڑھنے والے کو غور وفکر اور تدبر کی دعوت دیتی ہیں۔ آپ کی یہ برجستہ اور قلم برداشتہ تحریریں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہیں، جس میں آپ کا مخصوص طبعزاد اور فطری انشا پردازانہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے، جو بہت حد تک ان تحریروں اور پیرایۂ بیان سے مختلف ہے، جس کو آپ نے اپنی تصنیفات اور

تحقیقات وتعلیقات میں برتا اور اختیار کیا ہے۔ آپ کے ان غم آگیں تاثرات کی زبان میں ایک ایسی حلاوت وشیرینی ہے، جس میں ان عظیم شخصیتوں کی وفات پر رنج وغم اور حسرت وافسوس کی آمیزش ہے، جو اس امت کی نفع رسانی وخیر سگالی کے لیے کوشاں رہتے تھے، اور اپنے عظیم الشان علمی وعملی کارناموں کی وجہ سے زندہ جاوید ہیں۔ مولانا مرحوم کے ان تاثرات میں حلاوت وغم کی اس آمیزش نے ان کی نثر نگاری کی اس قسم میں بے انتہا لذت وچاشنی پیدا کر دی ہے، یہ الفاظ وتعبیرات کیا ہیں آپ کے جگر پارے اور دل کے شہ پارے ہیں، جو روح کی گہرائی سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے ہیں، اور دل سے جو بات نکلتی ہے وہ یقیناً دل میں اتر جاتی ہے۔

مصنف نے مولانا مرحوم کی نثر کی اس نوع کو گیارہویں باب کے ضمن میں ''وفیات الأعیان'' کے عنوان سے شامل کیا ہے۔

''آثار قلم'' کے عنوان سے محدث کبیر علیہ الرحمہ کے مضامین ومقالات، کتب ورسائل اور تحقیقات وتعلیقات کی ایک فہرست دی ہے، جو آپ کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے کے لیے تلاش وتحقیق اور تحریر وتالیف کے کام کو آسان اور سہل بنا دے گی۔

جلد اول کو ان قصائد اور نظموں پر ختم کیا گیا ہے، جو علماء وشعراء نے آپ کی وفات کے بعد نظم کیے تھے۔

یہ تو جلد اول کا تعارف تھا، دوسری جلد مولانا مرحوم کے علمی کارناموں کے لیے خاص ہے۔ اس جلد میں مؤلف نے مولانا مرحوم کی تصانیف وتالیفات، تحقیقات وتعلیقات اور جن کتابوں اور رسائل پر نظر ثانی اور ان کی مراجعت کی ہے، ان سب کا تعارف کرایا ہے، اسی طرح آپ کی اہم تصنیفات کا، ان کی علمی قدر وقیمت اور اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، خلاصہ پیش کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کے مؤلف نے کتابوں کے مطالعے، ان کی چھان پھٹک، اور معلومات کے اخذ وترتیب میں کس قدر محنت ومشقت اور جاں فشانی کی ہوگی، جس کے نتیجے میں اس علمی سطح کی یہ کتاب تیار ہوئی، جس کی کوئی باذوق قاری اور علم ومعرفت کا شیدائی تعریف اور ستائش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مصنف نے دونوں جلدوں میں علمی وتاریخی اسلوب اختیار کیا ہے، جو ایسے اطناب، مترادفات کے استعمال اور حشو وزوائد سے پاک ہے، جن کو انشائی، دعوتی اور ادبی وفکری اسالیب میں

سے کسی اسلوب پر لکھنے والا بروئے کار لاتا ہے، یہ ایسے طرز اور طریقے ہوتے ہیں جو کسی پوائنٹ پر توجہ کو مرکوز رکھنے کے لیے، یا کسی مفہوم کی طرف متوجہ کرنے کے لیے، یا کسی فکر اور خیال میں منہمک رکھنے کے لیے لکھنے والے کو مترادف الفاظ، یکساں جملے یا ہم آہنگ تعبیرات کے بکثرت استعمال پر مجبور کرتے ہیں۔ جو نتیجہ خیزی میں یا پڑھنے والے کو اپنے دائرۂ اثر میں لینے کے لیے مبالغہ اور غلو کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایسا جما ہوا علمی و تاریخی اسلوب جو کسی کمی بیشی کے بغیر حقیقت کی براہ راست، منصفانہ اور دقت نظر کے ساتھ تصویر کشی کردے، تو وہ صحیح راستے سے صحیح معلومات تک قاری کی رسائی میں معین و مددگار رہتا ہے، جس طرح یہ اسلوب ان معلومات کی تحصیل اور ان کے بعینہ ضبط کو سہل بنا دیتا ہے۔

لہٰذا اس کتاب کے مؤلف ہر ایسے انصاف پسند قاری کے شکریے اور قدر دانی کے مستحق ہیں، جو علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم علمی وفکری و دینی شخصیت کے تذکرہ وسوانح پر لکھی گئی کسی کتاب میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی خواہش اور جستجو رکھتے ہوں، کیونکہ مؤلف نے صاحب سوانح کے متعلق معلومات کو پُر فریب و پُر زور ادبی و افسانوی انداز اختیار کر کے ان کو صحیح سمت اور راستے سے پھیرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کا انداز مؤرخ کا انداز ہے اور بڑے بڑے سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں کا اسلوب و انداز ہے، جس پر دقت نظر، متانت وسنجیدگی، ایجاز اور سہولت کی چھاپ نمایاں ہے، اور اس عام و معمولی اسلوب سے بلند ہے جو زبان کی چاشنی، ادب کی رعنائی، ترکیبوں کی چستی و پختگی اور بلاغت کی جاذبیت و کشش سے خالی ہوتا ہے، جو پڑھنے اور سننے والے کو ناگوار اور اس کے اوپر گراں ہوتا ہے۔

کتاب کی دونوں جلدیں اس قابل ہیں کہ ان کا عربی اور دوسری زندہ عالمی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے، ہم کو اس کا علم نہیں ہے کہ اس کو عربی میں منتقل کرنے کا کام ہوا ہے یا نہیں، عربی میں علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے کی ضرورت بطور خاص اس وجہ سے ہے کہ کتب حدیث کی تحقیقات اور علمی مباحث سے تعلق رکھنے والے آپ کے عظیم الشان کارنامے بیشتر عربی میں ہیں، اور عرب علماء آپ کے بارے میں اس طرح جاننے کے لیے جس سے ان کی طبیعت آسودہ اور سیر ہو جائے، خواہش مند اور مشتاق ہیں۔ واللہ الموفق لکل خیر.

حیات ابوالمآثر
ایک مطالعہ

از: مولانا محمد علاء الدین ندوی ☆

''حیات ابوالمآثر'' ایک معرکۃ الآراء تصنیف وتذکرہ ہے، جلد اول مصنف کے دیباچہ، ۶/۱ اکابر علماء کی تقاریظ وتأثرات، حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی تمہید، مولانا اسیر ادروی کے پیش لفظ اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اپنے وقت کے عظیم محدث، گنجینۂ علوم ومعارف، مفخرۃ الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے وطن اور خاندان، ولادت اور تعلیم وتربیت، اساتذہ اور مشائخ، تدریسی اور تصنیفی سرگرمیاں، اندرونی اور بیرونی علمی اسفار اور اسفار حج، خانگی زندگی، اخلاق وعادات، اوصاف وکمالات، تصوف وکرامات، علمی مقامات وخصوصیات، جلیل القدر علماء کے احساسات وتأثرات اور ادب وشاعری کے ذوق وہنر جیسے بیش قیمت موضوعات مصنف نے آئینہ بنا کر پیش کردیا ہے، صرف کتاب کے حجم اور ذیلی عناوین کی لمبی فہرست کو دیکھ کر ہی ''حیات شبلی'' جیسی وقیع تصنیف کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، جو ہے بھی اسی سرزمین کی دین جس کا ہر ذرہ نیر تاباں بن کر ابھرتا ہے اور ایک جہان تازہ کو منور کرتا ہے۔ ''حیات ابوالمآثر'' ایک رجل عظیم، جبل علم اور نابغۂ روزگار ہستی کے پون صدی کے علمی کمالات کی روداد ہے، جس کی خاموشی اور عملی جدوجہد اور جس کا سفر وحضر علم حدیث کے نور سے منور تھا، جس کی زندگی کا ہر زاویہ برکتوں اور سعادتوں سے مالا مال تھا اور جس کی ہر جنبش لب دفاع اسلام کی کوششوں سے عبارت تھی۔

''حیات ابوالمآثر'' میں بلند پایہ علمی ودینی خدمات، حدیث، فن رجال، احقاق حق اور ابطال باطل اور بطور خاص ان تحقیقی کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو مطبوعہ بھی ہیں اور بیشتر غیر مطبوعہ بھی، اس محنت طلب کام میں خاندان کے ذمہ دار افراد نے کسی نونہال بچے کی طرح سے حضرت ابوالمآثر کے مسودات کو سنبھال کر رکھا، مصنف ممدوح نے ان کے ورق ورق کو پڑھا، دل میں اتارا، ذہن کے

☆ استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

دریچوں میں سجایا، آنکھوں میں بسایا، پھرہفت خواں طے کر کے نہایت قرینے اور سلیقے سے اہل علم کی خدمت میں درآبدار بنا کر پیش کر دیا۔

جلد دوم میں ''ہدیۂ تبریک وتہنیت'' کے عنوان سے حضرت مولانا محمد یحیٰ صاحب ندوی مدظلہ (جنہوں نے اس محقق اعظم کو دیکھا بھی ہے، برتا بھی ہے، نیاز مندانہ حاضر باشی بھی کی ہے اور اپنے ساغر و مینا کو مولانا کے خم خانۂ علم سے چھلکایا بھی ہے) نے حیات ابوالمآثر کے مختلف گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ پیش لفظ میں پروفیسر عبدالرحمٰن مومن کے شاداب قلم نے محدثین عظام کے قافلۂ سالار رأس المحدثین علامۂ عصر ابوالمآثر کی علمی گہرائی، قوت استنباط واستدلال، دقیقہ سنجی ونکتہ رسی، علم وعمل کی جامعیت، علمی بلندی اور بلا کی ژرف نگاہی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، پھر مصنف موصوف نے اپنے تمہیدی کلمات میں اس شیدائے علم ومعرفت، پیکر فضل وکمال، ہمہ جہت اور نابغۂ روزگار شخصیت کا ایسا جامع تعارف کرایا ہے کہ آپ نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ آگے چل کر مصنف نے حیات ابوالمآثر کی علمی وتحقیقی خدمات، تالیف وتصنیف، دفاع اسلام کی خاطر جان توڑ کوششوں اور علمی شغف وشیفتگی کی روداد سنائی ہے؛ مگر ایجاز، جامعیت، اثر انگیزی، دلچسپی، متانت، علمیت اور تصنیفی قابلیت کہیں ساتھ نہیں چھوڑتی۔ یہ ایک کامیاب تذکرہ نگاری کا شاہکار نمونہ ہے، جس سے ایک ایسے انسان کا سراپا سامنے آ گیا ہے جو زندگی بھر علم وعمل کا جویا رہا، شہرت وناموری سے بھاگتا رہا۔ جس نے فن حدیث، اسماء الرجال اور بحث وتحقیق کو اوڑھنا بچھونا بنایا، دین وملت کی خدمت جس کا شیوہ اور باطل کی بیخ کنی جس کا وطیرہ رہا۔

''بانگ حراء'' کے تنگ صفحات میں راقم ''حیات ابوالمآثر'' پہ جامع تبصرہ نہیں لکھ سکتا، پھر اس ناچیز کے اندر وہ مبلغ علم کہاں جو اس عبقری شخصیت پہ تبصرہ لکھنے کے لیے درکار ہے، تاہم کتاب کے مطالعے سے جس باکمال انسان کی تصویر ابھر کر سامنے آئی ہے اس کی ترجمانی شاید ذیل کے شعر سے کسی حد تک ہو سکے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علامہ اعظمی محدثین عصر کے سرخیل تھے، فقیہ تھے، محقق تھے، اصولی تھے، متکلمانہ شان رکھتے تھے، حدیث، رجال حدیث، اصول حدیث، اصول تفسیر، فقہ وفتاوی، سیرت ومغازی پہ ماہرانہ گرفت تھی۔ علوم عربیت، نحو وصرف، لغت، فقہ لغت اور عروض کے دریا کے شناور تھے۔ تصوف کلام، اور علم

ہیئت تک میں بھی درک حاصل تھا۔ مصنف تھے، انشاء پرداز تھے، زبان و بیان کا ستھرا اور جمالیاتی ذوق رکھتے تھے، قادرالکلام شاعر تھے اور وقیع شعر کہتے تھے۔

مصنف ''حیات ابوالمآثر'' نے اس نابغۂ روزگار کے تحقیقی اور علمی کاموں کا جس جذبۂ دروں اور سلیقہ مندی سے تعارف کرایا ہے، اگر صرف اس کے جلی اور ذیلی عناوین یہاں نقل کیے جائیں تو بانگ حرا کے پورے ۳۸ صفحات درکار ہوں گے۔ اس تذکرہ وتعارف کے جلی عناوین کے ضمن میں دفاع حنفیت اور غیر مقلدیت کے تناظر میں تراویح کی رکعات پہ محققانہ کلام بھی ہے، قرأت خلف الامام میں احناف کے دلائل بھی ہیں، تین طلاق کے مسئلے میں فیصلہ کن تحقیق دل پذیر بھی ہے، دفاع صحابہ اور ردشیعیت کا عنوان جلی بھی ہے، رد بدعت اور انکار حدیث کا منھ توڑ جواب بھی ہے، تفسیر، فقہ، سیرت، تاریخ، تذکرہ نویسی، اور ادب وانشاء کا ذکر جمیل بھی ہے، مصنفین کی نئی مطبوعات پہ تبصرے اور ان کا علمی تعاقب بھی ہے، اصلاحی وتربیتی رسائل کا تذکرہ بھی ہے، اور مصنف کے سلیقہ مند قلم سے ان سارے علمی کاموں کی ایسی تلخیص سامنے لائی گئی ہے کہ گویا پھولوں سے عطر کشید لیا گیا ہو، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بنیادی اور ٹھوس کاموں میں عربی تصانیف، عربی مخطوطات اور ان کی تحقیقات کا نہایت عمدہ اور جامع تعارف کرایا ہے اور اردو کاموں کی تفصیلات بھی بیان کی ہے۔

''حیات ابوالمآثر'' کے مطالعے سے انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ ایک آدمی کا کام ہے؟!! جس نے ایک کتب خانہ تیار کردیا، کیا ایک انسان کا سینہ علوم معارف کا ایسا خزینہ اور دماغ دلائل اور براہین کا ایسا سفینہ بن سکتا ہے؟ لیکن علامہ کے جہد مسلسل اور عمل پیہم نے تن تنہا وہ کر دکھایا جس کے لیے آج بڑی بڑی اکاڈمیاں وقف رہتی ہیں۔ علامہ کے وسعت مطالعہ کا یہ عالم ہے کہ تراث اسلام کا پورا سرمایہ اپنے دل ودماغ میں اتارلیا ہے، بقول مصنف کتاب: ''علامہ اعظمی کا علم ومعرفت ہمہ جہت اور علمی وفکری میدان بہت وسیع وعریض تھا، آپ کا شہباز فکر اور طائر ہمت شاعر مشرق کے اس شاہین کی طرح تھا جو اپنا بسیرا پہاڑوں کی چٹانوں میں کرتا ہے'' (ج۲،ص ۶۵) ''افراد وشخصیات کی تاریخ یعنی سوانح اور تذکرہ وتراجم علامہ اعظمی کے علم وقلم کی وسیع ترین جولان گاہ تھے، اس فن میں آپ کی معلومات کی وسعت کا یہ حال تھا کہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ آپ کے لوح قلب پر نقش اور ذہن پر ثبت تھی''۔ (ایضاً،ص ۷۱)

کیا ذہانت وفطانت تھی، کیسی علمی گیرائی اور بوقلمونی تھی، آپ کی ہر بات باوزن ہی نہیں بلکہ فیصلہ کن ہوتی تھی، آراء اور افکار میں توازن اور ثقاہت تھی، بحث وتحقیق میں دقت نظری اور ژرف نگاہی نمایاں تھی، تحریروں میں ادب کی چاشنی اور اظہار خیال میں تاثیر کی طاقت ہوتی تھی، آپ کی شخصیت کی تشکیل علمی جامعیت کے خمیر سے ہوئی تھی، علم ومعرفت کا ہر شعبہ اور علوم شریعت کا ہر گوشہ ایک دوسرے سے زیادہ تابناک معلوم ہوتا تھا، جس موضوع کو چھ کیا اسے اپنی علمیت، اصابت رائے اور تحقیق کے زور سے ایسا باوزن بنادیا کہ وہ قول فیصل بن گیا۔ دفاع اسلام کے معرکے میں اترے تو شمشیر براں ثابت ہوئے، میدان مناظرہ میں کودے تو اپنے خصم کو پٹخنیاں پہ پٹخنیاں دیتے چلے گئے، آخر کار اسے راہ فرار اختیار کرنا پڑا۔ علمی تعاقب اور قلمی استدراک کا ہتھیار سنبھالا تو مخالف کے زبان وقلم دونوں گنگ ہو گئے، باطل فتنوں کا قلع قمع کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ کی تحریر شعلہ جوالہ بن گئی اور باطل کے ایوانوں کو خاکستر کر گئی، یوں ہر زاویہ سے آپ کی شخصیت کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ آپ علم وتحقیق کا تاج محل اور عالم اسلام اور ہندوستان کے لیے فخر وناز کا سرمایہ تھے، یقیناً آپ عجوبۂ روزگار اور آیت من آیات اللہ تھے۔

یہ چند سطریں ''حیات ابوالمآثر'' پر تبصرہ نہیں ہیں، بلکہ اس قیمتی کتاب کی سطر سطر سے علم ومعرفت کی جو خوشبو قاری کے مشام جاں کو معطر کر گئی اس خوشبو کا ہلکا سا اثر ہے جو تاثرات کے رنگ میں پیش ہے۔ یہ ہماری سعادت مندی اور خوش بختی تھی کہ اس رجل عظیم اور یکتائے روزگار علمی شخصیت کی سوانح حیات کو پڑھ کر آنکھوں کو روشنی اور ذہن وشعور کو جلا بخشنے کا موقع ملا۔ وہ شخصیت جو دسیوں علوم وفنون میں درجہ امامت پر فائز تھی، یہ علم ومعرفت اور فکر وآگہی کے اس بحر بیکراں کی بایو گرافی ہے جو نسبتاً ایک افتادہ مقام میں بوریا نشیں بن کر علم کی مشاطگی اور عروس فکر وفن کی حنابندی کرتا رہا، مصنف کے الفاظ میں ''علم کا ایسا والہ وشیدا، ایسا شیفتہ ووارفتہ اور ایسا عاشق وفرزانہ چشم فلک نے دیکھا ہوگا مگر کم اور خال خال دیکھا ہوگا، آپ کی زندگی کی ایک ایک سانس میں علم کی خوشبو رچی بسی تھی، علم ہی آپ کی غذا، وہی دوا اور وہی شفا تھی''۔ (ج۱ص۴۷)

پھر اس بے لوث وبے غرض انسان کے پیچھے عالمی شہرت کا کوئی ادارہ نہیں تھا، جو اسے پُش کرتا، بڑا بناتا اور پر پرواز عطا کرتا، اس کے پیچھے کوئی تحریک اور تنظیم بھی نہیں تھی، جو اس کے لیے مناسب ڈائس مہیا کرتی اور منصب صدارت پر فائز رکھ کر ہائی لائٹ کرتی، بقیہ صفحہ ۵۴۶ پر

تبصرہ

حیات ابوالمآثر

از: ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی☆

۹/نومبر ۲۰۱۲ کی دوپہر کو میں برادر ابوشیبہ (علامہ حبیب الرحمٰن محدث اعظمی ؒ کے بڑے پوتے) کے ہمراہ ان کے مکان میں داخل ہوا، اور دیر تک اس مکان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ مکان کیا تھا شکستہ سی دیواروں کے چند کمرے، پرانی وضع کی یک منزلہ چھوٹی سی عمارت!! مہمان خانہ میں، جو دفتر بھی تھا، مولانا کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا رشید احمد اعظمی مدظلہ العالی سے ملاقات ہوئی، وہ بڑی انکساری وتواضع سے پیش آئے اور ساتھ میں کھانا کھلایا۔ مجھے جلد ہی دہلی لوٹنا تھا، اس لیے تھوڑی سی گفتگو کے بعد، جس کتاب کی طلب میں حاضر ہوا تھا وہ آپ سے بتائی اور اجازت لے کر رخصت ہوا، مگر دیر تک یہ تأثر قائم رہا کہ اس شکستہ سے مکان میں وہ شہنشاہِ علم رہتا تھا، جس کو مئو میں لوگ عقیدت ومحبت سے ''بڑے مولانا'' کہتے ہیں، جن کو علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی ؒ جیسے عظیم محدث ومفسر نے ''حبر نبیل'' کے نام سے یاد کیا ہے۔

آج مئو محدث اعظمی ؒ کے نام سے ہی جانا جاتا ہے، جن کے نام اور کام سے میں بچپن میں ہی آشنا ہو چکا تھا اور ان کے مفصل حالات کی بڑی جستجو تھی، اور اسی وجہ سے اسلامک فقہ اکیڈمی نے جب مئو میں ۸، ۹ نومبر ۲۰۱۲ کو ''ہندوستان میں فقہی سرمایہ'' کے موضوع پر دوروزہ سیمینار منعقد کیا، تو راقم بھی اس میں شرکت کے لیے تیار ہو گیا۔ اسی موقع سے حضرت کے وارثین سے ملاقات کا پروگرام بنایا تھا۔ دہلی واپسی کے کوئی دس دن بعد مطلوبہ کتاب ''حیات ابوالمآثر'' مؤلفہ ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی بھی موصول ہو گئی۔ کتاب دو جلدوں میں ہے اور ہر جلد کوئی ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اولین فرصت میں دونوں جلدیں پڑھ ڈالیں۔ یہاں اسی کتاب سے متعلق چند تأثرات پیش کیے جارہے ہیں۔

☆ایڈیٹر ماہنامہ افکار ملی، دہلی

علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے مئو میں آنکھ کھولی، اس کے قدیم اور تاریخی مدرسہ دار العلوم سے تعلیم حاصل کی۔ خدا کی شان یہ کہ دو بار دار العلوم دیوبند میں پڑھنے کے لیے داخل کیے گئے، مگر دونوں ہی بار کچھ عوارض خاص کر طبیعت کی ناسازی کے ایسے پیش آئے کہ ان کو دار العلوم سے فراغت کا موقع نہیں ملا۔ غالباً مشیتِ الٰہی تھی کہ ایک چھوٹی سی جگہ سے پڑھ کر مئو کی خاک سے جو ذرہ اٹھے وہ علوم اسلامیہ اور بطور خاص علم حدیث کا نیر تاباں بن کر عالم اسلام کو منور کر جائے۔ ایسی بارعب، پر ہیبت اور جلیل القدر شخصیات کم ہی ہوتی ہیں، جن کے علمی جاہ وجلال کا ڈنکا ہر طرف بج جائے جیسا کہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کی زیارت کے لیے علامۃ الشام شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ تین تین بار مئو جیسے دور افتادہ قصبے میں تشریف لائے۔ جن کی خدمت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مشاہیر نیاز مندوں کی طرح پیش آتے تھے۔ جن کو شیخ الازہر امام اکبر شیخ عبدالحلیم محمود نے **أكبر علماء العالم الإسلامي** (دنیا کے سب سے بڑے عالم) کا خطاب دیا۔ جنھوں نے اپنی پہلی ملاقات میں **أنا حبيب الرحمن الأعظمي من الهند** کہہ کر تعارف کرایا تو ان کے لیے علامہ نجد شیخ عبدالعزیز بن باز احتراماً اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے اور اس پر آپ کو بٹھا دیا۔ جن کو علامہ یوسف القرضاوی جیسے بڑے فقیہ نے دوحہ قطر کے اپنے مرکز بحوث ودراسات السیرۃ میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جدید وقدیم کے جامع جن سے استفادہ کرنے میں فخر جانتے تھے۔ جن سے سید الطائفہ سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ عمر میں ان سے بڑے ہونے کے باوجود علمی مسائل میں صرف استفادہ ہی نہیں، بلکہ اپنی کتابوں پر نظر ثانی کراتے تھے۔ جن کو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر کا اعتماد حاصل ہوا۔ جن کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ ولی اللہ ثانی کہا۔ اس کتاب کو پڑھ کر میری زبان سے نکلا کہ حق یہ ہے کہ محدث عمر بن عبسہ رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جملہ دہرایا جائے جو انھوں نے مشہور تابعی ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں کہا تھا کہ "**هذا الجند بخير مادام هذا الشيخ بين أظهرهم**" (اہل شام خیر کے ساتھ رہیں گے جب تک یہ شیخ ان کے درمیان موجود ہیں)۔

کتاب کا پہلا حصہ ۱۲/ابواب پر مشتمل ہے، اس میں فاضل مصنف نے - جو حضرت اعظمی کے نواسے ہیں - حضرت اعظمی کے وطن، خاندان، پیدائش، نشو ونما، اساتذہ، تلامذہ، تدریسی وتالیفی خدمات،

اسفار، سیاسی مصروفیت، نثر و نظم، اعیان کی وفیات پر حضرت کے تأثرات، خانگی زندگی، اخلاق و عادات علامہ اور تصوف، مبشرات و کرامات، علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ اہل علم کی نظر میں وغیرہ جیسے مباحث پر تفصیل سے قلم اٹھایا۔ ''آثار قلم'' کے ایک الگ عنوان سے مولانا کے تمام مضامین کے نام اور حوالے اور ان کی وفات پر جو مراثی تحریر کیے گئے، ان سب کو جمع کیا گیا ہے۔ فہرست مراجع اور رسائل وغیرہ کا اشاریہ دیا گیا ہے۔

یوں اس جامع مرقع کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اس قدر متنوع اور مختلف الجہات تھی کہ سید العلماء سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بجا طور پر ان کو ہندوستان کے دوائر علم میں شمار کیا تھا۔ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے نہایت محنت سے حضرت العلامہ کی حیات و خدمات سے متعلق مباحث اور تحریروں کو بڑی عرق ریزی سے جمع کیا اور ان کو ایک جاندار تذکرہ اور ایک دلکش سوانحی مرقع کی صورت میں پیش کردیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات کے تعارف و تلخیص پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل ایک ارمغان علمی ہے، جس میں نہایت جامعیت و کمال کے ساتھ علامہ اعظمی کی وسیع الاطراف خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں حضرت محدث اعظمی کی کتابوں کی حیرت انگیز معلومات، مخطوطات سے شغف، تفسیر و اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، متون و رجالِ حدیث کی مہارت، فقہی مرجعیت، عربی زبان و ادب اور دیگر مروجہ علوم اسلامیہ پر علامہ کی مہارت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ''علامہ اعظمی فتنوں کے تعاقب میں'' کے تحت ردسلفیت، ردشیعیت، ردرضاخانیت، اور فتنۂ انکار حدیث پر روشنی ڈالی ہے۔ علامہ کے ردود کی خاصیت یہ ہے کہ وہ علمی دنیا کے مسلمہ اصولوں پر بھی پورے اترتے ہیں اور اپنے اسلوب اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی چاشنی لیے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی خوش گوار طنزیہ جملوں نے ان کو نہایت کاٹ دار بنادیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ معاندین حضرت کے علمی تعاقب کے آگے ڈھیر ہوجاتے تھے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس جبل العلم سے ٹکرائے۔

علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی مختلف کتابوں کی تحقیق، تعلیق اور تحشیہ سے پوری عرب دنیا میں ایک غلغلہ ڈال رکھا تھا۔ اور ان کے شذوذ اور ناروا حملوں سے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے حنفی ائمہ بھی محفوظ نہیں تھے۔ قارئین کو یاد دلادوں کہ باوجود اپنے تمام ادعائے علم و تحقیق اور دعوائے عدم تقلید کے البانی رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے اپنی ''الضعیفہ'' میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں

خطیب بغدادی کی اڑائی ہوئی ان ہفوات پر جزم ویقین کرلیا کہ امام صاحب کوکل ۱۷ حدیثیں پہنچی تھیں۔ یہ اور اسی طرح کے بہت سے الزامات حنفی ائمہ پر انھوں نے لگائے ہیں۔ جن کا جواب باصواب علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے الألبانی شذوذه وأخطاءه لکھ کر دیا۔ مخطوطات ومسودات کی چند عکسی تصاویر اور ردود مذکورہ کی تفصیل کے ساتھ فقہیات میں محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات بھی اہم باب ہے۔ جس میں ''انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت'' ہمارے علماء وفقہاء اور اربابِ افتاء کے لیے نہایت چشم کشا بحث ہے، کیونکہ ہمارے بہت سے مفتیان کرام اور مصنفین اس باب میں افراط وتفریط کا شکار ہوگئے ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ اس باب میں حضرت اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر بھی نقد فرمایا ہے۔ دست کار اہل شرف بھی اسی موضوع سے ملتی جلتی کتاب ہے اور اس لائق ہے کہ نسب فروشی کے سارے دوکان دار اسے پڑھیں۔ اموی دور خلافت اور خاص کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید پر لعن طعن کیا جاتا ہے۔ حضرت محدث اس وادی میں بھی افراط وتفریط سے ہٹ کر گزرے ہیں اور اس سلسلہ میں مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ پر گرفت فرمائی ہے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ محدث اعظمی کے سامنے اصل چیز احقاقِ حق ہے، اور اس کے لیے انھیں اگر اپنی جماعت کے بزرگوں یا اپنے احباب پر بھی تنقید کرنی پڑے تو اس سے قدم پیچھے نہیں ہٹاتے اور اس میں کسی جنبہ داری یا جماعتی تعصب کو راہ نہیں دیتے۔

اس کے بعد عربی تصانیف ومضامین کے تحت مؤلف نے علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے حدیثی کارناموں کا ذکر کیا ہے، جن میں مسند حمیدی، کتاب الزہد، سنن سعید بن منصور، مصنف عبدالرزاق، مختصر الترغیب والترہیب، المطالب العالیہ، کشف الاستار، کتاب الثقات لابن شاہین، استدراکات قاسم قطلو بغا، رسائل شاہ ولی اللہ، حیاۃ الصحابہ، فتح المغیث، اور جزء خطبات النبی اہم ہیں۔ راقم کے نزدیک یہی حصہ اس کتاب کا مغز ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث کی ان عظیم کتابوں کی خدمت کے سلسلہ میں محدث اعظمی نے کتنی جان فشانی کی ہے اور کس طرح محنت ومشقت سے وسائل نہ ہونے کے باوجود ایک چھوٹے سے قصبہ میں بیٹھ کر اس فرد فرید نے وہ کام کردیا جس کو یوروپ میں بڑی بڑی اکیڈمیاں کیا کرتی ہیں۔

ہمارے علمی حلقے اور خاص کر علماء کے طبقہ کو جس میں تن آسانی بقیہ صفحہ ۵۶۹ پر

بہ یاد عالم بے بدل، محدث جلیل

علامہ حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ

پروفیسر حفیظؔ بنارسی

میں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز مئوناتھ بھنجن سے کیا تھا اور عمر عزیز کا ایک قیمتی سال ۷؍جولائی ۱۹۵۶ء تا ۳؍اگست ۱۹۵۷ء وہیں گذارا ہے، کئی مواقع ایسے آئے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف ملا، ان کی دی ہوئی سند توصیف ابھی میرے پاس محفوظ ہے، علم کا بحر زخار تھے، ان کے اندر سمندر کی گہرائی تھی، کم گو، وضع قطع فقیرانہ، تاجدار علم وفن ایسے ہی ہوتے ہیں

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

علم حدیث پاک کا دیوانہ چل بسا — جس کا ہر اک سخن تھا حکیمانہ چل بسا
محفل میں اب وہ گرمیٔ محفل نہیں رہی — نازاں تھی جس پہ شمع وہ پروانہ چل بسا
دشتِ عجم سے تا بہ عرب جس کی دھوم تھی — وہ اعتبارِ گلشن و ویرانہ چل بسا
عرفان و آگہی کا پیامی نہیں رہا — رقصاں تھا جس سے علم کا پیمانہ چل بسا
جس کی ہر اک نظر میں بھری تھی مئے طہور — واحسرتا، وہ پیرِ قدح خانہ چل بسا
شاہنشہِ علوم، فقیہ گہر فشاں — دنیا کی انجمن سے فقیرانہ چل بسا
ساغر اُداس اُداس ہیں، پیمانے سرنگوں — وجہِ فروغِ محفلِ رندانہ چل بسا

تھا افتخارِ عالمِ اسلام جو حفیظؔ
سوئے جناں وہ دین کا دیوانہ چل بسا

سرشکِ غم

بیادِ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ

مولانا مجیب الغفار اسعد اعظمی

بزمِ آثار وسنن کے آہ وہ صدر الصدور!
حضرتِ اقدس، محدث، صاحب طبعِ غیور

آہ استاذی حبیب الاعظمی بالغ نظر
بوالمآثر وہ امامِ ناقدانِ ذی شعور

ان کی رحلت سے ہوئے ہیں سب یتیم بےنوا
ہے سبھی کا شیشۂ دل صدمۂ فرقت سے چور

صدمۂ جانکاہ سے ہے سارا عالم سوگوار
مکتبے گریاں، کتابیں، حاشیے، بین السطور

غم کی تاریکی میں ہے سارا جہاں ڈوبا ہوا
ہر نظر کے سامنے ہے ظلمتِ غم کا وفور

ماہرِ علمِ حدیثِ مصطفیٰ رخصت ہوئے
تشنگانِ علم جائیں یا خدا کس کے حضور

یوں ہزاروں میکدے ہیں پر کہاں پائیں گے ہم
ساقیا تیری شرابِ کہنہ کا کیف و سرور

مل سکا ان کا کوئی ثانی نہ شانِ علم میں
لوگ دوڑاتے رہے اپنی نگاہیں دور دور

وہ بخاریٔ زمن تھے وقت کے ابن حجر
فنِ اسماء پر انھیں لاریب تھا کامل عبور

اللہ ان کے رخ کی تازگی مرنے کے بعد
زندگی سے بھی فزوں تھا ان کی پیشانی کا نور

زندۂ جاوید ہیں وہ اپنی تصنیفات میں
گرچہ ظاہر میں ہوئے ہیں آج مِن اہل القبور

اے خدا ٹھنڈی رہے تربت ہمارے شیخ کی
جنت الفردوس میں ان کو ملیں حور و قصور

عمر اقدس ہے ''محامد'' اسعدؔ محزون لکھ
ابتدا ''اختر حسن'' ہے خاتمہ ''وصل غفور''

صفحہ ۵٦٦ کا بقیہ

اب عام ہوچکی ہے، اس کتاب کو ضرور پڑھنا چاہئے کہ ان کو پتہ چلے کہ ان کی صفوں میں کیسے کیسے گوہر نایاب گزرے ہیں اور اب وہ خود کس حال میں ہیں۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے علامہ کے چند مکاتیب دے کر اس میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ غرض یہ کہ کتاب کیا ہے پورا کتب خانہ ہے، جس کو فاضل مصنف نے ۵۸۷ صفحات میں جامعیت کے ساتھ لکھا ہے اور یوں حضرت ابوالمآثر کی مفصل سوانح عمری اور ان کی علمی وفکری خدمات پر دو ضخیم جلدیں لکھ کر علماء ہند پر سے ایک بڑا قرض اتار دیا ہے۔ توقع ہے کہ کتاب مقبول ہوگی اور محدث اعظمی کے مطالعات کی نئی راہیں کھلیں گی۔ کیا اچھا ہوا گر اس کتاب کا عربی اور انگریزی ترجمہ بھی کروادیا جائے۔ عرب دنیا کے علاوہ مستشرقین اور مغرب کے لوگ بھی آپ کے حالات سے کما حقہ واقف ہوسکیں۔

اِک آسمان تھا کہ جسے کھا گئی زمیں

امیر الاعظمی

وہ امیرِ ہند ، علمِ دین کا روشن منار　　وہ چراغ راہ ہستی، وہ فقیہِ روزگار
کشورِ دانش، دیارِ آگہی کا شہر یار　　وہ خطیبِ عصر، اقلیمِ سخن کا تاجدار
قبر کی آغوش میں وہ کون محوِ خواب ہے
آسمانِ علم کا اک مہرِ عالم تاب ہے

اس کے قدموں پر نچھاور وقت کے شاہوں کا تاج　　اس نے پایا دشمنوں سے بھی عقیدت کا خراج
شان وشوکت کا ہے اس کی معترف سارا جہاں　　کیا مسلماں اور ہندو، رو کے سب کہتے ہیں آج
تاجدارِ علم وفن بے سیم وزر رخصت ہوا
آہ وہ عیسیٰ نفس، وہ چارہ گر رخصت ہوا

ساقیٔ دیرینۂ میخانۂ قال الرسول　　زمزمہ سنجِ حدیث ونکتہ آرائے اصول
گلشنِ اسلام کا وہ عندلیبِ خوشنوا　　جس کے منہ سے موعظت کے ہر نفس جھڑتے تھے پھول
کھو گیا وہ گوہرِ نایاب ، مردِ بے مثال
ختم جس کی ذات پر ہے فن اسماء الرجال

ہمدمِ سینہ فگاراں، ہمنوائے بسملاں　　چارہ سازِ درد منداں، مرہمِ خستہ دلاں
ہادمِ ایوانِ باطل، پاسبانِ قصرِ حق　　سربراہِ اہلِ عرفاں، سرگروہِ عاقلاں
اُسوۂ اسلاف، فقہِ بوحنیفہ کا امیں
حق تو ہے کہئے اسے، احناف کا حصنِ حصیں

تھا وہ یکتائے جہاں تاریخ میں تفسیر میں　　اس کا ثانی تھا نہ کوئی وعظ میں تقریر میں
قابلِ صد آفریں تھا اس کا کلکِ زر نگار　　تھا وہ مشہورِ زمانہ خوبیٔ تحریر میں
برگِ آوارہ کو چن چن کے گلستاں کر گیا
گوہر الفاظ سے کاغذ کا دامن بھر گیا

اس کی تالیفات ہیں موسوم کتنے نام سے — کرچکیں حاصل خراجِ داد، خاص و عام سے
عبدرزاق[۱] المطالب،[۲] اور شیبہ،[۳] درکنار — حق کوواضح کردیا رکعات[۴] اوراعلام[۵] سے

اس نے جو کچھ لکھ دیا وہ حرفِ آخر ہوگیا
زندۂ جاوید نامِ بوالمآثر ہوگیا

ذات سے اس کی، دوبالا ہوگئی شانِ عجم — اس کی عظمت کےعرب والوں نے چومے ہیں قدم
اپنی آنکھوں میں جگہ دی ہے سلیماں[۶] نے جسے — تھا نگاہِ تھانوی[۷] میں جو عزیز ومحترم

ہے دعا گواس کے حق میں یہ امیرؔ خاکسار
اس کے مرقد پر ہونازل، رحمتِ پروردگار

---

(۱) مصنف عبدالرزاق (۲) المطالب العالیہ (۳) مصنف ابن ابی شیبہ
(۴) رکعات تراویح (۵) اعلام مرفوعہ (۶) سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ
(۷) مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

روزنامہ آزاد ہند کلکتہ ۱۷ مارچ ۹۲ء

امیر شریعت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا انتقال

مرحوم نامور محدث اور تحریک آزادی کے ممتاز مجاہد تھے

کلکتہ ۱۶ مارچ: اعظم گڈھ سے بذریعہ فون موصولہ اطلاع کے مطابق امارت شرعیہ کے کل ہند امیر شریعت اور عالم اسلام کے نامور محدث حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی کا آج شام مئو ناتھ بھنجن میں مغرب سے پہلے طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا مرحوم کی عمر تقریباً اٹھانوے سال تھی ۱۳۴۲ ہجری میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں مدرس مقرر ہوئے ۱۳۴۹ھ میں اپنے وطن مئو کے جامعہ مفتاح العلوم کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔

مرحوم کا اصل رجحان فن حدیث سے متعلق غیر مطبوعہ کتابوں کو مرتب کرکے عوام کے سامنے پیش کرنا تھا، اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے آپ عالم اسلام میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اس وقت فن حدیث، رجال حدیث اور متعلقات حدیث میں مرحوم کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ فن حدیث میں آپ کا مشہور تحقیقی کارنامہ مصنف عبدالرزاق کی اشاعت ہے جو گیارہ ضخیم جلدوں میں عربی میں ہے اردو میں آپ کی تقریباً ۲۵ تصانیف ہیں۔

مرحوم مولانا صاحب نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا، یوپی اسمبلی کے ممبر بھی رہے جمعیۃ العلماء سے اخیر تک گہرا تعلق رہا، ہندوستان کے مختلف علمی اداروں مثلاً دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی رہے۔

مفسر قرآن الحاج مولانا حکیم فہد زماں حسینی صاحب نے مرحوم کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ گذشتہ رمضان میں امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی وفات کا غم ہلکا بھی ہونے نہیں پایا تھا کہ اس رمضان میں ہمیں عالم اسلام کے ایک بڑے عالم سے محروم ہونا پڑا۔ مولانا مرحوم ملک کے معتبر ترین علماء کرام میں تھے اور ان کی بے پایاں علمی خدمات رہیں۔

روزنامہ قومی مورچہ وارانسی

روزنامہ

قومی مورچہ

جلد رابع

بنارس سنیچر ★ ۲۱ مارچ ۱۹۹۲ء

موت العالم موت العالم

(۲)

جب ہم اس فقید المثال عبقری محدث کبیر کی وفات کا سوگ مناتے ہیں تو ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا ہے کہ مدارس اسلامیہ میں ماضی میں دین کے علوم کی تحصیل جس اخلاص و للہیت اور پاکیزہ جذبات و تاثرات اور تقویٰ و خدا پرستی کی جس روح کے ساتھ کی جاتی تھی، روکھی سوکھی خوراک اور موٹے جھوٹے لباس پر قناعت کرکے بلکہ خدا کا شکر بجا لاکر بھی طلباء و اساتذہ دونوں ہی خوش اور مگن رہا کرتے تھے اور بزبان حال

اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرۃ کے نعرے لگاتے تھے۔

کتاب و سنت کا جس قدر علم اپنے سینوں میں بڑھاتے جاتے تھے اس کے نتیجے میں ان میں تقویٰ اور پرہیزگاری اور سادگی کے جذبات خود بخود بڑھتے جاتے تھے، لیکن آج یہ نقشہ تیزی سے بدل رہا ہے مدارس سے خلوص و صداقت، اور سادگی و زہد و قناعت کی فضا کا فقدان ہو رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں الماٰثر اور محدث کبیر کے القاب کے مستحق علماء کا مدارس سے تیار ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور نظر آتا ہے۔ مدارس کے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر اقبال علیہ الرحمہ کا یہ شعر یاد آتا ہے۔ ؎ متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

اللہ تعالیٰ ہمیں بدگمانی کیلئے معاف کرے لیکن عمومی جائزہ یہ ہے کہ جس طرح کالجوں اور اسکولوں میں محض ڈگری کیلئے جیسے تیسے تعلیم حاصل کی جا رہی ہے اور ڈگری اسلئے تاکہ اس سے سرکاری یا پرائیویٹ شعبہ میں کوئی اچھی ملازمت ہاتھ آ جائے، اسی طرح بالعموم آج دینی مدارس میں بھی تحصیل علم مادی مفاد حاصل کیلئے کی جا رہی ہے۔ اس سے رب اور شریعت کا صحیح علم معلوم ہونا اور اس پر عمل کرکے دنیا و آخرت

دونوں میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی و خوشنودی حاصل کرنا پیش نظر نہیں ہوتا، الا من شاء اللہ۔ پھر یہ بھی غنیمت ہوتا اگر ایک دینی درسگاہ کا طالب علم بنیادی مقاصد سے ہی سہی علم دین سیکھنے میں جی جان سے سعی و جہد کرتا۔ اور اپنی دھن میں کامیاب رہنے کی کوشش کرتا۔ اس صورتحال کا یہ نتیجہ ہے کہ مدارس سے ہر سال جو طلبہ و فضلاء دستار فضیلت بندھوا کر نکلتے ہیں ان میں ذہین اور اچھی صلاحیت کے طلبہ شاذ و نادر ہوتے ہیں، یہ حالات تشویشناک ہیں اور ہم سے زیادہ اس کا علم و اندازہ خود ارباب درس و تدریس کو ہوگا۔ دینی درسگاہوں کے نظام میں کہیں سے کچھ نقص ضرور گھس گئے ہیں جن کے سبب طرح طرح کے عوارض انہیں دامن گیر ہیں، ان نقائص کی جستجو کرنا بھی انہیں صاحب بصیرت حضرات کا کام ہے جو اس شغل درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور اس میں مجتہدانہ نظر رکھتے ہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ مدارس اسلامیہ سے برابر دقیق النظر اور کامل محققین اٹھتے اور اس سلسلۃ الذہب کی کڑیوں سے کڑیاں جوڑتے رہیں

یہ خاکسار اداریہ نگار کی خوش نصیبی ہی تھی جو اسے حضرت علامہ مرحوم سے ایک مختصر ملاقات کا شرف حاصل ہوا، وہ کسی سفر کے دوران بنارس میں ایک معتقد کے یہاں مقیم تھے۔ ظہر اور عصر کے درمیان کا وقت تھا، ملاقاتیوں کا ہجوم تھا، لیکن خاکسار کا تعارف کرایا گیا تو بڑی بزرگانہ شفقت و محبت کے ساتھ متوجہ ہوئے اور تقریباً آدھے گھنٹے تک باتیں کیں۔ خاکسار کے والد ماجد مولانا ابو محمد امام الدین علیہ الرحمہ کا حال میں انتقال ہوا تھا، حضرت نے ان کی دینی و تبلیغی کوششوں کو سراہا، اور کچھ پرانی یادوں کے ورق الٹتے ہوئے بتایا کہ جب آپ جامعہ مظہر العلوم میں صدر مدرس تھے اس زمانے میں حافظ صاحب (والد مرحوم) برابر مدرسے میں آیا کرتے تھے اور علمی صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ حضرت نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مئو میں قومی مورچہ کا روزانہ مطالعہ کرتے ہیں اور اداریہ کو دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب ایک ایسی ہستی کے قریب بیٹھ کر شرف تخاطب حاصل ہوا جس کے علم و فضل کی گونج پورے عالم اسلام میں سنائی دیتی تھی۔ اس بلندی اور اپنی پستی کا احساس دامن گیر رہا اس کے ساتھ ہی اس بلند اخلاق اور خورد نوازی کا اندازہ بھی ہوا جو اس قبیل کے بزرگوں کا حصہ تھا۔ اللہ تعالیٰ پوری ملت کی طرف سے حضرت کے دینی و علمی کارناموں اور وقیع خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور اپنے نیک اور مخلص بندے کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ اور اس نقصان عظیم کی تلافی کیلئے اور آپ کے دنیا سے خالی ہونے والی جگہ کو پُر کرنے کیلئے دوسری شخصیات علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے [illegible]

INQUILAB DAILY
انقلاب
بدھ ۲۳ مارچ ۱۹۹۲ء

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کے انتقال پر

دفتر جمعیۃ علماء مہاراشٹر میں تعزیتی میٹنگ

مورخہ ۱۸ مارچ ۹۲ء بعد نماز تراویح دفتر جمعیۃ علماء مہاراشٹر زیبر بلڈنگ میں امیر الہند محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی کے انتقال پر ملال پر ایک تعزیتی جلسہ کا انعقاد زیر صدارت حضرت مولانا جنید احمد صاحب ہوا۔ جس میں اراکین و عہدداران جمعیۃ کی خاصی تعداد نے شرکت فرمائی جلسہ کا آغاز مولانا سعید الرحمان صاحب خطیب جامع مسجد باندرہ کی تلاوت سے ہوا۔ پھر بعض حاضرین و علماء کرام نے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا اور حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ کی عظیم علمی شخصیت پر اپنے اپنے تاثرات بیان کئے۔

سب سے پہلے مولانا جنید احمد صاحب صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر نے مولانا حبیب الرحمانؒ کے انتقال پر ملال پر اپنے رنج کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ میرا ذاتی رنج بھی ہے۔ کیونکہ مولانا موصوف کا میرے گھر سے بہت ہی قریبی تعلق تھا۔ اور وہ ہم لوگوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

مولانا جنید صاحب نے آخر میں فرمایا کہ میں مولانا کے فرزند مولانا رشید احمد صاحب نے آخر میں فرمایا کہ میں مولانا کے فرزند مولانا رشید احمد صاحب سے کہوں گا کہ ان کی نوادرات کو یکجا کیا جائے اور اس سلسلہ میں مئو میں ہی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔

مولانا افضال الحق صاحب نے کہا کہ مولانا مرحوم سے نہ صرف ہندوستان کے بڑے بڑے علماء بلکہ علماء مصر و شام و عرب بھی ان سے استفادہ کرتے تھے اور اپنے اشکال کو دور کرتے تھے وہ صرف اعظمی ہی نہیں بلکہ عالمی شخصیت تھے اور ہمیں فخر ہے کہ ہم نے ان کو دیکھا اور ان سے فیض اٹھایا۔

مولانا ظل الرحمٰن صدیقی صاحب نے اپنی تقریر میں مولانا کی سادگی علمیت اور ان اعلیٰ اسلامی اخلاق کا اعتراف کیا۔

مولانا مستقیم احسن اعظمی صاحب نے مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت مولانا باوجود بیماری اور نقاہت کے بھی معمولی گاؤں کے مدرسوں کی سرپرستی کے لئے لاری لیٹ کر سفر کرتے اور مدرسوں کی ترقی کے لئے ہمیشہ فکر مند رہتے۔

مولانا مجیب بستوی صاحب نے مولانا حبیب الرحمان الاعظمیؒ کو ایک نظم پڑھ کر خراج عقیدت پیش کیا۔

جناب گلزار اعظمی صاحب نے کہا کہ ایک اچھے عالم اور بزرگ کی یہی پہچان ہے کہ وہ جس جس سے ملتے نہایت ہی شفقت و محبت سے ملتے اور ہر ایک شخص یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ اسی سے زیادہ محبت کرتے تھے۔

حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب نے مولانا مرحوم کی ذات سے اپنے تاثر کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا حبیب الرحمان الاعظمیؒ محدثین کے ہندوستانی قافلے کے آخری فرد تھے موصوف ہندوستان کے ان چنے گنے چنے لوگوں میں تھے جو عالم اسلام میں ایک عظیم شخصیت مانے جاتے تھے۔ آپ نے علم حدیث کو اپنایا اور چٹائی پر بیٹھ کر علمی و ادبی وہ کام کیا ہے جس سے پورا عالم اسلام استفادہ کرتا ہے ہمارے محدثین و فقہاء اپنے مسائل کبھی فٹ پاتھ پر نہیں لاتے یہ ان کی اپنی ایک خوبی ہے اور قاضی اطہر مبارکپوری صاحب نے فرمایا کہ عالم اسلام میں مصر کے بعد جتنا علم ہندوستان میں حدیث و فقہ کے اعتبار سے رہا ہے۔ اور کسی ملک میں نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ہم سب کو صبر کی توفیق۔

آخر میں صدر محترم نے مولانا عبدالغفار صاحب خطیب عرب مسجد کے اچانک انتقال پر ملال کی خبر سناتے ہوئے حاضرین جلسہ سے مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا کی درخواست کی چنانچہ حاضرین نے مولانا حبیب الرحمان نور اللہ مرقدہٗ مولانا عبدالغفار مرحوم اور زوجہ مولانا کاتوری مرحومہ کے حق میں دعائے مغفرت کی اور تعزیتی جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ آواز ملک وارانسی — 24-3-92

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

منگل ۲۴ مارچ ۱۹۹۲ء | روزنامہ آوازِ ملک وارانسی | مطابق ۱۸ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ

آہ محدث کبیرؒ

اس دنیائے آب وگل میں پیدا ہونے والی ہر شئے کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ ہر شئی فانی ہے اور باقی رہنے والی ذات تو بس ایک خدا کی ہے جس کے حکم سے موت وحیات کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے جاری ہے بقول ٹیگور روزانہ لاکھوں طفل پیدا ہوکر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ خدائے پاک ابھی نسل انسانی سے مایوس نہیں ہوا ہے اسی طرح لاکھوں افراد روزانہ اپنا سفر حیات مکمل کرکے واپس چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی موت اہل خاندان کے علاوہ اور کسی کو متاثر نہیں کرتی نہ ہی عام طور پر انکی موت کی کسی کو خبر ہوتی ہے مگر بعض شخصیت عہد آفریں اور تاریخ ساز ہوتی ہے ان کی وفات سے پوری کائنات متاثر ہوتی ہے ایسی ہی ایک مقدس وبزرگ ہستی محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی قدس سرہٗ کی بھی تھی جن کا گزشتہ ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ کو افطار اور نماز مغرب کی مبارک ساعتوں میں جب رمضان المبارک کے عشرۂ رحمت کا اختتام اور عشرۂ مغفرت کا آغاز ہورہا تھا وطن مالوف مئو میں ۹۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی نادر روزگار ہستی ان ہی نفوس قدسیہ میں سے تھی جن کی جدائی سے کروڑوں قلوب پر کرب واضطراب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ دنیائے اسلام میں رنج والم کا بادل چھا گیا۔ فضائے کائنات پر حزن وملال طاری ہوگیا۔ روشن چہروں پر مردنی چھاگئی اور پورا ماحول موت العالم موت العالَم کی تصویر بن گیا۔ محدث کبیر کی ذات بابرکت کتنی اہم اور قابل قدر تھی۔ اس کا اندازہ انکی وفات حسرت آیات کے دوسرے دن ہر خاص وعام نے اسوقت کیا جب آخری سفر کے لئے ان کا جنازہ اٹھا، ملک کے کونے کونے سے آئے لاکھوں سوگواروں نے نماز جنازہ میں شرکت کی عقیدت مندوں کا اتنا زبردست اژدہام تھا کہ سہ پہر ۴ بجے سے رات دس بجے تک مٹی دینے کا سلسلہ جاری رہا۔ بلاشبہ مئو ہی نہیں پورے اتر پردیش میں کسی شخص کے جنازہ میں سوگواروں کا اتنا زبردست اژدہام پہلے کبھی نہیں دیکھنے میں آیا اور یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ ایک عالم کی موت صحیح معنوں میں ''پوری دنیا کی موت'' کے مصداق ہے یعنی پوری دنیا اس بزرگ ہستی کی وفات سے غمزدہ ہوجاتی ہے۔

محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکت اس عہد انحطاط میں رب ذوالجلال کا ایک بیش بہا عطیہ تھی جو مسلسل ۹۳ سال تک ملت اسلامیہ پر رحمت وبرکت کا وسیلہ بنتی رہی۔ دارالعلوم مئو اور دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل مئو کے ایک متوسط گھرانے میں جنم لینے والے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے اپنی غیر معمولی ذہانت، لیاقت اور صلاحیت سے دنیائے اسلام میں وہ اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا کہ وہ دنیائے اسلام کی برگزیدہ اور بزرگ ترین شخصیت بن گئے۔ پوری دنیا میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں ان کے کہے ایک ایک لفظ کو سرمایہ افتخار سمجھا اور انھیں ''امیر المومنین فی الحدیث'' کے لقب سے یاد کیا۔ محدث کبیر اور بخاریٔ وقت کے خطاب سے نوازا اور ابوالمآثر کی کنیت سے پکارا۔ بلاد اسلامیہ کے تمام اہل علم وفن اور ارباب علم ودانش کے دلوں پر انکی قابلیت کا نہ صرف سکہ جما تھا بلکہ وہ مشکلات احادیث کا حل ان سے چاہتے۔ اسماء الرجال پر ان کے کلام کو حرف آخر سمجھتے اور ان کی تمام تصنیفات ''التحقیقات لشمول، نصرۃ الحدیث''، اعلام مرفوعہ، رکعات تراویح'' احکام النذور للاولیاء اللہ، شارع حقیقی، المصنف، تنقید سدید، ارشاد الثقلین بجواب اتحاد الفریقین، ازہار مربوعہ'' اور دست کار اہل شرف وغیرہ کو ارمغان علم وفن سمجھکر قبول کرتے ہیں اور اپنی تحقیقات میں مرحوم کی کتابوں کا حوالہ دینا قبولیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ ان کی ایک عظیم تصنیف ''المصنف'' کی ۱۵ جلدیں بیروت میں شائع ہوئیں اور دوسری عظیم ترین تصنیف ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کی ۱۲ جلدیں مدینہ منورہ میں چھپ چکی ہیں اور مزید ۱۲ جلدوں کی اشاعت باقی ہے۔ اب جبکہ محدث کبیرؒ کا ظاہری وجود ہم سے جدا ہوچکا ہے انکے معنوی وجود کو زندہ رکھکر ان کی تعلیمات سے اکتساب فیض حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی غیر مطبوعہ تصنیفات کو جلد از جلد زیور طبع سے آراستہ کرکے شیدایان اسلام کے سامنے پیش کیا جائے۔ محدث کبیرؒ کے انتقال پرملال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے

روزنامہ آواز ملک وارانسی 24-3-92

سرشکِ غم و تاریخ رحلت

بر وفات حسرت آیات محدث جلیل، ابر العہد حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی
نور اللہ مرقدہٗ

منجانب مجیب الغفار اسعد الاعظمی استاذ تفسیر حدیث جامعہ مظہر العلوم بنارس

بزم دستار و سنن کے آہ وہ صدر الصدور
حضرتِ اقدس، محدث، صاحبِ طبعِ غیور

آہ استاذی حبیب الاعظمی بالغ نظر
بوالمآثر، وہ امامِ ناقدانِ ذی شعور

ان کی رحلت سے ہوئے ہیں سب یتیم بے نوا
ہے سبھی کا شیشۂ دل صدمۂ فرقت سے چور

صدمۂ جانکاہ سے ہے سارا عالم سوگوار
مکتبے گریاں، کتابیں، حاشیے بین السطور

غم کی تاریکی میں ہے سارا جہاں ڈوبا ہوا
ہر نظر کے سامنے ہے ظلمتِ غم کا وفور

ماہرِ علمِ حدیثِ مصطفےٰ رخصت ہوئے
تشنگانِ علم جائیں یا خدا کس کے حضور

یوں ہزاروں میکدے ہیں پر کہاں پائیں گے ہم
ساقیا تیری شرابِ کہنہ کا کیف و سرور

مل سکا ان کا کوئی ثانی نہ شانِ علم میں
لوگ دوڑاتے رہے اپنی نگاہیں دور دور

وہ بخاریٔ زمن تھے، وقت کے ذہبی بھی وہ
فنِ اسماء پر انہیں لاریب تھا کامل عبور

اللہ اللہ ان کے رخ کی تازگی مرنے کے بعد
زندگی سے بھی فزوں تھا انکی پیشانی کا نور

زندۂ جاوید ہیں وہ اپنی تصنیفات میں
گرچہ ظاہر بیں ہوئے ہیں آج من اہلِ القبور

اے خدا ٹھنڈی رہے تربت ہمارے شیخ کی
جنت الفردوس میں انکو ملیں حور و قصور

عمرِ اقدس ہے "مجاہد" اسعدِ محزوں لکھ
۹۳
ابتدا "اخترِ حسن" ہے خاتمہ "وصلِ غفور"

سنہ ۱۳۱۹ھ سنہ ۱۴۱۲ھ

روزنامہ آواز ملک وارانسی

26-3-92

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مرحوم کو مئو کانگریس (آئی) کا خراج عقیدت

مئو ۲۵ مارچ - امیر الہند جناب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے انتقال پر ملال کی خبر سے ہر چہار طرف غم واندوہ کی سیاہ بدلیاں چھا گئیں۔ تجہیز وتکفین کے بعد شہر کانگریس کمیٹی مئو کے عہدیداران، ممبران وسوگوار کارکنان کی ایک تعزیتی نشست ہوئی، کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے آل انڈیا مومن کانفرنس کے چیئرمین جناب مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نعمانی نے کہا کہ مولانا اعظمی مرحوم عالم اسلام کے مایۂ ناز عالم دین تھے جنہوں نے اپنی تصنیفات سے مئو اور ہندوستان کے وقار کو بلند کیا۔ ان کی تحریر وتقریر کا انداز منفرد تھا، نعمانی صاحب نے حاضرین کو بتایا کہ مجھے شرف تلمذ حاصل ہے اور مولانا اعظمی مرحوم کی علمی گہرائی کے کئی واقعات نقل کئے۔ نعمانی صاحب نے مولانا اعظمی مرحوم کو خلوص دل سے نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور دعائے مغفرت کی نیز ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا، صدر کانگریس جناب شوکت عمر انصاری نے مولانا اعظمی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مرحوم اپنی محققانہ صلاحیت کی وجہ سے آفاقی شہرت کے مالک تھے اور اپنی علمی گہرائی کی وجہ سے انہوں نے مئو کی شان اور اس کے وقار کو چار چاند لگا دیئے مولانا مرحوم کی زندگی اور تقدس کا پیام اور ان کی درویشانہ زندگی اور سب کے لئے پیار ومحبت ہم سب کے لئے مشعل راہ بن کر صدیوں تک رہنمائی کرتی رہے گی۔ اتر پردیش کانگریس کمیٹی کے ممبر شری رام اوتار پانڈے نے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے حاضرین کو بتایا کہ ہمارے ہندوستانی سماج میں آج بھی روحانی قدریں مادی قدروں پر غالب ہیں اور علماء نیز درویش منشوں کا مقام سماج میں دولت مندوں سے ہزاروں گنا بڑا ہے۔ مولانا مرحوم کی مقبولیت اور ان کے احترام سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ نائب صدر مئو شہر کانگریس جناب ماسٹر رام لعل نے حاضرین کو بتایا کہ مولانا مرحوم پوری انسانیت کے لئے بردان تھے اور محبت کے علمبردار تھے، جنرل سکریٹری شہر کانگریس کمیٹی جناب ڈاکٹر نور الدین احمد انصاری نے مولانا اعظمی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ مولانا اعظمی مرحوم نے اپنی غیر فانی تصنیفات سے اسلام وانسانیت کی لازوال خدمت انجام دی ہے۔ سکریٹری جگدیو لام اور بزرگ مجاہد آزادی اور مئو میونسپل بورڈ کے سابق چیئرمین جناب رام گوپال کھنڈیل وال نے مولانا اعظمی کو ہندو مسلم اور مئو کے سابق چیئرمین جناب رام گوپال کھنڈیل وال نے مولانا اعظمی کو ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار اور پیار ومحبت کا پیکر بتاتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کی۔ آخر میں ایک تعزیتی تجویز پیش کی گئی اور مولانا اعظمی مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے دو منٹ خاموش رہ کر مولانا اعظمی کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔

تعزیتی تجویز ۱۸ مارچ ۱۹۹۲ء

مئو شہر کانگریس کمیٹی آئی کے عہدیداران ممبران وکارکنان کی یہ تعزیتی نشست مئو کے عظیم سپوت اور عالم اسلام کے بے مثل اور شہرۂ آفاق ماہر اسلامیات امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتی ہے اور اس مایۂ ناز عالم دین کو پر خلوص نذرانۂ عقیدت پیش کرتی ہے۔ مولانا مرحوم کے علم بیکراں، ان کی تحقیقی کاوشیں، بزرگی، تقدس اور سادہ درویشانہ زندگی ان کی بلند خیالی اور علمی وقار سبھی میدان میں ان کے شاندار کارنامے نے مئو سے ان کی وابستگی کی وجہ سے اس دھرتی کا مقام بلند تر کر دیا ہے اور اسے عظمت کی نئی بلندیوں سے آشنا کرا دیا ہے جس سے اس شہر اور ضلع کا سر فخر سے اونچا ہوا ہے۔ اور بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا اعظمی صاحب کو جو بلند مقام قومی وبین الاقوامی میدان میں حاصل ہوا اس سے ان خطابات واعزازات کا وقار اور بڑھ جاتا ہے جو مولانا مرحوم کو بھارت سرکار نے مسلمانان ہند نے یا بین الاقوامی دنیا نے دیئے، مولانا مرحوم تقریباً تین چوتھائی صدی تک مئو کی سماجی، معاشرتی، علمی ومذہبی زندگی پر چھائے رہے اور ان کی ذات ہندو مسلم اتحاد اور پیار ومحبت کا پیکر تھی جس کے لئے یہ نشست انہیں گلہائے عقیدت پیش کرتی ہے اور مولانا مرحوم کے پسماندگان سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے نیز مالک دو جہاں سے ان کی مغفرت کی دعا کرتی ہے۔

شوکت عمر انصاری

مولانا اعظمی نمبر — قیمت ۲ روپیہ

ہفت روزہ جدید حالات مئوناتھ بھنجن
'HĀLAAT' WEEKLY MAU N.B.

شمارہ ۱۷ — مارچ / اپریل ۱۹۹۲ء — جلد ۲۶

محدث کبیر امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مرحوم

علم حدیث کا نیر تاباں غروب ہوگیا

امیر الہند محدث الاعظمی کی موت اسلامی دنیا کیلئے ایک عظیم حادثہ

اظہار الحق انصاری کے قلم سے

۱۰ر رمضان المبارک بروز سوموار غروب آفتاب کے ساتھ ہی علم حدیث کا خورشید تاباں بھی اس دنیا سے غروب ہوگیا اور دنیائے علم وفن کو یتیم کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محدث عصر اور عالم اسلام کے یگانۂ روزگار عالم علامہ محدث اعظم حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی وفات کی خبر نے پورے عالم اسلام اور مئو و اطراف مئو کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو بیتاب کر دیا اور ہر ایک نے چشم نم اور دل غم آگیں کے ساتھ اس المیے کو سنا اور دوسرے روز ۱۱ر رمضان المبارک کو مئو و اطراف مئو کے لاکھوں فرزندان توحید ڈھائی بجے دن میں روزہ رکھے ہوئے دھوپ اور تپش میں ان کی نماز جنازہ ادا کی۔ جنازے کے آس پاس ہندوؤں کی ایک بڑی جماعت موصوف کی عقیدت میں حاضر تھی۔

موصوف پورے عالم اسلام میں فن حدیث و رجال میں صف اول کے علماء میں شمار کئے جاتے تھے جن کی بدولت نہ صرف مئو بلکہ ہندوستان کا نام دنیائے اسلام میں روشن ہوا۔ اور چونکہ موصوف ہند و مسلم یکتا کے علمبردار تھے اور نہایت کشادہ ذہن وخیال کے مالک تھے اسلئے ہندوؤں کے ساتھ ہی ہر مکتب فکر کے مسلمان بھی ان سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ اور ان سے دعائیں لینے جاتے تھے

موصوف زہد وتقوی میں بھی اپنا امتیاز رکھتے تھے، یہ وہ خوبیاں اور کمالات تھے جس نے ہر ایک کو ان پر شیفتہ کر رکھا تھا لیکن جیسا کہ پہلے ہم لکھ آئے ہیں ان کا اصل فن حدیث و اسماء الرجال تھا جس کے لئے انہوں نے اپنی حیات مستعار صرف کر دی اور اپنی خداداد ذہانت و ذیانت کی وجہ سے تحقیق حدیث و اسماء الرجال کے بارے میں ایسا بے مثال کارنامہ چھوڑ گئے جو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنا رہے گا اور شائقین علوم نبوی اس سے برابر استفادہ کرتے رہیں گے۔

موصوف ان ہستیوں میں ہیں جن کے تمام محاسن وکمالات کو بیک قلم نہیں لکھا جا سکتا پھر بھی اسمیں کوئی شک نہیں کہ علم حدیث و اسماء الرجال میں ان کا شمار دور جدید کے صف اول کے محدثین میں ہوتا تھا اور موصوف کے علم حدیث سے بے پناہ شغف اور محبت کا اندازہ اس سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اثاثۂ حیات کو حدیث کی خدمات کے لئے وقف کر دیا اور اللہ تبارک وتعالی نے بھی دنیا ہی میں ان کو یہ صلہ دے دیا کہ پورے عالم اسلام میں انہیں قبول عام نصیب ہوا اور تحقیقات کے سلسلہ میں ان کی زیادہ تر رائے کو محدثین عصر نے تسلیم کیا اور ان کی تحقیقات کو جو قدر وقیمت حاصل ہوتی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

> محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سابق شیخ ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ نے مکہ مکرمہ میں منعقدہ علماء عرب وعجم کے نمائندے اجتماع میں کہا تھا کہ اس زمانہ میں اگر کسی کے محدث اعظم کہلانے کا مستحق ہے تو وہ آپ ہی ہیں۔

موصوف نے کتب حدیث کی تحقیقات میں اتنا کام کر دیا ہے کہ ہر ایک پر فرداً فرداً تبصرے کے لئے ایک ایک تصنیف کی ضرورت ہے لیکن تعلیق علی نصب الرایۃ اور مسند حمیدی کی تحقیق کے سوا ان کا بے مثال کارنامہ وہ تعاقب ہے جسے انہوں نے محدث احمد شاکر عصری کی تحقیق مسند احمد پر کیا اور موصوف کے تعاقب کو تسلیم کرتے ہوئے احمد شاکر نے اسے اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔

چونکہ حدیث و اسماء الرجال کا فن انتہائی دشوار ہے اسلئے اسمیں بڑے بڑے محققین سے کچھ نہ کچھ لغزش ہوئی ہے اور یہ انسانی فطرت بھی ہے اس لئے موصوف سے بھی لغزش ہوئی ہے مگر پھر بھی ان کی تحقیقات اور رائیں اکثر وبیشتر ناقابل انکار حقیقت ہیں جسے چار و ناچار علمائے عصر و محققین نے کھلے

(بقیہ ص ۳ پر)

پرنٹر پبلشر فخر العباد اعظمی نے افضل نعیمی پریس سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ حالات جلال صدر بازار مئوناتھ بھنجن سے شائع کیا۔ فون ۲۹۸۱

اعظمی نمبر — ہفت روزہ حالات جدید مئو — ۲ — ۲۷ر مارچ ۱۹۹۲

مولانا اعظمی صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازے گئے

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی شہر کے ہی محلہ پٹھان ٹولہ میں ایک غریب انصاری خاندان میں ۱۳۱۹ھ میں پیدا ہوئے تھے ان کا تاریخی نام احمد حسن تھا سب سے پہلے ان کی تعلیم مدرسہ فیضان العلوم بیاوگنج اور ابتدائی تعلیم ان کے والد محترم مولانا محمد صابر صاحب مرحوم کی دیکھ ریکھ میں ہوئی ان کے والد محترم معمولی مدرس تھے اسلئے تعلیم و تربیت دینے کا کام خود انھوں نے انجام دیا مولانا شروع ہی سے ہونہار طالب علم کی شکل میں سمجھے اور جانے لگے یہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند میں کافی دنوں تک علم کی تکمیل میں رہ کر علم حاصل کیا مولانا کو عربی و فارسی میں کافی مہارت حاصل تھی ان کی لکھی ہوئی کتابیں آج بھی ملک کے علاوہ غیر ملکوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ مولانا کے ذریعہ لکھی ہوئی کتابوں کی قیمت دینے کی ہر ممکن کوشش کی مولانا اپنے مذہب کے پختہ ہونے کی وجہ سے اپنے علم کو غیر ملک کے ہاتھوں فروخت کرنا گوارا نہیں کیا۔ کچھ ہی دنوں میں مولانا نے دنیا میں ایک باعزت مقام حاصل کر کے دنیا والوں کو یہ سبق سکھا دیا کہ ایک غریب آدمی کی عزت کسی امیر سے کم نہیں ہوتی۔ اسی مقبولیت نے مولانا کو بھارت سرکار کی طرف سے ۱۶ر مارچ ۱۹۸۶ء کو راشٹرپتی بھون دلی میں ہندوستان کے صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کے دست مبارک سے در پدم شری، کا ایوارڈ عربی زبان کے لئے ملا تھا یہی وجہ ہے کہ مولانا کو غیر ملکوں سے ڈاکٹری ملنے لگی۔

مولانا ایسے غریب پرور دنیا میں نام روشن کرنے والے انسان تھے جن کی موت کی خبر جنگل کے آگ کی طرح مئو شہر ہی نہیں غیر ممالک میں بھی دو گھنٹے کے اندر پھیل گئی۔ ہندوستانی ریڈیو کے علاوہ پاکستان، بی بی سی لندن، بنگلہ دیش ساؤتھ آف امریکہ۔ اور دیگر ممالک سے بھی نشر کی گئیں مولانا کے آخری دیدار کے لئے شام سے ہی دونوں فرقے کے لوگ ان کی رہائش گاہ پر اکٹھا ہو کر خراج عقیدت پیش کر رہے تھے۔

مولانا فن حدیث اور معقولات کے استاد تھے ۱۳۹۹ھ میں انھوں نے مدرسہ مرقاۃ العلوم قائم کیا تھا مولانا مئو کے مدرسہ دارالعلوم میں بھی بہت دنوں تک تعلیم حاصل کی ہے۔ مولانا جہاں ایک طرف محدث تھے وہیں دوسری طرف بہت سے مسلم تنظیموں اور اسلامی اداروں سے وابستہ رہے جیسے خاص کر دارالعلوم دیوبند جمعیۃ العلماء ہند کے ممبر اور امیر الہند کے عہدہ پر فائز رہے۔

ان کے مدرسہ مرقاۃ العلوم سے ٹھیک ساڑھے بارہ بجے شروع ہوا تو لاکھوں عقیدتمندوں کی آنکھیں نم اور ایک عجیب کرب چیخ و پکار کا منظر دیکھنے کو ملا ٹھیک دن میں ڈھائی بجے مولانا کا نماز جنازہ مئو ریلوے گراؤنڈ پر مولانا عبدالجبار صاحب نے پڑھایا اور اس دن چار بجے سے رات دس بجے تک مولانا کے لوگ منہ دیتے رہے اور شب ۱۰ بجے فاتحہ خوانی ہوئی۔ اس موقع پر عوام ازدحام کو کنٹرول کرنے کے لئے ضلع انتظامیہ کی جانب سے زبردست انتظامات کئے گئے تھے لیکن پھر بھی مجمع کو کنٹرول کرنا ممکن نہ ہوسکا۔

مرحوم کا جنازہ دن میں تقریباً ساڑھے بارہ بجے ان کے گھر سے نکلا جو خالہ شاہ [illegible] سے ہوتا ہوا ریلوے گراؤنڈ پر پہونچ گیا لوگوں کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ اس معمولی مسافت کو طے کرنے میں ایک گھنٹے کا وقت لگ گیا۔ جنازہ میں شریک لوگوں کے بے پناہ ازدحام کو دیکھتے ہوئے لوگوں کا کہنا تھا کہ آزادی کے بعد مئو کی سرزمین پر اتنا بڑا ہجوم دیکھنے کو نہیں ملا۔ مرحوم کے جنازہ اور تدفین جلوس سے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہیں شہر کے آس پاس کے ہندو دوستوں کی ایک بڑی تعداد اس عظیم عالم کو دیکھنے کو ملی اس سانحہ پر مئو دیار [illegible] نے عام بندی کا اعلان کیا تھا جبکہ مئو کے تمام کاروبار اور ادارے خود کو بند کر گئے یا [illegible] بھی مکمل طور پر بند رہے اور پورا شہر غم واندوہ کے ماحول میں ڈوب گیا تھا اور شہر کے ہندوؤں نے مولانا کی موت پر تاریخی بندی کر کے مولانا کے تئیں بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا۔

موصوف کے بارے میں قدرت کے فیصلہ کو قبول کرتے ہوئے ہم دعا کرتے ہیں کہ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

— آمین —

بقیہ:- علم حدیث کا نیّر تاباں غروب ہوگیا

دل سے تسلیم کیا ہے۔

موصوف نے مدرسہ مفتاح العلوم کو جن بلندیوں تک پہنچایا اور مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی مرحوم کے ہمراہ جس محنت شاقہ کے ساتھ اسکی خون جگر سے آبیاری کی وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن یہ عجیب المیہ ہے کہ اخیر دور میں موصوف اس ادارے سے الگ ہوگئے اور خود المعہد العالی مرقاۃ العلوم کی بنیاد رکھی جو تخصیص فی الفقہ کا ایک بے مثال ادارہ ہے۔ جامعہ مفتاح العلوم سے الگ ہونے کے بعد موصوف نے نہایت متین اور سنجیدہ نظریہ اپنایا اور حدیث نبوی پر اپنی تحقیق اور متوازن رائے پیش کرنے کا زیادہ تر حصہ ان کے اسی دور کا ہے اور اگر ان کی حیات مستعار ساتھ دیتی تو شاید فن حدیث و رجال میں اپنی خدمات کا نادرۂ روزگار نمونہ چھوڑ جاتے پھر بھی موصوف نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے کم نہیں ہیں اور آئندہ دور بھی ان کی خدمات کا ممنون رہے گا۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

مئو ناتھ بھنجن گذشتہ دور عالم اسلام کی بلند پایہ علمی و تحقیقی شخصیت امیر الہند محدث کبیر بخاری وقت ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کو لاکھوں سوگواروں نے اشکبار آنکھوں اور غم زدہ دل کے ساتھ آیات قرآنی کا ورد کرتے ہوئے مدرسہ مرقاۃ العلوم کے احاطہ میں سپرد خاک کر دیا اسطرح ایک عہد ساز روحانی شخصیت کا جسد خاکی مٹی تلے دب گیا تاہم انکی ذات سے پھیلنے والی ایمانی روشنی آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

(محدث اعظم) حضرت مولانا صاحب اعظمی کا گذشتہ ۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء کو عین وقت افطار ۷ بجکر ۳ منٹ پر انتقال ہوگیا تھا موصوف ۱۷ر مارچ کو حبیب مولانا کا آخری سفر

ایڈیٹر حالات جدید کا تعزیتی پیغام

رہ رہ کے لوگ مجھکو پڑھیں گے ورق ورق
میں تجربات کے وہ سبق چھوڑ جاؤں گا

حالات جدید کے ایڈیٹر اظہار الحق انصاری نے اپنے ایک تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ محدث اعظم امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دنیائے اسلام کی مایہ ناز مقتدر شخصیت تھے انھوں نے اپنے اعلیٰ دینی اسلامی تعلیم کے تحت اسلامی تاریخ و حدیث میں جو دنیائے اسلام میں بلند مقام پیدا کیا تھا اس سے ہمارے ضلع متوناتھ بھنجن کا نام سنہرے حرفوں سے تاریخ میں نوشت ہو گیا ہماری وقت کی خدمات نے اسلامی مشن کو وہ کامیابی عطا کی جو ہمارے فکر و سوچ سے باہر ہے اور اس کی ہمیں کافی فخر ہے۔

ایڈیٹر حالات جدید نے مولانا مرحوم کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے کہا کہ مولانا اعظمی صاحب نے اپنی بیش بہا زندگی کو اسلامی دینی علمی خدمات اور علم دین کے لئے وقف کر دیا تھا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ بہت قلیل مدت میں مرحوم اعظمی دنیائے اسلام کی مقتدر و برگزیدہ شخصیات میں شمار کئے جانے لگے۔

مولانا کی اندوہناک موت سے متو اور شرقی اترپردیش بلکہ پورا ملک اور بالخصوص دنیائے اسلام غمزدہ و سوگوار ہو گیا ہے اور اس افسوسناک المیہ کو بہت جلد فراموش کیا جانا بہت مشکل ہے کیونکہ مولانا اعظمی صاحب ہمیشہ ہی تمام سیاسی ملکی و گروہ بند فرقہ پرستی اور تنقیدی معاملوں سے کوسوں دور رہے۔

ایڈیٹر حالات نے کہا کہ مولانا اعظمی صاحب نے اپنی زندگی صحابہ کرام اور اولیائے اکرام کی طرز زندگی کی طرح سادہ زندگی گذارنے پر اہمیت و اولیت دی اور دنیا کی نوادرات آرائش و آسائش سے ہمیشہ کوسوں دور رہے مولانا کی موت پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے بقول ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔ آنے والی نسل مسلمانان تجھے یاد کرے۔

میں حضرت مولانا اعظمی کی المناک موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہوں اور مولانا اعظمی کو دلی خراج عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو [illegible]

مولانا اعظمی کے استاد اور شاگرد

درس حدیث میں برصغیر کے مسلمانوں کی والہانہ رغبت وعقیدت اور نسبت حدیث سے انسیت کی واقفیت کی تاریخ بہت پرانی ہے تاریخ فیروز شاہی بتاتی ہے کہ۔

اگر تھوڑی سی زحمت اٹھاکر تاریخ کے دریچوں سے حقیقتوں کو تلاش کیا جائے تو حضرت شاہ صاحب سے پہلے بلکہ بہت پہلے یہ ملک حدیث سے اس درجہ واقف ہوچکا تھا کہ یہاں سے حفاظ قرآن کی طرح بخاری شریف کے حفاظ بھی موجود تھے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ کی واجب الاحترام شخصیت اسلاف واخلاف کے درمیان ایسی ہی مضبوط اور ناقابل انکار کڑی ہے جن کے تمام وکمال کے اعتراف کے بغیر علام موت کے عاشقوں کی علمی خدمات کی حقیقی روح سامنے آسکتی ہے نہ ہی درس حدیث رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے معیار وتسلسل اور اس سے متعلقہ علوم کی علمی فنی باریکیوں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

مکۃ المکرمہ میں علماء عرب وعجم کے نمائندے اجتماع میں۔ جہاں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اور مولانا منظور نعمانی بھی موجود تھے سابق شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے فرمایا تھا کہ فی زمانہ عرب وعجم میں اگر کوئی محدث اعظم کہلانے کا مستحق ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمن اعظمی ہیں

آپکو انور علامہ شاہ کشمیری مفتی عزیز الرحمن دیوبندی علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا اصغر حسین کا راست اور مولانا رشید احمد گنگوہی کا ایک واسطے سے شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مولانا کریم بخش، مولانا عبدالغفار اور شیخ سعید سنبل کے علاوہ شیخ عبدالرحمن بھوپالی سے آپکو حدیث میں خصوصی سند حاصل ہوئی جسکا سلسلہ مولانا محمد اسحق محدث دہلوی تک پہنچتا ہے۔ سفر حج کے علاوہ دنیائے عرب کا آپ نے کئی علمی سفر کیا جن میں اہل علم سے استفادہ اور افادہ جاری رہا عالم عرب کی جن مقتدر شخصیتوں نے آپ سے سند حاصل کرنے کی سعادت پائی ان میں سے کچھ کے نام اسطرح ہیں۔

شیخ عبدالفتاح، ابوغدہ، شیخ اسماعیل الانصاری (دارالافتاء ریاض)

شیخ حماد الانصاری، شیخ محمد عوامہ، شیخ سعدی الہاشمی، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ شیخ عبدالعزیز ابوعیون الحود (حمص) سید صبحی السامرائی، علامہ نساء عواد معروف، اور شیخ حمدی عبدالمجید (بغداد) استاذ زہیر الشاویش (بیروت) استاذ عبدالستار ابوغدہ (کویت) شیخ نورالدین عتر (دمشق) ڈاکٹر عبداللہ الجبوری (ریاض) شیخ مقری ایمن رشدی سوید (جدہ) وغیرہ کا۔

ڈاکٹر محمد عمر رسا الاعظمی اس اعظمی کی نسبت ہندوستان کے شہر اعظم گڈھ کیطرف نہیں بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کیطرف ہے آپکا خاندان سات پشتوں سے المدرسۃ الاعظمیہ بغداد سے وابستہ ہے) نے حضرت محدث اعظمی کی زیارت اور اجازت حدیث کے لیے خاص طور سے مئو کا سفر کیا، شیخ ایمن رشدی سوید نے دو سفر کے اندر بخاری شریف مکمل پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ بقیہ صفحہ پر

اعظمی نمبر — ہفت روزہ حالات جدید مئو — ۵ — ۲۷ مارچ ۱۹۹۲ء

محدث اعظمی کی حیرت انگیز خدمات ایک نظر میں

مئوناتھ بھنجن۔ امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب ایک بلند پایہ کے عالم تھے انھیں جہاں مسلمانوں میں ایک دانشور تسلیم کیے جاتے تھے وہیں دوسری جانب ہند و طبقہ کے لوگ بھی عقیدت اور پیار کی نگاہ سے انھیں دیکھتے، کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ حدیث کے بارے میں ان کے مقابل کوئی عالم اسوقت دنیا میں نہیں ہیں۔

صدیوں پرانی حدیثوں کو مختلف ملکوں سے حاصل کر کے ان کی تصحیح اور غلطیوں کو دور کرنا اتنا مشکل کام ہے کہ کوئی بھی دنیا کا عالم اس میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت گوارہ نہیں کرتے تھے لیکن مرحوم کے لئے یہ کام اتنا سہل تھا کیونکہ مولانا ہمیشہ سے مذہبی کتابوں کے مطالعے میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتے ہوئے دیکھے گئے اور اس دوران اگر کتابوں کی کمی محسوس ہوتی تو مولانا کافی پریشان ہوجاتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی قدیم حدیث کا ایک حصہ عرب کی کسی لائبریری میں بوسیدہ حالت میں پڑا ہوا تھا مولانا کسی دیگر ملک سے اپنے ایک معتمد کے ذریعہ اسکی مکمل جانکاری حاصل کر کے اسکی فوٹو کاپی منگائے اور پھر بڑی کاوش کے بعد جب اسے پڑھنے کے قابل بنادیا تو بڑے بڑے علماء دانتوں سے انگلیاں دبا لیتے تھے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ ہزار صفحات پر مشتمل ایک کتاب جو (استنبول) ترکی کے کتب خانہ میں موجود تھی اسکی مائیکرو فلم مولانا نے بڑی کوشش سے حاصل کرلیا۔ لیکن یہاں نہ تو کمپیوٹر تھا اور نہ ہی کوئی نظام تکنیکی کہ اسے پڑھنے کے قابل بنایا جاسکے۔ بڑا ہی مشکل کام تھا کتاب عام لوگوں کے بے سمجھ رہی تھی مگر مولانا اپنی محنت اور لگن سے اس ناممکن کام کو قابل ممکن بنایا۔

یہ کتاب جب بیروت (لبنان) سے چودہ (۱۴) ضخیم ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی تو اسلامی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی لوگوں کے لئے یہ حیرت اور تعجب کا بنا ہوا تھا کہ آخر یہ کتاب مولانا نے کیسے پوری کی ہوگی مولانا کی بہت سی تصنیف ہندوستان کے علاوہ کویت، لبنان، عرب، جدہ، مصر وغیرہ کے علاوہ دیگر مسلم ملکوں میں شائع ہوئی تھی ایک قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے کبھی اپنی کتابوں کے لیے رائلٹی نہیں لی وہ اس کام کو مذہب کی خدمت سمجھ کر کرتے تھے آج ترقی کے دور میں یہ بہت حیرت انگیز بات ہے۔

ایک بار کی بات ہے انکے ذریعہ تیار کی گئی کئی ہزار صفحات پر مشتمل کتاب (مصنف عبدالرزاق) بیروت میں شائع ہو رہی تھی وہاں کے ایک دوسرے پبلشر نے مولانا سے رابطہ قائم کیا اور دریافت کیا کہ آپ کو اسکی رائلٹی کیا ملے گی؟ مولانا نے جب اس سے متعلق کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خاموش ہوگیا۔ اس نے کہا اس کے ایک حصہ پر ہی ہم لاکھوں ڈالر کما لیں گے۔

معمولی قد و قامت میں غیر معمولی شخصیت کے حامل مولانا اعظمی کی پیدائش ۱۸۹۸ء میں مئوناتھ بھنجن کے ایک غریب خاندان میں ہوئی تھی ان کے والد محترم مولانا محمد صابر حسن مرحوم نے ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے خود استاد تھے بعد میں حضرت مولانا ابوالحسن صاحب سے انھوں نے عربی کی تعلیم حاصل کی وہ ابتداء سے ہی ہونہار اور روشن دماغ کے طالب علم تھے انھوں نے مئو، گورکھپور، بنارس اور دیوبند کے واقع مدرسوں میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ شہر میں مدرسہ کے نام پر مرقاۃ العلوم کی جو شاندار عمارت دیکھنے کو مل رہی ہے وہ مولانا مرحوم کے زبردست محنت کا نتیجہ ہے مولانا اعظمی نے سادگی کی زندگی گزاری لیکن بلند خیالات کے پیکر تھے کسی طرح کے جلسہ جلوس سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی معمولی سی چٹائی پر بیٹھے تصنیف و تالیف درس و تدریس دیتے ہوئے انھیں دیکھا جاتا تھا زندگی بھر انھوں نے لوگوں کی خدمت کی صحیح معنوں میں ایک اچھے انسان تھے انکی سادگی اور نصیحتوں سے سبق لینا ہی ان کے لئے سچی خراج عقیدت ہوگی۔

امیر الہند کے ہمسفر

بقیہ مولانا کے استاد و شاگرد

علمی اسفار میں آپ جن اہم لوگوں سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں انمیں شیخ عبدالعلیم محمود، شیخ بہجۃ البیطار، شیخ علوی مالکی، شیخ محمد حسنین مخلوف، شیخ عبدالرحمٰن الیمانی، شیخ ناصرالدین البانی، علامہ خیرالدین زرکلی، شیخ محمد علی حرکان، مصطفیٰ احمد الزرقا، مفتی محمد امین الحسینی شامل ہیں۔ برصغیر میں حدیث کی اہم کتابوں پر شرح لکھنے اور حاشیہ تحریر کرنے کی روایت بہت پرانی ہے حضرت محدث الاعظمی کی تصنیفات و تالیفات کو اسلاف کی اسی کی روایت کی توسیع قرار دینا یا حدیث میں اکابر کی تحقیقی خدمات کے تسلسل کی ایک اہم کڑی کہنا صحیح ہے اسی روشنی میں ان کی اہمیت و حقیقت اور افادیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک تردید

مولانا مرحوم نے مئوناتھ بھنجن کے عظیم و قدیم دینی درسگاہ دارالعلوم مئو سے شیخ الحدیث حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مرحوم کے دور میں شریک درس ہو کر اسی درسگاہ سے سند فراغت حاصل کی تھی اور اوّل اوّل انھوں نے اسی دارالعلوم مئو میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیئے مگر کچھ عرصہ بعد چند وجوہات کی بنیاد پر مولانا مرحوم نے مظہر العلوم بنارس میں ملازمت اختیار کرلی۔

امیر الہند کی موت پر یوتھ لیڈر کی اظہار تعزیت

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی وفات سے نہ ہم سب کو بلکہ تمام عالم اسلام کو صدمہ پہونچا ہے اور انھوں نے کتابوں کے ذریعہ اسلامی تحریک کو نقطہ عروج تک پہونچایا انکی جتنی بھی تعریف کیجائے کم ہے۔

مئو یوتھ کانگریس آئی کے صدر جناب اشتیاق احمد انصاری نے مولانا کے انتقال پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی موت سے پورا عالم اسلام دکھی ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے منور کرے اور اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مولانا اعظمیؒ کی تصانیف

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے امالی "فیض الباری علی صحیح البخاری" چار ضخیم جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ اور شیخ الہندؒ کے امالی علی سنن ابوداؤد، انوار المحمود کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔

• علامہ شبیر احمد عثمانی کی صحیح بخاری پر تقریریں، نہایت علمی شرح کی صورت میں فضل الباری علی صحیح البخاری کے نام سے شائع ہوئی ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا ہے۔ آپ نے فتح الملہم کے نام سے صحیح مسلم کی جو عربی شرح کی ہے اس کو علماء ازہر نے تمام سابقہ شروح پر مقدم مانا ہے۔

• صحیح بخاری کے متن کے ساتھ حضرت گنگوہیؒ کی تقریر مولانا محمد زکریاؒ کی عربی تصنیف مع الدراری علی صحیح البخاری ۳ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

• مولینا محمد ادریس کاندھلوی نے تراجم بخاری کی مکمل عربی شرح کئی جلدوں میں تحریر فرمائی ہے۔

• مولانا خلیل احمدؒ نے ابوداؤد کی شرح، بذل المجہود، پانچ ضخیم جلدوں میں عربی میں تحریر فرمائی ہے جو مولانا محمد زکریاؒ کے مختصر حواشی کے ساتھ مصر سے دوبارہ شائع ہوئی ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی شرح معارف السنن، اس دور میں خدمت حدیث کا شاہکار ہے۔

• امام محمدؒ کی، کتاب الآثار، کی شرح مولانا مہدی حسنؒ نے کئی جلدوں میں تحریر کی ہے۔

• ابوبکر بن شیبہ کی، المصنف علم حدیث کا نادر خزانہ ہے جس پر مولانا عبدالخالق افغانی نے [illegible] تحقیقی کام کیا ہے۔

حضرت محدث حبیب الرحمٰن الاعظمی نے حدیث کی کئی قدیم کتابوں کے مسودوں پر عرق ریزی فرمائی ہے۔ ان پر نہایت نفیس تعلیق لکھی ہے۔

عالم عرب کے مشہور محدث علامہ احمد محمد شاکر کی شرح مسند ابن حنبل پر تنقیدات علمی تنقید آپ کا یادگار کارنامہ ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مصنف نے ان تنقیدوں کو اظہار تشکر کے ساتھ نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ اپنی کتاب کی پچیسویں جلد میں حضرت محدث الاعظمیؒ کی فضیلت علمی اور علوم حدیث میں آپ کی مہارت کے اعتراف کے ساتھ شامل بھی کیا ہے۔

آپ کی تحقیق و تعلیق کا شاہکار یہ کتابیں ہندوستان کے علاوہ بیروت، دمشق مکۂ مکرمہ اور کویت وغیرہ سے شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ مسند حمیدی (دو جلدوں میں)

۲۔ امام بخاریؒ کے استاذ، امام عبداللہ بن مبارکؒ کی کتاب الزہد والرقائق،

۳۔ سنن سعید بن منصور (۲ جلدوں میں)

۴۔ انتقاء الترغیب والترہیب لابن حجر،

۵۔ علامہ طاہر پٹنیؒ کی خواتم جامع الاصول کی تلخیص۔

۶۔ ابن حجر کی المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ لابن حجر (۴ جلدوں میں)

۷۔ مصنف عبدالرزاق (۱۱ جلدوں میں)

(۸) ہیثمی کی کشف الاستار عن زوائد مسند البزار (۴ جلدوں میں)۔

۹۔ مصنف ابن شاہین کی کتاب الثقات،

۱۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ (۵ جلدوں میں)

.... اس کے علاوہ بھی کئی اہم اور یادگار تصنیفات ہیں جو ملک و بیرون ملک سے بڑے اہتمام سے شائع ہوئیں اور اہل علم کے لئے نافع ثابت ہوئیں۔

اردو میں بھی آپ کی کئی تصانیف ہیں اور انہیں کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں بس چند کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ بقیہ صفحہ پر

۱۔ نصرۃ الحدیث منکرین حدیث کے دلائل کا رد،

مولانا کے عقیدتمندوں کیلئے پجاری نے مندر کا پھاٹک کھول دیا

ریلوے گراؤنڈ پر واقع مندر کے پجاری نے مولانا مرحوم سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے جنازہ میں شرکت کیلئے باہر سے آئے عقیدتمندوں کو وضو کے لئے پانی کی فراہم کا خاص انتظام کیا اور نماز جنازہ میں شرکت کے منتظر بیرونی افراد کے آرام کے لئے مندر کے احاطہ میں جگہ مہیا کر کے بے مثال انسان دوستی اور قومی ایکتا کا ثبوت پیش کیا ضلع مجسٹریٹ اور پولس سپرنٹنڈنٹ سمیت تمام ضلعی افسران نے بھی مولانا مرحوم کے جنازہ میں شرکت کے لئے آئے عقیدتمندوں کو ممکنہ سہولیات فراہم کیں اور انکی ہمدردانہ روش کی سبھی حضرات نے تعریف کی۔

مرحوم کے جنازہ نماز میں شرکت کے لئے دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، بھاگلپور، بنارس گورکھپور بستی اعظم گڈھ، گونڈا، بہرائچ، غازیپور، جونپور، بلیا دیوریا، فیض آباد اور مشرقی اضلاع نیز مئو کے قرب وجوار کے لاکھوں عقیدت مندوں نے شرکت کی۔ نماز جنازہ میں جمعیۃ علماء ہند کے صدر اور نائب امیر الہند مولانا اسعد مدنی ایم پی کے چھوٹے بھائی مولانا اسجد مدنی اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی نے خاص طور سے شرکت کی مانی۔ مرحوم کے جنازہ اور آخری دیدار کے لئے مئو کے سڑکوں پر ہزاروں افراد بالخصوص غیر مسلم حضرات گھنٹوں کھڑے رہے سندھی کالونی کے باشندوں نے خاص طور سے اپنے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر مولانا مرحوم کے جنازہ کا انتظار کیا اور آخری دیدار کے لئے اپنی حسرت پوری کی۔

مرحوم کے پسماندگان میں دو بیٹوں مولانا رشید احمد اعظمی، مولانا سعید احمد صاحب کے علاوہ چار بیٹیاں باحیات ہیں۔ علم حدیث اور فن رجال کے موضوع پر ان کی تصانیف میں ان کے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد انکے معاون خاص بنے رہے۔

مولانا اعظمیؒ علمِ دین کے ایک روشن مینارہ تھے!

مئو ناتھ بھنجن۔ استاذ محترم محدث جلیل امیر الہند ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ کے انتقال پر ملال سے نہ صرف مجھے بلکہ لاکھوں لوگوں کو زبردست اور شدید صدمہ پہونچا ہے۔ آل انڈیا مومن کانفرنس کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن نعمانی نے مولانا اعظمیؒ کے انتقال پر ایک تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ مولانا کے انتقال سے دنیائے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔

مولانا تقریباً ۷۵ سال تک درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ علم دین کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ بلاشبہ حضرت مولانا مرحوم کی ذات گرامی دنیائے اسلام میں ایک روشن مینارہ کی سی تھی جس سے ہزاروں تشنگان علوم دین فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کل نفس ذائقۃ الموت نعمانی صاحب نے کہا کہ حضرت مولانا مرحوم بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ بہر حال ہم سب کو فرمان الٰہی ان اللہ مع الصابرین کے مطابق اس حادثہ جانکاہ پر صبر سے کام لینا چاہئے۔ نعمانی صاحب نے دعا کی ہے کہ اللہ رب العزت ان کے دینی کارناموں کو درجہ قبولیت عطا فرمائے اور ان کو دارالنعیم میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

انھوں نے مولانا کے پسماندگان کو خاص طور سے مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب کے ساتھ اظہار غم میں برابر کے شریک ہیں اور ان کے لئے یہی دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ مولانا مرحوم کے مشن کو جاری رکھیں۔

ہفتہ روزہ حالات جدید مئو
مینجنگ ایڈیٹر ــــ شاہ جمال انصاری ــــ ایڈیٹر ــــ اظہار الحق انصاری
سالانہ ــــ ۴۰ روپئے ــــ فی شمارہ ــــ ۱/۵۰ روپئے

اعظمی نمبر ہفتہ روزہ حالات جدید مئو ۷ ۲۷ مارچ ۱۹۹۲ء

مولانا اعظمی ہندو مسلم ایکتا کی جیتی جاگتی تصویر تھے

مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مئو اور اسکے قرب وجوار میں ہندو مسلم ایکتا کے لئے ایک عظیم الشان مثال تھے کیونکہ جب بھی کبھی یہاں پر فرقہ واریت کا ننگا ناچ ہوا اور انسانی زندگی شعلوں کے نذر ہونے لگی تو مولانا نے دونوں طبقے اور خاص طور سے مظلوم مسلمانوں کو صبر اور امن زبر دست تلقین کرتے ہوئے دیکھے گئے خود ہندو فرقہ مولانا کے ہر امن پسند اور ہدایتی فیصلوں کا احترام کیا یہاں کی ایک خصوصیت ہے کہ جب کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تو اسکا حل صرف مولانا کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انسانیت اور ملک کے لئے سب سے بہتر ہے سیاسی سماجی و مذہبی اور سرکاری

انسرانن کے مولانا کی علمی اور بلند پایہ شخصیت کا اعتراف تھا آپ اپنی عمر بھر کی پنشن بھی کبھی لینے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی پنشن رقم کے بارے میں کسی سے کچھ دریافت کیا ہاں جب کبھی انکے سیاسی دوست اپنے پنشن لینے جانے تو مولانا کے بھی پنشن بہی کا مطالعہ کرکے انھیں انکی آئی ہوئی پنشن رقم کی خبر دے دیتے تھے اس کے باوجود وہ نہ جاتے لیکن ان سے بے پناہ محبت عقیدت رکھنے والے دوست اپنے رسک پر مولانا کی پنشن ان تک پہونچا دیتے تھے اسطرح مولانا ایک سادہ مذہبی زندگی گذارنے کے حامی تھے۔

مولانا اعظمی کی موت سے عالم اسلام کی تحریک کو جھٹکا

محدث اعظم، بخاری وقت، حافظ حدیث اور عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے انتقال سے عالم اسلام کو شدید چوٹ پہونچی ہے جسکا خلا پورا کیا جانا ناممکن ہے۔

مشہور ومعروف ادارہ دانشگاہ اسکول مئو کے منیجر جناب مولوی اسلام الدین اعظمی اور اسکول کے صدر جناب ماسٹر اظہار الحق انصاری نے ایک تعزیتی پیغام میں مولانا اعظمی کے انتقال پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ مولانا اعظمی کی موت سے عالم اسلام کی تحریک کو زبردست جھٹکا لگا کیونکہ مولانا اعظمی نے اپنی ساری زندگی کو اسلامی خدمات کے لیے وقف کر دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ مرحوم کی مقبولیت ساری دنیا کے اندر ایک معجزہ بن گئی تھی۔ جس کے سایہ میں اسلامی تحریک کو دنیا کے ہر گوشے میں پھلنے پھولنے کا بہترین موقع میسر تھا۔ افسوس آج آپکی غیر حاضری ہم اور ساری دنیا کے لئے ایک تشویش کا باعث بنا ہوا ہے۔ ان حضرات نے پروردگار عالم سے دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور انکے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا اعظمی کے انتقال پر فخر العبید اعظمی کا پُرملال

مئو ناتھ بھنجن۔ امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے انتقال سے عالم اسلام کو جو شدید جھٹکا لگا۔ وہ ناقابل برداشت ہے۔ مرحوم اعظمی نے اپنی پوری زندگی دینی خدمات کے لیے وقف کر دیا تھا موجودہ اسلامی تحریک میں جو ایک انقلاب آیا وہ مولانا کی زبردست محنت لگن اور بیش بہا کوششوں کا نتیجہ مانا جائے گا جس کا آج اعتراف عالم اسلام کے بلند پایہ علماء کرام کر رہے ہیں۔

جمعیۃ الفلاح الخیریہ کے جنرل سکریٹری اور ہفتہ روزہ حالات جدید کے پرنٹر وپبلشر جناب فخر العبید اعظمی صاحب نے مولانا اعظمی کی وفات پر ایک تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ ہندوستان کے مشرقی اتر پردیش سے ایک دینی ستارہ غروب ہو گیا جس کی روشنی سے اسلامی دنیا کو قال اللہ وقال الرسول کے صحیح راہ کو تلاش کرنے میں کافی مدد ملی انھوں نے قدیم اور بوسیدہ حدیثوں کو جو صحیح کرکے مذہبی استعمال کے لائق بنا دیا بیشک وہ اسلامی دنیا کے لیے ایک بہت بڑا نیک قدم ہے۔ فخر العبید اعظمی نے مولانا مرحوم کو شاندار خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انکی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پورا ہونا مشکل ہے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ مولیٰ مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اپنے مقرب ترین بندوں میں شامل کرے نیز پسماندگان کو صبر وجمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اگلا شمارہ عید نمبر ہوگا قارئین نوٹ فرمائیں۔ (ادارہ)

مسلمانوں میں مولانا کے فیصلہ کا زبردست احترام

مذہبی اور مسلکی تنازعہ کا سوال ہو یا چاند کی تصدیق کا مسئلہ ہو مولانا کے مناسب فیصلے کا سبھی دل احترام کرتے تھے مرکزیت ہلال کمیٹی اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو بلا تفریق مولانا کے اوپر سونپ دیتی تھی مشرقی اتر پردیش میں چاند کے مسئلہ پر کبھی مولانا کی موجودگی میں اختلاف کا باعث نہیں بنا مولانا مذہب ومسلک کے نظریہ کا کبھی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ وہ قال اللہ اور قال الرسول کا درس دیتے انھوں نے کبھی دینی جلسوں میں لمبی تقریریں نہیں کیں۔ وہ کہتے تھے کہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے ایک حدیث کافی ہے۔ کیا ضرورت کہ بعد نماز عشاء وعظ ونصیحت شروع کیا جائے اور بارہ ایک بجے ختم کیا جائے اس سے لوگ محو نیند ہو کر فجر کی نماز چھوڑ دیتے ہیں اس لیے اس دینی تقریر کا فائدہ ایک بہت بڑے نقصان کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

سرکاری مراعات سے احتراز

مولانا مرحوم مئو ناتھ بھنجن کی سرزمین کے وہ پہلے عوامی نمائندے ہیں جنھوں نے جو ۱۹۵۲ء میں یوپی کی اول اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے انکی ایمانداری سے جواہر لال نہرو اور انکو رائے شاستری نے کانگریس کا ٹکٹ دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ مولانا نے نامزدگی کا پرچہ بھرنے کے بعد کسی فرد یا کسی چھوٹے بڑے دوست تک کو نہیں کہا جسکے نتیجہ میں عوام نے انھیں ایک زبردست اکثریت سے کامیاب کرایا آپ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک اسمبلی کے رکن رہے اور جب اس کی مدت پوری ہو گئی تو آپ کو پنشن ملنے لگی لیکن پنشن کا یہ حال تھا کہ کبھی آپ سرکاری آفسوں میں جانا پسند نہیں کیا لیکن آپ کے مخلص دوستوں کی کوششوں سے آپ کی پنشن آپکے ہاتھوں تک پہونچ جاتی تھی۔ نہیں مولانا کو متعدد بار انکے مدرسہ مرقاۃ العلوم کو سرکاری افسران نے گرانٹ دینے کی گذارش کی لیکن انھوں نے اسے سختی سے انکار کر دیا۔ مولانا کے شیدائی اور شاگرد ...

تصنیف مولانا اعظمی کی تصانیف۔

حدیث کے eternal relevan... کا اثبات اور انکی India Pensadii... پر اصرار ہے۔

۲۔ رکعات التراویح دینی نماز تراویح کی رکعتوں کا ثبوت احادیث نبوی سے پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ دستکار اہل شرف میں بتایا گیا ہے کہ عزت وشرف کا معیار کسب حلال ہے، رزق مشکوک ... مشکوک، تصنیف وتالیف کے علاوہ درس وتدریس میں بھی آپ کی ناقابل فراموش خدمات ہیں۔ آپ کئی اداروں کے بانی بھی ہیں۔

آپکے نامی گرامی تلامذہ میں چند اہم نام یہ ہیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد حسین بہاری، شیخ الحدیث مولانا عبد الستار اعظمی، شیخ الحدیث مولانا عبد الجبار اعظمی، شیخ الحدیث محمد سلیمان اعظمی، فاضل جلیل مولانا ظفیر الدین اور الاستاذ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ایڈیٹر البعث الاسلامی لکھنؤ۔

اردو اخبار حریت بمبئی

۸ ۲۷ مارچ ۱۹۹۲ء

सम्पादक इजहारुलहक अंसारी

HALAAT JADID URDU
Weekly
Mau Nath Bhanjan (275101)
साप्ताहिक हालात जदीद उर्दू

ہفت روزہ حالات جدید مئو
مینجنگ ایڈیٹر
شاہد جمال

میرے حلقہ انتخاب کا نیر تاباں اب غروب ہو گیا

عالم اسلام کو روشن کرنے والا

مرکزی وزیر توانائی کلپناتھ رائے کا تعزیتی پیغام

یہ خبر سن کر میرے دل کو بے حد دکھ ہوا کہ میرے حلقہ انتخاب کا نیر تاباں جو بھارت اور پورے عالم اسلام کو اپنے علم وفن سے روشن کر رہا تھا غروب ہو گیا۔ مجھے پروانچل کے اس یگانہ روزگار عالم اور محدث پر بے حد ناز تھا جس کے فضل وکمال کی وجہ سے بھارت کا نام پورے عالم اسلام میں روشن ہوا کی خبر سن کر میرے دل کو جو صدمہ پہنچا ہے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس عظیم عالم اور مانے ہوئے محدث کے سامنے عقیدت پیش کرتا ہوں اور پروانچل کے عوام کے غم میں شریک ہوں۔ ان کی موت اس کے اظہار میں پروانچل کے پوری دنیا کے کو دل سے خراج اور ان کے پسماندگان ساتھ ان کے شریک غم ہیں شری کلپناتھ رائے

امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم

مرکزی وزیر توانائی کلپناتھ رائے

مولانا اعظمی نمبر

نعت شریف

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی ایک نعت شریف جو گذشتہ ۱۶ ر مارچ کو رحلت فرما گئے۔

وہ جہاں کا رمز وجود ہے وہ مدار کار نظام ہے
کرو یاد معرکہ بدر کا، پڑھو فتح مکہ کا واقعہ
سبھی انبیاء کرام کا ہے مقام سب سے بلند تر
جو غذائے روح وسکون دل یہ انہیں کی پاک حدیث ہے
جو مجھے ملا وہ محض انہیں کی نگاہ لطف وکرم سے ہے

وہ خدا کی شان جمال کا یہ خدا کہ مظہر تام ہے
وہ خدا کا قہر وجلال تھا یہ نبی کی رحمت عام ہے
وہ ہلال چرخ کمال تھے میرا شاہ بدر تمام ہے
جو مریض دل کی شفا بنے یہ انہیں کا پاک کلام ہے
قلم وزبان حبیب کیا ہے یہ انہیں کا فیض دوام ہے

مرسلہ نیاز احمد مفتاحی
مورخہ ۱۷ ر اپریل ۱۹۷۲ء

روزنامہ آواز ملک وارانسی 1-4-92

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی وفات پر جامعہ عربیہ تعلیم الدین مئو میں تعزیتی میٹنگ

مئو۔ ۱۳؍ مارچ۔ امیر المومنین فی الحدیث محدث جلیل حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کی خبر پورے شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور پورا شہر گہرے رنج وغم میں ڈوب گیا۔

اس سلسلہ میں جامعہ عربیہ تعلیم الدین مئو میں ایک تعزیتی میٹنگ منعقد کی گئی۔ جس میں حضرات مدرسین واراکین نے اس سلسلہ میں اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ شیخ الحدیث والجامعہ حضرت مولانا مفتی اعجاز احمد حسینی نے اس تعزیتی میٹنگ میں حضرت مولانا کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بخاری وقت ابو حنیفہ دوراں ہم سے رخصت ہو گئے۔ اس جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ حضرت محدث اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے ناقابل تلافی خلا پیدا ہوا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔ بعدہ حضرت علامہ مرحوم کے لئے ترقی درجات کی دعا کی گئی۔

مولانا افضال احمد صاحب نے اپنی تعزیتی میٹنگ میں کہا کہ اسلامیان ہند کا آفتاب غروب ہو گیا، اس سلسلہ میں جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ مگر صبر کے بجز چارۂ کار کیا ہے؟

مولانا فیاض احمد الفیضی نے کہا کہ ہندوستان کی سرزمین سے ایسی شخصیت رخصت ہو گئی جن کی ذات پہ عالم اسلام کو ناز تھا۔ ہائے افسوس! آج وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ مولانا رفیق احمد قاسمی نے کہا کہ حدیث رسول کا سرچشمہ دنیا سے رخصت ہو گیا، حضرت مولانا ہم کو یتیم چھوڑ گئے۔

جناب ماسٹر محمد حسن [illegible] نے کہا کہ والد شیخ رفتار محمدؒ کی موت سے حضرت کے ایسے [illegible] دیکھو جتنے سوگ میں مومنان مئو شہر کی آنکھیں اشکبار ہیں۔

قاری اعجاز احمد نے اپنی طرف سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ حضرت مولانا کی شخصیت ایک بے مثال شخصیت تھی جس کی مثال ملنی بہت مشکل ہے۔ ہم جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ اللہ ہم سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا اسعد نظامی صاحب نے کہا کہ محدث اعظمی اپنی گوناگوں خصوصیات، تبحر علمی، وسعت نظر، اور علمی وتحقیقی خدمات کی روشنی میں ایک ایسی مشعل فروزاں تھے جس کے بجھ جانے سے تاریکی کا احساس مدتوں باقی رہے گا۔ اللہ ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

جناب مولانا کمال احمد ندوی نے کہا، علوم اسلامیہ میں یکتائے روزگار حافظ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی آج دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں ان کی وفات ہندوستان کے لئے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کیلئے ایک سانحہ ہے۔ مولانا مرحوم نے ایسا خلا چھوڑا ہے جس کو پُر کرنا بڑا مشکل نظر آتا ہے۔

مولانا شاہنواز احمد نے فرمایا کہ موت العالِم موت العالَم حضرت محدث کبیر کی شخصیت پورے عالم اسلام کے لئے باعث ناز تھی۔ آپ کے وصال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پورا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔

مختصراً حضرت مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا اعجاز احمد اعظمی اور دیگر مدرسین نے حضرت مولانا کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب خلف اکبر حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی اور گہری محبت کا اظہار کرتے ہوئے صبر وشکر کی توفیق کی دعا کی۔ آخر میں حضرت مولانا کے لئے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت پر میٹنگ اختتام پذیر ہوئی۔

(منظور احمد [illegible])

3 روزنامہ آواز ملک (وارانسی) 1-4-92

محدث کبیر کی وفات پورے عالم اسلام کا زبردست علمی خسارہ ہے۔

جامع مسجد احیاء العلوم مبارکپور میں امیر الہندؒ کے جلسۂ تعزیت میں مقررین کا اظہار خیال

(مبارکپور اعظم گڑھ)

یہاں جامع مسجد متعلقہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں ۲۴ رمضان المبارک کو بعد نماز جمعہ محدث کبیر امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی وفات حسرت آیات کے سلسلے میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت حضرت مولانا عبد الستار صاحب قاسمی صدر جمعیۃ علماء ضلع اعظم گڑھ نے فرمائی۔

قاضی ریاض احمد صاحب کی تلاوت قرآن مجید سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ پھر مولانا اشتیاق احمد صاحب قاسمی استاذ جامعہ عربیہ احیاء العلوم نے امیر الہند کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگوں کی وفات صرف اہل خانہ کے لئے رنج کا باعث ہوتی ہے۔ بعض کی اہل محلہ اور گاؤں والوں کے لئے بعض کی پورے شہر اور علاقہ والوں کے لئے مگر بعض شخصیات کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کی وفات کا صدمہ گاؤں شہروں اور ملکوں کے حدود تک نہیں رہتا۔ بلکہ ہر ایک جگہ ہر ایک کو دکھ اور صدمہ ہوتا ہے سبھی رنج و ملال محسوس کرتے ہیں۔ ایسی شخصیت کے اٹھ جانے کا شدید احساس ہوتا ہے۔ امیر الہند محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی انہیں نابغۂ روزگار شخصیات میں سے تھے جن کی وفات حسرت آیات سے پورا عالم اسلام سوگوار ہے۔ اور سبھی ایک زبردست علمی خلا محسوس کر رہے ہیں۔

مولانا محمود الحسن صاحب قاسمی فاضل مدینہ یونیورسٹی نے بھی اسی قسم کے تاثرات ظاہر کئے اور حضرت امیر الہند سے اپنے ذاتی تعلقات نیز حج کے موقع پر امیر الہند کے ساتھ رفاقت و معیت نیز خدمت کے جو لمحات میسر آئے ان کو اپنی زندگی کے یادگار لمحات سے تعبیر کیا۔

اس کے بعد مولانا عبد الرؤف صاحب مفتی جامعۃ الفلاح بلریا گنج نے تقریر کرتے ہوئے اکابر دیوبند کے سنہرے سلسلے کا تذکرہ کیا۔ اور امیر الہند کی شخصیت پر جامع انداز میں روشنی ڈالی۔

آخر میں مولانا مفتی جمیل احمد صاحب نذیری ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور نے تفصیل کے ساتھ حضرت امیر الہند کی علمی دینی قومی اور ملی خدمات کا تذکرہ کیا۔ علم حدیث میں ان کی جلالت شان اور فن اسماء الرجال میں ان کے تفوق اور امتیاز کو بیان کرتے ہوئے موصوف نے امیر الہند کی اہم تصانیف و تالیفات مصنف عبد الرزاق، مسند ابن ابی شیبہ، نصرۃ الحدیث، اعلام مرفوعہ، رکعات تراویح، تذکرۃ النساجین، ابانۃ الحاجۃ وغیرہ کا تعارف کرایا۔ عالم اسلام میں امیر الہند کو کن خصوصیات کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل تھا۔ اور دینی اور ملی جماعتوں میں کن اوصاف کی بنا پر ان کو عظمت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ان کو بیان کیا

مولانا نے فرمایا کہ نماز جنازہ میں عدیم المثال اور بے نظیر اژدہام حضرت امیر الہند کی عند اللہ مقبولیت اور عند الناس محبوبیت کی دلیل ہے۔ اور اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ واقعی اور حقیقی عالم دین کو اس دور انحطاط اور بے دینی میں لوگ اپنے سر آنکھوں پر بٹھانے اور اس کا بھرپور اعتراف و احترام کرنے کے لئے تیار ہیں۔

موصوف نے جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے ساتھ حضرت امیر الہند کے خصوصی لگاؤ اور تعلق کا بھی تذکرہ کیا اور بتایا کہ ہر اہم موڑ پر حضرت امیر الہند کو یاد کیا گیا۔ اور حضرت والا نے اپنی تشریف آوری سے خدام جامعہ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

پھر اس دعا کے ساتھ یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا کہ اللہ تعالیٰ حضرت امیر الہند کی حسنات کو قبول فرمائے اور ان کی لغزشات وغیرہ کا بھرپور صلہ رحمت فرماتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام ثابت فرمائے۔ جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے۔ اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عنایت فرمائے (آمین)۔ ۔۔۔۔

روزنامہ آواز ملک وارانسی 2-4-92

مدرسہ دینیہ غازی پور میں امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کا سوگ

غازی پور۔ بذریعہ ڈاک یکم اپریل ۳۰ مارچ ۹۲ء کو مدرسہ دینیہ غازی پور میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا ابو بکر صاحب قاسمی ناظم کتب خانہ اثریہ حضرت مولانا کی علمی حیثیت اور دنیائے اسلام میں ان کی مقبولیت کا ذکر کیا۔ مولانا قاسمی نے بتایا کہ برصغیر ہند و پاک ہی نہیں مصر، شام اور سعودی عرب کے ممتاز علماء ان کے شاگرد تھے۔ بڑے بڑے مصنفین جب کوئی کتاب تصنیف کرتے حضرت مولانا کی خدمت میں اصلاح و تنقید کے لیے پیش کرتے اور جب مولانا تصدیق کر دیتے تو وہ کتاب مستند مانی جاتی۔

عزیز الحسن صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ و جنرل سکریٹری ملی جمعیۃ علماء نے حسب ذیل تعزیتی تجویز پیش کی، جو متفقہ طور پر منظور ہوئی اور مولانا مشتاق احمد صاحب صدر المدرسین مدرسہ دینیہ نے ایصال ثواب اور دعاء مغفرت کرائی۔

تجویز تعزیت:۔ مسلمانان غازی پور کا یہ تعزیتی جلسہ امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور ان کے سانحۂ ارتحال کو ایک عظیم قومی و ملی حادثہ تصور کرتا ہے مولانا مرحوم ہندوستان ہی نہیں پوری اسلامی دنیا کے ایسے منفرد، ممتاز اور عبقری انسان تھے جن کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ علم حدیث میں ان کا پایہ بلند، تحقیقی کاوشوں میں ان کا مقام ممتاز تھا گویا ان کا طرۂ امتیاز، بے نیازی و سادگی میں نظیر علم و علماء کا وقار ان کے دم سے قائم۔ الغرض ان کی ذات ستودہ صفات ایک ایسا مینارۂ نور تھی جس سے

[illegible]

اکناف عالم میں علم کی روشنی پھیل رہی تھی۔ افسوس کہ ان کی رحلت سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ مئو مولانا کی وجہ سے مشرقی اتر پردیش کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے مولانا کے بعد اس کی بزم علم سونی رہ گئی ہے

افسوس مولانا کے جسد خاکی کے ساتھ مئو کی مٹی کے نیچے برکتوں اور سعادتوں کے کیسے کیسے خزانے دفن ہو گئے۔

ہماری نگاہیں آنے والے دنوں میں مولانا کو تلاش کرتی رہیں گی۔ مگر افسوس وہ ہمیں اب کہیں نہیں ملیں گے البتہ ان کے علوم، ان کی روایات اور ان کی تحریر کردہ شاہ راہ علم موجود ہے۔ جس پر چل کر ہم وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں مولانا ہمیں پہنچانا چاہتے تھے۔ ہمیں توقع ہے کہ مولانا کے متوسلین و جانشین مولانا کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے

یہ جلسہ مولانا کے صاحبزادگان و اہل خاندان سے دلی ہمدردی و تعلق خاطر کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے قلوب کو تسکین دے۔ (نامہ نگار)

पूर्वांचल संदेश
१७ मार्च १९९२ (४)

शोक में आज
मऊ बंद रहेगा

मऊनाथभंजन ,१६मार्च । मऊ उद्योग व्यापार मंडल के अध्यक्ष मौलवी सफिउल्लाह एवं मन्त्री विनोद कुमार टंडन ने बतायाकि मौलाना हबीबुर्ररहमान शाहब अजमी के शोक में नगरके समस्त व्यावसायिक प्रतिष्ठानबंद रहेंगे ।

व्यापार मंडल ने समस्त व्यापारियों से अनुरोध कियाकि वे मौलाना की स्मृति में अपनी दुकानें बन्द कर उन्हें श्रद्धां-जलि अर्पित करें।
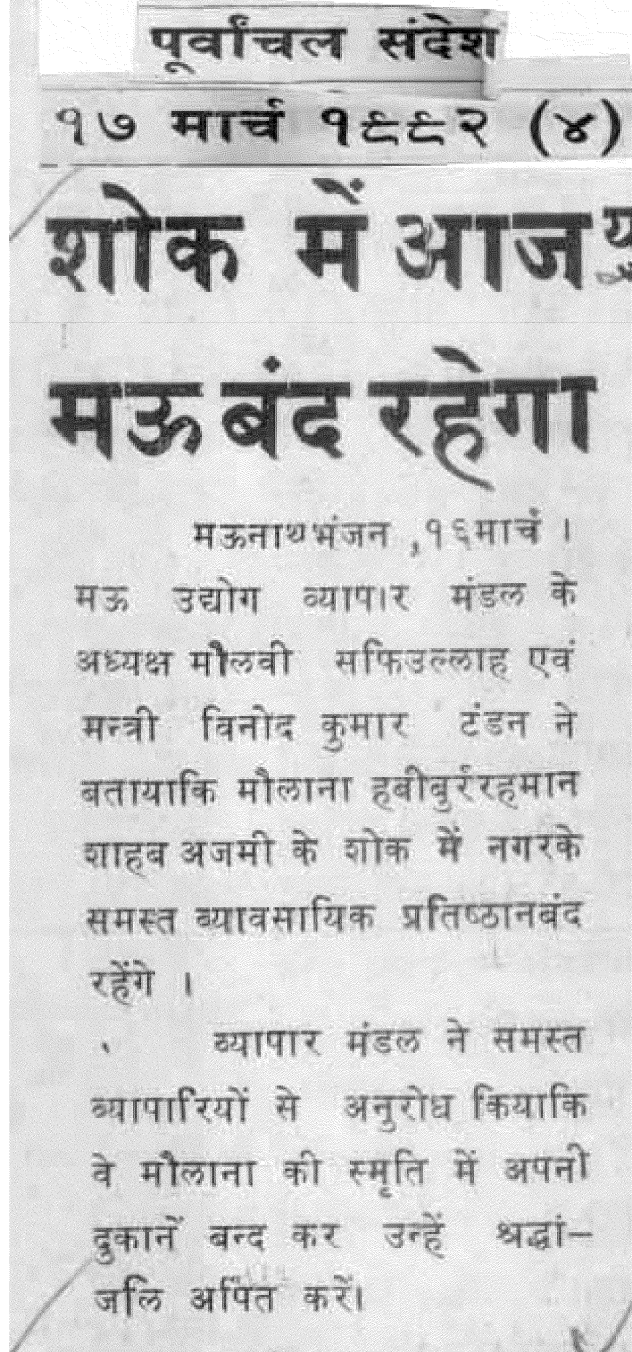
2-4-92
UMI MORCHA URDU DAILY 2 कौमी मोर्चा

جامعہ مظہر العلوم میں تعزیتی جلسہ

گذشتہ ۲۴ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ بروز دوشنبہ جامعہ مظہر العلوم میں محدث جلیل علامہ حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پرملال پر ارکان و ہمدردان جامعہ نے ایک تعزیتی میٹنگ منعقد کی جس میں ارکان جامعہ نے آپ کے لئے دعاء مغفرت کی اور درج ذیل تعزیتی تجویز منظور کی۔

محدث کبیر محقق شہیر، ابو المآثر حضرت علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی کے سانحۂ ارتحال کی خبر ۱۰ رمضان المبارک کو بعد نماز مغرب سات بجے بذریعہ فون بنارس پہونچی معلوم ہوا کہ مذکورہ تاریخ میں عین افطار کے وقت آپ نے اس دار فانی کو الوداع کہا اور مالک حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت کے وصال کی خبر جانکاہ سنکر ارکان مدرسہ اور تمام متعلقین کو دلی صدمہ اور صد درجہ افسوس ہوا۔ حضرت کے انتقال سے علمی دنیا میں ایک بڑا خلاء پیدا ہو گیا جس کا پر ہونا دشوار ہے۔ آپ کی ذات گرامی محققین، مصنفین، مولفین اور علماء عرب و عجم کے لئے مرجع تھی۔ علمی حلقہ میں الجھے ہوئے مسائل آپ کے یہاں حل ہوتے تھے۔ علم حدیث، اسماء الرجال اور فقہ میں پورے عالم اسلام میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ دینی امور اور مسائل میں کسی طرح کی نرمی اور مداہنت آپ برداشت نہ فرماتے، کتاب و سنت اور اسلاف کے طریقہ کا آپ سختی سے پابندی فرماتے اور لوگوں کو اسی کا حکم دیتے، اسی لئے اباحیت پسندی، نگری روشن خیالی، آزادیٔ طبع اور جدت پسندی کے دور میں آپ کی ذات ہدایت کا سرچشمہ تھی۔

افسوس کہ علم و عمل، رشد و ہدایت اور معرفت و سلوک کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا، کل من علیہا فان۔

حضرت مولانا کو جامعہ مظہر العلوم سے گہرا قلبی لگاؤ تھا آپ نے ہمیشہ جامعہ کی سرپرستی فرمائی مگر افسوس کہ آج جامعہ کے در و دیوار نوحہ خواں ہیں آپ نے ۱۳۳۵ھ میں جامعہ مظہر العلوم میں بحیثیت طالب علم داخلہ لیا اور وقت کے محدث و فقیہ حضرت مولانا عبد الغفار صاحب مئوی کے فیض صحبت میں رہ کر ملا اور فاضل کا امتحان دیا اس کے بعد دوسرے مرحلہ میں بحیثیت مدرس تشریف لائے اور تیسرے مرحلہ میں صدر المدرسین کی حیثیت سے تین سال تک جامعہ کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور ۱۳۹۶ھ سے ۱۶ سال تک مسلسل ختم بخاری شریف کے موقع پر جامعہ کی دعوت پر تشریف لاتے اور بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیتے رہے حدیث پر آپ کا درس کیا ہوتا بس علوم و معارف کا ایک بحر بیکراں، درس کے اختتام پر مدرسین، منتظمین، طلبہ اور عوام سبھی کو اپنے خاص انداز میں نصیحت فرماتے اور اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر خالص اللہ کے لئے محنت اور لگن سے کام کرنے کی تلقین فرماتے آہ وہ جامعہ کا سرپرست، بخاری وقت ملجا و ماویٰ زماں، غزالی دوراں ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔ شمع محفل کیا بجھی محفل اجڑ گئی۔

دعا ہے کہ رب کریم آپ کی بال بال مغفرت فرمائے اور اپنی بے پایاں رحمت سے آپکی قبر کو سیراب کرے اور آپ کے درجات کو بلند فرمائے اور تمام متعلقین متوسلین اور عقیدت مندوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

ناظم اعلیٰ و ارکان جامعہ مظہر العلوم

بنارس

نئی دہلی (پی ٹی آئی): ریلوے بجٹ کو پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد کل یعنی یکم اپریل سے اضافہ شدہ مسافر کرایوں اور مال بھاڑوں کا نفاذ عمل میں آرہا ہے۔ وزارت ریلوے نے مجوزہ اضافوں کے نفاذ کے آج احکامات جاری کر دئے۔

نیم شہری ریل سروسوں میں ایک کلومیٹر سے ۱۰ کلومیٹر تک کے مسافت پر موجودہ کرایوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا

DATE: 4-4-92

QAUMI MORCHA URDU DAILY

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی وفات سے علم و تحقیق کا باب بند ہو گیا

دفتر امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ پھلواری شریف میں جلسہ تعزیت منعقد

پھلواری شریف (پٹنہ) ۳/اپریل
محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن
اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر امارت شرعیہ
کانفرنس ہال میں ایک تعزیتی نشست
حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نائب
امیر شریعت کی صدارت میں ہوئی
جس میں جملہ کارکنان امارت شرعیہ نے
شرکت کی حضرت مولانا نظام الدین صاحب نے
خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مولانا کی
وفات سے آسمان علم کا ایک اور سورج
غروب ہو گیا انکو علم حدیث میں من جانب اللہ
کمال و رسوخ حاصل تھا وہ علماء کے تربیت
کرنے والے اور بنانے والے تھے ان کے
مزاج میں تواضع تھا مگر علم کی عظمت تھی
اس موقع پر قاضی شریعت حضرت مولانا
مجاہد الاسلام نے خطاب کرتے ہوئے
فرمایا کہ حضرت مولانا کی وفات سے گذشتہ
صدی کے اکابر علماء کی صف اٹھ گئی وہ
بڑے محدث اور صاحب تحقیق و تصنیف
بزرگ تھے سنجیدہ علمی تحقیقی کا کام ان کا
طرہ امتیاز تھا اللہ تعالیٰ نے ان کو حفظ
و ذہانت اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا علم وافر عطا فرمایا موصوف
کے قلم سے احادیث کے کتنے ہی ذخیرے
منظر عالم پر آئے مصنف ابن ابی شیبہ
اور عبدالرزاق کتاب الزہد وغیرہ کو تحقیق
کر کے عنصر مشہود پر لانا ان کے علم کا
تحقیق کا کمال ہے انشاء اللہ شغل بالحدیث
سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند مرتبہ پائیں گے
ہمیں چاہیے انکے نہج کی پیروی کریں انہوں
نے کہا کہ وہ خالص علمی شخص تھے سیاست
سے لگاؤ نہیں تھا۔ اگرچہ بعض اہل سیاست
نے اپنے مفاد میں انکو استعمال کرنا
چاہا اس موقع سے مولانا سعید احمد قاسمی معاون
قاضی مولانا انیس الرحمٰن صاحب نائب قاضی
شریعت اور دارالعلوم دیوبند کے سفیر مولانا
شبیر وزیر عالم قاسمی نے خطاب کرتے ہوئے
حضرت مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش
کیا۔ جلسہ کا آغاز مولانا اسمعیل صاحب ندوی
معین ناظم امارت کی تلاوت قرآن سے
ہوا تھا اور صدر جلسہ کی دعا پر ختم ہوا

QAUMI MORCHA

DATE: 26-4-92

تاریخ وفات

ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمن اعظمی نور اللہ مرقدہٗ

— از جناب شوق اعظمی استاذ جامعہ اثریہ دار الحدیث مئو

بوالمآثر حیف، از دنیا گذشت، رہنمائے ملتِ بیضا گذشت

از جہانِ رنگ و بو سیر آمدہ، در مقام ارفع و اعلیٰ گذشت

جسمِ او پنہاں شدہ در زیرِ خاک، روحِ پاکش بر سرِ طوبیٰ گذشت

تابِ ہجرانش مریداں را نہ بود، صبرِ دلہا، راحتِ جانہا گذشت

از زمیں تا آسماں از فرطِ غم، نالہ و فریاد و واویلا گذشت

در حقیقت او فقیہہ وقت بود، علمِ دیں را عاشق و شیدا گذشت

یادگارِ اوست "مرقاۃ العلوم"، چشمہ بگذاشتہ ما را گذشت

زندہ جاوید ہست تالیفِ او، چیست جائے غم اگر از ما گذشت

شد مبارک فال بہر آخرت، در مبارک ماہ از دنیا گذشت

روزِ دوشنبہ دہم رمضاں بہ شام، از جہاں در جنت الماویٰ گذشت

فکرِ تاریخ وفاتش بود شوق

گفت ہاتف،

"عالم یکتا گذشت"

۱۹۹۲ء

DATE: 19-4-92

QAUMI MORCHA

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کی دیرپا یادگار قائم کرنے کی ضرورت ہے

سہ ماہی مجلہ ترجمان الاسلام بنارس جولائی میں خصوصی نمبر شائع کریگا

بنارس ۱۸ اپریل - مولانا اسیر ادروی ایڈیٹر ترجمان الاسلام بنارس نے حسب ذیل بیان برائے اشاعت بھیجا ہے۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کے سانحۂ وفات کے بعد تعزیتی جلسوں کا سلسلہ برابر جاری ہے، مولانا مرحوم کی جلالت علمی اور عظمت شان کا یہی تقاضا بھی ہے لیکن مولانا مرحوم کے وہ گونا گوں علمی و تحقیقی کارنامے ہیں جن کی وجہ سے عالم اسلام کے ہر محقق و ژرف بین عالم کا سر ان کے آستانۂ جاہ و جلال پر جھکا ہوا نظر آتا ہے ضرورت ہے کہ علمی دنیا کو ان سے روشناس کرایا جائے۔

مولانا مرحوم کی ذات مرجع خلائق تھی۔ عوامی عقیدت و محبت اور قدر دانی کے مظاہرے ہوتے رہتے تھے، عوام کے دلوں پر حکمرانی کا منظر تو دو لاکھ انسانوں نے ان کی نماز جنازہ میں شریک ہو کر دیکھا، سفید پوش مسلمانوں کا ایک بحر زخار ریلوے گراؤنڈ میں اس طرح لہریں لے رہا تھا جیسے سمندر میں موجیں حد نگاہ تک کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انتظامیہ کے افراد پولیس اور افسران حیران و سرگرداں کہ رات کے سناٹے میں کس نے صور پھونک دیا کہ صبح ہی سے انسانوں کا جم غفیر ہر سمت سے سیلاب کی طرح امڈا چلا آ رہا ہے جیسے کوئی عظیم الشان بند یک بیک ٹوٹ گیا ہے ہر شخص دم بخود حیرت زدہ اور ششدر تماشائی بن کر آیا اور خود تماشا بن گیا، ریلوے گراؤنڈ میں حد نگاہ تک پھیلا ہوا سفید پوش انسانوں کا مجمع زبان حال کہہ رہا تھا،

حیرت سے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا

مگر یہ روح نواز مناظر عارضی ہیں، عقیدت و محبت کی یہ خوشبو فضاؤں میں تحلیل ہو کر گم ہو جائے گی، شوق اور عقیدت کی نگاہیں وقتی طور پر ان سے تسکین حاصل کریں گی، دل کے ورق پر کوئی دیرپا نقش قائم نہیں ہوگا۔ ضرورت ہے کہ مولانا مرحوم کی دیرپا یادگاریں قائم کی جائیں۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ادارہ "ترجمان الاسلام" بنارس نے جولائی میں "مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نمبر" شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور ملک کے مشاہیر اہل علم اور ارباب قلم سے قلمی تعاون حاصل کر کے ایک دستاویزی یادگار نمبر کی شکل میں شائع کرنے کا عزم کیا ہے۔

اس نمبر میں مولانا کی شخصیت، خصوصیات، کمالات، امتیازات اور علمی و تحقیقی کارناموں پر مستند اور مفصل مضامین ہوں گے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ نمبر کتابت، طباعت اور مشتملات کے لحاظ سے اپنی روایت کو برقرار رکھے اور مولانا مرحوم کے شایان شان ہو۔ انشاء اللہ جولائی میں یہ خوبصورت تحفہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

पूर्वांचल संदेश १७ मार्च १९९२ (४)

पद्मश्री मौलाना हबीबुर्रहमान साहब आजमी का इन्तकाल

इस्लामी जगत में शोक की लहर

मऊनाथभंजन, १६ मार्च। इस्लामी जगत के विश्वविख्यात उल्मा व मुसलमानों के अमीरूल हिन्द हजरत मौलाना हबीबुर्रहमान साहब आजमी का आज सायंकाल ६ बजे उनके पठान टोला स्थित पैत्रिक निवास स्थान में लम्बी बीमारी के बाद उनका इन्तकाल हो गया।

स्वर्गीय मौलाना आजमी आजाद भारत के उत्तर प्रदेश की पहली विधान सभा के सदस्य थे। १९८५में तत्कालीन राष्ट्रपति श्री ज्ञानी जैल सिंह उन्हें अरबी के क्षेत्र में महत्वपूर्ण योगदानके लिए पद्मश्री से सम्मानित किया था।

सरलता, सादगी एवं ज्ञान की प्रतिमूर्ति मौलाना हबीबुर्रहमान साहब आजमी विभिन्न देशों का भ्रमण किया था, उनके धार्मिक प्रस्थान को मुस्लिम जगत में काफी सम्मान प्राप्त था। उनकी लिखी पुस्तकें विश्व के अनेक विद्यालयों में पढ़ायी जाती हैं।

मौलाना के मृत्यु की खबर सुनते ही पूरा नगर शोक में डूब गया। उनके अन्तिम दर्शन के लिये लोगों का ताता लगा हुआ है। हिन्दू और मुसलमानों में समान रूप से लोकप्रिय मौलाना आजमी इस शहर की गंगा–जमुनी संस्कृति की अमूल्य धरोहर थे।

मौलाना मानवता के सच्चे सेवक थे- दिनेश सिंह

मऊनाथभंजन। पद्म श्री मौलाना हबीबुर्रहमान आजमी के निधन से पूरा क्षेत्र शोकमग्न हो गया है। उनका अंतिम दर्शन करने व श्रद्धांजलि अर्पित करने वालों का ताता लगा हुआ है।

जिलाधिकारी श्री दिनेशसिंह ने मौलाना हबीबुर्रहमान आजमी के निधन पर हार्दिक शोक व्यक्त करते हुए उन्हें मानवता का सच्चा सेवक बताया। उन्होंने कहा कि एक उद्‌भट विद्वान हमारे बीच से उठ गया।

उनके जनाजे के नमाज स्थानीय रेलवे के मैदान में कल २ बजे होगी। जिसमें भारी संख्या में लोग अपने अजीम रहनुमा को श्रद्धांजलि देने के लिए उपस्थित रहेंगे।

– स्वर्गीय मौलाना के निधन को अपूरणीय क्षति बताते हुए पूर्वांचल संदेश के प्रधान सम्पादक श्री अर्जुन सिंह ने कहा कि वे संत थे। उनके निधन से एक महान विभूति हमारे बीच से उठ गयी।

उद्योग व्यापार मण्डल कें जिलाध्यक्ष श्री राधे कृष्ण खण्डेलवाल ने मौलाना आजमीके निधन पर दुःख व्यक्त करते हुये कहा कि स्व. आजमी ने अपना पूरा जीवन समाज सेवा को समर्पित किया था। वे साम्प्रदायिक सद्भाव के उदाहरण थे।

व्यापार मण्डल के अध्यक्ष मौलवी सफीउल्लाह ने कहा कि मौलाना आजमी आलम इस्लाम की एक अजीम सख्सियत थे जो आज दुनिया से रुखसत हो गये। जिससे आलमे इस्लाम में गम की लहर दौड़ गयी है। खासतौर से हिन्दुस्तान के पैमाने पर जो नुकशान हुआ है वह कभी पूरा नहीं हो सकता। मऊ के लोगों को उन पर नाज था। खुदा उनके परिवार के लोगों को सब्र की तौफीक दें तथा उन्हें जन्नतुल फिरदौस में जगह दें।

قومی مورچہ
بنارس
بنارس ۔ اتوار ٭ ۲۲ر مارچ ۱۹۹۲ء

سنگ غم و تاریخ رحلت

بر وفات حسرت آیات محدث جلیل امیر الہند ابو المآثر حضرت مولانا

حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ

منجانب: مجیب الغفار اسعد اعظمی

بزم آثار و سنن کے آہ وہ صدر الصدور
حضرت اقدس محدث، صاحب طبع غیور

آہ استاذی حبیب الاعظمی بالغ نظر
بو المآثر وہ امام ناقدانِ ذی شعور

ان کی رحلت سے ہوئے ہیں سب یتیم بے نوا
ہے سبھی کا شیشۂ دل صدمۂ فرقت سے چور

صدمۂ جانکاہ سے ہے سارا عالم سوگوار
مکتبے گریاں کتابیں حاشیئے بین السطور

غم کی تاریکی میں ہے سارا جہاں ڈوبا ہوا
ہر نظر کے سامنے ہے ظلمتِ غم کا وفور

ماہرِ علمِ حدیثِ مصطفےٰ رخصت ہوئے
تشنگانِ علم جائیں یا خدا کس کے حضور

یوں ہزاروں میکدے ہیں پر کہاں پائیں گے ہم
ساقیا تیری شرابِ کہنہ کا کیف و سرور

مل سکا ان کا کوئی ثانی نہ شانِ علم میں
لوگ دوڑاتے رہے اپنی نگاہیں دور دور

وہ بخاری زمن تھے وقت کے ذہبی تھے وہ
فنِ اسماء رجال میں لاریب تھا کامل عبور

اللہ اللہ ان کے رخ کی تازگی مرنے کے بعد
زندگی سے بھی فزوں تھا انکی پیشانی کا نور

زندۂ جاوید ہیں وہ اپنی تصنیفات میں،،
گرچہ ظاہر میں ہوئے ہیں آج من اہل القبور

اے خدا ٹھنڈی رہے تربت ہمارے شیخ کی
جنت الفردوس میں انکو ملیں حور و قصور

عمر اقدس ہے "مجاہد" اسعد محزون لکھ
۹۳
ابتدا "اخترِ حسن" ہے خاتمہ "وصلِ غفور"
۱۳۱۹ھ ۱۴۱۲ھ

موت العالم موت العالم

۲۴: ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی تغمدہ اللہ بغفرانہ عالم اسلام کے مقتدر عالم، جمہوریہ ہند کے ایوارڈ یافتہ عربی اسکالر محدث کبیر، بقیۃ السلف، امیر الہند ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی وفات حسرت آیات پر جامعہ اثریہ دار الحدیث مئوناتھ بھنجن اترپردیش میں ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت جناب ثناء احمد صاحب گرہست صاحب صدر کمیٹی جامعہ ہذا منعقد ہوا جس میں حضرت مولانا کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا

مولانا موصوف بتاریخ ۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء کو یوم دوشنبہ عین مغرب کے وقت قوم کو سوگوار چھوڑ کر راہی دار البقاء ہوئے!

انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا موصوف کی ذات گرامی منبع معقول بین علوم و ذخیرہ کامل [illegible] ہستی تھی جس سے تشنگان علوم [illegible] سیراب ہوتے تھے اس دور میں [illegible] رجال میں آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مشکل سے ہی پورا ہو گا

ادارہ جامعہ اثریہ دار الحدیث پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں اور قوم کو آپکا نعم البدل عنایت فرمائیں نیز ہمکو اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں، آمین ثم آمین

اراکین جامعہ اثریہ دار الحدیث
مئوناتھ بھنجن۔ اترپردیش

روزنامہ آواز ملک وارانسی 1-4-92

منشی عبداللہ منظر
ملک ٹولہ مئو

آہ - امیرالہند

ابوالمآثر محدث کبیر حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ

نائب مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو چل سنبھل کے اے قلم

مکینوں کے ہے لبوں پر العطش اور الاماں
بوالمآثر محفل اسلام کے پیر مغاں
چار سو ہے شور ماتم ہر طرف شور فغاں
ہے عجب ہنگامہ آرائی کا عالم اب یہاں
بزم علم دیں کا گویا لٹ گیا جاہ و حشم

نائب مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو چل سنبھل کے اے قلم

اے وقار قوم و ملت اے منار علم و فن
اے امام المسلمیں اے نائب شاہ زمن
زہد و تقویٰ کے امیں مہر نبوت کی کرن
بزم علم دیں میں آخر کون ہوگا ضوفگن
بعد رحلت آپ کے یہ لوگ کہتے ہیں بہم

نائب مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو چل سنبھل کے اے قلم

عظمتوں کے تاج والے آپ کا جو دور تھا
ذرے ذرے گلفشاں تھے مہکی مہکی تھی فضا
کتنے پاکیزہ تھے لمحے کیا تھا منظر خوشنما
آہ لیکن آج ہر سو اک قیامت ہے بپا
ایک عالم غرق ماتم آنکھ ہے ہر ایک نم

نائب مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو چل سنبھل کے اے قلم

اللہ اللہ یکساں وہ سب پہ محبت آپ کی
اور وہ بے لوث ہر طلبا پہ شفقت آپ کی
سب کی آنکھوں میں بسی ہے اب بھی صورت آپ کی
کر گئی برپا قیامت آہ رحلت آپ کی
خادم شرع متیں اے صاحب ذی محترم

نائب مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو چل سنبھل کے اے قلم

در حقیقت دونوں آنکھیں تھیں شرافت کی امیں
روئے زیبا تھا متانت کی جبیں سے دلنشیں
جنبش لب پر وہیں سے جھڑتے تھے گلہائے حسیں
دست شفقت کی عنایت آفریں صد آفریں
تذکرہ لی خوشنما اللہ رے سلجھے قدم

نائب مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو چل سنبھل کے اے قلم

خندہ پیشانی سے ملتے آپ سب سے صبح و شام
نام لیتے تھے ادب سے آپ کا ہر خاص و عام
عظمتوں کے تاج والے لائق صد احترام
لیجیے منظر کا اپنے روضۂ مرقد میں سلام
چھوڑ کر او جانے والے ہم کو یوں با چشم نم

نائب مرسل کی اب توصیف کرتا ہوں رقم
احتراماً سرنگوں ہو چل سنبھل کے اے قلم

28-3-92
URDU DAILY कौमी मोर्चा उर्दू दैनिक

بخاریٔ وقت، امیر الہند ابوالمآثر حضرت مولانا

حبیب الرحمٰن الاعظمی

کا انتقال اور منشی نیاز کا آنکھوں دیکھا حال

جیسے ہی عشرۂ رحمت گیا دسواں رمضان
دارِ فانی سے گیا دیکھ حبیب الرحمٰن

ساری دنیائے عرب جس پہ رہی ہے قربان
ناز کرتا رہا جس پر مرا ہندوستان

گر پڑی جیسے ہر انسان پہ غم کی چٹان
ریڈیو سے ہوا جب موت کا (انکی) اعلان

انتقال ان کا ہوا عین بوقت افطار
ہونیوالی تھی مساجد میں بھی مغرب کی اذان

یوں تو بھارت کا "امیر" انکا لقب تھا لیکن
مانتی تھی انھیں دنیائے عرب بھی سلطان

انکے دربار میں جھکتی نظر آتی دنیا
سرنگوں سامنے ان کے تھے کلکٹر، کپتان

ان سے میں جب بھی ملا مجھ کو خدا یاد آیا
ہے حدیثوں میں بزرگوں کی یہی تو پہچان

وہ محدث، وہ مفکر، وہ فقیہہ دوراں
جنکی تفسیر سے ہوتا ہے بخاری کا گمان

ایسی تشریح کہ تسلیم زمانہ کر لے
کھول کر سامنے رکھ دیتے حدیث و قرآن

آپ سے دور رہا کرتی تھی بد دینی بھی
آپ کی بات سے ہوجاتا تھا تازہ ایمان

سونی سونی سی ہے اب علم و ادب کی محفل
آگیا علم کے بازار میں ادبی بحران

یوں تو حضرت نے کئی ایک کتابیں لکھدیں
جس سے امت پہ جو مشکل تھی ہوئی وہ آسان

یادگار ان کی ہیں مفتاح العلوم و مرقاۃ
جس جگہ ہوتی ہے تعلیم حدیث و قرآن

اس قدر بھیڑ تھی حضرت کے جنازے میں نیاز
جنّ و انساں کا سمندر تھا ملک کا طوفان

جس گلی میں بھی گذر جائے طوفانِ بشر
جس سڑک پر بھی نکل جائے لاکھوں انسان

سارے بازار بھی اس روز تھے اس غم سے نڈھال
بند اس دن تھی مئوناتھ کی اک اک دکان

ناز ہے شہر مئو تجھ پہ نیاز احمد کو
تیری آغوش میں ہے کتنا مبارک انسان

جن کے دیدار کو انساں کیا، ملک تک ترسے
انکی تربت پہ الٰہی! تری رحمت برسے

ہفت روزہ
مئوناتھ بھنجن
جدید حالات
'HALAAT' WEEKLY
MAU N.B.
جلد نمبر ۳۰ ۲۹ رمئی سنہ ۱۹۹۲ء بروز جمعہ شمارہ نمبر ۲۱

محدثِ کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی چند خصوصیات

از۔ سلطان احمد قاسمی صدر جمعیۃ الفلاح الخیریہ مئو

حضرت العلامہ مولانا اعظمی کے علمی کارناموں کا جائزہ لینا آپ کی محققانہ بصیرت اور مجتہدانہ حیثیت کا اجاگر کرنا فن حدیث اور اسماء الرجال جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے ہندو پاک میں چند ہی ایسی شخصیات ہیں جو اس کام کو انجام دے سکتی ہیں پھر بھی یہ دعوی سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حضرت العلام کی علمی گہرائی اور گیرائی کا کما حقہ حق ادا کر سکیں گی مولانا مرحوم کے نقوشِ حیات کی جمع و ترتیب ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جو خود بھی اس میدان کا راہ نورد ہو اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو ایک سرسری جائزہ ہے یا پھر بخل سے کام لیا گیا ہے میں خود بھی تعلیم و تعلم درس و تدریس تصنیف و تالیف سے ہٹ کر ان کی مجالس وعظ و تبلیغ۔ اصلاح و تربیت۔ شخصی وجاہت علمی رعب و ادب علمانہ شان و وقار سے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا موصوف ایک غیر معروف متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے ان کے والد مرحوم مولانا محمد صابر صاحب ایک نیک طینت پاکباز انسان تھے انکی نیک نیتی اور علم دین سے والہانہ وابستگی کا ثمرہ تھا جو اس بحرِ زخار دریا کی شکل میں پیدا کیا پاکیزہ خصلت جامع شریعت و طریقت حامل علوم نبوت کی صورت میں نمودار ہوا آپکے والد مرحوم نے ابتداء ہی سے اپنی آغوشِ تربیت میں رکھا آپ کی تعلیم کا زیادہ حصہ قدیم دینی درسگاہ دارالعلوم مئو میں گذرا کچھ دنوں کے لئے دارالعلوم دیوبند بھی تشریف لے گئے مگر وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی وہاں سے لوٹ آنے کے بعد دورۂ حدیث کی تکمیل دارالعلوم مئو میں فرمائی علم حدیث سے فطری و خصوصی لگاؤ تھا اس بیچ میں دارالعلوم دیوبند کے جید علماء نامور محدثین سے بھی استفادہ کا شرف نصیب ہوا۔ نیز استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث ابوالانوار علامہ عبد الغفار صاحب مئوی کی خدمت میں عرصہ دراز تک رہے اور علم حدیث سے صحیح معنوں میں ذوق یہیں سے پیدا ہوا جسکا تذکرہ اپنی زندگی میں حضرت العلام بار بار فرماتے رہے۔ شخصی وجاہت علمی رعب و ادب چہرہ پر بہت نمایاں تھا کسی کو بے تکلف بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی چاند کی گواہی کے سلسلے میں اچھے اچھے لوگوں کا قدم ڈگمگا جاتا تھا۔

حضرت مولانا کا مفتاح العلوم کی ابتدائی زندگی میں عوام سے رابطہ زیادہ تھا اور وعظ کی مجلسوں میں بھی حصہ زیادہ لیتے تھے۔ مغرب کے بعد وعظ فرمانا پسند فرماتے تھے اور عشاء کے بعد کی مجالس میں شرکت سے قطعاً گریز فرماتے تھے۔ کیونکہ اس سے صبح کی نماز اور دیگر وظائف میں خلل پڑتا تھا وعظ نہایت مختصر ہوتا تھا مگر ٹھوس۔

آج کے پیشہ ور مقررین کی طرح نہیں لایعنی باتوں سے مکمل پرہیز فرماتے تھے جو کچھ فرماتے قرآن وحدیث کے حوالہ سے اور ساتھ ہی ساتھ مسائل کا کام استنباط بھی فرماتے جس سے مجتہدانہ شان نمایاں ہوتی قصے کہانیوں میں وقت برباد نہیں کرتے خاص خاص موضوعات پر تقریر کرنا آپ کا شیوہ نہیں تھا جیسا کہ بعض فرقہ کے مقررین اپنی نام آوری کے لئے ایسا کرتے ہیں بلکہ وقت کی ضرورت اور مقتضائے حال کا پورا پورا لحاظ فرماتے وعظ کی زبان نہایت صاف ستھری اور سلیس ہوتی تھی باتیں کھری کھری اور دو ٹوک کبھی کسی سیٹھ یا کسی صاحب کی پرواہ نہیں کرتے تھے شرعی احکام بیان کرنے میں مصلحت بینی دور کا

18-3-91 कौमी मोर्चा उर्दू दैनिक पृष्ठ ६ :- मूल्य १.५०

عالم اسلام کی بلند پایہ علمی شخصیت محدث کبیر حضرت علامہ حبیب الرحمن اعظمی کو تقریباً دو لاکھ عقیدتمندوں نے سپرد خاک کیا

مئو کی تاریخ میں اتنا بڑا ہجوم نہیں دیکھا گیا۔ سارا شہر سوگ میں ڈوب گیا۔ مشرقی اضلاع کے ہر حصہ سے بے پناہ ہجوم امنڈ پڑا۔ صنعتی شہر میں کاروبار مکمل بند رہا!

مئوناتھ بھنجن۔ ۱۷ مارچ (بذریعہ نامہ نگار) عالم اسلام کی بلند پایہ علمی و تحقیقی شخصیت امیر الہند محدث کبیر ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے جسد خاکی کو آج ان لاکھوں سوگوار عقیدت مندوں نے ان کے دولت کدہ سے متصل احاطہ کے ایک حصہ میں اشک بار آنکھوں اور غم زدہ سے لبریز دل کیساتھ سپرد خاک کیا مرحوم کی لحد مبارک میں مٹی دینے کا سلسلہ دن میں تقریباً ساڑھے تین بجے سے شروع ہو کر رات آٹھ بجے تک جاری رہا۔ لوگ جوق در جوق ان کی مٹی میں شرکت کیلئے چلے آرہے تھے۔ رمضان کے روزہ کی وجہ سے کافی لوگ انکی مٹی دینے سے محروم رہ گئے

مرحوم کے جنازہ میں گورکھپور، بستی اعظم گڑھ، گونڈا، بہرائچ، غازیپور، جونپور، اور وارانسی سمیت مختلف مشرقی اضلاع کے تقریباً کل حصے سے بڑی تعداد میں عقیدت مندوں نے شرکت کی، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے حضرت مولانا سعید الرحمان صاحب اعظمی نے شرکت کی،

مرحوم کا جنازہ دن میں تقریباً ۱۱ بجے ان کے گھر سے نکلا، جو خاص شاہراہوں سے ہوتا ہوا ریلوے گراؤنڈ پر پہونچا۔ لوگوں کے ہجوم کا عالم یہ تھا کہ اس معمولی مسافت کو طے کرنے میں ایک گھنٹے کا وقت لگ گیا۔

جنازہ میں شریک لوگوں کے بے پناہ اژدہام کو دیکھتے ہوئے بزرگوں کا کہنا ہے کہ آزادی کے بعد مئو کی سرزمین پر اتنا بڑا ہجوم نہیں دیکھا گیا۔

مرحوم کے جنازہ اور تدفین میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کی بھی بڑی تعداد شامل تھی۔ مولانا کی رحلت کے سوگ میں بیوپار منڈل نے عام بندی کا اعلان کیا تھا۔ جب کہ مئو کے تمام کاروباری ادارے حتیٰ کہ دستی کرگھے بھی مکمل طور پر بند رہے اور پورا شہر غم واندوہ کے ماحول میں ڈوبا رہا۔

مرحوم موصوف کی نماز جنازہ ریلوے میدان میں دن تقریباً ڈھائی بجے ان کے چھوٹے حضرت مولانا عبد الجبار اعظمی نے پڑھائی اس موقع پر عوام کے اژدہام کو کنٹرول کرنے کیلئے ضلع انتظامیہ کی جانب سے زبردست انتظامات کئے گئے تھے۔ لیکن پھر بھی مجمع کو کنٹرول کرنا ممکن نہ ہوسکا

مرحوم موصوف کی پیدائش کے بعد ان کے والدین نے ان کا تاریخی نام اختر حسن رکھا تھا۔ لیکن بعد وہ حبیب الرحمان کے نام سے مشہور ہو گئے،

مرحوم کے پسماندگان میں دو صاحبزادے مولانا رشید احمد، اور مولانا سعید احمد صاحب کے علاوہ ۴ بیٹیاں باحیات ہیں۔ علم حدیث اور فن رجال کے موضوع پر ان کی تصانیف میں ان کے بڑے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب معاون خاص بنے رہے عرصہ دراز سے اپنی علالت کے باوجود جب تک بازو میں سکت تھی مولانا موصوف تصنیف وتالیف کا کام انجام دیتے رہے

مولانا موصوف کی طبی علالت کے دوران مئو کے مشہور و معروف ڈاکٹر نثار احمد انصاری ان کے علاج میں مصروف رہے چند دنوں قبل جب علالت نے مزید اختیار کرلی تو دوسرے ڈاکٹروں کے ساتھ ہی ڈاکٹر نثار احمد صاحب مولانا کی صحت یابی کے لئے پوری طور پر کوشاں رہے۔

فہرست عنوانات